بین الاقوامی ادب

(انتخاب)

اکادمی ادبیات پاکستان

بین الاقوامی ادب

(انتخاب)

مدیر اعلیٰ

فخر زمان

مدیر منتظم

ڈاکٹر راشد حمید

مرتبین

محمد عاصم بٹ، طارق شاہد، افضال شاہد

اکادمی ادبیات پاکستان

ایچ ۸/۱، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد، پاکستان

(یہ کتاب 1995 میں جناب خالد اقبال یاسر کی زیر ادارت شائع ہونے
والے سہ ماہی ادبیات کے خصوصی شمارے 'بین الاقوامی ادب نمبر' کے
انتخاب پر مشتمل ہے۔)

نگران اعلیٰ	فخر زمان
منتظم	ڈاکٹر راشد حمید
تدوین وطباعت	محمد عاصم بٹ
اشاعت	2008
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان سیکٹر ایچ ایٹ ون' اسلام آباد
مطبع	ماریہ پرنٹرز، راولپنڈی
قیمت	(غیر مجلد) 750 روپے (مجلد) 800 روپے

اداریہ

1995 میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے دور حکومت میں بین الاقوامی ادبی کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں دنیا بھر سے 400 نمائندہ اہل قلم نے شرکت کی تھی۔ اس موقع پر چھ جلدوں پر مشتمل سہ ماہی "ادبیات" کا ایک ضخیم 'عالمی ادب نمبر' شائع کیا گیا تھا۔ اس خصوصی شمارے میں عالمی ادب سے نمائندہ تحریروں کے تراجم کے ساتھ ساتھ ہندوستان سے اردو ادب پاروں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اب ایسا ہی ایک انتخاب ایک جلد میں پیش کیا جارہا ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ عالمی ادب کا کوئی انتخاب مکمل نمائندگی کا دعوی نہیں کر سکتا، کوشش کی گئی ہے کہ سبھی عالمی ادبی مراکز سے اہم ادیبوں کی تحریروں کو یکجا کیا جائے تاکہ اس انتخاب کو ممکنہ حد تک نمائندہ بنایا جاسکے۔ سو کے لگ بھگ ملکوں سے نمائندہ اہل قلم کی تحریریں اس انتخاب کی زینت بنی ہیں۔ امید ہے کہ یہ انتخاب آپ کے ذوق سلیم کے مطابق ہوگا۔

فخر زمان

فہرست

نثر

شاعری 591

روس اور وسط ایشیائی ریاستیں

رومانیہ

عراق

فلپائن

فلسطین

کانگو

کینیا

کیمرون

کینیڈا

گنی

گھانا

گیمبیا

میکسیکو

ناروے

نائجیریا

نکاراگوا

نیپال

ہالینڈ

ہانگ کانگ

ہنگری

یوکرین

یونان

آبائی کننبائیف (قازقستان): خصوصی مطالعہ

نثر

ڈان سٹیوینز / ستار طاہر

فن تشہیر

بچپن کی سرحدوں کو پھلانگنے والے نوجوان گدھے نے اپنی بات سے اپنے بوڑھے باپ کو چونکا دیا۔ "کیا کہا تم نے! کیا ہو سکتا ہے" بوڑھے گدھے نے پوچھا۔ "بابا جی مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں" "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کونسا کام کر سکتے ہو بیٹے۔؟" بوڑھے گدھے نے پوچھا۔ "اب میں شیر کی کھال پہن سکتا ہوں کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔ اس طرح ہم ان سب کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمیں ماضی کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔" "تمہیں اس گدھے کا حشر یاد نہیں جس نے شیر کی کھال پہن کر شیر بننے کی کوشش کی تھی۔" بوڑھے گدھے نے کہا "وہ احمق تھا۔" نوجوان گدھے نے جوش سے کہا۔ "ادھر اس نے ہینگنا شروع کیا ادھر لوگوں کو اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔" نوجوان گدھے نے شیر کی کھال میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ وہ شیر ہی نظر آ رہا تھا۔ کھال اوڑھ کر جوان گدھا بڑی شان سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ بوڑھے گدھے نے کہا۔ "اچھی کھال ہے۔ اب ذرا شیر کی طرح دھاڑ کر دکھاؤ۔ "نوجوان گدھے نے اپنا منہ کھولا مگر اس کے منہ سے جو آواز نکلی وہ ہینگنے کی نہ تھی بلکہ کسی طاقتور اور جوان شیر کے دہاڑنے کی آواز تھی۔ بوڑھا شیر اتنا حیران ہوا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور تقریباً" آدھا منٹ تک آنکھیں جھپکاتا رہا۔ "واقعی تم دھاڑ رہے تھے"۔ "ہاں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اصل چیز تشہیر ہوتی ہے' وہ چیز نہیں جس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ میری دھاڑ اصلی ہے اندر سے میں گدھا ہوں تو کسی کو کیا خبر!"

بوڑھے گدھے کی زبان کی نوک پر ایک بات آتے آتے رہ گئی۔ تھوتھا چنا باجے گھنا۔ مگر اس نے چپ رہنے ہی میں بہتری سمجھی اور پوچھنے لگا "مگر میں حیران ہوں کہ تم نے سچ مچ شیر کی طرح دہاڑنا کس طرح سیکھ لیا"۔ "نیا زمانہ نئے اطوار" نوجوان گدھے نے اتراتے ہوئے کہا۔ "میں ایک مدت سے شیروں کا معائنہ اور مطالعہ کر رہا ہوں اب تو کوئی شیر بھی میرے مقابلے میں دھاڑ کر نہیں دکھا سکتا۔"

"غرور کا سر نیچا۔" بوڑھے گدھے کے دل میں یہ الفاظ گونجے اور اور اس بار ہمت کر کے وہ ان الفاظ کو زبان پر لے آیا۔

"بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔" نوجوان گدھے نے اپنے بوڑھے باپ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

"میٹھی گھاس بھی بوڑھوں کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے نیچے جا کر کڑوی ہو جاتی ہے۔" "گھاس کے ذائقہ کا پتہ کھانے سے چلتا ہے بوڑھے گدھے نے کہا" اب باتیں کم اور کام زیادہ دکھاؤ۔"

شیر کی کھال میں مگن اور اتراتا ہوا نوجوان گدھا قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے باہر اسے ایک کتا دکھائی دیا۔ گدھے کو توقع تھی کہ کتا اسے شیر سمجھ کر بھاگ جائے گا مگر کتا بڑی بے نیازی۔ سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

"تم بھاگے کیوں نہیں؟" گدھے نے پوچھا۔

"میں بھلا کیوں بھاگتا۔" کتے نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ "اگر تم دھاڑتے ہوئے یہاں آتے تو پھر میں یقیناً بھاگ اٹھتا" پھر یہ کہ "مجھے بھلا کیا علم کہ تم شیر کی کھال میں گدھے نہیں ہو۔ یہ ایک بار تو ایسا ہو چکا ہے۔ وہ گدھا جس نے شیر کی کھال اوڑھ رکھی تھی مجھے یاد ہے۔"

"یاد آیا۔" گدھے نے کہا۔ "مگر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں" یہ کہہ کر اس نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔

"واقعی تم شیر ہو" یہ کہہ کر کتا دم دبا کر بھاگا۔

دو فرلانگ تک کتا بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ تھک گیا تو ایک جگہ رک کر ستانے لگا پھر اپنے پنجے سے اپنے جسم کو کھجایا اور اپنے آپ سے کہنے لگا "دھاڑا تو وہ شیر کی طرح تھا مگر وہ شیر نہیں تھا۔ گدھا تھا جو شیر کی کھال اوڑھے پھر رہا ہے۔ میں ابھی جا کر اپنے آقا کو خبر کرتا ہوں۔"

کتا تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے مالک کے پاس پہنچا

"آقا! ایک احمق گدھا شیر کی کھال اوڑھے پھر رہا ہے۔ اپنی چھڑی اٹھایئے اور اس کی مرمت کر دیجئے۔"

"یہ تو میں کروں گا ہی" کتے کے مالک نے کہا" میں اس نابنجار کو خوب پیٹوں گا جو اتنی اوچھی اور باسی حرکت کے ساتھ لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے"

"آقا مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" کتے نے خوش ہو کر کہا

کتا اور اس کا مالک تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے جب انہوں نے گدھے کو دیکھا' جو شیر کی کھال میں تھا اور غرا رہا تھا۔

کتے کے مالک نے کہا "گدھے کے بچے ابھی جب تم میری چھڑی کی ضرب سہو گے تو اپنی اصلیت جان جاؤ گے۔"

"میں اسے اپنے دانتوں سے نوچ لوں گا۔" کتے نے کہا

مرد چھڑی لئے آگئے بڑھا۔ اس نے گدھے کو مارنے کے لئے چھڑی اوپر اٹھائی۔ گدھے نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔ شیر دہاڑا اور آگے بڑھ کر مرد کے بازو پر بھی دانت دے مارے۔ مرد خوف سے چیخا۔ چھڑی اس کے ہاتھ سے گری اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ وہ ایک میل تک بھاگتا چلا گیا۔ کتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ دم لینے کے لئے رکا تو کتے نے کہا۔ "آقا آپ کیوں بھاگ رہے تھے' وہ تو گدھا تھا۔"

"بکواس نہ کرو۔ وہ شیر تھا۔ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا' اس نے میرے بازو پر کاٹا بھی ہے۔ خاموش رہو۔ تم نے تو مجھے مروا ہی دیا تھا۔"

"مگر میرے آقا' آپ مجھے بات کرنے کی اجازت تو دیں' میں چند لفظوں میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ شیر نہیں گدھا تھا۔"

"لفظ نہیں' دنیا میں عمل پر نظر رکھی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر کتے کے مالک نے کتے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

سیلی مورگن / ثمینہ

خط

بس ہچکولے لیتی آگے جا رہی تھی اور میرے تھکے بوڑھے سر میں اور بھی درد ہو رہا تھا۔ میں رونا چاہتی تھی لیکن بس میں کبھی لوگ روتے نہیں۔ میں نے اداسی سے اپنی گود میں رکھے بسکٹوں کے پرانے ٹن کی طرف دیکھا۔ "سکاچ شارٹ بریڈ" ۔۔۔ وہ اسے پسند بھی نہیں تھے لیکن اسے ڈبہ پسند تھا۔ اس کے رنگ پسند تھے۔ سو میں نے اسے وہ ڈبہ دے دیا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں کو پونچھا جو آہستہ آہستہ میرے گالوں کو نم کر رہے تھے۔ وہ جا چکی تھی اور میں خود کو بوڑھا' اکیلا اور نامطمئن محسوس کر رہی تھی۔

میری انگلیوں نے ڈبے کے ڈھکن کے کنارے ڈھونڈے اور آہستہ آہستہ ڈبہ کو کھول دیا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو اس نے اس دنیا میں چھوڑا تھا' ایک باریک چاندی کا ہار' ایک بچے کی کچھ تصویریں' اس کا شہریت کا سرٹیفکیٹ اور ایک خط ۔۔۔ اسے یہ خط لکھنے میں کتنی دیر لگی تھی۔ میں یہ سوچ کر مسکرائی۔ اس نے ہر ایک لفظ بار بار پڑھا تھا۔ کہیں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو۔ یہ خط اس کے لئے بہت اہم تھا۔ ہم کبھی کبھی مذاق بھی کرتے تھے اس دن کے بارے میں جب میں یہ خط ایلین کو دوں گی۔۔۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دن اتنی جلدی آجائے گا۔

"میں ہار گئی ہوں۔" میں نے ہار اٹھاتے ہوئے سوچا۔ ہم نے یہ ہار ایلین کی دسویں سالگرہ پر خریدا تھا لیکن ہمیں خبر نہیں تھی کہ اسے کہاں اور کیسے یہ ہار بھجوائیں۔ اور اب ہمیں معلوم تھا کہ ایلین کہاں رہتی ہے لیکن اسے اس ڈبہ اور اس کی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ہار بچے کی تصویر پر رکھ دیا۔

ایلین نے کہا تھا کہ وہ تصویر اس کی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ کسی غلطی کا نتیجہ تھا اور یہ کہ اب میں اسے تنگ کرنا چھوڑ دوں۔ میں اسے تیسری مرتبہ ملنے گئی تھی اور لگتا تھا کہ یہ آخری بار تھی۔ میں نے خط اٹھایا وہ دھندلا اور پرانا ہو چکا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے کھولا اور دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔

"میری پیاری بیٹی ایلین کے نام:

میں یہ خط اس امید پر لکھ رہی ہوں کہ ایک دن تم اسے پڑھ سکو گی اور سمجھ سکو گی کہ کیا ہوا۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے جاننا نہیں چاہتی ہو کیونکہ تمہارے خیال میں تمہیں میں اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ ایسا نہیں تھا۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ کیا ہوا تھا؟

میں صرف سترہ سال کی تھی جب تم ہماری آبادی میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ سب جاننا چاہتے تھے کہ تمہارا باپ کون تھا۔ لیکن میں کچھ نہ کہتی تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ایک سفید مرد تھا۔ تم جو اتنی صاف شفاف تھیں۔ لیکن اس کے دل میں تمہارے یا میرے لئے کوئی پیار نہ تھا۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں تمہاری حفاظت

کروں گی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ تمہاری زندگی مجھ سے بہتر انداز سے گزرے۔

میں بیس سال کی ہوئی تو وہ تمہیں مجھ سے پرے لے گئے۔ Aborigines Protection Board کے مسٹر نیول نے کہا کہ اسی میں تمہاری بہتری تھی۔ اس نے کہا کہ مجھ جیسی کالی ماؤں کو تم جیسی بچیوں کو رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم ہم لوگوں کی طرح پرورش پاؤ۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی لیکن میری ایک نہ چلی۔ یہ تو قانون تھا نا!

میں تیس سال کی ہوئی تو تمہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ کوئی نہ بتاتا تھا کہ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا راز تھا۔ پھر میں نے سنا کہ انہوں نے تمہارا آخری نام بدل دیا ہے مگر مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ نام کیا تھا۔ میں مسٹر نیول سے ملی اور اسے بتایا کہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ ایک سفید گھرانے نے تمہیں اپنا لیا تھا۔ تم سمجھتی تھیں کہ تم بھی سفید نسل سے ہو' مسٹر نیول نے کہا کہ اگر میں تمہیں ڈھونڈ بھی لوں تو تمہیں ہی نقصان پہنچے گا۔

بہت عرصہ میں تمہیں بھول جانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو کیسے بھول جاتی۔ کبھی کبھار میں تمہارے بچپن کی تصویر نکال کر دیکھتی تھی اور اس میں تمہارے چھوٹے سے چہرے کو پیار کرتی تھی۔ میں دعائیں کرتی تھی کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہاری ایک ماں بھی ہے جو تم سے پیار کرتی ہے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ تم کہاں تھیں تم خود بڑی ہو چکی تھیں اور تمہارا اپنا گھر تھا۔ میں نے تمہیں خط لکھنے شروع کر دیئے تاکہ تم تک پہنچ سکوں۔ میرا جی چاہتا تھا تمہیں اور اپنے نواسے نواسیاں دیکھنے کو۔۔۔ لیکن تمہیں تو ان سب باتوں کا پتہ ہے کیونکہ تم میرے خط واپس بھیجتی رہتی تھیں۔۔۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتی۔ نہ ہی تمہارے خلاف میرے دل میں کوئی گلہ شکوہ ہے۔ میں جانتی ہوں تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔

جب تمہیں یہ خط ملے گا تو میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی لیکن میرے ٹین کے ڈبہ میں جو میری محبوب چیزیں ہیں وہ تمہاری ہوں گی۔ میری خواہش ہے کہ ایک دن تمہیں احساس ہو کہ تم کون ہو۔ واقعی کون ہو۔ اور تم میرے پیارے لوگوں سے دوستی کرو۔۔۔ کیونکہ تمہاری اساس۔ بنیاد تو یہ لوگ ہی ہیں۔

یہ خط تمہیں جو خاتون دیں گی ان سے نرمی کا سلوک کرنا۔ وہ تمہاری خالہ ہیں۔ تمہاری پیار کرنے والی ماں۔"

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب میں نے خط دوبارہ تہہ کر کے ٹین کے چھوٹے ڈبہ میں رکھا۔ میں نے پوری کوشش کر دیکھی تھی لیکن کوئی حل نہ تھا۔ کوئی فائدہ نہ تھا۔ اب میں تھک گئی تھی۔

ہمارے خاندان میں نیلی سب سے زیادہ ہمت والی تھی۔ وہ کبھی ہمت نہ ہارتی تھی۔ اسے ہمیشہ یقین تھا کہ ایک دن ایلین گھر واپس آجائے گی۔

میں نے ڈبہ کا ڈھکن اچھی طرح سے بند کیا اور کھڑکی سے دور جاتی سڑک کی طرف دیکھا۔ اچھا ہی تھا کہ نیلی اس دنیا میں نہیں تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ کم از کم اسے تو خبر نہیں تھی کہ حالات نے کیا رخ اختیار کیا تھا۔۔۔ پھر اچانک میں نے اس کی آواز سنی۔ بہت نزدیک اور دھیرے سے اس نے کہا "تم ہمیشہ بہت جلدی ہمت ہار جاتی ہو۔"

"بالکل بھی نہیں" میں نے آہستہ سے کہا۔

اب میں نہ جانتی تھی کہ کیا کروں۔ نیلی ٹھیک تو کہتی تھی۔ وہ لڑکی ہمارا اپنا خون ہے۔ اسے میں کیسے اتنی

آسانی سے اپنی زندگی سے نکل جانے دوں۔ میں نے ڈبے کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اور اچانک ہی میں خود کو پہلے سے زیادہ مطمئن او ہمت ور محسوس کر رہی تھی۔ میں ایک مرتبہ اور کوشش کروں گی۔ میں نے خود سے کہا۔ میں ایک نئے لفافے میں یہ خط بھجواؤں گی۔ شاید وہ پڑھ ہی لے اسے۔"

میں باہر باغ میں تھی جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ مجھے یقین تھا جب تک میں فون کے نزدیک پہنچوں گی وہ بند ہو چکا ہو گا۔ آجکل مجھے پچھلی سیڑھیوں سے چڑھنے میں دیر لگتی ہے "ہیلو" میرا سانس پھول رہا تھا جب میں نے ریسیور اٹھایا۔

"آنٹی بیسی۔۔؟"

"کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ایلین ہوں۔۔"

"ایلین۔۔۔؟" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دو ماہ پہلے اسے وہ خط پوسٹ کیا تھا۔

"کیا واقعی ایلین ۔۔۔ یہ تم ہو۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ واقعی میں ہوں۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں۔۔۔؟"

"ہاں۔ جب بھی تمہارا جی چاہے"

"میں کل آؤں گی۔۔ اور آنٹی ۔۔۔ اپنا خیال رکھیں۔۔"

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے جب میں نے ریسیور واپس رکھا۔ کیا میں نے ٹھیک سنا تھا۔ کیا اس نے واقعی کہا تھا "اپنا خیال رکھیں' آنٹی" میں تیزی سے اپنے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے آنسو پونچھے۔

"میں کیوں نہ آنسو بہاؤں" میں نے اونچی آواز میں خالی کمرے میں کہا۔ "میں بس میں نہیں بیٹھی ہوں۔" اور مجھے یوں لگا جیسے نیلی میرے بہت قریب تھی۔ "میری بھینا" میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "سنا تم نے۔؟ ایلین کل یہاں ہو گی۔"

"سنا تم نے بھینا؟ ایلین گھر واپس آ رہی ہے۔۔"

جیمز جوائس/ صغیر ملال

آئلین

وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی شام کی تاریکی کو شہر کی گلیوں میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر کھڑکی کے گرد آلود پردے سے لگا تھا اور اس کی ناک دھول کا بوجھل پن محسوس کر رہی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔

گلیاں سنسان تھیں۔ کچھ دیر پہلے سامنے سے ایک اجنبی گزرا تھا۔ جب وہ سڑک پر چلتا تو اس کے جوتے آہٹ پیدا کرتے اور جب وہ کچے راستے پر اترتا تو یکلخت خاموشی سی چھا جاتی۔ جہاں اب سڑک اور مکانات تھے وہاں پہلے ایک میدان تھا۔ شام کے وقت اس میدان میں محلے کے بچے کھیلتے تھے۔ دن ڈھلے تمام گھروں کے بچے وہاں جمع ہو جاتے۔ جارج اور اس کی چھوٹی بہنیں' استانی جی کے بچے' لوی اور اس کا معذور بھائی جسے دوسرے بچے اپنی چیزوں کی نگرانی سونپ دیتے تھے' گلابی رنگت والا سوئی جو مذاق میں "مس سوئی" کہلاتا تھا اور توتلی کیتھرین جو بولتے میں منہ سے جھاگ اڑاتی تھی کسی دن کھیلنے میں دیر ہو جاتی تو پاپا ان کا پیچھا کرتے میدان تک آ جاتے۔ اندھیرا اچھانے کے باوجود گھر نہ لوٹنے پر ان کو ڈانٹتے۔ پاپا کو آتے دیکھ کر وہ سر جھکائے گھروں کی جانب بھاگنا شروع کر دیتے۔ بعد میں اس میدان میں سرخ اینٹوں اور چمکدار چھتوں والے مکانات تعمیر ہو گئے۔

اس زمانے میں سب خوش رہا کرتے تھے۔ پاپا اس وقت اتنے سخت مزاج نہیں تھے اور پھر امی بھی زندہ تھیں۔ اب ان باتوں کو زمانہ گزر چکا تھا۔ وہ بڑی ہو چکی تھی۔ اس کے بھائی بڑے ہو چکے تھے امی کو فوت ہوئے کئی برس گزر گئے تھے۔ اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہو چکے تھے۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ اب وہ بھی جا رہی تھی' گھر چھوڑ رہی تھی۔

گھر! اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں اور کمرے کی چیزوں کو حسرت سے دیکھا۔ وہ ان چیزوں کو جھاڑتے پونچھتے جوان ہوئی تھی۔ صفائی کرتے ہوئے وہ اکثر سوچتی تھی کہ روزانہ اتنی دھول کہاں سے آتی ہے؟ شاید اب وہ ان چیزوں کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائے۔ میز کرسیاں' تپائیاں اور ٹوٹا ہوا ساز جس کے عین اوپر اس عالم دین کی تصویر ٹنگی تھی جس کا نام اسے آج تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

"آج کل ان کا قیام فار لینڈ میں ہے۔" اس کا باپ مہمانوں کو یہ تصویر دکھاتے ہوئے ہمیشہ یہی الفاظ دہراتا تھا۔

اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں سے دور چلے جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔ ہر چند کہ گھر میں اسے کئی سہولتیں حاصل تھیں لیکن اس کے باوجود ------ وہ چلی جائے گی۔ وہ کیوں نہ جائے یوں ہی کڑھتے رہنا کیا اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے؟ کام کرو اور زندہ رہو۔ زندہ رہو اور کام کرو۔ کیوں؟ خاندان کو سنبھالنا صرف ایک فرد کی ذمہ داری تو نہیں ہوتی۔ کوئی کچھ بھی کہے وہ چلی جائے گی۔

مسز وائٹ کہیں گی "دیکھا؟ چلی گئی نا! میں جانتی تھی۔ وہ ٹکنے والی نہیں ہے۔" لیکن مسز وائٹ کے کچھ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کسی کے بھی کچھ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس کے نئے گھر میں حالات بہت مختلف ہوں گے۔ وہ ملک اپنی روشن راتوں اور بارونق شاہراہوں کے لیے مشہور ہے۔ وہاں وہ شادی شدہ زندگی گزارے گی۔۔۔ وہ آئلین' ایک معزز خاتون۔۔۔۔ لوگ اس کی عزت کریں گے۔ کوئی خود کو محض خاندان کی خدمت کے لیے کیسے وقف کر دے؟ اس کی ماں کو عمر بھر کی قربانی کا کیا صلہ ملا تھا؟ اب وہ خود پچیس سال کی ہو چکی تھی۔ مگر اب بھی اس کا باپ جب چاہے اسے ڈانٹ دیتا تھا۔ مہمانوں کے سامنے شور کرتا تھا۔ اسے اجڈ اور پھوہڑ کہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا دل اچانک زور زور سے کیوں دھڑکنے لگتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں پسینے سے کیوں بھیگ جاتے ہیں۔ اسے اس کے باپ نے اس حال تک پہنچایا تھا۔ اس کی ماں نے بھی انتہائی ابتری کے عالم میں زندگی گزاری تھی اور اب وہ بھی۔۔۔۔ وہ۔ آئلین۔ پاپا کو بچپن ہی سے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کے دونوں بھائیوں سے انہیں کسی حد تک لگاؤ تھا مگر اس کی تو وہ صورت سے چڑتے تھے۔ اب بھی وہ اکثر کہتے تھے کہ اگر انہیں اس کی مرحومہ ماں کا خیال نہ ہو تو وہ اس کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھنا بھی گوارا نہ کریں۔ اس کے دونوں بھائی بھی گھر چھوڑ چکے تھے۔ بڑا تو دل کے پیدائشی نقص کے باعث دنیا ہی چھوڑ گیا تھا اور چھوٹا کسی غیر ملک میں عمارتوں کی اندرونی آرائش کا کام کر رہا تھا۔

مالی مسائل ان تمام پریشانیوں سے بڑھ کر تھے۔ اس کا بھائی ہر ماہ ایک معقول رقم بھجواتا تھا مگر منی آرڈر پاپا وصول کرتے تھے اور پاپا سے کوئی پیسے طلب کرتا تو وہ بدکلامی پر اتر آتے۔ خاص طور پر اسے گھر کا خرچ دینے سے وہ قطعی منکر ہو جاتے۔

"تمہاری کھوپڑی میں تو دماغ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔" وہ کہتے۔ "ذہین لوگ پیسہ کماتے ہیں اور ذہین لوگ ہی اسے خرچ کرنا بھی جانتے ہیں۔ احمقوں کو خون پسینے کی کمائی سے دور رکھنا چاہئے۔"

تھوڑا بہت وہ خود بھی کماتی تھی۔ امیر گھرانے کے دو بچے اس کی نگہداشت میں تھے۔ بہلانے اور سلانے سے لے کر اسکول بھیجنے وہ ان کے ہر کام کی ذمہ دار تھی۔ مگر اس کام سے جو آمدنی ہوتی وہ گھر کا خرچ چلانے میں صرف ہو جاتی۔ کھانے میں اگر گوشت یا سبزی کی کمی رہ جاتی تو پاپا آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔ وہ گھر کو قائم رکھے ہوئے تھی اور گھر قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ اب جبکہ وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی اسے گھر سے اپنائیت بھی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔۔ لیکن بہرحال وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

اسے فرینک کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ فرینک' فراخ دل اور ہنس مکھ لڑکا۔ اسے دیکھ کر زندگی کے مثبت پہلوؤں کا خیال آتا تھا۔ روشنی' محبت' قہقہے اور خوش دلی کی محفلیں۔ فرینک بحری جہاز پر کام کرتا تھا اور دور دراز شہروں کے قصے اس کی نوک زبان پر رہتے تھے۔ وہ دنیا بھر کے ملکوں اور شہروں کی سیر کر چکا تھا۔ اب اس کا سمندر پار گھر بسانے کا ارادہ تھا۔ گذشتہ چند برسوں سے جب بھی فرینک کا جہاز بندرگاہ پر لگتا وہ ضرور اس سے ملاقات کرنے شہر آتا۔ پہلی مرتبہ اس نے فرینک کو ان بچوں کے گھر دیکھا تھا جن کی نگہداشت پر وہ مامور تھی۔ فرینک تمام گھر والوں کو اس جزیرے کے قصے سنا رہا تھا جہاں آدم خور بستے تھے۔ اس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کے باوجود سب حیرت کا اظہار کر رہے تھے' ہنس رہے تھے۔ اس دن کے بعد وہ ایک دوسرے کو گھر سے باہر ملنے لگے تھے۔ لیکن ایک دن پاپا نے انہیں تفریح گاہ میں گھومتے دیکھ لیا۔

"میں ان جہاز رانوں کی عادتوں سے خوب واقف ہوں۔" پاپا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "آئندہ میں

تمہیں اس کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

بعد میں ان دونوں نے اس بدلی ہوئی صورتحال کا تجزیہ کیا تھا اور نہایت دانشمندی سے یہ پس ماندہ شہر اور اس کا گھٹا ہوا ماحول چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام گہری ہو گئی تھی۔ اس کی گود میں پڑے دونوں لفافے دھندلا گئے تھے۔ ایک خط اس کے بھائی کے نام تھا۔ دوسرے خط میں اس نے پاپا کو سب کچھ صاف صاف بتانے کی کوشش کی تھی۔ پاپا کچھ عرصے سے تیزی سے بوڑھے ہو رہے تھے۔ ممکن ہے وہ اسے یاد کریں۔ جب سے ان کا سر جھکنے لگا تھا۔ ان کے لہجے کی تختی میں بھی کچھ کمی آگئی تھی۔ گذشتہ دنوں وہ بیمار ہوئی تھی تو اپنی عادت کے برعکس انہوں نے ایک حد تک اس کی تیمارداری بھی کی تھی۔ انہیں اظہار ہمدردی کرتے دیکھ کر اسے بچپن کا وہ دن یاد آگیا تھا جب وہ سب چھٹی کا دن گزارنے دریا کے کنارے گئے تھے۔ اس دن پاپا نے بچوں کو ہنسانے کے لیے آوازیں بدل بدل کر لطیفے سنائے تھے اور مزاحیہ انداز میں رقص بھی کیا تھا۔

اس کی روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا لیکن وہ اسی طرح گرد آلود پردے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ تاریکی چھانے کے باعث اب اسے دھول کے ذرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ دور کوئی بانسری پر لوک دھن بجا رہا تھا۔ جس روز اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا اس روز بھی کوئی بانسری پر لوک دھن بجاتا ان کے دروازے پر آیا تھا۔ گرد و نواح کے دیہات سے اکثر ایسے فن کار آتے تھے جو عوامی سازوں کی سنگت میں بھیک مانگتے تھے۔ اس دن وہ سب ماں کی بیماری کے سبب بانسری کی آواز سے پریشان ہو گئے تھے۔ پاپا نے دروازہ کھول کر موسیقاروں کو ڈانٹا تھا۔

"گنوار دیہاتیو بھاگ جاؤ ورنہ تمہارے ساز توڑ دوں گا۔"

مگر آج بانسری کی آواز اسے بہت اداس کر رہی تھی۔ اسے ماں سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ وہ ہر حالت میں گھر کو بکھرنے سے بچائے گی۔۔۔ وہ۔ آئلین۔۔۔ اسے ماں کی بے لوث زندگی اور اس کے انجام کا بھی خیال آیا۔ گھر والوں کے لیے اس کا ایثار اور ذاتی خوشیوں کی قربانی جو بالآخر پاگل پن پر ختم ہوئی۔ مرتے وقت ماں ایسے بے ربط جملے بولنے لگی تھی جو ایک مدت تک انہیں یاد آتے اور اداس کرتے رہے تھے۔

آئلین گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجات۔۔۔۔۔ اسے ہر حالت میں اس ماحول سے نجات حاصل کرنی ہے' فرینک اسے بچا لے گا۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ خوش رہنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ سب خوش رہتے ہیں۔ وہ کیوں خوش نہ رہے؟؟ فرینک اسے خوشی دے گا۔

ہنگامہ خیز ہجوم کے وسط میں اس کا وجود قطعی غیر نمایاں تھا۔ فرینک نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے بحری سفر میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مسلسل کچھ بتا رہا تھا۔ بندرگاہ پر خاکی رنگ کے بکسوں اور بستروں والے فوجی سپاہیوں کا جمگھٹا تھا۔ وقفے وقفے سے اسے ہجوم کے درمیان پہاڑ جیسے جہاز کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرینک کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اسے اپنے اندر کوئی قدیم اور مضبوط چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ اسے ہمت دے اور سیدھا راستہ دکھائے۔ دعا مانگنے کے بعد بھی اس کے ہونٹ بہت دیر تک لرزتے رہے۔ اچانک فضا جہاز کی سیٹی سے گونج اٹھی اور اس کا دل تیزی

سے دھڑکنے لگا۔

"آؤ" فرینک نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

اس کے ہاتھ پاؤں سرد پسینے سے بھیگ گئے۔ سامنے سمندر تھا۔ فرینک اسے گہرے پانیوں میں لے جا رہا تھا۔ وہ اسے ڈبو دے گا۔

"آؤ!" اس بار فرینک چیخ پڑا۔

"نہیں۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے لوہے کا جنگلا تھام لیا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

"آئلین! آئلین!"

"نہیں!" سلاخ پر گرفت کی سختی سے اس کی انگلیوں کے جوڑ زرد پڑنے لگے۔ فرینک اس کا ہاتھ چھوڑ کر جہاز کی سمت بھاگا مگر آخری کوشش کے طور پر دوبارہ اس کے نزدیک آگیا۔ کسی نے جہاز پر سے فرینک کو ڈانٹا مگر وہ بچوں کی طرح اس کی منتیں کرنے لگا۔ آئلین خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ یکلخت فرینک چونک گیا۔ آئلین کا چہرہ کسی مویشی کی طرح جذبات سے یکسر عاری تھا' اس کی آنکھوں میں نہ کوئی الوداعی کیفیت تھی نہ کوئی وابستگی تھی' نہ ہی کوئی پہچان تھی۔

اگنازیو سلون / ستار طاہر

بیٹی جیسی گڑیا

بیٹی کی فرمائش آج بھی پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
کئی روز سے وہ جب گھر سے روزگار کی تلاش میں نکلتا تو اس کی پوری کوشش ہوتی کہ کسی طرح اس کی مڈ بھیڑ اپنی پانچ برس کی بیٹی سے نہ ہو جائے۔ بہت دن پہلے اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لئے ایک ایسی خوبصورت گڑیا خرید کر لائے گا جو اس کی طرح خوبصورت ہو گی۔ معصوم بچی نے پوچھا تھا۔
"ابو میں خوبصورت ہوں"
"ہاں بیٹے تم بہت خوبصورت ہو"
حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کی بیٹی خاصی بدصورت تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی' ناک بہت پھیلا ہوا اور کان بڑے' ہونٹ موٹے اور ٹیڑھے۔ ٹھوڑی نیچے کو جھکی ہوئی' ہاتھ پاؤں بھی ایسے ہی تھے۔ رنگ بھی صاف نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بچی کی پیدائش کے بعد کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی کی بدصورتی کم ہو جائے گی' لیکن معاملہ اس کے الٹ ہوا اور وہ جوں جوں بڑی ہوئی اس کی بدصورتی نمایاں ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنی بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی بیٹی کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ بدصورت ہے۔ بلکہ اس کی تربیت ایسے انداز میں کرے کہ اس کے ذہن میں کبھی یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ بیوی یہ ذمہ داری پوری طرح نباہ رہی تھی۔ برے دن آتے ہیں تو پوچھ کر نہیں آتے......وہ جس فیکٹری میں کام کرتا تھا ایک تو وہ پہلے ہی خسارے میں جا رہی تھی۔ پھر اسے آگ لگ گئی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ فیکٹری کے مالک نے جان بوجھ کر آگ لگوائی تھی۔ تاکہ ایک تو بیمہ کی بھاری رقم وصول کر سکے اور خسارے کا کام چھوڑ کر کوئی نیا کام کرے اور مزدوروں سے بھی جان چھوٹ جائے۔ کئی مہینوں سے وہ بے کار تھا۔ جو چار پیسے برے دنوں کے لئے بچائے تھے وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ اب حالات ایسے رخ پر آ گئے تھے کہ وہ کوشش کرتا کہ اسے روزانہ کوئی کام مل جائے تاکہ جب شام کو گھر آئے تو اس کی جیب میں کچھ پیسے ہوں اور ہاتھ میں کھانے پینے' روز مرہ کی ضرورتوں سے بھرا ہوا تھیلا۔ اکثر اسے کوئی کام نہ ملتا' پورے شہر میں بے روزگاری عام تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ حالات کب تبدیل ہوں گے۔
ان حالات میں اس کی بیٹی نے گڑیا کی ضد شروع کر دی۔ وہ اب گلی محلے میں کھیلنے چلی جاتی تھی۔ اس کی ماں کو خیال تھا کہ ان کی بیٹی میں خاصا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ ویسے بھی گلی محلے کے بچے بھی کوئی ایسے گلفام نہیں تھے کہ وہ ان کی بیٹی کی بدصورتی کا مذاق اڑاتے۔ ایک دن وہ گلی کی کسی لڑکی کے پاس ایک گڑیا دیکھ آئی۔ اب وہ بضد تھی کہ اسے بھی ایسی ہی گڑیا خرید کر دی جائے۔ وہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کو اپنے برے حالات کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔ اور اگر بتاتے بھی تو شائد یہ بات ان کی بچی کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس نے اپنی بیٹی کا دل

رکھنے کے لئے ایک گڑیا .... خوبصورت گڑیا لا دینے کا وعدہ کر لیا۔ بیٹی جیسی خوبصورت گڑیا لا کر دینے والا جملہ اس کے منہ سے ایسے ہی نکل گیا تھا۔ لیکن بیٹی کا جواب سن کر اسے تعجب ہوا تھا "ابو کیا میں خوبصورت ہوں" اکثر جب وہ کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا تو یہ جملہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا "کیا میری بیٹی کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں بلکہ بدشکل ہے؟" وہ سوچتا .... اور کوئی جواب نہ دے پاتا۔ اصل میں وہ اس مسئلے پر قصداً" سوچتا ہی نہیں تھا۔ یہ خیال تو خود بخود اس کے ذہن میں آجاتا تھا۔

اس کی بیٹی کی ضد میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ وہ روتی، خفگی اور کہتی مجھے گڑیا چاہیے ---- مجھے گڑیا لا کر دو۔

ہر روز جھوٹا وعدہ کر کے تسلی دے کر وہ خود کو بھی خاصا پریشان کر رہا تھا۔ سوچتا وہ اسے کیوں بتا نہیں دیتا کہ میں ابھی اس کے لئے گڑیا نہیں خرید سکتا۔ لیکن یہ بتانے کی اس میں جرات کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ جب وہ کام پر جانے لگتا تو وہ اس کے سر ہو جاتی۔ آج گڑیا لے کر آنا۔ خالی ہاتھ نہ آنا۔ اس نے بیوی سے مشورہ کیا اور صبح اپنی بیٹی کے جاگنے سے پہلے ہی روزی روزگار کی تلاش میں جانے لگا تاکہ بیٹی سے جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

اس روز اسے کئی دنوں کے بعد کام مل گیا۔ ایک دوکاندار اپنی دکان کی توسیع اور مرمت کے بعد اسے نئے سرے سے ترتیب دے رہا تھا' اسے کچھ مزدوروں کی ضرورت تھی۔ دو دن اس نے وہاں کام کیا اور اچھے خاصے پیسے اسے مل گئے۔ جب دوسرے دن کام ختم ہونے کے بعد اسے اچھی خاصی رقم ادا کی گئی تو اس نے سوچا آج میں گڑیا خرید کر لے جاؤں گا۔

اس نے کھلونوں کی دکانوں پر ایک مناسب' اچھی گڑیا کی خوب جانچ پڑتال کی۔ ہر گڑیا جو اچھی تھی بہت مہنگی تھی کچھ گڑیاں تو ایسی بھی تھیں جو اتنی مہنگی تھیں کہ وہ اپنی پوری کمائی ادا کر کے بھی نہ خرید سکتا تھا۔ تین چار دکانوں پر مختلف قیمتوں کی گڑیاں دیکھنے کے بعد وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب کتنے دنوں کے بعد کام ملے گا ان پیسوں سے وہ چند دنوں کے لئے گھر میں راشن بھی ڈال لینا چاہتا تھا۔ تاکہ گھر میں فاقے کی نوبت نہ آئے۔ بہت حساب کتاب لگا کر اس نے آخری فیصلہ کر لیا۔ آٹھ یا دس روپے سے زیادہ قیمت کی گڑیا نہیں خرید سکتا تھا۔ اس کی بچی کو بھی گڑیا سے کہیں زیادہ خوراک کی ضرورت تھی' گڑیا کا کیا تھا' اچھے دن آنے پر' مستقل ملازمت ملنے پر وہ اسے پھر گڑیا خرید کر دے سکتا تھا۔ اس نے جو گڑیا خریدی وہ معمولی تھی۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی۔ بہرحال اس نے گڑیا خریدی' لفافے میں رکھی اور چل پڑا۔

گھر جانے سے پہلے اس نے ضروری سامان خریدا ایک بڑا تھیلا اس سامان سے تقریباً" آدھا بھر گیا۔ اس کے بعد وہ ٹرام میں سوار ہو کر گھر جلدی پہنچنا چاہتا تھا۔ ٹرام میں بہت رش تھا۔ کسی نے دھکا دیا تو بڑا تھیلا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ادھر ٹرام رکی اور لوگ اس کے تھیلے کو روندتے اترتے چڑھتے گئے۔ جب ٹرام چلی تو بڑی مشکل سے وہ اپنا تھیلا اٹھانے میں کامیاب ہوا۔

وہ گھر پہنچا.... سامان کا تھیلا دیکھ کر اس کی بیوی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

ایک ایک کر کے وہ چیزیں نکالنے لگی۔ بیٹی بھی پاس بیٹھی تھی وہ اپنی بیٹی کو اچانک گڑیا دے کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ تھیلے کے آخر میں سارے سامان کے نیچے وہ گڑیا والا لفافہ تھا۔

"بوجھو تو میں کیا لایا ہوں"

"گڑیا' گڑیا" وہ خوشی سے چیخنے لگی۔

اس نے لفافے سے گڑیا نکالی

پلاسٹک کی گڑیا سامان کے بوجھ اور لوگوں کے قدموں کے نیچے روندے جانے سے بالکل پچک گئی تھی۔ ہونٹ ٹیڑھے میڑھے اور موٹے ہو گئے تھے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ناک بوجھ سے پھیلی ہوئی تھی .... گڑیا کا وجود دوہرا تہرا ہو گیا تھا۔ وہ حیرت اور قدرے تاسف سے گڑیا کو دیکھنے لگا۔

اس کی بیٹی نے جلدی سے وہ گڑیا چھین لی ...

اسے دیکھا پھر ہنسی .... اس کی ہنسی بے ریا اور معصوم تھی....

"بالکل میرے جیسی ہے۔" وہ بولی "ابو شکریہ۔ آپ میرے جیسی خوبصورت گڑیا لائے۔"

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو آنسو چھپانے کے لئے اٹھ کر جا رہی تھی۔

لیوپولڈو لگونس / محمود احمد قاضی

بندر

میں نے اس بندر کو ایک سرکس کی نیلامی کے مال میں سے خریدا تھا جو کہ دیوالیہ ہو گئی تھی۔
سب سے پہلے اس تجربے کا خیال میرے ذہن میں اس وقت آیا جب میں ایک سہ پہر کو کسی مضمون کی یہ سطور پڑھ رہا تھا کہ "جاوا کے مقامی باشندوں کے مطابق بندروں کے نہ بولنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بول نہیں سکتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی وہ بولنا چاہتے ہی نہ تھے۔۔۔ لکھا تھا "وہ بولنے سے اس لئے پرہیز کرتے ہیں تاکہ لوگ ان سے بے گار نہ لے سکیں۔"
اس خیال کو پہلے پہل میں نے سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن بعد میں جب علم بشریات کی یہ تھیوری میرے سامنے آئی تو میں اس میں منہمک ہو گیا۔۔۔ اس تھیوری کے مطابق بندر انسان ہی تھے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے بولنا ترک کر دیا تھا۔ اس بنا پر ان کے بولنے والے اعضا اور دماغ کے مرکز کے درمیان جو کہ گفتگو کو کنٹرول کرتا ہے تعلق اتنا کمزور پڑ گیا کہ پھر یہ حقیقت میں معدوم ہی ہو گیا۔
ظاہر ہے اگر اس بات کو سامنے لایا جائے تو وہ عجیب و غریب خصوصیات جو بندروں کو ایک غیر معمولی مخلوق کے طور پر پیش کرتی ہیں ان کی فوری وضاحت ہو سکے گی۔ لیکن اس کا واحد ممکنہ ثبوت اس وقت ہی مل سکتا ہے جب کسی بندر کو بولنے پر مجبور کر دیا جائے۔
اسی دوران میں نے دنیا کا سفر کرتے ہوئے اپنے بندر کو اپنی مہمات اور آوارہ گردیوں میں قریب سے قریب تر رکھا تھا۔ یورپ میں اس نے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اگر میں چاہتا تو اسے ایک نیم انسانی چیز کے طور پر پیش کر سکتا تھا۔ لیکن ایک معتبر بزنس مین ہونے کے ناتے سے مجھ سے ایسا کوئی احمقانہ فعل سرزد نہیں ہو سکتا تھا۔

بندروں کے بولنے کی صلاحیت پر پختہ یقین رکھنے کی بناء پر میں نے کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل کئے بغیر ساری ببلیو گرافی کو چھان مارا۔ صرف ایک بات میں یقینی طور پر جانتا تھا کہ بندروں کے نہ بولنے کی کوئی سائنسی توجیح موجود نہ تھی۔ اس ضمن میں غور و خوض کرنے اور مطالعہ کرنے میں مجھے پانچ سال لگ گئے۔
زور۔۔۔ پتہ نہیں اس کا یہ نام کس نے رکھا تھا حتیٰ کہ اس کا سابقہ مالک بھی اس کے اس نام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔۔۔ بہرحال زور یقیناً" ایک شاندار جانور تھا۔ سرکس میں اس نے جو تربیت حاصل کی تھی اگرچہ وہ محض مسخرے پن تک محدود تھی، لیکن اس کی وجہ سے اس میں جو صلاحیت پیدا ہوئی تھی اس نے مجھے اس بظاہر لایعنی سی تھیوری کو اس پر آزمانے کی طرف مائل کیا تھا۔ مزید یہ کہ جمپنزیوں کے بارے میں جیسے کہا جاتا ہے (اور زور بھی جمپنزی ہی تھا) کہ وہ بندروں کی ایک اعلیٰ ترین نسل ہے اور اس کی دماغی صلاحیت بھی سب سے اچھی ہوتی ہے، تو اسی حوالے سے میری کامیابی کے روشن امکانات موجود تھے۔ جب بھی میں اسے

چلتے ہوئے دیکھتا تو وہ اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھ کر اپنے دونوں پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو کر چلتا نظر آتا وہ اس وقت ایک نشے میں دھت ملاح کی طرح لگتا۔۔۔ یہ خیال کہ وہ کمزور دماغ والا ایک انسان ہی ہے میرے اندر جڑ پکڑتا گیا۔

اصل میں اس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ موجود نہیں کہ کیوں ایک بندر الفاظ کی صحیح ادائیگی سے قاصر رہتا ہے۔ اس کی فطری گفتگو یعنی اس کی چیخوں کا وہ سلسلہ جس سے وہ اپنے ہم جنسوں سے ہم کلام ہوتا ہے بہت مختلف النوع ہے۔ اس کا نرخرہ اگرچہ انسانوں سے مختلف ہے لیکن یہ ایک توتے کے نرخرے جتنا مختلف ہرگز نہیں جبکہ ایک توتا بول بھی سکتا ہے' اور جہاں تک اس کے دماغ کا تعلق ہے اگر اس کا موازنہ طوطے کے دماغ سے کیا جائے تو تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایک احمق شخص کا دماغ بھی ناپختہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سارے احمق ایسے ہیں جو کہ لفظوں کو ادا کر لیتے ہیں۔ جہاں تک بروکا کی پیچیدہ ترجیح کا تعلق ہے تو اس کا انحصار بے شک دماغ کی مکمل نشوونما پر ہے اور مزید یہ کہ اس بات کو صحیح طور پر ثابت نہیں کیا جا سکا کہ یہی حصہ گفتگو کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگرچہ اعضا کے لحاظ سے یہی ممکنہ حصہ ہے لیکن بہرحال اس کے برعکس بھی کچھ غیر متنازعہ دلیلیں ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ جس طرح ایک بندر کئی اور طرح کی بڑی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے' اس میں سیکھنے کی لگن ضرور ہوتی ہے جیسے کہ اس کے چیزوں کی نقل کرنے کے رجحان سے اظہار ہوتا ہے۔ اس کی یادداشت دوسری حرکات و سکنات' ایک تاثر کو ہنرمندی سے اپنے اوپر طاری کر لینے کی صلاحیت نسبتاً" ایک انسانی بچے سے بہتر ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بندر ایک اعلیٰ موضوعی حوالے سے ایک ہونہار نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

مزید یہ کہ میرے والا بندر تو نوجوان تھا اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ایک بندر کی نوجوانی کا زمانہ اس کی ذہانت کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس طریق کار میں سب سے بڑی مشکل مجھے اسے الفاظ کے سکھانے کے سلسلے میں درپیش تھی۔ میں اپنے پیش رووں کی بے نتیجہ کاوشوں سے واقف تھا۔ یہاں مجھے اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ اپنے پیش رووں کی مکمل اہلیت اور صلاحیت اور پھر ان کی تمام کوششوں کے بے سود نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا یقین ایک سے زیادہ مرتبہ متزلزل ہوا۔ لیکن ان تمام حالات و واقعات کے ہوتے ہوئے بھی یہ موضوع مجھے اس نتیجے پر پہنچاتا رہا' کہ سب سے پہلا قدم ایک بندر کے آواز پیدا کرنے والے اعضا کی نشوونما کے ضمن میں اٹھانا چاہیے۔

بے شک یہ وہ طریقہ ہے جو کوئی شخص تلفظ کی صحیح ادائیگی کے نتائج حاصل کرنے سے پہلے گونگوں بہروں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس طریقے کے بارے میں ابھی میں نے سوچنا ہی شروع کیا تھا کہ میرے ذہن میں گونگوں بہروں اور بندروں کی مشابہت کا سوال ابھرا۔ سب سے پہلے تو ان کی نقل کرنے کی غیر معمولی استعداد تھی جو کہ الفاظ کی ادائیگی کا نعم البدل ہو سکتی تھی اور اس بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ بولنے میں ناکامی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سوچنے میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سوچنے کی قوت کے زائل ہونے کی وجہ سے بولنے کی استعداد بھی کم ہو جائے۔ پھر کچھ اور خصوصیات بھی ہیں جو کہ بہت خاص اور عجیب و غریب ہیں یعنی کام میں ان کی مستعدی' وفاداری اور لن کا حوصلہ۔۔۔ ان کی ان صلاحیتوں کو دو طریقوں سے بڑھایا جا سکتا ہے' جن کا باہمی تعلق کرتبوں میں توازن کے ہنر اور گھبراہٹ کے خلاف ان کی مدافعت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

میں نے اپنے بندر کو ایک گونگا بہرہ سمجھ کر زبان اور ہونٹ کی پریکٹیکل مشقوں سے کام کے آغاز کا فیصلہ کیا۔

پھر اس کے بعد اس کی قوت سماعت' اس کے چھونے کی حس کی ضرورت کے بغیر میرے اور اس کے درمیان براہ راست رابطے کا وسیلہ بن سکتی تھی۔ یہ بات قاری کے ذہن میں رہے کہ اس طرح میں یہ مثبت پلان تیار کر رہا تھا۔

خوش قسمتی سے بندروں کی تمام اقسام میں سے چمپینزی کے ہونٹ بہتر طور پر حرکت کر سکتے ہیں اور خاص طور پر زور جو کہ گلے کی خرابی کا شکار رہ چکا تھا اپنے منہ کو پورے کا پورا کھول لینے کا فن جانتا تھا تاکہ اس کا معائنہ ہو سکے۔ پہلے ہی معائنے نے جزوی طور پر میرے شبہات کی تائید کر دی' اس کی زبان دور پیچھے اس کے منہ میں بے حرکت پڑی رہتی تھی سوائے اس وقت کے جب اسے کوئی چیز نگلنا ہوتی تھی۔ مشق کے نتائج جلد ہی برآمد ہوئے کیونکہ صرف دو ماہ بعد وہ جان گیا تھا کہ مجھے چاٹنے کے لئے اسے کیسے زبان باہر نکالنی چاہیے۔ یہ پہلا رابطہ تھا جو اس نے کسی چیز کے تصور اور زبان کو حرکت دینے کے درمیان قائم کیا ایک ایسا تعلق یا رابطہ جو کہ اس کی جسمانی ساخت کے عین مطابق تھا۔

ہونٹوں نے بہت زیادہ مشکلات پیدا کیں۔ حتیٰ کہ ان کو پھیلانے کے لئے ایک موچنے کا استعمال ضروری تھا۔ لیکن اس نے میرے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات اور اس عجیب کام کی اہمیت کے پیش نظر میرے ساتھ خوب دلجمعی سے تعاون کیا۔ جب میں ایسی حرکات کی مشق کرتا جن کی اسے نقالی کرنا ہوتی تھی تو وہ اپنا بازو پیچھے لے جا کر پیٹھ کو کھجاتا ہوا اور نہایت انہماک کے ساتھ اپنی آنکھیں جھپکاتا ہوا میرے پاس بیٹھا رہتا۔ یا پھر وہ اپنے بالوں بھرے چہرے کو یوں تھپکتا جیسے وہ کوئی ایسا شخص ہو جو اپنے خیالات اور حرکات و سکنات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور کر رہا ہو۔ آخر کار اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دینا سیکھ لیا۔

لیکن بولنے کا ہنر تو اتنی آسانی سے نہیں آتا جیسے کہ ایک بچہ بھی خاصے عرصے تک صرف غوں غاں ہی کرتا ہے اور پھر جیسے جیسے اس کا شعور نشوونما پاتا ہے وہ باتیں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ دیکھا گیا ہے آواز پیدا کرنے والے مرکز اور دماغ کے قوت گویائی کے مرکز کا تعلق اس انداز سے ہوتا ہے کہ ان کی فطری نشوونما کا لطف ان کے باہم مل کر کام کرنے پر ہوتا ہے۔ اس نظریے کی توجیح گونگوں بہروں کو زبانی تعلیم کے طریق کار کے موجد ہینک نے ۱۷۸۵ء میں پہلے ہی کر دی تھی۔ وہ "خیالات کے متحرک علت و معلول" کی بات کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ جملہ روز روشن کی طرح یوں عیاں ہے کہ ایک ہم عصر ماہر نفسیات کے دعوے سے بھی زیادہ اس پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

لسانی فنون کے حوالے سے زور کی حالت بھی اس بچے جیسی تھی جو بولنے سے پہلے بہت سے لفظوں کا مفہوم سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے لیکن چونکہ اس کے پاس زندگی کا وسیع تجربہ تھا اس لئے اس میں چیزوں کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کے ان فیصلوں کا اظہار تاثرات کے حوالے سے ہی نہ ہوتا تھا بلکہ عملی طور پر بھی وہ چیزوں کو پرکھنے' ان کا تجزیہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کو ایک مفروضے پر مبنی مبہم دلیل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کی ذہانت موجود تھی اور جو یقینی طور پر میرے مقصد کے حصول کے لئے بے حد مددگار تھی۔

اگر میری تھیوری محض میری خوش فہمی معلوم ہوتی ہو تو اس چیز کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ قیاس جو کہ منطقی دلیل کی بنیاد ہوتا ہے بہت سے جانوروں کے ذہنوں کے لئے اتنا اجنبی بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قیاس بنیادی طور پر دو قسم کے احساسات کے درمیان موازنہ ہوتا ہے اور اگر ایسا نہیں تو کیوں وہ جانور جو انسان سے واقف

ہوتے ہیں اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو اسے نہیں جانتے وہ ایسا نہیں کرتے۔
بہر حال میں نے صوتی تعلیم سے زور کی تربیت کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اسے گویائی کی الف بے سکھانے کا سوال تھا پھر اس کے بعد اسے ایک بامعنی گفتگو کی طرف مائل کرنا مقصود تھا۔ بندر کو ایک گونگے بہرے پر بہرحال فوقیت حاصل تھی کہ اس کے پاس آواز تھی اور لفظوں کو ادا کرنے والے اعضاء پر اسے بہتر کنٹرول حاصل تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کی آواز کو کس طرح تبدیل کیا جائے کہ وہ آوازوں کی ادائیگی اس انداز سے کر سکے جسے اساتذہ اگر وہ ساکت ہوں تو حروف علت کہتے ہیں اور اگر وہ متحرک ہوں تو حروف صحیح کہتے ہیں۔
کھانے پینے کی اشیاء سے بندر کی رغبت کے مد نظر اور ہینک کے طریقہ کار کی مثال کی پیروی میں میں نے ہر حرف علت کو کسی کھانے پینے کی چیز سے متعلق کرنے کا فیصلہ کیا۔ مثلاً "a" کو Potato سے 'e' کو Beat سے 'i' کو Pie سے 'o' کو Cocoa سے اور 'u' کو Prune سے ---- اس طرح حرف علت ایسی چیزوں کے نام کا حصہ بن گیا بعض میں وہ ایک ہی بار آیا اور بعض میں دو بار جیسے کہ Cocoa میں یا پھر دو حروف علت کی بنیادی آوازیں ایک ہی لفظ میں آگئیں جیسے کہ Potato میں۔ جہاں تک حروف علت کا تعلق تھا یہ تجربہ بہت اچھا رہا کہ کھلے منہ کے ساتھ آوازوں کی ادائیگی ہوتی تھی۔ زور نے انہیں دو ہفتوں میں سیکھ لیا۔ البتہ حرف U کی ادائیگی میں اسے سب سے زیادہ دقت پیش آئی۔
حروف صحیح پر مجھے بہت زیادہ کام کرنا پڑا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جن حروف کی ادائیگی میں دانت اور مسوڑے دونوں استعمال ہوتے ہیں انہیں وہ شاید کبھی بھی ادا نہ کر سکے گا اس کی لمبی داڑھیں اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ اس کا ذخیرہ حروف بہت کم تھا یعنی صرف پانچ حروف علت اور f, g, m, k, b اور c پر مبنی تھا یعنی وہ حروف صحیح جو صرف زبان اور تالو کی مدد سے ادا کئے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے لئے بھی سماعت کا طریقہ کار ناکافی تھا۔ مجھے چھونے کے احساس کا طریقہ کار اپنانا پڑا جیسے کہ گونگوں بہروں کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ پہلے میں اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتا اور پھر واپس اس کے سینے پر رکھتا تاکہ وہ آواز کی لہروں کے ارتعاش کو محسوس کر سکے۔
اور یوں تین برس گزر گئے مگر وہ ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا۔ وہ چیزوں کو حرف کا نام دیتا تھا جو ان چیزوں میں بہت نمایاں ہوتا تھا۔ بس یہی کچھ وہ حاصل کر سکا۔
سرکس میں اس نے کتوں کی طرح بھونکنا سیکھ لیا تھا کیونکہ وہ انہی کے ساتھ کام کرتا تھا اور جب وہ میرے چہرے پر اس پر کی گئی محنت میں ناکامی کے تاثرات دیکھتا اور محسوس کرتا کہ میں اسے بلوا نہیں سکا تھا تو وہ اونچی آواز میں بھونکنے لگتا جیسے مجھے بتا رہا ہو کہ وہ تو بس یہی کچھ کر سکتا تھا۔ وہ حروف علت اور حروف صحیح کو علیحدہ علیحدہ ادا کرنے اور انہیں آپس میں ملانے سے قاصر تھا۔ p اور m کی ادائیگی کرتے ہوئے تو اسے بہت زیادہ اذیت سے گزرنا پڑتا تھا۔
سیکھنے کے عمل میں اس کی سست روی کے باوجود اس کے اندر ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے اعضاء کو اب بہت کم حرکت دیتا تھا۔ دیکھنے میں وہ اب زیادہ ذہین لگتا تھا اور اس میں سوچ بچار کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے ستاروں کی طرف غور سے دیکھنے کی عادت اپنا لی تھی۔ اس کی حساسیت بھی پہلے سے بڑھ گئی تھی اس میں جلد رو پڑنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔
اگرچہ اس میں زیادہ کامیابی تو نہیں ہو رہی تھی لیکن اسی بے سود تیقن کے ساتھ اس کی تعلیم جاری تھی۔

اب میرا یہ سارا کام ایک تکلیف دہ وہم میں بدل گیا تھا اور آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ میرا رجحان طاقت استعمال کرنے کی جانب ہو رہا تھا۔ ناکامی کی وجہ سے میرا مزاج بہت بگڑ گیا تھا حتیٰ کہ وہ مقام آگیا جب میں لاشعوری طور پر زور پر تشدد کر سکتا تھا۔

اب وہ زیادہ تر خاموشی میں ڈوبا رہنے لگا تھا اور وہ اپنے اس رویے سے مجھے یقین دلا رہا تھا کہ میں اس کی خاموشی کو کبھی توڑ نہیں سکوں گا اور اب اچانک میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس وجہ سے بول نہیں پا رہا تھا کہ وہ بولنا چاہتا ہی نہ تھا۔

ایک شام باورچی ڈرا سہما مجھے یہ بتانے آیا کہ اس نے بندر کو صحیح الفاظ میں بولتے ہوئے سن لیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق بندر باغ میں ایک درخت کے نیچے براجمان تھا۔ باورچی اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا یعنی اسے وہ لفظ یاد نہ رہے۔ اس کے خیال کے مطابق جو دو لفظ اسے یاد رہ گئے تھے وہ بستر اور پائپ تھے۔ اس کی اس حماقت پر میں نے اسے تقریباً" پیٹ ہی ڈالا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام رات میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر گزاری۔ اور جو کچھ میں تین سالوں میں حاصل نہ کر سکا تھا اور میری جس غلطی نے سب کچھ برباد کر دیا تھا اس کی تلافی اس رات کے اندھیرے کی بے چینی اور تجسس نے کر دی۔

بندر کو فطری گویائی کی اہلیت حاصل کرنے کی طرف مائل کرنے کے بجائے میں نے دوسرے دن دوسری راہ اپنائی اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسے اپنا حکم ماننے پر مجبور کیا۔ بس مجھے p اور m وغیرہ حرفوں کے سلسلے میں ہی کامیابی حاصل ہو سکی' جن سے میں اب بہت تنگ آچکا تھا وہ بھی مکارانہ انداز میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا --- اس کی رونی صورت اور حرکات و سکنات میں ایک طرح کی مضحکہ خیزی تھی۔ میں غصے میں آگیا اور بلا سوچے سمجھے اسے پیٹنے لگا۔ اس کا نتیجہ اس کے رونے کی صورت میں برآمد ہوا اور اس کی مکمل خاموشی کو اس کی کراہوں نے توڑ دیا۔

تین روز بعد وہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے جو کسی دماغی بیماری کی پیچیدگیوں کی وجہ سے تھا بیمار پڑ گیا۔ جونکیں' ٹھنڈے پانی کا غسل' جلاب' واضح الرجی کا حربہ' الکحول کا مرکب' برومائیڈ ---- اس کی خوفناک بیماری کے خلاف ہر نسخہ آزمایا گیا۔ مایوسی کی ان انتہاؤں کے درمیان بھی میں اپنی پوری لگن کے ساتھ' جس میں میری ندامت اور خوف کا بھی دخل تھا' اس کا علاج ایک تو اس لئے کر رہا تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے ظلم کا شکار ہوا تھا اور دوسرے یہ کہ میرے خیال میں وہ اپنی زندگی کا ایک قیمتی راز شاید اپنے ساتھ قبر میں لئے جا رہا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد وہ قدرے سنبھل گیا مگر وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اپنے بستر سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ موت کے اتنے قریب ہونے پر وہ بہت متین اور مہذب ہو گیا تھا۔ اس کی شکر گزار آنکھیں کمرے میں ہر طرف مجھے ڈھونڈتی رہتیں جب میں اس کے سامنے نہ ہوتا تب بھی میں اس کی نگاہوں کو اپنے پر مرکوز محسوس کرتا --- افاقہ حاصل کرنے کی خواہش میں اس کا ہاتھ میری قربت اور لمس کے لئے میری طرف بڑھا رہتا۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ ایک انسان کی طرح میری تنہائیوں کا ساتھی بنتا جا رہا تھا۔

تحقیق کی جستجو نے جو میری کجروی پر مبنی تھی میرے تجربات کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ بندر اب بولنے کے قریب ہی تھا میں اپنے تجربے کو اس مقام پر ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سے نہایت آہستگی سے ان حروف کے بارے میں پوچھنا شروع کیا جن کو کہ وہ ادا کرنا جانتا تھا

--- کوئی جواب نہ ملا۔ میں کافی دیر تک اسے تنہا چھوڑ دیتا اور کمرے کی پارٹیشن کے سوراخ سے اسے دیکھا رہتا --- کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ میں چھوٹے چھوٹے فقروں میں اس سے بات کرتا --- اس کی وفاداری اور اس کی پسندیدہ کھانے پینے کی اشیاء کا ذکر کرکے اس کے جذبات کو ابھارتا --- نتیجہ وہی --- وہ کچھ نہ بولتا --- جب میں غم انگیز لہجے میں بات کرتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔ جب میں وہ مانوس سا فقرہ جس سے میں اپنے سبق کا آغاز کرتا تھا ادا کرتا یعنی "میں تمہارا آقا ہوں۔" یا جب میں ایک حتمی سچائی کو اس تک پہنچانے کی خاطر اسے کہتا "تم میرے بندر ہو" تو وہ اپنی آنکھیں بند کرکے ان فقروں کا جواب اثبات میں دیتا --- لیکن وہ کوئی ایک لفظ بھی ادا نہ کرتا حتیٰ کہ اس کوشش میں وہ اپنے ہونٹوں کو بھی کوئی حرکت نہ دیتا۔

حقیقت میں اس کے تمام تر تاثرات اور اپنی بات مجھ تک پہنچانے کا سارا انداز گونگے بہروں جیسا ہو گیا تھا --- میں نے اپنی احتیاطی تدابیر کو دو چند کر دیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ گونگے بہرے عموماً ذہنی طور پر بیمار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات میں چاہتا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تاکہ اس کی یہ ہذیانی کیفیت ہی اس کی خاموشی کو توڑنے کا سبب بن جائے۔

اس کے روبصحت ہونے کا عمل تیز نہیں تھا۔ وہ اسی طرح لاغر اور غمگین تھا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر بیمار تھا۔ اس کی جسمانی حالت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا اور جلد یا بدیر اس کے بارے میں تمام امیدیں ختم ہونے والی تھیں۔ بیماری کی وجہ سے وہ میرا فرمانبردار تو ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کی خاموشی جو میرے ہی مایوسانہ اقدامات کی وجہ سے تھی نہ ٹوٹ سکی۔ اپنے جبلی تقاضوں اور قدیم روایات کی پاسداری کرتے ہوئے وہ اپنی ہزاروں سال پرانی خاموشی کو اپنے اوپر طاری کئے ہوئے تھا۔ جس طرح جنگل کے باسی قدیم انسان جنہیں کسی وحشیانہ ناانصافی نے خاموش رہنے یا ذہنی خود کشی کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا' اپنے راز کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اسی طرح اس کے اس لاشعوری فیصلے کے پیچھے وقت کی وسیع خلیج کے پار تاریخ کے آغاز سے پہلے کسی جنگلی زندگی کی پراسراریت موجود تھی۔

چار ہاتھوں والے انسان نما جانوروں کے عظیم خاندان بدقسمتی سے ارتقائی عمل کے نتیجے میں اپنی قدروقیمت کھو بیٹھے' وہ انسان سے شکست کھا گئے' وہ انسان کے وحشیانہ پن کا شکار ہو گئے اور اس طرح انہیں اپنے باغ عدن کی سلطنت سے بے دخل ہونا پڑا۔ ان کی عظمت تباہ برباد کر دی گئی' ان کی عورتوں کو پکڑ لیا گیا تاکہ ایک منظم غلامی کا آغاز ماں کے پیٹ سے ہی ہو سکے۔ اپنی بے بسی اور شکست خوردہ حالت میں اس نسل نے اپنی انسانی عظمت کے اظہار کے لئے احتجاجاً" از خود بولنا ترک کر دیا اور انہوں نے اپنے دشمن سے گفتگو کا رابطہ ختم کر کے اپنی نسل کے تحفظ کے لئے جانوروں کی سلطنت کی گمنامی میں پناہ ڈھونڈ لی۔

اور انسان نے اسی ارتقائی عمل کے دوران اپنے ان خوفناک' ظالمانہ اور وحشیانہ اقدامات کی بنا پر جنہیں اس نے اپنی ذہنی عیاشی قرار دیا الہامی کتابوں میں درج ہدایات سے روگردانی کرتے ہوئے اس بے چاری مخلوق کو اپنی تضحیک کا نشانہ یوں بنایا کہ اسے اپنے آپ کو بہت کم تر درجے کی مخلوق کے طور پر زندگی بسر کرنا پڑی۔ اس تنزلی کے نتیجے میں ان کی ذہانت ہمیشہ کے لئے اس سطح پر چلی گئی کہ اب وہ محض ایک خود کار عمل کے تحت اشارے ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی نسل کی زندگی بچانے کی فکر میں انہوں نے اپنی کمر کو جانوروں کی طرح جھکا لیا اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے ایک مکمل جانور کا وصف اپنا لیا جو بیک وقت حزنیہ بھی تھا اور مزاحیہ بھی تھا۔

ماضی میں پیش آنے والے انہی حالات و واقعات کی وجہ سے میں اپنے زعم میں خود کو کامیابی سے قریب سمجھے

لگا تھا۔ ہزاروں لاکھوں سال کی بول چال کی جادوئی طاقت ابھی تک اس بندر نما جانور کی روح میں ایک زریں لہر کی طرح موجود تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی حیوانی جبلت کے سیاہ سایوں کا خوف اس بے حد قدیم رکاوٹ کو دور کرنے کے راستے میں حائل تھا۔

زور نے اپنے ہوش و حواس کھوئے بغیر اپنی زندگی کی آخری سانس لینا شروع کر دی تھیں۔ یہ دھیرے دھیرے وارد ہونے والی موت تھی ۔۔ اس کی آنکھیں بند تھیں وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا اس کی نبض ڈوب رہی تھی اور غنودگی اس پر طاری تھی البتہ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھول کر اپنے ملاتو لوگوں جیسے چہرے کے ساتھ جب میری طرف دیکھتا تو یہ منظر بہت دلکش ہوتا۔ اور اس آخری سہ پہر کو' اس کی موت کی سہ پہر کے وقت وہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے میں نے یہ کہانی لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام کے پھیلتے ہوئے سایوں کی خاموشی اور گرمی میں میں اس کے بستر کے ساتھ لگا اونگھ رہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس نے میری کلائی پکڑی ہے۔ میں نے پریشان ہو کر آنکھیں کھولیں۔ بندر اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ اب یقینی طور پر مر رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا انسانی تاثر تھا کہ میں ڈر سا گیا' لیکن اس کے ہاتھ اور اس کی آنکھوں نے مجھے اتنے پرجوش انداز میں اپنی طرف کھینچا کہ میں اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا۔ اور پھر اس کے آخری سانس کے ساتھ جو کہ یقینی طور پر اس کا آخری سانس تھا عین اس وقت مجھے امید کی رمق نظر آئی کیونکہ وہ کچھ کہہ رہا تھا مجھے یقین ہے وہ کچھ بڑبڑایا تھا (میں اس کی آواز' اس کے لہجے کو جو ہزاروں لاکھوں سالوں سے نہیں سنا گیا تھا کیسے بیان کر سکتا ہوں) اس کے ان الفاظ کی گہری انسان دوستی' ہماری نسلوں کے درمیان موجود فاصلے کو ختم کر رہی تھی:

پانی ---- میرے آقا! آقا ---- میرے آقا........

بورخیس / اسد محمد خان

دستِ خداوند کی تحریر

قید خانے کی عمارت بلند ہے اور یہ پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کی شکل تقریباً ایک کامل نصف کرے کی ہے، کیونکہ فرش نے جو پتھر کا ہے، نصف کرے کو اس کے انتہائی ممکنہ قطر سے ذرا اوپر کاٹ دیا ہے اس طرح عمارت کے پھیلاؤ سے اس کے جبر کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ ایک دیوار عمارت کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی اوپر تک چلی گئی ہے۔ یہ اگرچہ بہت بلند ہے لیکن عمارت کی محرابی چھت تک نہیں پہنچتی۔

دیوار کے ایک طرف میں موجود ہوں، تزیناکن۔ قہولوم کے اس ہرم کا مہنت جسے پیدرو دی الوریدو نے نذر آتش کر دیا تھا اور دوسری جانب ایک گلدار ہے جو اپنی اسیری کے زمان و مکان کو رازدارانہ اور ہموار قدموں سے ناپتا رہتا ہے۔ فرش کی سطح پر بیچ کی دیوار کو پھاڑتی ہوئی ایک لمبی کھڑکی ہے جس میں سلاخیں لگی ہیں۔ اس ایک ساعت (نصف النہار) میں کہ جب سائے نہیں ہوتے، چھت میں ایک دروازہ کھلتا ہے اور ایک جیلر جو گزرتے برسوں کے ساتھ گھلتا، معدوم ہوتا جا رہا ہے، لوہے کی ایک چرخی کو حرکت دیتا ہے اور ہمارے لیے رسے کے سرے پر بندھے پانی کے مرتبان اور گوشت کے ٹکڑے اتار دیتا ہے تو گنبد میں روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس ایک لمحے میں، میں گلدار کو دیکھ سکتا ہوں۔

میں جتنے برس تاریکی میں پڑا رہا ان کا شمار بھول چکا ہوں۔ ہر چند کہ میں کبھی جوان تھا اور اس قید خانے میں چل پھر سکتا تھا، اب میں کچھ نہیں کرتا، بس اپنی موت کی مدرا میں انتظار کرتا ہوں، اس خاتمے کا جو انہوں نے میرے لیے تیار کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے وقت میں چقماق کے لانبے خنجر سے قربان کیے جانے والوں کے سینے چاک کیے ہیں، مگر اب کسی افسوں کے بغیر میں خود کو خاک سے اٹھا بھی نہیں سکتا۔

ہرم کی آتش زنی سے پہلے والی رات میں ان آدمیوں نے جو بلند قامت گھوڑوں سے اترے تھے، ایک کنزِ مخفی کا پتہ معلوم کرنے کے لیے، مجھے سرخ کی ہوئی دھات سے پیٹا۔ میری آنکھوں کے سامنے انہوں نے خداوند کے مجسمے کو گرا دیا، مگر اس نے مجھے بے یارومددگار نہ چھوڑا۔ میں ان کی اذیتوں تلے بھی خاموش رہا۔ انہوں نے مجھے چیر دیا، مجھے ضربیں لگائیں، میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے اور پھر اس قید خانے میں میری آنکھ کھلی جس سے فانی زندگی میں مجھے چھٹکارا نصیب نہیں ہو گا۔

وقت گزارنے کی خاطر، کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ اس اندھیرے میں وہ سب کچھ یاد کروں جو میں جانتا ہوں۔ بعض سنگی اژدروں کی ترتیب اور تعداد، یا افسوں سازی کے کسی درخت کی شکل یاد کرنے میں میں نے پوری پوری راتیں ضائع کر دیں۔ اس طرح میں نے برسوں پر فتح پائی اور وہ سب جو میری ملک تھی اس کا قبضہ حاصل کیا۔

ایک رات میں نے محسوس کیا کہ میں ایک قطعی یادداشت کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ سمندر کو دیکھنے سے

قبل مسافر اپنے لہو میں ایک ہیجان سا محسوس کرتا ہے۔ گھنٹوں بعد میں نے کہیں دور اس یاد کی موجودگی کا ادراک کرنا شروع کیا۔ یہ خداوند سے متعلق ایک روایت تھی۔ تخلیق کے پہلے دن ایک پیش آگہی سے جان کر کہ وقت کے خاتمے پر بڑی بدنصیبی اور تباہی برپا ہوگی۔ خداوند نے ایک ایسا کلمہ سحر تحریر کر دیا تھا جو ان بلاؤں کے رد کی تاثیر رکھتا تھا۔ اس نے یہ کلمہ اس طور لکھا تھا کہ انتہائی دور دراز نسلوں تک پہنچے اور اتفاق محض سے متاثر نہ ہو سکے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اور کن حروف میں یہ کلمہ لکھا گیا ہے' لیکن یقین کامل ہے کہ یہ راز ہی رہے گا اور بلاشبہ کوئی شنندہ انسان ہی اسے پڑھے گا۔ میں نے غور کیا کہ ہمیشہ کی طرح ہم یگ کے اختتام پر ہیں اور کیونکہ خداوند کا آخری مہنت ہونا میرا مقدر ہے' سو عین ممکن ہے کہ مجھے ہی اس لکھت کا رمز پڑھنے کی سعادت نصیب ہو۔ ہرچند کہ میں قید خانے میں پڑا تھا مگر اس حقیقت کا احساس مجھے امید سے محروم نہ کر سکا۔ شاید میں نے قہولوم یں ہزار دفعہ تحریر دیکھی ہوگی اور میں شاید اسے سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔

اس خیال نے مجھے حوصلہ دیا' مجھے عجیب طرح خیرہ و سرشار کر دیا۔ زمین کی حدود میں ایسے قدیم و کہنہ اجسام اپنے وجود رکھتے ہیں جن میں کوئی بگاڑ نہیں پیدا ہو سکتا۔ جو لافانی ہیں۔ تو ممکن ہے انہی میں سے کوئی جسم وہ علامت ہو جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایک پہاڑی خداوند کا لفظ ہو سکتی ہے' اسی طرح ایک دریا ایک سلطنت یا ستاروں کی ترتیب لیکن صدیوں کے دورانیے میں پہاڑیاں ہموار ہو جاتی ہیں' دریا اپنی گزرگاہیں بدل لیتے ہیں۔ سلطنتیں پامال ہوتی اور تغیر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ستاروں کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ آسمان میں ایک تبدل ہے۔ پہاڑیاں' ثابت و سیار افراد ہیں اور افراد معدومیت کی زد پر ہوتے ہیں۔ میں نے زیادہ مستحکم چیزوں کی تلاش شروع کی۔ ایسی چیزیں جو کم غیر محفوظ ہوں۔ میں نے اناجوں کی نسلوں' گھاس' چڑیوں اور انسان کی پیڑھیوں کے بارے میں سوچا۔ شاید یہ افسوں میرے چہرے پر لکھا ہو گا۔ شاید اپنی تلاش کا مقصود میں خود ہوں۔ میں اس گتھی کے الجھاوے میں تھا' اچانک مجھے یاد آیا کہ خداوند کی صفات میں سے ایک صفت یہ گلدار ہے اور تب میری روح تکریم و تقدیس سے معمور ہو گئی۔ میں نے شروعات وقت کی اس پہلی صبح کا تصور کیا۔ میں نے تصور کیا کہ میرا خداوند گلداروں کی زندہ کھال کو یہ ابدی پیغام تفویض کر رہا ہے۔ گلدار لاتعداد بار جفتی کریں گے' غاروں گپھاؤں میں' آبی گھاس کے قطعوں پر' جزیروں میں اپنے جیسوں کو جنتے رہیں گے تاآنکہ آخری آدمی تک یہ پیغام پہنچ جائے۔ میں گلداروں کے اس تسلسل کو' پیچیدگی کے اس سیل گرم کو اپنے تصور میں لایا۔ خیال کیا کہ یہ تسلسل جو چراگاہوں' گلوں میں دہشت پھیلائے ہوئے ہے' یہ اس لیے ہے کہ ایک غایت خداوندی کو محفوظ رکھا جا سکے۔

تو دوسرے حصے میں ایک گلدار تھا۔ میں نے معلوم کر لیا کہ یہ موجودگی میرے قیاس کی تصدیق ہے' ایک رازدارانہ عنایت ہے۔

میں نے طویل برس اس گلدار کی کھال پر پڑے نشانات کی ترتیب اور ہیئت کو یاد کرنے میں صرف کئے۔ ہر اندھا دن میرے لیے روشنی کا ایک لمحہ روا رکھتا تھا تاکہ میں زرد کھال پر پڑے سیاہ دھبوں کو اپنے ذہن پر مرتسم کر سکوں۔ ان میں سے کچھ چیتاں تھیں' کچھ نے ٹانگوں کے اندرونی رخ کو چوڑائی میں کاٹتی ہوئی دھاریوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کچھ خود کو دہراتے ہوئے چھلوں کی صورت میں تھے۔ شاید ان سے ایک اکیلی آواز' ایک اکیلا لفظ مراد ہو گا۔ بہت سے دھبوں کے گرد سرخ حاشیے تھے۔

میں اپنی مشقت کی تھکن کو بیان نہیں کروں گا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ میں نے اس گنبد میں چیخ کر کہا کہ اس عبارت کو پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ ایک خداوند کے لکھے جملے کی کلی چیستاں کے مقابلے میں مجھے الجھانے والی

ایک محسوساتی چیستاں کا تردد رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ ایک ذہن مطلق کس قسم کا جملہ تراشے گا؟ میں نے غور کیا کہ انسانوں تک کی زبان میں کوئی بیان ایسا نہیں ہے جو پوری کائنات کو جتلا نہ کر لیتا ہو' لفظ "گلدار" کہنا ان گلداروں کو بیان کرنا ہے جو اسے وجود میں لائے' ان ہرنوں اور کچھوؤں کو بیان کرنا ہے جو اس نے مار کر کھا لیے' ان چراگاہوں کو جن میں وہ ہرن چرتے رہے' اس زمین کو جس نے چراگاہیں پیدا کیں اور آسمان کو بیان کرنا ہے جس نے زمین پر روشنی اتاری۔ میں نے غور کیا کہ ایک خداوند کی زبان کا ہر لفظ حقائق کی اس سلسلہ بندی کو ظاہر کر دے گا' کسی مضمرانہ بالواسطہ انداز میں نہیں' بلکہ ایک صریح اور قطعی انداز میں' بتدریج نہیں بلکہ ایک دم۔

ایک وقت ایسا آیا کہ کسی ربانی کلمے کا تصور ہی مجھے رکیک اور بے حرمتی والا لگا۔ میں نے سوچا ایک اللہ کو ایک لفظ ادا کرنا ہے کہ اس ایک لفظ میں ہر بات ادا ہو جائے گی۔ بولا ہوا کوئی بھی لفظ اس کے لیے کائنات سے کم تر یا وقت کی میزان کل سے کم نہیں ہو سکتا۔ "تمام" "کل عالم" "کائنات" یہ غریب اور ہوس مند الفاظ تو اس ایک لفظ کی پرچھائیاں اور عکس ہیں جو لفظ کہ ایک پوری زبان کے برابر اور اس "کل" کے مساوی ہے جو کوئی زبان اپنے اندر لیے ہوئے ہو سکتی ہے۔

ایک دن یا ایک رات۔ میرے دنوں اور میری راتوں میں فرق بھی کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے خواب دیکھا کہ قید خانے کے فرش پر ریت کا ایک ذرہ ہے میں بے اعتنائی سے پھر سو گیا اور خواب دیکھا میں جاگ اٹھا ہوں اور فرش پر ریت کے دو ذرے ہیں۔ میں دوبارہ سو گیا اور میں نے دوبارہ خواب دیکھا کہ ریت کے ذرے تین ہیں۔ وہ اسی طرح بڑھتے گئے یہاں تک کہ قید خانہ ان سے بھر گیا اور میں ریت کے اس نصف کرے میں دم توڑنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں' سو بڑی کاوش سے میں نے خود کو بیدار کیا۔ بیداری بے فائدہ تھی' ریت کے بے شمار ذرے میرا دم گھونٹ رہے تھے۔ کسی نے مجھ سے کہا "تم جاگ کر کسی حالت بیدار میں نہیں اٹھے' یہ تو ایک پچھلا خواب ہے۔ یہ خواب ایک اور خواب میں چل رہا ہے اور اس طرح ایک لامتناہیت جاری ہے' جو ریت کے ذروں کی تعداد ہے۔ جس مسافت کو تمہیں پھر سے کاٹنا ہے وہ قطع نہیں ہونے کی اور اس سے قبل کہ تم حقیقت میں بیدار ہو سکو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میں مٹ رہا ہوں۔ ریت میرے دہانے کو کچلے دے رہی تھی مگر میں چیخ اٹھا کہ "خواب کی ریت مجھے ہلاک نہیں کر سکتی اور خواب اندر خواب کا کوئی وجود نہیں۔" ایک درخشندگی نے مجھے بیدار کر دیا۔ بالائی تاریکی میں روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ مجھے جیلر کا چہرہ' ہاتھ' چرخی' رسا گوشت کے ٹکڑے اور مرتبان نظر آئے۔

مقدر جو شکل اختیار کر لے' آدمی بتدریج خود کو اس سے شناخت کرنے لگتا ہے کہ آدمی خود ہی اپنے فعل کا ماحول ہے۔ چیستانوں کو بوجھنے والے یا ایک منتقم' یا خداوند کے ایک مہنت سے زیادہ میں تو ایک قیدی تھا۔ ان تھک بھول بھلیوں میں پھر اپنے سنگین قید خانے میں لوٹ آیا۔ جیسے کوئی اپنے گھر لوٹتا ہے۔ میں نے اس کی سیلن کو دعا دی' گلدار کو دعا دی' میں نے اس روزن کو دعا دی جو روشنی کو راہ دیتا تھا۔ میں نے اس بوڑھے دکھتے ہوئے بدن کو دعا دی' میں نے تاریکی اور پتھر کو دعا دی۔

تب ایسا منظر پیش آیا جسے نہ میں کبھی بھول سکتا ہوں نہ بیان کر سکتا ہوں۔ کہ الوہیت سے' موجودات سے اتصال کا ظہور ہوا (مجھے نہیں معلوم آیا یہ دو لفظ ہم معنی ہیں) انبساط اپنی علامتوں کو نہیں دہراتا۔ بعضوں

نے خداوند کو درخشندگی میں دیکھا ہے، بعضوں نے تلوار میں اور بعضوں نے گلاب کی پنکھڑیوں کے دائروں میں۔

میں نے ایک انتہائی بلند پہیہ دیکھا جو نہ میری آنکھوں کے سامنے تھا، نہ پیچھے، نہ دائیں نہ بائیں۔ وہ بہ یک وقت ہر جانب تھا۔ یہ پہیہ پانی سے بنا تھا اور آگ سے بھی اور (اگرچہ اس کے سرے نظر آرہے تھے) وہ لامتناہی تھا۔ وہ منجملہ ماضی حال و مستقبل سے مرتب تھا۔ اس پوری بنت کا ایک دھاگا میں تھا اور دوسرا دھاگا پیدرو دی الوریدو، کہ مجھے نے مجھے اذیتیں دی تھیں۔ اب اسباب و علل منکشف تھے اور معلول منکشف تھے کہ ہر شے کو لامحدودیت کے ساتھ سمجھنے کے لیے میرا ایک بار اس پہیے کی طرف دیکھنا ہی کافی تھا۔

تصور کرنے یا محسوس کرنے کی مسرت کے مقابلے میں علم و آگہی کی مسرت کس درجہ بڑی ہوتی ہے۔ میں نے کل ممکنات کو دیکھا۔ میں نے کائنات کے مخفی نقش دیکھے۔ میں نے مبدا ماخذ دیکھے کہ کتاب صلاح میں جن کا بیان ہے میں نے پہاڑیاں دیکھیں جو پانیوں پر سے اٹھی تھیں۔ میں نے دشت کے پہلے انسانوں کو دیکھا۔ میں نے پانی کے ظروف دیکھے جو ان آدمیوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ میں نے وہ کتے دیکھے جنھوں نے ان کے چہرے چیر پھاڑ دیے تھے۔ میں نے وہ بے چہرہ اللہ دیکھے جو ایک تنہا مسرت کی تشکیل کرتے ہیں اور ہر شے کی آگہی حاصل کرتے ہوئے مجھے گلدار کی کھال کی لکھت کا علم بھی حاصل ہو گیا۔

یہ چودہ بے ضابطہ الفاظ سے ترتیب دیا ہوا ایک افسوں ہے (یا شاید وہ ایسے لفظ ہیں جو فی الاصل بے ضابطہ نہیں ہیں بلکہ ایسے نظر آتے ہیں) مجھے قدرت و اختیار حاصل کرنے کے لیے محض بلند آواز سے انھیں ادا کرنا ہو گا۔ مجھے اس سنگین قیدخانے کو معدوم کرنے کے لیے، اپنی شب تاریک میں دن کے نفوذ کے لیے، مرد جوان بن جانے کے لیے، لافانی بننے کے لیے اور اس بات کے لیے کہ شیر الوریدو کو فنا کردے، ہسپانویوں کے سینوں میں مقدس خنجر اتارنے کے لیے، ہرم کی دوبارہ تعمیر کے لیے، سلطنت کو پھر سے تشکیل دینے کے لیے ان الفاظ کو ادا کرنا ہو گا۔ چالیس ارکان ہجی۔ چودہ لفظ اور پھر میں، تزیناکن اس قلم رو پر حکمرانی کروں گا جو مونتے زوما کے زیرنگیں تھی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں وہ الفاظ کبھی ادا نہیں کروں گا، اس لیے کہ اب مجھے کوئی تزیناکن یاد نہیں۔

تو اب گلدار کی کھال پر لکھا ہوا رمز میرے ساتھ ہی فنا ہو جائے۔ وہ جس نے موجودات کی جھلک دیکھ لی ہو، جسے ممکنات کی شعلہ زن نگارشوں کا ایک جلوہ نظر آگیا ہو، وہ ایک آدمی کے بارے میں اور اس کی ادنیٰ مسرتوں، اس کی بدنصیبیوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، خواہ یہ آدمی وہ خود ہی کیوں نہ ہو۔ بے شک کبھی وہ یہ آدمی تھا، لیکن اب اسے کوئی پروا نہیں۔ اب جبکہ وہ کوئی بھی نہیں ہے، وہ اس دوسرے کے مقدر کے بارے میں کیوں فکرمند ہو، وہ اس دوسرے کے قبیلے کے بارے میں کیوں سوچے۔

اس لیے میں وہ افسوں نہیں پڑھتا۔ اس لیے میں اندھیرے میں پڑا ہوا دنوں کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھے فراموش کردیں، فنا کردیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا

وہ باغ ---- حقیقی تھا یا خواب؟
دھند بھری روشنی میں مست میں یہ پوچھتا رہا ہوں
(تقریباً ایک تسلی کی طرح) کہ وہ ماضی
جو اس آج کے ناآسودہ آدم کی مالک ہے
اس خدا کا بنایا ہوا ایک طلسمی خواب تو نہیں تھا
جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا؟ اب یہ حافظے میں
غیر قطعی اور مبہم ہے' وہ شفاف فردوس'
لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ موجود ہے اور باقی رہے گی
اگرچہ میرے لئے نہیں۔ درگزر نہ کرنے والی زمین
میرا دکھ درد ہے اور ہابیل' قابیل اور ان کی آل
کے درمیان میں الاخوانی جنگیں بھی میرا دکھ درد ہیں
مگر پھر بھی یہ بہت ہے کہ ہم سے محبت ہوئی
ہم خوش رہے اور ایک ہی دن کے لئے سہی
مگر اس جیتے جاگتے باغ کو چھو تو لیا ہم نے

الوداع

ہم نے گیارہویں شاہراہ کے کونے پر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ سڑک کے اس پار پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تم بھی مڑیں اور ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کا اشارہ کیا۔

لوگوں اور گاڑیوں کا ایک دریا ہمارے سامنے بہنے لگا۔ یہ ایک عام سی سہ پہر میں پانچ بجے کا وقت تھا۔ میں کیسے جان سکتا تھا کہ یہ غمناک اور عمیق دریائے ایکرون ہے۔

اور اب میں اس یاد کو ڈھونڈ نکالتا ہوں اور اس پر نظر کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ جھوٹ تھا، اور شاید اس الوداع کے پیچھے ایک دائمی جدائی تھی۔

کل رات کے کھانے کے بعد میں اندر ہی ٹھہرا رہا اور ان چیزوں کو سمجھنے کی خاطر وہ آخری تعلیمات پھر سے پڑھتا رہا جو افلاطون نے اپنے استاد سے منسوب کی ہیں۔ میں نے پڑھا کہ جب جسم کا خاتمہ ہو جائے تو روح نکل کر جا سکتی ہے۔

اور اب میں نہیں جانتا کہ حقیقت اس یقینی الوداع میں ہے یا اس کی نامبارک تاویلات میں۔

کیونکہ اگر روح کی موت نہیں تو ہمیں الوداع کہنے کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

ایک دوسرے کو الوداع کہنا جدائی کا انکار کرنا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ "آج ہم جدا ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں، لیکن کل پھر ملیں گے۔" انسان نے الوداع کی رسم اس لیے ایجاد کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ جانتا ہے کہ وہ لافانی ہے، چاہے بظاہر وہ بے دلیل اور لمحاتی ہی معلوم ہوتا ہو۔

کبھی نہ کبھی ڈیلیا (کس دریا کے کنارے؟) ہم اپنا یہ غیر یقینی مکالمہ ایک بار پھر جوڑ لیں گے، اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا کسی میدانی علاقے میں گم شدہ ایک شہر میں ہم بورخیس اور ڈیلیا رہ چکے ہیں۔

عبداللہ کاخر / ستار طاہر

زندگی، زندگی

دادی اماں دروازے کے پاس سٹور کے سامنے اپنے پاؤں گرم کر رہی تھیں۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کے پاؤں بھی گرم نہیں ہو رہے تھے۔ اسے شدت سے سردی کا احساس ہوتا رہتا' حالانکہ گھر خاصا گرم رہتا تھا۔
بڑے میاں ان کے شوہر کھڑکی کی مرمت کر رہے تھے۔ جسے ان کے پوتے نے توڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا "آج تک تمہیں اتنا پتہ نہ چلا کہ پاؤں کیسے گرم کئے جاتے ہیں۔ کھلے دروازے میں بیٹھ کر تم اپنے پاؤں نہیں آسمان کو گرم کر رہی ہو۔" دادی اماں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور پھر ایک کوچ پر جا کر لیٹ گئی۔ پہلے تو اسے قطعاً" محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ اٹھ نہیں سکتی لیکن جب دادی اماں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس میں انہیں ناکامی ہوئی اور تیسرے دن ان کا انتقال ہو گیا۔
بیوی کی موت کا بڑے میاں پر عجیب اثر ہوا' جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ ان کا بیٹا ان کی بہو اور ان کے پوتے پوتیاں دوڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور پھر رونے پیٹنے لگے۔ تب بڑے میاں کا سارا وجود کانپ اٹھا اور اس نے کہا۔ "اے اللہ میاں میری قسمت میں اور کیا لکھا ہے جو کچھ باقی بچا ہے وہ بھی پورا کر دو۔" ترپن برس پہلے بڑے میاں کی دادی اماں سے شادی ہوئی تھی۔ ترپن برس سے وہ ایک ہی برتن میں کھاتے چلے آ رہے تھے' ایک سے جذبات' احساسات اور خیالات کے مالک تھے۔ عادتیں بھی ایک جیسی تھیں۔ یہ تو سوچنا بھی محال تھا کہ ان میں سے کوئی بھی مرجائے گا یا بچھڑ جائے گا اور دوسرا ابھی زندہ رہے گا۔
جب ابتدائی رسوم ادا ہو گئیں اور دادی اماں کو کفنا دیا گیا تو بڑے میاں کو یوں لگا جیسے ان کے اندر کوئی بڑی نازک اور قیمتی چیز ٹوٹ گئی ہے اور اب وہاں خلاء ہے' ایک ایسا درد ہے جس کا کوئی مداوا نہیں اور بڑے میاں زارو قطار آنسو بہانے لگے۔ جب تدفین ہو چکی تو پرسہ دینے والوں سے سارا گھر بھر گیا۔ لوگ بڑے میاں کو تسلی دے رہے تھے ان کا غم بھلانے کی کوشش کر رہے تھے' مگر بڑے میاں کے چہرے سے یہ تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی کہ اب دنیا میں ان کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہ گیا اور ان کی زندگی بے معنی اور بے روح ہو گئی ہے۔
دادی اماں کے انتقال کے ایک ہفتہ کے بعد بڑے میاں کی حالت دیدنی تھی۔ وہ تیزی سے سوکھتے چلے جا رہے تھے جیسے وہ کوئی ایسی شاخ ہوں جسے پانی سے محروم رکھا جا رہا ہو۔ بعض اوقات تو انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ بعض اوقات وہ خود کو کوسنے لگتے تھے کہ جب دادی اماں اپنے پاؤں گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تو وہ ان کے ساتھ رکھائی اور سختی سے پیش آئے تھے۔
ان کے کنبہ کے افراد یہ کوشش کرتے کہ وہ تنہا نہ رہیں' کوئی نہ کوئی ہر وقت ان کے پاس رہتا۔ ان کے سب سے چھوٹے پوتے نے اپنے سارے کھلونے اٹھائے اور بڑے میاں کے کمرے میں چلا آیا کہ میں تو دادا ابا کے سامنے ہی کھیلوں گا۔ اس سے بڑا پوتا بھی دن میں دس بار ان کے کمرے میں آکر ان کی تصویر بنانے کی کوشش کرتا بڑے میاں کے بیٹے نے ٹیکسی لی اور بڑے میاں کو اس پر سوار کر کے سارے شہر کی سیر کرائی۔ بڑے میاں نے راستہ میں ایک بار بڑی تلخی سے کہا "جب تمہاری ماں زندہ تھی تب تم نے کبھی ہمیں ٹیکسی پر سیر کرانے کی کوشش نہ کی تھی۔"
اتنی موسلا دھار بارش ہوئی کہ صحن میں پڑی گدی بھورے کی برف کی طرح صاف ہو گئی۔ بڑے میاں ایک

ستون کا سہارا لئے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے انہیں اونی اور بھدی سی جرابیں دکھائی دیں یہ وہ جرابیں تھیں جنہیں پہن کر دادی اماں اپنے پاؤں گرم رکھنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔

بڑے میاں نے وہ جرابیں اٹھالیں اور انہیں صاف کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اک بار پھر انہیں شدید خلا کا احساس ہوا اور انہیں اپنا دل خالی خالی لگنے لگا۔ بڑے میاں اس روز شام تک آنسو بہاتے رہے۔

بڑے میاں اگرچہ رات کو نیند کی گولیاں استعمال کرنے لگے تھے پھر بھی انہیں نیند نہ آتی۔ آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے یا پھر گھر کا چکر لگانا شروع کر دیتے۔ ہر چیز انہیں اپنی بیوی کی یاد دلاتی۔ ماضی کی ایک ایک چھوٹی چھوٹی سی باتیں بھی انہیں یاد آتی تھیں۔ اور بڑے میاں کبھی کبھی محسوس کرتے کہ ان کی بیوی مری نہیں بلکہ مختصر عرصے کے لئے کسی جگہ گئی ہے اور لوٹ آئے گی۔ معمولی سے معمولی آہٹ پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھتے۔ ان کے بیٹے اور بہو نے انہیں تسلی دینے کی ہر طرح سے کوشش کی' صبر کی تلقین کی مگر بڑے میاں کا دل خالی ہی رہا۔

ایک دن بڑے میاں اچانک غائب ہو گئے چاروں طرف ان کی ڈھنڈیا پڑی' آس پاس' پڑوس' دوستوں' رشتہ داروں سب کے گھروں میں انہیں تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔ حتیٰ کہ ہسپتال بھی دیکھ آئے کہ اچانک کسی حادثہ کا شکار ہو کر وہاں نہ پہنچ گئے ہوں۔ کسی کو خیال تک نہ آیا کہ قبرستان بھی دیکھ آنا چاہیے جب کہ بڑے میاں وہیں پائے گئے۔ وہ اکثر اپنی بیوی کی قبر پر آیا کرتے تھے کبھی ایک گھنٹہ ٹھہرتے کبھی دو گھنٹے لیکن اس بار وہ سیدھے قبرستان کے منتظم کے پاس گئے تھے اور گرما گرم بحث کے بعد منتظم اس پر رضا مند ہو گیا تھا کہ دادی اماں کے پہلو میں ان کے لئے جگہ مخصوص کر دی جائے۔

شام ڈھلے بڑے میاں گھر کی طرف لوٹے کسی نے سہارا دیکر انہیں بس پر سوار کر دیا تھا۔ بس سے اترے تو کونے والے موچی نے انہیں دیکھا تو ان کی طرف لپکا' سہارا دیکر ساتھ لے آیا۔ چائے پینے پر اصرار کیا اور کہا "دادا ابا اتنے اداس نہ رہا کرو ہر شخص جانتا ہے کہ دادی اماں کتنی اچھی خاتون تھیں' اسی لئے تو ان کے جنازے کے ساتھ پورا قصبہ تھا۔"

شدید گرم چائے نے بڑے میاں کی طبیعت کچھ بحال کر دی تھی وہ موچی کی باتوں سے کچھ متاثر ہوئے تھے اس لئے کہنے لگے "یہ سچ ہے ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ برسوں پہلے جہاں وہ کام کرتی تھی وہاں بھی لوگ اب تک اس کے کام کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ اسے کام چھوڑے کئی برس ہو گئے تھے۔"

بڑے میاں گلی میں پہنچے تو رشتہ داروں اور عزیزوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا کہ بڑے میاں لوٹ آئے ہیں کہیں گم نہیں ہوئے۔ ایک ڈاکٹر جو وہاں موجود تھا اس نے دادی اماں کا ذکر کر کے کہا "کیا عورت تھی وہ' اس کے جنازے پر سارا قصبہ امڈ پڑا تھا۔ اتنے مہمانوں کو چائے پلانے کے لئے تو ایک اتنی بڑی ساوار کی ضرورت پڑتی ہے جس میں کم از کم پانی کی آٹھ بالٹیاں ڈالی جائیں میرا خیال ہے ہمارے قصبہ کو ایک ایسی ساوار کی ضرورت ہے' کیا خیال ہے ہم کیوں نہ سب مل جل کر چندے اور عطیات پر ایسی ساوار بنوا لیں۔"

بڑے میاں جلال میں آگئے "میرا بیٹا اکیلا ایسی ساوار خرید سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکر کر کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

قدرتی بات ہے کہ بڑے میاں کو بھلا چائے اور ساوار کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ وہ تو آج اپنی قبر کے لئے جگہ مخصوص کرا کے آئے تھے لیکن اب چونکہ وہ کتنے ہی لوگوں کے سامنے ساوار خریدنے کی حامی بھر چکے تھے س لئے یہ کام تو بہر حال انہیں پورا کرنا ہی تھا۔ بڑے میاں کے بیٹے نے انہیں مناسب رقم دے دی اور بڑے میاں اب ساوار کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے' کسی دکان پر مطلوبہ ساوار مل ہی جائے گا۔ لیکن انہوں نے ہر دکان پر جا کر دیکھ لیا لیکن ان کے مطلب کی ساوار انہیں کہیں نہ

ملی۔ ان کے کنبہ کے افراد البتہ خوش تھے کہ بڑے میاں کسی حد تک مصروف تو ہو گئے۔

بالآخر تلاش بسیار کے بعد بڑے میاں مطلوبہ سماوار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ قصبہ کے چیئرمین نے اس سماوار کو قصبے کے لوگوں کے سامنے وصول کیا۔ ایک تقریب کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ بڑے میاں کے اس عطیے پر سب نے تالیاں بجا کر داد دی۔

اس ہنگامے میں ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ اس سماوار کے حصول سے قصبے کی صرف نصف ضرورت پوری ہوتی ہے۔ قصبے میں شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے رکابیاں' میز پوش' کرسیاں اور دوسرے برتن مستعار لینے پڑتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم سب مل جل کر چندہ جمع کر کے یہ تمام ضروری اشیاء خرید لیں اور اجتماعی ملکیت کے طور پر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے وقت استعمال کریں۔ یہ تجویز فوراً" منظور کر لی گئی۔ جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان اشیاء کی خریداری کا فرض کسے سونپا جائے تو سب نے متفقہ طور پر بڑے میاں کا نام لیا۔ بڑے میاں احتجاج کرنے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے کچھ کہنا بھی چاہا لیکن ان کی آواز اور ان کے چہرے کے احتجاجی تاثرات تالیوں کی گونج میں گم ہو گئے اور بڑے میاں کو رضامندی کا اظہار کرنا پڑا کہ وہ یہ فریضہ بھی انجام دیں گے۔

قصبہ میں کتنے ہی ایسے گھرانے اور کنبے تھے جنہوں نے از خود اس اجتماعی کام کے لئے اپنا حصہ نہ بھجوایا۔ اس لئے بڑے میاں کو ان کے گھروں پر کئی بار جانا پڑا۔ کوئی کہتا کل آنا بڑے میاں' کوئی کہتا بھلا میں اتنے زیادہ پیسے کیوں دوں۔ فلاں نے تو اس سے بھی کم حصہ دیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جو اس جلسے میں شریک نہ ہوئے جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس لئے بڑے میاں انہیں ساری سکیم بھی سناتے اور اس کی ضرورت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالتے اور یوں خاصا وقت کٹ جاتا۔

بڑے میاں اب صبح ہوتے ہی گھر سے نکل پڑتے۔ آس پاس کے لوگوں کے ہاں جاتے۔ ان سے ان کے حصے کی رقم وصول کر کے دکانوں کا رخ کرتے۔ چیزیں خریدتے' انہیں سنبھال کر رکھتے۔ یوں سارا دن مصروفیت میں گزرتا۔ جب کبھی تھوڑی سی فراغت مل جاتی تو وہ اپنی بیوی کی قبر پر بھی چلے جاتے مگر ایسے موقعے اب کم ہی ملتے تھے۔

جب سب چیزیں خریدی جا چکیں تو بڑے میاں نے انہیں سکول کے شیڈ میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان پر ایک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس اجتماعی ملکیت کو خریدنا اور جمع کرنا مشکل کام نہ تھا' اصل کام تو ان کی حفاظت ہے۔ بعض گھرانے ضرورت کے وقت چیزیں لے جاتے لیکن واپس کرنا بھول جاتے۔ بعض لوگ چیزوں کو بدلی ہوئی صورت میں واپس کرتے۔ چائے دانیوں کی ٹونٹیاں ٹوٹی ہوئی ہوتیں' میزپوشوں کے کنارے سگریٹ سے جلے ہوئے' کانٹے ٹیڑھے ہو چکے ہوتے۔ اب بڑے میاں ان لوگوں کو سمجھانے پر تل جاتے' انہیں ذمہ داری کا درس دینے لگتے۔

موسم گرما شروع ہو گیا۔ قصبہ نے شجرکاری کے منصوبے کو ختم کر لیا تھا۔ ایک اخبار میں اس سلسلے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ضلع وار تفصیل سے بتایا گیا کہ اس ضلع میں کتنے درخت لگائے گئے تھے۔ اور بڑے میاں کے قصبے کو خصوصی اعزاز دیا گیا تھا۔ بڑے میاں کے پوتے نے یہ مضمون پڑھا تو زور زور سے ہنسنے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو پودے لگائے گئے تھے ان میں سے کتنے ہی سوکھ چکے تھے۔ بڑے میاں کو جوش جو آیا تو وہ اپنے قصبے کی ہر گلی بازار اور راستے کا چکر لگانے لگے۔ ایک ایک درخت گن ڈالا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ پچھلے برس ایک ہزار سات سو پودے لگائے گئے تھے جن میں سے صرف آٹھ سو چھ باقی بچے تھے۔ باقی تمام سوکھ گئے تھے۔ بڑے میاں کو بڑا جلال آیا اور وہ اس مقامی اخبار کے دفتر میں پہنچ گئے۔ جس نے یہ مضمون شائع کیا تھا۔ وہ بڑے جوش میں تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا گیا' حقائق کا علم ہونے پر انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ تردید شائع کریں گے۔ دو دن کے بعد اس اخبار میں بڑے میاں کے نام سے ایڈیٹر کے نام ایک خط شائع ہوا جس میں درختوں کی

صحیح تعداد بتائی گئی تھی۔ اسی شام کو جب بڑے میاں موچی کے ہاں بیٹھے اپنے جوتے پالش کر رہے تھے اور مزے لیکر بتا رہے تھے کہ ضلع کا چیئرمین پودے اگانے میں ناکام رہا ہے تو اتفاق سے چیئرمین کا بھی ادھر سے گزر ہوا۔ وہ تو خط کی اشاعت پر پہلے ہی بھنایا ہوا تھا بڑے میاں کو دیکھ کر بولا "یہ سب لوگ جو بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے تنگ کرتے رہتے ہیں' بڑے میاں تمہارا ایک پاؤں قبر میں ہے تم ان جھنجھٹوں میں کیوں پڑتے ہو۔" بڑے میاں کوئی سخت جواب دینے ہی والے تھے کہ اپنی زبان روک لی۔ اور سر جھکائے گھر کی طرف چل دیئے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہے تھے کہ کہیں چیئرمین کو یہ علم تو نہیں ہو گیا کہ میں اپنی بیوی کے پہلو میں ایک قبر کی جگہ مخصوص کرا چکا ہوں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے قبرستان کے منتظم کے نام لکھنا شروع کیا۔

"جناب میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پرزور اصرار پر آپ نے میرے لئے جو قبر میری بیوی کی قبر کے قریب درخت کے پاس مخصوص کی تھی مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ قبر کی یہ جگہ کسی ضرورت مند کو دے دی جائے۔ یہ لکھ کر انہوں نے دستخط ثبت کئے' پھر لفافے پر پتہ لکھنے لگے تو سوچ میں پڑ گئے کیونکہ انہیں قبرستان کا پتہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے خط کو لفافہ میں رکھا اس کو بند کیا اور پھر مہر لگا کر اپنے پوتے سے کہا۔ یہ خط قبرستان کے منیجر کو خود پہنچا کر آؤ"

پروین ملال / طاہر آفریدی

قبرستان

ہم اس قبرستان میں رکے ہوئے ہیں اور کہیں جا نہیں سکتے۔ یہ قبرستان بہت بڑا اور بہت وسیع ہے۔ جہاں تک نظریں جا سکتی ہیں وہاں تک قبروں کا سلسلہ دکھائی دے رہا ہے۔ مگر ہم اس قبرستان کے حصار میں ہیں اور کسی طرف سے باہر نکل نہیں سکتے۔ یہ قبرستان بہت ہیبت ناک اور یہ قبریں بہت خوفناک ہیں۔

موت بھی عجیب ہے۔ مردے کو ہر چیز سے بے نیاز بنا دیتی ہے۔ اگر ان قبروں کے مردے زندہ ہوتے تو انہیں ہر چیز کی ضرورت ہوتی۔ روٹی کپڑے اور دواؤں اور زندگی کی بہت ساری دوسری چیزوں کی ضرورت! مگر اب یہ دیکھو! سب ہی بڑے صبر و سکون سے لیٹے ہوئے ہیں۔ اگر یہ زندہ ہوتے تو کتنا شور مچاتے۔ کوئی روتا' کوئی ہنستا' کوئی نوحے کرتا' کوئی گانے گاتا اور کوئی ٹھنڈی آہیں بھرتا' فریاد کرتا۔ مگر اب یہ سب ایک دائمی خاموشی میں پڑے ہیں۔۔۔ ہر روز اس قبرستان پر مشرق سے سورج طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ خزاں آتی ہے اور بارشیں ہوتی ہیں' اور گرمی کی پیاس بھی! مگر قبرستان اپنے حال میں ہے اور بہت متانت اور صبر سے یہ سب کچھ اپنے آپ پر برداشت کرتا ہے۔۔ اور قبرستان کے مردے بھی اپنی قبروں سے سر نہیں اٹھاتے اور نہ شکوہ شکایت کرتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

دوسری بات یہ کہ ہم زندہ سانس لینے والے بھی اس قبرستان میں قید ہو گئے ہیں۔

ہم اس قبرستان میں بہت عرصے سے زندگی گزار رہے ہیں بس! یا زندگی کے نام پر کچھ اور کر رہے ہیں۔ ہم روٹی کھا رہے ہیں۔ مگر بھوکے ہیں' کپڑے پہنتے ہیں مگر ننگے ہیں' پانی موجود ہے مگر پیاسے ہیں۔ محبت نہیں جانتے' ہم مذہب سے ناآشنا ہیں اور انسانیت کا تو صرف نام سنا ہے۔ ہماری آنکھیں بھی ہیں' مگر ان سے دیکھتے نہیں' کان بھی ہیں مگر کچھ سنتے نہیں۔ یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ خود بھی نہیں سمجھتے۔ ہم نے ایک دوسرے کے گریباں پکڑ رکھے ہیں' ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور جب بھی موقع ملے ایک دوسرے پر وہ ظلم ڈھا رہے ہیں کہ جنگل میں درندے بھی شاید ایسا نہ کرتے ہوں۔ یہ ہم پر کیا بیت رہی ہے؟ یہ کس کے ہاتھوں ہو رہا ہے؟

ایک بات اور! ہمارے درمیاں اس قبرستان میں بادشاہ بھی ہے ایک نہیں کئی بادشاہ! قبرستان کے بادشاہ! مردوں کے بادشاہ! ان کا شمار سینکڑوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ بادشاہ آپس میں بھی بغض و عناد رکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ بھی!۔۔ ہمارے ساتھ تو اس طرح پیش آتے ہیں جیسے ہم نے آدم سے ابھی تک ظلم ہی کیا ہو اور یہ اب ہم سے اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔۔۔ ان بادشاہوں نے قبرستان میں جگہ جگہ' کونوں کونوں پر جھنڈے گاڑ کر اپنے لیے مقام بنا لیے ہیں اور قبروں پر کرسیاں رکھ کر' تخت بچھا کر حکومت کر رہے ہیں۔۔۔۔ ان کی حکومتیں نہ دین کو جانتی ہیں نہ مذہب کو' نہ قانون اور نہ انسانیت کو! بس ہماری زندگی اور موت کی سوداگری کرتے ہیں۔۔۔ حقیقت میں اس قبرستان کے مردے تو ہم ہیں یہ قبریں تو ہر روز ہمارے لیے اور ہم پر ہی بنتی ہیں۔ یہ قتل کیے گئے

مردے تو سب کے سب ہم ہی ہیں۔

ہم زندہ بھی ہیں اور مردہ بھی! عجیب نظارہ ہے زندہ بھی اور مردہ بھی! ہم جتنے بھی قتل ہوتے ہیں۔ ان بادشاہوں کی پیاس بڑھ جاتی ہے۔ ہم روزانہ سینکڑوں' ہزاروں کی تعداد میں مرتے ہیں۔ قتل ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کی پیاس پہلے جیسے تھی اب بھی ویسے ہی ہے۔۔۔

ہماری کوئی فریاد نہیں سنتا۔ جتنا بھی ہم چیخیں' چلائیں مگر ایسا کوئی نہیں کہ ہماری سن لے۔۔۔ اف اللہ! یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟

ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ ہمارے ان بادشاہوں نے سب کچھ ہم سے چھین لیا ہے ہاں! اب کچھ بھی ہمارے پاس نہیں رہا ہے۔ ہمارے گھروں کی دیواریں' کمروں کی کھڑکیاں' دروازے اور یہاں تک کہ ہماری شناخت' ہمارا نام و نشان تک ہم سے چھین لئے گئے ہیں۔ ہم قبروں میں بیٹھے ہیں اور زندگی کے دن رات گزار رہے ہیں۔

کبھی کبھی سرگوشیوں میں یہ بھی سن رہے ہیں۔ یہ بادشاہ اس قبرستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپس میں بانٹ لیں گے۔ سب سے بڑھ کر دکھ کی بات تو یہ ہے کہ مردوں کی ہڈیاں بھی نکال کر تقسیم کریں گے۔۔۔ وہ ان مردوں کی ہڈیوں کو کسی فائدہ کے لیے تقسیم نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ کام اپنی ناسمجھی اور سرکشی کے سبب کر رہے ہیں۔ مردوں کی ہڈیوں کی تقسیم!۔۔۔ یہ مردے تو خود انہوں نے قتل کئے ہیں۔۔۔ اسی قبرستان کے مردے ہمارے خوابوں میں آکر ہمیں بتاتے ہیں کہ "ہمیں انہوں نے ہی قتل کیا ہے۔۔ آخر اتنے سارے لوگوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی وحشت سیر کیوں نہیں ہوتی؟ جب یہ بادشاہ کبھی کبھی آپس میں صلح کرنے لگتے ہیں تو وہ دن ہمارے لیے عید کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ مگر بدقسمتی تو یہی ہے کہ ان کی اس صلح کو دوام حاصل نہیں اور وہ پھر بہت جلد جھگڑنے لگتے ہیں۔ جھگڑتے تو وہ ہیں اور نقصان ہمیں پہنچتا ہے' تباہی ہماری ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ آپس میں اس بات پر متفق ہو گئے ہوں کہ وہ اسی طرح لڑتے رہیں گے اور دوسروں کو اسی طرح قتل کرتے رہیں گے۔ مارتے رہیں گے۔۔ وہ ایک دن جھگڑنے کے بعد دوسرے دن پھر آپس میں مل کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ مگر ہمارے سروں کی کٹائی شروع ہو جاتی ہے اور ہزاروں ہاتھوں پیروں کے ڈھیر بن جاتے ہیں اور کھوپڑیاں مٹی میں لوٹتی پوٹتی ہیں۔

آہ خدایا!

دیکھو تو! وہ پھر ایک دوسرے پر غصے ہو رہے ہیں' ایک دوسرے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب پھر اس قبرستان میں ہمارا سرخ اور تازہ خون بہے گا۔ اب پھر ہمارے خون سے پیاسی زمین سیراب ہو جائے گی۔ زمین! مٹی! ہر روز روتی ہے' چیختی ہے' چلاتی ہے' آہیں بھرتی ہے اور کہتی ہے۔

"اب ہم سے مزید انسانی خون نہیں پیا جاتا۔ ہم اور انسانی خون نہیں پی سکتے۔"

مگر سننے والا کون ہے؟

دیکھو! دیکھو! وہ پھر غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ نجانے اب کیا ہو گا۔۔۔ اب کی دفعہ اگر ان کا جھگڑا شروع ہوا تو ہم سب کے سب مارے جائیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔ ہاں! ایک بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔۔۔ ہم اپنی آنکھیں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ ہمیں پھر قتل کر رہے ہیں۔ مگر ہم میں مزاحمت کی روح مر چکی ہے۔ ہم ان کے مقابلے پر اٹھتے نہیں اور اتفاق نہیں کرتے۔ ہم چیختے چلاتے بہت ہیں مگر ہماری آوازیں اس

لیے بے اثر ہو چکی ہیں کہ ہم میں اتفاق نہیں۔ ہاں! اگر اس بار وہ لڑ پڑے تو ہم سب مارے جائیں گے اور صرف وہ قبرستان کے بادشاہ زندہ رہ جائیں گے اور یہ قبرستان باقی رہ جائے گا۔ اکیلے وہ ہوں گے اور یہ مردے ہوں گے۔۔۔ بے حساب اور بے شمار مردے۔۔۔ ہماری باری آنے والی ہے۔ شاید ہم حتمی طور پر مر جائیں۔۔۔ اس لیے کہ ہم آپس میں اتفاق اور اتحاد نہیں رکھتے۔

شفق ستانیزئی / قیوم مروت

صاحب! جیسے آپ کی مرضی.....!

کئی سال پہلے جب افغانستان میں انگریز کی حکومت تھی۔ ایک دن ایک پریشان حال آدمی انگریز حاکم کے دفتر میں حاضر ہوا۔ اور دفتر کے ہیڈ کلرک سے کہا۔

" صاحب ۔ میں گھر سے نوکری کے لئے نکلا ہوں۔" عرضی بڑھاتے ہوئے "یہ میری عرضی ہے۔ اگر کوئی نوکری دلا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔" بابو صاحب نے اس سے درخواست لیتے ہوئے درخواست پر نظر ڈال کر پوچھا۔ "یہ تم نے خود لکھی ہے؟" "جی ہاں۔ میرا نام غلام ہے۔ آپ کی دعاؤں کی برکت ہے۔ کہ یہ میں نے خود ہی لکھ لی ہے" بابو صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے کب تمہیں دعائیں دی ہیں۔؟" غلام نے سرتاپا انکسار ہو کر کہا۔ "بس صاحب آپ کی دعاؤں کی برکت ہے۔" پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔ "صاحب۔ میں نواب خان کا آدمی ہوں۔ وہ آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔"

بابو صاحب نواب خان کا نام سنتے ہی چونک پڑا۔ اور کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "اچھا۔ اچھا۔ تو تم نواب خان کے آدمی ہو۔؟"

غلام نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں۔ میں نواب خان کا آدمی ہوں۔"

بابو نے کہا ۔ "خان صاحب کو میرے احترامات اور تعظیمات پہنچا دیں اور کہیں کہ ہم ہر وقت آپ کی خدمت کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اور جب بھی کوئی کام ہو تو مجھے حکم دیا کریں۔" غلام نے کہا۔ "سر آنکھوں پر جناب ۔۔۔! میں آپ کے سلام اور آداب ان تک پہنچا دوں گا۔"

اس دن کی تمام ڈاک اور غلام خان کی درخواست بابو صاحب نے انگریز جان ٹن کے سامنے میز پر رکھ دی جان ٹن کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ نیلی اور قدرے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس کے سرخ و سفید چہرے پر بہت پرکشش معلوم ہوتی تھیں۔

جان ٹن نے بابو صاحب سے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہے کہ انٹرویو کرنا ضروری ہے....؟ ایسا کرتے ہیں..... میں باہر کھڑکی کے قریب بیٹھ جاتا ہوں۔ اور تم دونوں کی باتیں نوٹ کرتا ہوں۔ تم اس سے انٹرویو کر لو۔ کیوں کہ میرے سامنے اکثر لوگ گھبرا جاتے ہیں اور تمہارے ساتھ ٹھیک ٹھاک باتیں کرتے ہیں۔" بابو صاحب نے کہا. "ٹھیک ہے سر۔" اور دفتر سے نکل گیا۔

اگلی صبح غلام مقررہ وقت پر بابو صاحب کے پاس آیا۔ اور احتراماً" سینے پر ہاتھ رکھ کر دہرا ہو کر سلام کیا۔ بابو نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ اور سوالات شروع کر دیئے۔

بابو: "تمہارا نام؟"

غلام: "آپ اور جان نن صاحب کی جو مرضی۔"

بابو: "اس میں ہماری کیا مرضی۔؟ تم اپنا نام بتاؤ۔ میں لکھ لیتا ہوں۔"

غلام: "بعض لوگ مجھے غلام کہتے ہیں۔ اور نواب خان غلامو۔ لیکن آپ اور جان نن صاحب کی جو مرضی ہو۔"

بابو نے اس کا نام لکھ لیا۔ اور کہا۔ "تم عجیب آدمی ہو۔ اپنا نام بھی اوروں کی مرضی پر چھوڑتے ہو۔ "تمہارے والد کا کیا نام ہے؟"

غلام: "میرا والد نہیں ہے۔ جیسے آپ کی مرضی ہو۔ وہی لکھ لیں۔"

بابو: غلام یہ کیا کہہ رہے ہو؟

غلام: "صاحب۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ میری ساری زندگی دوسروں کے گھروں میں پل بڑھ کر گزری ہے۔ ہر ایک نے مجھے کچھ عرصے کے لئے بیٹے' بچے' بچو اور کیا کیا نام دیا۔ اور پھر گھر سے نکال دیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ کہ میرا کوئی باپ تھا بھی یا نہیں۔؟"

بابو: "حیرت ہے؟ تو تم نے لکھنا پڑھنا کہاں سیکھا۔؟"

غلام: "صاحب ۔ میں نواب خان کے پاس نوکر تھا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ اس کے بیٹوں کو مکتب پہنچاتا۔ واپس لاتا۔ ان کے ساتھ کتابیں اٹھا کر لے جاتا۔ میرا اور کوئی کام نہ تھا..... مکتب کے ایک بوڑھے معلم کو مجھ پر ترس آیا۔ اس نے مجھے دوسرے لڑکوں کے ساتھ بٹھایا۔ اور یہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا وہیں سیکھا۔"

بابو: "تم نے کمال کیا ہے۔ کہ ایسے حالات میں بھی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔"

غلام: (سینے پر ہاتھ رکھ کر) "صاحب۔ یہ آپ کی دعاؤں کی برکت ہے۔"

بابو نے اسے گھور گھور کر دیکھا۔ اور خاموش رہا۔

بابو: "کس ولایت (صوبہ) کے رہنے والے ہو۔؟ کس قوم سے تعلق رکھتے ہو؟ گاؤں کا کیا نام ہے۔؟"

غلام: "صاحب .... بے ولایت ہوں۔ بے قوم ہوں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اور ابھی ملک نواب خان کے گاؤں سے آیا ہوں۔"

بابو نے اس سے مزید استدلال کرنا چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ وہ کہتا جاتا۔ وہی لکھتا جاتا۔

بابو: "اچھا یہ بتاؤ۔ کہ ایمانداری اور صداقت میں کیسے ہو۔؟"

غلام: "صاحب۔ جیسے آپ ہیں۔"

بابو: "تمہیں مجھ سے کیا۔؟ تمہیں میرا کیا پتہ .....؟ اپنی بات کرو۔"

غلام: "صاحب۔ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

بابو: "کس کے مذہب پر ہو؟"

غلام: "ملکوں کے گاؤں میں ملک نواب خان کے مذہب پر تھا۔ اب جیسے آپ کی مرضی۔"

بابو: (غصہ سے) "مجھے تو تم پاگل دکھائی دیتے ہو.... آپ کی مرضی۔ اور آپ کی مرضی۔ مذہب میں بھی میری مرضی۔؟ ..... کوئی اور بات بھی تمہیں آتی ہے یا نہیں؟"

غلام: "صاحب۔ آپ کی مرضی میری مرضی۔ جو مجھے آتا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔ اگر یہ غلط ہو تو آپ بتا دیں پھر میں ویسے ہی کہوں گا۔"

بابو: (مزید غصے میں آکر) "چلو .... جاؤ .... مشکل ہے کہ تمہیں اس عقل کے ساتھ کوئی نوکری دے دے .... یہ انگریز ہیں انگریز.... بال کی کھال نکالتے ہیں۔ تم جیسے کم عقل کو کیسے رکھیں گے۔؟ ہر بات میں آپ کی مرضی۔ آپ کی مرضی۔ جیسے آپ کی مرضی .....!"

غلام کرسی سے اٹھا۔ بابو کو نہایت احترام کے ساتھ سلام کیا۔ اور کہا۔

"صاحب۔ جیسے آپ کی مرضی ..... صاحب جیسے آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر باہر جانے کی اجازت طلب کی۔ اور سلام کر کے دفتر سے نکل گیا۔ جان ٹن صاحب نے یہ تمام باتیں سن لیں۔ اس کے ساتھ اس وقت ایک ملک بھی بیٹھا تھا۔ بابو نے فائل جان ٹن صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "صاحب۔ یہ شخص تو نرا احمق تھا۔ عقل سے بالکل کورا۔ ہر بات میں کہتا تھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔ آپ کی مرضی۔ یہاں تک کہ نام کے بارے میں بھی کہا۔ آپ کی مرضی۔"

جان ٹن صاحب ہنس پڑا۔ اور بابو سے کہا۔ "اس پوسٹ کے لئے مجھے آج تک اس جیسا ہوشیار آدمی نہیں ملا۔ جاؤ اسے بلا لاؤ۔ میں نے اسکی تمام باتیں سن لی ہیں۔"

بابو: "صاحب۔ مجھے تو اس کی باتوں میں عقل و فکر نام کو نہیں ملا۔"

جان ٹن: "تمہارے عقل کے ترازو میں اس کی باتیں ہلکی نکلیں۔ اس لئے کہ تم جوہر شناس نہیں ہو۔ لیکن میری عقل کے ترازو میں اس کی باتیں خاص طور پر یہ بات کہ "ملکوں کے گاؤں میں نواب خان کے مذہب پر تھا۔ اب جیسے آپ کی مرضی" بہت ہی وزن دار لگی۔ اس قسم کے لوگ بہت کامیاب اہلکار ثابت ہوتے ہیں سرکار کی کامیابی۔ موافقت۔ اور دوام کا رمز ایسے ہی اہلکاروں پر منحصر ہوتا ہے۔ تمہیں پتہ نہیں۔ مجھے اس کی عقل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اسکی مذہبی طاعت کی ہے کیونکہ مجھے مشیر، دوست اور ساتھی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک فرمانبردار اہلکار کی ضرورت ہے۔ حکم میرا ہو۔ اور ہاتھ پاؤں اسکے۔" جان ٹن نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ملک خان میر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں ملک صاحب۔ تمہارے ساتھ کس قسم کے آدمی گزارہ کر سکتے ہیں۔"

ملک خاں میر نے جواب دیا۔ "صاحب ..... جو ہمارے مذہب پر ہو۔ اور جو ہر حالت میں ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ اور اگر ہمارے ساتھ داؤ پیچ کھیلنے لگے۔ تو اسے گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے...."

جان ٹن نے اس بات پر ملک خان میر کو تھپکی دیکر کہا۔ "ویل ...... آفرین .... تم بھی بڑے کام کے آدمی ہو۔" پھر بابو سے کہا۔ "جاؤ۔ اسے لے آؤ ایسا نہ ہو کہ وہ نکل جائے۔"

بابو صاحب غلام کے پیچھے دوڑ پڑا اور اسے کہا "واپس آجاؤ۔ جان ٹن صاحب تمہیں بلا رہا ہے۔" "غلام اسی وقت مڑا۔ اور کہا "اچھا صاحب۔ جیسے آپ کی مرضی....." کہتے ہیں۔ غلام نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنی ترقی کر لی کہ جان ٹن صاحب کے دفتر کا مکمل اختیار اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اور وہ بابو صاحب جو اسے کم عقل سمجھ رہا تھا۔ اسکی ماتحتی میں کام کرنے لگا۔ لوگ اسے غلام کی جگہ غلام خان کہنے لگے۔

جب جان ٹن کی ٹرانسفر دوسری جگہ پر ہو گئی۔ تو اس نے آنے والے انگریز کو اسکی استعداد کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کر دیں۔ اور اسے خصوصی طور پر اس کے سپرد کر دیا۔ اس طرح اس قسم کی رپورٹوں کے ساتھ دوسرے آنے والے انگریزوں کے سپرد ہوتا گیا۔

میں نے اپنے خیال میں آپ کو ترقی اور کامیابی کا گر بتا دیا ہے۔ اب آگے صاحب۔ جیسے آپ کی مرضی۔

یلدرین بے / اعجاز احمد فاروقی

روایت

گولیاں سنسناتی ہوئی تواتر کے ساتھ دائیں جانب سے چلی آرہی تھیں۔ السانڈرو پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا تھا بچاؤ کی یہی صورت اس وقت ممکن تھی۔ السانڈرو تو بچ گیا اس کا کوہستانی گائیڈ نہیں بچ سکا۔ ایک گولی اس کی حس و حرکت کا خاتمہ کر گئی تھی۔ اس نے اپنے فوجی سازوسامان کے تھیلے سے دوربین نکالی' چہار سو کا جائزہ لیا ایک طرف قریباً" ایک ہزار گز کے فاصلے پر چند ایک سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے اس نے بھانپ لیا کہ گولیاں اسی جانب سے آ رہی ہیں۔

شام ہونے والی تھی پہاڑوں پر میدانوں کی نسبت اندھیرا جلد چھا رہا تھا اپنے گائیڈ کی وفات سے وہ بے سہارا ہو گیا تھا موت کا خطرہ اور خوف پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ گزشتہ بارہ گھنٹوں سے وہ مسلسل پیدل چل رہا تھا اور اب تو اس کے جسم کا عضو عضو تھک گیا تھا اور پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ زاد راہ بھی کم مکا گیا تھا پانی کی ضرورت ہر شے سے فزوں تر ہو گئی تھی۔

السانڈرو نے اپنے آپ سے کہا "شاید میں انہی پہاڑوں میں بھوک اور پیاس کی شدت سے مرجاؤں گا!"۔

اگرچہ وہ نہ تو وہاں رک سکتا تھا اور نہ چل سکتا تھا لیکن اس کو ہر قیمت پر چلنا ہی تھا اس لئے جیسے تیسے بھی بن پڑا وہ چلتا ہی رہا۔ وہ کب تک چلتا رہا' اس کو معلوم نہیں ہو سکا ایک جگہ آبادی کے آثار دکھائی دیئے تو اس میں مزید ہمت جاگی اس نے اب اس کی پروا نہیں کی' وہ دوست آبادی ہے یا کہ دشمن آبادی وہ شتم پشتم آبادی کے پہلے مکان تک پہنچ گیا۔ دروازے کو دو تین بار تھپتھپایا پھر چکرایا اور زمین پر گر گیا' اور بے ہوش ہو گیا۔

اور جب اس کو ہوش آیا تو وہ ایک نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور ایک معمر آدمی گرم شوربے کا پیالہ لئے اس کے سرہانے ایستادہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کا پورا وجود دہل گیا' بوڑھے کا سراپا اور لباس اس بات کے ثبوت تھے کہ وہ البانیہ کا باشندہ ہے اور اس کے ملک اٹلی نے چند ہی ہفتے قبل البانیہ کو اپنی کالونی بنانے کے لئے اس پر حملہ کیا ہوا تھا اور وہ خود بھی اسی فوج کا میجر تھا۔

"اگر اس بوڑھے کو میری اصلیت کا علم ہو گیا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا"

میجر السانڈرو نے اپنے آپ سے کہا۔

اور میجر السانڈرو سے اس معمر البانوی نے کہا۔

"آپ بیس گھنٹوں کے بعد جاگے ہیں یہ گرم گرم شوربا پی لیں اس سے آپ کی باقی ماندہ تھکن بھی کافور ہو جائے گی اور توانائی عود کر آئے گی۔

"کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ میں اطالوی فوج میں میجر ہوں جس نے آپ کے ملک پر حملہ کیا ہے؟"

میجر نے سہمے اور مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔
" لیکن میجر ہونے سے قبل آپ ہمارے مہمان ہیں البانوی تو مہمان نوازی کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے' آپ نچنت ہو کر شوربا پینے کی کریں"
"لیکن میری فوج نے آپ کے ملک پر جو مظالم کئے ہیں وہ......"
"وہ میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں" ۔ بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔
"تو کیا میں آپ کی قید میں ہوں؟"
"جی نہیں' ہرگز نہیں آپ قیدی نہیں مہمان ہیں"
"لیکن کیوں؟"
" آپ میرے گھر کے دروازے کے باہر بے ہوش پڑے تھے اس لئے آپ ہمارے مہمان ہیں پھر یہ کہ آپ خود آئے تھے اور ہم آپ کو کہیں سے پکڑ کر نہیں لائے تھے۔ جب تک آپ میرے مہمان ہیں تو امان میں ہیں اور جائے امان میں ہیں"
"گویا میں چاہوں تو یہاں سے جا سکتا ہوں؟"
"بلاشبہ' بلاشبہ"
" آپ تو عجیب مہربان اور خلیق لوگ ہیں"
"ہاں' اگر جاتے وقت آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہوئی تو میں اپنا گھوڑا بھی پیش کر دوں گا"
" آپ کا بے حد شکریہ"
" اچھا' کیا کھانا ابھی کھائیں گے یا کچھ دیر بعد ؟۔ آپ اطالوی اور عیسائی ہیں تو شراب بھی پیتے ہوں گے لیکن میں مسلمان ہوں اس لئے شراب فراہم نہیں کر سکتا البتہ میری بیٹیوں نے آپ کا پھٹا ہوا فوجی کوٹ مرمت کر دیا ہے آپ کے ناکارہ اور پھٹے ہوئے جوتے میں نے پھینکوا دیئے ہیں اور مراکشی چمڑے کے نئے بوٹ منگوا لئے ہیں آپ کے لئے نئی قمیض بھی سل چکی ہے۔" بوڑھا مسلسل بول رہا تھا اور میجر السانڈرو مسلسل حیران ہو رہا تھا۔
"میں نے اپنے فوجی کیمپ جانا ہے میرے گائیڈ کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور میں گرتا پڑتا ادھر پہنچ گیا۔"
میجر نے شرمسار ہو کر کہا۔
" آپ ضرور جائیں' جب جی چاہے جائیں لیکن کھانا کھائے بغیر آپ نہیں جا سکتے"
اچھا تو جیسے آپ کی مرضی۔
حسب روایت دسترخوان بچھایا گیا۔
میجر السانڈرو نے بڑے اطمینان کے ساتھ سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد اپنے میزبان شان بیگ سے پوچھا۔
"تازہ ترین خبریں کیا ہیں؟"
" آپ کے لئے اچھی اور میرے لئے بری خبر یہ ہے کہ اٹلی نے البانیہ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمارا بادشاہ فرار ہو گیا ہے"
میجر کے ذہن میں آیا کہ بوڑھا اس لئے اس کی خاطر مدارت کر رہا ہے کہ اب وہ ایک مفتوحہ ملک کا شہری ہے اس نے بڑے تکبر اور فخر سے کہا۔
"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھلاؤں گا آپ میری بات کا یقین کر لیں"

بوڑھا بھی اس کے اندرونی تموج کو بھانپ گیا تھا اس نے فی الفور کہا۔
"آپ کی تکریم اور عزت کی وجہ یہ ہے کہ آپ میرے مہمان ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی غلط فہمی کی ضرورت نہیں ہے۔ کاش کہ آپ اطالوی فوج کے میجر نہ ہوتے۔"
"میں ایسی مہمل باتیں سننے کا خوگر نہیں ہوں، سمجھے"
"یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ اطالوی ہیں، سینئور السانڈرو، آپ میدان جنگ میں ہمارے دشمن ہیں لیکن اس وقت کہ آپ میرے گھر میں ہیں اور میرے بس میں ہیں اور مہمان ہیں یہی خاطرمدارت کی وجہ ہے اسے کوئی کمزوری اور چاپلوسی مت سمجھئے۔ اور ہاں یہ فیرنی تو آپ نے چکھی ہی نہیں اسے بھی چکھیں۔"
"واہ، واہ یہ تو بڑی لذیذ ہے۔ اس چپقلش کو جنگ مت کہیں یہ تو بس ایک کھیل تماشا تھا۔ آپ کی فوج تو بغیر مقابلے کے فرار ہو گئی تو میں کیا کروں۔ ویسے آپ لوگ غضب کے نشانے باز ہیں۔ کل کسی نے ہزار گز کے فاصلے سے میرے گائیڈ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا"
بوڑھا آدمی یہ سن کر چپ رہا اچانک گھر کے اندر سے آہ وفغان کی آوازیں آنے لگیں۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ اس جنگ میں میرے پانچوں بیٹے شہید ہوئے ہیں ان کی لاشیں بس ابھی آئی ہیں۔ میرے اہل خانہ اس لئے رونے لگے ہیں میں خود بھی محاذ جنگ پر تھا لیکن بس شہادت کی سرفرازی نصیب نہیں ہوئی"
یہ سن کر میجر السانڈرو ٹھرا کر چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کہیں اس کے بیٹے میری گولیوں سے ہلاک نہ ہوئے ہوں۔ تاہم اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"جنگ میں معلوم نہیں کیا کیا ہوتا ہے میری خواہش ہے کہ آپ تادیر سلامت رہیں"
"ہاں۔ لیکن آپ میرے مہمان ہیں اس لئے چنتا نہ کریں"
بوڑھے نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔
"آپ لوگ بڑے عالی ظرف مہمان نواز ہیں میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ ہماری حکومت آپ کے احسانات کا بدلہ ضرور چکائے گی"
السانڈرو نے کہا۔
بوڑھے نے یہ سن کر کہا
"سینئور السانڈرو مہمان نوازی تو ہماری قدیم روایت ہے اور ہم اسے کسی انعام کے لئے نہیں کرتے۔ یہ علاقہ اطالوی فوج کی رسائی سے باہر ہے۔ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو ہمارے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ ہاں ہماری مہمان نوازی کی ایک اور بات بھی نوٹ کر لیں۔ اس علاقے کے ایک آدمی نے اپنے ہی پڑوسی کی بیوی کو ہلاک کر دیا۔ مقتولہ کے شوہر نے قسم اٹھائی کہ وہ قاتل کو نہیں چھوڑے گا لیکن اگلے ہی روز قاتل مقتولہ کے گھر میں مہمان بن کر آگیا اور کئی برس وہیں مہمان کی حیثیت ہی سے رہتا رہا"
"اچھا اب مجھے جانا ہے اجازت دیں۔" میجر نے کہا
"جیسے آپ کی مرضی، سینئور"
بوڑھے کے حکم پر اس کے ملازم نے سینئور السانڈرو کی واپسی کے لئے گھوڑا تیار کروایا۔
میجر السانڈرو نے اپنی رائفل کاندھے پر لٹکائی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

شان بیگ اس کو رخصت کرنے کے لئے دور تک اس کے ساتھ آیا اور ایک جگہ رک گیا۔
"اس جگہ میرے علاقے کی حد ختم ہوتی ہے"
اب میجر السانڈرو نے دیکھا کہ میزبان نے مہمان پر اپنی بندوق تانی ہوئی تھی۔ موت کے خوف نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ اپنے معمر میزبان کی یہ کایا پلٹ اس کے لئے لکیر معمہ تھی۔ اس نے ہکلا کر کہا۔
"س۔ ی۔ یہ ...... آپ کیا کر رہے ہیں؟"
"وہی کچھ جو مجھے کرنا چاہئے"
"آپ آپ آپ اپنے مہمان کو مارنا چاہتے ہیں کیا؟"
"ہاں"
"لیکن کیوں؟"
"سینتور السانڈرو، تم نے اس قاتل مہمان کی پوری سرگزشت نہیں سنی، اگر سن لیتے تو بچ جاتے۔ وہ قاتل مہمان بن کر مقتولہ کے شوہر کا مہمان بن کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور کئی برس ان کے ہاں رہا۔ مقتولہ کے شوہر نے اس کو کچھ نہیں کہا لیکن ہونی شدنی جسے تم اپنی زبان میں "سارا سارا" کہتے ہو وہ ایک دوسرے گاؤں میں چلا گیا تھا اور یوں وہ اب اپنے میزبان کا مہمان نہیں رہا کیونکہ وہ اب اس کے علاقے میں نہیں رہا تھا مقتولہ کے شوہر نے وہیں پہنچ کر اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ سینتور آپ بھی اب میرے علاقے میں نہیں ہیں اس لئے اب میرے مہمان نہیں دشمن ہیں۔ میرے بیٹوں کے قاتل، میں نے کافی شہادتوں کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرے بیٹوں کے قاتل آپ ہی ہیں۔ اب میں اپنے ہر بیٹے کا نام لے کر ایک ایک گولی ماروں گا۔"
السانڈرو تو یہ سنتے ہی جیسے مرنے سے قبل ہی مر گیا۔
سنان نے اس کو یکے بعد دیگرے پانچ گولیاں مار کر ختم کر دیا۔ پھر لات مار کر ایک اتھاہ کھڈ میں گرا دیا۔
گھر واپس آکر بوڑھا اپنے بیٹوں کی لاشوں پر گر پڑا اور بے اختیار رونے لگا۔

جرم ضعیفی

اس نے اپنی چیخ ' اپنے گندے دانتوں کے پیچھے دبا رکھی تھی اور بھاگ رہی تھی۔ حالانکہ تمام کونے کھدروں سے بہت سی آوازیں اسے پکار رہی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے چہرے جھانک رہے تھے۔ مگر وہ بھاگ رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے اپنے ہونٹ بند کر رکھے تھے تاکہ اس کی بھنچی ہوئی چیخ باہر نہ نکل سکے۔ اس کی ایڑیاں ' کنکریٹ کے بنے ہوئے اس ہائی وے پر دوڑتے ہوئے درد کر رہی تھیں جو اب ٹوٹ پھوٹ چکا تھا لیکن کبھی جس پر بہت مسافر سفر کیا کرتے تھے۔

نہیں ۔ نہیں ۔ اس نے سسکاری بھری۔ اور دوڑتی رہی۔

جا بجا اگی ہوئی جھاڑیاں اس کے پیروں سے چمٹ رہی تھیں جسے وہ دوڑتے ہوئے رک رک کر صاف کرتی جا رہی تھی۔

روڈ پر اس کے سامنے اپنے منزل کے انتخاب کی آسانیاں تھیں۔ زیر زمین پناہ گاہیں غاروں کے دروازے ' وہ کسی طرف مڑ سکتی تھی مگر اس نے فیصلہ کیا کہ اسی روڈ پر دوڑتی رہے گی تاکہ بھٹک کر مدد سے بالکل ہی محروم نہ ہو جائے۔

"ادھر ' ادھر آجاؤ" ایک عورت نے اسے پکارا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی پناہ گاہ کی طرف اشارہ کر کے اسے بلا رہی تھی کیونکہ وہ ابھی جوان ہی تھی اور رس بھری تھی۔

"نہیں ۔ نہیں" وہ ہانپتے ہوئے کراہی ۔ کیونکہ ابھی اس کی عمر صرف تیس سال تھی' وہ منفرد تھی۔ کھا لئے جانے میں کوئی حرج نہ تھا کیونکہ انسانوں کو زندہ رہنا تھا' لیکن موت کا تصور بڑا خوفناک تھا۔ سیدھی سی بات تھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی کم از کم ابھی۔ وہ دوڑ رہی تھی۔ وہ وقت سے پہلے بالکل مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کبھی مرنا نہیں چاہتی تھی نہ ابھی نہ بعد میں۔ پھر بعد میں کا خیال اسے ستانے لگا۔

"اس پر سوچو۔" دوڑتے ہوئے اس نے خود سے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے ایک گڑھے کو پھلانگا پھر اس روڈ کے ساتھ اس نے اس سڑک کا انتخاب کیا جو جنوب کی سمت جاتی تھی۔ "اس پر سوچو۔" اس نے خود سے کہا۔ اس کی سانسیں بری طرح بے ترتیب تھیں۔ "میں ابھی صرف تیس برس کی ہوں۔ اور سب سے منفرد ہوں۔ پوری دنیا۔ نہیں بلکہ کائنات میں میرے جیسا کوئی اور نہیں۔ میری ذات اپنی یادوں کے ساتھ منفرد ہے۔ یادیں......"

پہلا منظر

بہت برف پڑی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بدن کو فرکوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اور ہارن کی منتظر تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لوگ کوئی نہ کوئی جانور مار کر لا رہے ہوں گے تاکہ چولہا جل سکے۔ اسے ہر چیز سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے نیگٹو ہو۔ چاندنی میں درخت سفید اور برف سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی سانسوں سے کوٹ کے کچھ بال اڑ رہے تھے۔

"آؤ۔ آجاؤ۔" ہارن نے اسے پکارا۔ پھر وہ اس اس کے ساتھ برف زدہ گھاس میں گھس پڑی۔ آبادی کا بڑا باورچی خانہ اندھیرے میں ڈوبا کھڑا تھا اور گرم تھا۔ یہ پیڑوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ یہیں سے اشیائے خورد و نوش کی تقسیم ہوتی تھی۔ وہ خوش نصیب تھی کہ وہ ایک سردار کے گھر پیدا ہوئی تھی اور ایک سردار کی بیوی تھی۔ اس کے بچے ' دوسروں کی بہ نسبت سردی سے محفوظ تھے اور کم بھوکے تھے۔ پھر بھی اسے پریشانی تھی۔ کیونکہ وہ دور سے آنے والی ' روتے ' بچوں کی آوازیں سن رہی تھی۔

اس کے فرکوٹ پر چیتے کی کھال جیسی پٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے قد کی خوش شکل عورت تھی۔

"آؤ۔ آؤ ہمارے پاس آجاؤ۔" ایک جوان لڑکی نے اسے پکارا۔ مگر وہ اور تیز بھاگنے لگی کیونکہ اس نے لڑکی کے دانت دیکھ لئے تھے جو تیز بھی تھے۔ اور چمک رہے تھے۔ دوڑتے ہوئے اس نے سسکاری بھری 'نہیں' نہیں میں مرنا نہیں چاہتی۔ اس کے سامنے ایک اور سردیوں کا منظر آ رہا۔

دوسرا منظر

باغوں کے پیڑ پھلوں سے خالی تھے۔ اور ہرن فاقہ زدہ ہو کر دوبارہ پہاڑیوں کی طرف چلے گئے تھے۔ انہیں صرف وہی جانور مل سکے تھے جو ایک چشمے کے پاس آئے تھے۔ اب تو پانی بھی نہیں رہا تھا۔ بڑے باورچی خانے کی چمنی سے دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ اور اس کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

اسی قحط سالی میں اس کے گھر تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا۔ مگر یہ ایک ٹانگ سے بے کار تھا۔ اسے سر تک اونچا اٹھاتے ہوئے ہارن نے کہا "یہ تو کسی کام کا نہیں" پھر اس نے اسے فرش پر پٹخ دیا۔ بچے کا سر کھل گیا۔ نہیں ' نہیں ' وہ زمین پر اسی کے ساتھ بکھر گئی۔ مگر اس کا سردار شوہر اپنی جگہ کھڑا رہا اور بولا۔ "مرنا تو سبھی کو ہے" پھر اس نے ملازم عورت سے کہا۔ "اسے بڑے باورچی خانے میں لے جاؤ۔" وہ وہیں زمین پر پڑی سسکتی رہی۔

راستہ ایک جگہ سے بٹ گیا تھا۔ وہ ذرا سی ٹھٹکی کدھر دوڑنا چاہیے؟ معاً" اسے دو نوجوان دکھائی دیئے۔ ان کے پاس چاقو تھے۔ اب دو صورتیں تھیں یا وہ دوڑتی رہے۔ یا رک جائے اور مار ڈالی جائے۔

"تھوڑا آرام لے لو۔" ایک نوجوان پکارا۔ اس نے مغرب والے راستے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ لڑکے نے اپنا چاقو اس کی سمت پھینکا۔ جو اس کے بائیں شانے سے ٹکرایا اور کھال چھیلتا نیچے گر گیا۔ اس کے بدن سے گرم گرم خون نکلنے لگا مگر وہ نہیں رکی۔ "میں مرنا نہیں چاہتی' میں اس دنیا میں منفرد ہوں' میرے جیسا کوئی نہیں۔ انہیں اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ جینا مرے لئے کتنا ضروری ہے۔"

تیسرا منظر

انتہائی سخت موسم سرما کے اختتام پر آہنی زمین چٹخی اور اس میں سے پھولوں اور پودوں نے سر نکالا۔ حیرت کی بات تھی۔ وہ اس جگہ سے گزرے جہاں مارن کی کھوپڑی دفن تھی۔ یہ اعزاز صرف سردار کے لئے وقف تھا کہ اس کا سر مکمل طور پر یکجا حالت میں دفن کیا جائے۔ پھر وہ دریا کی طرف چلدی جہاں بچے نما رہے تھے۔ اس موسم بہار میں اس کا بیٹا نیلسی بڑا ہو چکا تھا۔ حالانکہ موسم سرما میں خوراک کی سخت قلت رہی تھی مگر اسے خوراک ملتی رہتی تھی۔ اس کے باپ کے گوشت نے کافی مدد دی تھی۔

اس نے ٹیکی کو دیکھا جو ایک درخت تلے کھڑا تھا۔ ٹیکی کو غالباً" سرداری ملنے والی تھی۔ مگر وہ بے حد ست تھا۔ سستی اس کے لئے جان لیوا ہو سکتی تھی۔ اور وہ کسی بھی دن بڑے باورچی خانے میں پہنچایا جا سکتا تھا۔ لیکن علاقے کے لوگ ابھی اس سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ کچھ بھی ہو اس کے ہتھوڑے نے ہی تو مارن کی جان لی تھی۔

وہ ٹیکی کی طرف ست قدموں سے بڑھی' وہ محتاط بھی تھی۔ ٹیکی اس کا بڑا بیٹا تھا لیکن اگر وہ اپنے باپ کو مار سکتا تھا تو ..... ٹیکی نے اس کے نزدیک پہنچنے پر مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا۔ جسے اس نے ملائمت سے تھام لیا۔ اور پھر ٹیکی نے اپنی گرفت مضبوط کی اور اسے زور سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پورے جسم سے اس پر جا پڑی اور دونوں زمین پر گر گئے۔ اور جب اس نے ٹیکی کے ہونٹوں کو اپنے بالوں اور گردن پر چپکتے محسوس کیا۔ اور اس کی انگلیاں اپنے جسم میں دھنستے پائیں تو وہ چیخی۔ "نہیں۔ نہیں۔"

"کیوں نہیں۔" ٹیکی نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کہ ٹیکی کا کیا ارادہ ہے۔ کیا وہ اسے کھانے کا ارادہ رکھتا ہے یا ..... ٹیکی کے پاس مناسب جواز تھا۔ اس نے پوری سردیاں ایک معمولی کمبل میں گذاری تھیں اور اسے سب سے اچھا کمبل اوڑھنے کو دیا تھا۔ اس نے کھلانے پلانے میں بھی سخاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ بھاگتی رہی۔ متعدد آوازیں اسے پکار رہی تھیں۔ وہ مسلسل اپنی چیخ کو منہ میں دبائے ہوئے تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بلند ہوئی تو گویا ایک سائرن کا کام کرے گی۔ پھر وہ بچ نہیں سکے گی۔ اور وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسی دنیا میں تھی جو اس کی موت کی خواہاں تھی۔ نیلی نے ایک حبشی لڑکی کو اپنا لیا تھا اور گھر لے آیا تھا۔ نیلی نے حفظ مراتب کو توڑ کر اچھی مثال قائم کی تھی۔ مجھے اس کے پاس پہنچنا چاہئے۔ حبشی لڑکی کے گھر پیدائش ہونے والی ہے۔ میں نہیں ہوں گی تو اس کی مدد کون کرے گا۔ بے شک انہیں میری ضرورت ہے۔ مجھے وہاں پہنچنا چاہئے۔

چوتھا منظر

موسم خزاں شروع ہو رہا تھا۔ بارشوں کے بعد زمین بنجر پڑی تھی۔ شمالی ڈھلوان پر' ٹیکی اور نیلی میں تکرار ہوئی تھی۔ ٹیکی نے نیلی کے سر پر ہتھوڑے سے وار کیا تھا اور وہ زمین پر اس طرح لڑھک گیا تھا جیسے مر گیا؟۔ مگر نیلی مرا نہیں تھا ایک دم سے وہ اٹھ پڑا تھا۔ وہ اپنی کٹیا کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر نیلی اٹھا تھا اور اس نے ٹیکی کا سر پھاڑ دیا تھا۔

"اے مردود۔ تو نے میرے بیٹے کو مار ڈالا" وہ چیخی تھی۔

پھر انہیں دنوں۔ نیلی حبشی لڑکی کو گھر میں لے آیا تھا۔ اور اسے اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ وہ اس کے کاٹج کو

صاف ستھرا رکھتی تھی اور کھانا پکاتی تھی۔ یہ اچھی بات تھی کہ گھر میں ایک اور عورت آگئی تھی۔
ہا۔ یکایک ایک جانب سے چھپی ایک عورت اس سے ابھری۔ وہ دریا کے کنارے پر تھی۔ اس نے عورت کے ایک مکا رسید کیا۔ وہ کراہ کر پیچھے الٹ گئی۔
بھاگتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ وہ نیلی کے پاس چلی جائے جس کی ہڈیاں بھی گل رہی تھیں۔ نہیں۔ اس کے پوتیاں پوتے اچھے بچے تھے۔ اسے امید تھی وہ سب اسے خوش آمدید کہیں گے۔ یہ بچے سب اپنے باپ نیلی کی طرح مضبوط تھے۔ اگر ہرن ملنے لگے تو وہ انہیں پکا کر بچوں کو کھلائے گی۔ پوری گرمیوں میں پانی برسا کیا تھا۔ اور اس دوران ہر طرف سے حشرات الارض نکل پڑے تھے۔ پہلے افعی نکلے تھے۔ اور کنکھنیے سانپ' ان سب کا گوشت زہریلا تھا۔ جسے یہ کاٹتے تھے اس آدمی کو بھی فوراً" مار دیا جاتا تھا اور اس کے اعضا علیحدہ کر دیئے جاتے تھے تاکہ ان میں زہر نہ بھرے ورنہ وہ بھی خوراک کے لئے موزوں نہیں رہتا تھا۔
یکایک دوڑتے ہوئے اس نے دیکھا۔ کہ وہ اپنے گھر سے نزدیک ہو رہی ہے۔ اس کا اپنا گاؤں آگیا تھا۔ اس کا وطن جہاں وہ مارن کے ساتھ شکار پر نکلا کرتی تھی۔ اور پھر نیلی کے ساتھ۔ وہ مرنے والی نہیں تھی۔ کم از کم اس وقت وہ زندہ رہنے والی تھی کیونکہ وہ اپنی ذات میں منفرد تھی اور شاندار تھی۔
"پالیا میں نے " اسے دفعتاً" کسی کا نعرہ سنائی دیا۔ ایک زور دار ضرب لگی تھی اسے اور وہ زوروں کے ساتھ زمین پر گر گئی۔ اس کی سانسیں بہت تیز تھیں۔ مناظر رہ رہ کر اس کے ذہن کے پردے پر ابھر اور مٹ رہے تھے۔ موسم 'لوگ ' بچے 'شوہر ' اور وہ خود ' اکیلی ' اہم منفرد ساری دنیا میں سب سے جدا۔
"نہیں۔ نہیں۔" وہ گڑگڑائی۔ اس نے اس شخص سے رکنے کے لئے کہا جو اپنے کلہاڑے کو سر سے بلند کر چکا تھا اور ٹھیک اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔
"نہیں" وہ زور سے چیخی۔ اس کی آنکھیں امید سے چمک اٹھی تھیں۔ آدمی کے عقب سے نیلی نمودار ہو رہا تھا۔ کئی دوسرے افراد کے ساتھ یہ سب شکار پر نکلے تھے۔ نیلی کے ساتھ اس کی حبشی بیوی بھی تھی اور دو لڑکے بھی جو بہت کم سن بچے تھے۔
"نیلی" وہ زمین پر پڑے پڑے زور سے چیخی۔ "مجھے بچاؤ۔ میں تمہاری ماں ہوں۔
نیلی کے ہونٹوں پر ایک چوڑی مسکراہٹ ابھری اور اس کے دانت چمکنے لگے۔
"مگر ہم سب بہت بھوکے ہیں۔" اس نے کہا۔
کلہاڑی چمکتے ہوئے اوپر سے نیچے کی طرف گری۔ اور اس کے اندر کی ہر تصویر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر وہ سارا جتھا برف کے گالوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑی سی خاک اڑی اور پھر فضا صاف ہو گئی۔ دونوں کمسن بچوں کے ہاتھ صرف ایک انگوٹھا اور ایک انگلی لگی تھی' وہ انہیں کو ادھیڑ رہے تھے۔

ارنسٹ ہیمنگوے / مرزا حامد بیگ

بارش میں بلی

وہ اس کی ٹانگوں پر چابک برساتے تھے اور سفید گھوڑا الف ہو جاتا تھا۔
سوار نے رکابوں کو گھما کر سیدھا کرتے ہوئے اٹھایا اور کاٹھی میں اڑس لیا۔
جب گھوڑا دلکی چال چلا تو اس کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ لٹکی ہوئی بھری بھری نیلی تھیلی آگے پیچھے جھولنے لگی۔
اکھاڑے کے چھوکرے اس کی پچھلی ٹانگوں پر مسلسل چھڑیاں برسا رہے تھے۔
پھر وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوکرے نے اس کی لگام تھامی اور کھینچتا ہوا آگے لے گیا۔ سوار نے ایڑ لگائی، آگے جھکا اور خونخوار بیل کے سامنے اپنا نیزہ لہرایا۔ گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے درمیان سے خون جاری تھا۔ وہ پریشان حال ڈگمگا رہا تھا اور بیل اس پر حملہ کرنے کے لئے کسی طور پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔

○

ہوٹل میں صرف دو ہی امریکی باشندے ٹھہرے ہوئے تھے۔
کمرے سے لے کر سیڑھیوں کے راستے تک ان کی کسی سے شناسائی نہ تھی۔
دوسری منزل پر ان کا کمرہ، سمندر کے رخ پر تھا۔ اس کے سامنے باغ عامہ اور جنگ کی یادگار نصب تھی۔ باغ میں اونچے تاڑ کے درخت اور ہرے رنگ کی نشستیں تھیں۔ خوشگوار موسم میں وہاں اکثر ایک نہ ایک مصور اپنی ایزل کے ساتھ نظر آتا۔
مصوروں کو تاڑ کے درمیانی راستے اور سمندر کے رخ پر، باغ کے سامنے ایستادہ ہوٹل کے نکھرے ہوئے رنگ پسند تھے۔
اطالوی باشندے دور دراز سے جنگ کی اس یادگار کو دیکھنے آتے۔ کانسی سے بنی ہوئی یہ یادگار بارش میں لشکتی تھی۔
بارش ہو رہی تھی۔
بارش کے قطرے تاڑ کے درختوں سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے، پتھریلی روشوں کے گڑھوں میں پانی ٹھہر گیا تھا۔
بارش میں، سمندر کی لہریں ایک لمبی لکیر بنا کر ساحل سے ٹکراتی تھیں اور ایک بار پھر، لکیر کی صورت ساحل تک آنے کے لئے واپس ہو جاتی تھیں۔ جنگی یادگار کے قریب چورستے میں کھڑی ہوئی موٹریں اب غائب ہو چکی تھیں۔
چوک کے اس پار، کیفے کے دروازے میں کھڑا ہوا ایک بیرا، ویران چورستے کو دیکھ رہا تھا۔
امریکن کی بیوی کھڑکی کے پاس کھڑی، باہر کا نظارہ کر رہی تھی، باہر عین ان کی کھڑکی کے نیچے ایک بلی

دوہری ہو کر ٹپکتی ہوئی ہرے رنگ کی میز تلے دبکی ہوئی تھی اس کی پوری کوشش تھی کہ سمٹ کر بھیگنے سے بچ جائے۔
"میں نیچے جا کر اس بلی کو لاتی ہوں" لڑکی نے کہا
"میں چلا جاتا ہوں" خاوند نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنی خدمات پیش کیں۔
"نہیں، میں لے آؤں گی، بیچاری پانی سے بچنے کے لئے میز تلے بیٹھی ہے"
خاوند نے مطالعہ جاری رکھا۔ وہ دو تکیوں کا سہارا لیے پائنیتی کی طرف لیٹا تھا۔
"بھیگ نہ جانا" اس نے کہا۔
اس کی بیوی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ جب وہ استقبالیہ کے قریب سے گزری تو ہوٹل کا مالک اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی جانب احترام سے جھکا، اس کی نشست کمرے کے دوسرے سرے پر تھی۔ وہ بہت اونچے قد کا بوڑھا آدمی تھا۔
"مزاج شریف؟" لڑکی نے کہا وہ اسے اچھا لگتا تھا۔
ما۔ ما۔ مادام مہربانی، بہت خراب موسم ہے"
وہ میز کے پیچھے کھڑا تھا جو نیم روشن کمرے کے کونے میں تھی وہ اسے اچھا لگتا تھا خاص طور پر اس کی انتہا کی سنجیدگی ۔۔۔ جب وہ شکایات سنتا تھا، اسے وہ انداز پسند تھا جب وہ کسی قسم کی خدمت بجا لاتا تھا۔ ہوٹل کا مالک ہونے کے ناتے اس کے احساسات کی وہ قدردان تھی وہ اس کے بوڑھے بھاری چہرے اور بڑے بڑے ہاتھوں کو پسند کرتی تھی۔
محبت میں سرشار، اس نے دروازہ کھولا اور باہر دیکھا اب بارش اور تیز ہو گئی تھی ایک آدمی ربڑ کی برساتی اوڑھے سنسان چوراہے سے ہو کر کیفے کی طرف آ رہا تھا۔
بلی داہنی طرف ہو گی۔ شاید وہ چھجے کے نیچے سے ہوتی ہوئی گزر سکے۔ اس نے سوچا۔ وہ دروازے میں کھڑی ہی تھی کہ ایک چھتری اس کے عین پیچھے کھلی۔ یہ وہی خادمہ تھی، جو ان کے کمرے کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔
"بارش میں بھیگ نہ جایئے گا۔" وہ اطالوی زبان بولتے ہوئے مسکرائی، یقیناً" اسے ہوٹل کے مالک نے ہی بھیجا ہو گا۔
خادمہ کے ساتھ جس نے چھتری تھام رکھی تھی، وہ کنکریوں سے بنی روش پر چلتی رہی تاوقتیکہ اپنی کھڑکی تلے نہ پہنچ گئی۔ میز وہیں رکھی تھی بارش سے دھلی نکھری ہوئی سبز میز لیکن بلی جا چکی تھی۔ اسے شدید مایوسی ہوئی۔
خادمہ نے اس کی طرف دیکھا، "کیا بات ہے مادام"
"یہاں ایک بلی تھی" امریکی لڑکی نے جواب دیا۔
"بلی؟"
"ہاں ۔۔ ایک بلی"
"بلی۔" ملازمہ ہنس دی۔
"بارش میں گھری ہوئی بلی"
"جی" اس نے کہا۔

میز کے نیچے تھی پھر اوہ ۔۔۔۔ وہ مجھے چاہیے تھی مجھے چاہئے تھی۔" وہ جب انگریزی میں بات کرتی تو خادمہ کا چہرہ بھنچ جاتا۔

" آیئے مادام" .... "وہ بولی ہمیں اب اندر جانا چاہئے۔ آپ بھیگ جائیں گی۔"

"واقعی" .... امریکی لڑکی نے جواب میں کہا۔

وہ کنکریوں والا راستہ طے کرتی دروازے میں سے گزر گئیں۔ خادمہ چھتری سمیٹنے کی خاطر باہر ہی رک گئی۔ جب وہ استقبالیہ کے سامنے سے گزری تو ہوٹل کا اطالوی مالک اپنی نشست سے جھکا' لڑکی کو اندر ہی اندر بہت چھوٹی لیکن تنی ہوئی کوئی چیز محسوس ہوئی۔

ہوٹل والے نے اسے احساس دلایا کہ وہ بہت ننھی سہی' لیکن ساتھ ہی بہت اہم ہے اسے لمحاتی طور پر اپنا آپ انتہائی اہم محسوس ہوا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس نے دروازہ وا کیا۔ جارج بستر پر اسی طرح مطالعہ کر رہا تھا۔ "بلی مل گئی؟" اس نے کتاب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جا چکی تھی"

"حیرت ہے کہاں چلی گئی؟" اس نے آنکھوں کو آرام دیتے ہوئے پوچھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔

"کتنی خواہش تھی مجھے اس کی" ' اس نے کہا

میں خود نہیں جانتی ' میں نے ایسا کیوں چاہا۔ میں اس بے چاری کو لانا چاہتی تھی۔ بلی کے لئے باہر بارش میں ہونا کوئی مذاق نہیں ہے۔"

جارج پھر کتاب پڑھنے لگا۔

وہ اٹھ کر چلتی ہوئی سنگار میز کے آئینے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ دستی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنے چہرے کے خطوط کا مشاہدہ کیا' پہلے ایک طرف سے پھر دوسری طرف سے پھر اس نے اپنے سر کی پشت اور گردن کا جائزہ لیا۔

"کیا خیال ہے ' یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ میں اپنے بالوں کو بڑھنے دوں؟"

ایک بار پھر ۔۔۔۔ اپنے خدوخال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔ جارج نے نگاہیں اٹھائیں اور اس کی گردن کے پچھلے حصے کی طرف نظر کی بال لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔"

"میں اسی طرح پسند کرتا ہوں ' جیسے اب ہیں"

"میں ان سے اکتا گئی ہوں۔" وہ بولی میں لڑکوں کی سی چھب سے اکتا گئی ہوں۔"

جارج نے بستر پر کروٹ لی۔

جب سے لڑکی نے بولنا شروع کیا تھا۔ جارج کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم خوب صورت دکھائی دیتی ہو۔ بہت عمدہ۔" وہ بولا۔

اس نے آئینہ سنگھار میز پر رکھا اور کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر نگاہ کی اب اندھیرا بڑھ رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ اپنے بال خوب کس کر پیچھے کی طرف ہموار کروں۔ اور پشت پر ایک بڑا سا جوڑا بناؤں ' جسے میں محسوس بھی کر سکوں" ' وہ بولی

"میں چاہتی ہوں کہ ایک بلی ہو ' جو میرے زانو پر بیٹھے اور جب میں اسے سہلاؤں تو آہستہ آہستہ خر ' خر

بولے۔"

"ہوں" بستر میں جارج نے جواب دیا۔

"اور ----- میں چاہتی ہوں کہ میز پر اپنے چاندی کے چھری کانٹے سے کھانا کھاؤں۔ اور مجھے موم بتیاں چاہیں' اور میں چاہتی ہوں کہ بہار کا موسم ہو' اور میں آئینے کے سامنے بالوں میں کنگھی کروں.......... اور ایک بلی چاہئیے۔ اور کچھ نئے کپڑے۔"

"اوہ ------ بس کرو۔ اور پڑھنے کے لئے کوئی چیز لے لو۔" جارج بولا۔ وہ پھر پڑھنے میں جٹ گیا تھا۔

اس کی بیوی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ اور ابھی تک تاڑ کے درختوں میں بارش ہو رہی تھی۔

بہرحال مجھے ایک بلی تو چاہئیے

"مجھے ایک بلی چاہئیے اور ابھی چاہئیے ' اگر میرے بال لمبے نہیں ہیں' یا کوئی دلچسپی نہیں ہے تو بلی تو لے ہی سکتی ہوں۔

جارج سنی ان سنی کر رہا تھا۔ وہ اپنی کتاب پڑھ رہا تھا۔

لڑکی نے کھڑکی میں سے اس طرف دیکھا جہاں چورستے میں روشنی ہو گئی تھی کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"چلے آؤ" جارج پکارا۔

اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر دیکھا' دروازے پر خادمہ کھڑی تھی' وہ کچھوے کی پشت جیسی رنگت کی بہت بڑی بلی تھامے ہوئے تھی جو سختی سے اس کے ساتھ چمٹی ہوئی آدھی نیچے لٹک رہی تھی۔

معاف کیجئے گا۔ مالک نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ مادام تک پہنچاؤں۔

سلویا پلاتھ / صغیر ملال

خوابوں کی انجیل

روزانہ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک میں اپنی نشست پر بیٹھی دوسروں کے خواب ٹائپ کرتی رہتی ہوں۔ مجھے اسی لیے ملازم رکھا گیا ہے۔ میرے افسروں کا حکم ہے کہ میں تمام چیزیں ٹائپ کروں۔ خواب' شکایات ماں سے اختلاف' بوتل اور بستر کے مسائل' باپ سے جھگڑا' سر درد' جو اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ ہمارے دفتر میں صرف وہی لوگ آتے ہیں۔ جن کے گھروں میں عذاب بھر چکے ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کہ چوہا اپنے جسمانی زاویۂ نگاہ کے سبب بہت جلد سمجھ جاتا ہو کہ دور سے آتے دکھائی دینے والے دو بڑے پاؤں کائنات کا نظام کس طرح چلاتے ہیں لیکن جہاں سے میں دنیا کو دیکھتی ہوں۔ وہاں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے نگہبان کا نام "سراسیمہ" ہے۔

سراسیمہ کی بھی شکل ہو سکتی ہے۔ کتا۔ طوائف۔ چڑیل۔ شیطان۔۔۔۔۔ سو جائے یا جاگتا رہے۔ وہ سراسیمہ ہی رہتا ہے۔

جب لوگ سوال کرتے ہیں کہ میں کہاں کام کرتی ہوں تو میں انہیں بتاتی ہوں کہ میرا کام شہر کے اسپتال کے ایک شعبے کا ریکارڈ درست رکھنا ہے۔ عام طور پر یہ جواب کافی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اس طرح کی بات نہیں پوچھتا جس کے جواب میں مجھے بتانا پڑے کہ میں پہلے سے موجود ریکارڈ کی نگہداشت کے علاوہ نیا ریکارڈ ٹائپ بھی کرتی ہوں۔ دراصل نیا ریکارڈ ٹائپ کرنا ہی میرا پیشہ ہے اور میں اپنے پیشے سے مقدس انداز میں وابستہ ہوں۔ اس لیے کہ میری تحویل میں خوابوں کے ڈھیر ہیں اور میں کسی کو یہ نہیں بتا سکتی۔ نہیں بتا سکتی کہ میں اپنے گھر کے کمرے میں ہسپتال کے قوانین کی پابند نہیں ہوں۔ یہاں میں فقط سراسیمہ کے احکام پر عمل کرتی ہوں جو مجھے خواب جمع کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

خواب در خواب میں بالغ ہو رہی ہوں اور اسی رفتار سے خوابوں سے میری شناسائی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک دن میں دنیا کی سب سے بڑی خواب آشنا بن جاؤں گی لیکن خواب شناسی کی انتہا پر پہنچ کر بھی میں لوگوں کے خواب روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ خوابوں کا ناجائز استعمال نہیں کروں گی۔ یہاں تک کہ میں خوابوں کی تعبیر بتانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں تو صرف خواب جمع کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں پہچاننا چاہتی ہوں۔ ان سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔ میں سراسیمہ کی کارکن ہوں' اور خواب جمع کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ٹائپ شدہ خواب اتنی مرتبہ پڑھتی ہوں کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ پھر میں گھر جا کر انہیں سراسیمہ کی مقدس کتاب میں درج کر دیتی ہوں۔

کبھی کبھی میں رات کے وقت اپنے گھر کی چھت پر چلی جاتی ہوں۔ وہاں سے نیند بھرے شہر کو دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ چھت پر ٹہلتے ہوئے وائلن کے تار کی طرح ہمہ وقت لرزنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ صبح کے

آثار نمودار ہونے پر تھکن سے چور اپنے بستر پر آتی ہوں اور کسی بخار زدہ شخص کی طرح سو جاتی ہوں۔ شہر میں موجود انسانی سروں کا شمار' اور پھر ان سروں میں آنے والے مصنوعی خوابوں کا حساب مجھے بے انتہا تھکا دیتا ہے۔

دوسرے دن مجھے وہی خواب ٹائپ کرنے ہوتے ہیں جنہیں میں رات اپنی چھت سے محسوس کر چکی ہوں۔ یقیناً شہر بھر کے خواب لامحدود ہیں' اور میں شام تک فقط ان کا ایک معمولی حصہ ٹائپ کر سکتی ہوں' لیکن اس کے باوجود میرے دفتر میں فائلوں کا انبار بڑھتا جا رہا ہے اور بہت جلد وہ دن آنے والا ہے' جب دفتر میں سوائے خوابوں کی فائلوں کے کوئی دوسری چیز رکھنے کی جگہ نہیں بچے گی۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ میں لوگوں کو ان کے خوابوں کے حوالے سے پہچاننے لگتی ہوں۔ بہت سے مریض ایسے ہوتے ہیں کہ میں ان کے نام بھول جاتی ہوں۔ لیکن ان کے خواب یاد رہتے ہیں۔ مثلاً یہ آدمی جو ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے' خواب میں خود کو کسی مشین کے گھومتے پہیوں میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ اس خواب میں اتنا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ آنکھ کھلنے کے بعد بھی کچھ دیر تک چیختا رہتا ہے۔ اس طرح کے اور لوگ بھی ہیں جو خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ کسی مشین تلے روندے جا رہے ہیں' یا کوئی ایجاد انہیں نگل رہی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جب مشینیں نہیں تھیں' اس وقت لوگ کس طرح کے خوابوں سے ڈرتے ہوں گے۔؟

میرا اپنا بھی ایک خواب ہے۔ اس خواب میں ایک بہت بڑی جھیل نظر آتی ہے۔ اتنی بڑی کہ اس کے کنارے ہیلی کاپٹر کے شیشے والے پیٹ سے بھی نظر نہیں آتے جہاں سے میں اس کی تہہ میں جھانکتی ہوں۔ جھیل کا پانی خوف ناک بلاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ ایسی بلائیں جو قدیم زمانے میں زمین کی سطح پر گھومتی تھیں۔ وہ زمانہ جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ ابھی اس نے آگ نہیں جلائی تھی' فصل نہیں اگائی تھی۔ اس خواب میں سورج چاند ستارے اور زمین آسمان کے درمیان پائی جانے والی دیگر تمام چیزوں کی شکلیں اور خصوصیات بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اچانک جھیل کی سطح برف سے ڈھک جاتی ہے اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں جاگ جاتی ہوں۔ اس خواب سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک کسی بھی خواب میں معنی تلاش کرنا لاحاصل لگتا ہے۔

یہی وہ جھیل ہے جہاں رات کے وقت شہر بھر کے خواب بہتے ہوئے آتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر تمام دماغوں کا گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جھیل شہر کے مضافات میں پائے جانے والے پینے کے شفاف پانی کے ان ذخیروں جیسی نہیں ہو سکتی' جن کی دن رات یوں حفاظت کی جاتی ہے' جیسے وہ خاردار تاروں کے درمیان رکھے انمول ہیرے ہوں۔ یہ ایک مختلف جھیل ہے۔ صدیوں کے جمع شدہ گلتے سڑتے خوابوں سے اس جھیل کا پانی مٹیالا اور بدبودار ہو گیا ہے اور اس کی سطح سے ہر وقت دھواں اٹھتا رہتا ہے۔

ایک سر میں رات بھر میں کتنے خواب آتے ہیں؟ اور شہر میں سروں کی مجموعی تعداد کیا ہے؟ اور دنیا میں اس طرح کے کتنے شہر پائے جاتے ہیں؟ اور زمین پر کتنی راتیں گزر چکی ہیں؟؟ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ریاضی میں تیز ہوتے ہیں اور بڑے بڑے اعداد کا لمحوں میں حساب لگا لیتے ہیں۔ میں تو صرف اس ایک شہر میں رات بھر میں دیکھے جانے والے خوابوں کا شمار کرتی ہوں تو میرا سر چکرا جاتا ہے۔

یہ عجیب جھیل ہے۔ اس میں پیار کرنے والوں کے چہرے اور پھولی ہوئی لاشیں اور یادیں اور دھند اور دھواں اور پرزے اور سائنسی ایجادات اور نفع اور نقصان ایک دوسرے سے لپٹے تیرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے اس میں مردہ پیدا ہونے والے بچے بھی نظر آتے ہیں۔ مردہ پیدا ہونے والے بچے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ

جھیل کی دوسری سمت بیٹھے عظیم تخلیق کار کے نامکمل پیغامات ہوں۔
اس جھیل کو کوئی بھی نام دے لو۔ دنیا کے تمام افراد ایک برادری کی صورت میں صرف یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک انبوہ' ایک ڈھیر' ایک ناقابل فہم انبار جو سوتے میں بالکل ایک چیز کا بنا لگتا ہے لیکن جوں ہی جاگتا ہے' جداجدا ہو جاتا ہے۔ جھیل کی اکائی میں سب ثنویت سے پاک ہو جاتے ہیں۔ مگر عالم بیداری میں انہیں دوبارہ اپنی اپنی شخصیتوں کا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔
جھیل کا خواب میرا ذاتی خواب ہے۔ اسے میں کسی ریکارڈ میں درج نہیں کروں گی۔ کسی فائل میں دفن نہیں ہونے دوں گی۔
اہم بات یہ ہے کہ ہسپتال کے جس شعبے میں مجھے ملازمت ملی ہے' وہ دوسرے شعبوں سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے شعبے میں دوائیں نہیں دی جاتیں۔ مریض سے صرف گفتگو کی جاتی ہے۔ اس کی سنی جاتی ہے۔ اسے محسوس کیا جاتا ہے' مجھے اپنے شعبے کا طریقہ کار پسند ہے۔ یہ ان جسمانی بیماریوں والے شعبوں کے طریقے سے بہتر ہے۔ جہاں رنگین حلول اور سفوف کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہسپتال کی عمارت نیم تاریک اور تنگ ہے' جس کے باعث کبھی کبھی دوسرے شعبوں کے مریض اور معالج بھی ہمارے کمروں میں عارضی طور پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسے دنوں میں ہمارے شعبے کی برتری مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔
منگل اور بدھ کے روز جگہ کی کمی کے سبب آپریشن والے مریضوں کے پلنگ ہمارے شعبے کے ہال میں کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹائپنگ کے دوران میری نظر بار بار ان کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ جس جگہ میں بیٹھتی ہوں۔ وہاں سے مریضوں کے فقط پاؤں نظر آتے ہیں۔ سرخ کمبلوں اور سفید چادروں سے نکلے صاف ستھرے زرد پیروں کی طویل قطار۔
کسی کسی دن اعصابی امراض کے شعبے والے بھی ہمارا کوئی کمرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مریض عجیب و غریب بولیاں بولتے ہیں۔ لاطینی اور چینی زبانوں کے گانے گاتے ہیں اور سارا وقت شور مچاتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے مریضوں کی جسمانی حالت درست ثابت ہو جائے تو اعصابی امراض کے ماہر انہیں ہمارے شعبے میں بھیج دیتے ہیں۔
ان دشواریوں کے باوجود میں اپنے کام سے غافل نہیں ہوتی۔ سر جھکائے مسلسل دوسروں کے خواب ٹائپ کرتی چلی جاتی ہوں۔ اب تو میرے پاس مریضوں کے خوابوں کے علاوہ اپنے بھی ایک سے زیادہ خواب جمع ہو چکے ہیں۔
ان دشواریوں کے باوجود میں اپنے کام سے غافل نہیں ہوں۔
یہ خواب میں نے خود تخلیق کئے ہیں لیکن ابھی میں ان خوابوں کو خود سے بھی نہیں دہراؤں گی۔ کچھ عرصے تک انہیں اس مجسمے کی طرح وقت گزارنا ہو گا جو اپنی نقاب کشائی کی رسم سے ایک لمحے قبل تک مخمل کے سرخ کپڑے میں سر سے پاؤں تک ڈھکا رہتا ہے۔
میں جو بھی خواب حاصل کرتی ہوں جس طرح بھی حاصل کرتی ہوں' اس پر سراسیمہ کے دستخط ضرور ثبت ہوتے ہیں۔ سراسیمہ کو ڈرامائی انداز میں ظاہر ہونا پسند ہے۔ ہر چند کہ وہ ظاہر ہونے کے لیے مختلف جگہوں اور اوقات کا انتخاب کرتا ہے' مگر کوئی جگہ' کوئی وقت ہو' وہ ہمیشہ ڈرامائی انداز میں سامنے آتا ہے۔
خوابوں کا کاروبار بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر سراسیمہ اپنی جانب سے اس میں شاعری کا عنصر شامل نہ کر

دے تو یہ کاروبار ناقابل برداشت ہو جائے۔ خوابوں کے کاروبار میں شاعری کا عنصر شامل کرنے پر میں سراسیمہ کی شکرگزار ہوں۔

چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس اس نوجوان نے بتایا تھا کہ اس کے خواب۔۔۔۔ لیکن میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اس نوجوان کا خواب ہے جو اس روز سیاہ جیکٹ پہنے ہمارے کلینک میں داخل ہوا تھا؟ مجھے یقین ہے کہ یہ اس کا ذاتی خواب ہے۔

دل میں یقین کا جذبہ ہو تو طاقت اور التجاؤں اور آنسوؤں سے خواب تحریر کیے جا سکتے ہیں۔ دوسروں کے خواب ٹائپ کرنا آسان کام ہے لیکن ذاتی خواب تخلیق کرنے میں بہت توانائی صرف ہوتی ہے۔

ہسپتال کے مرکز میں ایک اور شعبہ ہے' جو ہمارے شعبے سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کے خواب ہمارے بس میں نہ آسکیں' اسے ہم عمارت کے مرکزی حصے میں بھیج دیتے ہیں۔ میں نے ہسپتال کا وہ شعبہ آج تک نہیں دیکھا۔ ہرچند کہ اس کی سیکرٹری میری واقف ہے۔ (ہم دونوں ایک ہی ہال میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں) مگر اس کا حلیہ اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز مجھے اس سے دور رکھتا ہے۔ اس کا نام بھی عجیب سا ہے۔ میں اکثر اس کا نام بھول جاتی ہوں۔ کچھ اس طرح کا نام جیسے "مل روبج" یا "مل روج" اس طرح کے نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں نظر نہیں آتے۔ میں نے ایک مرتبہ ٹیلیفون ڈائرکٹری کی ورق گردانی کی تھی اور یہ دیکھ کر خوش ہوئی تھی کہ شہر میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا نام "اسمتھ" نہیں ہے۔

بہرحال یہ مل روبج یا مل روج نام کی عورت بڑی صحت مند اور اونچی لمبی ہے۔ اس کا لباس عام لباس سے زیادہ کسی ادارے کی وردی معلوم ہوتی ہے۔ (ضروری نہیں کہ یہ ادارہ کوئی قانون ہی نافذ کرتا ہو) مل روج کے سنگین چہرے پر چند غیرمعمولی تل بھی ہیں۔ یہ تل دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید مل روج کا چہرہ سورج کی روشنی میں بہت کم رہا ہے۔ دھوپ کی تپش حاصل نہ ہو تو جلد پر طرح طرح کے داغ پڑ جاتے ہیں۔ ممکن ہے مل روج نے مصنوعی روشنیوں تلے پرورش پائی ہو۔ اگر اس کے چہرے سے اس کی آنکھیں نوچنے کی کوشش کی جائے تو محسوس ہو گا جیسے کوئی پتھر کھرچ رہا ہے۔

میرے وارڈ کی ہیڈ سیکرٹری کا نام مس ٹیلر ہے۔ مس ٹیلر روز اول سے ہمارے وارڈ سے وابستہ ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ جس دن میں پیدا ہوئی تھی اسی روز وارڈ کا افتتاح ہوا تھا۔ مس ٹیلر ہسپتال کے بارے میں ہر چیز جانتی ہے۔ وہ اس کے تمام ڈاکٹروں' مریضوں' شعبوں اور منصوبوں سے واقف ہے۔ اپنے پیشے میں اتنی لگن میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ وہ ہسپتال میں موجود ہر جان دار اور بے جان شے کا حساب رکھتی ہے۔ اسے تمام وقت اعداد و شمار میں گھرا دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔

دفتر میں میری دلچسپی صرف خواب جمع کرنے کی حد تک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہسپتال میں آگ لگ جائے تو مس ٹیلر خود کو بچانے سے پہلے اعداد و شمار کی فائلیں بچانے کی کوشش کرے گی۔ میرے اور مس ٹیلر کے مشاغل مختلف ہونے کے باوجود ہمارے آپس کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ بس میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ مجھے دفتر کی فائلوں میں پرانے خواب پڑھتے دیکھ لے۔ عام طور پر ہمارا شعبہ بے پناہ مصروف رہتا ہے' لیکن پھر بھی مجھے کبھی کبھی خوابوں کے پرانے ریکارڈوں میں جھانکنے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔ مگر اتنی عجلت میں انوکھے اور اچھوتے خوابوں کا انتخاب ایک مشکل عمل ہے۔ میرے فن کا تقاضا ہے کہ میں فرصت سے بیٹھوں' خوابوں کی گہرائی میں اتروں۔ ان کے سارے پہلوؤں کو جانچوں' انہیں ہر زاویے سے پرکھوں اور پھر جن خوابوں کو ہر طرح سے مکمل

پاؤں' انہیں گھر لے جا کر خوابوں کی مقدس کتاب میں درج کر دوں۔ اگر شراب کا معیار بتانے والے ماہرین' پہلا قطرہ چکھنے سے قبل ایک گھنٹے تک شراب کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں تو میں خوابوں کے سلسلے میں اس فرصت اور سہولت سے کیوں محروم ہوں۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بڑا ٹرنک لاؤں اور خوابوں کی ساری فائلیں اس میں بھر کے لے جاؤں۔ ہسپتال کے گیٹ پر غیر معمولی قسم کی پوٹلیوں اور بنڈلوں کو کھلوا کر دیکھا جاتا ہے اور اسٹاف کے چند دوسرے لوگ بھی سرکاری سامان کی نگہداشت پر مامور ہیں' مگر میں ٹائپ رائٹر یا کوئی قیمتی دوا وغیرہ چرانے کا منصوبہ نہیں بنا رہی۔ میں تو بس پرانے خوابوں کی فائلیں ایک رات کے لیے گھر لے جاؤں گی اور دوسری صبح انہیں اسی ترتیب سے دوبارہ الماری میں سجا دوں گی۔ اس میں کسی کا کیا نقصان ہے؟ یوں تو میں خوابوں میں فقط جھانکنے سے بھی بہت کچھ معلوم کر سکتی ہوں لیکن مس ٹیلر کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جس کے سبب میں ہر آہٹ اور سرگوشی پر چونک جاتی ہوں' اور اس طرح میں چند لمحوں کے لیے بھی اپنا شوق مکمل توجہ سے پورا نہیں کر پاتی۔

اداس دنوں میں جب میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ پرانی فائلوں سے کسی خواب کی ایک جھلک ہی دیکھ لوں' سراسیمہ میری جانب پشت کر کے پہاڑوں جتنا بلند ہو جاتا ہے اور مجھ پر اتنا خوف طاری ہوتا ہے کہ میں اپنے حواس گم کر بیٹھتی ہوں۔

ایسے موقع پر میری حالت ان بھیڑوں کی سی ہوتی ہے جو آنکھوں کے سامنے اگی سبز گھاس چرنے میں اس قدر مشغول ہو جاتی ہیں کہ چراگاہ کے اختتام پر قربانی کے چبوترے کی موجودگی سے آخری لمحے تک بے خبر رہتی ہیں۔

اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہر روز سراسیمہ کے آدمیوں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکال رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کے لیے سراسیمہ کے دربار تک رسائی رکھنے والوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہر چند کہ اس کے گروہ میں فقط وہی نمایاں منصب پر فائز ہوتا ہے جو خوابوں کو یاد رکھے اور خواب دیکھنے والوں کو بھول جائے۔ یوں بھی خوابوں کے مقابلے میں خواب دیکھنے والوں کی کیا وقعت ہے؟ مگر ڈاکٹر یہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے لیے تو "سراسیمہ" مریض کے بدن میں داخل ہونے والا کانچ کا ٹکڑا ہے جسے وہ روحانی پائپوں کی مدد سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ہیری کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" اعتراض کرنے والوں کو ڈاکٹر یاد دلاتے ہیں۔ "جب وہ ہمارے شعبے میں داخل ہوا تھا تو سراسیمہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ اسی لیے تو اسے پوری دنیا غلاظت کا ڈھیر نظر آنے لگی تھی۔ اس نے کام پر جانا چھوڑ دیا تھا کہ راستے میں انسانوں کا تھوک اور جانوروں کی آلودگی پڑی ہوتی ہے۔ پہلے یہ گندگی جوتوں کو لگتی ہے۔ وہ کہتا تھا اور جب گھر آ کر جوتے اتارو تو ہاتھ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد منہ تک پہنچنے میں اسے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟"

"ہیری کو جسمانی معذور بھی برے لگتے تھے۔ معذوروں کے ناخن اور کانوں کا پچھلا حصہ میل سے اٹا ہوتا ہے۔" وہ اکثر گفتگو کا آغاز ہی اس جملے سے کرتا تھا۔ لیکن ہمارے مشوروں اور ہدایات پر عمل کرنے سے وہ بالکل نارمل ہو گیا تھا۔ یاد ہے؟ علاج کے آخری دن اس نے ہم سب کے ساتھ کیسی خوش دلی سے ہاتھ ملایا تھا اور ہمارا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ آخری دن اس کی آنکھوں کے شعلے بجھے ہوئے تھے۔ اور وہ احمقوں کی طرح مسکراتا ہوا ہمارے کلینک سے روانہ ہوا تھا۔ اگر صورتحال یہی رہی تو کتنے ہیری آئیں گے۔ صحت یاب ہو کر چلے جائیں گے اور میں اپنے خوابوں کے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں کر سکوں گی۔ مجھے بہرطور اپنی رفتار بڑھانی ہے اور مس ٹیلر کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔

اس مسئلے کا صرف یہی حل ہے کہ کسی دن میں دفتر ہی میں رات گزاروں اور صبح تک تمام فائلوں سے اپنے مطلب کے خواب ڈائری میں تحریر کر لوں۔

دفتر میں رات گزارنے کا خیال کئی دنوں سے (کمبلوں سے نکلے مریضوں کے زرد پیروں کی قطار کی طرح) بار بار میرے سامنے آ رہا ہے۔ ایک دن پانچ بجے شام میں خود کو دفتر کے واش روم میں چھپتے دیکھتی ہوں۔ گہرے ہوتے اندھیرے کے ساتھ دفتر سے گھر جانے والوں کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی ہے۔ میں واش روم سے باہر نکلتی ہوں تو دن بھر مصروف رہنے والے ہسپتال کی عمارت' سوموار کے چرچ کی طرح خالی اور اداس محسوس ہوتی ہے۔ میں فوراً اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔ ٹائپ رائٹرز اپنے خانوں میں بند کئے جا چکے ہیں۔ ٹیلی فونوں میں تالے پڑے ہیں۔ دنیا اپنی جگہ موجود ہے۔

میں چھت پر لگا ہلکی طاقت کا بلب روشن کر کے' ریکارڈ میں موجود خوابوں کی سب سے پرانی فائل کا پہلا صفحہ کھولتی ہوں۔ فائل کا رنگ ابتداء میں نیلا رہا ہو گا' مگر اب اس کی جلد زرد ہو گئی ہے۔ میری پیدائش کے دن یہ فائل بالکل نئی ہوئی ہو گی۔ میں صبح تک اس فائل کی ورق گردانی کرتی ہوں۔ آدھی رات کے قریب میں اس فائل میں درج آخری خواب پڑھتی ہوں۔ مئی کی انیس تاریخ کو ایک نرس اپنے مریض کی الماری کھول کر لانڈری کے تھیلے سے پانچ کٹے ہوئے سر نکالتی ہے۔ ان میں سے ایک سر نرس کی ماں کا ہے۔

سرد ہوا کا ایک ہلکا جھونکا میری گردن کو چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں خوابوں کی فائلوں کے سامنے فرش پر بیٹھی ہوں اور اب ٹانگوں پر فائل کا بوجھ محسوس کر رہی ہوں۔ اچانک میری نظر سامنے والے دروازے پر پڑتی ہے۔ دروازے کے کواڑ فرش سے اٹھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی دوسری طرف دو مردانہ جوتے نظر آ رہے ہیں۔ جوتوں کی نوکیں میری سمت ہیں۔ بھورے چمڑے کے بنے ہوئے اونچی ایڑیوں والے یہ جوتے غیر ملکی ساخت کے ہیں۔ جوتے ساکت ہیں۔ ہرچند کہ ان کے اوپر کالے رنگ کی وہ ریشمی جرابیں بھی ہیں۔ جن سے کسی ٹانگوں کی زرد رنگت جھلک رہی ہے مگر جوتے ساکت ہیں۔

"بے چاری۔" کوئی انتہائی پیار بھری آواز میں کہتا ہے۔ "--- بے چاری' فرش پر کیسے بیٹھی ہے۔ اب تک تو اس کی ٹانگیں اکڑ گئی ہوں گی۔ اس کی مدد کرو۔ سورج نکلنے والا ہے۔"

دو ہاتھ میرے بازوؤں تلے سے نکل کر مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ میری ٹانگیں واقعی سن ہو چکی ہیں۔ میں لڑکھڑاتی ہوں۔ خوابوں کی فائل فرش پر جا پڑتی ہے۔ "کچھ دیر تک یوں ہی کھڑی رہو۔ خون کی گردش درست ہو جائے گی۔" ہسپتال کے مالک کی سرگوشی میرے کان میں گونجتی ہے۔ میں اپنی ڈائری سینے سے لگا لیتی ہوں۔ یہ میری آخری امید ہے۔

"اسے کچھ نہیں معلوم۔"

"اسے کچھ نہیں معلوم۔"

"اسے سب کچھ معلوم ہے!!"

چمکدار جوتے کی نوک خوابوں کی فائل کو ٹھوکر مارتی ہے۔ میری پیدائش کی پہلی چیخ کے وقت شہر میں دیکھے جانے والے تمام خوابوں کا ریکارڈ' الماری کی تہہ کے اندھیرے میں چلا جاتا ہے۔

وہ مجھے عمارت کے مرکز کی سمت لے جا رہا ہے۔ میں اپنی رفتار تیز کر دیتی ہوں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے گھسیٹا جا رہا ہے۔

"اس سے پہلے کہ تم مجھے نکالو۔" میں مضبوط لہجے میں کہتی ہوں۔ "میں خود نوکری چھوڑ دوں گی۔" "تم ہمارے کام آتی ہو۔" اس مرتبہ مالک کہیں دور سے بولتا ہے۔ "ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔"

میں اور مالک چلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیچ در پیچ راہداریوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد سرنگیں آتی ہیں۔ آخری سرنگ کے اختتام پر آہنی پھاٹک کھل جاتا ہے۔ ہمارے گزرنے کے بعد ہماری پیٹھ پیچھے پھاٹک یوں بند ہوتا ہے جیسے مویشیوں کو مذبح خانے لے جانے والی گاڑی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

ہم ایک انجانے کمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ کم از کم میرے لیے یہ کمرہ بالکل اجنبی ہے۔ میں دوسروں کے علاقے میں آگئی ہوں اور میرا سامان پیچھے رہ گیا ہے۔ ہینگر پر لٹکا کوٹ۔۔۔۔ اور میرے ڈیسک کی دراز میں میرا بٹوا پڑا ہے۔ صرف میری ڈائری میرے ساتھ ہے' اور سراسیمہ ہے جس کی تپش مجھے برف باری میں منجمد ہونے سے بچا رہی ہے۔ میں انتہائی تیز روشنیوں کے نیچے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ "آگئی ہے۔"

"چڑیل۔"

مس مل روج فولادی ڈیسک کے پیچھے کھڑی مجھے گھور رہی ہے۔ کمرے کی ساخت ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کا نچلا حصہ ہو۔ کسی بھی دیوار پر کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہے۔ سامنے سے سراسیمہ کے نائب نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں دہکتے ہوئے کوئلوں سے زیادہ سرخ اور روشن ہیں۔ وہ مجھے عجیب آوازوں میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں سراسیمہ کی صفوں میں شامل ہوں اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ دنیا میں سراسیمہ کے کارکن کس حال میں ہیں۔

"امن۔ میں تمہارے لیے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آئی ہوں۔" میں اپنا ڈائری والا ہاتھ بلند کر کے انہیں مخاطب کرتی ہوں۔

"یہ پرانا راگ ہے۔ بی بی۔" مل روج ہاتھی کی طرح جھوم اٹھتی ہے۔"۔ اب ہم ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوں گے۔"

مس مل روج مجھ پر جھپٹتی ہے۔ میں بچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر وہ بہت تیز رفتار اور طاقتور ہے۔ پہلی بار اس کا وار خالی جاتا ہے مگر دوسری مرتبہ وہ مجھے دبوچ لیتی ہے۔

"پرانا راگ مت الاپو۔ یہ ڈائری ہمارے حوالے کر دو۔"

مس مل روج کے سانسوں میں پاگل کر دینے والی بو ہے۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں اس کی مردوں جیسی مضبوط اور بے رس چھاتی کو اپنے وجود کی پوری قوت سے پرے دھکیلتی ہوں۔ لیکن میں اس کے مقابلے میں بہت کمزور ہوں۔ اس کی انگلیاں درندے کے پنجوں کی طرح میرے بدن میں پیوست ہو رہی ہیں۔

"میری بچی۔۔۔ میری بچی میرے پاس لوٹ آئی ہے۔" میرے کانوں میں پھنکارتی ہے۔

"یہ لڑکی۔" ہسپتال کے مالک کی آواز سے کمرہ گونجتا ہے۔ "سراسیمہ کے ساتھ وقت گزارتی رہی ہے۔"

"بری بات!"

"بری بات!"

سفید لکڑی کا ایک تخت عین میرے سامنے بچھا دیا گیا ہے۔ مل روج میری کلائی سے گھڑی اتارتی ہے۔ انگلیوں سے انگوٹھی نکالتی ہے' بالوں سے ہیئر پن الگ کرتی ہے۔ پھر وہ میرا لباس اتار کر مجھے موسم کی پہلی برف جیسی بے داغ اور سفید چادروں میں لپیٹ دیتی ہے۔ اچانک کمرے کے چاروں کونوں سے پتھرائی آنکھوں والے چار وجود نکل کر مجھے سفید تخت پر لے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپریشن تھیٹر والے کپڑے اور نقاب پہن رکھے ہیں۔ ان کا مقصد سراسیمہ کی بادشاہت ختم کرنا ہے۔ وہ ایک ایک کر کے میری دونوں ٹانگیں اور بازو قابو کر لیتے ہیں۔ دروازے سے آنے والا میرے سر کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتی مگر اس کے ہاتھوں میں موجود تیز دھار والے اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ سن سکتی ہوں۔

سراسیمہ کے نمائندے میری بے بسی پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ وہ گنگناتے ہیں۔

"فقط خوف سے محبت کی جا سکتی ہے۔

خوف سے محبت' باشعور ہونے کی علامت ہے۔

فقط خوف' ہر طرف خوف کا راج ہو۔

"فقط خوف سے محبت کی جا سکتی ہے۔"

مل روج اور ہسپتال کا مالک سراسیمہ کے نمائندوں کو خاموش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

میرے سر کے پیچھے کھڑے شخص کو اشارہ کیا جاتا ہے۔ یکلخت مشین اور تیز دھار آلات چلنے کی آواز بقیہ تمام آوازوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ جونہی میں خود کو معدوم ہوتے محسوس کرتی ہوں' چھت پر لگی روشنیوں سے سراسیمہ کا چہرہ جھانکتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ آواز کی کڑک سے کائنات پر سائے پڑ رہے ہیں

میں عمر بھر سراسیمگی سے وابستہ رہی ہوں' اور مجھے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وابستگی بیسویں منزل سے چھلانگ ہے' گلے میں پڑی رسی ہے۔ دل پر رکھے خنجر کی نوک ہے۔

مختار لوبس / نسیم شاہد

دیوانے کا خواب

۴۶ سالہ کونت' جمہوریہ انڈونیشیا کا شہری اور جکارتہ میں حکومتی سول سروس کا ایک ادنیٰ سا قاصد ہے۔ جس کی ماہوار تنخواہ ۳۲۵ روپے ہے۔ دو بچوں کا باپ ہے اور تیسرے کی آمد آمد ہے۔ وہ روزانہ سول سروس کے دیگر چھوٹے ملازمین کی طرح' اس ٹرک کے پیچھے لٹک کر دفتر پہنچتا ہے۔ جو محکمے نے اس مقصد کے لئے مختص کیا ہوا ہے۔ آج اس کا ٹرک بہت سے دوسرے ٹرکوں کے ساتھ' چھوٹے ملازمین کو لے کر' اس ریلی میں شرکت کے لئے جا رہا ہے جو مغربی نیو گنی کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے سلسلے میں منعقد ہو رہی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر مسلسل مغربی نیو گنی کی آزادی کے لئے گیت گا رہا ہے۔ وہ جب بھی گاتا ---- "میرے صبر کی انتہا ہو چکی ہے" ---- تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے واقعتاً" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ جیسے اگر ابھی اسے کوئی حکم دے' تو وہ فوراً" اس جزیرے میں جا کر ظالم اور خبیث نو آباد کاروں کو نکال باہر کرے گا۔

وہ اپنے اندر ایک ایسے کونت کو دیکھتا ہے' جو سبز فوجی لباس میں' سر پر ہیلمٹ اور گردن میں سرخ سکارف پہنے ہوئے ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رائفل ہے اور وہ اس حالت میں کھڑا ہے جیسے ابھی ساحل سمندر کی طرف حملہ آور ہوا چاہتا ہے۔ اس کے بعد تصویر کچھ دھندلا سی جاتی ہے۔ تصویر کے مختلف ہیولے یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں جھلملانے لگتے ہیں۔ وہ ساحل سمندر پر لیٹ جاتا ہے اور بموں کے ہیبت ناک دھماکے' اور توپوں اور ٹینکوں کے گولوں کی گھن گرج سنتا ہے' بارود کی بو سونگھتا ہے اور خود کو اس پر حملہ آور ہونے کے لئے اکساتا ہے۔ تب اسے اپنی فتح کا منظر نظر آتا ہے اور ایک فاتح کی حیثیت سے اس کی واپسی ہوتی ہے۔ اس کا استقبال ایک ہیرو کے طور پر کیا جاتا ہے۔ صدر' اسے تمغے سے نوازتے ہیں اس کی بیوی تیناح اس پر فخر کی نگاہ ڈالتی ہے۔ اس کے بچے اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ پھر اس کی ترقی ہو جاتی ہے۔ وہ اب قاصد نہیں رہتا۔ اب اسے شام کے وقت سائیکل رکشہ چلانے کی ضرورت نہیں' کہ جس میں اسے شام کے چھ بجے سے لے کر رات کے دو بجے تک اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ تصوراتی تصویر زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔

جب کبھی اس کی بیوی پوچھتی کہ وہ ملازمت کے باوجود سائیکل رکشہ کیوں چلاتا ہے' تو وہ اسے بتاتا کہ ایمانداری سے زندہ رہنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اس کی تنخواہ تو اتنی بھی نہیں تھی کہ جس سے صرف کھانے پینے کے اخراجات ہی پورے ہو سکتے۔ ہر رات سائیکل رکشہ چلا کر کمائے جانے والے بیس روپے انہیں اس قابل بناتے تھے کہ وہ غربت میں عزت کی زندگی گزار سکیں۔ اس نے تین سال تک دن رات کام کیا۔ وہ کمزور سا تھا۔ سائیکل رکشہ چلا کر اس کی ٹانگوں کے پٹھے پھول گئے تھے۔ اس کی آنکھیں نیند کی کمی کے سبب سرخ اور بے نور سی ہو چکی تھیں۔ کسی کو اس سے یہ پوچھنے کی فرصت نہ تھی کہ وہ اس قدر مشقت کیوں کرتا ہے؟ اور نہ ہی کسی کو اس بات کی پرواہ تھی کہ اگر وہ بیمار پڑ گیا تو کیا ہو گا۔ اگر کوئی اس بارے میں اس سے پوچھتا تو شاید وہ

جواب میں کہتا ----- "زندگی مختصر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر بات کا فیصلہ قسمت ہی کرتی ہے" ---- وہ ہر بات کو اسی حوالے سے دیکھتا تھا کہ وہ قسمت کی مرضی سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کو ایسا ہی ہونا تھا جیسی کہ وہ ہے۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس کے لئے کسی کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اور اس نے واقعتاً" کسی کو موردالزام نہیں ٹھہرایا۔ نہ حکومت کو' نہ رہنماؤں کو' حتیٰ کہ خدا کو بھی نہیں۔ وہ بے لوث اور فرمانبردار تھا۔ وہ نماز پڑھتا اور باقاعدگی سے روزے رکھتا۔ وہ اپنے قومی رہنماؤں پر اعتماد کرتا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے۔ اس معاملے پر بحث و مباحثے کی اس کے نزدیک کوئی گنجائش نہ تھی۔ اگر کوئی اپنا اس سے اختلاف کرتا تو وہ بڑی سادگی سے کہتا ----- " تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے' وہ اگر ہم سے زیادہ نہ جانتے ہوتے تو کبھی ہمارے رہنما نہ بن سکتے۔ کیا بن سکتے؟ اگر وہ احمق ہوتے' تو کیا ہمارے رہنما ہوتے؟ اگر وہ تمہیں کچھ کرنے کے لئے کہتے ہیں تو تمہیں کر گزرنا چاہیے' وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ اگر زیادہ نہ جانتے ہوتے تو رہنما بن ہی نہیں سکتے تھے" ----

کونت' دوسرے ہزاروں لوگوں کے ساتھ خشک موسم کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا' لیموزین گاڑی میں بیٹھ کر ریلی سے خطاب کے لئے آنے والے رہنماؤں کا منتظر تھا۔ وہ اس بات کے احساس سے عاری تھا کہ بھوکا پیاسا رہ کر جان بوجھ کر جلسے میں تاخیر سے آنے والے رہنماؤں کی تقریروں کو سننے کے لئے انتظار کرنا کتنی احمقانہ بات ہے۔ اس قسم کا انتظار اس کی طرز زندگی کا حصہ تھا۔ اسے عظیم رہنماؤں کو کاروں میں بیٹھے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی ---- پھر جب تقریریں شروع ہوتیں تو کونت گرمی کی شدت' بھوک پیاس حتیٰ کہ اپنے سائیکل رکشہ کو بھی بھول گیا۔ ہر بار جب کوئی رہنما نیا اور مکاری سے بھرا نعرہ لگواتا' تو کونت پورے زور سے اس کی تائید میں چلا کر جواب دیتا۔ اس نے ۱۹۴۵ء کے آئین کی بنیاد کے لئے دوبارہ اپنی جاں نثاری وقف کر دی۔ وہ ہر صدارتی حکم پر یقین رکھتا تھا۔ اسے سوئیکارنو کے ۱۹۵۹ء میں بنائے گئے منشور پر اعتماد تھا۔ جس میں جمہوریت' سوشلزم' اقتصادیات اور قومی کردار کے بارے میں رہنما اصول بیان کئے گئے تھے۔ وہ مغربی نیوگنی کی جدوجہد کا حامی تھا۔ وہ ان تمام باتوں کے بارے میں کبھی بھی شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو فخر سے بتاتا تھا کہ اس نے ملک میں جاری انقلاب میں شرکت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں وہ اپنے والدین سے اس بات پر ناراضگی محسوس کرتا تھا' کہ انہوں نے اسے گیارہ سال پہلے کیوں پیدا نہیں کیا۔ جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو وہ صرف گیارہ برس کا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس وقت اسے بائیس برس کا ہونا چاہیے تھا۔ تاہم اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اب بھی اس انقلاب میں حصہ لے سکتا ہے ----- اس شام ریلی میں کی جانے والی تقریریں بہت شاندار تھیں۔ حتیٰ کہ دفتر واپس جانے اور وہاں سے گھر لوٹنے تک' وہ انہیں کے سحر میں مبتلا تھا۔ کھانا کھانے اور ایک گلاس پانی پینے کے بعد اچانک اسے کمزوری کا احساس ہوا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ وہ اس کا سر' ٹانگیں اور کمر دبائے ----- ایک وزیر نے تو واقعی بہت عمدہ تقریر کی" ---- اس نے اپنی بیوی کو بتایا ---- "اگر ہر آدمی اتنا ہی کمیٹڈ ہو' جتنا کہ وہ ہے' تو ہم مغربی نیوگنی۔ بہت عرصہ پہلے ہی حاصل کر چکے ہوتے" ---- شام کے چھ بجے اس کا دوست صبح کی شفٹ ختم کر کے رات کی شفٹ کے لئے سائیکل رکشہ اس کے پاس لے آیا۔ کونت نے نہا کر شام کی نماز پڑھی اور اس کے بعد رکشہ لے کر مرکزی ہائی وے کی طرف روانہ ہو گیا ----- بری ساعتوں کا آغاز رات ساڑھے گیارہ بجے سے ہوا۔ اس کے سر میں دوبارہ شدت سے درد شروع ہو گیا۔

طبیعت کو زیادہ خراب ہوتے دیکھ کر اس نے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پندرہ روپے کما چکا تھا اور یہ سائیکل رکشہ کا کرایہ ادا کرنے کے لئے کافی تھے۔ اچانک ایک کار اس کے سامنے نمودار ہوئی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جو اس کے کندھے سے ٹکرایا' جس سے سائیکل رکشہ کا توازن بگڑ گیا اور وہ سڑک پر جا گرا۔ کار کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ فراٹے بھرتی ہوئی ایک طرف کو نکل گئی۔ لوگ اس کی طرف دوڑے اور شور و غل برپا ہو گیا۔

"کتنا حرام زادہ ہے' ٹکر ماری اور کار بھگا کر لے گیا" ---

--- "پولیس کو بلاؤ" ---

--- "اسے مت ہلاؤ" ---

--- "خدایا خیر کر' اس کا خون تو بہت تیزی سے بہہ رہا ہے" ---

--- "نہ' نہ' اسے مت چھیڑو" ---

--- "اگر مجھے وہ حرام زادہ نظر آجائے' تو اسے قتل کر دوں گا" ---

--- "وہ الو کا پٹھا ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتا' اس لئے کہ اس کے پاس کار ہے" ---

--- "کیا کسی نے اس کا نمبر نوٹ کیا" ---

--- "بہت اندھیرا تھا' کچھ نظر نہیں آیا" ---

--- "اگر حالات ایسے ہی رہے تو لازماً" ایک دوسرا انقلاب بھی آئے گا" ---

جونہی بہت زیادہ ہجوم ہوا ٹریفک رک گئی۔ کار والوں نے بے صبری سے ہارن بجانا شروع کر دیئے۔ پولیس آئی۔ تھوڑی دیر بعد ایمبولنس بھی سائرن بجاتی پہنچ گئی۔ کونت کو ہسپتال لے جایا گیا اور کسی نے اس کے گھر بھی اطلاع کر دی۔ کئی گھنٹوں بعد ڈاکٹر آیا۔ اس نے خون کی بوتلیں مانگیں۔ کونت کی بیوی کا خون چیک کیا گیا۔ لیکن وہ خون کی کمی کا شکار نکلی۔ خاندان کے کسی دوسرے فرد کی تلاش ہوئی۔ پانچ دوستوں سمیت ساری فیملی اس مرض کا شکار تھی۔ بلکہ بعض کو تو چند دوسری بیماریاں بھی لاحق تھیں۔ اب ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خون کہاں سے حاصل کیا جائے' اس کی بیوی دے سکتی ہے اور نہ دوسرے عزیز و اقارب اور دوست۔ ریڈ کراس کے بلڈ بنک کے ذریعے خون مل تو سکتا تھا' مگر اس کے لئے کسی اور گروپ کا اتنا ہی خون فوراً" جمع کرانا پڑتا تھا۔ اب ایسا صحت مند آدمی کون تھا جو کونت کے لئے خون دیتا؟ شاید کونت خوش قسمت تھا۔ بلڈ بنک کا ایک ملازم کونت کے لئے خون دینے پر تیار ہو گیا۔ انہوں نے جلدی سے خون کی بوتل لی اور ہسپتال پہنچ کر نرس کے حوالے کر دی جو فوراً" ہی مریض کے لئے اندر لے گئی تناح باہر شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آکر اسے گھر چلے جانے کو کہا کہ خدا نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اطمینان سے صبح آجائے۔ تناح اس خبر پر بڑی حد تک مطمئن ہو گئی۔

دوسری صبح جب وہ کونت کی خبر لینے ہسپتال آئی تو اسے بتایا گیا کہ کونت بے ہوشی کے عالم میں ہی انتقال کر گیا ہے۔ وہ اس کی لاش لے جا سکتی ہے۔ تناح یہ خبر سن کر سکتے کے عالم میں بے ہوش ہو گئی۔ اس دوران بلڈ بنک کے ملازم اور ڈاکٹر کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی' اسے نہ کونت سن سکتا تھا اور نہ تناح۔ بلڈ بنک کا ملازم اس لئے ڈاکٹر سے جھگڑ رہا تھا کہ کونت کے لئے دیا جانے والا اس کا خون ایک وزیر کو لگا دیا گیا تھا' جس کا ایکسیڈنٹ تقریباً" اسی وقت ہوا تھا جب کونت کو حادثہ پیش آیا تھا۔ وزیر کو بچانے کے لئے خون کی اشد ضرورت تھی اور اتفاق سے اس کے خون کا گروپ بھی وہی تھا جو کونت کا تھا ------ "لیکن کیوں؟" ----- ملازم نے

غصے سے کہا۔۔۔۔۔ "میں نے تو رکشہ ڈرائیور کی مدد کی تھی کیونکہ کوئی اور اسے خون دینے کو تیار نہ تھا"۔۔۔ ۔۔۔ "اپنے غصے پر قابو پاؤ" ۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "ایک وزیر کسی سائیکل رکشہ چلانے والے سے 'اس ملک کے لئے سو گنا زیادہ اہم ہے' کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرو گے؟" ۔۔۔۔ بلڈ بنک کا ملازم ڈاکٹر کی اس بات سے قطعاً" مطمئن نہیں تھا۔ لیکن اگر کونت سننے کے قابل ہوتا تو ڈاکٹر کی یہ بات سن کر یقیناً" مسکراتا۔ یہ سوچ کر کہ انقلاب کے لئے اس کی خدمات کسی کام تو آئیں۔ اس نے اپنی جان دے دی تاکہ رہنماؤں میں سے ایک رہنما زندہ رہ کر شاید اس انقلاب کو جلد نتیجہ خیز بنا دے جو آزادی کے لئے ضروری ہے۔

صادق ہدایت / غوث بخش صابر

حاجی مراد

حاجی مراد نے ایک جست لگائی اور دکان سے باہر آیا۔ اپنے لباس کی شکنیں درست کیں، مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کھجایا اور اپنے معاون لڑکے حسن کو صدا دی، دونوں نے دکان سے باہر رکھا ہوا سامان سمیٹا، دکان بند کر دی۔ حاجی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چار تیران نکالے، حسن کے ہاتھ میں رکھنے کے بعد مردوں اور عورتوں کے ہجوم میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ جو کرتہ اس نے پہننے کے لئے بغل میں دبا رکھا تھا۔ بغل سے نکال کر کندھے پر ڈالتے ہوئے خوش خرامی سے گھر کی جانب چل دیا۔ ہر ہر قدم پر اس کے نئے جوتوں سے اٹھتی ہوئی سیٹیوں کی آواز لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کر رہی تھی۔ راہرو، شناسا، شہر کے دکان دار، کاریگر راہ چلتے اس سے علیک سلیک کرتے۔ حاجی مراد خوشدلی سے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ہلکی سی جنبش دے کر جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ "حاجی صاحب اسلام علیکم!" پیشانی پر ہاتھ رکھے ایک شناسا گویا ہوئے۔ "کہاں رہتے ہو آجکل ملاقات نہیں ہوتی؟" حاجی صاحب جواب میں مسکرا کر آگے بڑھے۔ ایک اور دکاندار راستے میں حائل ہوا۔ "ارے جناب حاجی صاحب۔ اچھے تو ہیں۔ آپ کی دید کو آنکھیں ترس گئی ہیں؟"

حاجی مراد ہر ایک سے ہنستے مسکراتے مل کر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ "حاجی" کا لفظ مراد کے لئے بہت بڑی عزت تھی یہ اس کا لقب قرار پا چکا تھا ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب تک انہوں نے حج نہیں کیا ہے۔ اس کی ماں نے البتہ باپ کی وفات کے بعد اپنے شوہر کی وصیت کی رو سے گھر کا سارا اثاثہ اور اندوختہ بیچ باچ کر کربلا کی زیارت سے شرف پایا تھا مگر تنگ دستی کی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ مراد کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے وہاں سے اپنے چچا کے پاس ہمدان جا پہنچے۔ کچھ روز پہلے چچا کا انتقال ہو چکا تھا ان کا اور کوئی وارث نہیں رہا تھا مراد کو وراثت میں متوفی کی ساری جائیداد ہاتھ لگی۔ مراد کے چچا اس شہر میں چونکہ حاجی کے نام سے مشہور تھے وراثت میں حاجی کا لفظ بھی اس کے نام کا حصہ بنا۔ چچا کی جائیداد اچھی خاصی تھی مراد آسودہ حال ہو گیا۔ روپے پیسے کے ہاتھ لگنے پر اس نے اپنی والدہ اور بہن کی کربلا میں بہت دنوں تک تلاش جاری رکھی مگر اسے کامیابی نہ ہو سکی۔

دو سال ہوئے اب اس نے شادی بھی کر لی ہے، مگر قسمت کھوٹی ہے، بیوی کی بچی محبت کی بجائے میاں بیوی کے درمیان ہر روز جوتیوں میں دال بٹتی رہتی ہے۔ بیوی منہ زور تو میاں غصیلا۔ حاجی مراد ہر دکھ سکھ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والا شخص ہے مگر بیوی کی زبان درازی اور کم حوصلگی کا متحمل نہیں۔ بیوی جب کاٹنے کو دوڑتی ہے تو میاں آگ بگولہ ہو کر چھڑی کے ساتھ روئی کی طرح اسے دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ مگر وہ حرافہ اپنی سرشت سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتی بالآخر غصہ اتر جانے پر حاجی مراد ہی پشیمانی کا اظہار کر کے اسے مناتا جو پھر سے شیر و شکر ہو جاتے گویا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ بیوی کی گود اب تک بھری نہ تھی دوست احباب اکثر مشورہ دیا

کرتے کہ ایک اور بیاہ کرے مگر حاجی مراد باؤلا تو نہیں تھا۔ دوسری شادی کا مطلب تھا رہا سہا سکون بھی تباہ کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی مراد نے اس موضوع پر سوچا بھی نہیں پھر بیوی جوان بھی تھی' حسین بھی۔ یہ سچ ہے کہ ان میں مار پیٹ ہوا کرتی تھی مگر ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا تصور دونوں کے ذہنوں کی سرحد سے دور تھا۔ چند سالوں کی رفاقت نے دونوں کو ناساعد حالات کا عادی بنا ڈالا تھا۔ زندگی کے دن جیسے تیسے گزر ہی رہے تھے۔ حاجی خود بھی اب تک اتنا بوڑھا نہیں ہوا تھا کہ اولاد کی امید دل سے نکال دیتا۔ درگاہ خداوندی بہت بڑی ہے' اولاد کی تمنا کا تقاضہ تھا کہ حاجی مراد اس منہ پھٹ بیوی کے ساتھ گزر کرے۔ یہ اور بات تھی کہ بیوی کو پیٹنے میں فوری غصہ اگر حاجی مراد کے لئے محرک تھا تو بیوی بھی شور و شین' زبان درازی اور نت نئے بہانوں سے پرسکون زندگی کے سمندر میں طوفان اٹھایا کرتی۔ یہ جو کہا ہے کہ راسخ عادتیں پیچھا نہیں چھوڑتیں کچھ غلط بھی نہیں ---- گزشتہ شب بھی دونوں میں کھٹ پٹ اور ہلکا سا جھگڑا ہو چکا تھا۔ آج حاجی مراد نے تہیہ کر لیا تھا کہ بیوی نے چوں بھی کی تو انار کی چھڑی سے وہ اس کی کھال ادھیڑ ڈالے گا۔ اس خیال سے حاجی کا دل لمحہ بھر کے لئے غم سے آزاد ہوا تھا مگر بیوی کے سلوک کا آسیب حاجی کی گردن پر مستقلاً سوار رہا۔ گزری ہوئی رات کے طعنوں کے نشتر ابھی تک دل کو زخمی کئے دے رہے تھے۔

"جھوٹے حاجی! تم خود کو حاجی کہتے ہو۔ نارو!! اپنی ماں اور بہن کو بھوک کے حوالے کر کے کربلا میں بے یار و مددگار چھوڑ آیا۔ میری تو قسمت کھوٹی تھی کہ تمہارے پلے پڑ گئی۔ شہر کے کھاتے پیتے سنار نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ میری عقل جاتی رہی۔ میں اندھی تھی ایک اچھے گھرانے کو چھوڑ کر تجھ سے بیاہ کر لیا تجھ جیسے منحوس سے شادی کرتے ہوئے کاش مجھے سانپ ہی ڈس جاتا۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے تو نے خود کو حاجی کہلوا رکھا ہے۔"

گزری ہوئی رات کے جھگڑے کو یاد کر کے حاجی پر ایک مرتبہ پھر سے غصے کا دورہ پڑنے لگا۔ اگر اس وقت بیوی سامنے ہوتی تو ہو سکتا ہے حاجی اسے قتل ہی کر دیتا۔ اسی غصے میں پیچ و تاب کھاتا حاجی نہر کے پاس چوک میں پہنچا چنار کے سایوں اور باغات کے نظاروں نے عارضی طور پر اس کی طبیعت کو راحت بخشی۔ وہ سوچنے لگا کل یار دوستوں کو ساتھ لے کر کھانے پینے کی چیزیں لئے پورا دن یہاں گزارے گا۔ یہ نظارے زندگی کے غم ---- بیوی کی زبان درازی اور تنگ دلی کا ملال شاید دھو ڈالیں۔

حاجی نے گھر جانے کے لئے بمشکل دو ایک قدم اٹھائے تھے کہ اسے ایسا لگا جیسے قریب سے گزرنے والی عورت اس کی بیوی ہے جس نے حاجی مراد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے اس کا راستہ کاٹ دیا تھا۔ بلاشبہ' ہو بہو اسی کی بیوی ہے برقع میں اگرچہ اس کا چہرہ چھپا ہوا ہے مگر رفتار وہی جانی پہچانی ہے۔ اپنی بیوی کی رفتار کون نہیں پہچانتا۔--- ایک شناخت تو ایسی ہے کہ حاجی مراد لاکھوں کے میلے میں اسے پہچان سکتا ہے۔ اس کی بیوی کے برقعے کے کونوں پر سفید لیس ٹکی ہوئی ہے۔ برقع کالا' سفید لیس۔ نہیں۔ نہیں' غلطی کیسی' میری ہی بیوی ہے۔ مجھے فریب دینے کی خاطر تیز تیز قدم اٹھاتی دوڑی جا رہی ہے تاکہ مجھ سے پہلے گھر پہنچ جائے۔

حاجی غصے میں بھر گیا۔ "کس سے پوچھ کر' کس کی اجازت سے یہ حرافہ گھر سے نکلی ہے۔ دیکھو' دکان کے سامنے کی سڑک سے بھی نہیں گزری مبادا میں اسے پہچان جاؤں۔ آخر کس سے ملنے گئی ہے؟ عجیب بات ہے۔ گھر کی طرف بھی نہیں جا رہی۔ خدائی خوار۔" حاجی نے سوچا اسی چوراہے پر اسے جا لینا چاہیے اور خوب خبر لینی چاہیے۔ غصے میں بھرے ہوئے حاجی مراد نے زور سے پکارا۔ "شہربانو اے شہربانو۔" عورت نے منہ پھیر کر دیکھا

اور مارے خوف کے رفتار اور تیز کر لی۔ حاجی کا غصہ اور چمکا "ایک تو بنا پوچھے' بغیر اجازت گھر سے نکلی ہے پھر میرے بلانے پر جواب تک نہیں دے رہی۔"

حاجی کے غصے میں جوش بھر گیا۔ اس نے اونچی آواز میں ایک بار پھر پکارا۔۔۔ "ارے میں تم سے کہہ رہا ہوں تمہیں سنائی نہیں دیتا کیا؟ کس کی اجازت سے تم گھر سے باہر نکلی ہو۔ ذرا دھیرج رکھو میں تم سے اچھی طرح سے نپٹ لیتا ہوں۔" ۔۔ عورت بالآخر رک گئی اور چیخ کر بولی

"تم کون ہو۔۔۔ کس سے کہہ رہے ہو' بدکردار غنڈے۔ تیری کیا کوئی ماں بہن نہیں ہے۔ راہ چلتی عورتوں کو تنگ کرتے ہو۔ ذرا دیکھو تو میں تمہارا کیا علاج کرتی ہوں۔ کیا یہ شہر نا پرسان ہے' تجھے کسی کا ڈر نہیں میں ابھی تجھے پولیس کے حوالے کرتی ہوں۔"

عورت کی چیخ و پکار سے بازار میں بھونچال سا آ گیا۔ جلد ہی حاجی مراد چاروں طرف سے لوگوں کے ہجوم میں گھر کر رہ گیا۔ مجمع لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حاجی مراد کے اوسان جاتے رہے' چہرہ سرخ ہونے لگا' گردن کی رگیں تن گئیں۔ "بازار میں سب لوگ مجھے جانتے ہیں۔ بیوی نے مجھے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہنے دیا۔" اپنی اس بے عزتی پر حاجی کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہونے لگی۔ غصے میں آگے بڑھ کر اس نے عورت کو ایک زوردار چانٹا رسید کیا۔ "بے ادب۔ اپنی آواز تبدیل کرنے کی کوشش نہ کر۔ میں نے تجھے پہچان لیا ہے میں آج ہی تمہیں طلاق دے دوں گا۔ بے غیرت' بے حیا! بیچ بازار میری سالہا سال کی نیک نامی پامال کر رہی ہے۔ تجھ سے بیاہ کر کے میں نے خود سے بڑی بے انصافی کی ہے۔۔۔ بھائیو! تم گواہ رہنا میں نے اسی وقت اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔"

حاجی مراد کے توقف کرنے پر عورت پھٹ پڑی۔ "اے لوگو تم چاروں طرف خاموش کیوں کھڑے ہو کیا تم سب غیرت سے محروم ہو چکے ہو۔ تم اس بیہودہ شخص سے کچھ کیوں نہیں کہتے جو بھرے بازار میں ایک عورت کی توہین کر رہا ہے۔ گندی گالیاں بک رہا ہے۔ افسوس' اگر حسین اس موقع پر موجود ہوتا اس کی خوب خبر لیتا۔ تم سب اس طرح مجمع لگا کر بے حس کھڑے دیکھ رہے ہو جیسے یہ ایک نظارہ ہو یہ کیا تمہارا باپ ہے......"

اتنے میں دو تین آدمی ہجوم سے باہر نکلے حاجی مراد کو کھینچ کر ایک طرف لائے' اتنے میں پولیس بھی آ پہنچی۔ دو تین سپاہیوں نے حاجی مراد اور برقع پوش عورت کو معہ دو تین گواہوں کے ساتھ لیا اور تھانے لے آئے۔ لوگوں کا ہجوم تماشے کی غرض سے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ حاجی مراد نہایت شرمسار آگے آگے چل رہا تھا۔ اب وہ بھی پشیمان ہو رہا تھا کیونکہ بغور دیکھنے پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا عورت کے جوتے اور موزے اس کی بیوی کے پہناوے سے نہیں ملتے تھے۔ عورت نے سپاہی کو اپنا جو اتا پتہ بتایا اس سے بھی حاجی مراد کی پشیمانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب اس نے پہچان لیا تھا کہ عورت مشہدی حسین سنار کی بیوی ہے۔۔۔ کتنی خوفناک غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سپاہی حاجی مراد' عورت اور گواہوں کے ساتھ تھانے پہنچے۔ ہجوم باہر رک گیا۔ ایک میز کے سامنے دو تھانیدار کرسیوں پر براجمان تھے سپاہی نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ تھانیدار نے حاجی مراد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"جناب مجھ عاجز کو حاجی مراد کہتے ہیں۔ پورا شہر مجھے پہچانتا ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"رنگ ریز ہوں۔ بازار میں میری دکان ہے۔ کچھ خدمت ہو تو ارشاد فرمایئے"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے چوراہے پر اس خاتون کی بے عزتی کی اور اسے مارا ہے؟"
"کیا عرض کروں جناب! مجھ سے غلطی ہوئی ہے میں سمجھا تھا شاید میری بیوی ہے۔"
"تم نے یہ کیسے سوچا یہ تمہاری بیوی ہے؟"
"میری بیوی کے برقع کے کونوں پر بھی سفید لیس ٹنکی ہے۔"
"عجیب بات ہے۔ تم نے آواز سے بھی نہیں جانا؟"
حاجی مراد نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔
"کیا بتاؤں جناب! میری بیوی کیسی حرافہ ہے وہ ہر انسان' ہر جانور کی بولی بول لیتی ہے۔ وہ ہر عورت کی طرح گفتگو کر سکتی ہے وہ ہر عورت کی چال چل سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دھوکا دینے کے لئے آواز بدل کر بول رہی ہے۔"
یہ بات سنتے ہی عورت ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ "واہ' تم اندھے ہو مجھے نہیں پہچانتے۔ کیا تم نے بے رحمی سے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم اس طرح خود کو نہیں بچا سکتے۔ اگر حسین مشہدی کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے اس کی بیوی پر ہاتھ اٹھایا ہے تو وہ تمہاری اچھی طرح خبر لے گا۔"
اب تھانیدار نے عورت کو تسلی دی اور کہا "محترم بہن۔ تم خود تجویز کرو۔ حاجی کو کیا سزا دی جائے۔" حاجی نے فریاد کی ..... "نہیں حضور .. نہیں .. خدا گواہ ہے کہ مجھ سے غلط فہمی میں یہ سب کچھ سرزد ہوا ہے۔ میں عالی جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں شہر کا ایک سفید پوش آدمی ہوں۔"
تھانیدار نے کاغذ پر کچھ لکھا اور سپاہی کے حوالے کر دیا۔ حاجی کو ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا حاجی نے گھبراہٹ میں جرمانے کی رقم گن کر دی۔ اب سپاہی حاجی مراد کو تھانے کے سامنے کھلی جگہ پر لے آئے۔ لوگوں کا ہجوم اب پہلے سے بھی بڑھ چکا تھا۔ کئیوں نے حاجی مراد کی جانب انگلی اٹھا اٹھا کر اشارے بھی کئے۔ کانا پھوسیاں بھی ہوتی رہیں۔ ایک آدمی کوڑا لے آیا۔ حاجی کا زرد کرتا اتار دیا گیا۔ حاجی مراد کا سر شرم کے مارے جھکا ہوا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اس پر کوڑے برسائے گئے' مگر مراد نے اف تک نہ کی۔ کوڑے کھانے کے بعد وہ اٹھا ریشمی رومال سے چہرہ صاف کیا' اپنا زرد کرتا کندھے پر ڈال کر نجی چال چلتا ہوا وہاں سے چلدیا۔ اب وہ اس طرح قدم رکھ رہا تھا جیسے زمین کو زحمت نہ پہونچے۔ قدم دھرنے میں یہ احتیاط کر رہا تھا کہ نئے جوتوں کی آواز سنائی نہ دے گویا یہ آواز بھی اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔
اور دوسری صبح اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے ڈالی۔

عباس حکیم / شعیب احمد

لا انتہا خواب میں ہے

رات، کھڑکی میں اداس بیٹھی تھی۔ دو روز سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ نہ ختم ہونے والی تیز اور موسلا دھار بارش! زمین اور آسمان کو جیسے نیلی ڈوریوں سے باندھ دیا گیا ہو۔ ساری رات میں کھڑکی کے اداس بستر کو دیکھتا رہا اور زندہ اور روشن دنوں میں گھومتا رہا۔ وہ دن جو سحر سے پھوٹتے تھے۔ جب زندگی امڈتی تھی اور خوشیاں رقص کرتی تھیں۔ میں سردیوں سے اٹا ہو درہ تھا، میں اس پودے کی طرح تھا جس کی شاخوں سے بہار اڑ گئی تھی....

مجھے اپنے ریاضی کے استاد یاد آنے لگے جو کہتے تھے۔

"....... دو متوازی خطوط کبھی آپس میں نہیں مل سکتے!"

متوازی خطوط آپس میں کیوں نہیں مل سکتے؟! آخر کیوں؟!

...... پہاڑ، پہاڑ سے نہیں مل سکتا۔ انسان انسان سے مل سکتا ہے۔ پہاڑ باہم متوازی ہیں، انسان متوازی نہیں ہیں۔ پہاڑ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے، انسان ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ انسان سیدھے نہیں ہیں، انسان ٹیڑھے ہیں۔ متوازی خطوط سیدھے ہیں۔ متوازی خطوط ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔

پھر کہتے

"متوازی خطوط لا انتہا میں ملتے ہیں۔"

بہت اچھا، خوشی ہوئی کہ یہ بیچارے کمزور خط بھی کہیں جا کر تو مل سکیں گے۔ کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کوئی چیز ناممکن نہیں۔ اس نے سچ کہا ہے۔ بالآخر ہر ناممکن کو ممکن بننا ہے۔ بس انتظار کی ضرورت پڑتی ہے، چشم براہ رہنا پڑتا ہے۔

وہ مزید کہتے

"لا انتہا کچھ نہیں ----- لا انتہا کا کوئی وجود نہیں اور اگر کہیں ہے تو پھر وہ لا انتہا نہیں ہے!"

مطلب یہ کہ متوازی خطوط کہیں نہیں مل سکتے۔ مجھے اس میٹھے خواب سے نکال کر اچھا نہیں کیا گیا۔

جب میرے ھندی نژاد استاد ڈائس پر کھڑے کہہ رہے تھے۔

"لا انتہا کچھ نہیں۔ لا انتہا کا کوئی وجود نہیں" انہیں خبر نہیں تھی کہ وہ مجھے لا انتہا کی وسعتوں میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے نزدیک لا انتہا سیب کا درخت ہے جو لب جو کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اور آدم دوڑتے ہوئے درخت کی طرف جا رہے ہیں! سیب کا درخت حوا ہے! حوا سیب کا درخت ہے۔ سیب کا درخت آدم ہے! سیب کا درخت سانپ ہے! سانپ شیطان کا بوسہ ہے! قہقہہ مارتا ہوا ظلم ہے....

درخت اچھے ہیں، میں ان سے اوپر نکلتا ہوں وہ میرے ...... بدن پر خراشیں ڈال دیتے ہیں - میرے ہاتھ

پاؤں زخمی کر دیتے ہیں لیکن مجھے ان سے محبت ہے میں پھر بھی ان سے اوپر نکلتا ہوں۔ ان کی شاخوں میں بیٹھتا ہوں اور پتوں سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ پیتا ہوں۔ استاد کہتے ہیں۔

"لاانتہا کو سوچا نہیں جا سکتا۔ اگر اسے سوچا جا سکے تو پھر وہ لاانتہا نہیں ہے!"

ندی بھاپ بن گئی' سیب کا درخت سوکھ گیا!........

میرا ستارہ گم ہو گیا اور میری چینی کی گڑیا ٹوٹ گئی.....

"لاانتہا کہیں ختم نہیں ہوتا۔ لاانتہا کا کوئی وجود نہیں - ہر خط کا ایک نقطۂ انجام ہے لیکن متوازی اور منحنی خط کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ دونوں طرف سے لاانتہا تک جاتے ہیں---- لاانتہا کو لیٹے ہوئے آٹھ (00) سے ظاہر کرتے ہیں یہ لاانتہا کی علامت ہے......"

لاانتہا لیٹا ہوا آٹھ ہے! لاانتہا تھکا ہوا آٹھ ہے! لاانتہا پڑا ہوا ہے' سویا ہوا ہے' مرا ہوا ہے! دو متوازی خطوط کبھی آپس میں نہیں مل سکتے۔ اگر ایک خط جھک جائے تو دوسرے تک پہنچ سکے گا لیکن پھر وہ دوسرے کے متوازی نہیں رہے گا----- نہ رہے! متوازی نہ رہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟! میں کہتا ہوں: متوازی خطوط ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔

کھڑکی جاگ اٹھی۔ ایک ہیولا سا شیشے کے ساتھ ٹکرا کر تاریکی میں گر گیا۔ ننھے پرندے نے اپنا نازک پنجہ شیشے کے نیچے ڈوری سے باندھ رکھا تھا اس کے پر کھلے تھے اور وہ چونچ سے شیشے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے بتی بجھا دی آہستہ سے کھڑکی کھولی' ہاتھ بڑھایا اور بھیگی ہوئی رات سے اسے پکڑ لیا۔ پھر کھڑکی بند کی' بتی جلائی' اپنے ہونٹ اس کے گرم مرطوب پروں پر رکھے' میں نے اس کا بوسہ لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں سے سفید پردہ جھلکا جس نے اس کی آدھی آنکھوں کو چھپا لیا۔ اس کا زرد سینہ کانپ رہا تھا اس کا سرخاکستری' کندھے آسمانی اور دم سبز تھی.....

اس نے میرے ہاتھ پر بیٹھ کر جھرجھری لی' اڑا اور چچا کی تصویر والے فریم پر بیٹھ گیا پھر وہ چہک چہک کر گانے لگا۔ چچا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان کے لبوں پر مہربان مسکراہٹ جم گئی تھی۔ میں اس کے لئے دانہ پانی لینے باہر لپکا...... دانا اور پانی والا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے میں نے سوچا اگر دانہ نہ کھاتا ہو تو! میں دوبارہ باہر نکل گیا اور جب واپس آیا تو اس کی آواز کمرے میں لہراتی پھر رہی تھی۔ ہر چیز میں جان آ گئی تھی۔ ہر چیز زندہ ہو گئی تھی۔ میں آرام سے پلنگ پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں اور کان جادوگر پرندے پر لگا دیئے۔ لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ جمع ہو رہے تھے۔ وہ اچھل رہے تھے اور زرد رنگ کے غباروں میں سے چہک رہے تھے۔ غبارے آٹھ کی شکل میں تھے! اب لاانتہا کی علامتیں! ہوا بھرتی جاتی تھی اور یہ بڑے ہوتے جاتے تھے۔ اوپر اٹھتے تھے اور میری تھکی تھکی آنکھوں کے سامنے آ کر پھٹ جاتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ نغموں کی پر رونق گود سے نیند اور خواب کے پہلو میں پھسل گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو کھڑکی' دھوپ کو کمرے کی تنہائی میں گھسیٹ لائی تھی اور قالین کے نقش و نگار دن کی گداز حدت میں سو رہے تھے۔ میں نے میز پر رکھے پیالوں کو دیکھا اور اچانک میرا دھیان گزشتہ رات کی طرف نکل گیا۔ مجھ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چچا اداس تھے! فریم کے اوپر پرندہ نہیں تھا۔ میں نے ہر جگہ دیکھا مگر اس کا نام و نشان تک نہ ملا----- رات کو میں نے کمرے کا دروازہ تو بند کر دیا تھا اور کمرے میں کوئی ایسا روزن بھی نہیں جس سے وہ باہر جا سکتا ہو۔ کل جب میں نے اسے پکڑا تو کئی بار سوچا کہ کل چھوڑ دوں گا۔ یہاں اکیلا ہے'

اداس ہو جائے گا۔ بہار کا موسم ہے اور اسے اپنے ساتھی کے پاس ہونا چاہیے لیکن جب اس نے میری آنکھوں اور کانوں پر جادو کر کے رات اور تنہائی کا سکون مجھ سے چھین لیا تو میں سمجھ گیا کہ اسے آزاد نہیں کر سکوں گا۔ اس نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ گاتا تھا اور پرواز کرتا تھا۔ وہ رات کی سوغات تھا۔ ڈر اور بارش کا پیش خیمہ تھا......

میں نے آہستہ سے کھڑکی کھولی اور رات کی بھیگی ہوئی گود سے اس کو اٹھا لیا۔ اگر میں نہ ہوتا! اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ رات کے اس شکاری پرندے کا لقمہ بن چکا ہوتا جو کھڑکی سے ٹکرا کر تاریکی میں گر گیا تھا۔ میں نے بتی بجھائی۔ آہستہ سے کھڑکی کھولی۔ ہاتھ نکال کر بارش کے جنگلوں میں اسے پکڑ لیا۔ میں اس کے نازک بدن کو اپنی سانسوں کی گرمی پر لپیٹتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے موتی میری آنکھوں میں رکھ دیئے۔ میرے ہاتھ پر بیٹھا' جھرجھری لی' اڑا اور اڑ کر فریم پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ چہک چہک کر گانے لگا اور میری آوارہ روح سے خاموشی اور تنہائی کا غبار چھٹ گیا۔ میں کتنا خوش نصیب تھا! خوش نصیب تھا پر جانتا نہیں تھا لیکن اب...... اب تو وہ نہیں ہے ...... میں سوچنے لگا دو متوازی خطوط لاانتہا میں جا کر ملتے ہیں۔ لاانتہا کا کوئی وجود نہیں۔ دو متوازی خطوط کبھی آپس میں نہیں ملیں گے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ چچا کہہ رہے تھے۔

"نہ روؤ! میرے پاس آجاؤ! بتاؤ ناں کیا بات ہے؟"

فریدوں تنکابنی / محمد اطہر مسعود

........بس اس کی کسر تھی

معلوم نہیں یہ عمدہ خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا کہ آدمی بغیر ناشتہ کئے دفتر چلا آئے۔ بس اتنا پتا چل سکا کہ دو تین دن میں ہی سب ملازمین نے بغیر ناشتے کے آنا شروع کر دیا اور یوں صبح وقت پر دفتر پہنچنے لگے۔ پہلے چند دن تو سب کا بھوک کے مارے برا حال ہوا مگر ایک دن محمود نے بالاخر ہمت کی اور ایک بسکٹ کا ڈبا خرید لایا۔ بس تکلفاً" ہی باقی ساتھیوں سے پوچھنے کی دیر تھی کہ سب نے بغیر کسی ھجکچاہٹ کے ایک ایک بسکٹ اٹھا لیا اور یوں منٹوں میں ڈبا ختم۔ ان حالات میں آئندہ سے بسکٹ خریدنے کی ہمت کون کرتا؟

چند دن بعد مس حامدی نے دفتر آتے ہوئے راستے میں ایک سینڈوچ نکالا' اس کی خوشبو آنا" فانا" پھیل گئی اور سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مس حامدی نے بھی رسماً" و اخلاقاً" سب سے پوچھا مگر سب نے شکریے کے ساتھ یہ پیشکش رد کر دی سوائے حمیدی کے' جو بولا:

"چونکہ مجھے السر کا مرض ہے لہٰذا آپ کی اجازت سے صرف ایک لقمہ..... امید ہے آپ برا نہیں منائیں گی!" یہ کہا اور مس حامدی کا آدھا سینڈوچ توڑ لیا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ صرف "ایک لقمہ" ہے' سارے کا سارا ایک ہی بار منہ میں ڈال لیا۔

یوں مس حامدی نے اپنا سینڈوچ بلکہ اپنا باقی ماندہ سینڈوچ اسی نیم خاموش ماحول میں غصے اور جھجک سے ملے جلے انداز میں زہر مار کیا۔

کمرے کے سکوت کو بالاخر حمیدی کی بھاری بھرکم آواز نے توڑا:

"کیوں نہ ہم سب کل سے سینڈوچ کھانا شروع کر دیں؟"

محمدی بولا:

"تجویز تو اچھی ہے!"

احمدی نے کہا:

"ہاں کیوں نہیں۔"

حمیدی ایک بار پھر گویا ہوا:

"تو پھر طے ہو گیا کہ ......"

مہدی نے بھی بادل نخواستہ موافقت کا اظہار کر ہی دیا۔

اگلے دن سب نے اپنے اپنے پیسے دیئے اور چپراسی کو بلا کر سینڈوچ منگوانے لگے:

"دیکھو! پانچ سینڈوچ............"

"جی..... وہ..... منیجر صاحب کا حکم ہے کہ کسی کے ذاتی کام کے لئے دفتر سے باہر نہ جاؤں......."

"اچھا چلو رہنے دو' جاؤ۔"

"مجھے سب معلوم ہے اسے کیا تکلیف ہے۔ کوئی بات نہیں ہم خود ہی خرید لایا کریں گے۔"

"منیجر کیا کہے گا؟"

حمیدی بولا:

"اس کی فکر نہ کرو۔ اسے میں خود دیکھ لوں گا۔"

اور حمیدی خود ہی منیجر کے پاس چلا گیا:

"سر! آپ سینڈوچ پسند فرمائیں گے؟ میں باقی ساتھیوں کے لئے لینے جا رہا تھا سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں۔"

منیجر نے سر اوپر اٹھائے بغیر ہی کہا:

"چکن!" اور ابھی حمیدی مڑا بھی نہ تھا کہ آواز آئی: "کنگ سائز"۔

اس دن کے بعد گویا یہ کام بھی حمیدی کی ڈیوٹی میں شامل ہو گیا۔ وہ ہر روز اپنے سب ساتھیوں سے پیسے جمع کرتا' سینڈوچ خرید کر لاتا اور سب میں تقسیم کرتا۔ لیکن منیجر کے سینڈوچ کے پیسے ان سب کو مل کر ہی ادا کرنا پڑتے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ منیجر نے حمیدی کو کسی کام سے بلوایا تو اسے محض یہ کہہ کر ٹرخا دیا گیا:

"سر وہ تو سینڈوچ لینے گیا ہوا ہے۔"

رفتہ رفتہ یہ خورد و نوش بھی دفتر کے کام کا حصہ شمار ہونے لگا۔ اسی قسم کا ایک اور معمول اخبار اور میگزین تھے۔ شروع شروع میں احمدی ہر ہفتہ کے دن اپنے لئے "کیمان سپورٹس" اور مس حامدی کے لئے "زن روز" خرید لاتا تھا۔ ایک دن منیجر نے ان دونوں کو دفتری اوقات کے دوران رسالہ پڑھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا:

"یہ دونوں رسالے فی الفور میرے کمرے میں بھجوا دیجئے۔ یہ دفتر ہے کوئی لائبریری نہیں۔"

اس کے بعد تو ہر سنیچر کو دونوں رسالے علی الصبح منیجر صاحب کی میز پر پہنچ جاتے اور ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے کسی کو انہیں وہاں سے اٹھانے کی جرات نہ ہوتی۔ اس وقت تک "زن روز" میں شائع شدہ تمام انعامی معمے حل ہو چکے ہوتے اور "کیمان سپورٹس" کی حالت بھی خاصی بگڑ چکی ہوتی منیجر بھی مس حامدی کی طرح انعامی معموں کا دیوانہ اور احمدی کی طرح فٹ بال کا شیدائی تھا۔

معاف کیجئے گا ہم اپنے موضوع سے بہت دور نکل گئے۔ بات تو ناشتہ نہ کرنے اور سینڈوچ خریدنے سے شروع ہوئی تھی۔ اس معمول کو شروع ہوئے ابھی ایک یا دو ہفتے ہی ہوئے ہونگے کہ محمدی کے ذہن میں ایک اور تجویز در آئی:

"یہ ہم اتنے مہنگے سینڈوچ کیوں خریدیں ...... اور وہ بھی باسی ڈبل روٹی اور نجانے کب کے پڑے بیف یا چکن کے بنے ہوئے' جنہیں کھا کر فوڈ پوائزننگ ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ ہم یہ سینڈوچ خود بھی تو تیار کر سکتے ہیں۔!"

اسی وقت ایک خصوصی میٹنگ میں یہ تجویز بالاتفاق منظور کر لی گئی۔

اگلی صبح جب حمیدی دفتر آیا تو اس کے پاس تین سو گرام بیف' تین سو گرام سلاد' ڈبل روٹی کے چند سلائس اور دو ایک ٹماٹروں کے علاوہ ایک عدد تیز چھری اور ایک نمکدانی بھی تھی۔ (منیجر کا کنگ سائز چکن سینڈوچ' اس سارے انتظام کے باوجود' اپنی جگہ قائم و دائم تھا۔" مس حامدی نے دوبار ہاتھ صابن سے دھو چکنے کے بعد سینڈوچ

تیار کرنے شروع کئے۔ نتیجہ حسب توقع ہی رہا۔ تازہ ڈبل روٹی اور نرم و لذیذ بیف کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ علاوہ ازیں ایک سینڈوچ زائد بچ گیا جسے سب نے باصرار مس حامدی کو پیش کیا:

"واللہ قطعاً" گنجائش نہیں۔"

بعض نے رائے دی کہ اسے چپراسی کو دے دیا جائے مگر حمیدی بولا:

"چھوڑیں جی! اسے سر چڑھانے سے کیا فائدہ۔ لاؤ ایک لقمہ میں لے لیتا ہوں۔" اور ساتھ ہی چھری سے آدھا سینڈوچ کاٹ لیا۔ بقیہ نصف احمدی نے ختم کر ڈالا۔ اگرچہ اب دفتر کی روٹین یہی بن گئی تھی مگر پھر بھی یکسانیت سے بچنے کی خاطر کبھی کبھی وہ مینو میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کر لیتے۔ مثلاً" ہفتے میں ایک دن انڈے خرید لئے جاتے اور دفتر کے کچن میں ہی انہیں تیار کروا لیا جاتا۔ بعض دفعہ مس حامدی اپنے گھر سے شام کے بچے ہوئے شامی کباب لے آتی۔

ایک دن تو انتہا ہی ہو گئی۔ انہوں نے ایک سالم مرغ روسٹ خرید لیا۔ اس موقع پر بھی مس حامدی کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے بطریق احسن مرغ کے برابر حصے کئے اور سب میں تقسیم کر دیئے۔ اسی طرح ایک روز جگر کھانے کا پروگرام بن گیا مگر شومئی قسمت کہ جس وقت جگر فروش اپنی ٹرے اٹھائے دفتر کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا تو اس کی مڈھ بھیڑ مینجر سے ہو گئی۔ ناچار جگر والا پروگرام ملتوی کر کے وہ سب اپنے اسی پرانے سینڈوچ پر لوٹ آئے۔

شکم کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو کام کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ بے شک خورد و نوش کے ان معمولات کی بدولت غیر حاضریوں اور دیر سے آنے کی شرح میں خاصی کمی واقع ہوئی تھی مگر پھر بھی کچھ لوگوں کو دفتر پہنچتے پہنچتے دیر ہو ہی جاتی جس کا جرمانہ انہیں ہر ماہ ادا کرنا پڑتا۔

کچھ ہی دن بعد سب سے دیکھا کہ مس حامدی نے صبح آتے ہی اپنے پرس سے ٹوتھ برش اور پیسٹ نکالی اور واش روم کی راہ لی۔ واپسی ہوئی تو بولی:

"میں نے دیکھا دیر ہو رہی ہے تو سوچا کہ آفس جا کر دانت صاف کر لوں گی۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

یقیناً" کوئی حرج نہیں تھا بلکہ یہ تو ان سب کے حق میں بہتر ہی ہوا کہ انہیں مس حامدی کو دانت صاف کرتے ہوئے بھی دیکھنے کا موقع ملا اور یوں اس کا ایک اور خوبصورت انداز ان کے ذہنوں پر نقش ہو گیا۔

اگلی صبح سب نے واش روم سے "ونوز" کی عجیب سی آواز سنی۔ تھوڑی دیر بعد محمودی چہرے پر فتح مندی کے تاثرات لئے زیر لب مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں برقی ریزر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی تازہ شیو چیک کرتے ہوئے بولا:

"ھاھا..... اسے کہتے ہیں پندرہ منٹ کی بچت!"

محمودی کی دیکھا دیکھی محمدی بھی دوسرے دن آیا تو اس کے پاس شیونگ برش، کریم اور بلیڈ پر مشتمل پوری شیونگ کٹ موجود تھی۔ لیکن اس دن شاید محمدی کا ستارہ ہی گردش میں تھا---- مینجر کو اسہال کی تکلیف تھی لہذا محمدی کی شیونگ کٹ بیکار ہی رہی۔

چند دن بعد، جب مینجر کو کچھ افاقہ ہوا تو ایک بار پھر واش روم سے آواز آنی شروع ہوئی جو محمودی کے ریزر سے ذرا زیادہ بلند تھی------ مس حامدی اپنے چھوٹے سے دستی ہئیر ڈرائر سے بال سیٹ کرنے میں مصروف تھی۔

کچھ عرصہ بعد!

اگر ٹائپ رائٹر پر کام نہ بھی ہو رہا ہوتا تو "ٹک ٹک" کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔ سبھی لوگ باری باری مس حامدی کے نیل کٹر سے ناخن کاٹنے میں مصروف رہتے۔

ایک دن جب احمدی' مس حامدی کا چھوٹا آئینہ سامنے رکھے اپنی چھوٹی قینچی سے مونچھوں کی پیرائیش میں مصروف تھا تو اچانک دروازہ کھلا اور منیجر کمرے میں داخل ہوا۔ اس دن تو احمدی نے اداکاری کی حد ہی کر دی۔ اتنی صفائی سے قینچی دراز میں رکھی کہ آواز تک نہ آئی اور ساتھ ہی رومال اٹھا کر منہ پر رکھ دیا۔ منیجر بولا:

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے احمدی؟"

"بس ...... سر...... یہ ذرا ہونٹ پر چھوٹی سی پھنسی نکل آئی تھی......"

"اوہ۔ اچھا......"

ابھی منیجر کمرے میں موجود ہی تھا سب زیر لب مسکرا پڑے ------ احمدی کی نصف مونچھ اسی بدحواسی میں ناتراشیدہ رہ گئی تھی۔

اگرچہ ایسی سب مصروفیات اب دفتری معمول کا باقاعدہ حصہ معلوم ہونے لگی تھیں اور کسی بھی سٹاف ممبر کے لئے ان میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی مگر حمیدی کا صبح سب سے پہلے دفتر آنا سب کی سمجھ سے باہر تھا۔ حاضری رجسٹر پر سب سے پہلے دستخط اسی کے ہوتے مگر وہ خود ایک گھنٹہ بعد آتا۔ سارے سٹاف کی سخت کوشش کے باوجود نہ تو کوئی اور اس سے پہلے دفتر آسکا اور نہ ہی اس کے جلدی پہنچنے کا راز معلوم کر سکا۔ بالآخر خود حمیدی نے' جو اس دن بڑے موڈ میں تھا' یہ راز سب پر آشکار کیا:

"یوں ہے کہ میں جونہی بیدار ہوتا ہوں بس لباس تبدیل کر کے دفتر چلا آتا ہوں...... اور منہ ہاتھ دھونے سے لیکر دانت صاف کرنے اور شیو کرنے تک دیگر سب کام یہیں انجام دیتا ہوں۔ اس طرح مجھے آدھا گھنٹہ مزید سونے کا موقع مل جاتا ہے۔"

اور

حمیدی نے واقعی سب دوستوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ دفتر آکر انجام دینے والے کاموں میں صرف ایک کام رہ گیا تھا سو وہ بھی اس نے اوور ٹائم والے دن انجام دے ڈالا۔ اگرچہ اس کام کی ادائیگی میں اسے چوکیدار کی بھی تھوڑی بہت "خدمت" کرنا پڑی لیکن درحقیقت یہ ان دونوں کے آئندہ "باہمی تعاون" کی ابتدا تھی جس کا آغاز اسی ماہ سے ہو گیا ------ منیجر کی طرف سے دونوں کی جواب طلبی اور جرمانے کی صورت میں!

کلیرائس لسپکٹر / محمود احمد قاضی

دنیا کی سب سے چھوٹی عورت

استوائی افریقہ کے تاریک حصوں میں فرانسیسی سیاح مارسل پریٹر جو کہ شکاری اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ حیران کن طور پر چھوٹے بونوں کے ایک قبیلے سے روشناس ہوا اور یہ خبر پا کر وہ اور زیادہ حیران ہوا کہ جنگلوں سے آگے اور زیادہ فاصلے پر اس سے بھی زیادہ چھوٹے قد کے لوگ موجود تھے۔ پس وہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔

مشرقی کانگو میں جھیل کیو کے نزدیک اس نے حقیقتاً" دنیا کے سب سے چھوٹے بونوں کو دریافت کر لیا اور ایک ڈبے کے اندر ڈبہ اور پھر اس ڈبے کے اندر ایک اور ڈبے کی طرح تابعدار اور یہ اس لحاظ سے کہ اس فطری انداز میں کوئی اور اس سے بازی نہ لے جائے' دنیا کے سب سے چھوٹے بونوں کے درمیان وہاں دنیا کے سب سے چھوٹے بونوں کی سب سے چھوٹی چیز موجود تھی۔

مچھروں اور شیر گرم درختوں کے درمیان' بہت زیادہ اور کچھ کم سبز پتوں کے درمیان' مارسل پریٹر نے ایک اٹھارہ انچ قد کی پوری جوان' سیاہ' خاموش' بندر کی طرح سیاہ عورت کو دیکھا۔ اس نے اخباری نمائندوں کو بتایا۔"جو اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ایک درخت کے اوپر رہتی تھی۔ جنگل کے شیر گرم' بدبودار بھبھکوں میں۔ وہ پھلوں کو بہت جلدی پگھلا دیتی تھی اور انہیں از حد اپنی مرضی کے مطابق بنا لیتی تھی' وہ حاملہ تھی۔

تو وہاں وہ دنیا کی سب سے چھوٹی عورت کھڑی تھی۔ مثال کے طور پر سخت گرمی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فرانسیسی اچانک اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا ہو۔ شاید اس لئے کہ وہ جنونی تھا' اس کی روح نہ تو متزلزل تھی اور نہ ہی اپنی حدود کو پھلانگتی تھی' جو کچھ کہ وہاں موجود تھا اسے ترتیب دینے اور نام دینے کی فوری ضرورت کے تحت اس نے اس کا نام "چھوٹا پھول" رکھا اور تسلیم کی جانے والی حقیقتوں کے درمیان اس نے اس کی علیحدہ پہچان کے لئے فوری طور پر اس کے متعلق کوائف جمع کرنے شروع کر دیئے۔

اس کی نسل جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اس نسل کے صرف چند نمونے ہی باقی رہ گئے ہیں' جو کہ اگر افریقہ کے خفیہ خطرات میں گھرے ہوئے نہ ہوتے تو ان کی تعداد بڑھ سکتی تھی۔ بیماری' پانی کی خوفناک گندگی' ناکافی غذا اور دندناتے درندوں کے علاوہ لیکولاز کے لئے سب سے بڑا خطرہ وحشی بھانٹو ہیں' ایک خطرہ جو خاموش ہوا میں

جنگ کے آغاز کی طرح ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ بھانڈز انہیں بندروں کی طرح جال ڈال کر پکڑتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح' وہ ان کو بھی جال ڈال کر پکڑتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ یہ ننھی مخلوق پسپا ہوتے ہوئے' ہمیشہ پسپا ہوتے ہوئے افریقہ کے وسط میں چھپتے ہوئے ختم ہو گئی ہے جہاں کہ اس سیاح نے خوش قسمتی سے دریافت کر لیا۔ تحفظ کی حکمت عملی کے تحت وہ سب سے اونچے درخت پر رہتے ہیں۔ عورتیں غذا ریندھنے پکانے کے لئے اور کچی چیزوں کو اکٹھا کرنے کے لئے نیچے اترتی ہیں اور مرد شکار کرنے کے لئے۔۔ جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اسے تقریباً" فوراً" ہی آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ درندوں کی وجہ سے یہ بچہ زیادہ عرصے تک آزادی سے عام طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس پر ماتم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اتنی چھوٹی سی زندگی میں کوئی لمبا اور مشکل کام نہیں تھا حتیٰ کہ جو زبان بچہ سیکھتا ہے وہ بہت مختصر' سادہ اور عام طور پر ضروری استعمال والی ہوتی ہے۔ لیکولاز چند نام ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہ چیزوں کو ان کی حرکات و سکنات اور جانوروں کی آوازوں کی مناسبت سے نام دیتے ہیں۔ جیسے روحانی چیزوں کے لئے ان کے پاس ایک ڈھول ہے۔ جب وہ ڈھول کی تھاپ کے ساتھ رقص کرتے ہیں تو ایک چھوٹا نر بھانڈز کی مزاحمت کے لئے کھڑا رہتا ہے جو کہ کوئی نہیں جانتا کہ کہاں سے آن ٹپکے۔

تو اس طرح سے انہی قدموں پر کھڑے کھڑے اس سیاح نے موجود انسانی چیز جیسی اس چھوٹی مخلوق کو دریافت کیا۔ اس کا دل بے طرح سے دھڑکتا ہے کیوں کہ دنیا میں کوئی بھی قیمتی ہیرا اتنا نایاب نہیں ہے۔ ہندوستان کے عالم لوگوں کی تعلیمات بھی اتنی کمیاب نہیں۔ دنیا کے امیر ترین لوگوں نے بھی ایسی عجیب و غریب عظمت کو نہیں دیکھا تو جناب یقینی طور پر وہاں ایک عورت تھی جو کہ ایک نہایت خوبصورت خواب میں بھی متصور نہیں ہو سکتی تھی' اور تب اس وقت اس سیاح نے ڈرتے ڈرتے' احساس کی اس نزاکت کے ساتھ جس کا کہ اس کی بیوی نے بھی کبھی اہل نہیں سمجھا ہو گا کہا۔ "تم ایک چھوٹا پھول ہو۔"

اس لمحے ۔۔۔۔ چھوٹے پھول نے اپنے آپ کو کھجلایا جہاں پر سے کوئی بھی نہیں کھجلاتا۔ سیاح نے اس تصوراتی آدمی کی طرح جو پاکیزگی کا سب سے بڑا انعام حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے' اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

جہازی سائز میں اتوار کے اخبارات کے رنگین سپلیمنٹ میں چھوٹے پھول کا ایک فوٹو چھپا ہے۔ وہ ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا پیٹ پہلے ہی سے کافی بڑھا ہوا تھا۔ چپٹی ناک' کالا چہرہ' چوڑے پاؤں' وہ ایک کتے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

اس اتوار کو ایک گھر میں ایک عورت نے اخبار میں چھوٹے پھول کی تصویر دیکھ کر کہا۔ "میں اسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی کیونکہ یہ میرے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔"

ایک اور گھر میں' ایک عورت نے افریقی عورتوں میں سے اس سب سے چھوٹی عورت سے ایسی معاندانہ شفقت محسوس کی کہ (ایک پاؤنڈ کے علاج سے ایک اونس کی پرہیز زیادہ بہتر ہے) چھوٹے پھول کو محض اس عورت کی شفقت کے سہارے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کون جانتا ہے کہ یہ شفقت محبت کی کون سی تاریکی کی طرف لے جائے گی؟ وہ عورت سارا دن بہت پریشان رہی جیسے کہ وہ کچھ کھو بیٹھی ہو۔ اس کے علاوہ یہ موسم بہار تھا اور ہوا میں ایک خطرناک بردباری تھی۔

ایک اور گھر میں پانچ سال کی ایک بچی تصویر دیکھ کر اور اس کے متعلق تبصرہ سن کر بہت حیران تھی۔ بالغوں سے بھرے ہوئے ایک گھر میں یہ چھوٹی لڑکی اس وقت انسانوں میں سب سے چھوٹی تھی' اور اگر تمام تر لاڈ پیار کا یہی ذریعہ تھی تو محبت کے استبداد کے پہلے خوف کا بھی یہی ذریعہ تھی۔ "چھوٹے پھول" کے وجود نے اس چھوٹی لڑکی کو بہت بے اطمینانی کی حالت میں سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سالہا سال کے بعد' اس کی فہم کے مطابق مختلف دوسری وجوہات کی بنا پر وہ یہ سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور ہو گئی کہ "دکھ بے انت ہے۔"

ایک اور گھر میں' موسم بہار کی تقدیس میں' ایک لڑکی جس کی شادی ہونے والی تھی اس نے اپنے اندر رحم کی ایک لہر محسوس کی۔ "اماں: اس چھوٹی سی تصویر کی طرف دیکھو --- بے چاری چھوٹی سی چیز --- دیکھو یہ کتنی غمگین ہے۔"

ماں نے کسی قدر درشتگی' شکست خوردگی اور غرور کے ساتھ کہا۔ "لیکن یہ اداسی ایک جانور کی اداسی ہے --- یہ انسانی اداسی نہیں۔"

اپنی حوصلہ شکنی پر لڑکی نے صرف اتنا کہا۔ "اوہ اماں!"

ایک اور گھر میں' ایک چھوٹے سے شرارتی لڑکے کے پاس ایک شرارتی خیال تھا۔ "امی جان -- اگر میں اس چھوٹی عورت کو چھوٹے پال کے بستر میں ڈال دوں جبکہ وہ سو رہا ہو تو کیا وہ بیدار ہو کر ڈر نہیں جائے گا؟ کیا وہ چیخے گا نہیں؟ جب وہ اسے اپنے بستر پر بیٹھا پائے گا --- اور پھر ہم اس کے ساتھ کھیلیں گے ---- وہ ہمارا کھلونا ہو گی!"

اس لئے اس کی امی باتھ روم کے آئینے کے سامنے اپنے بال سیٹ کر رہی تھی اور ایک باورچی کی اس بات کو یاد کر رہی تھی جو ایک بار اس نے یتیم خانے کی زندگی کے بارے میں بتائی تھی۔ یتیموں کے پاس کھیلنے کے لئے کھلونے نہیں تھے اور چھوٹی لڑکیوں نے بچوں میں سے ایک کی موت کو نن سے چھپائے رکھا تھا۔ انہوں نے لاش کو ایک الماری میں رکھ دیا تھا اور جب نن چلی گئی تھی تو وہ اس مرے ہوئے بچے کے ساتھ کھیلتی رہیں۔ اسے نہلایا اسے کھانے کو چیزیں دیں پھر انہوں نے اسے سزا بھی دی تاکہ وہ اسے بوسہ دے سکیں' اور اسے تسلی دے سکیں۔ باتھ روم میں امی کو یہ سب کچھ یاد آیا اور اس سوچ میں گم اس کے جھریوں بھرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ اس نے محبت کرنے کی ظالمانہ ضرورت پر غور کیا اور خوشی حاصل کرنے کی لوگوں کی خواہش کی خباثت پر غور کیا۔ اس نے سوچا کہ کس سفاکی سے ہم کھیلتے ہیں۔ بے شمار مرتبہ ہم محبت کے لئے دوسروں کو مار دیتے ہیں' تب اس نے اپنے شرارتی بچے کی طرف دیکھا جیسے کہ وہ ایک خطرناک اجنبی کی طرف دیکھ رہی ہو' اور اس کے اندر اپنی روح کا ایک خوف موجود تھا۔ اپنے جسم سے زیادہ جو اس کے ہونے کا باعث تھا اور خوشی اور زندگی کا ماہر تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف بے راحت فخر اور توجہ کے ساتھ دیکھا کہ اس بچے کے سامنے کے دو دانت پہلے ہی جھڑ چکے تھے' ارتقا خود بخود پنپ رہا تھا' دانت گر رہے تھے ان دانتوں کو جگہ دینے کے لئے جو بہتر طور پر چبا سکیں گے اس نے اس کی طرف گہری سوچ میں ڈوب کر دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا۔ میں اسے ایک نیا سوٹ خرید کر دوں گی۔ ہٹ دھرمی سے اس نے اپنے دانتوں سے بوڑھے بچے کو عمدہ کپڑوں میں سجا سنورا دیکھا۔ ہٹ دھرمی سے وہ اسکو صاف ستھرا دیکھنا پسند کرتی تھی جیسے کہ اس کی صفائی ستھرائی ایک تسلی آمیز برتری کو یقینی بناتی ہو' ہٹ دھرمی سے وہ خوب صورتی کے نرم پہلو کی تکمیل کرتی رہی۔ ہٹ دھرمی کے ساتھ وہ اسے پرے دھکیلتی رہی یعنی اس چیز سے دور

کرنے کی کوشش کرتی رہی جو کہ ایک بندر کی طرح سیاہ کالی ہو سکتی تھی" تب باتھ روم کے آئینے میں دیکھتے ہوئے' امی نے اپنے چہرے پر قطعی مصنوعی اور سماجی مسکراہٹ سجاتے ہوئے چھوٹے پھول کے عام سے چہرے اور اپنے خدوخال کی تجریدی لکیروں کے درمیان ناقابل عبور انفرادیت کا فاصلہ بنا لیا لیکن ۔ سالہا سال کی مشق کے باوجود وہ جانتی تھی کہ یہ ایک ایسا اتوار تھا کہ اس وقت اپنے آپ کو کھوئی جا چکی انفرادیت' خوابوں اور پریشانی سے بچانا ہو گا۔

ایک اور گھر میں' وہ سب اس چھوٹے پھول کو دیوار کے ساتھ رکھ کر اس کے پونے اٹھارہ انچ کے قد کو ناپنے کے تلذذ میں مبتلا تھے اور حقیقتاً" یہ ایک خوش کن حیرانی تھی۔ وہ کسی بھی تیز ترین تصور میں لائی جانے والی تصویر سے بہت چھوٹی تھی۔ خاندان کے ہر فرد کے دل میں اس چھوٹی سی ڈٹ جانے والی چیز کو دیکھ کر ناسٹلجیائی خواہش پیدا ہوئی کہ یہ چیز صرف اس کے لئے تھی۔ یہ چیز جو ہڑپ ہونے سے بچ رہی تھی جو کہ خیرات کا ایک مستقل ذریعہ تھی۔ شہرت کا دلدادہ خاندان اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کون نہیں چاہتا کہ ایک انسان محض اس لئے ہو' اس کا اپنا ہو' یہ بھی سچ ہے کہ ایسا ہونا ہر وقت آسان نہیں ہوتا۔ بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کوئی محسوسات ہی نہ ہوں۔

والد صاحب نے ایک بازوؤں والی کرسی میں دھنس کر یقینی طور پر اخبار کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر وہ اس گھر میں رہے تو ایک ہی جھگڑے میں ختم ہو جائے -- یہاں اس گھر میں ہر چیز جھگڑے کی نذر ہو جاتی ہے۔"

"اوہ تم --- جوز --- تم سدا کے قنوطی ہو۔" والدہ صاحبہ بولیں۔

گھر کی سب سے بڑی لڑکی جس کی عمر بمشکل تیرہ سال تھی' نے کہا۔ "اماں جانی --- کیا آپ نے اس کے پیدا ہونے والے بچے کے سائز کے بارے میں بھی غور کیا ہے؟ والد صاحب اخبار کے پیچھے چھپے ہوئے بے چینی سے ہلے بغیر نہ رہ سکے۔

والدہ صاحبہ نے خوشی سے پگھلتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا کا سب سے چھوٹا کالا بچہ ہو گا۔ تصور کی آنکھ سے اسے اس کے بڑھے ہوئے چھوٹے پیٹ کے ساتھ ہماری میز پر کھانا لگاتے ہوئے دیکھو۔"

والد صاحب غرائے۔ "بس بہت ہو چکا۔"

والدہ صاحبہ نے توقع کے برعکس ناراض ہوتے ہوئے کہا ۔ "لیکن تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ایک نہایت غیر معمولی چیز ہے۔ تم اصل میں بے حس انسان ہو۔"

اور یہ غیر معمولی چیز بجائے خود!

اسی اثناء میں' افریقہ میں' بجائے خود اس نایاب چیز کے دل میں (اور کون جانتا ہے کہ اس کا دل بھی کالا نہ ہو گا' کیونکہ جب ایک بار فطرت ہی سے غلطی ہو چکی تھی تو اب وہ قابل اعتماد نہ رہی تھی) اس کے اپنے ذاتی راز جیسی وہ نایاب ترین چیز تھی۔ جی ایک بہت ہی غیر معمولی حد تک چھوٹا بچہ۔ ایک خاص طریق کار سے' سیاح نے اس چھوٹی سی بالغ عورت کے چھوٹے سے پیٹ کا معائنہ کیا اور اس لمحے سیاح نے اس وقت سے جب سے کہ اس نے اسے دیکھا تھا پہلی بار تجسس کے احساس' سانس لینے یا کامیابی حاصل کرنے یا سائنسی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر اپنے آپ کو فکر مند پایا۔

دنیا کی سب سے چھوٹی عورت ہنس رہی تھی۔

وہ گرم جوشی کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ پھول سی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ انوکھی چیز بجائے خود ابھی تک ہڑپ نہ کئے جا سکنے کے اس ناقابل بیان مسرت کے ہیجان کا تجربہ محسوس کر رہی تھی۔ اسے ابھی تک نہ کھائے جا چکنے کے خیال نے کسی اور وقت شاید اس کے دل میں ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھدکنے کی خواہش پیدا کر دی ہوتی لیکن اس مدہوشی کے لمحے میں، مشرقی کانگو کے گھنے جنگلوں کے درمیان وہ اس وقت اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا رہی تھی۔ اس لمحے اس کی سوچ محض اپنے سب سے چھوٹے ہونے پر مرتکز تھی --- پس وہ ہنس رہی تھی۔ یہ اس طرح کی ہنسی تھی کہ جیسے کوئی بولنا نہ جانتا ہو، بات کرنا نہ جانتا ہو تو وہ محض ہنستا ہے، یہ ایسی ہنسی تھی جس کو وہ مجبور سیاح کوئی نام نہ دے سکا اور وہ اپنی گداز ہنسی سے خود ہی لطف لیتی رہی۔ وہ جو کہ بھسم ہو جانے والی نہ تھی، ختم نہ ہونا، تباہ نہ ہونا ایک سب سے زیادہ مکمل احساس ہے، جبکہ وہ ابھی ہڑپ ہونے سے بچی ہوئی تھی تو اس کی حیوانوں جیسی ہنسی ایسی ہی نازک تھی جیسے کہ خوشی نازک ہوتی ہے۔

سیاح حیران تھا۔

ایک دوسری وجہ کہ یہ انوکھی چیز کیوں اتنا ہنسے جا رہی تھی تو وہ اس لئے کہ اس کے اس چھوٹے پن کے اندر ایک حد سے زیادہ کالی چیز نے حرکت کرنا شروع کر دیا تھا اس انوکھی چیز نے اپنے سینے میں اس گرمی کو محسوس کیا جسے کہ محبت کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس زرد رو سیاح سے محبت کرتی تھی۔ اگر وہ بول سکتی اور اسے بتاتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے تو وہ جھوٹی شان کے ساتھ کھانستا۔ جھوٹی شان جو اس وقت منہدم ہو جاتی جب اس نے مزید کہا ہوتا کہ وہ اس کی انگوٹھی کو بھی بے حد پسند کرتی ہے اور اس کے بوٹوں کو بھی اور جب یہ انہدام ہو چکتا تو چھوٹے پھول کو قطعی پتہ نہ چلتا کہ ایسا کیوں ہوا کیونکہ سیاح کے لئے اس کی محبت (جسے کہ گہری محبت اس لئے کہنا چاہیے کہ وہ صرف گہرے خلوص کے لئے ہی بنی تھی) خلوص پر مبنی محبت اس حقیقت کے حوالے سے کبھی ختم نہ ہوتی کہ وہ اس کے بوٹوں سے بھی محبت کرتی تھی۔ لفظ محبت کے بارے میں ایک پرانی غلط فہمی پائی جاتی ہے اور اگر بہت سارے بچے اس غلط فہمی کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں تو بہت سے دوسرے بچوں نے پیدا ہونے کا نادر موقع کھو دیا ہے محض اس تاثر کی بناء پر کہ وہ مطالبہ کرتیں ہے کہ جس سے محبت کی جائے وہ صرف میں ہوں۔ میں ہوں میری دولت نہ ہو۔ لیکن جنگل کی اس نمی میں اس ظالمانہ شائستگی کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اور محبت کھائی جانے والی چیز نہیں، محبت تو ایک خوب صورت بوٹ کو پا لیتی ہے۔ محبت اس اجنبی رنگت والے آدمی کو پسند کرتی ہے جو کالا نہیں ہوتا اور محبت ایک چمکتی دمکتی انگوٹھی کی محبت میں بھی ہنستی ہے۔ چھوٹے پھول نے محبت میں پلکیں جھپکائیں۔ اور ہنسی --- گداز ہنسی --

سیاح نے جواباً" مسکرانا چاہا یہ جانے بغیر کہ کتنی گہرائی اس کی مسکراہٹ میں موجود تھی۔ اور تب وہ گھبرا گیا جتنا کہ ایک بڑا آدمی گھبرا سکتا ہے۔ اس نے اپنے سیاحوں والے ہیٹ کو سر پر درست کرنے کا بہانہ کیا۔ اس کی رنگت تبدیل ہوئی۔ پھر اس کی رنگت خوب صورت ہو گئی۔ سبزی مائل گلابی --- طلوع آفتاب کے وقت ایک لیموں کی طرح --- وہ بے شک چڑچڑا ہو گیا تھا۔

شاید سر پر موجود علامتی ہیلمنٹ کو درست کرتے ہوئے سیاح نے اپنے آپ پر قابو پایا اور پھر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوا اور اندراج کرنے لگا۔ اس نے اس قبیلے کے چند ٹھہر ٹھہر کر بولے گئے لفظوں کا مطلب اور ان کے اشاروں کا مطلب سمجھ لیا۔ اب وہ سوالات کر سکتا تھا۔

چھوٹے پھول نے جواب دیا۔ "جی ہاں یہ ایک اچھی بات ہے کہ میرے رہنے کے لئے میرا ایک اپنا درخت ہے' حالانکہ اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں اتنی سیاہ ہو گئی تھیں کہ انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ یعنی مالک ہونا --- مالک ہونا --- مالک ہونا اچھا ہے۔" سیاح نے کئی مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔

مارسل پریٹر کو کئی مشکلات بھی پیش آئیں۔ لیکن وہ نوٹس لیتا رہا --- وہ جو نوٹس نہیں لیتے انہیں کام چلانا پڑتا ہے جتنا کہ وہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

اچانک ایک بوڑھی عورت اخبار کو تہہ کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہتی ہے۔

"تو جناب جیسے کہ میں ہمیشہ کہتی ہوں ---- خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ (خدا) کیا کر رہا ہے۔"

ہوکائر مسکلیشو / محمد عاصم بٹ

امن اور جنگ

جنگ میں شریک ہونے میں مجھے دیر ہو گئی تھی۔ مجھے ٹیکسی لینا پڑی۔ یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ حال ہی میں کرائے بڑھے تھے۔ یہ بالکل غیر متوقع اور ایک ناخوشگوار خرچہ تھا۔ میرے بجٹ کے لیے ایک دھچکا۔ تاہم میں بڑی دشواریوں سے بچتا ہوا وقت پر ہی وہاں پہنچ گیا۔ ساعت مینسن کے سامنے ایک طویل قطار تھی' میں واحد پھسڈی نہیں تھا۔ والٹر جو خندق میں میرا رفیق تھا' وہاں جوا کھیل رہا تھا۔ وہ بھی ٹیکسی پر آیا تھا ہم پڑوسی تھے اور جنگ میں تقریباً ایک ہی وقت داخل ہوئے تھے۔ ہر مہینے کی دوسری جمعرات کو ہم دنگا فساد میں شرکت کے لیے گلی کی نکڑ سے بس پکڑتے۔

"میں اس سارے معاملے سے بے زار ہو گیا ہوں۔" والٹر نے کہا۔

"میں بھی۔" میں نے جواب دیا۔

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ہم نے اپنے کارڈز میں چھید کیا اور انتظامیہ کے سائبان کی طرف چل دیئے جہاں عارضی طور پر لباس رکھنے کا کمرہ (پندرہ سے زیادہ برس پہلے) تعمیر کیا گیا تھا۔

"آج تو دیر ہو گئی۔" کمرے کے نوجوان منتظم نے کہا۔

ہم نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم اپنے لاکرز کی چابیاں لے کر چل پڑے۔ سرعت سے لباس تبدیل کیا۔ اپنی پرانی مماثل وردیاں پہنیں' رائفلیں اور گولہ بارود (بیس کارتوس) اٹھائے اور اگلی صفوں کی طرف چل دیئے۔ جنگ کا منظرنامہ شہر کے مضافات میں ایک کھلا علاقہ تھا۔ میدان جنگ کی کانٹے دار تاروں سے جو سائن بورڈز کے ساتھ ساتھ لگی تھیں' احاطہ بندی کی گئی تھی۔ سائن بورڈز پر لکھا تھا "جنگ' خبردار۔" ایک غیر ضروری تنبیہہ۔ چند لوگ یہاں کانجز اور موسم گرما کے گوشہ عافیت میں آئے ہوئے تھے۔

ہم سپاہیوں نے قریب دو کلومیٹر لمبی ایک خندق پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ہمارا دشمن جسے ہم کبھی نہ دیکھ سکے تھے۔ ہم سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خندق میں ہی چھپا بیٹھا تھا۔ دونوں خندقوں کے بیچ کے خطے میں ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ تباہ شدہ جنگی کاریں اور ٹینک' گھوڑوں کی ہڈیوں کے ساتھ گڈمڈ تھے۔ یہ اس زمانے کی یادگاریں تھیں جب باہمی چپقلش بڑی خونخوار ہوتی تھی لیکن اب یہ چپقلش ایک متوازن کیفیت پر ٹھہر گئی تھی جو ہمارے کپتان کے الفاظ میں ایک "خودساختہ مہم" تھی۔ اب جنگیں نہیں ہوتیں۔ وہ ہم کو بس یہی نصیحت کرتے ہیں کہ ہم خندق سے باہر نہ نکلیں میرے لیے یہ ایک مسئلہ ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے کو ایک خالی کارتوس کی بڑی خواہش تھی۔ جسے حاصل کرنے سے میں قاصر تھا۔ لڑکا اصرار کرتا رہتا تھا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

والٹر اور میں ہم دونوں نیچے خندق میں داخل ہو گئے۔ وہ جگہ مکمل غیر آرام دہ ہرگز نہیں تھی۔ ہمارے پاس میزیں' کرسیاں' ایک چھوٹا چولہا' کھانے کے برتن تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریکارڈ پلیئر

اور ایک سفری ٹیلی وژن بھی موجود تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ تاش کھیلی جائے۔
"پھر سہی" اس نے کہا۔ وہ اپنی رائفل کا چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ اور برہمی سے جائزہ لے رہا تھا۔
"یہ خبیث شے اب کام نہیں کرتی۔" اس نے اعلان کیا۔
"خیر۔" میں نے کہا "یہ پندرہ برس پرانی تو ہو گی۔ یہ اتنا فائدہ تو دے چکی ہے۔ جتنا اسے دینا چاہئے تھا۔" میں نے اسے اپنا ہتھیار نہیں کہا۔ عین اسی لمحہ ہمیں ایک تڑاقا سنائی دیا۔ اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزری۔
"یہ بہت نزدیک تھی۔" میں نے کہا۔
"یہ احمق لوگ۔" والٹر گرجا "ایک دن آئے گا جب یہ کسی کو زک پہنچانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" اس نے میرا ہتھیار لیا' کھڑا ہو گیا اور دو ہوائی فائر کئے۔
"اسے اپنے لیے ایک تنبیہہ سمجھو۔" وہ چلایا اور پھر سے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک اردلی بے تار ٹیلی فون کے ساتھ ظاہر ہوا۔ "آپ کی بیوی' مسٹر والٹر۔"
"جہنم میں بھیجو اسے۔" وہ چلایا۔ "وہ یہاں بھی مجھے سکون سے رہنے نہیں دیتی۔" اس نے ٹیلی فون پکڑا "ہیلو' ہاں' یہ میں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے تمہیں بتایا تاکہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے علم ہے کہ تم پریشان ہو' لیکن تمہاری پریشانی بے ضرورت ہے۔ یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں نے اچھی طرح سے خود کو لپیٹ رکھا ہے۔ بارش نہیں ہو رہی۔ کیا تم سن رہی ہو؟ یہاں سب ٹھیک ہے۔ معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ خدا حافظ!"
"یہ عورت نرا عذاب ہے۔" اس نے ٹیلی فون اردلی کو لوٹاتے ہوئے کہا۔
میں کچھ نہ بولا۔ میں خود اپنی بیوی سے پریشان تھا۔ لیکن میرا مسئلہ مختلف تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی یہاں جنگ لڑ رہے ہیں۔ اسے شک تھا کہ میں اپنا دن موٹل میں گزارتا ہوں۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ کس قسم کی جنگ ہے۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی کچھ نہیں جانتا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ یہ بہت الجھا ہوا مسئلہ تھا۔ اسی باعث صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ایک پورا کمیشن بٹھایا گیا تھا۔ کمیشن کا چیئرمین گاہے بگاہے ہم سے ملنے آتا اور اپنی کار کی شکایت کرتا جو اسے ان تفتیشی دوروں کے لیے مختص کی گئی تھی۔ وہ اسے "پرانا باجا" کہتا۔ چند مالی وجوہات کی بنا پر انتظامیہ اسے بدلنے سے انکاری تھی۔
اس صبح اگلی صفوں میں یکسر خاموشی طاری تھی۔ ہم میں سے کوئی گولی چلاتا تو دوسری طرف سے ان میں سے کوئی جوابی فائر کرتا۔ اس کے بعد پھر سے وہی خاموشی چھا جاتی۔ نصف دن گزرنے پر انہوں نے ہمیں کھانا پروسا' سبز سلاد' بھنا ہوا گوشت اور یونانی چاول اور ان کے ساتھ ایک بے مزہ پڈنگ۔۔۔
"صورتحال بد سے بدتر ہو رہی ہے" والٹر نے شکایتی لہجے میں کہا۔ اردلی نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی ریسٹورنٹ میں یا ایسی ہی کسی جگہ بیٹھا ہے۔ والٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔
ہم سہ پہر کے قیلولے کے لیے لیٹ گئے۔ اور گہری نیند سوگئے۔ جب ہم بیدار ہوئے تو رات بھیگ چکی تھی۔
"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔" میں نے والٹر سے کہا۔ والٹر میرے ساتھ چلنے سے قاصر تھا۔ وہ رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ میں ملبوسات کے کمرے میں گیا اور لباس تبدیل کیا۔

"جنگ کی کیا صورتحال ہے۔" اس شوخ نوجوان نے پوچھا "عمدہ، بہت عمدہ۔" میں نے جواب دیا۔ میں ایک کرخت چہرے والے افسر سے اپنا چیک لینے کے لیے انتظامیہ کے دفتر میں گیا۔ وہاں رسید کی تین نقول پر دستخط کئے۔ مجھے بس سٹاپ تک جانا تھا اور میرے پاس بہت وقت تھا۔

گھر میں میری بیوی اپنے رقص کے لباس میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے روکھے پن سے کہا۔

میں خواب گاہ تک گیا اور اپنے سامان کا تھیلا کندھے پر ڈالا۔ ہم اپنے مطالعہ کے کمرے میں گئے اور اپنی کام کی پیائش کرنے والی سائیکلوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

"ہم بھلا کہاں تھے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید تم کبھی یہ نہیں جان سکو گے۔" اس نے جواب دیا۔ پھر نقشہ اٹھایا۔ ایک لمحہ کے لیے بغور اس کا جائزہ لیا اور بولی "ایڈریٹک کے ساحلی علاقے بسیگلی میں۔"

ہم جنوبی انداز میں پیڈل چلانے لگے۔ دو گھنٹے بعد جب ہم رکے تو ہنوز ایڈریٹک میں مالفینا کے قریب پہنچے تھے۔ اٹلی تک ہم سال بھر میں پہنچ ہی جائیں گے۔ اس کے بعد پھر کچھ سوچیں گے۔ مجھے طویل المیعاد منصوبے بنانا پسند نہیں ہے۔ قدرتی طور پر اس کا سبب جنگ کی صورتحال ہے۔ تاہم اس سے بھی بڑی ایک وجہ ہے کہ مستقبل غیر معلوم رہے تو انسان ایک مستقل سرخوشی میں گم رہتا ہے۔"

ڈلن تھامس / غلام الثقلین نقوی

میلے کے بعد

میلہ ختم ہو چکا تھا۔ سٹالوں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ کاٹھ کے گھوڑے اندھیرے میں ساکن کھڑے تھے گویا دلکی چال چلنے کے لیے وہ پھر سے مشین کی موسیقی اور گنگناہٹ کا انتظار کر رہے ہوں۔ ہر بوتھ میں ایک ایک کر کے گیس لیمپ گل ہو رہے تھے اور جوئے خانوں کی چھوٹی چھوٹی میزوں کو کینوس سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور کیراوان ہاؤسوں کی کھڑکیوں میں روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔

اس لڑکی کو کسی نے نہیں دیکھا تھا!

وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی اور راؤنڈ اباؤٹس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ برادہ ملی ریت پر قدموں کی آخری چاپ اور فاصلوں میں گم ہوتی ہوئی آوازوں کو سن رہی تھی۔ تب وہ ویران و سنسان میدان میں اکیلی رہ گئی۔ لکڑی کے گھوڑوں اور پری نما کشتیوں کے ہیولوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اسے سونے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ کبھی اس سٹال کا پڑا کینوس کا پردہ اٹھاتی، کبھی اس کا اور اندر کے گرم گرم اندھیرے میں جھانکتی لیکن اندر جانے سے ڈرتی۔ فرش پر بکھرے ہوئے ناریل کے چھلکوں اور تراشوں میں کسی چوہے کے چلنے سے سرسراہٹ ہوتی یا ہوا کے کسی تیز جھونکے سے کوئی کینوس لرزتا یا چرچراتا تو وہ بھاگ کر راؤنڈ اباؤٹس کی پناہ لے لیتی۔

ایک بار وہ تختوں پر چڑھی۔ ایک گھوڑے کے گلے میں پڑی گھنٹی اچانک بج اٹھی تو اس کا سانس رک گیا۔ گھنٹی خاموش ہو گئی لیکن جب تک مکمل سناٹا نہ ہوا اور گھنٹی کی آواز اندھیرے میں ڈوب نہ گئی، اس وقت تک وہ سانس لینے کی جرات بھی نہ کر سکی۔ چپ چاپ چلتے ہوئے کبھی اس نے کسی گنڈولے میں جھانکا اور کبھی جھک کر خیمے کے نیچے دیکھا، کسی جگہ ڈراؤنی خاموشی تھی اور کہیں چوہوں کی سرسراہٹ لیکن ایسی جگہ کوئی نہ تھی جہاں وہ سو سکے۔

وہ خیمہ جہاں دن کو ایک نجومی بیٹھا لوگوں کو قسمت کا حال بتا رہا تھا، اس کے ایک کونے میں سوکھی گھاس کا ایک ننھا سا ڈھیر تھا۔ اس نے ڈھیر کو ہاتھ لگایا تو یوں لگا جیسے وہ حرکت کر رہا ہو۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر ایک بچے کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کیراوان ہاؤسوں تک جائے جو میدان کے کناروں پر استادہ تھے۔ ایک بھدے سے کیراوان ہاؤس کے پاس وہ رک گئی۔ اس کی کھڑکی پر دستک دی پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ اس نے ایک موٹے آدمی کو سٹوو کے سامنے بیٹھے دیکھا۔ وہ ٹوسٹ بنا رہا تھا۔ اس سے زیادہ موٹا آدمی اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ اس نے تین مرتبہ شیشے کو کھٹکھٹایا اور تب وہ سایوں میں چھپ گئی۔ اس نے کیراوان ہاؤس کی پہلی سیڑھی پر موٹے آدمی کے پاؤں کی تھاپ سنی۔

موٹے آدمی نے پکارا "کون ہے؟ کون ہے؟"
لیکن وہ جواب دینے کی جرات نہ کر سکی۔
اس نے دوبارہ پکار کر کہا "کون ہے؟ کون ہے؟"
اب کے وہ اس کی آواز پر بے اختیار ہنس پڑی جو اتنی ہی پتلی تھی جتنا وہ موٹا تھا۔
اس نے لڑکی کا قہقہہ سنا اور اس طرف منہ پھیرا جہاں سایوں نے اسے چھپا رکھا تھا۔
وہ بولا "پہلے تم نے شیشہ کھٹکھٹایا' پھر تم چھپ گئے اور اب قہقہہ لگا رہے ہو۔"
لڑکی نے سایوں سے نکل کر روشنی کے دائرے میں قدم رکھ دیا۔۔۔۔ یہ جانتے ہوئے کہ اب چھپنا بے کار ہے۔
"تو تم ایک لڑکی ہو؟ موٹا آدمی پکار اٹھا "اندر آجاؤ لیکن پہلے اپنے پاؤں پونچھ لینا۔"
اس نے لڑکی کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا اور خود کیراوان کے اندر چلا گیا۔
لڑکی اب اور کیا کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ سیڑھیاں چڑھ کر کیراوان میں داخل ہو جائے جو الم غلم سامان سے اٹا ہوا تھا۔ موٹا آدمی اسی جگہ پر سٹوو کے سامنے بیٹھ چکا تھا جہاں وہ ٹوسٹ کو نامکمل چھوڑ گیا تھا۔
"کیا تم اندر آگئی ہو؟" اس نے پوچھا کیونکہ اس کی پشت لڑکی کی طرف تھی۔
"کیا دروازہ بند کر دوں؟" لڑکی نے پوچھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے' اس نے دروازہ بند کردیا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور اسے ٹوسٹ بناتے ہوئے دیکھتی رہی حتیٰ کہ ٹوسٹ جل گیا۔
"میں تم سے بہتر ٹوسٹ بنا سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"مجھے اس میں کوئی شک نہیں۔" موٹے نے جواب دیا۔
وہ اسے دیکھتی رہی اس نے جلے ہوئے ٹوسٹ کو قریب ہی پڑی ایک پلیٹ میں رکھا اور گول روٹی کا ایک نیا ٹکڑا کاٹا اور اسے سٹوو کے سامنے رکھا۔ یہ ٹکڑا بھی جلد ہی جل گیا۔
"مجھے ٹوسٹ بنا دو۔" لڑکی نے کہا۔
اس نے ناشکری کے انداز میں چمٹا اور روٹی اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔
"اسے خود ہی کاٹو۔" وہ بولا "ٹوسٹ بناؤ اور پھر کھا بھی لینا۔"
وہ بستر سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
"دیکھو تو! تمہارے بیٹھنے سے میرا بستر کس طرح پچک گیا ہے!" موٹا آدمی بولا "نہ جانے تم کون ہو کہ اندر آئیں اور میرے بستر میں ڈینٹ ڈال دیا۔"
"میرا نام اینی ہے۔" اس نے بتایا۔
بہت جلد پوری روٹی کے ٹوسٹ بن گئے اور ان پر مکھن لگ گیا۔ تب لڑکی نے ٹوسٹ میز کے وسط میں رکھے اور دو کرسیاں میز کے آمنے سامنے لگا دیں۔
"میں اپنے حصے کے ٹوسٹ بستر پر رکھ کر کھاؤں گا۔" موٹے نے کہا "تم وہیں بیٹھ کر کھاؤ گی۔"
جب وہ کھانا ختم کر چکے تو موٹے آدمی نے کرسی کو پیچھے سرکایا اور میز کے پرلے سرے پر بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظریں جما دیں۔
"مجھے لوگ موٹا کہتے ہیں۔ میرا گھر "ٹری آرک" میں ہے اور میرا ہمسایہ جو قسمت کا حال بتاتا ہے "ایبر

ڈین" کا رہنے والا ہے۔ موٹے نے کہا۔

لڑکی بولی "مجھے میلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کارڈف کی رہنے والی ہوں۔"

"ہاں! اس نام کا ایک قصبہ ہے تو سہی۔" موٹے آدمی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے پوچھا کہ تم وہاں سے کیوں نکلیں۔

"پیسے کے لیے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

تب موٹے آدمی نے اسے میلے کی تفصیلات سنائیں اور ان جگہوں کے متعلق بتایا جہاں جہاں وہ گیا تھا اور ان لوگوں کا ذکر کیا جن سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی عمر کتنی ہے' اس کے بھائیوں کے نام کیا ہیں اور وہ اپنے بیٹے کو کس نام سے پکارے گا۔ اس نے اسے بوسٹن ہاربر کی تصویر دکھائی اور اپنی ماں کا فوٹو جو وہیٹ لفنر تھی۔ اس نے آئرلینڈ میں گرمیوں کے موسم کا حال بھی بیان کیا۔ اور کہا "میں ہمیشہ سے ایک موٹا آدمی ہوں اور اب میں موٹا آدمی The Fatman کہلاتا ہوں۔ کوئی آدمی موٹاپے میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" آخر میں اس نے کہا کہ جب وہ سسلی میں تھا تو وہاں گرمی کی لہر آئی تھی اور سسلی بحیرۂ روم پر واقع ہے۔

لڑکی نے اسے نجومی کے خیمے میں بچے کے متعلق بتایا۔

"وہ پھر یہ ستاروں ہی کی بات ہوئی۔" موٹا آدمی بولا۔

"بچہ مر جائے گا۔" اینی نے کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ آدمی پولیس مین کو لینے نہ گیا ہو۔ اب اگر میں پھر کسی پولیس مین کے قابو میں آگئی تو اچھا نہ ہو گا۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا۔ باہر کا اندھیرا اسے نامہربان سا لگا۔ اس نے کرسی سٹوو کے اور قریب سرکالی۔

"اگر پکڑا ہی جانا ہے تو بہتر ہے نرم گرم فضا میں پکڑی جاؤں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

لیکن جب اس نے موٹے آدمی کے قدموں کی چاپ سنی تو کانپنے لگی۔ جب وہ ایک متحرک پہاڑ کی طرح سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اس نے اپنی دبلی پتلی چھاتی کو ہاتھوں سے دبا لیا۔ اندھیرے میں اسے یوں دکھائی دیا جیسے موٹا آدمی مسکرا رہا ہو۔

"دیکھو تو ستاروں نے کیا کھیل کھیلا ہے۔" موٹے آدمی نے کہا اور نجومی کے بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے اندر آگیا۔

جب لڑکی نے بچے کو اپنے سینے سے لگا کر بہلایا اور بچہ اس کی چھاتیوں سے لگ کر پہلے رویا اور پھر چپ ہو گیا' تو اس نے موٹے آدمی کو بتایا کہ وہ اس کے باہر جانے سے کتنا خوف زدہ ہوئی تھی۔

"مجھے پولس مین سے کیا سروکار؟" موٹا بولا۔

لڑکی نے بتایا کہ پولیس اسے پکڑنا چاہتی ہے۔

"تمہیں پولیس کیوں پکڑنا چاہتی ہے؟" موٹے آدمی نے پوچھا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بچے کو اپنے نحیف و نزار سینے سے اور قریب کر لیا۔

تب موٹے آدمی کو اس کے دبلے پن کا احساس ہوا۔

"تمہیں خوب کھانا پینا چاہیے' مس کارڈف۔" اس نے کہا۔

تب بچہ رونے لگا۔ پہلے ہلکی آواز میں۔۔۔ پھر جیسے طوفان امڈ آیا ہو۔ لڑکی اسے اپنی گود میں جھلاتی رہی لیکن کوئی تدبیر بھی بچے کو پرسکون کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

"مت روؤ۔۔ مت روؤ۔" موٹا آدمی چلایا لیکن بچے کے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا۔ اینی نے اسے چوم چوم کر بے حال کر دیا لیکن وہ بدستور چیختا رہا۔

"ہمیں کوئی اور تدبیر آزمانی چاہیے۔" وہ بولی۔

"اسے لوری سناؤ۔" موٹے نے کہا۔

وہ لوری گاتی رہی لیکن بچے کو اس کا گانا بھی پسند نہ آیا۔

"اب صرف ایک ہی چارہ ہے۔" اینی نے کہا "کہ ہم اسے "راؤنڈ اباؤٹس" پر لے چلیں۔"

بچے کے بازو اپنی گردن میں حمائل کر کے' وہ لڑکھڑاتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری اور اس ویران میدان کی طرف دوڑی جہاں دن کو میلہ لگا ہوا تھا۔ موٹا آدمی بھی ہانپتا کانپتا اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ خیموں اور سٹالوں میں سے راستہ بناتے ہوئے آخر وہ میدان کے درمیان میں پہنچ گئے جہاں کاٹھ کے گھوڑے ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔

وہ اچک کر ایک گھوڑے کی زین پر جا بیٹھی۔ اس نے چلا کر کہا "انجن چلاؤ۔"

کچھ فاصلے سے پرانی دقیانوسی طرز کی اس مشین کو کرینک لگانے کی آواز سنائی دی جو سارا دن کاٹھ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتی تھی۔ تب اسے رک رک کر انجن کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر گھوڑوں کے سموں کے نیچے تختے کھڑکھڑانے لگے۔

اس نے دیکھا کہ موٹا آدمی اس کے پاس تختے پر آ کھڑا ہوا ہے' اس نے مرکزی لیور کو کھینچ لیا ہے اور سب سے زیادہ پستہ قد گھوڑے پر سوار ہو گیا ہے۔

راؤنڈ اباؤٹ گھومنے لگا' پہلے آہستہ آہستہ۔۔۔ اور جونہی اس کی رفتار میں تیزی آئی' بچہ لڑکی کے سینے سے چمٹ کر چپ ہو گیا اور اس نے تالی بجائی۔

رات کی تیز ہوا بچے کے بالوں کو اڑاتی رہی اور موسیقی اس کے کانوں میں جھنجھناتی رہی۔ کاٹھ کے گھوڑے چکر پہ چکر کاٹتے رہے اور ہوا کی چیخیں ان کے سموں کی کھٹ کھٹ میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہیں۔

اور کیراوان ہاؤسوں میں رہنے والے لوگوں نے دیکھا کہ موٹا آدمی اور ایک لڑکی جو کالے کپڑوں میں ملبوس تھی اور جس کے بازوؤں میں ایک بچہ تھا' مشینی گھوڑوں پر سوار آرگن کی تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی دھن پر چکر پہ چکر کاٹ رہے ہیں۔

ڈھلوان

ہمری اسٹریٹ کے آخری سرے پر ڈھلوان کو روکنے کے لئے حفاظتی دیوار بنی ہوئی تھی۔ جب میں چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ وہ دیوار مشن ہلز کے علاقے کو پرانی آبادی پر گرنے سے روکتی ہے اور اسی لئے تعمیر کی گئی ہے۔ دیوار کے پاس کھائی خاصی تنگ تھی' لیکن نیچے کی طرف چلی گئی تھی' جہاں غریب لوگ اپنے گندے اور خستہ حال مکانوں میں رہتے تھے۔ ہم مشن ہلز کے بچوں کا نیچے پرانی آبادی میں جانا ہماری شان کے خلاف تھا۔ مجھے جان ڈی اور بوبی کو سختی سے منع کیا گیا تھا کہ ہم نیچے نہ جائیں۔ ہمیں تو مشن ہلز اور پرانی آبادی کے درمیان ڈھلوان پر کھیلنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہاں چھوٹے چھوٹے زہریلے سانپ ہیں۔ اگرچہ ہم نے کبھی کوئی سانپ وہاں نہیں دیکھا تھا۔ ہاں ہم نے بیکار اور غریب لوگوں کو گھومتے پھرتے ضرور دیکھا تھا جو کبھی کبھی اوپر مشن ہلز کی نئی آبادی میں کام کی تلاش میں بھی آتے رہتے تھے۔ اور چند پیسوں کے عوض لان کی گھاس کاٹتے' کار کی صفائی کرتے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کر دیتے تھے۔ البتہ انہیں کام کے لئے اوپر آنے کی اجازت تھی۔

ہمارے والدین ہمیں دیوار پر بھی کھیلنے کی اجازت نہ دیتے' اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ ہم دوسری طرف بھی چلے جاتے ہیں۔ یہ دیوار اوپر سے چار فٹ چوڑی تھی اور کھائی پر بند باندھتی سیدھی دور تک چلی گئی تھی' اگرچہ گرمیوں میں ہم تقریباً" روزانہ وہاں کھیلتے تھے مگر مجھے ہمیشہ دیوار کے درمیانی حصے میں جاتے ہوئے خوف آتا تھا کیونکہ اس جگہ سے دیوار خاصی تنگ تھی اور جب نیچے نگاہ جاتی تھی تو نیچے لڑھک جانے کا خوف ذہن پر چھا جاتا تھا۔ یہ دیوار نئی آبادی کی طرف کم جھکی ہوئی تھی اور اس کی ڈھلوان نیچے کی طرف دور تک چلی گئی تھی۔ اس میں جگہ جگہ زنگ آلود سریئے گڑے ہوئے تھے اور اگر کوئی ان پر گر پڑتا تو پھر وہ اس کے جسم کے پار ہو جاتے۔ ادھر نیچے پرانے ڈرم اور کٹے ہوئے کنستر کیلوں والے بورڈ اور اینٹوں کے روڑوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جنہیں نئی آبادی کے لوگوں نے پھینک دیا ہوا تھا۔ اگرچہ محکمہ پولیس کی طرف سے کوڑا کرکٹ نہ پھینکنے کی ہدایت ایک بورڈ پر لکھی نظر آتی تھی۔ جان ڈی کا کہنا تھا کہ نئی آبادی کی جانب والی کھائی ایک دن اسی طرح پر ہو جائے گی۔

ایک عرصہ تک ہم نے جو سب سے بڑی جرات مندی کا کارنامہ سرانجام دیا تھا وہ یہ تھا کہ ہم دیوار پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور ظاہر کرتے تھے کہ ہم ایسا کرتے وقت بالکل خوفزدہ نہیں ہوتے حالانکہ اندر سے میں خوفزدہ رہتا اور مجھے پتہ تھا کہ بوبی کو بھی ڈر لگتا تھا اور یقیناً" جان ڈی بھی اندر سے خوفزدہ ہوتا تھا مگر ہم سب ظاہر نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک بار ہم نے سکیٹنگ کا مظاہرہ کیا 'اگرچہ اسے سکیٹنگ کہنا درست نہیں۔ ہم یوں ہی لکڑی کی کھڑاؤں پہن کر ادھر ادھر چل لیتے۔ یہ جان ڈی کی اختراع تھی۔ چنانچہ ہم نے پہلے اسے ہی چلنے کو کہا۔ اس کے بعد مجبوراً" مجھے جانا پڑا اور ہم دونوں بوبی پر اس وقت تک ہنستے رہے جب تک کہ اس نے بھی چل

کر نہیں دکھایا حالانکہ اسکا چہرہ اور بھی زرد ہو گیا' جب اس نے مجھے اور جان ڈی کو ڈھلوان پر سائیکلیں چلانے کی باتیں کرتے سنا لیکن ہم تو محض شیخیاں مار رہے تھے۔

لیکن پھر ہماری ڈینی سے ملاقات ہو گئی۔

جب ہم نے پہلی بار ڈینی کو دیکھا تو ہم اپنی طرف کھائی میں تھے اور کوکا کولا کے اشتہار کے بورڈ پر پتھروں سے نشانے لگا رہے تھے۔

"ارے ۔۔۔ وہ کون ہے؟" بوبی نے کہا۔

اور میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا دیوار کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پتہ چل گیا کہ اس کا تعلق پرانی بستی سے ہے۔ وہ بہت مریل سا لڑکا تھا۔ اس نے لمبا چوغہ پہنا ہوا تھا اور اس کے پاؤں کے ننگے سیاہ تلوے نظر آ رہے تھے۔

"اوئے" جان ڈی پکارا۔ اس کی آواز عجیب سی تھی۔ "چل اتر دیوار سے۔"

"کیوں؟" لڑکے نے جواب دیا۔ "تم کون ہوتے ہو مجھے دیوار سے اتارنے والے؟" "تمہارا خیال ہے میں نہیں اتار سکتا؟"

"اور تمہارا خیال ہے کہ تم مجھے اتار سکتے ہو۔ موٹے؟"

جان ڈی کو بہت غصہ آیا۔ ویسے وہ اتنا موٹا نہیں تھا۔ ہم بوبی کو پیچھے چھوڑ کر دیوار پر چڑھ گئے۔ بوبی کی جرابیں ہمیشہ اتر کر جوتوں میں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ اور اسے بار بار انہیں اوپر چڑھانے کے لئے رکنا پڑتا تھا۔ پرانی آبادی کا لڑکا ہم دونوں سے چھوٹا تھا۔ وہ بوبی کا ہم عمر ہو گا' اس لئے جان ڈی کے لئے اس سے لڑنا مناسب بات نہیں تھی۔ میں نے جان ڈی کو یہ بات بتائی لیکن خود اسے بھی اس کا احساس تھا کہ اپنے سے چھوٹے پر ہاتھ اٹھانا ٹھیک نہیں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا نام ڈینی بتایا۔ اس کے دانت خراب تھے اور وہ اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا نام رکے ہے' دوسرا جان ڈی ہے اور جو پیچھے آ رہا ہے اسکا نام بوبی ہے۔ ہم سب دیوار پر بیٹھ گئے۔ جان ڈی نے کہا۔ "تم پرانی آبادی سے آئے ہو نا؟"

ڈینی نے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے نیچے کی طرف تھوکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی تھوک دیوار سے ٹکرانے کی بجائے خاصی دور جا کر گری۔ جان ڈی نے کہا۔ "پرانی آبادی میں ایک معمولی سا اسکول تو ہے لیکن یقیناً" تم سکول نہیں جاتے ہو گے۔ نئی آبادی میں تو سب بچے اعلیٰ درجے کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔"

"پرانی آبادی کے سکول میں کیا خرابی ہے۔" بوبی نے پوچھا۔ وہ ہمیشہ اسی قسم کے سوال اٹھاتا رہتا تھا۔ جان ڈی نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "یہ سکول پرانی آبادی میں ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خرابی ہے تمہیں اس بات کا پتہ ہونا چاہیے۔"

بوبی نے جان ڈی کو حیرت سے دیکھا مگر خاموش رہا۔

ڈینی اب بھی اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے تھوک نیچے پھینک رہا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی۔ "کیوں نہ واپس چل کر ہم پھر کوکا کولا کے بورڈ پر نشانے لگائیں۔" ڈینی ہمارے ساتھ ہو لیا اور اس نے ہم سب سے بہتر نشانے لگائے۔ اس پر جان ڈی کو غصہ آیا اور اس نے اپنی سبکی محسوس کی۔ دس میں سے میں نے اور جان ڈی نے

آٹھ مرتبہ اور ڈینی نے نو بار صحیح نشانے لگائے۔ بوبی صرف پانچ پتھر صحیح نشانے پر پھینک سکا۔ پھر جان ڈی نے کہا کہ آؤ دیکھتے ہیں دیوار کی چوٹی تک کون پتھر پھینک سکتا ہے۔ اس مرتبہ جان ڈی جیت گیا۔

"میں اس سے بھی بہتر پتھر پھینک سکتا ہوں" جان ڈی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ایک بار میں نے بہت بڑا پتھر چوٹی تک اچھالا تھا۔"

ڈینی نے جان ڈی کو کن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسے پتھر پھینکنا ہماری آبادی کے کئی لوگوں کا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

"ہوں۔۔۔" جان ڈی نے حقارت سے کہا۔ "پرانی آبادی کے لوگ؟"

پھر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بکرا بلایا۔۔۔ ڈینی نے اس سے زیادہ بلند آواز میں بکرا بلایا۔۔۔ پھر اس نے ایک لمبی ڈکار سی لی۔ جان ڈی نے بھی ڈکار لی مگر وہ کچھ اچھی نہ تھی۔ ڈینی نے اپنی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر اتنے زور کی سیٹی بجائی کہ میں نے اتنی تیز اور اونچی آواز کی سیٹی پہلے نہیں سنی تھی۔ جان ڈی نے سیٹی بجانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم میں سے کسی کو سیٹی بجانی نہ آتی تھی۔ جان ڈی نے خفیف ہو کر کہا۔ "میں پرانی آبادی کے لوگوں کو جانتا ہوں۔ وہ اکثر ہمارے ہاں نئی آبادی میں آجاتے ہیں۔ کبھی رہنے کے لئے جگہ مانگتے ہیں، کبھی اک آدھ روٹی یا کھانے پینے کی کوئی چیز۔۔۔ ممی ان کو باغیچے کی گھاس کاٹنے کا کام دیتی ہیں۔۔۔۔ دیکھو اگر تمہارے باپ کو کام نہ ملتا ہو تو میں ممی سے کہہ کر اسے گھاس کاٹنے کا یا کوئی دوسرا کام دلوا دوں گا۔"

ڈینی نے جواب دیا "اور تمہارے ڈیڈی کو کام نہ ملتا ہو تو میں اسے کام دلا دوں گا۔"

"تمہارا باپ کیا کرتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ آئیل فیکٹری میں کام کرتا ہے۔"

"کیا تم لوگ بکریاں نہیں پالتے؟" بوبی نے پوچھا۔

پھر میں نے اسے بتایا کہ میرا باپ ایک بہت بڑا انشورنس ایجنٹ ہے۔ جان ڈی نے کہا کہ میرا باپ بینک کا وائس پریزیڈنٹ ہے۔ بوبی نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا باپ فیکٹری میں کیا کام کرتا ہے؟"

جان ڈی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "صرف کالے اور میکسیکی لوگ آئیل فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ڈینی کا باپ بیکار آوارہ گردی کرتا ہے۔" ڈینی نے جواب میں جان ڈی کے باپ کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ جس پر جان ڈی نے اسے دھکا دے کر کوکا کولا کے بورڈ پر گرا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر جان ڈی کے پیٹ میں زور کا ایک مکا رسید کیا۔ لیکن جان ڈی نے اسے گرا لیا اور پیٹنا شروع کر دیا۔ ہم نے مشکلوں سے جان ڈی کو پکڑ کر الگ کیا۔ اور اسے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ ڈینی اٹھ کر چلا نہ گیا۔ ڈینی کھائی پار کرنے لگا تو اس نے مڑ کر اپنے کندھے کے اوپر سے تھوکنے کی کوشش کی۔ جان ڈی نے اسے دھمکی دی کہ وہ آئندہ اپنی شکل نہ دکھائے اور دیوار کے اس طرف نہ آئے ورنہ یہ اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

لیکن دو ہی روز بعد ڈینی پھر ادھر آنکلا اور اس کی جان ڈی سے پھر لڑائی ہوئی۔ جان ڈی جیت گیا لیکن ڈینی نے مکا مار کر اس کی ناک لہولہان کر دی تھی۔ ڈینی جان ڈی کے باپ کے متعلق اس وقت تک اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار نہ تھا جب تک کہ جان ڈی اس کے باپ کے بارے میں اپنے الفاظ واپس نہ لے۔ چنانچہ تنگ آکر

جان ڈی نے اپنے الفاظ واپس لے لئے اور ڈینی نے کہا۔ "اچھا میں بھی واپس لیتا ہوں۔"

اس کے بعد بھی اکثر ہم ڈینی کو یہاں دیکھتے رہے۔ ایک دفعہ جب جان ڈی اپنے والدین کے ہمراہ لاس انیجلز گیا ہوا تھا۔ ڈینی نے مجھے اور بوبی کو بتایا کہ وہ پرانی بستی کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا مطلب تھا پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ کیونکہ وہ اکثر ایسے ہی کام کرتے تھے۔ بوبی کو ڈینی اچھا لگتا تھا۔۔۔ مجھے بھی وہ ناپسند نہیں تھا لیکن جان ڈی اور ڈینی کی نہیں بنتی تھی۔ جان ڈی ہمیشہ پرانی آبادی کے لوگوں کے خلاف باتیں کرتا تھا' اور تب ڈینی اسے موٹا کہہ کر چڑاتا تھا۔ جس سے اسے سخت غصہ آتا تھا۔ ڈینی کا جان ڈی کو موٹا کہنا صحیح نہیں تھا لیکن جان ڈی جو کچھ پرانی آبادی والوں کے بارے میں کہتا تھا وہ باتیں ٹھیک تھیں' وہ لوگ ایسے ہی تھے۔ جان ڈی اگرچہ موٹا تھا لیکن اتنا موٹا بھی نہیں تھا۔ اگر ڈینی پرانی آبادی کا رہنے والا نہ ہوتا تو اسے پتہ ہوتا کہ جان ڈی کا اس کی پٹائی کرنا کسی طرح جائز نہ تھا اور اسی لئے وہ ہچکچاتا تھا۔ کیونکہ ڈینی اس سے کہیں چھوٹا تھا اسے مارنا ایسی ہی بری بات تھی جیسی میں یا جان ڈی بوبی کو مارتے' جب کہ بوبی ابھی صرف گیارہ سال کا تھا۔

ایک دفعہ جب ہم ہکری اسٹریٹ کے کنارے سائیکلیں چلا رہے تھے تو ہم نے ڈینی کو دیوار پر دیکھا۔ ہم نے اسے اوپر بلایا اور میں نے اسے اپنی سائیکل لانے اور ہمارے ساتھ چکر لگانے کی دعوت دی۔

"میرے پاس اب میری سائیکل نہیں رہی۔" اس نے جواب دیا۔ اس نے میری سائیکل کی طرف دیکھا جو بالکل نئی تھی اور جان ڈی اور بوبی کی سائیکل سے اچھی تھی۔

"تمہاری سائیکل کیا ہوئی؟" بوبی نے پوچھا۔

"وہ چوری ہو گئی۔"

"میں شرط لگاتا ہوں اس کے پاس کبھی سائیکل تھی ہی نہیں۔" جان ڈی نے کہا۔

"میرے پاس تھی اور میں چلاتا بھی تھا۔" ڈینی نے جواب دیا۔ "چلو نیچے چل کر کھیلتے ہیں۔"

"تم میری سائیکل لے کر چلا لو۔" بوبی نے پیش کش کی۔

لیکن ڈینی اس کی سائیکل نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی سائیکل کافی عرصہ ہوا گم ہو گئی تھی اور شاید اب وہ اچھی طرح سائیکل چلانی بھول گیا ہو' اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ بوبی کی سائیکل کو کوئی نقصان پہنچے۔ یقین تو مجھے بھی نہ آتا تھا کہ کبھی اس کے پاس سائیکل رہی ہو گی لیکن خاموش رہا مگر جان ڈی بولا۔

"اگر ایک دفعہ سائیکل چلانی آجائے تو پھر بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

پھر وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو گیا اور ہینڈل پر پاؤں رکھ کر واپس آتے ہوئے بولا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟" اسے پتہ تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پھر اس نے ڈینی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ڈینی ۔۔۔ تم اپنے ابا سے کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں ایک سائیکل خرید دیں تاکہ تم بھی ہمارے ساتھ سائیکل چلا سکو۔"

"مجھے سائیکل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔" ڈینی نے کہا۔ "پہلے بھی جب میرے پاس سائیکل تھی تو بیکار ہی گھر میں کھڑی رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چوری ہو جانے پر میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔"

جان ڈی نے ایسا قہقہہ لگایا جسے سن کر مجھے ہمیشہ غصہ آتا تھا۔ پھر اس نے اور چھوٹے دائرے بنانے اور چکر لگانے شروع کر دیئے۔ پھر بولا۔

"میں شرط لگاتا ہوں تم میں کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔"

ڈینی منہ لٹکائے جان ڈی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درشتی کے آثار تھے اور اس کے باہر کو نکلے ہوئے میلے دانت نچلے ہونٹ میں سختی سے گڑے ہوئے تھے۔ آخر وہ بولا:

چلو نیچے چلتے ہیں میں یقیناً" کچھ نہ کچھ ایسا کر سکتا ہوں۔ جو تم سب نہیں کر سکتے۔"

ہم اپنی سائیکلیں تھامے اس کے پیچھے نیچے اترے۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر دیوار کے درمیان میں چلتا گیا۔ تب اس نے دیوار کے کنارے پر چلنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنے بازو پھیلائے اور مزید کنارے کی طرف جا کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور دوسری ٹانگ دیوار سے باہر ہوا میں لہرائی اور اکیلی ٹانگ پر بیٹھکیں لگانے لگا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔" جان ڈی نے کہا اور کنارے پر جا کر اس نے بھی بیٹھکیں لگانی شروع کر دیں اگرچہ وہ ڈینی کی طرح عمدہ نہیں تھیں اور جان ڈی جلد ہی ہانپنے لگا تھا لیکن وہ خوش تھا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

اب میری باری تھی اور میرا کوئی ارادہ ایسا کرنے کا نہیں تھا۔ اُدھر ڈینی کا دھیان جان ڈی کی طرف تھا۔ اس کے چہرے پر پہلے کی طرح درشتی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے کہا۔ "اچھا تو تم ایسا تو بالکل نہیں کر سکتے۔"

اور یہ کہہ کر وہ دیوار کی نگر کو ہاتھوں سے پکڑ کر ہوا میں لٹک گیا۔ اور اسی طرح لٹکے لٹکے ڈھلوان اترتا چلا گیا۔ بوبی نے اسے آواز دی۔ "ڈینی باز آجاؤ۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔" لیکن وہ برابر دیوار کی نگر کو پکڑے، گھٹنوں کو لٹکاتا اور پنجوں کو کنارے کی کنکریٹ میں گاڑتا چلتا رہا۔ میں نے بھی اسے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور دیوار کے ساتھ گھسٹتا اور جان ڈی کی طرف دیکھتا بہت دور نیچے چلا گیا جہاں سے اس کا سر اور صرف ہاتھ نظر آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ خود کو گرانے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے اس کے نیچے زنگ آلود سریئے تیروں کی طرح گڑے نظر آرہے تھے۔ اور اس سے پرے کھائی میں ٹوٹے ہوئے کنستر اور کوکا کولا کے اشتہار کے بورڈ کے نوکیلے کنارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چلا رہا تھا۔

"میں شرط لگاتا ہوں تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

اس کا سر دوبارہ ابھرا تو میں نے دیکھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور کنکریٹ پر رگڑی ہوئی ہاتھوں کی انگلیاں سفید ہو رہی تھیں۔ جان ڈی کا چہرہ بھی تمتمایا ہوا تھا لیکن وہ بوکھلایا ہوا بھی تھا۔ جب اس نے میری اور بوبی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ آگے بڑھ کر ڈینی کے ہاتھوں پر حملہ کرنے والا تھا۔ جس سے اس نے دیوار کے کنارے کو پکڑ رکھا تھا اور یہ صورت حال مجھے اس سے بھی بدتر محسوس ہوئی جو ڈینی نے پیدا کی ہوئی تھی لیکن پھر جان ڈی کے بارے میں ایسا سوچنے پر مجھے ندامت ہونے لگی۔ ڈینی دوبارہ اوپر چڑھنے لگا تو دیوار کے کنارے پر کہنی ٹکا کر اس نے دم لیا۔ بوبی نے کہا:

"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

بوبی نے ڈینی کی مدد کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور میری طرف دیکھ کر مجھے بھی مدد کے لئے پکارا۔ لیکن جان ڈی نے اسے پیچھے ہٹا دیا اور میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ جان ڈی کو بوبی پر بھی غصہ آرہا تھا۔ میں ڈینی کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن جان ڈی سے بگاڑنا بھی نہیں چاہتا تھا اس لئے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں میں نے کہا۔ "اب اسے خود ہی اوپر چڑھنا چاہیے۔"

"میں چڑھ لوں گا۔" ڈینی نے کہا اور گھما کر ٹانگ دیوار کے کنارے پر ٹکا دی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا پاؤں پھسل گیا اور بوبی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں بھی چلایا اور سوچا کہ ڈینی کا کام اب تمام ہو گیا۔ مجھے وہ سریئے سامنے گڑے نظر آرہے تھے جو اس کے جسم کے پار ہو سکتے تھے لیکن ڈینی پھر سنبھل گیا۔ اور اوپر چڑھنے کی

جدوجہد کرنے لگا۔ اس کی گردن کے پٹھے پھولے ہوئے تھے۔ اس نے مضبوطی سے کنکریٹ میں انگلیاں گاڑی ہوئی تھیں۔ آخر وہ زور لگا کر اور اچھل کر اوپر چڑھ آیا اور دیوار کے اوپر لیٹ کر سانس لینے لگا۔ اسکا سیاہ چہرہ پسینے سے تر تھا اور اس کے جسم کا سامنے کا حصہ کنکریٹ سے رگڑنے کی وجہ سے سفید ہو رہا تھا۔

"تم ایسا بالکل نہیں کر سکتے موٹے۔" اس نے جان ڈی سے کہا۔

مجھے پتہ تھا جان ڈی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ڈینی کی طرف نہیں دیکھا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "میں تم سے بہتر بھی کچھ کر سکتا ہوں۔"

وہ اٹھا اور سائیکل لے کر پیچھے چلا گیا اور پھر زور زور سے پیڈل چلاتا ہوا دیوار کی ڈھلوان چڑھنے لگا۔ چوٹی پر پہنچ کر جب سائیکل کی رفتار سست پڑ گئی تو وہ اترنے سے پہلے گر پڑا۔ وہ جلدی سے اٹھا' کپڑے جھاڑ کر اور ڈینی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"میں کر لیا کرتا تھا۔" ڈینی نے کہا۔ "اور میں ایسا کر لیتا اگر میری سائیکل چوری نہ ہو گئی ہوتی۔"

"تم سخت جھوٹے ہو۔" جان ڈی چلایا۔ "تمہارے پاس کبھی سائیکل تھی ہی نہیں۔ تمہارا بوڑھا غریب باپ تمہیں سائیکل خرید کر دے ہی نہیں سکتا۔"

پھر وہ میری طرف مڑا اور بولا "رکے کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا "میں نے کب ایسا کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟"

"بزدل" وہ چلایا۔ "تم بھی بزدل اور ڈرپوک نکلے۔ بہتر ہے کہ تم بھی میلے دانتوں والے ڈینی کے ہمراہ نیچے کی آبادی میں چلے جاؤ۔ تم جیسے بزدل اور ڈرپوک کو مشن ہلز کی آبادی میں نہیں رہنا چاہیے۔"

مجھے غصہ آیا اور جی چاہا اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ وہ اس سے پہلے دو مرتبہ مجھے پیٹ چکا تھا۔ مگر میں اس کی یہ باتیں بھی نہیں سن سکتا تھا اس لئے میں نے کہا "ٹھیک ہے موٹے" اور اپنی سائیکل لینے چلا گیا۔

جان ڈی' بوبی کے سامنے اپنی بڑ ہانک رہا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ صرف وہی دیوار پر سائیکل چلا سکتا تھا۔ میں نے ڈھلوان پر سائیکل چڑھائی۔ میں اس وقت تک خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ میں نے نیچے یا اپنے آس پاس نظر نہیں دوڑائی تھی۔ میں پیچھے سے تیزی سے آتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا اور جلدی جلدی پیڈل مارنے لگا۔ میں نے گردن جھکائی ہوئی تھی تاکہ مجھے آنکھوں کے کناروں سے کھائی کی گہرائی نظر نہ آسکے حالانکہ میں اتنا تیز جا رہا تھا کہ میں نے آج تک اتنی تیز سائیکل نہیں چلائی تھی لیکن پھر بھی مجھے لگتا تھا جیسے درمیانی حصے میں پہنچنے میں مجھے کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ میں درمیانی حصے سے آگے بڑھ گیا ہوں اور ابھی تک میری سائیکل ٹھیک جا رہی تھی۔ میں نے صرف ایک بار نیچے پرانی آبادی کی طرف نگاہ کی تو مجھے بڑی گلی جہاں خرید و فروخت ہوتی تھی اور آئیل فیکٹری جہاں ڈینی کا باپ کام کرتا تھا نظر آئے اور نیچے ڈرموں کا ڈھیر دکھائی دیا۔ میں سائیکل چلاتا ہوا دیوار کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اب میں پرانی آبادی سے اتنا بلند تھا جتنا میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور مجھے اس بلندی سے خوف بھی آ رہا تھا۔ میں زور زور سے پیڈل مار رہا تھا۔ اب مجھے گرنے کا خوف تھا اور یہ خوف اس لئے بھی تھا کہ میں بہت تیز جا رہا تھا اور اب رک نہیں سکتا تھا اور کسی طرف مڑنا یا واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا اور دوسری طرف جان ڈی تھا جس کا قد مجھے اپنے سے بڑا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر میں ہار جاتا تو مجھے جینے نہ دیتا۔۔۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ جب پیچھے ہٹنے یا رکنے کا کوئی امکان نہیں تو پھر ڈرنا فضول ہے۔ اب تیر کمان

سے نکل چکا تھا اور واپس کمان میں نہیں آسکتا تھا اس لئے میں نے خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر پتہ نہیں کب اور کیسے میں جان ڈی کے پاس سے گزرا' پھر بوبی کے پاس سے اور پھر ڈینی کے پاس سے اور میں چوٹی پر پہنچ گیا اور میں نے سائیکل کی رفتار کم ہوتے ہی جلدی سے چھلانگ لگا دی۔ اور گرنے سے بچ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ جان ڈی کو اس کی سست رفتاری اور اترتے وقت گر جانے کا طعنہ دوں گا لیکن اب میرا جی نہ چاہا۔ اس کی بجائے میں ڈینی کی طرف مڑا اور اس پر زور زور سے ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا تا آنکہ بوبی نے مجھے بتایا کہ ڈینی بھی اس کی سائیکل لے کر ڈھلوان پر چلانے کے لئے تیار ہے۔ میں نے دیکھا بوبی چیخ رہا تھا اور جان ڈی ٹانگیں چوڑی کئے سامنے کھڑا تھا اور نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ڈینی نے بوبی سے سائیکل لی اور نیچے کھائی کی طرف چل دیا۔۔۔۔۔ وہ ٹانگیں چوڑی کئے سائیکل پکڑے جا رہا تھا تو جان ڈی نے ہولے سے کہا۔

"وہ کوشش نہیں کرے گا۔ اسے تو سائیکل چلانی آتی ہی نہیں۔"

میں نے بھی سر ہلایا لیکن بوبی کچھ نہ بولا۔ ہم ڈینی کو دیکھنے لگے۔

کافی دور جا کر اس نے سائیکل پر سوار ہونے کی کوشش کی تو گر پڑا۔ بوبی چلایا اور ڈینی کو منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن اس نے دوبارہ کوشش کی۔ تب جان ڈی نے چلانا شروع کر دیا کہ وہ بزدل اور ڈرپوک ہے۔ پھر اس نے پرانی بستی کے لوگوں کے بارے میں اور ڈینی کے باپ کے بارے میں بکواس شروع کر دی۔ اس نے ڈینی کو طعنے دیئے کہ اس کا باپ اتنا غریب تھا کہ وہ اسے سائیکل لے کر بھی نہیں دے سکتا تھا اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اس کے دانت ٹھیک کرا سکے' اسے اچھے کپڑے خرید کر دے اور اس کے بال کٹوائے اور مشن ہلز کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے قابل بنا کر بھیجے۔

ڈینی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پہلے جان ڈی کو برا بھلا کہا' پھر ہم سب کو گالیاں دیں اور ہمارے باپوں کے بارے میں گھٹیا الفاظ استعمال کئے۔

اس نے ایسی گندی گالیاں دیں جو ہم نے اپنی نئی آبادی میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جان ڈی کا پتہ نہیں لیکن مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ایک پتھر اٹھا کر اسکو مارا لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکا اور کھائی میں جا گرا۔ جان ڈی نے بھی پتھر اٹھا کر پھینکا مگر وہ بھی اسے نہ لگا۔

ڈینی خاموش ہو گیا۔ وہ سائیکل کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اس کی قمیض اور پتلون کے سامنے کا حصہ اب تک گرد سے اٹا ہوا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں سے بالوں کو ٹھیک کر رہا تھا۔ میں ایک اور پتھر تلاش کر رہا تھا میں نے بوبی کے چہرے پر نگاہ کی تو وہ ہم سے پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا اور میری اور جان ڈی کی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا' اس سے مجھے شرمندگی محسوس ہوئی۔ جان ڈی نے چند ایک پتھر اور پھینکے اور میں نے بھی ایک پتھر اور پھینکا اور اگرچہ ڈینی کو ایک بھی نہیں لگا مگر اب میرا دل قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ صرف میں بوبی سے آنکھیں ملانے سے کترا رہا تھا۔

جان ڈی نے کہا۔ "ڈینی سائیکل چرانا چاہتا ہے۔"

میرا بھی یہی خیال تھا اور مجھے اب افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ناحق جان ڈی کو موٹا کہا تھا۔ پھر ہم دونوں بوبی کو پیچھے آتا چھوڑ کر دیوار پر چلنے گئے۔ جب ہم گلی کے سرے پر پہنچے تو ڈینی بوبی کی سائیکل لے کر غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے اسے پرانی آبادی کی سڑک پر دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

"وہ بوبی کی سائیکل لے اڑا ہے۔" جان ڈی نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اپنی سائیکلوں کی بھی خبر لینی چاہیے کہیں وہ انہیں بھی نہ اڑا لے جائے۔"

"چور کہیں کا۔" مجھے غصہ آرہا تھا۔

"وہ سائیکل واپس لے آئے گا۔" بوبی نے اطمینان سے کہا۔

"بس تمہیں اتنا ہی پتہ ہے" جان ڈی نے کہا۔ "اب تم وہ سائیکل کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

"شاید ہمیں پولیس کو بلانا پڑے۔" میں نے کہا اور جان ڈی نے کہا۔

"ہاں ہمیں پولیس کو لے کر اس کا گھر تلاش کرنا چاہیے۔"

ہم دونوں ہکری اسٹریٹ میں جان ڈی کے گھر گئے۔ بوبی اپنی جرابیں ٹھیک کرنے کے لئے پیچھے رہ گیا۔ وہ آنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہم اسے زبردستی لا رہے تھے۔ جب ہم نے مسز ڈنموتھ کو سائیکل چوری ہو جانے کے بارے میں بتایا تو انہیں بالکل یقین نہ آیا لیکن جب ہم نے انہیں بتایا کہ وہ لڑکا پرانی آبادی کا تھا اور شاید اسی دن کے لئے وہاں اکثر منڈلاتا رہتا تھا تو انہیں یقین آگیا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔

پولیس والوں نے یقین دلایا کہ وہ ابھی جا کر سائیکل برآمد کرلیں گے۔ پولیس سائیکل اور ڈبی کی تلاش میں چلی گئی تو مسز ڈنموتھ نے ہمیں آئس کریم کھلائی اور ہم بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ بوبی چپ چپ تھا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ "تمہیں تمہاری سائیکل مل جائے گی۔ وہ اسے ڈھونڈھ نکالیں گے۔"

جان ڈی نے آئس کریم چاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ اس کمینے چور کو پکڑ لیں گے۔" "وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟" بوبی نے اداس لہجے میں پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے پتہ ہے۔" جان ڈی نے جواب دیا۔

"کیا؟" میں نے اور بوبی نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ اسے قیدیوں کے اصلاح خانے میں رکھیں گے۔" جان ڈی نے کہا۔ "اور جب وہ ذرا بڑا ہو جائے گا تو اسے جیل میں بند کر دیں گے۔"

بوبی اچھل پڑا۔ اس نے پہلے جان ڈی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اسکا منہ لٹکا ہوا تھا اور وہ رونے والا تھا۔ اچانک وہ جان ڈی پر پل پڑا اور اس کے سر پر دو ہنٹر مارنے اور سسکیاں لینے لگا۔

جب میں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بھی تھپڑ رسید کر دیا۔ لیکن اسے لڑائی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میں جان ڈی کے برابر تھا اور ہم دونوں اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھے۔ چنانچہ ہمیں بوبی کو نیچے گرانے اور اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جانے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہ آئی۔

گراہم گرین / ستار طاہر

ثبوت حاضر ہے

کوئی بڑا کہانی کار اپنے قاری کو کس طرح چونکاتا ہے۔ اس کا ثبوت حاضر ہے۔

تھکی ہوئی آواز مبہم اور بے معنی تھی۔ کوئی لفظ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ بے ربط' بے ترتیب آواز۔ کرنل کراشا جھنجلا رہا تھا اسے یقین تھا کہ تقریر کرنے والا بیمار ہے تبھی تو اوٹ پٹانگ بکتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے غور سے مقرر کی طرف دیکھا۔ اس کی شکل پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ کرنل کراشا نے سوچا "کبھی یہ کتنا طاقتور اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس نے ہی ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں کو سر کیا تھا اور آج یہی نوجوان میجر ویور کی صورت میں بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے۔ کرنل کراشا کو افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے میجر ویور کی درخواست پر اجلاس کیوں بلایا؟ میجر ویور کی طرف سے اسے ایک درخواست ملی تھی کہ کلب کے رکن کی حیثیت سے وہ ایک اہم موضوع پر کلب کے ارکان سے خطاب کرنا چاہتا ہے۔ کرنل کراشا کلب کا صدر تھا اس نے اجلاس بلانے کا حکم جاری کر دیا' اور اب اجلاس ہو رہا تھا اور سامعین بور ہو رہے تھے۔ کیونکہ میجر ویور کی کوئی بات ان کے پلے نہ پڑ رہی تھی۔ میجر ویور جب اجلاس سے خطاب کرنے آیا تو کرنل کراشا کو بڑی حیرت ہوئی کہ میجر ویور نے تیز خوشبو لگا رکھی ہے۔ اس کی کوٹ کی اوپر والی جیب میں لگا ہوا سفید رومال گویا خوشبو میں بھیگا ہوا تھا۔ کئی خواتین نے خوشبو سونگھ کر ناک سکیڑ لئے تھے۔

میجر ویور نے جب اپنی عجیب و غریب آواز میں تقریر شروع کی تو الفاظ کسی حد تک سمجھ میں آرہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "روح ہر چیز سے قوی ہے۔ دل و دماغ اور اعصاب سب روح کے تابع ہیں۔ روح توانا ہے اور روح کو کبھی موت نہیں آتی۔ تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ روح کتنی طاقتور ہو سکتی ہے۔" اس کے بعد اس کی آواز پھٹ گئی۔ لفظ ریزہ ریزہ ہو گئے۔ صرف مطلب عنقا ہو گیا اور ایک عجیب طرح کی آواز گونجتی رہی' پھٹی ہوئی آواز۔ لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے بے چین تھے۔ ایک خاتون نے اپنی سلائیاں اور اون نکالی اور بنائی میں مصروف ہو گئی۔ میجر ویور کا ایک جملہ پھر سمجھ میں آگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "انسانی جسم مر جاتا ہے مگر روح کبھی نہیں مرتی' روح لافانی ہے۔"

ایک بار پھر اس کی گفتگو بے معنی اور بے ربط ہو گئی پھر میجر ویور چیخا۔ "یہ بڑی اہم بات ہے' میں آپ کو کہانی سناتا ہوں۔" اس جملے کو سن کر سامعین نے ایک لمحہ کے لئے اپنی توجہ اس کی طرف مبذول کر لی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میجر ویور پھر پٹڑی سے اتر چکا تھا۔ اور سمجھ میں نہ آنے والے الفاظ میں کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔

کرنل کراشا نے دیکھا کہ تقریر کرتے وقت میجر ویور اب بار بار اپنے گلے پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ وہ چونکہ صدر کی حیثیت سے اس کے قریب بیٹھا تھا اس لئے کچھ الفاظ جو دوسروں تک پہنچ ہی نہ سکتے تھے اس کے کانوں میں پڑ جاتے تھے۔ کرنل کراشا میجر ویور کو جوانی کے دنوں سے جانتا تھا اور اسی لئے اب حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے اسکی یہ بوجھل اور کبھی چیختی اور کبھی دم توڑتی ہوئی آواز' بے مقصد آواز۔ کبھی کبھی کوئی جملہ سمجھ میں آجاتا تھا اور پھر' آواز الفاظ کو اپنے اندر اس طرح گم کر لیتی کہ الفاظ کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا اور صرف آواز ہی سنائی دیتی رہتی۔ "ایک بار جب میں شملہ گیا۔" میجر ویور کہہ رہا تھا۔ کرنل کراشا نے اس کی بات دھیان سے سننے کی کوشش کی مگر میجر ویور پھر پٹڑی بدل چکا تھا اور جانے کیا کہہ رہا تھا:

سامعین کی تیسری قطار میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر براؤن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی جو اس نے ایک آدمی کو تھما دی کہ وہ مجلس کے صدر کرنل کراشا کو دے دے۔

ڈاکٹر براؤن ایک درمیانے قد کا تیز طرار انسان تھا۔ دوستوں میں یہ مشہور تھا کہ وہ کسی عقیدے پر یقین نہیں رکھتا۔ مجلس کے صدر کرنل کراشا کے نام اس نے اپنے رقعہ میں لکھا۔

"کیا آپ اسے روک نہیں سکتے' یہ شخص شدید بیمار ہے۔ اور پھر وہ جو کچھ کہہ رہا ہے نہ تو کسی کو اس کی سمجھ آرہی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی ربط ہے۔"

یہ رقعہ پڑھ کر کرنل کراشا نے دائیں بائیں اور سامنے دیکھا سامعین مقرر کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے' اس کی آواز گونج رہی تھی۔ پھٹ رہی تھی دم توڑ رہی تھی اور صرف مطلب غائب تھا۔ کرنل کراشا کو میجر ویور پر رحم آنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں کہا آخر اسے تقریر کرنے کی کیا سوجھی تھی۔ اس کے سفید رومال سے اٹھتی ہوئی تیز خوشبو نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ادھر میجر ویور کہہ رہا تھا۔ "اس کا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتا ہوں کہ انسان مرجاتا ہے مگر روح زندہ رہتی ہے۔ آپ کو ثبوت چاہیے تو لیجئے ثبوت حاضر ہے۔"

اس کی آواز پھر لفظوں سے محروم ہو گئی اور خالی آواز رہ گئی۔ کرنل کراشا نے اپنی گھڑی اتار کر اس کے سامنے رکھ دی یہ ایک اشارہ تھا کہ اب تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لیکن میجر ویور نے گھڑی کو دیکھنے کے باوجود کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا وہ بولتا چلا گیا کرنل کراشا حیران تھا کہ آخر میجر ویور کہنا کیا چاہتا ہے۔ میجر ویور کی آواز کبھی گونجتی کبھی سرگوشی میں تبدیل ہو جاتی اور درمیان میں بعض اوقات ایسے لمحہ بھی آتے کہ جیسے آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو' اور بعض اوقات تو ایک عجیب صورت پیدا ہوتی۔ میجر ویور کے جبڑے ہلتے رہتے اور حلق سے کوئی آواز نہ نکلتی وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے میز بجانے لگتا۔

توقع کے برعکس میجر ویور خود ہی کرسی پر بیٹھ گیا اس کا سر پیچھے کی طرف لٹک گیا۔ ایک خاتون اسے اس حال میں دیکھ کر چیخی۔ ڈاکٹر براؤن کرسیوں کی قطاروں میں سے تیزی سے گزرتا ہوا سٹیج پر پہنچا اور میجر ویور پر جھک گیا۔ کرنل کراشا نے کہا کہ جب ڈاکٹر براؤن نے میجر ویور کی جیب سے رومال نکالا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پھر اس نے سرگوشی میں کرنل کراشا سے کہا۔ "ان سب لوگوں سے کہہ دو کہ یہاں سے پہلے چلے جائیں یہ تو مر چکا ہے۔"

ڈاکٹر براؤن کی آواز میں ایک عجیب طرح کا ارتعاش تھا' عموماً ڈاکٹر جس لہجے میں موت کا اعلان کیا کرتے ہیں یہ وہ لہجہ تو نہ تھا۔ ڈاکٹر براؤن نے اپنی زندگی میں موت کو مختلف انداز میں مختلف روپ میں دیکھا تھا۔ وہ آدمی جنہوں نے اپنی جان اپنے ہاتھوں سے لی تھی' وہ آدمی جو میدان جنگ میں مارے گئے تھے' وہ انسان جو غیر معمولی بیماریوں کا شکار ہوئے ان سب کو دیکھ کر اس کے چہرے پر وہ تعجب اور وہ پریشانی کبھی نہ جھلکی تھی۔ جو میجر ویور کے مردہ چہرے کو دیکھ کر نمایاں ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر براؤن نے حیرت سے بوجھل آواز میں کہا "میجر ویور کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی اسے مرے کم از کم ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

کرنل کراشا چند منٹوں تک تو گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے خیالات تک منجمد ہو گئے پھر وہ سوچنے لگا' تو اچھا یہ تھا اصل ماجرا۔ اس لئے میجر ویور نے اجلاس بلانے کی درخواست لکھی تھی۔ وہ سات دن پہلے مر چکا تھا۔ لیکن اپنے اس عقیدے کو ثابت کرنے کے لئے کہ روح کبھی نہیں مرتی اور انسانی جسم روح کے تابع ہوتا ہے۔ اس نے اپنی روح کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی ابدیت کا اظہار کرے۔ اس نے جسم کی مدد کے بغیر روح کو بولنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لئے تو اس کے بیشتر الفاظ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تھے۔

کرنل کراشا کے کانوں میں میجر ویور کی روح کی آواز گونجنے لگی۔

جسم مرجاتا ہے مگر روح زندہ رہتی ہے روح کبھی نہیں مرتی' آپ کو ٹھوس ثبوت چاہیے تو لیجئے ثبوت حاضر ہے۔

جان کولیئر / ستار طاہر

عرق الفت

ایلن آسٹن جب نیم تاریکی میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو وہ بے حد بوکھلایا ہوا تھا۔ ایک دروازے کے اوپر جب اس نے مطلوبہ نام کی تختی دیکھی تو اس دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا' اس کمرے کا فرنیچر ایک ڈرائنگ ٹیبل اور گھومنے والی کرسی اور ایک سادہ کرسی پر مشتمل تھا۔ گندی دیواروں پر کچھ شیلف تھے جن میں درجن بھر بوتلیں اور مرتبان نظر آ رہے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بوڑھے آدمی نے ایلن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔"

"جناب میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ایسا محلول ہے جو غیر معمولی اور حیران کن اثرات کا حامل ہے"۔ بوڑھے آدمی نے بڑی سنجیدگی سے اسے بتانا شروع کیا کہ وہ جن اشیاء کی تجارت کرتا ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں تاہم وہ جو کچھ بیچتا ہے وہ غیر معمولی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اپنے دعوئی کو ثابت کرنے کے لئے اس نے شیلف سے ایک بوتل اٹھا کر کہا۔ "یہ ایک محلول ہے 'بے رنگ 'بے ذائقہ جیسے پانی ہو۔ کافی شراب کسی چیز میں ڈالئے اس کی کبھی پہچان نہ ہو سکے گی۔ حتیٰ کہ اسے استعمال کرنے والا مر جائے تو پوسٹ مارٹم کے ذریعہ بھی اس کا سراغ نہیں چل سکتا۔"

"آپ کا مطلب ہے یہ زہر ہے۔" ایلن نے پوچھا۔

"اسے دستانے صاف کرنے والا محلول بھی کہا جا سکتا ہے۔ ویسے انسان کو صاف کرنا ہو تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ محفوظ اور ......"

"مگر مجھے تو ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" ایلن نے کہا۔

"بہتر بھی یہی ہے کہ تم اسے نہ لو۔ ویسے اسکی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے۔ چمچ بھر زہر۔ پانچ ہزار ڈالر کا اس سے کم میں نے ایک پائی نہیں لی۔"

"مجھے امید ہے کہ آپ کے پاس جو دوسرے محلول ہیں وہ اتنے مہنگے نہیں ہوں گے۔"

بوڑھا عجیب انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "ہاں مثلاً" میرے پاس جو "عرق الفت" ہے اسکی قیمت کم ہے۔ اگر محبت کرنے والے لوگوں کے پاس پانچ ہزار ڈالر ہوں تو پھر انہیں مجھ سے یہ "عرق الفت" خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔" ایلن کو بوڑھے سے یہ بات سنکر بڑی تسلی ہوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بوڑھے نے اشارے سے روک کر کہا۔ "میں اس کاروبار کو ایک اور انداز میں لیتا ہوں۔ میرے پاس جو شخص عرق الفت لینے کے لئے آتا ہے وہ دوسری چیز خریدنے کے لئے بھی ضرور آتا ہے۔ ہاں یہ میرا تجربہ ہے اور اس دوسری چیز.... زہر کے لئے وہ پھر رقم بھی جمع کر لیتا ہے کیونکہ اس سے کم داموں پر تو میں اسے بیچتا نہیں ہوں۔"

ایلن نے دیکھا کہ بوڑھا عجیب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی "میری ایجاد "عرق الفت" کے اثرات عارضی نہیں دائمی ہوتے ہیں اسے اپنی محبوبہ کو پلا کر دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" ایلن کا چہرہ اشتیاق سے تمتمانے لگا تھا۔ "اس کا ایک قطرہ آپ کی محبوبہ کی تمام عادتیں بدل دے گا۔ وہ یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ وہ ہر چیز بھول جائے گی۔ صرف تنہائی اور آپ کی خواہش کے علاوہ اس کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہی نہ ہو گی۔"

"میں کیسے یقین کر لوں" ایلن نے کہا "وہ تو پارٹیوں کی بے حد دلدادہ ہے" "وہ پارٹیوں کو سرے سے نظر انداز کرنے لگے گی وہ خوبصورت لڑکیوں سے خوف کھایا کرے گی کہ وہ کہیں اس سے چھین نہ لیں۔ وہ آپ کا پورا دھیان رکھا کرے گی۔"

"وہ تو اب بھی میری نگرانی کرتی ہے۔"

"لیکن جب وہ "عرق الفت" کو چکھے گی تو پھر صرف تمہاری ہو کر رہ جائے گی۔"

"وہ تم سے ایک ایک بات تفصیل سے پوچھا کرے گی۔ سارا دن کہاں رہے کس کس سے ملے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی کریدا کرے گی کہ تم سارا دن کیا سوچتے رہے۔ وہ تمہارا ہر دم خیال رکھے گی 'اگر تمہیں گھر لوٹنے میں تاخیر ہو گئی تو اسکی جان پر بن جائے گی۔ وہ سمجھے گی کہ تم کسی حادثے میں مارے گئے ہو۔"

"اپنی محبوبہ کو اس حالت میں تو اپنے تصور میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"ایسا سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر تم کبھی اس سے اکتا جاؤ گے تو وہ تمہیں معاف کر دے گی ہاں بالآخر وہ تمہیں معاف کرنے پر مجبور ہو گی۔ دنیا میں اور بھی تو دل موہ لینے والی صورتیں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی پھسل جایا کرتا ہے"۔ "میں ایسا نہیں کروں گا میں اسی سے محبت کرتا ہوں"۔ "بلاشبہ لیکن اگر ایسا ہو تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وہ تمہیں کبھی طلاق نہ دے گی وہ تمہیں کبھی پریشانی میں مبتلا نہ کرے گی ...."

"اس عرق الفت کی قیمت کیا ہے؟"

"یہ زیادہ منگا نہیں ہے" بوڑھے نے کہا آدمی کو صاف 'کرنے والے زہر کی قیمت سے اسکی قیمت بے حد کم ہے۔ اس کی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے ایک پائی کم نہیں اور اسکی قیمت ادا کرنے کے لئے رقم جمع کرنی پڑتی ہے اور اسکی ضرورت تمہارے جیسے نوجوانوں کو نہیں۔ ذرا بڑی عمر کے لوگوں کو پڑتی ہے۔"

میں "عرق الفت" کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"اوہ "عرق الفت" بوڑھے نے میز کی دراز کھولتے ہوئے ایک چھوٹی سی ٹیوب نکال کر کہا۔ "اسکی قیمت صرف ایک ڈالر ہے "میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔" ایلن نے کہا۔ بوڑھا آدمی اس وقت اس چھوٹی سی ٹیوب میں محلول بھر رہا تھا۔

"میں آپ کو ممنون کرنا چاہتا ہوں" بوڑھے آدمی نے کہا "میرے گاہک زندگی میں کبھی نہ کبھی دوسری بار پھر میرے پاس آتے ہیں تب انہیں زیادہ قیمتی اور منگی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ہاں یہ رہا "عرق الفت" تم اسے انتہائی موثر پاؤ گے۔

"میں دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں خدا حافظ۔" ایلن نے کہا۔ "پھر ملیں گے ...." بوڑھے نے کہا اور پھر بڑی سنجیدگی سے ہنسنے لگا اسے یقین تھا کہ اس کا یہ گاہک بھی ایک دن اس کے پاس قیمتی زہر خریدنے آئے گا۔۔!!

برٹرینڈ رسل / ناز سرحدی

رائے عامہ کا خوف

بہت کم لوگ ایسے ہیں۔ جو اس وقت تک دنیا میں خوش رہ سکتے ہوں۔ جب تک بحیثیت مجموعی ان کی زندگی کرنے کا ڈھنگ اور دنیا کے متعلق ان کے نظریات کو وہ تمام لوگ تحسین کی نظر سے نہ دیکھیں' جن کے ساتھ ان لوگوں کا رہنا سہنا ہو۔ جدید معاشروں کا خاصا ہے کہ وہ مختلف عقیدوں اور اخلاقیاتی نظریات میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال نشاۃ الثانیہ کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ اجاگر' ہوتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی مذہب میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ایک دوسرے سے عملی معاملات میں اختلاف رکھتے ہیں۔ یا دنیا میں طبقۂ امراء نے کچھ ایسے کاموں کی اجازت دے رکھی تھی جو عوام الناس میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد کچھ ڈھیل دینے والے اور آزاد خیال قسم کے لوگ آئے جو مذہبی فرائض کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے اپنے وقت میں پورے براعظم یورپ میں اشتراکی اور غیر اشتراکی طبقات میں ایک چوڑی خلیج حائل ہے۔ جس نے نہ صرف سیاسی بلکہ دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ انگریزی بولنے والے ممالک میں یہ اختلافات اور بھی زیادہ ہیں۔ کہیں فنون لطیفہ کو سراہا جاتا ہے تو کہیں ان جدید فنون کو شیطانی عمل سمجھا جاتا ہے۔ کچھ طبقات کے نزدیک شہنشاہیت کا فروغ عین عبادت ہے تو دوسرے اسے ایک بیوقوفانہ خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ روائیتی لوگ بدکاری کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں لیکن کچھ طبقے اسے قابل معافی گناہ تصور کرتے ہیں' اگرچہ وہ اسے اچھا عمل بھی نہیں سمجھتے۔ کیتھولک لوگوں میں طلاق بالکل ممنوع قرار دی گئی ہے۔ لیکن غیر کیتھولک لوگ اسے ازدواجی زندگی کی ایک ضرورت پر معمول کرتے ہیں۔

ان اختلافات کے طفیل انوکھے خیالات رکھنے والا کوئی بھی شخص اپنے آپ کو کسی خاص طبقہ میں رہائش کے دوران بالکل اجنبی پاتا ہے۔ جبکہ کسی دوسرے طبقہ میں رہائش کے دوران اسے ایک عام فرد سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس سے خاص طور پر نوجوانوں میں ناخوشی کا عمل تیز ہوتا جا رہا ہے۔ ایک نوجوان لڑکا یا لڑکی ماحول میں موجود کسی نظریہ سے متاثر ہوتے ہیں' مگر یہ جان کر غمگین ہو جاتے ہیں کہ یہ نظریہ ان کے اپنے طرز معاشرت میں ثمر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں دنیا کی جہالت کی وجہ سے ہماری زندگیوں اور خاص طور پر نوجوانوں میں ایک غیر ضروری رگی پائی جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف ایک دکھ کا احساس بڑھتا ہے' بلکہ آزادیٔ فکر کو ایک معاندانہ ماحول سے بچانے کے لئے توانائی ضائع کرنی پڑتی ہے۔ اور ننانوے فیصد واقعات میں ایک ایسی کمزوری اور بے ہمتی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے تصورات اور اندازہائے فکر کو ان کے منطقی نتائج تک نہیں پہونچا پاتے۔

تقریباً" ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خوش رہنے کے لئے ایک ہمدردانہ ماحول ضروری ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو

اپنے اردگرد کے ماحول سے کوئی خاص شکایت بھی نہیں ہوتیں۔ لیکن کچھ لوگ (جن میں زیادہ تر دانشمند اور فنکار حضرات شامل ہیں) اپنے ماحول کو من و عن قبول نہیں کر سکتے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہونے والے شخص کو نوجوانی ہی میں اپنی فکری فضیلت کے خلاف ایک معاندانہ ماحول کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کوئی سنجیدہ قسم کی کتابیں پڑھنا چاہے۔ تو گاؤں کے دوسرے لڑکے یہاں تک کہ اس کے اپنے معلم بھی اسے ایسی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر اسے فنون لطیفہ سے دلچسپی ہو تو اس کے ہم عمر ساتھی اسے صنف نازک اور اس کے بڑے اسے بداخلاق سمجھتے ہیں۔ اگر وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے جو اس کے معاشرہ میں عام نہ ہو تو اسے تنبیہہ کی جاتی ہے۔ کہ وہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالے اور اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کئے رکھے۔ وہ اپنے والدین کے مذہبی عقائد اور سیاسی وفاداریوں پر نکتہ چینی کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو ایک مصیبت میں گرفتار دیکھتا ہے۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر غیر معمولی لیاقت کے حامل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں نوخیزی ایک بڑی بدقسمتی کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ عام لیاقت رکھنے والے ان کے دوسرے ساتھیوں میں نوخیزی خوشیاں منانے کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔

جب ایسے بدنصیب نوجوانوں کو یونیورسٹی پہنچنے پر اپنے ہی جیسے خیالات رکھنے والے کچھ دوسرے نوجوانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ تو ان کے دو چار سال ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں۔ اور اگر وہ خوش قسمت ہوں تو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں کوئی ایسی نوکری مل جاتی ہے جس کے دوران ہم خیال ساتھیوں کے ملنے کا امکان ہو سکے۔ لندن یا نیو یارک جیسے بڑے شہروں میں رہنے والے ایک ذہین شخص کو اپنے مزاج کے موافق ایسا کام مل جانے کی امید کی جا سکتی ہے جہاں کسی دباؤ یا منافقت کے تحت کام نہ کرنا پڑتا ہو' لیکن اگر کام کے سلسلے میں اسی شخص کو کسی چھوٹے قصبے میں رہائش پذیر ہونا پڑے اور ایسی رہائش اس کی عزت و توقیر کی متقاضی ہو (جیسا کہ ایک ڈاکٹر یا وکیل کے لئے ضروری ہے) تو ممکن ہے' کہ وہ اس بات پر مجبور ہو جائے کہ اپنی پسند اور اپنے تصورات کو اپنے ملنے والوں سے چھپائے رکھے۔ یہ بات امریکہ کی حد تک تو بالکل سچ ہے کیونکہ امریکہ ایک وسیع ملک ہے۔ اسی لئے ذہین اقلیت کو عوامی رائے کی زد سے بچانے کے لئے اقدامات کئے جانے چاہئیں تا کہ یہ فطین لوگ آپس میں مل بیٹھ کر زندگی کا لطف اٹھا سکیں۔

بسا اوقات غیر ضروری بزدلی مصیبت کو دوچند کرنے میں مدد دیتی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ رائے عامہ کی زد میں زیادہ تر بزدل لوگ ہی آتے ہیں۔ رائے عامہ عموماً" ایسے لوگوں کی مخالفت نہیں کرتی جو رائے عامہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر لوگ ڈرپوک ہوں گے تو کتا زیادہ زور سے بھونکے گا بھی اور کاٹے گا بھی لیکن جن لوگوں میں کتے کو دھمکانے کا حوصلہ ہو انہیں کتا زیادہ تنگ نہیں کرتا۔ انسانی گروہ میں بھی کتے والی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر آپ دوسرے انسانوں کو یہ تاثر دیں کہ آپ ان سے دبتے ہیں تو وہ آپ کو دباتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کی پرواہ نہیں کریں گے تو انہیں اپنی قوت پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ آپ کو اکیلا چھوڑ دینا ہی غنیمت سمجھتے ہیں۔

پرانی وضع کے لوگ اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں کہ روایت سے بغاوت کیوں کی گئی' کیونکہ وہ اس بغاوت کو اپنے خلاف ایک تنقید سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو روایت سے اختلاف کرتے ہیں اپنے لئے ایک کانٹوں بھری راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اب اگر انہی لوگوں کو کسی ایسے معاشرے میں رہنے کا اتفاق ہو جہاں ان کی روایت کشی کی کوئی خاص پرواہ نہ کی جاتی ہو تو یہی لوگ خاموشی اور تنہائی پسندی کو چھوڑ کر خوش و خرم رہنے لگتے ہیں۔ اسی

لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو معاشرتی ماحول سے غیر آہنگ پانے والے نوجوان کوئی ایسا پیشہ اختیار کریں جس میں ان کو ہم خیال ساتھی اور دوستانہ ماحول مل سکے' چاہے ایسا کرنے میں انہیں مالی نقصان ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ لیکن ایسا کرنا آسان بھی تو نہیں۔

نفسیاتی تجزیات کے اس دور میں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی نوجوان کے خیالات اپنے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے تو اس کی وجہ کسی نفسیاتی خرابی میں ڈھونڈی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا سوچنا ایک صریح غلطی ہے۔ فرض کریں' ایک نوجوان کے والدین مسئلہ ارتقاء کو ایک شیطانی سوچ سمجھتے ہیں تو ایسے حالات میں اس نوجوان کی اپنی ذہانت کے سوا کوئی دوسری چیز اسے ان کے ساتھ غیر ہمدردانہ رویہ رکھنے سے نہیں روک سکتی۔ اپنے ماحول کے ساتھ غیر ہم آہنگی ایک بدقسمتی کی بات ہے' مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ جہاں ماحول معاندانہ اور غیر دوستانہ بلکہ بیوقوفانہ ہو وہاں پر ایسے ماحول کے ساتھ کچھ لوگوں کی غیر ہم آہنگی ایک عمدگی' لیاقت یا اچھی قدر پر معمول کی جا سکتی ہے اور ایک حد تک یہ خصوصیات ہر ماحول میں پائی جاتی ہیں۔ گلیلیو اور کیپلر کے خیالات کو خطرناک سمجھا گیا تھا' اور یہی حال ہمارے اپنے عہد کے ذہین لوگوں کا بھی ہے۔ احسن طریقہ یہ نہیں کہ معاشرتی احساس کو اتنی بالیدگی دی جائے کہ ذہین لوگوں کو اپنے اچھوتے اور مخصوص خیالات کی بنا پر معاشرے سے خطرہ محسوس ہونے لگے۔ احسن طریقہ یہ ہے کہ ایسی معاشرتی مخالفت کو کم سے کم اور غیر موثر رکھا جائے۔

جدید دنیا میں اس مسئلہ کا سب سے ضروری پہلو نوجوانوں سے متعلق ہے۔ اگر کسی شخص کو صحیح پیشہ اور ماحول میسر آجائیں تو وہ معاشرے کے ظلم سے کسی حد تک محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص ابھی نوجوان ہے اور اس کی لیاقت اور اس کے ہنر کو ابھی پرکھا ہی نہیں گیا تو جاہل لوگوں کے ہاتھوں اس کے نقصان اٹھانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ خاص طور سے ایسے جاہل لوگ جو کبھی یہ گوارہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان سے بہت کم عمر کا ایک نوجوان ان سے زیادہ معلومات رکھتا ہے۔ کچھ لوگ تو جہالت کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں بری طرح تلخی کا شکار ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "فہم و ادراک اپنا مقام بنا کر رہتے ہیں۔" اسی کہاوت کے بل بوتے پر بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ایک معاندانہ معاشرتی ماحول نوجوانوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن اس کہاوت کو من و عن تسلیم کر لینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ تو وہی ہوا' جیسا کہ کہتے ہیں کہ تمام قتل آخر میں منظر عام پر آکر ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ کچھ ایسے قتل بھی ہوتے ہیں جو کبھی بھی ہمارے علم میں نہیں آتے۔ اسی طرح ہمیں مشکلات کے خلاف فہیم لوگوں کی کامیابیوں کا تو علم ہے' لیکن کتنے ہی ذہین و فطین نوجوان معاشرے کے ظلم کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور ہمیں ان کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم چاہیں گے کہ نوجوانوں کے لئے زیادہ رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں۔

جہاں یہ ضروری ہے کہ بڑے چھوٹوں کے خیالات کی قدر کریں' وہاں چھوٹوں کے لئے بڑوں کی خواہشات کا احترام کرنا ضروری نہیں۔ اس کی ایک سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہر صورت میں نوجوانوں کی زندگی کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہئیے۔ جب نوجوان اپنے بڑوں کی زندگیوں کو سدھارتے مثلاً" اپنی بیوہ ماں یا رنڈوے باپ کی دوبارہ شادی کرنے پر اعتراض کریں تو ان کا یہ طرز عمل اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ ان والدین کا جو اپنے بچوں کی زندگی کو ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا بڑا کیا چھوٹا' جب شعور کو پہنچ جائیں تو انہیں اپنی اپنی زندگیوں کو اپنی پسند کے مطابق گزارنے اور غلطیاں کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ زندگی کے کسی بھی اہم فیصلے میں بڑوں کے دباؤ میں نہ آئیں۔ مثال کے طور پر فرض کریں کہ آپ ایک نوجوان ہیں اور آپ سٹیج پر

ڈرامہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کے والدین آپ کی اس خواہش کی مخالفت اس بنا پر کر رہے ہیں کہ سٹیج پر ڈرامہ کرنا ایک غیر اخلاقی کام ہے۔ یا معاشرتی طور پر کمینوں کو زیب دیتا ہے۔ والدین آپ پر ہر قسم کا دباؤ ڈالیں گے۔ شاید وہ آپ سے کہیں کہ اگر ان کا حکم نہ مانا گیا تو آپ کو گھر سے نکال دیا جائے گا یا آپ کا معاشرتی مقاطعہ کیا جائے گا۔ اور یہ کہ کچھ سالوں کے بعد آپ خود ہی ڈرامہ بازی سے تائب ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ وہ آپ کو ہر طرح سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی سوچ میں کچھ سچائی بھی ہو۔ مثلاً" آپ میں فنکارانہ صلاحیتوں کا فقدان ہو یا آپ کی آواز سٹیج ڈرامہ کے لئے موزوں نہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو بہر حال تھیٹر کمپنی والوں کے ذریعے ان باتوں کا علم ہو ہی جائے گا اور اس کے بعد آپ کے پاس پھر بھی اتنا وقت بچ جائے گا کہ آپ اپنا پیشہ تبدیل کر سکیں۔ والدین کا دباؤ آپ کو اپنے منصوبہ سے ہٹانے کے لئے ایک جائز وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ان کے سب کچھ کہنے کے باوجود بھی آپ وہ سب کچھ کر گزریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے والدین بہت جلد آپ کے ساتھ متفق ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تھیٹر والوں کی پیشہ ورانہ رائے آپ کے خلاف ہو تو آپ کو فوراً" ان کی بات مان لینی چاہیے کہ پیشہ ورانہ رائے کا احترام بہر کیف ضروری ہے۔

میرا خیال ہے کہ عام طور پر پیشہ ورانہ رائے کے علاوہ دوسروں کی آراء کو چھوٹے بڑے معاملات میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اصولاً" صرف بھوک سے مرنے یا جیل جانے سے بچنے کے لئے رائے عامہ کی عزت کرے، لیکن اس کے علاوہ رائے عامہ سے دبنا ظلم کے سامنے سر جھکانے کے مترادف ہے، کیونکہ اس طرح سے انسان کی ذاتی خوشیاں تک رائے عامہ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ خرچ اخراجات کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ بہت سے لوگ اپنی مرضی کے خلاف پیسہ ضائع کرنے پر اس لئے مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں پڑوسیوں سے اپنی عزت کروانے کے لئے ایک عدد موٹر کار رکھنا یا بڑی بڑی دعوتیں دینا بہت ضروری ہے۔ دراصل جب کسی بھی آدمی میں موٹر کار رکھنے کی استطاعت ہو لیکن گاڑی رکھنے کی بجائے وہ اپنی پسند کے مطابق ایک عمدہ لائبریری قائم کرنے یا اپنی مرضی سے سیر سپاٹے پر خرچ کرے تو دوسروں کی نسبت لوگ اس کی زیادہ عزت کریں گے۔ ہاں البتہ! رائے عامہ کی مخالفت ارادۃً" نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اس طرح سے بھی تو رائے عامہ کی توقیر بڑھتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر رائے عامہ سے اختلاف رکھنا ایک قوت اور سرخوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ معاشرہ زیادہ دلچسپ معاشرہ ہوتا ہے جس میں مرد اور عورتیں رائے عامہ کے سامنے نہیں جھکتے بمقابلہ اس معاشرے کے جہاں سب لوگ ایک دوسرے کے ڈر سے ایک ہی جیسا طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ جہاں بھی انفرادیت کو پنپنے دیا جائے گا وہاں انسانوں کی شخصیتوں کے اختلافات کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اور مختلف شخصیتوں سے ملنا بھی تو ایک خاص مسرت کا باعث ہوتا ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے کی نقل نہیں ہوتے۔ طبقۂ امراء کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان میں شخصی اختلافات اور منحرف طور طریقوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے۔ ہماری جدید دنیا میں ہم معاشرتی آزادی کے اس منبع کو کھوتے جا رہے ہیں اور اسی لئے یکسانیت کے خطرات کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں کہ لوگ خوانخواہ عجیب و غریب اور نرالی حرکتیں کرنا شروع کر دیں، ہاں البتہ ان کو قدرتی طور پر اپنی اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ بشرطیکہ ان کی پسند معاشرے کی صحت مند قدروں کے خلاف نہ ہو۔

آج کی دنیا میں ذرائع آمد و رفت میں تیزی کی وجہ سے لوگوں کا اپنے جغرافیائی طور پر نزدیک پڑوسیوں پر انحصار کم ہو گیا ہے۔ جن کے پاس اپنی موٹر کار ہے وہ بیس میل کے اندر اندر کسی کو بھی اپنا پڑوسی سمجھ سکتا ہے۔

اسی لئے ان کے پاس اپنے ساتھی اپنے دوست چننے کی طاقت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ اگر کسی گنجان آباد علاقہ میں رہنے والے ایک شخص کو بیس میل کے اندر اندر اپنی پسند کے دوست نہ ملتے ہوں۔ تو اسے افسوسناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ بڑے شہروں میں نزدیکی آس پڑوس رکھنے کا دستور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ چھوٹے مقامات پر لوگ ابھی بھی اپنے پڑوسیوں کو جانتے اور مانتے ہیں۔ بڑے شہروں میں تو پڑوسیوں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھنے کو ایک بیوقوفانہ عمل سمجھا جانے لگا ہے۔ ہمیں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا چناؤ رشتہ داروں یا پڑوسیوں کی بجائے اپنی پسند کے لوگوں میں سے کرنا چاہیے۔ خوشی اور مسرت اسی وقت مل سکتی ہے جب انسان ہم پسند اور ہم خیال لوگوں کے درمیان رہ رہا ہو۔ یوں سماجی ترقی کے راستے بھی کھلتے چلے جاتے ہیں اور لوگوں میں تنہائی پسندی کا جذبہ بھی ماند پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے غیر دستوری لوگوں کی دستوری یا روایتی لوگوں کے ہاتھوں گت بننے سے غیر دستوری لوگوں کو جو مسرت اور شادمانی حاصل ہوتی تھی وہ اب باقی نہیں رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی شادمانی ختم ہو جانے سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

دوسرے کئی اقسام کے خدشوں کی طرح رائے عامہ کا ڈر بھی ایک ظلم کی حیثیت رکھتا ہے اور ترقی کی راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ رائے عامہ کے ڈر کی موجودگی میں کسی قسم کی ناموری پیدا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ روح کو وہ آزادی دلائی جائے جو انسانی مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ سچی مسرت کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے رہن سہن کے طریقے ہماری اپنی خواہشات کا مظہر ہوں نہ کہ ہمارے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی پسند یا ناپسند پر مبنی ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ پڑوسیوں کا ڈر اب ڈر نہیں رہا' لیکن ایک نئی قسم کے ڈر نے جنم لیا ہے اور وہ ہے اخباروں کا ڈر۔ انسان کو خدشہ رہنے لگا ہے کہ خدانخواستہ اس کے متعلق اخباروں میں کچھ چھپ نہ جائے۔ اگر کوئی اخبار کسی بے گناہ شخص کو تختہ مشق بنانے کی ٹھان لے تو اس کے نتائج الم ناک ہو سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے لوگ اپنی گمنامی کی وجہ سے اس المناک انجام سے بچے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے نشرو اشاعت کو فروغ ملتا جائے گا لوگوں کو اس نئے سماجی ہتھیار سے نئے خطرات لاحق ہوتے جائیں گے۔ نشرو اشاعت کے ظلم کے شکار لوگوں کے لئے اس نئے خطرے کو مذاق میں اڑا دینا اور بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ پریس کی آزادی کے بلند بانگ نعروں اور اصولوں کے متعلق دنیا کچھ بھی کہے' میرے خیال میں ازالۂ حیثیت عرفی کے قوانین کو بدلنا ہو گا۔ تاکہ ہر اس چیز کو غیر قانونی قرار دیا جا سکے جو معصوم لوگوں کی انفرادی آزادیوں پر پابندی عائد کرتی ہو تاکہ اخباروں کو لوگوں پر کیچڑ اچھالنے سے روکا جا سکے۔

اس شیطانی عمل کا ایک ہی علاج ہے' اور وہ یہ کہ عوام اپنے آپ میں صبر و تحمل کا جذبہ پیدا کریں۔ اور ایسا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عوام میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھائی جائے جو سچی خوشی حاصل کر سکیں اور ایسے لوگوں کی تعداد گھٹائی جائے جو دوسروں کی خوشیاں چھیننے کی تاک میں رہتے ہیں۔

ایلین سٹائیف / ستار طاہر

زندگی کا تعاقب

پو پھٹنے کے وقت بوڑھا خرگوش بے چین ہو گیا۔ اب اسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اسے دھوکہ دے رہی تھیں' ہر چیز اسے دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ دھندلی شبیہوں کو دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی شدت سے دن چڑھنے کا انتظار کیا کرتا تھا کیونکہ صبح روشنی پھیلتے ہی دھندلائی ہوئی چیزیں اسے قدرے واضح طور پر نظر آنے لگتی تھیں۔ جوں جوں صبح کا وقت قریب آتا وہ بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ برف کے نیچے دبی ہوئی گوبھی کی جڑوں کو کھودنا بھی کتنا مشکل کام ہوتا تھا وہ کیٹی کے کھیتوں میں برف کے نیچے دبی گوبھی کی جڑوں کو اور ڈنٹھلوں کو کرید رہا تھا۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور آوازوں کو غور سے سننے لگا۔ قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے دیہات دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ ان دیہاتوں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں گاؤں کے مرغے ایک ایک کر کے بانگیں دے رہے تھے۔ آسمان جو پورے اور چمکتے ہوئے چاند کی وجہ سے پیلے زرد نظر آ رہا تھا۔ اب نیلگوں ہوتا جا رہا تھا۔ ستارے چھپ گئے تھے' چاند مدھم پڑ گیا تھا۔ جنگل کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ مگر وادی میں یخ بستہ پانی جو ندی سے بڑبڑاہٹ سے ملتی جلتی اواز پیدا کر رہا تھا جیسے درد سے کراہ رہا ہو۔

خرگوش تیز تیز چلتا' قدرے دوڑتا جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ نرم نرم جمی ہوئی برف اس کے پیروں کے نیچے تڑختی اور عجیب سی آواز پیدا کرتی۔ یخ بستہ ہوا اور آس پاس کے گہرے سکوت میں معمولی سی آواز بھی بڑی گونجدار سنائی دیتی اور اعصاب پر بوجھ بن جاتی۔

خرگوش چلتے چلتے دوڑتے دوڑتے آس پاس کی آوازوں سے بو سونگھنے کے لیے رک جاتا تھا۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے ہوا کو سونگھنے لگتا!

عجیب جھٹپٹے کا سماں تھا۔ روشنی ہونے سے پہلے روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔ تیز ہو رہی تھی۔ ایک عجیب کشمکش ایک عجیب۔۔ منظر تھا۔ برف اب زیادہ سپید نظر آنے لگی تھی اور آسمان پہلے سے بھی زیادہ نیلا ہو گیا تھا۔ اور پھر جنگل جھومنے لگا جیسے وہ گہرے اور کھلے پانیوں میں تیر رہا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سفید رنگ کی روشنی سے بھر گئی۔

خرگوش کی ہمت بندھ گئی۔ اس کی مایوسیاں ختم ہو گئیں۔ سفید روشنی کو دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا۔ اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا تھا۔ اس لیے اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے وہ جنگل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ وہ کبھی کبھی ایک لمبی چھلانگ لگاتا پھر اچانک رک جاتا اور ہمہ تن گوش بن کر آس پاس کی آوازوں کو سننے لگتا اور جب اس کے اپنے دل کی تسلی ہو جاتی تو وہ پھر اچھلتا' کودتا اور پھر اپنے راستے پر بھاگنے لگتا۔ اس کی تھوتھنی کے بال ٹھنڈی ہوا اور سانس لینے کی وجہ سے کانٹوں کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے

پنجوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

جب وہ یوں بھاگتا دوڑتا موج میلہ منا چکا تو اس نے سوچا کہ اب آنے والے دن کی فکر کرنی چاہیے۔ یقیناً آج کا دن۔۔۔ دھوپ چمکتا رہے گا اس لیے مجھے ابھی سے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ میں یہ دن کہاں گزاروں۔ خرگوش چلتا ہوا پہاڑی کے دامن میں پہنچا جہاں تیز ہوا کی وجہ سے برف پڑی تھی اور یوں خرگوش نے اپنے آپ کو جنوبی ڈھلوان کی طرف پایا۔ اب اس کی چال میں اور بھی تیزی آ گئی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور برف کے سینے پر اس کے چاروں پنجوں کے نشان بھی اب زیادہ واضح بن رہے تھے جیسے چار سوراخ ہوں جو ایک دوسرے کے قریب ہی بنے ہوئے ہوں۔ کافی دور تک برف کے سینے پر پھیلے ہوئے یہ چار پنجوں کے نشان اگر غور سے دیکھے جائیں تو خرگوش کی ذہانت کی داد دینی پڑتی تھی کہ اس نے جست لگاتے' کودتے ہوئے پنجے گاڑے تھے۔ جہاں برف کی سطح قدرے سخت تھی لیکن خرگوش کی اس جبلی صلاحیت کا صحیح اندازہ تو کوئی تجربہ کار آنکھ ہی لگا سکتی تھی۔ یوں بھاگتے دوڑتے' چھلانگ لگاتے اور سستاتے ہوئے خرگوش نے بالآخر ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی جہاں وہ آرام سے بے خوف و خطر لیٹ سکتا تھا۔

یہ ایک بوڑھے درخت کی جڑیں تھیں جہاں خرگوش نے اپنے رہنے کا انتخاب کیا تھا۔ طوفان اور سیلاب اس درخت کی جڑوں کے ساتھ برسوں نبرد آزما رہے تھے۔ مگر یہ قدیم اور زمین کے سینے میں اتری ہوئی جڑیں اتنی مضبوط تھیں جیسے زندگی۔۔۔۔

زمان منیر / احمد سعدی

میں قسم کھاتا ہوں

یلدوز خان کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اس نے کتنے چاؤ سے یہ باغ لگائے جن کو ان فوجیوں نے تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ سیب کے باغ میں درختوں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے سیب لگے ہوئے تھے۔ انگور کے باغ میں بیلیں انگوروں کے گچھوں سے لدی ہوئی تھیں۔ خوبانی کے باغ میں بھی پیڑوں کا یہی حال تھا۔ اس بار قرض کی ادائیگی کے بعد بھی اسے اچھا خاصہ فائدہ ہونے کی امید تھی۔ لیکن ان فوجیوں نے اس کے باغوں کو ملیا میٹ کر کے اس کے سنہرے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔

یلدوز خان نے باغوں کے لگانے میں بڑی محنت کی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہی وہ مٹی صاف کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو ہٹانا' چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو مٹی کھود کر باہر نکالنا۔ اونچی زمین کی مٹی کاٹ کر نیچی زمین کو ہموار کرنا' اس طرح کے کتنے ہی کام اسے کرنا پڑتے تھے۔ یہ سلسلہ مغرب کی اذان تک چلتا رہتا۔ اس درمیان وہ صرف دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے گھر جاتا تھا۔ یہی وہ وقفہ تھا جب اسے ذرا ستانے کا موقع ملتا تھا۔

وہ بڑی سخت جان توڑ محنت اور مشقت کرنے کے بعد ان باغوں کو لگانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس عرصے میں اسے چلچلاتی ہوئی دھوپ اور لو برساتی ہوئی گرم ہواؤں میں جھلس کر ان باغوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے کام کرتا رہتا اور اس کا سارا جسم دھوپ میں جلتا رہتا اور صرف وہ خود ہی نہیں' اس نے اپنی بیوی بچوں اور بوڑھی ماں کو بھی رہائی نہیں دی تھی۔

جن دنوں وہ اونچی نیچی زمین کو ہموار کر رہا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں یا اس کی چھ سات سالہ بچی اس کا ناشتہ لے کر آتی تھی تو وہ ان سے بھی مٹی کھود کر پتھر نکالنے اور پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو وہاں سے ہٹانے کا کام لیتا۔

صرف یہی نہیں چارا لگاتے وقت بھی ان پودوں کی آبیاری کے لئے اس کی بیوی' اس کی بچی اور اس کی بوڑھی ماں نے بڑی محنت کی تھی۔ وہاں سے تقریباً" نصف میل کی دوری پر ایک آبشار تھا جہاں سے پانی لانا پڑتا تھا۔ اور انہوں نے یہ فاصلہ طے کر کے پانی لا کر ان پودوں کی آبیاری کی تھی۔ پانی لانے میں انہیں کتنی تکلیف ہوتی' کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا' یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے بعد جب پودے بڑے ہوئے اور جب درختوں میں پھول نکلے پھل آئے تو بھی انہوں نے کتنے ہی دنوں تک پودوں اور درختوں کی جڑوں میں پانی ڈال کر انہیں توانائی بخشی تھی۔

جب درختوں میں پھل آئے تھے تو انہیں خوشی ہوئی تھی۔ انگور کی بیلوں میں جھولتے ہوئے گچھے سیب کے

درختوں کی شاخوں پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے سیب اور خوبانی کے بوجھ سے جھکی ہوئی پیڑوں کی شاخوں کو دیکھ کر ان کے دل میں شادمانی کی پھلجھڑیاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

ایک روز یلدوز خان خوشی کے نشے میں ایسا سرشار ہوا کہ جھومتا ہوا گھر پہنچا اور کچھ کہے سنے بغیر اپنی بوڑھی ماں کی قدم بوسی کرنے لگا۔ اس کی اس اچانک عقیدت بھری محبت کو دیکھ کر اماں اچنبھے میں پڑ گئی۔

"کیا بات ہے یلدوز' یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ سب تمہاری دعاؤں کی برکت ہے امی!" یلدوز خان نے بڑے جذباتی انداز میں جواب دیا۔

"آہا' آخر ہوا کیا ہے' کچھ بولو تو سہی؟" اس کی ماں قدرے بیزار سی ہو گئی۔

"کیا بتاؤں امی' اس بار باغوں میں اتنے پھل آئے ہیں کہ اللہ نے چاہا تو سارے قرض ادا ہو جائیں گے۔"

"خدا کا شکر ہے بیٹے۔" خوشی سے بوڑھی ماں کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"اس بار پھلوں کو فروخت کر کے میں تمہارے لئے ایک عینک خرید دوں گا امی۔" یلدوز خان نے کہا۔

"ہاں یلدوز' خرید دینا بیٹے' اب تو دور کی چیز مجھے بالکل دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی آنکھوں میں شدید درد بھی ہوتا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"میں سب سمجھتا ہوں امی!" یلدوز نے کہا۔۔۔ "تمہارے کراہنے کی آواز سن کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تمہاری آنکھوں میں ضرور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن کیا کرتا' پیسوں کی قلت کے سبب اتنے دنوں تک کچھ نہ کر سکا۔ اس بار انشاء اللہ ضرور لا دوں گا۔"

اس نے اپنی بیوی کو بھی یہ امید دلا رکھی تھی کہ شمس خان کے پاس جو اس کے ہاتھ کی پہونچی کی جوڑی گروی ہے' اس بار وہ اسے چھڑا کر لا دے گا۔

بیوی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ "لیکن اس سے پہلے امی کے لئے عینک ضرور لا دینا' کیوں!"

"ضرور!" یلدوز خان نے ترنگ میں آ کر جواب دیا تھا۔۔۔ "پھلوں کو فروخت کر کے میں سب سے پہلے امی کی عینک ہی لاؤں گا اس کے بعد تمہاری پہونچی چھڑاؤں گا اور اس کے بعد......"

"مجھے کیا دو گے ابو؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی بیٹی جمیلہ بول اٹھی۔۔۔۔ "میں نے بھی ان باغوں میں کم محنت نہیں کی ہے۔"

"ہاں' ہاں' میں تمہیں بھی اس کا انعام ضرور دوں گا' بولو تمہیں کیا چاہئے۔"

جمیلہ نے یلدوز خان کے گلے میں جھول کر کہا تھا۔۔۔ "میرے لئے تم ہرن کا ایک بچہ لا دو گے' بولو' لا دو گے نا؟"

"ہرن کا بچہ! ہرن کا بچہ لے کر تم کیا کرو گی بیٹی؟"

"میں اسے پالوں گی' اس سے پیار کروں گی' گھاس کھلاؤں گی' بولو ابو' لا دو گے نا؟"

"اچھی بات ہے" یلدوز خان نے جمیلہ کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ "جب تمہاری خواہش ہے تو ضرور لا دوں گا۔"

لیکن آج اس کی ساری امیدیں' اس کی ساری تمنائیں' اس کے سارے وعدے خاک میں مل گئے تھے۔ ان فوجیوں نے صرف اس کے باغوں کو ہی تباہ نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے دوسرے تمام لوگوں کے باغوں کو بھی تس نس کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے دھمکی بھی دی تھی۔۔۔ چونکہ مجاہدین انہیں باغوں میں آ کر پناہ

لیتے ہیں' اس لئے جب تک یہ مجاہدین نیست و نابود نہیں کر دیئے جاتے' کوئی باغ نہیں لگائے گا' ہوشیار ہو جاؤ۔

یہ سب کچھ سن کر یلدوز خان کا دل پژمردہ ہو گیا تھا' وہ رونا چاہتا تھا' اپنی بے بسی پر آنسو بہانا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں غم و غصہ کی آگ سلگ اٹھی تھی۔

دیکھتے دیکھتے رات آگئی اور تاریکی بڑھتی گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تاروں سے بھرا ہوا آسمان ہرن کی کھال کی طرح نظر آرہا تھا۔ دور کہیں سیار بول رہا تھا۔ چاروں طرف رات کی خاموشی جھینگروں کی آواز سے گونج رہی تھی۔

یلدوز خان اپنے گھر کے سامنے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن اتنا پراگندہ تھا کہ اناپ شناپ' آسمان و زمین کی بے مقصد بہت ساری باتیں اس کے دماغ میں گھر کر رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا' اب اس کا' اس کے بیوی بچوں کا' اس کی بوڑھی ماں کا مستقبل کیا ہو گا؟ اس نے اپنی ماں سے عینک خریدنے کا' بیوی سے اس کی گروی رکھی ہوئی پہونچی چھڑانے کا اور اپنی بچی سے ہرن کا بچہ خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ تو کوئی ایک وعدہ بھی پورا نہ کر سکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے سر پر قرض کا جو بوجھ تھا' وہ کیسے اتارے گا' اپنا اور اپنے خاندان کے پیٹ کی آگ کو کیسے بجھائے گا۔ وہ اندر ہی اندر جیسے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

اچانک اسے بہت سارے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ چونک اٹھا۔۔۔۔ "کون؟"

جو شخص سب سے آگے تھا' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔۔۔۔ "تمہارا بھائی! مجاہد!"

وہ بھی سائے کی طرح اس کے سامنے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان سبھوں کے شانوں پر سنگینیں تھیں اور وہ اپنے جسموں کو درختوں کی شاخوں اور پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

یلدوز خان سحر زدہ سا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

اتنے میں قطار میں کھڑے ہوئے پہلے آدمی نے کسی سے کہا۔۔۔ "اسے بھی ایک رائفل دے دو۔"

دوسرے ہی لمحہ کسی نے اس کے ہاتھ میں ایک رائفل دے دی اور دوسرے کسی نے بولٹ سے بھری ہوئی پٹی اس کی کمر میں باندھ دی۔

اچانک یلدوز کے دل پر چھایا ہوا غبار دھل گیا اور اس کے دل میں مسرت کی لہریں در آئیں۔ وہ رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ کر اسے بار بار چومنے لگا۔

پھر اس نے حلف اٹھایا۔۔۔۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنی ماں' اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لئے اپنے ملک کو وطن دشمنوں سے آزاد کرانے کے لئے' ملک کو ہرا بھرا اور خوشحال دیکھنے کے لئے زندگی کی آخری سانس تک جنگ کروں گا۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں جان دے کر بھی اپنا یہ عہد پورا کروں گا۔۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں!"

نذرالاسلام/علی مطہر اشعر

اُمید

میں، شاید تمہیں حاصل کرلوں گا، پیاری! دور کہیں افق پر جہاں جھکتا آسماں درختوں کے جھنڈ کے گہرے سبزے کو چومتا ہے۔ کسی دور افتادہ گاؤں کی اکیلی چراگاہ میں یا گاؤں کے تالاب کے خاموش کنارے پر تم شاید اکیلی آؤ۔ اپنی پیاری ہنسی ہنستے ہوئے اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لو گی آسمان کی نیلاہٹوں کے پار تمہارے کھلی آنکھیں دمک رہی ہیں اور وہ باد جنوب ہمراز پیغام رساں ہے۔ جو تمہاری خبر میرے پاس لارہی ہے تم ایک عیار کنیز ہو درختوں میں سے آتی ہوئی تم یکبارگی آؤ گی اور میری آنکھوں کو پیار سے چوم لوگی وہاں دور اُفق پر پر شکوہ سورج اپنی چمکتی کرنوں سے وہ پیغام لکھ رہا ہے۔

پریم چند / محمد اسد الدین

بچہ

گنگو کو لوگ براہمن کہتے ہیں اور وہ بھی اپنے آپ کو براہمن سمجھتا ہے۔ میرے دوسرے نوکر مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ لیکن گنگو کبھی بھی مجھے اس طرح سلام نہیں کرتا۔ وہ شاید مجھ سے سلام کی امید کرتا ہے۔ میرے استعمال کئے ہوئے برتنوں کو وہ ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ گرمی میں اسے پنکھا جھلنے کو کہوں۔ جب کبھی میں پسینے سے تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو پنکھا تو اٹھا لیتا ہے لیکن اس کے انداز سے یہ لگتا ہے جیسے وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ وہ تنک مزاج ہے اور معمولی سی پھٹکار بھی نہیں برداشت کر سکتا۔ اس کے دوست بہت کم ہیں اور سائیس یا نوکروں کے ساتھ بیٹھنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کبھی کسی سے ملتے جلتے نہیں دیکھا' نہ ہی وہ کسی میلے ٹھیلے میں جاتا ہے۔ نہ ہی وہ بھنگ یا اس قسم کی چیزیں پسند کرتا ہے جس کی لت اس کے طبقے کے لوگوں میں عام ہے۔

وہ کبھی پوجا پاٹھ نہیں کرتا' نہ ہی کبھی ندی پر اشنان کرنے جاتا ہے۔ وہ بالکل ان پڑھ ہے لیکن توقع یہ کرتا ہے کہ لوگ اسے براہمن کی حیثیت سے عزت دیں اور کیوں نہ ہو؟ اگر لوگ پشتینی جائیداد کی بنا پر احترام چاہتے ہیں تو گنگو بھی چاہے گا کہ اسے حسب و نسب کی بنیاد پر عزت دی جائے۔

میری طبیعت کچھ ایسی ہے کہ میں نوکروں سے بلا ضرورت بات نہیں کرتا۔ میری سخت ہدایت ہے کہ جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میری تنہائی میں حائل نہ ہو۔ چھوٹے موٹے کام جیسے پانی کا گلاس لینا' جوتا پہننا یا بتی جلانا' میں خود کرنا پسند کرتا ہوں اور ان کو نہیں بلاتا۔ اس سے مجھے ایک آزادی اور خوداعتمادی کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے معمول سے مانوس ہو گئے ہیں اور مجھے پریشان نہیں کرتے۔

اگر یہ لوگ کبھی بن بلائے میرے پاس آتے ہیں تو یا تو تنخواہ پیشگی مانگنے کے لیے یا دوسرے نوکروں کی شکایت کرنے کے لیے۔ دونوں ہی باتیں مجھے بری لگتی ہیں۔ جب میں ان کو باضابطہ اور مناسب تنخواہ دیتا ہوں تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مہینے کی تنخواہ پندرہ ہی دن میں کیوں خرچ کر لیتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں چغلی کھانا کمزوری کی نشانی ہے یا خوشامد کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ دونوں ہی باتیں اخلاق سے گری ہوئی ہیں۔

ایک صبح گنگو بن بلائے میرے پاس آ گیا۔ مجھے غصہ آ گیا اور جھنجلا کر پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں بول پایا۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں پتہ ہے مجھے صبح کی سیر کو دیر ہو رہی ہے۔" گنگو نے رک رک کر جواب دیا۔ "آپ دیر نہ کریں' میں پھر آ جاؤں گا۔" یہ بات اور بھی بری تھی۔ اب چونکہ میں جلدی میں تھا تو گنگو اپنی بات جلدی ختم کر لیتا۔ اگر وہ ایسے وقت پر آیا جب وہ سمجھتا ہے کہ میں فرصت میں ہوں تب تو وہ بہت وقت ضائع کرے گا۔ جب میں پڑھ یا لکھ رہا ہوتا ہوں تب ہی وہ مجھے مصروف سمجھتا ہے۔ جب وہ

دیکھتا ہے میں بیٹھ کر کچھ سوچ رہا ہوں تب سمجھتا تھا کہ میں خالی بیٹھا ہوں۔ اور یہ بات طے ہے کہ کسی ایسے ہی وقت پر وہ اپنے آپ کو مسلط کرے گا۔ اس کو یہ ذرا بھی خیال نہیں ہوتا کہ یہ لمحے میرے لیے کتنے قیمتی ہیں۔

میں اسی وقت اس سے نمٹنا چاہتا تھا اور کہا "اگر تم پیشگی مانگنے آئے ہو' تو تمہیں بالکل نہیں ملے گا۔"

"مجھے پیشگی نہیں چاہیے۔" گنگو نے کہا "میں نے آپ سے کبھی پیشگی نہیں مانگا۔"

"تو پھر تم کسی کی شکایت لے کر آئے ہو۔" میں نے کہا "دیکھو' چغلی سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

"نہیں سرکار" گنگو نے کہا "کسی کے خلاف مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"تو پھر کیوں پریشان کر رہا ہے؟" میں نے بے صبری سے کہا۔

گنگو نے اپنے دل کی بات بتانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ اپنی طاقت سمیٹ رہا ہے۔ بالآخر اس نے کہا "حضور میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی خدمت نہ کر سکوں گا۔"

اس قسم کی درخواست پہلی مرتبہ سننے میں آئی اور مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں ایک مثالی مالک سمجھا جاتا تھا اور نوکر میرے ساتھ رہنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

"تم کیوں جانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آپ تو دیا کی مورت ہیں سرکار۔" گنگو نے کہا "کسی معقول وجہ کے بغیر کون آپ کو چھوڑنا چاہے گا؟ لیکن میرے لیے کوئی دوسرا راستہ ہے نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے لوگ آپ کی طرف انگلی اٹھائیں۔"

یہ تو بڑے چکر میں ڈالنے والی بات تھی۔ سیر کے بارے میں میں بھول گیا اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تم پہیلیاں کیوں بجھا رہے ہو؟ دل میں جو بات ہے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" گنگو نے دوبارہ اٹک اٹک کر کہا سرکار' بات یہ ہے کہ ----- وہ عورت جو ابھی ابھی ودھوا آشرم سے نکال دی گئی ----- وہ گومتی دیوی ----- " اور جملہ پورا کئے بغیر وہ رک گیا۔ میں نے بے صبری سے پوچھا "اس عورت کا تمہاری نوکری سے کیا تعلق؟"

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' سرکار" گنگو نے کہا۔

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ پرانے خیالات رکھنے والا براہمن جس کا نئی تہذیب سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک ایسی عورت سے کیوں شادی کرنا چاہتا ہے جسے کوئی بھی غیرت مند آدمی اپنے گھر کے پاس پھٹکنے بھی نہ دے گا۔ محلہ کے پرسکون ماحول میں گومتی نے کافی ہلچل مچا رکھی تھی۔ کئی سال پہلے وہ ودھوا آشرم میں آئی تھی۔ آشرم' کے منتظمین نے دو مرتبہ اس کی شادی کروا دی تھی۔ لیکن دونوں مرتبہ ہفتہ بھر میں وہ واپس بھاگ آئی تھی۔ بالآخر آشرم والوں نے اسے نکال دیا تھا۔ اب وہ محلہ میں ایک کوٹھڑی لے کر رہتی تھی اور محلہ کے منچلے نوجوانوں کی دلچسپی کا مرکز تھی۔

مجھے گنگو پر غصہ بھی آیا اور ہمدردی بھی ہوئی۔ شادی کرنے کے لیے اس بیوقوف کو کیا کوئی اور عورت نہیں ملی؟" میں نے سوچا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ عورت اس کے ساتھ کچھ دن سے زیادہ نہیں رہے گی۔ اگر اس کی مالی حالت بہتر ہوتی تو شاید وہ چھ مہینہ تک رک جاتی لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ شادی زیادہ دن نہیں چلے گی۔

"تم اس عورت کے ماضی سے واقف ہو؟"

"وہ سب جھوٹ ہے سرکار۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ جواب دیا۔" لوگوں نے ناحق اس کو بدنام

کر رکھا ہے۔"
"کیا بکتے ہو!" میں نے کہا "کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ وہ اب تک تین شوہر بدل چکی ہے؟"
گنگو نے اطمینان سے جواب دیا "ان لوگوں نے اسے نکال دیا تو وہ کیا کرتی؟"
"کیسے بدھو ہو!" میں نے کہا "کیا تم سوچتے ہو کوئی اتنی دور سے آکر شادی کر کے لے جاتا ہے۔ ہزار روپیہ خرچ کرتا ہے اسی لیے کہ آخر میں اس عورت کو گھر سے نکال دے؟"
گنگو نے شاعروں جیسے پرجوش انداز میں جواب دیا "ہجور' جہاں محبت نہیں وہاں کوئی بھی عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت صرف روٹی' کپڑا اور مکان ہی نہیں چاہتی۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ انہوں نے ایک بیوہ سے شادی کر کے اس پر بڑا احسان کیا ہے اور چاہتے ہوں گے کہ تن من سے وہ ان کی ہو جائے۔ لیکن کسی دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے خود کو بھلانا پڑتا ہے۔ اسے دورے پڑتے ہیں۔ وہ اناپ شناپ بکنے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس پر کسی بھوت کا اثر ہے۔"
اور "تم ایسی عورت سے شادی کرو گے۔" میں نے کہا۔ "سمجھ لو تم پریشانی کو دعوت دے رہے ہو۔"
گنگو نے شاعروں جیسے لہجے میں کہا "اگر وہ مجھے مل گئی تو بھگوان کی دیا سے میری زندگی سدھر جائے گی۔"
"تو تم نے طے کر لیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں ہجور۔" اس نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو میں تمہارا استعفا منظور کرتا ہوں۔"
ویسے تو میں پرانی رسموں اور بے معنی رواجوں پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اس معاملہ میں میں نے یہ سوچا کہ کوئی ایسا آدمی جو ایک مشتبہ کردار عورت سے شادی کرنا چاہتا ہو' اس کو گھر میں رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس سے بہت ساری الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میرے خیال سے گنگو کا اس عورت سے شادی کرنا ایسا تھا جیسا کہ کوئی بھوکا آدمی روٹی کے لیے لپکتا ہے۔ اسے یہ پروا نہیں کہ روٹی سوکھی اور بے مزا ہے۔ میں نے سمجھا کہ اس معاملے سے دور رہنا ہی عقلمندی ہے۔
پانچ مہینے گزر گئے۔ گنگو نے گومتی سے شادی رچالی تھی اور اسی محلّہ کی ایک جھونپڑی میں رہنے لگا تھا۔ راستہ میں ملاقات ہوتی تو میں حال چال پوچھ لیتا۔ مجھے اس کی زندگی سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس کہانی کا انجام کیا ہوتا ہے' اس کا مجھے بے صبری سے انتظار تھا۔ بہرحال میں نے ہمیشہ گنگو کو خوش پایا۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک ہوتی جو بے فکری سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ روزانہ کم و بیش ایک روپیہ کما لیتا تھا۔ اس میں سے لاگت نکال کر اسے دس آنے کے قریب بچ جاتے تھے۔ اس دس آنے میں کوئی آسمانی طاقت رہی ہو گی جو اسے اس طرح کی مکمل آسودگی دے سکتی تھی۔
ایک دن میں نے سنا کہ گومتی بھاگ گئی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی۔ شاید گنگو کی خوداعتمادی پر مجھے ہمیشہ سے رشک تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ آخر میری بات سچ نکلی۔ اب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ جو لوگ اسے گومتی سے شادی کرنے سے منع کر رہے تھے۔ وہی دراصل اس کے خیرخواہ تھے۔ "کتنا بے وقوف تھا وہ۔" میں نے سوچا "گومتی سے شادی کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ جیسے اسے جنت مل گئی ہو۔" میں اس سے ملنے کو بے چین تھا۔
سہ پہر کو جب ملاقات ہوئی مجھے ایسا لگا کہ گنگو بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رو پڑا' بابو جی گومتی

مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"
میں نے مصنوعی ہمدردی کے ساتھ جواب دیا "میں نے شروع میں تم سے کہہ دیا تھا کہ اس عورت سے دور رہو لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی۔ کیا مال اسباب بھی لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟"
گنگو نے اپنے دل پر اس طرح ہاتھ رکھا جیسے میں نے کوئی کفر بک دیا اور کہا "ایسا نہ کہئے بابو جی' اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں بلکہ اپنی چیزیں بھی یہیں چھوڑ گئی۔ پتہ نہیں اسے مجھ میں کیا کمی نظر آئی جو مجھے چھوڑ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے قابل نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور میں ٹھہرا بالکل ان پڑھ۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اوروں کے لیے جو کچھ بھی رہی ہو' میرے لیے تو وہ دیوی تھی۔ مجھ میں ضرور کوئی خامی رہی ہو گی جو اس نے مجھے چھوڑ کر چلے جانے کی ٹھان لی۔"
گنگو کی باتوں سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے وہ اس کی بے وفائی کی کہانی سنائے گا اور مجھے اس کے ساتھ ہمدردی جتانا پڑے گی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے وقوف کی آنکھیں یا ابھی تک کھلی نہیں ہیں یا وہ اپنی سمجھ بوجھ کھو بیٹھا تھا۔ میں نے مذاق کے انداز میں کہا "تو وہ تمہارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟"
"کچھ نہیں بابو جی۔ ایک پیسے کی چیز بھی نہیں۔"
"اور تم سے بہت محبت بھی کرتی تھی؟"
"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں بابو جی۔ مرتے دم تک اسے نہیں بھولوں گا۔"
"اور پھر بھی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی؟"
"یہی تو حیرت کی بات ہے بابو جی۔"
"تم نے وہ پرانی کہاوت سنی ہے۔ "بے وفائی تیرا نام عورت ہے۔"
"ایسا نہ کہئیے بابو جی' میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے بارے میں یہ بات نہیں سوچ سکتا تھا۔"
"اگر اب بھی اس سے اتنا لگاؤ ہے تو جاؤ اسے ڈھونڈ نکالو۔"
"ہاں مالک' جب تک اسے ڈھونڈ نہ نکالوں مجھے چین نہ آئے گا۔ بس یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ہے کہاں! مجھے یقین ہے وہ واپس میرے پاس آئے گی۔ اس کی تلاش میں میں ضرور نکلوں گا۔ زندہ رہا تو واپس آکر آپ کا درشن کروں گا" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔
اس واقعہ کے بعد مجھے نینی تال جانا پڑا اور تقریباً ایک مہینے بعد میں وہاں سے لوٹا۔ ابھی کپڑے بھی نہیں اتار پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچہ گود میں لئے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ کرشن کو پاکر نند بھی شاید اتنے خوش نہ ہوئے ہوں گے۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک تھی جیسے کسی بھوکے آدمی کے چہرے پر بھرپیٹ کھانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔ میں نے پھر مذاقاً پوچھا "کیا گومتی دیوی کی کچھ خبر ملی؟ تم تو اس کی تلاش میں نکلے تھے۔" گنگو نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا "میں نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے بابو جی۔ وہ لکھنؤ کے زنانہ ہسپتال میں تھی۔ وہ اپنی سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر میں بہت زیادہ پریشان ہو جاؤں تو مجھے اس کا اتا پتا بتا دے۔ یہ سنتے ہی میں لکھنؤ بھاگا اور اسے لے آیا۔ نفع میں یہ بچہ بھی مجھے مل گیا۔" اس نے بچے کو اٹھا کر میری طرف ایسا بڑھایا جیسے کوئی کھلاڑی تمغہ دکھا رہا ہو۔
اس کی بے حیائی پر مجھے حیرت ہوئی۔ گومتی سے اس کی شادی ہوئے ابھی چھ مہینہ بھی نہیں ہوئے اور وہ

اس بچہ کو فخر کے ساتھ دکھا رہا تھا۔ طنزاً" میں نے کہا "اچھا' تو تمہیں ایک بچہ بھی مل گیا۔ وہ شاید اسی لیے بھاگی تھی۔ کیا تمہیں یقین ہے یہ بچہ تمہارا ہے؟"

"میرا کاہے کو ہے بابو جی' یہ بھگوان کا ہے۔"

"یہ لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا نا؟"

"ہاں بابو جی' کل ہی وہ ایک مہینہ کا ہو گا۔"

"تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے؟"

"یہ ساتواں مہینہ ہے۔"

"تو تمہاری شادی کے چھ مہینے کے اندر ہی یہ بچہ پیدا ہو گیا؟"

"ہاں' گنگو نے اطمینان سے جواب دیا۔"

"پھر بھی تم اسے اپنا بچہ مانتے ہو؟"

"ہاں سرکار"

"کیا تمہاری عقل ٹھکانے ہے؟" میں نے پوچھا' پتہ نہیں وہ میرا اشارہ سمجھ پا رہا تھا یا جان کر انجان بن رہا تھا۔

"اس نے بڑی تکلیف اٹھائی ہے" گنگو نے اسی لہجے میں کہا "یہ اس کے لیے ایک نئی زندگی ہے بابو جی۔ پورے تین دن تین رات وہ تڑپتی رہی۔ درد بالکل برداشت سے باہر تھا۔" اسی موقع پر میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا "شادی کے چھ مہینے کے اندر بچہ ہوتے پہلی بار آج سنا۔"

یہ بات سن کر گنگو جیسے حیرت زدہ ہو گیا۔ شریر مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔ "مجھے اس کی بھی پروا نہیں رہی۔ شاید اسی لیے گومتی نے گھر چھوڑا تھا' میں نے کہا بھی تھا کہ اگر اس کو مجھ سے پریم نہیں ہے تو وہ مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے' میں اس کا خیال نہیں کروں گا۔ لیکن اگر وہ مجھے چاہتی ہے تو صرف اس بچہ کو ہمارے درمیان نہیں آنا چاہیے۔ میں اسے اپنے بچے کی طرح چاہوں گا۔ اگر کوئی جوتا ہوا کھیت لیتا ہے تو فصل کو محض اس لیے نہیں چھوڑ دیتا کہ اسے کسی دوسرے نے بویا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

گنگو کے جذبات نے میرے دل کو چھو لیا اور میں بے وقوف بن کر رہ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس بچہ کو گنگو کی گود سے لے لیا اور چوما۔ گنگو نے کہا "بابو جی آپ تو نیکی کا پیکر ہیں۔ اکثر گومتی سے میں آپکا ذکر کرتا ہوں۔ کئی مرتبہ اس کو کہا بھی کہ آکر آپ کو سلام کرے۔ لیکن وہ بہت شرماتی ہے۔"

میں اور نیکی کا پیکر! میری متوسط طبقے کی ذہنیت گنگو کے حوصلے اور ایمانداری کے سامنے پشیمان ہو کر رہ گئی۔

"نیکی کا پیکر تو تم ہو۔" میں نے کہا "اور بچے نے تو اس پر چار چاند لگا دئے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چل کر گومتی سے ملنا چاہوں گا۔"

اور ہم دونوں گنگو کے گھر کی طرف چل پڑے۔

(ھندی)

قرۃ العین حیدر

کہرے کے پیچھے

گھوڑوں، رکشاؤں اور ڈانڈیوں پر سوار انگریز صاحب اور میم اور بابا لوگ بازار کے اس پل پر سے دن بھر گزرا کرتے ہیں۔ شام کو ہندوستانی امنڈ آتے ہیں۔ تیز تیز چلتے ڈھلان اترتے یا ہانپتے کانپتے چڑھائی چڑھتے انسانوں کا ریلا جوار بھاٹا معلوم ہوتا ہے سینما گھروں میں ایستھر ولیمز، جون فونٹین، نورجہاں اور خورشید کی پکچریں چل رہی ہیں۔ رنک میں اسکیٹنگ جاری ہے۔ ابھی سیوائے کے بال روم میں اینگلو انڈین مغنیہ اور اس کے ساتھی "Enjoy your self - It's later than you think" گانا شروع کریں گے۔ ڈرم پر چوٹ پڑے گی۔ مہاراجہ اور مہارانی اور نواب لوگ اور بڑا صاحب اور بڑا میم لوگ ڈینس Dance بنائے گا۔

اس وقت جب سارا مسوری تفریح میں مصروف ہوتا ہے، ایک غریب آدمی بازار کے اس پل پر چپ سادھے ہمالیہ کو تکتا نظر آتا ہے۔ کھڑا کبیرا دیر سے، مانگے سب کی خیر۔

شکستہ خاکی کوٹ اور کنٹوپ پہنے یہ آدمی جو حلئے سے بے روزگار مہتر معلوم ہوتا ہے، ایک انگریز بچی کو گود میں اٹھائے دن ڈھلے بازار میں آنکلتا ہے۔ جھٹ پٹے کے وقت تک چپ چاپ ادھر ادھر کھڑا رہتا ہے یا پل کی منڈیر پر جا بیٹھتا ہے۔

یہ فضل مسیح جمعدار کسی صاحب کی بچی کھلاتا ہے تو اتنا مسکین اور پھٹے حال کیوں؟ تعجب!

فضل مسیح فاتر العقل بھی معلوم ہوتا ہے۔ زارشاہی روس میں اس قسم کے لوگوں کو Holy Fool کہتے تھے۔ ہمارے ہاں مجذوب۔ پتہ نہیں یہ بے چارہ مجذوب ہے یا محض پیدائشی احمق۔ بہرحال زیادہ تر وہ بالکل خاموش رہتا ہے۔ سنہرے گھنگریالے بالوں والی بچی اتنی خوبصورت ہے کہ اکثر راہ گیر اسے دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں بابو لوگ کھیسیں نکال کر "گڈ ایوننگ مسی بابا!" عرض کرتے ہیں۔ نووارد انگریز بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں لیکن مقامی انگریز اسے نظرانداز کرتے ہوئے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سالہ بچی فضل مسیح کی گود میں یا کندھے پر بیٹھی ہنستی یا روتی یا اپنے ٹیڈی بیر یا لولی پوپ میں مشغول رہتی ہے۔

فضل مسیح سلسلہ کوہ کو تکا کرتا ہے، جس کے ادھر ان دیکھی "پھولوں کی وادی" ہے۔

اندھیرا پڑے وہ بچی کو کندھے پر بٹھا کر سر جھکائے ونسنٹ ہل کی طرف چل پڑتا ہے۔ محض ایک مرتبہ ایک لکھنؤی راہ گیر نے اس سے پوچھا تھا "اماں، یہ کس کی بچی ہے؟" تو اس نے جھنجلا کر جواب دیا تھا "میری بھانجی ہے، صاحب۔"

"میاں! ہندوستان کا اینگلو انڈین طبقہ کیا آسمان سے گرا تھا؟ اسی طرح وجود میں آیا ہے۔" دوسرے راہ گیر نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

شاید وہ قہقہہ بھی فضل مسیح کے کانوں میں گونجا کرتا ہے۔ مگر وہ کچھ بولتا نہیں۔ سر جھکائے، لڑکی کو

کندھے پر بٹھائے ونسنٹ ہل کی چڑھائی چڑھنے لگتا ہے۔

ونسنٹ ہل کی مقامی آبادی کو معلوم ہے کہ کٹو آیا اس خوبصورت سفید فام بچی کی ماں اور فوجی بینڈ میں ڈرم بجانے والا ایک گورا اس کا باپ تھا۔ اور یہ کہ لڑکی کو رچمنڈز گیسٹ ہاؤس کی انگریز مالکن مس میلیا رچمنڈ پال رہی ہیں۔ کٹو مس صاحب کی سانولی سلونی گورکھ پوری آیا ہے' ذات کی مہترانی۔ اس کے ماں باپ کو مس میلیا کے مشنری والد نے عیسائی کیا تھا۔ اس کا اصل نام مارتھا ہے' مگر وہ گلہری کی سی پھرتی سے پہاڑیوں پر چڑھتی اترتی ہے' اس لیے کٹو کہلانے لگی۔ مس رچمنڈ کی زندگی یہ موروثی مہمان سرائے چلاتے ہی گزر گئی۔ حالات نے ان کو غصیلا بنا دیا ہے۔ ٹیری کی طرح چلاتی ہیں اور "چنچنیا میم" پکاری جاتی ہیں۔

رچمنڈز دوسرے درجے کا "یوروپینز اونلی" گیسٹ ہاؤس ہے' جس میں معمولی حیثیت کے انگریز' غریب سفید فام مشنری' یا گوری رنگت کے یوریشین آکر ٹھہرتے ہیں۔ مس رچمنڈ اپنی عقابی نظر سے بھانپ لیتی ہیں کہ کس میں کتنے فیصد ولایتی خون ہے۔ ذرا سے بھی سانولے اینگلو انڈین کو کٹو آیا کے ذریعے کہلوا دیتی ہیں کہ جگہ خالی نہیں۔

یہ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں کی بات ہے۔ رچمنڈز گیسٹ ہاؤس میں ایک نوجوان گورا ٹامی آکر ٹکا۔ کارپورل آرتھر بولٹن جنگ سے قبل لندن کے ایک معمولی ریسٹوران کے آرکیسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا۔ چاہتا وہ بھی یہی تھا کہ دنیا کے مشہور سازندوں میں اس کا شمار ہو' مگر بہت سے فنکاروں کی طرح مواقع کے فقدان نے اسے گم نام اور مفلس رکھا تھا۔ جنگ چھڑنے پر فوج میں ذرمر بھرتی ہو کر انڈیا آگیا تھا۔ اسے بھی رومن اردو سکھائی گئی تھی۔ لیکن وہ ہندوستانی موسیقی بھی شوق سے سنتا تھا۔ کتابیں پڑھتا تھا اور پوئیٹری لکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ عام گوروں سے مختلف ایک حساس اور فن کار ٹامی تھا۔ لیکن چونکہ اہم صاحب بہادر یا فوجی افسر نہ تھا کہ سیوائے میں ٹھہرتا' وہ محض بے چاری چنچنیا میم کا مہمان تھا۔ دن بھر وہ پہاڑیوں پر گھومتا یا نظمیں لکھتا۔ کٹو آیا سے اس کی سریلی آواز میں کجریاں سنتا اور میز پر تال دیتا جاتا۔ کبھی کٹو اپنا گھیردار سفید لہنگا گھماتی کنجیوں کا گچھا چھنکا کر ٹھمکی لگاتی "مرجاپور میں اورن ٹھورن کاشی ہمارو گھاٹ" تو آرتھر بچوں کی طرح خوش ہو کر تالی بجاتا اور اس کے ساتھ ناچنے لگتا۔ اسے کٹو آیا بہت اچھی لگی تھی اور اس کے باؤلے بھائی فضل مسیح سے بھی اس کی گاڑھی چھنی۔ وہ دونوں صبح صبح باہر نکل جاتے' اور وادیوں میں بھرے اور پہاڑوں پر تیرتے کہرے کو گھورا کرتے اور سوچتے۔ اس دھندلکے کے پیچھے کیا ہے؟

میرٹھ چھاؤنی واپس جاتے وقت آرتھر بولٹن نے کہا تھا "میں سچ بولنے کا عادی ہوں' اس وجہ سے ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہوں۔ ہماری رجمنٹ شاید جرمنی جانے والی ہے' اور وہاں گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ اس لیے میں شاید تم لوگوں کو خط نہ لکھ سکوں۔ یوں بھی میں خط وکتابت کے معاملے میں بہت کاہل ہوں۔ اور خطوں میں لکھا ہی کیا جا سکتا ہے؟" لیکن ضابطے کے مطابق میرٹھ چھاؤنی واپس جا کر اس نے مس رچمنڈ کو شکریہ کا نوٹ بھیجا تھا' جس میں کٹو اور فضل مسیح کو بھی سلام لکھا تھا اور یہ بھی کہ وہ چند روز بعد یورپ جا رہا ہے۔

جب بے چاری کٹو کے یہاں آرتھر بولٹن کی ہم شکل سو فیصد گوری بچی ہوئی تو خلاف توقع مس رچمنڈ نے کوئی بازپرس نہیں کی۔ انہیں معلوم تھا کہ کٹو آوارہ نہیں۔ بہرحال وہ ان کی وفادار خانہ زاد ملازمہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش سے مس رچمنڈ کو اپنی ویران زندگی کچھ بھری بھری سی دکھائی دینے لگی اکثر وہ سوچا کرتی تھیں کہ اس گیسٹ ہاؤس کے لیے کیوں جان کھپاتی ہیں؟ کس کے لیے پیسہ جوڑتی ہیں؟ اب یہ پیاری بچی خدا نے ان کے لیے

بھیج دی تھی۔

مس رچمنڈ کو خیالی پلاؤ پکانے اور تھیٹر رچانے کا شوق تھا۔ وہ عام مڈل کلاس انگریزوں کی طرح بڑی زبردست اسنوب (Snob) بھی تھیں۔ انہوں نے اس بچی کے متعلق ایک کہانی ایجاد کی۔ "اس کے باپ کرنل آرتھر بولٹن برلن کے محاذ پر لاپتہ ہو گئے۔" وہ آہ بھر کر کہتیں اور مہمان کو بریک فاسٹ کھلاتی جاتیں۔ "آرتھر بے چارہ میرا فرسٹ کزن تھا۔ اس نے ایک آئرش لارڈ کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ دونوں انڈیا میں تھے۔ بنگلور میں بے چاری برجٹ بچی کو جنم دیتے ہوئے ختم ہو گئی۔ ریڈ کراس والوں نے اسے میرے پاس بھیج دیا۔"

سوری کے ایک انگریزی گرجا گھر میں بپتسمہ دلواتے وقت مس رچمنڈ نے رجسٹر میں بھی والد کا نام "کرنل آرتھر بولٹن" لکھوا دیا تھا۔ اور دونوں انگلیوں کا کراس بنا کر دل میں کہا تھا۔

"So help me God"

کٹو قسمت کی دھنی نکلی۔ "بڑھیا گیسٹ ہاؤس اور روپیہ پیسہ اس چھوکری کے نام کر جائے گی۔" ونسنٹ ہل کے نوکروں نے کہا۔

ادھر ہندوستان آزاد ہوا' ادھر سوری انگریزوں سے اچانک خالی۔ سوائے مس رچمنڈ کے' جو برطانیہ جا کر برتن دھونے اور جھاڑو دینے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ بلکہ خلاف امید ان کا ہوٹل (جس پر سے انہوں نے "یوروپینز اونلی" کا بورڈ اتار دیا تھا) اب زیادہ چلنے لگا' کیونکہ آزاد ہندوستانی ایک "انگلش گیسٹ ہاؤس" میں ٹھہرنا بہت فخر کی بات سمجھتے تھے۔

کیتھرین بولٹن عرف کینی بھی اپنی پھرتی اور چونچالی کی وجہ سے "چھوٹی کٹو" کہلاتی تھی۔ اس کے کانونٹ اسکول میں اب ہندی اور سنسکرت بھی پڑھائی جا رہی تھی۔ ان مضامین کے استاد ایک چلتے پرزے قسم کے نوجوان تھے۔ کینی ان سے بہت چڑتی تھی۔

سوری کے وہ انگریز پادری صاحب جنہوں نے کیتھرین کو بپتسمہ دیا تھا' آسٹریلیا جا بسے تھے لیکن مس رچمنڈ کو خط لکھتے رہتے تھے۔ کینی تیرہ سال کی ہوئی تو انہوں نے لکھا "میں کیتھرین کے متعلق فکر مند ہوں۔ ہندوستان میں اس کا مستقبل کیا ہے؟ کیا تم چاہو گی کہ وہ کسی ہندو Heathen سے شادی کر لے؟ بہتر ہو گا کہ تم اسے یہاں لے آؤ۔"

مس رچمنڈ نے غور کیا۔ ہندوستان میں اس حسین اینگلو انڈین لڑکی کا مستقبل کیا ہے؟ ٹیلی فون آپریٹر؟ آفس سیکرٹری؟ یا خدانخواستہ کال گرل یا کیبرے ڈانسر؟ ابھی سے سوری میں کینی بولٹن کی تیزی اور طراری کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اور جس روز چلتے پرزے ہندی ٹیچر نے اس کے ساتھ چھیڑخانی کی کوشش کی اور اس کی مدافعت پر اسے "نخرے والی دوغلی چھوکری" پکارا' وہ آگ بگولہ ہو کر گھر لوٹی کیتھرین کو بھی اپنی گوری نسلی فوقیت کا شدت سے احساس تھا۔ اس نے مس رچمنڈ کو قصہ سنایا۔

اس سرد شام کو مس رچمنڈ نے فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے کٹو اور فضل مسیح کو بلایا۔ وہ دونوں آ کر دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ مس سیلیا صوفے پر آتش دان کے سامنے بیٹھی نٹنگ کر رہی تھیں۔ کینی ریڈیو گرام کے پاس موجود تھی۔ مس سیلیا رچمنڈ نے گمبھیر آواز میں کہا "کٹو' ہم آسٹریلیا جا رہا ہے۔ کینی بابا ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہمارا پیکنگ شروع کر دو۔"

کٹو اور فضل مسیح نے ایک لمحے کے لیے ان دونوں اجنبی سی گوری عورتوں کو تکا اور اچانک پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگے۔

کٹو نے ناک سڑکتے ہوئے مضبوطی سے جواب دیا "مس صاحب' کینی ہمارا پیٹ کا اولاد ہے۔ ہم اسے نہیں جانے دے گا۔ ہمارا بھائی بھی اس کی صورت دیکھ کر جیتا ہے۔ مس صاحب' ہم نے شادی نہیں بنایا کہ سوتیلا باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔"

"خاموش!" بڑھیا نے چلا کر کہا "تم اپنی اوکات میں بھول رہا ہے' کٹو۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کینی تمہارا اولاد ہے؟ تمہارا یہ مجال کہ تم اتنا بڑا بات بولو!"

کٹو گم سم رہ گئی۔ مس صاحب سے اسے یہ امید نہ تھی۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

کینی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ آسٹریلیا جانے کے لیے بے قرار تھی۔ عاقبت اندیش مس رچمنڈ سے بچپن میں بتا چکی تھیں کہ کرنل بولٹن ایک فرضی ہستی ہیں۔ کارپورل بولٹن اس کا باپ اور کٹو اس کی ماں ہے۔ مگر اس اصلیت کو پوشیدہ رکھنے ہی میں اس کی خیریت ہے۔ کینی نے' جو جمد للبقا کے اصولوں کو جبلی طور پر پہچانتی تھی' اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔

مس رچمنڈ نے ذرا سمجھانے کے انداز میں کہا "کٹو' تم ایک دم پاگل ہائے۔ تم سوچنا مانگتا۔ ادھر ہمارا ڈیتھ کے بعد کینی کا فیوچر کیا ہوگا؟ مسوری میں تھوڑا نیٹو لوگ اب بھی جانتا کہ وہ تمہارا چھوکری ہے۔ اگر یہ بات سب کو معلوم ہو گیا تو؟ کاسٹ سسٹم والا لوگ اس سے شادی بنائے گا؟ اور کیا تم مانگے گا کہ تمہارا بیٹی ہوٹلوں میں ایک ایک کپڑا اتارنے والا ناچ کرے؟ یا تم میونسپلٹی کے جمعدار سے اس کی شادی کرے گا؟ سوچنا مانگتا ہے۔"

کٹو لاجواب رہ گئی۔

مس رچمنڈ نے گیسٹ ہاؤس ایک سندھی کے ہاتھ بیچا' جس نے فوراً لاؤنج میں سے جیزس اور میری کو اتار کر گرونانک اور شنکر پاروتی کو سجا دیا اور "رچمنڈز" کی جگہ باہر "دی نیو ہمالیہ ویجی ٹیرین ہوٹل" کا بورڈ لگا دیا۔ لیکن پرانا اسٹاف مع کٹو آیا برقرار رکھا۔ کٹو اور فضل مسیح روتے دھوتے مس رچمنڈز اور کیتھرین کو خداحافظ کہنے دہرہ دون ریلوے سٹیشن تک گئے۔ ٹرین چلی دی۔ فضل مسیح کنٹوپ اور بھورا دگلہ پہنے خالی پلیٹ فارم پر کھڑا حسب عادت خلا کو تکتا رہا۔

سڈنی ائیرپورٹ پر اتر کر مس رچمنڈ نے چاروں طرف دیکھا اور مسکرائیں۔ وہ بالآخر ایک "سفید ملک" میں موجود تھیں۔ (گو وہ نجیب الطرفین انگریز تھیں' مگر پیدا گورکھ پور میں ہوئی تھیں اور صرف ایک بار' چند ماہ کے لیے انگلستان گئی تھیں) اب وہ اور کینی منتظر رہیں کہ قلی آکر ان کا اسباب اٹھائیں گے۔ مگر کسی نے ان کا نوٹس نہ لیا۔ آخر دوسروں کی دیکھا دیکھی کیتھرین نے ایک ٹھیلے پر سامان لادا۔ جب مس رچمنڈ نے ٹھیلہ دھکیلنا شروع کیا تو اچانک ان کا دل اندر سے ٹوٹ سا گیا۔

ریورنڈ سگمور برآمدے میں منتظر تھے۔ وہ انہیں اپنے گھر لے گئے۔ مس رچمنڈ کو اپنے گرجا کے متصل بازار میں پھل اور سبزی ترکاری کی ایک مختصر سی دکان مع فلیٹ خریدوا دی۔ دوسرے ہفتے سے مس رچمنڈ دکان پر ترازو کے پاس بیٹھنے لگیں۔ وہ سڈنی کی ورکنگ کلاس میں شامل ہو چکی تھیں۔

کیتھرین سکول میں داخل کر دی گئی۔ بہت جلد اس نے پر پرزے نکالے "ڈیٹ" کرنے لگی۔ رات کو دیر

سے گھر لوٹتی۔ وکٹورین اور ہندوستانی اخلاقیات کی پروردہ مس سیلیا رچمنڈ اس کو ڈانٹتیں۔ دونوں میں خوب جھائیں جھائیں ہوتی۔ دونوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ ایک پینسٹھ سالہ اپنی جگہ سے اکھڑی ہوئی مجرد انگریز مڈل کلاس عورت اور ایک پندرہ سالہ دوغلی لڑکی جس کا کوئی بھی واضح پس منظر نہ تھا۔ نقلی پھوپھی بھتیجی کا بہت ہی غمناک جوڑا تھا۔

مس رچمنڈ سڈنی کی جلاوطنی اور تنہائی زیادہ نہ جھیل پائیں۔ کیتھرین سترہ برس کی تھی جب وہ چل بسیں۔ بدقسمتی سے اس کے نیک دل گارجین ریورنڈ سگمور بھی کچھ عرصے بعد فوت ہو گئے۔ سکول چھوڑ کر کیتھرین اپنی دکان پر بیٹھنے لگی۔ قانونی طور پر بالغ ہوتے ہی کھل کھیلی۔ اس کے لفنگے یار دوست اس کا روپیہ اڑانے لگے۔ دکان بک گئی۔ مس رچمنڈ کبھی کبھار کٹو کو اس کی خیریت لکھ بھیجا کرتی تھیں۔ کینی نے کبھی بھولے سے اپنی ماں کو خط نہیں لکھا۔

وہ بے حد حسین تھی اور ایکٹریس بننا چاہتی تھی۔ مگر آسٹریلیا میں نہ باقاعدہ اسٹیج تھا' نہ سینما انڈسٹری' ایک لفنگے نے صلاح دی کہ ہالی وڈ پہنچے' یا لندن کے شو بزنس میں شامل ہونے کی پہلی سیڑھی نائٹ کلب ہیں۔ چنانچہ کیتھرین نے کیبرے ناچنا سیکھا۔ اس دوران میں وہ اپنے ترکے کا سارا روپیہ تمام کرچکی تھی۔

اسی طرح آوارہ گردی کرتی وہ ہانگ کانگ' سنگاپور' کوالالمپور کے نائٹ کلب سرکٹ میں پہنچ گئی۔ کہیں وہ کیبرے ناچی' کہیں نائٹ کلب ہوسٹس بنی لیکن یہاں ترچھی آنکھوں والی اینگلو چائنیز چھوکریوں کا کمپی ٹیشن بہت سخت تھا۔ اور پھر وہ پیشہ ور طوائف نہیں تھی۔ بہرحال "کرنل آرتھر بولٹن" کی بیٹی تھی۔ اس فرضی کرنل نے اسے قدم قدم پر وقار سے چلتے رہنا سکھایا۔ کبھی کبھار اسے اپنی سخت گیر فرضی پھوپھی سیلیا رچمنڈ یاد آ جاتیں۔ کبھی ماں اور ماموں اس کے سامنے آکھڑے ہوتے۔ وہ آنسو پونچھ کر دوسرا سگریٹ سلگالیتی اور اپنی زندگی کے انقلابات پر متحیر رہتی۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے نائٹ کلب سرکٹ نے اسے عاقل اور افسردہ دل بنا دیا۔ کرپٹ سیاستدانوں اور ان کے عیاش بیٹوں کی سٹیج پارٹیوں میں ناچ کر وہ جہان سوئم (تھرڈ ورلڈ) کے سیاسی اور اخلاقی حالات سے باخبر ہو چکی تھی اور ہر ملک اور ہر شہر کے ہوٹلوں کے کمروں میں سرہانے ایک ہی بائبل رکھی ملتی اور اس بائبل کا کوئی فائدہ اسے نظر نہ آیا تھا۔ چینی ریستورانوں کے عقبی کمروں میں بیٹھی' اگربتیوں کے مرغولوں میں گھری پراسرار چینی بڑھیاں جو قسمت کا حال بتاتی تھیں' کوئی گتھی اس کے لیے نہ سلجھا سکیں۔

جکارتا کے ایک چینی ریستوران میں اسے ایک دل کش سا ڈچ آدمی ملا۔ وہ وگ لگاتا تھا اور اس نے سوٹ پر ایک چوغہ سا پہن رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک ڈچ صوفی ہے۔ مرشد عنایت خان کے بیٹے کا مرید۔ "میں انڈونیشین صوفی ازم کے اسرار سیکھنے ایمسٹرڈیم سے آیا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو Dutch Sensitives کہلاتے ہیں۔ ہماری چھٹی حس بہت زیادہ بیدار ہوتی ہے۔"

چوپ سوئی کھاتے کھاتے اچانک اس نے کہا "تمہارا باپ زندہ ہے۔"

وہ چونک پڑی۔

"وہ ایک روز ضرور تم کو ملے گا۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔" ڈچ صوفی نے کہا۔

"واقعی؟ بڑا آدمی کس طرح؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مگر وہ بہت اونچا آدمی ہے۔"

اس کا مطلب ہے وہ واقعی کرنل تھا اور اب برٹش آرمی میں جنرل بن چکا ہوگا۔ یہ سوچ کر کینی بے

حد مسرور ہوئی۔ اس کے آدھے دکھ دور ہو گئے۔ اس نے خود کو بہت محفوظ محسوس کیا۔

اس ڈچ صوفی کی موجودگی نے بھی اسے بہت سکون بخشا۔ اسی صوفی ازم اور .E.S.P اور احساس تحفظ کے چکر میں وہ اس دل کش آدمی کے ساتھ ایک جمعہ کو جکارتا کی ایک مسجد میں پہنچ گئی۔ پتلی چگی داڑھی اور چندھی آنکھوں والے ایک انڈونیشین مولوی نے اسے کلمہ رٹایا۔ اس کا نام حلیمہ دتی رکھا اور اس دلندیزی مسلمان محمد معین کوٹ سے نکاح پڑھا دیا۔ اس نے رجسٹر پر اپنا نام لکھا دیکھا اور اسے بڑی طمانیت ہوئی۔ "کیتھرین حلیمہ دتی بنت کرنل آرتھر بولٹن۔" (جن کے بارے میں محمد معین کوٹ کا کہنا تھا کہ زندہ ہیں، مرحوم نہیں ہوئے۔)

وہ ڈچ نومسلم بڑا پکا مومن تھا اس نے حلیمہ دتی کا ناچنا گانا بند کرا دیا۔ لیکن جکارتا کے جس ہوٹل میں وہ کیبرے کرتی تھی اگر آپ وہاں ناچتے نہیں تو قیام و طعام کے سارے بل ادا کیجئے۔ چونکہ محمد معین کوٹ کے منی آرڈر ایمسٹرڈیم سے آنے میں ذرا تاخیر تھی، لہٰذا کیتھرین کوٹ نے ایک بار پھر اپنا جمع جتھا خرچنا شروع کیا۔

کوئی پندرہ روز بعد ایک صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ ڈچ صوفی غائب تھا۔ اس کی ہیرے کی انگوٹھیاں اور سچے موتیوں کی مالا اور بندے جو اسے آنٹ سیلیا کے ترکے میں ملے تھے، وہ بھی غائب تھے۔ اور باقی ماندہ نقدی بھی۔ سرہانے میز پر ہوٹل کی موٹی بائیبل البتہ اسی طرح رکھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر پلاسٹک کا ایک خالی کپ

گذشتہ شب ہی اس ادب نواز اور روحانی ولندیزی نے باتوں باتوں میں کسی امریکن افسانہ نگار کا ایک جملہ دہرایا تھا کہ تم ساری دنیا گھوم لو۔ آخر تمہیں پتہ چلے گا کہ دنیا محض "Holiday Inns" اور پلاسٹک کے پیالوں سے بھری ہوئی ہے (The World is Full of Holiday Inns and Plastic Cups) اور گھر واپس جانا ضروری ہے۔

چنانچہ کیتھرین کوٹ بھی کسی نہ کسی طرح دھکے کھاتی جکارتا سے اپنے گھر سڈنی واپس پہنچی۔ عمر ڈھل رہی تھی اور حسن زائل ہونے والا تھا۔ یہاں اسے اب بس کنڈکٹر کی ملازمت ہی مل سکی۔

جھد للبقا کی خاصیت یہی ہے کہ انسان کبھی ہار نہیں مانتا۔ چنانچہ ٹکٹ کاٹتے کاٹتے وہ اب بھی دن کے خواب دیکھا کرتی۔ اگلے بس سٹاپ پر شاید کوئی سپنوں کا شہزادہ موجود ہو، کیونکہ کیا پتہ اس کہرے کے پیچھے کیا ہے۔

راجہ سریندر ناتھ بہادر کے جد امجد ایک غریب برہمن جوتشی تھے، جن کی کسی پیش گوئی سے خوش ہو کر شہنشاہ جہاں گیر نے کالندی کے کنارے جاگیر انہیں بخش دی تھی۔ موجودہ راجہ صاحب نئی دہلی میں رہتے تھے۔ ایک بڑا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ان کے فرزند اکبر (جو پہلے یوراج شلیندر ناتھ جی کہلاتے اور اب محض مسٹر ایس این، باجپئی تھے) جاپان، سنگاپور، آسٹریلیا کے دورے پر نکلے تھے۔ یوراج ذرا بھولے سے آدمی تھے۔ اب پہلی بار "فارن" آنے کا اتفاق ہوا تھا لہٰذا آسٹریلیا میں مبہوت تھے۔

کرسمس سیزن کی وجہ سے سڈنی میں بڑی چہل پہل تھی۔ اس روز ایسا ہوا کہ اوپیرا ہاؤس کی طرف سے چلے تو یاد آیا آسٹریلیا، انڈیا کا میچ جاری ہے۔ ایک راہ گیر سے راستہ پوچھ کر اسٹیڈیم جانے والی بس پر چڑھ گئے اور کھڑکی کے پاس جا بیٹھے بس میں بھانت بھانت کی صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ حسین لبنانی لڑکیاں، اطالوی مہاجر، گول چہرے والے آسٹریلین۔ بس کنڈکٹر نے ٹکٹ کے لیے نازک گورا سا ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں چکا چوند، جگمگاتا چہرہ، چودھویں کا چاند، اتنا حسن بھی ممکن ہے؟ وہ پری جمال بھی ایک ہندوستانی کو دیکھ کر

ذرا احساس یگانگت سے مسکرائی۔
راج کمار نے سن رکھا تھا۔ گوری میم ہنسی تو پھنسی۔ اب ذرا بے خوفی سے اس سے آنکھیں چار کیں۔ ہزار جان سے عاشق ہوئے۔
جو بندے پہلی بار گوروں کے دیس جاتے ہیں' اگر وہ پہلے چھ ماہ کے اندر اندر کسی میم سے بیاہ نہ کریں تو سمجھو بچ گئے۔ ورنہ نہیں۔ راج کمال شیلندر کو تو آسٹریلیا آئے محض دس دن ہوئے تھے۔
بس کنڈکٹر ٹکٹ دے کر اسی طرح مسکراتی ہوئی آگے چلی گئی۔ پھر اس نے ان کا نوٹس نہ لیا مگر راج کمار مستقل مزاج آدمی تھے۔ دوسرے روز پھر اسی وقت اسی بس پر چڑھے چار روز کے تعاقب کے بعد کامیاب رہے۔ تعارف کرایا۔ پرنس شیلندر آف انڈیا۔
لفظ "پرنس" سے پری جمال متاثر نظر آئی' کہ بچپن میں مسوری میں راج کماروں اور نواب زادوں کو دیکھ چکی تھی اور اگر سڈنی کی ایک بس میں ایک بندہ خود کو انڈین پرنس کی حیثیت سے متعارف کرائے تو وہ جہاں دیدہ سابق رقاصہ یہ بھی پہچان سکتی تھی کہ وہ نقلی راج کمار نہیں۔
پری شیشے میں اترنے لگی۔ شام کے لیے اپائنٹمنٹ۔ شمعوں کی روشنی میں ڈنر۔ رقص۔ اتوار کو ساحل پر چہل قدمی۔ اعلیٰ خاندان برطانوی لڑکی۔ کرنل کی بیٹی۔ لارڈ کی نواسی' ہم پلہ جوڑا تھا۔
ہمارے نواب راجہ لوگوں کا وطیرہ تھا کہ کم از کم ایک جونیئر بیگم یا جونیئر رانی یورپین رکھتے تھے۔ (عموماً وہ لندن بارمیڈز ہی ہوتی تھیں) پرنتو اب سوتنتر بھارت کے مکھیہ سماچار یہ تھے کہ رجواڑے سماپت' رنواس گپت اور ہندو جاتی پر کیول ایک واہ کا قانون لاگو۔
اس کے باوجود آزاد ہندوستان میں بھی انگریزی یا امریکن لڑکی سے بیاہ کرنے میں جو سربلندی مضمر تھی' شیلندر جی اس سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی پہلی بیوی کا دیہانت ہو چکا تھا۔ اور جب انہوں نے کیتھرین کوٹ کو پروپوز کیا تو اس حور ارضی نے ان کی درخواست ایک ادائے دل بری سے مسکرا کر منظور کی۔
جکارتا کی مسجد میں اس کا نکاح پڑھایا گیا تھا' یہ بتانے کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ سڈنی کے ایک آشرم میں پھیرے ہوئے۔ شیلجا دیوی نیا نام "شیلندر کی مناسبت سے۔" بنگالی سوامی نے مسکرا کر سمجھایا۔
"اکھنڈ سو بھاگیہ وتی۔ رجیہ لکشمی یورانی شیلجا دیوی جی بدھائی ہو۔" اس کے کند ذہن سے نئے شوہر نے (جو قد میں اس سے بہت چھوٹا تھا) باچھیں کھلا کر اس سے مصافحہ کیا۔ شادی کے رجسٹر پر اس کے باپ کا نام لکھا گیا۔ کرنل آرتھر بولٹن۔
کارپورل آرتھر میرٹھ چھاؤنی سے سیدھا برلن گیا تھا۔ چند روز بعد ہی جنگ ختم ہوئی اور وہ اپنے فوجی بینڈ کے ساتھ انگلستان میں جگہ جگہ فتح کے شادیانے بجاتا پھرا۔ پھر اسے اس عارضی فوجی ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔
آرتھر بولٹن کا باپ جو پکیڈلی سرکس میں بوٹ پالش کرتا تھا' بمباری میں مر چکا تھا۔ آرتھر کو ایسٹ اینڈ کے ایک ڈانس ہال میں ڈرم بجانے کا کام مل گیا۔ شادی نہیں کی۔ کون یہ بکھیڑا پالتا بوڑھا ہو گیا۔ لقوے نے ایک ہاتھ معذور کر دیا تو دربانی کرنے لگا۔ اب بھی پوئیٹری لکھتا۔ پابندی سے چرچ جاتا' جو عموماً اسے خالی ڈھنڈار ملتے۔ اردواں ہونے کی وجہ سے پاکستانی' ہندوستانی مزدوروں سے خوب پٹتی۔ ایک بار چوکیدار ہی نے اسے پنجابی ملک التجار مسٹر کھوسلہ کی دکان پر دربان کا کام دلوا دیا۔ یہ عالیشان شوروم نائیٹس برج میں تھا۔ سب لوگ اس نرم

مزاج پیارے سنکی سے بوڑھے سے بہت خوش تھے۔

اس روز صبح کو شو روم پہنچ کر اس نے ہال کی جھاڑ پونچھ کی۔ پھر گاہکوں کے لیے میز پر پڑے رسالوں کو ترتیب سے رکھا۔ اس وقت بمبئی سے شائع ہونے والے ایک زنانہ انگریزی میگزین کے سرورق پر چھپے رنگین پورٹریٹ نے اسے متوجہ کیا رسالے کے اندر اس حسینہ کے بارے میں باتصویر مضمون بسلسلہ انٹیریر ڈیکوریشن' حسینہ نئی دہلی میں رہتی تھی۔

آرتھر بولٹن صوفے پر بیٹھ گیا اور جیب سے عینک نکال کر مضمون پڑھنے لگا۔ "یورانی شیلجا دیوی جی نسلاً انگریز ہیں اور برطانوی ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے والد کرنل آرتھر بولٹن پچھلی جنگ عظیم میں لاپتہ ہو گئے تھے اور ان کے نانا ایک آیریش لارڈ تھے۔ راج کماری جی کا بچپن مسوری میں گزرا۔ پھر وہ اپنی پھوپی لیڈی رچمنڈ کے پاس آسٹریلیا چلی گئیں جہاں انہوں نے بیلے اور پیانو اور انٹیریر ڈیکوریشن کی مہارت حاصل کی۔۔۔۔"

بڈھے آرتھر نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک ششدر' ساکت و صامت بیٹھا رہا۔

دوسرے روز اس نے دکان کے **مینجر** سے ایک ماہ کی چھٹی مانگی' جو منظور ہوئی۔

بینک سے ساری عمر کی جمع پونجی نکال کر ہوائی جہاز کا ریٹرن ٹکٹ لیا۔ باقی ماندہ رقم سے تحائف خریدتا پھرا۔

بھاری شاپنگ بیگ اپنے سالم ہاتھ میں اٹھائے پیدل چلتا چلتا تھک جاتا تو کسی دروازے میں بیٹھ کر ستا لیتا اور پھر چلنا شروع کر دیتا۔ اس طرح ٹرانسپورٹ کے جو پیسے بچائے' ان سے داماد کے لیے بڑھیا نائیاں بھی خرید لیں۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ رچمنڈز گیسٹ ہاؤس کے پتے پر کٹو کو اس کا خط مل جائے گا۔

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ "دی نیو ہمالیہ ویجی ٹیرین ہوٹل اینڈ ڈسکو تھیک" کے سامنے کھڑا تھا۔ بورڈ پر "اینڈ ڈسکو تھیک" کا حال ہی میں اضافہ کیا گیا تھا۔

کٹو آیا نے اسے سمجھایا "صاحب' ہمارا چھوکری انڈیا واپس آ گیا۔ ہم کو ایک لیٹر نہیں ڈالا اور بیاہ کر لیا۔ اس کا کیا مطبل ہے؟ یہ مطبل ہے کہ وہ ہم سے مل کر اپنی نئی لائف میں کوئی گڑبڑی نہیں ڈالنا مانگتا۔"

وہ شاگرد پیشے کے آگے ایک پتھر پر بیٹھی اپنے سر میں سرسوں کا تیل ڈال رہی تھی۔ فضل مسیح نزدیک ایک پائن کے نیچے اسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ سامنے وادیاں اودے کہرے سے بھر گئی تھیں۔

بڈھے آرتھر نے اپنے سالم ہاتھ سے پائپ سلگایا اور متعجب ہوا کہ یہ جاہل' غریب اور دکھی عورت کس قدر شانت ہے۔"

"کٹو' تم کو ذرا غصہ نہیں؟" اس نے متحیر آواز میں دہرایا۔

"گسہ کون بات کا' صاحب؟ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا' ہم نے چھٹی ماں کا لکھا پورا کیا۔"

"چھٹی ماں؟ وہ کون لیڈی ہے؟"

"بمبئی کا ایک بوہری میم صاحب ادھر آیا تھا۔ ہمارا کہانی سن کر بولا "کٹو بائی جب بچہ پیدا ہوتا ہے' اس کے چھٹے روز چھٹی ماں آ کر اس کا مقدر اس کے ماتھے پر لکھ جاتی ہے۔ ادھر ہم لوگ اس کو کرم کے پھن بولتے ہیں۔"

آرتھر غور سے سنتا رہا۔ ابرو اٹھا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور ہنس پڑا۔

"ہمارا کینی بابا کے ماتھے پر اسی سرونٹ کوارٹر کی اس سامنے والی کوٹھری میں چھٹی ماں رات کو آکر لکھ گئی تھی کہ وہ رانی بنے گی۔ ہماری بات مان لو' صاحب۔ اس سے ملنے مت جاؤ۔"

"کیوں؟"

"بس' ہم جو تم کو بولتا ہے۔"

"نہیں' کنو' چھٹی ماں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ہم اور تم اس سے ملنے دلی جائے گا۔ دیکھو' ہم اس کے لیے ولایت سے کتنے پریزنٹ بھی لایا ہے۔"

قریب پتھر پر بیٹھ کر آرتھر نے بڑے چاؤ سے لندن کے وہ شاپنگ بیگ کھولے۔

○

سرخ کھپریل کی چھت والی عالیشان سہ منزلہ سفید کوٹھی کے سامنے مختصر سا لان تھا' اور پھاٹک کے عین مقابل میں چند قدم کے فاصلے پر اس بیڈ روم کا دریچہ جس کی تصویر بسلسلۂ انٹیریر ڈیکوریشن زنانہ رسالے میں چھپی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ گلابی جاڑوں کی سہانی صبح۔ راجہ صاحب نے ایک معروف سوامی جی کو بریک فاسٹ پر بلایا تھا اور اب لان پر ان کی تقریر سننے میں محو تھے۔ (سوامی جی اپنے فرنگی چیلوں کے ساتھ موریہ میں قیام پذیر تھے) اس وقت راجہ صاحب کے علاوہ ان کے چار فرنچ چیلے اور چیلیاں اور راجہ صاحب کا چھوٹا لڑکا بھی ان کے سامعین میں شامل تھے۔ سوامی جی ست' چت اور آنند پر بھاشن دے رہے تھے' جب ایک ٹیکسی پھاٹک پر آکر رکی اور سلفریجز کے بیگ اٹھائے ایک ذرا پینچر سا انگریز' معمولی ساڑی پہنے ایک دیسی عورت اور وگلہ اور کنٹوپ پہنے بھوری داڑھی والا ایک باؤلا سا آدمی اندر داخل ہوئے۔ کنٹوپ والا ٹھٹھک کر پھاٹک کے پاس ہی دبک گیا۔ انگریز نے سہمتی جھجکتی عورت کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ لان کی طرف بڑھا۔

راجہ سرنریندر ناتھ جی نے سر اٹھا کر کوفت اور تعجب سے نواردوں پر نظر ڈالی۔ گورکھے دربانوں نے ان اناپ شناپ قسم کے لوگوں کو اندر کیسے آنے دیا؟ غالباً" یہ Jehovah's Witnesses تھے۔ بے ضرر خبطی' جو اتوار کے روز صبح صبح بھلے مانسوں کے گھروں پر نازل ہو کر انہیں خبردار کرتے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ یہ لوگ بہت بور کرتے ہیں۔

جب سوامی جی چاندی کی کٹوری میں پانی نوش جان کرنے کے لیے رکے تو سفید فرنچ کرسیوں کے نزدیک پہنچ کر بڈھا انگریز بشاشت سے بولا "گڈ مورننگ لیڈیز اینڈ جینٹل مین!"

حاضرین خاموش رہے۔ سوامی جی کو اپنے بھاشن میں مداخلت ناگوار گزری۔ وہ چیں بہ جبیں ہو کر چمپا کا پھول سونگھنے لگے۔ نووارد جوڑا چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ آخر راجہ صاحب نے ابرو سے اشارہ کیا۔ بیٹھ جاؤ۔ دونوں بیٹھ گئے۔

"سوامی جی' آرمبھ کیجئے۔" راجہ صاحب نے جو سادھوں سنتوں کے بے حد معتقد تھے' درخواست کی۔

سوامی جی نے ست اور است پر بھاشن پھر شروع کیا۔ بڈھا آرتھر سر آگے بڑھا کر دھیان سے سننے لگا۔

سوامی چند منٹ بعد رکے۔ ایک فرنچ چیلی نے کیسٹ ریکارڈ کا ٹیپ تبدیل کیا۔ تب بڈھے انگریز نے ان کو مخاطب کیا "مسٹر گرو' ست اور است پر آپ کے وچاروں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں بھی ایک سمسیہ پر پرکاش ڈالنے انگلستان سے یہاں آیا ہوں۔ یور ہائی نس' میں آپ کی پیاری بہو کیتھرین---" اس نے جیب سے تصویر کا تراشہ

نکال کر نام پڑھا "راجیہ لکشمی شیلجا دیوی جی کا باپ ہوں۔"

"اوہو' واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز' کرنل!" راجہ نے گرم جوشی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "کرنل بولٹن! آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"یور ہائی نس۔" بڈھے آرتھر نے گلا صاف کر کے چاروں طرف دیکھا اور فرشتوں والے تبسم کے ساتھ بولا "کرنل تو میرے خاندان میں سات پشت میں کوئی نہیں ہوا۔ میرا باپ موچی تھا ماں باورچن۔ میں آرمی میں ڈرمر بھرتی ہوا تھا۔ اب دربان ہوں۔"

حاضرین برف کی طرح منجمد ہو چکے تھے۔ چند لمحوں بعد آرتھر نے چاروں طرف دیکھ کر تاسف سے سرہلایا "میرے ساتھ ساری عمر یہی مسئلہ رہا ہے کہ میں سچ بولتا ہوں۔ لیکن یہاں جب میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر سوامی بھی سچ کی الوہیت ہی کا درس دے رہے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی خرچ کر کے یہاں پہنچا ہوں' اپنی لڑکی سے ملنے اور اس کے لیے بطور اس کے جہیز کے کچھ چیزیں بھی لایا ہوں۔" اس نے جھک کر گھاس پر دھرے بیگ اٹھائے پھر رکھ دیئے۔

مجمع اسی طرح منجمد رہا۔

آرتھر نے پھر بات شروع کی۔ "کیتھرین یقیناً اپنی ماں سے مل کر بھی خوش ہو گی' جس سے وہ تیرہ سال کی عمر سے جدا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ کٹو دم بخود اس کو تک رہی تھی۔۔۔۔ ماحول اچانک بے حد غیر حقیقی ہو گیا تھا۔ زندگی میں اس طرح کے واقعات نہیں ہوتے۔ آرتھر نے پھر بات شروع کی۔

"یہ بے وقوف عورت یہاں آتے ڈر رہی تھی۔ میں نے کہا مارتھا' روشنی سے خائف ہو؟ سچ کے معانی کی روشنی سے مت ڈرو۔ ہم سب خدا کے بچے ہیں۔ کیا تم اپنی پیاری بچی سے ملنے کے لیے بے تاب نہیں؟ تو آؤ ہم دلی چلیں اور اپنی لڑکی سے ملیں۔ کیا کوئی ماں باپ اور ان کی اولاد ایک دوسرے سے ملتے ہوئے جھجھک سکتے ہیں؟ قانون قدرت کے خلاف جا سکتے ہیں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اور یور ہائی نس' آپ کی مائیتھولوجی میں ہے کہ لارڈ شیوا جب اپنی سسرال پہنچے تو ان کے مغرور سسر نے ان کی بے عزتی کی۔" وہ ٹھٹکا' کھنکارا اور سوچ کر بولا "معاف کیجئے' میں نے غلط مثال دی۔ مطلب یہ کہ۔۔۔"

"یہ بڈھا قطعی دیوانہ ہے۔" راجہ صاحب نے سوچا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس عجیب و غریب خوفناک اجنبی کو تکے جا رہے تھے۔ ان کے بارعب چہرے کی رنگت تیزی سے بدل رہی تھی۔ مگر آرتھر بولٹن نے نہایت اطمینان سے اپنی تقریر جاری رکھی "تو مطلب یہ راجہ بہادر کہ ابھی جب میں آپ کے پھاٹک پر پہنچا تو سوچا' شاید آپ بھی بد دماغ ہوں گے اور عام امیر' طاقتور آدمیوں کی طرح منافقت اور مصلحت پسندی کو جائز سمجھتے ہوں گے۔ مگر یہاں نظر آیا کہ دھرم کرم پر گفتگو جاری ہے' ستیہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ خدا ستیہ ہے۔ حق' ٹروتھ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ منش کو ہمیشہ سچ بولنا چاہئے۔ اور سچ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھنی چاہئے۔ یہی اصل سدھانت اور گیان ہے۔ تو جناب والا آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میرا نجات دہندہ جیزس کرائسٹ بھی یہی کہہ گیا ہے وہ تو سچ بولتے بولتے سولی پر چڑھ گیا تھا۔ مشہور واقعہ ہے۔"

چھوٹے راج کمار نے محسوس کیا کہ راجہ صاحب کا پارہ تیزی سے اوپر چڑھ رہا ہے اور وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ اس نے موقع سنبھالنے کے لیے فوراً پوچھا "آپ لوگ کافی پئیں گے؟"

بڈھے نے مسکرا کر اسے دیکھا "مارتھا" کافی؟"

سوامی جی اٹھ کر چمپا کے سائے میں ٹہل رہے تھے۔ چھوٹے راج کمار نے کافی بنا کر کٹو آپا کو پیش کی۔ آرتھر بڑے جوش سے اردو میں بولا "شاباش ہم بوہٹ خوش ہوا کہ آپ لوگ چھوت چھات بھی نہیں کرتا ہائے' ہم سب ایک خدا باپ کا بچہ لوگ ہائے۔ جینزس بولا کہ اس کے فادر کا منیشن میں سب کے لیے کمرہ ہے۔ یورہائی نس! آسمانی باپ سب کو پالتا' پیار کرتا ہے یہ دیکھو' ہمارا لڑکی کی ماں کا ہم سے میرج بھی نہیں ہوا۔ ہم کو مالوم بھی نہیں تھا کہ مارتھا نے کیتھرین کو جنم دیا۔ مگر آسمانی باپ نے اس کو پال کر بڑا کر دیا۔ ہم نے میگزین میں اس کا تصویر دیکھا پورے چھتیس برس کے بعد! مارتھا بڑا بہادر عورت ہائے۔ اب تک آیا گیری کرتا مسوری میں۔ بوہٹ نیک عورت ہائے۔ سچا کرسچئن۔ اس کا ماں باپ بھی سچا کرسچین تھا۔ وہ بھی بہت غریب تھا۔ جھاڑو دیتا تھا۔ گوسل کھانہ صاف کرتا تھا جینزس بولا: گریب مسکین لوگ ہی آسمانی بادشاہت کا مالک ہے۔ آپ کا مسٹر گاندھی بھی ایسا ہی بولتا تھا۔ بونگی کالونی میں رہتا تھا۔ ہمارا مارتھا کٹو بھی بونگی ہے۔ ایک دم سیدھا آسمانی بادشاہت میں جائے گا۔"

راجہ صاحب نے' جو ٹکٹکی باندھے آرتھر بولٹن کو گھور رہے تھے' اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور زور سے چیخے۔ ساری زندگی راجہ صاحب کو کسی نے اتنے زور سے دہاڑتے نہیں سنا تھا۔ ان کی اس خوفناک چیخ سے دہل کر سب ان کی طرف لپکے۔ راجہ صاحب نے چکرا کر سر جھکا لیا۔ ان کو غش آ رہا تھا۔ وہ دل کے مریض تھے۔

کیتھرین اس وقت بیڈ روم کے دریچے سے سارا منظر دیکھ رہی تھی' جو اس جگہ سے اسٹیج کے سیٹ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ زندگی ناقابل یقین تھی۔ صبح کو بریک فاسٹ کی میز پر جب اس کا تعارف سوامی جی سے کرایا گیا تھا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔ سوامی جی وہی مسوری سکول کے ہندی سنسکرت ٹیچر تھے جن کی دست درازی کی وجہ سے مس رچمنڈ نے آسٹریلیا ہجرت کرنے کا فوری فیصلہ کیا تھا۔ آسٹریلیا روانگی سے قبل ہی معلوم ہوا تھا کہ یہ مہاشے سکول کا روپیہ غبن کر کے ایک پہاڑی لڑکی سمیت چمپت ہو گئے۔ تب بھی نہایت تیز و طرار چرب زبان آدمی تھے۔ بہت ترقی کی۔

اس وقت بریک فاسٹ کے بعد انہوں نے چپکے سے اپنی سابق شاگرد سے کہا "دیکھو جی چھوٹی کنو' میں نے بڑی محنت اور بیس سال کی سادھنا سے اپنا یہ کیریئر بنایا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں میرے اٹھارہ آشرم کھل چکے ہیں' ہزاروں چیلے بن گئے ہیں۔ تم میرا بھانڈا نہ پھوڑو۔ میں تمہارے بارے میں اس برہمن رائل فیملی کو نہ بتاؤں گا کہ مہترانی کی لڑکی ہو۔ باپ نامعلوم۔" ان کی یہ سرگوشی سنتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ آ کر اپنے کمرے میں چھپ گئی تھی۔ مسکراتے ہوئے سوامی جی نے باہر جا کر اپنا بھاشن شروع کر دیا تھا۔ لیکن ہونی اپنی بنسی بجا چکی تھی۔ ٹیکسی آ کر رکی اور اس نے اپنی ماں کو اترتے دیکھا اور اس کا باؤلا ماموں۔ اور ایک سنکی سا انگریز بوڑھا۔ وہ جا کر لان پر بیٹھ گئے اور کیتھرین نے اپنے اس ناقابل یقین باپ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا۔

مس سیلیا رچمنڈ مرحومہ کو ایک مرتبہ گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ایک دہلوی بیگم صاحبہ نے "باؤلی ہنڈیا" پکانی سکھائی تھی۔

زندگی بھی دیوانی ہانڈی تھی جو کھدبد پکے جا رہی تھی اور اب اچانک اس میں ابال آ گیا تھا۔ دہشت سے لرز کر اس نے سامنے دیکھا' پھاٹک پر اس کا پاگل ماموں تھم کی طرح استادہ خلا کو گھور رہا تھا۔ سبزے پر اس کا

دیوانہ باپ اس کی زندگی تباہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس شخص سے ملنے کی وہ ہمیشہ سے کتنی آرزومند رہی تھی۔ بچپن سے اس کی ماں اور آنٹ سیلیا نے اس شخص کی نیک دلی اور بھولپن کے کتنے قصے سنائے تھے جو محض تین ماہ گیسٹ ہاؤس میں قیام کر کے سب کے من موہ کے چلا گیا تھا۔ شاید اسے قدرت نے مامور کیا تھا کہ اچانک غیب سے ظہور پذیر ہو' زندگیوں کے رخ بدلے اور غائب ہو جائے۔ ناقابل یقین' ناممکن اور کیا حق گوئی دراصل تباہ کن ہوتی ہے؟

اس نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے "اسٹیج" کو دیکھا' جو ایک کومک اوپیرا کا منظر معلوم ہو سکتا تھا' اگر اتنا بھیانک نہ ہوتا۔ برہمن راجہ صاحب جن کو اس انکشاف پر کہ ان کی بہو بھنگن کی اولاد ہے' فوراً غش آ گیا تھا۔ وہ چار یورپین جو مہا ٹھگنی مایا سے بچنے کے چکر میں ایک ٹھگ سوامی کے پالے پڑ گئے تھے' اور وہ بنگلہ بھگت جو راجہ صاحب کو پنکھا جھل رہا تھا اور اس کی بے چاری ماں جو ساری عمر روتی رہی تھی اور اب بھی رونے کے سوا اس کے بس میں کچھ نہ تھا اور اس کا باپ غریب خستہ حال۔ ایک ہاتھ سے معذور' جو جانے کس طرح پیسے اکٹھے کر کے اس کا "جہیز" لے کر سات سمندر پار سے آیا تھا اور اب ہکا بکا سب کے چہرے تک رہا تھا۔

کیتھرین کے دل میں رحم اور محبت اور خون کے جوش کا ایک ریلا سا آیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگتی ہوئی باہر جائے اور اپنے جھکی سڑی باپ' مصیبت زدہ ماں اور پیارے ماموں سے لپٹ جائے۔ اس محل اور اس ارسٹوکریٹک برہمن خاندان اور دولت مند شوہر کو خیرباد کہے اور ان بے مایہ پیارے' بھولے' دیوانے لوگوں کے ساتھ چلی جائے۔ کیونکہ جہاں یہ لوگ ہوں گے وہی بالآخر اس کا گھر ہو گا' کہ دنیا Holiday Inns اور پلاسٹک کے پیالوں اور سرخ چھتوں والے Heinz اسٹائل مکانوں اور چاندی کی کٹوریوں سے بھری ہوئی ہے' اور اسے اپنا گھر اب تک نہیں ملا۔ کیا وہ سچ مچ اکھنڈ سو بھاگیہ وتی راجیہ لکشمی شیلجا دیوی جی ہے؟ وہ اپنی کھال کے اندر محض کیتھرین بولٹن ہے اور کرنل بولٹن اور کارپورل کے جس تضاد نے اسے ہمیشہ مضمحل رکھا تھا' آج بالآخر وہ بھی حل ہو چکا ہے۔

وہ باہر جا کر ڈرامائی انداز سے اعلان کرے گی۔ ڈیڈی! ماما! آ گئی! میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔

وہ ہمت کر کے دروازے کی طرف بڑھی لیکن کواڑ کھولتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے ہیرے کے کنگنوں سے ٹکرائی۔ باہر اس کی مرسیڈیز دھوپ میں چمکی اور اسے یاد آیا کہ گیارہ بجے گولف کلب پہنچنا ہے۔ کیا یہ سب پل کی پل میں غائب؟

مرمریں غسل خانے میں سے شاور کی آواز آ رہی تھی۔ پھر خیال آیا: اس خوفناک انکشاف کے بعد اس کا شوہر اسے خود ہی چلتا کر دے گا۔ اس سے بہتر ہے' باعزت طریقے سے خود ان لوگوں کے ساتھ چلی جائے۔ اسے چکر آ گیا' جیسے وہ ڈوبتے جہاز پر کھڑی تھی۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش لازمی ہے۔ جہد للبقا کا پہلا اصول۔

اس کا کم عقل شوہر ڈریسنگ گاؤن پہنے غسل خانے سے نکلا۔ "یہ باہر کیا شور ہو رہا ہے؟" اس نے دریچے کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

کیتھرین نے ایک گہری سانس بھری اور صاف' مضبوط آواز میں بولی "میرے بارے میں وہ آرٹیکل چھپنا غضب ہو گیا۔ بدمعاشوں کی ایک ٹولی آ پہنچی بلیک میل کرنے۔ خود کو میرے ماں باپ بتاتے ہیں۔ ادھر تمہارے پتا جی الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں ممکن ہے کہ برہمن ووٹ توڑنے کے لیے یہ ان کے مخالفوں کی حرکت بھی ہو۔

ایک ہریجن عورت کو سکھا پڑھا کر بھیج دیا کہ مجھے اپنی بیٹی بتائے۔ یہ انگریز بڈھا سی آئی اے ایجنٹ بھی ہو سکتا ہے، پولیس کو فون کرو فوراً۔

راج کمار شیلندر گاؤدی تھا، مگر اتنا نہیں۔ اس نے ایک ابرو اٹھا کر اپنی نازنین یوورانی کو ذرا غور سے دیکھا۔ کیتھرین کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ راج کمار شیلندر اسے اپنے راستے سے ہٹاتا دروازہ کھول کر سیدھا اپنے عالی مرتبت باپ کی طرف لپکا، جو ہوش میں آ چکے تھے۔ کیتھرین نے تیر کی طرح غسل خانے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

سامنے پھاٹک پر اس کا فاتر العقل ماموں ہاتھ پھیلائے کھڑا سب کی خیر مانگ رہا ہے۔

(اردو)

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے------"
(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں)

---------------- ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی------

گلی گلی، محلے محلے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ" "زمین میں بساؤ" اور "گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے "ملا شکور" میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابا کو اس کا سکریٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو------ لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے-----" ہتھ لائیاں کمھلانی لاجونتی دے بوٹے،-----" تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا--- جانے وہ کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہو گی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟------ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا تھا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا----- انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ

بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کراس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدود کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی------ "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی---- " صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں---- "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔ عورت جس کے قابو میں نہیں آتی---- " اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا---- " تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی" لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا۔ مگر وہ یہ بھول گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آتیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں--- ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا--- ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے---- وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انہیں وہ ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا------ انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں--- کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح---- ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے۔

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے نئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے--- او وہی منڈلی ہے۔ اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنگ مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں

گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلوؤں میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پر بھارت پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہ گین پروپیگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کے پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔ پر گنگناتا چلا جاتا ہے' اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں دنوں جبکہ مسز مردولا سارا بھائی' ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملاشکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے ------ اور وہ نعرے لگاتے رہے حتی کہ ان کے گلے سوکھ گئے ---   لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں' جن کے ماں' باپ' بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ------ سہاگ ونتی ------ سہاگ والی ------ اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ------ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے ------ اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو در اصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں' ان میں لاجو نہ تھی سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں پھر کہیں نیکی رام' محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں وکیل

کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے------

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہونچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا------ میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا----- ایسی حالت میں جبکہ وہ گربھ وتی تھی۔ "کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟" -------- نارائن باوا نے کہا-----" یہ ہے رام راج جس میں دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورتن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا-------

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!"

"چپ رہو جی" -------- "تم کون ہوتے ہو؟" ----- "خاموش!" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا----- "مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا"۔

پھر ملی جلی آوازیں آئیں------"خاموش" ---- ہم نہیں بولنے دیں گے" اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی---- " مار دیں گے "۔

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا------ "تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!"

سندر لال نے کہا---" میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا----- رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں"۔

انہیں لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے' اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے۔ "سنو' سنو' سنو------"

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹہوکا دیا اور سندر لال بولے----- "شری رام نیتا تھے ہمارے' پر یہ کیا بات ہے بابا جی' انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا' مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟"

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا--- "اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے"۔

"ہاں بابا" سندر لال بابو نے کہا------ "اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا------ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے------- اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے------ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی' جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا

سر گدھے کا؟"

آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے۔۔۔۔ سیتا۔۔۔۔ لاجونتی۔۔۔۔ اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیئے تھے اور پھر وہ سب "سندر لال بابو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیئے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا۔۔۔۔ "مہاستی سیتا زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی۔۔۔۔ "شری رام چندر۔۔۔۔"

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں۔۔۔۔ "خاموش! خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ، محرر کی چوکی کلاں جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے۔۔۔۔ اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

"ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے۔۔۔!"

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملاشکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا۔۔۔۔

"بدھائی ہو سندر لال"

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "کس بات کی بدھائی لال چند؟"

میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے"

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا۔۔۔ "کہاں دیکھا ہے؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

"واگہ کی سرحد پر"۔

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا۔ "کوئی اور ہو گی"۔

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ "نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو۔۔۔"

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا۔۔۔ "بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر۔۔۔۔"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا "تیسرا ماتھے پر" وہ نہیں چاہتا تھا۔ اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آ گئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمھلانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما

جاتی تھی--- اور گم ہو جاتی تھی' اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نا معلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو---- سندر لال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف' ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا---

"لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی"۔

لال چند نے کہا--- ہندوستان اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھانا"۔

"پھر کیا ہوا---؟" سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔"کیا ہوا پھر؟"---

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا

"سچ مچ آگئی لجونتی بھابی؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دیدیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں--- لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ' بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا--- تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو--- دیکھو--- جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی"۔

--- پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا مال واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا---

"لاجو---- لاجو بھابی----" مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا-----

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا' جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی--- اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے۔ اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں' زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا------ "پانی دے دو--" اسے یوں محسوس ہوا' بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کار فرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو' سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو---- تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر' انسانی مال' انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ' اس کے نکھار' اس کے عزیز ترین رازوں' اس کے تیندولوں کی سر عام نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں گپتی' کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب گپتی' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین' یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے

اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں۔۔۔ از بیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعتراف شکست 'ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازاربند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی' ایکدم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً" دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے' لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جبکہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی۔ اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی۔۔۔ عادتاً" محض عادتاً" ۔۔۔ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق۔ دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔۔۔۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں ۔۔۔۔ وہ موٹی ہو گئی تھی۔۔۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مرئل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے' اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا کہ شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا۔۔۔۔ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم' محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی اور صحت مند' نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے۔۔۔۔۔

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے کسی نے کہا۔۔۔ "ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت۔۔۔"

اور یہ آواز رسالو' نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت 'اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے۔۔۔۔ ان سب لوگوں اور

ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شد و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلّہ ملاشکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلاپٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی۔ سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا "دیوی"! اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں لیکن سندر لال، جو لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اونھوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا۔۔۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے "سیاہ دنوں" کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا۔۔۔

"کون تھا وہ؟"

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "جماں" ۔۔۔۔ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا۔۔۔

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا۔۔۔ "نہیں ۔۔۔ اور پھر بولی "وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ۔۔۔ اب تو نہ مارو گے؟"

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا۔۔۔ "نہیں دیوی! اب نہیں ۔۔۔ نہیں ماروں گا۔۔۔۔"

"دیوی!" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا ۔۔۔ " جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے یہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے ۔۔۔"

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی' اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے ۔۔۔۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بد سلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو کو توقع نہ تھی ۔۔۔ وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ۔۔۔۔ لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے۔ وہ چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی ۔۔۔ اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی' پر اجڑ گئی' سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لئے کان! ۔۔۔ پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملاشکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا ۔۔۔۔

" ہتھ لائیاں کملان نی' لاجونتی دے بوٹے ۔۔۔"

(اردو)

اجیت کور / افضل توصیف

نہیں، ہمیں کوئی شکایت نہیں

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی، جب میرے اخبار کے چیف رپورٹر کا فون آیا۔ پی ٹی آئی نے خبر دی تھی کہ فرید آباد کی سبھی فیکٹریوں میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ تناؤ بڑھ گیا ہے جس فیکٹری سے ہڑتال شروع ہوئی وہاں ایک مزدور کی موت ہو گئی ہے۔ اب تم صبح سویرے سیدھی وہیں چلی جانا۔ دفتر آنے کی ضرورت نہیں۔ پوری معلومات لے کر سٹوری شام کو فائل کر دینا۔

اگلی صبح.....

فرید آباد.....

جس فیکٹری سے ہڑتال شروع ہوئی تھی، اس کے باہر مزدوروں کا جمگھٹا تھا۔ ہوا میں غصے کی پھنکار ضرور تھی مگر عام فضا جیسے غم اور بیچارگی سے نڈھال ہو۔

فیکٹری کا گیٹ بند تھا۔ باہر، ذرا ہٹ کے درختوں کے نیچے، دیوار کے پاس اور سڑک کے کنارے مزدوروں کی کئی ٹولیاں۔ بیٹھے یا کھڑے وہ باتیں کر رہے تھے یا باہم صلاح مشورے۔ مگر ہوشیاری سے ہر آنے والے کو تاڑ بھی رہے تھے۔ میں نے دیکھا ان سب کے چہروں سے رات کا اندھیرا راکھ کی طرح جھڑ رہا تھا۔

آگے بڑھ کر میں نے گیٹ کے اندر کی طرف کھڑے چوکیدار کو اپنا پریس کارڈ دکھایا۔ اور وہ سلاخوں میں سے کارڈ کو دیکھتے ہوئے گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے سے ٹائم کیپر کو بلانے چلا گیا۔ ٹائم کیپر نے پریس کا کارڈ دیکھا تو تھوڑا سا گیٹ کھول کر مجھے اندر بلا لیا۔ پھر اپنے کمرے میں بیٹھ کر ٹیلی فون پر کسی کو میرے بارے میں بتانے لگا۔

مالک نے شاید اجازت دے دی تھی، اسی لئے وہ مجھے ساتھ لے کر فیکٹری کی عمارت کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ مجھ سے چند قدم آگے ہی چل رہا تھا وہ۔ میں نے بھی تیز قدم اٹھائے اور اس کے برابر آ کر بات کرنے کی کوشش کی۔ تم لوگوں کی فیکٹری تو بالکل قلعے جیسی ہے، نہیں؟

میرا خیال تھا بات سے بات نکلے گی۔ ایسے حالات میں بات چیت کرتے ہوئے کئی بار عام سے لوگوں سے بڑے بڑے سراغ مل جاتے ہیں۔ مگر وہ تھا کہ ماتھے پر تیوریاں ڈالے، صرف اتنا ہی بول سکا۔ "ہڑتال کے زمانوں میں قلعہ بنانا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ یہ مزدور تو خدا جانے کیا کر گزریں" ..... اور پھر اس نے آگے نکل کر تیز چلتے ہوئے تاثر دیا کہ مجھ سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتا۔

اندر فیکٹری کا مالک بے حد فراخ اور ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں چوڑی اور چمکیلی میز کے پیچھے گھومتی کرسی پر ڈٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ کی۔ بہت چکنے سنہری فریم کی عینک کے پیچھے چمکتی چالاک آنکھیں۔ جسم گوشت کا تھیلا یا بھری ہوئی مشک قیمتی سوٹ کے اندر پھنسی ہوئی۔ سامنے میز پر چار ٹیلی فون، کاغذ قلمدان، پن

پنسلیں پیپرویٹ اور فائیلوں کی ٹرے رکھی تھی۔

چائے کا آرڈر اس نے میرے منع کرنے کے باوجود اور فوراً ہی دے دیا اور پھر بن پوچھے ہی بتانے لگ پڑا۔ "ایسے حالات میں کوئی کس طرح ڈسپلن رکھ سکتا ہے؟۔ یہ مزدور تو بس چاہتے ہیں کہ کام بالکل نہ کریں اور ہم ان کے سامنے جھکتے ہی رہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کسی کو چوری کرتے پکڑلیں تو کیا چپ بیٹھ رہیں۔ کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو کیا اسے پلنگ پہ بٹھا کر پنکھا جھلیں۔ وہ بھی چوری کرتے پکڑا گیا تھا۔ ہم نے پولیس کے حوالے کر دیا۔ آگے پولیس جانے اور ملزم۔ آپ ہی بتایئے 'اگر پولیس چوروں سے چوری نہ نکلوائے۔ چوروں کو سزا نہ ہو تو کیا اس ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی کوئی شکل رہ جائے گی؟

"کیا چرایا تھا اس نے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

اتنے میں چپڑاسی چائے لے کر اندر آگیا۔ آبنوسی ٹرے میں سجا ہوا چاندی کا ٹی سیٹ' پیچھے پیچھے ایک اور آدمی دوسری ٹرے اٹھائے ہوئے آیا۔ اس میں کئی پلیٹیں 'کاجو' نمکین پتے' بسکٹ ایسے لوازمات سے بھری رکھی تھیں۔

چائے کا کپ میں نے پکڑ لیا۔ کیونکہ چائے پینے کے دوران ایک بے فکری سی رہتی ہے کہ اگلا بندہ اب کسی بہانے بھی کمرے سے کھسک نہیں سکتا۔ نہ ہی وہ آپ کو چلتا کر سکتا ہے۔ بات کو جس حد تک طول دینا ہو۔ اسی حد تک چائے کو لمبا کر دو۔ آدھ گھنٹہ بات کرنی ہو تو چائے کی پیالی آدھ گھنٹے میں خالی کرو۔ یہ بات میرے تجربے کی ہے۔ اسی تجربے کو کام میں لانا چاہا تھا میں نے۔ ورنہ تو وہ میرے کسی بھی سوال پر جھلا کر یا تلملا کر اس میٹنگ کو ختم کر سکتا تھا۔

"چوری کیا کی تھی اس نے" میں نے پھر سے پوچھا

"مشینری کے پرزے۔ اور کچھ را میٹریل تھا"

"تو آپ لوگوں نے پکڑا کیسے؟"

"بس جی ایک بڑے سے تھیلے میں سامان بھر کے پیچھے پمپ کے پاس رکھ دیا تھا کہ چھٹی کے بعد چپ چاپ لے جائے گا۔ مگر پکڑا گیا۔"

"پکڑا کس نے؟"

"چوکیدار نے"

"پھر؟"

"پھر کیا' ہم نے پولیس کو رپورٹ کی۔ انہوں نے اسے حراست میں لے لیا"

"حراست میں کتنا عرصہ رہا؟"

"کوئی دس دن"

"دس دن مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا؟"

"نہیں' ابھی تو تفتیش کر رہے تھے وہ"

"پھر اس کی موت کس طرح ہو گئی؟ یہیں حراست میں ہی؟"

"بالکل حراست میں ہی۔ پولیس والے تفتیش کے لئے اسے یہاں لے کر آئے تھے۔ بس پاؤں پھسل گیا اس کا' اور نیچے کاسٹک ٹینک میں جا گرا۔ شکر ہے کہ وہ اس وقت پولیس کی حراست میں تھا۔ اور پولیس کی نفری ساتھ

تھی۔ ورنہ تو ان مزدوروں سے کیا بعید کہہ دیتے کہ کاسٹک ٹینک میں ہم نے ہی اسے دھکا دے دیا۔"

"مگر یہ ہڑتال جو مزدوروں نے کر رکھی ہے؟"

"بس جی۔ انہیں سے پوچھا جائے کہ جب وہ پولیس کی حراست اور حفاظت میں مرا ہے تو اس کی موت کے لئے کسی اور کو کس طرح ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟"

"آپ کی فیکٹری کے ساتھ ہی دوسری فیکٹریوں کے مزدوروں نے بھی تو ہڑتال کر دی ہے"

"بس جی۔ ان کا کیا ہے۔ یہ تو بھڑوں کے چھتے کی طرح چھڑ جاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پہ بھڑک جاتے ہیں' ان کا نقصان جو کوئی نہیں ہوتا۔ نہ کروڑوں کی مشینیں خالی رہتی ہیں۔ نہ مال کی سپلائی رکنے سے کروڑوں کا نقصان ہوتا ہے۔ انکا کیا ہے بس زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگائے اور وہ لنگوٹیوں جیسی لال جھنڈیاں ڈنڈوں پر ٹانگ کر چل پڑے۔ بعد میں رولا رپا کر کے اس آوارہ گردی کی تنخواہ وصول کی۔ کوئی قانون ہونا چاہیئے اس اندھیر گردی کے خلاف۔ آپ لوگ جو اخبار والے ہیں اس سلسلے میں آپ کو لکھنا چاہیئے۔ خود حکومت کو بھی جاگنا چاہیے؟"

"اب کیا ایکشن لے رہے ہیں آپ لوگ؟" میں نے پھر ایک سوال داغ دیا۔

"ہم نے کیا ایکشن لینا ہے جی۔ البتہ ہم نے اس کے کنبے کو پانچ ہزار روپیہ دے دیا ہے۔ ویسے بنتا تو نہیں تھا ہماری طرف سے کچھ بھی دینا' کیونکہ نوکری سے تو اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ مگر ہم خدا کا خوف کرنے والے لوگ ہیں۔ سو اس کی فیملی کی امداد کر دی' انسانیت کے ناطے سمجھ لیں"

"استعفیٰ؟ کیا وہ کام نہیں کرتا تھا آپ لوگوں کے ساتھ؟"

فیکٹری کے مالک نے کرسی پہ کروٹ سی بدلی اور بولا "نہیں کام تو کرتا تھا۔ مگر اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ نوکری چھوڑ کر خدا جانے کیا پاپڑ بیلنے کا ارادہ تھا اسکا۔ بس آخری دو، چار دن ہی باقی تھے اس کی ملازمت کے۔ شاید اسی لئے سوچا ہو گا جاتے جاتے ہاتھ کر جاؤں"

اسی وقت ایک آدمی نے اندر آکر فیکٹری کے مالک سے کچھ سرگوشی سی کی۔ خود میں نے بھی کاغذ سمیٹے۔ قلم بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے رسمی طریقے سے کہا "آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں' لیں نہ کچھ"۔ میں نے کہا "آج نہیں ' پھر سہی۔ شاید دوبارہ آنا پڑے کسی وقت"۔ بلا کے جلدی ٹل جانے سے وہ کافی مطمئن دکھائی دیا۔ اور کمرے کے دروازے تک میرے ساتھ آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خدا حافظ کہتا۔ میں نے پوچھ لیا۔

"بائی دا وے وہ کاسٹک ٹینک ہے کہاں؟" یہ بات سن کر وہ ایک لمحے کو چپ رہ گیا۔ اس کے چہرے سے ایک پرچھائیں سی گزر گئی۔ مگر یہ لوگ ساری پرچھائیاں سمیٹنے کے لئے جھاڑو تو اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ پرچھائیں ایک دم ہٹ گئی اور اس کی وہی معمول کی مسکراہٹ پھر سے اس سیٹھ کے چہرے پر پھیل گئی۔

"وہ اندر ہے"

"اچھا' اس کے اندر گرنے کے لئے اوپر جانا پڑے گا؟ سیڑھیوں کے ذریعے نا؟"

اس کی عینک کے پیچھے ایک گھوری نے مجھے گھورا۔ اور ماتھے پر تین تیوریوں کا ترشول سا ابھرا' بس چلتا تو وہ ترشول میرے پیٹ میں اتار دیتا۔ مگر پھر ایک دم ترشول غائب ہوا اور مسکراہٹ واپس آ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"وہ ٹینک میں ہی گرا تھا نا؟"

"یس یس!" میں نے پہلے بھی دیکھا ہے ہم جھوٹ بولنے غصہ دکھانے یا پھر کسی سٹپٹائی کیفیت میں بات کرنے کے لئے کسی دوسری زبان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ میں سوچنے لگی' لیکن ایک دم سے اگلا سوال میرے ہونٹوں سے پھسل گیا!

"کہاں سے گرا تھا وہ؟"

"اوپر سے"

"اوپر اسے پولیس لے گئی تھی' مگر کس لئے؟"

"آپ کو بتایا تو ہے پولیس تفتیش کر رہی تھی"

"مگر اوزاروں کا تھیلا تو آپ نے کہا پپ کے پاس سے چوکیدار کو ملا تھا۔ پھر اوپر لے جا کر تفتیش کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ خاص کر کے ایسی جگہ جس کے عین نیچے تیزاب سے بھرا ہوا ٹینک تھا۔"

فیکٹری کا مالک اب چڑ گیا تھا۔ اس نے اپنا غصہ چھپانے کی کوشش بھی چھوڑ دی۔ تڑاخ سے بولا "یہ تو آپ پولیس سے ہی پوچھیں وہی بہتر جانتے ہیں۔ اور اب ...... (اس نے گھڑی دیکھی) میری ایک اپائنٹمنٹ ہے۔ ایکس کیوزمی!" پھر اس نے اشارے سے زیادہ لفظوں میں کم' چپڑاسی سے کہا کہ مجھے باہر گیٹ تک لے جائے۔ راستے میں میں نے چپڑاسی کو کریدنے کی کوشش کی "لاش دیکھی تھی تم لوگوں نے؟ کاسٹک کے ٹینک میں سے تو جلے ہوئے گوشت کا ڈھیر ہی نکلا ہو گا۔۔۔ تیزاب تو۔۔۔۔"

وہ اپنے ناخن سے دانت کریدتا ہوا ایک بے حسی کے ساتھ میرے برابر چلتا رہا۔

"تم لوگوں کا بھائی بند تھا آخر۔ آج اس کے ساتھ ہوئی ہے۔ کل تمہارے ساتھ بھی ہو سکتی ہے' یا نہیں"

"جدوں ہووے گی دیکھ لواں گے"

"جب ہو ہی گئی تو دیکھنا کیا؟"

"پھر تو ہمارے یتیم بچے ہی دیکھیں گے یا بیوہ عورت"

"اس کا مطلب تو ہوا کہ موت سے پہلے چپ چاپ دیکھتے جاؤ سب کچھ۔ خواہ تمہارا ساتھی آنکھوں کے سامنے تیزاب کے ٹینک میں ڈال کر زندہ جلا دیا جائے....."

ہم ابھی گیٹ سے چند قدم دور ہی تھے کہ پیچھے سے آتی ہوئی کالی شیورلیٹ زناٹے سے آگے نکل گئی کار کو دور سے آتا دیکھ کر ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی کے ٹنٹڈ گلاسز میں سے کچھ دیکھ تو نہ سکی تھی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ کالی شیورلیٹ میں فیکٹری کا مالک ہی بیٹھا تھا۔

گیٹ کے باہر کھڑے بیٹھے مزدوروں کی آنکھوں نے گھور کر دیکھا۔ کار گرد کے بادل بناتی ہوئی آگے نکل گئی تب انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ بجھے انگاروں کی راکھ اسی طرح برس رہی تھی۔ رک کر میں ان سے بات کرنے لگی تو ایک جوان سا مزدور آگے بڑھا اور کہیں پاتال میں سے بولا "کیا فائدہ ظلم کے بارے لکھنے کا؟ اخباروں میں چھپی خبر کا کیا فائدہ" جب اس سے کسی کا کچھ بنتا بگڑتا ہی نہیں۔ ہاں اگر بگڑنا بنتا ہے تو پیسے کی طاقت سے۔ ہمارے پاس پیسے کی طاقت ہوتی تو ہم بھی ایک آدھ لیڈر خرید لیتے۔ وہ پارلیمنٹ میں جا کر شور شرابا کرتا۔ پولیس کو خرید سکتے تو وہ قاتلوں کو پھانسی لگوا دیتی۔ صرف ایک ہی طاقت ہے۔ اور وہ پیسہ ہے"

"کیوں؟ سچی بات اخباروں میں چھپے تو بھی ہنگامہ تو ہوتا ہی ہے۔ سب کو پھوڑ جاتے ہیں۔ سچائی کی تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہر کسی کو' پولیس کو' حکومت کو اور اخبار کو بھی۔"

"ہوں سچائی؟" ایک کڑوی آواز سنائی دی۔ "آجکل اس ملک میں دو طرح کی سچائی چلتی ہے جناب اسی طرح جیسے دو طرح کا پیسہ چلتا ہے۔ نمبر ایک۔ نمبر دو اسی طرح کی چال سچائی کی بھی ہے۔ ایک نمبر سچائی دو نمبر سچائی۔ آپ بتائیے کونسی سچائی کی طرف دار ہیں؟"

اتنے میں ایک اور محنت کش بھیڑ میں سے نکل کر آگے آیا۔ سیاہ کالا رنگ۔ سخت جبڑے۔ کھردرے چوڑے ہاتھ اور کندھے جیسے دھرتی کا بوجھ سہارنے والے پاوے ہوں۔ اپنا بڑا سا منہ کھول کر بولا۔ "پریتم کو قتل کیا گیا ہے۔"

"پریتم؟ پریتم نام تھا اس کا؟"

"ہاں جی۔ پریتم کو قتل کیا گیا۔ اور جان بوجھ کر سوچ سمجھ کر"

"کس نے قتل کیا؟ پولیس نے؟"

"پولیس: پولیس کیا ہوتی ہے؟ ایک وردی ایک ڈنڈا ایک بندوق!"

"پولیس نے پورے پندرہ دن مار مار کے اس کی کھال ادھیڑ دی تھی۔" ان میں سے ایک اور تڑپ کر بولا۔

"اس نے چوری کی تھی نا۔ مالک تو یہی کہتے ہیں"

"چوری؟ چوری تو اسی صورت میں کر سکتا تھا۔ اگر وہاں کام کر رہا ہوتا۔ کام سے تو وہ استعفیٰ دے چکا تھا"

"یہ استعفیٰ کیا چکر ہے؟ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔ "اس کا استعفیٰ منظور نہیں کیا تھا انہوں نے۔ مگر وہ اڑ گیا۔ مہینے کی تنخواہ کاٹتے ہیں تو کاٹ لیں، کام پہ نہیں گیا۔"

"کوئی جھگڑا ہوا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ وہ تو مالک کا بڑا راز دار بندہ تھا ہر وقت ساتھ رہتا۔ تڑکے سویرے مالک کی کوٹھی جاتا۔ گاڑی میں ساتھ ہی فیکٹری آتا۔ کئی بار باہر کے کاموں پر جاتا۔ شام کو گھر بھی مالک کے ساتھ ہی جاتا۔ مالک کے ساتھ دورے پر بھی وہی جاتا، کبھی دلی کبھی بمبئی، کبھی کہیں اور۔"

"اچھا پھر۔؟"

ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم ہی تھا۔ اسے وقت ہی کہاں ملتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے اداس سا رہنے لگا تھا۔ کئی بار رات کی روٹی کھا کر ہم میں سے کسی کے گھر آتا تو کہتا میری تو کتی نوکری ہے! کوئلوں کی دلالی ہے بھائی۔ کالک ہی کالک!"

"اسی لئے استعفیٰ دے دیا تھا اس نے؟"

"یہ تو پتہ نہیں، مگر اتنا ہے کہ جس دن استعفیٰ دیا۔ اسی دن لنچ کے وقفے میں وہ میرے پاس آبیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ "واہ موج ہے تم لوگوں کی۔ کم از کم لنچ کے وقت اس نکاری دنیا کو بھول کر روٹی تو اطمینان سے کھاتے ہو۔ آپس میں دکھ سکھ کی بات بھی کر لیتے ہو۔ میں بھی استعفیٰ دے آیا ہوں۔ میرا بھی دل کرتا ہے ایسی بے فکری کے ساتھ اپنے بچوں کی سنگت میں بیٹھ کر روٹی کھاؤں، بات کروں۔" اس کی باتوں سے مجھے حیرت ہوئی۔ ہم تو سمجھتے تھے پتہ نہیں کیش کرتا ہے، موٹروں پہ گھومتا پھرتا ہے۔ "نوکری چھوڑ کر کرو گے کیا؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔ کہنے لگا "بازار میں سائیکلوں کی دکان کھولوں گا۔ پرانی سائیکلیں خریدوں گا۔ ان کی مرمت اور پالش کر کے منافع پر بیچا کروں گا۔ پھر آہستہ آہستہ شاید کوئی ایجنسی بھی مل جائے۔"

"بازار میں اس نے دکان کرائے پر لے بھی لی تھی۔ جس دن پکڑا گیا۔ وہاں اپنی دکان کو ہی ٹھیک ٹھاک

کرنے میں لگا ہوا تھا۔" ایک اور بندا بتانے لگا۔

"کیا مطلب وہ فیکٹری سے نہیں پکڑا گیا؟"

"کہاں جی۔ وہ تو مالک نے اپنا بندا بھیج کر اسے بلوایا تھا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر وہ چلا گیا۔ شاید سوچا ہو کہ استعفے کے سلسلے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فیکٹری آیا تھا۔ میں نے خود دیکھا اسے مالک کے دفتر کی طرف جاتے۔ بس۔ بات کر کے باہر نکلا تو چوکیدار پمپ کے پاس سے سامان کا بھرا تھیلا اٹھا لایا' اور چور چور شور مچانے لگا۔"

"تو فیکٹری کے اندر گیا ہی نہیں تھا وہ؟"

"بالکل بھی نہیں۔ کام ہی چھوڑ چکا تھا فیکٹری سے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں وہ سامنے" اس نے اشارہ کیا' مالک کا دفتر اور ادھر یہ پمپ لگا ہے۔ پولیس کو تفتیش کرنی ہوتی تو اسے پمپ کے پاس لے جاتی یا مالک کے کمرے میں۔ اندر فیکٹری میں اور پھر تیزاب کے ٹینک کے عین اوپر لے جانے کا مطلب کیا تھا؟"

"مطلب؟ ظاہر ہے کہ سازش تھی اس کے قتل کے لئے پورا پلان بنا ہو گا۔ مالک نے پولیس کے ساتھ مل کر' جانے کتنا پیسہ کھلایا ہو گا۔"

"مگر جب اتنے دن وہ' کیا نام تھا اس کا؟ پریتم؟ حراست میں رہا' تم لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ کیوں آخر؟" مجھے غصہ آرہا تھا سارے قصے پہ۔ یونین پہ......

"اصل میں وہ نوکری چھوڑ چکا تھا۔ یونین کا ممبر بھی نہیں تھا۔ سچ پوچھیئے تو وہ کبھی بھی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ہمیشہ مالکوں کی طرف ہی رہا۔ ہم تو اسے غدار ہی سمجھتے رہے۔ ہمیشہ سے جب ہماری ہڑتال ہوئی وہ ہمارے ساتھ نہیں ملا"

"مگر بندہ تو تمہارا ہی تھا۔ نہیں؟ ایک ورکر' جیسے کہ تم سب ہو۔ کیا تمہارا فرض نہیں بنتا کہ......؟"

"اب جبکہ وہ قتل ہو گیا تو لگتا ہے کہ وہ ہمارا ہی بندہ تھا۔ ہماری برادری جو ہمیشہ ظلم زیادتی کا شکار رہتی ہے۔ وہ اسی کا ایک حصہ تھا۔"

"تمہاری اس ہڑتال کی مانگ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے میمورنڈم کیا دیا تھا۔ ہڑتال سے پہلے؟"

"یہی کہ سارے معاملے کی مکمل تفتیش ہونی چاہئے"۔ ایک نے کہا تو ساتھ ہی دوسرا بول پڑا: "یہ بھی دل کی تسلی والی بات ہے۔ کونسی تفتیش سے انصاف مل جائے گا۔ اگر مل مالک نے قتل کیا ہے تو کونسی کچہری مالک کو پھانسی کی سزا دے گی؟ اور وہ پولیس والے جو قتل کی سازش میں شریک ہوئے' کونسا قانون انہیں سزا دے گا؟" ایک نوجوان مزدور غصے میں بولے جارہا تھا۔ اس کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ یا شاید تھا مجھے اور ان سب کو ان سوالوں کا جواب معلوم تھا۔

"مگر وجہ کیا تھی اس کے قتل کی؟ مالکوں کی دشمنی تھی کیا اس کے ساتھ؟"

"مالکوں کے کچھ خاص راز ہوں گے اس کے پاس۔ ہر وقت ساتھ جو رہتا تھا ان کے۔ اسی لئے تو اس کا استعفیٰ منظور نہیں کر رہے تھے وہ' اسی لئے اسے واپس بلا رہے تھے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مارے محبت کے بلا رہے تھے۔ سوچنے کی بات ہے۔ وہ اسے واپس لانے پر زور کیوں دے رہے تھے؟"

"مجھے اس کے گھر تک پہنچا سکتے ہو؟" میں نے ایک مزدور سے پوچھا۔

ایک چھوٹی سی گلی کے پچھواڑے میں اس کے گھر کے آگے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک جوان

عورت بیٹھی ایک بچی کو کنگھی کئے جا رہی تھی۔ عورت کی آنکھیں لال سرخ، پپوٹے سوجے ہوئے، انگاروں کی طرح جلتے ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اپنی چادر کی بکل کس لی اور سر کو ماتھے تک ڈھک لیا۔ کنگھی کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"یہ بی بی آپ کو ملنے آئی ہے" میرے ساتھ آنے والے نے کہا۔ میں اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پہ نگاہ کی کلیجہ منہ کو آگیا۔ مگر وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا پریتم کے لئے میں نے کیا کہا۔ رسمی افسوس والے دو لفظ ہی کہے ہوں گے۔ اس کی جھکی آنکھوں کے سرخ پپوٹوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اسی طرح کانپتے ہاتھ سے کنگھی کرتی رہی۔ اتنے میں اندر سے ایک جوان لڑکا سر پہ پگڑی لپیٹتا ہوا باہر نکلا۔ میرے ساتھ آئے مزدور نے اسے میرے بارے میں بتایا تو اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔

"یہ پریتم کا چھوٹا بھائی ہے مستی"

مستی میری طرف گھورتے ہوئے اپنی پگڑی کو بل دیتا رہا۔ پھر ایک دم تیز تیز بولنے لگا۔

"یہ قتل ہے! دن دیہاڑے کیا گیا قتل!! کوئی سنتا ہی نہیں۔ اخباروں والے آتے ہیں تو مالک انہیں بھی پٹو ڈال دیتے ہیں!"

میرے ساتھ گئے مزدور نے آنکھوں آنکھوں میں اسے گھورا۔ مگر وہ اور تیزی سے بولنے لگا۔

"اوئے میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ ڈرنے والے کو انہوں نے مار ڈالا قصائی ہیں یہ سب قصائی اور وہ پولیس ان کی زر خرید گولی ہی تو ہے۔ غریب کی سنتا کون ہے یہاں؟ مگر میں تو اپنی بات سنا کر ہی چھوڑوں گا۔ کوٹھے پر چڑھ کے بولوں گا... ہاں وہ چیخا۔

میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش سی کی۔ "فکر نہ کر کاکا!"

"فکر کیسے نہ کروں جی۔ وہ تو یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ بندا مار دیا۔ بات ختم۔ ان کے سارے بھید بھی تیزاب کے ٹینک میں جل کر فنا ہو گئے۔ سارے گناہ چھپ گئے۔ مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گا"

"یہی بات ہے کہ جو میں کہہ رہی ہوں۔ تم لوگ اپنی بات واضح تو کرو۔ صرف غصہ دکھانے سے تو کچھ نہیں ہو گا نا۔ آخر اس ملک میں قاعدہ قانون ہے، سرکار ہے اور جمہوریت بھی ہے۔"

"جمہوریت کی ماں کی ---" ----

ساتھ والے مزدور نے اسے جھڑک دیا۔ تیری مت ماری گئی ہے مستی! بندا بندی تو دیکھ لیا کر پاگل جہان کے! عقل کی بات کر"

"عقل؟ عقل گئی اکی ماں کے ------ مجھے کچھ ہوش نہیں۔ دل چاہتا ہے جس طرح انہوں نے میرے بھائی کا خون کیا۔ میں ان سب کو آرے سے چیر ڈالوں یا اس سے بھی کچھ زیادہ کروں۔"

اور پھر وہ سبھی کہانیاں سناتا چلا گیا..... "آدم کال، کلجگ، پتھر کا زمانہ۔ وحشی ادوار، کھولتے تیل کے کڑاہے میں تلے جاتے انسانوں کے جسم...... اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ سارا وجود پگھل رہا تھا لاوے کی طرح۔ پتہ نہیں کس طرح کے کام کرواتے رہے تھے اس سے۔ اور وہ اس کے سر پہ تو وفاداری کا بھوت سوار تھا۔ کبھی گھر میں اس نے اپنا بھید سانجھا کیا نہ دل کا دکھ۔ کئی وار گھری شاموں کو چپڑاسی آکر پیغام دے جاتا کہ وہ مالکوں کے ساتھ کہیں گیا ہوا ہے۔ دیر سے لوٹے گا۔ دیر سے گیا، صبح کہیں اذانوں کے وقت وہ گھر آتا..... مگر اب وہ ان کاموں سے بیزار ہونے لگا تھا۔ سارا غصہ گھر والوں پہ نکالتا۔ یا پتھر ہو کے منجی پہ لیٹا چھت

کو گھورتا رہتا۔ میں جب اپنی نوکری کی بات کرتا وہ مجھے منع کر دیتا۔ کہتا "نہیں ستی ہم اپنا کوئی کام کر لیں گے۔ نوکری کے ساتھ بھی کوئی زندگی ہے۔ چاکری تو ہوتی ہی ذلیل کرنے والی چیز ہے۔ یہ تو اسی صورت چل سکتی ہے اگر بندا اپنے اندر والے انسان کا گلا گھونٹ دے" ۔ یہی بات وہ کہا کرتا تھا۔"

"ہوں" ستی ذرا سا چپ ہوا تو میں نے ہنکارہ بھرا۔ وہ پھر بولنے لگا۔

"تے فیر او ہنے استعفیٰ دے دیا۔ کیا گناہ کیا؟ سائیکلوں کی دکان کھول رہا تھا۔ گھر میں سب سے ہنس کر بات کرنے لگا تھا۔ اس کی چھاتی سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ پر مالک اسے چین کہاں لینے دے رہے تھے۔ ہر روز بلاوا آتا۔ آکر مل جاؤ۔ آخر ایک دن وہ مالکوں کے بھیجے ہوئے بندے کے ساتھ فیکٹری چلا گیا۔ اب آپ بتاؤ' جو بندا مالک کے دفتر میں بیٹھ کر کوئی بات کر رہا ہے' اس کے پاس فیکٹری کے اوزار پرزے کہاں سے آجائیں گے؟ کہاں سے تھیلہ بھرے گا؟ پمپ کی طرف وہ گیا ہی نہیں۔ اندر فیکٹری کے فلور پر اس نے قدم نہیں رکھا۔ سب جھوٹ اور کفر تول دیا۔"

"اور پھر جس طرح پورے پندرہ دن اس کی کھال ادھیڑی گئی۔ اسے الٹا لٹکا کے جس طرح اس کے پاؤں پہ ضربیں لگائیں گئیں۔ میں .... میں تو ان کی ماں ـــ اب وہ پھٹ پڑا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ذرا سا ضبط کیا اور بولنے لگا۔ "پھر اس کو قتل کرنے کے لئے فیکٹری لے گئے قصائی! پھر لاش کا پوسٹ مارٹم کرواتے پھرے کوئی پوچھے "ماس کے جھلسے ہوئے لوتھڑے کا پوسٹ مارٹم کیا کرو گے؟"

آنکھوں پہ ہاتھ رکھے وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھی پریتم کی بیوی سسکیاں بھر کے رو رہی تھی۔ اس کا بچہ قریب ہی کھڑا تھا حیران کملائے پھول جیسا۔

ستی اب دہائیاں دے کر رو رہا تھا"۔ ہائے وے لوگو! انہوں نے ہمارا بھائی ٹوٹے ٹوٹے کر کے بوری میں بھر کے ہمارے حوالے کیا۔ جاؤ لے جا کر جلا دو اسی توڑے کو!"

عورت کی ہچکیوں میں سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ مگر آسمان نہیں پھٹا۔ البتہ ایک بزرگ آدمی لاٹھی ٹیکتا اندر سے نکل آیا۔ سفید میلی پگڑی۔ خیالی داڑھی چہرے پہ دکھ پریشانی کا جال۔ باہر آکر اس بوڑھے نے اپنے ہاتھ کا چھجا سا بنا کر آنکھوں پہ سایہ کیا اور غور سے مجھے دیکھا پھر۔ پھر سیج سے کہنے لگا۔ "نہیں بی بی۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔"

"اس کمبخت کی آئی تھی چلا گیا۔ پچھلے جنم کا وری تھا۔ کلیجہ چھلنی کر گیا۔" اب اس کی آواز بھرا کر جیسے پھٹ سی گئی۔

"کسی کا کوئی قصور نہیں بی بی۔ یہ ستی تو پاگل ہے۔ یونہی بولتا رہتا ہے" کچھ دیر چپ سی طاری رہی۔ تب ہی کنبے کے بزرگ کی سفید داڑھی کے بال لرزے۔ آواز حلق کو کرچھتی باہر نکلی "ایک تو چلا گیا۔ اب کیا دوسرے کو بھی کھو بیٹھیں!"

(پنجابی)

شیکھر جوشی/احمد صغیر صدیقی

وجیو

جگدیش بابو نے اسے پہلی بار اس کیفے میں دیکھا تھا جس پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور جو بازار سے آتے ہوئے سڑک پر بائیں جانب واقع تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ آنکھیں چمکیلی اور بال سنہرے تھے۔ اس کی چال پھرت میں ایک قسم کی تازگی اور زندگی تھی۔ بالکل شبنم کے اس قطرے جیسی جو کنول کے بڑے سے پتے پر آہستگی سے لڑھکتا ہے۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال ہو گی۔

جس وقت جگدیش بابو اپنی سگریٹ کا دھواں کھینچتا ہوا کیفے میں داخل ہوا وہ لڑکا میز سے پلیٹیں اٹھا رہا تھا۔ پھر ابھی وہ اپنی نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ آکھڑا ہوا۔ ایسا لگا تھا جیسے وہ اسی کا منتظر رہا ہو۔ لڑکے نے کچھ کہا نہیں بس تقریباً" تھوڑا سا مسکرایا۔ جگدیش بابو نے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ دوبارہ مسکرایا اور چلا گیا' اور دوسرے ہی لمحے وہ پھر نمودار ہوا۔ چائے سمیت۔

یہ احساسات بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ بسا اوقات آدمی بالکل تنہا اور سنسان جگہ پر بھی خود کو اکیلا نہیں محسوس کرتا تنہائی کے باوجود کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر چیز مانوس سی لگتی ہے اپنی سی لگتی ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ آدمی بھری ہوئی محفل میں بھی یوں محسوس کرتا ہے' جیسے وہ بالکل اکیلا ہو۔ کوئی بھی شے مانوس نہیں لگتی مگر جذبے کی جڑیں کہیں نہ کہیں بے گانگی یا دوری میں ضرور ہوتی ہیں۔

جگدیش بابو اس بڑے سے شہر میں ایک دور افتادہ مقام سے آیا تھا۔ اور خود کو بہت تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی میں اسے کوئی اپنائیت نظر نہیں آتی تھی۔ ممکن تھا کہ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد وہ اس کا عادی ہو جاتا' مگر فی الحال یہاں کی ہر چیز اسے اجنبی لگتی تھی۔ اسے اپنا گاؤں یاد آنے لگا۔ وہاں کے لوگ یاد آنے لگے' اسکول یاد آنے لگا' سنگی ساتھیوں کا خیال اسے ستانے لگا۔

"چائے' صاحب"

جگدیش نے سگریٹ کا گل جھاڑ کر لڑکے کے بولے ہوئے لفظ "صاحب" کا تجزیہ کیا۔ اسے لگا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے نظر آئی ہو۔ اس نے لڑکے سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"مدن"

"مدن۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میں پہاڑی ہوں۔ صاحب"

"پہاڑ تو بہت سے ہیں۔ دارجلنگ' آبو' مسوری' شملہ' تم کون سی پہاڑی کی بات کر رہے ہو؟"

"الموڑہ صاحب۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"گاؤں کا نام"

لڑکے نے کچھ تذبذب سے کہا۔ "دراصل اس گاؤں کا نام ذرا عجیب سا تھا۔" اس نے گریزاں لہجے میں کہا۔ "صاحب۔ وہ الموڑہ سے بیس میل پرے ہے۔" "پھر بھی۔ اس کا کوئی نام تو ہو گا۔" جگدیش نے اصرار کیا۔

"دتیال کہتے ہیں اسے۔" لڑکے نے کھسیاتے ہوئے بتایا۔

جگدیش کے چہرے پر چھائی تنہائی کی پرچھائیاں جیسے پھر سے اڑ گئیں۔ مسکراتے ہوئے اس نے لڑکے سے کہا کہ وہ خود بھی ادھر ہی کا ہے۔ اس کا گاؤں دتیال کے پاس ہی تھا۔" لڑکے کے چہرے پر خوشی کا گہرا تاثر ابھرا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ٹرے گرتے گرتے بچی۔ چند لمحوں تک وہ گنگ سا کھڑا رہا۔ جیسے ماضی کو یاد کر رہا ہو۔ ماضی۔ اس کا گاؤں۔ اس کے پہاڑ۔ چشمے 'ماں' باپ 'بہنیں' اور بڑا بھائی۔ "دجیو" ہاں وہ اپنے بڑے بھائی کو یہی کہتا تھا۔"

آخر یہ کس کی شباہت اسے جگدیش میں دکھائی دی تھی۔ اپنے آپ کی یا اپنے بڑے بھائی کی جسے وہ "دجیو" کہہ کر پکارا کرتا تھا؟

ذرا ہی دیر بعد جگدیش اور اس کے درمیان اجنبیت ختم ہو چکی تھی۔ اب صورت یہ تھی کہ جگدیش جوں ہی کیفے میں آتا تھا۔ مدن لپک کر اس کا استقبال کرتا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولتا تھا۔ "سلام دجیو"۔ "دجیو آج تو بڑی سردی ہے۔"

"دجیو۔ لگتا ہے بارش ہو گی"

"دجیو تم ٹھیک تو ہو۔؟"

پھر کسی طرف سے آواز لگتی۔ "بوائے"۔ اور مدن فوراً" لپک کر ادھر چلا جاتا۔ آرڈر لے کر جاتے ہوئے وہ جگدیش سے پوچھتا۔ "دجیو کوئی اور چیز لاؤں؟"

"پانی لے آؤ"

"ابھی لایا۔ دجیو" مدن دوسری طرف سے پکار کر کہتا۔ "دجیو" کا لفظ دہراتا ہوا جس میں بلا کی محبت اور قربت بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ سے کافی دنوں سے دور تھا۔ اسے یہ لفظ ادا کرتے ہوئے شاید بڑا سکون ملتا تھا۔

کچھ عرصے بعد۔ جگدیش بابو کو جو اس جگہ اکیلا پن محسوس ہوتا تھا۔ وہ رخصت ہو گیا۔ اب یہاں کے بازار۔ یہاں کے لوگ' اور یہاں کی چیزیں اسے مانوس لگنے لگی تھیں۔ مدن کی پکار۔ "دجیو۔ دجیو" اسے ایکدم سے بری لگنے لگی تھی۔

"مدن۔ ادھر آنا"

"آیا۔ دجیو"

مدن کا "دجیو" اسے ایکدم سے اکھرنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے اس کی تحقیر ہو رہی ہو۔ ان کے ہاتھ میں انس کا دھاگا بہت کمزور تھا۔

"چائے لاؤں۔ دجیو"

"نہیں۔ اور سنو۔ یہ تم ہر وقت دجیو دجیو کیوں کہتے رہتے ہو۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ دوسروں کو مخاطب کس طرح کیا جاتا ہے"

جگدیش کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا تھا۔ اس کی زبان چل پڑی تھی۔ مدن چھوٹا ضرور تھا مگر اس کی سمجھ اس کی عمر سے زیادہ تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے والا بچہ اتنا نادان کیسے ہو سکتا تھا کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکتا۔

اس روز وہ کیفے کے مالک سے رخصت لے کر گھر چلا گیا۔ جو ایک چھوٹی سی کھولی پر مشتمل تھا۔ اس نے سر کو بازوؤں میں چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ جو حالات تھے۔ یعنی گھر سے دوری۔ شفقتوں سے محرومی اور ایک اپنے آدمی کا پا جانا۔ ان کی موجودگی میں اس کا رویہ فطری ہی تھا۔ مگر اس روز اسے شدید احساس ہوا کہ اس علاقہ غیر میں جیسے کسی نے اسے اپنی ماں کی آغوش سے نوچ لیا ہے۔ مدن دوسرے روز پھر کام پر موجود تھا۔

اس روز جگدیش جب کیفے کی سمت آ رہا تھا۔ راستے میں اسے اپنا ایک بچپن کا دوست ہیمنت مل گیا۔ یہ ایک اتفاقی ملاقات تھی۔ وہ اسے لے کر کیفے میں آگیا۔ میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے مدن کو بلایا تو اسے احساس ہوا۔ کہ مدن کچھ کھنچا کھنچا سا ہے۔ بہر حال اس کی دوسری آواز پر وہ آگیا۔

آج اس کے چہرے پر وہ پرانی مسکراہٹ نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے اسے دیکھ کر کہا۔ "کیوں دجیو۔ کیا لاؤں؟"

اس بار جگدیش کو خود ہی بولنا پڑا۔ "دو چائے"

اس بار بھی مدن نے ہمیشہ کی طرح "ٹھیک ہے دجیو۔ ابھی لایا۔" کے الفاظ ادا نہیں کئے بلکہ اس نے کہا۔

"بہتر ہے صاحب" اور پھر اس طرح چلا گیا جیسے وہ کسی مکمل اجنبی سے بات کر تا رہا ہو۔

"مجھے تو یہ کوئی پہاڑی لڑکا لگتا ہے۔" ہیمنت نے لڑکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" جگدیش بابو نے سر ہلایا اور موضوع بدل دیا۔

مدن نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" یکایک ہیمنت نے اسے مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ جگدیش بابو نے نگاہیں چراتے ہوئے اپنی توجہ پیالی پر مرکوز کر دی تھی۔ مدن کی آنکھوں کے سامنے یادوں نے ابھرنا ڈوبنا شروع کر دیا۔ اسی طرح کبھی' جگدیش بابو نے بھی 'اس سے نام پوچھا تھا اور پھر ایک روز اس نے محبت سے اسے پکارا تھا۔ دجیو......

اور پھر ایک دن اس نے سنا تھا۔ "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ تم ٹھیک سے بڑوں کو مخاطب کر سکو"

جگدیش بابو نے اپنا سر اٹھایا تو دیکھا مدن کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جیسے ابھی ابھی رو دے گا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟' ہیمنت نے دوبارہ پوچھا۔

"صاحب۔ مجھے یہاں لوگ "بوائے" کہہ کر بلاتے ہیں۔" اس نے کہا اور فوراً" ہی وہاں سے چلا گیا۔

عجب بھوندو لڑکا ہے۔ ہیمنت نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنا نام تک نہیں معلوم۔

(ھندی)

عصمت چغتائی

ننھی کی نانی

ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انہیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سرسڑاتی پھرتی تھیں تو بفاطن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھرلی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجنا بجانے کی غیردلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آجاتی ہے۔

زندگی کی بھاگ دوڑ میں کچھ بھونا بھلنا بھی آگیا اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے۔ پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے، ادھر کی ادھر پہنچانے کے سوا اور کسی کام کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی کافی منافع بخش ہوتا ہے۔ محلّہ میں کھٹ پٹ چلتی ہی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطرمدارات ہوتی ہے لیکن یہ پیشہ کتنے دن چلتا، نانی لتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پا کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنا شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیاں ڈالی ہیں گوش میں۔" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھییں نگوڑی کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ، کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلوگوش۔ جب دیکھو آلو گوش۔۔ ہا۔۔۔ اب تو مہینوں گزر جاتے ہیں آلوگوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے۔۔۔ اے بیوی کو تھمیر چھوڑ دیا؟"۔۔۔ وہ ایک دم فکرمند ہو جاتیں۔

"نہیں بوا کو تھمیر نگوڑا سب مارا گیا۔ مواسقے کا کتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کو تھمیر کے بھلا آلوگوش کیا خاک مزا دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی، حکیم جی کے لونڈے نے کل شبن میاں کی پتنگ میں کنگی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو چھجے پر قدم رکھا تو۔۔۔"

"اے میں کوئی تمہارے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔"

اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹ پٹاتی حکیم جی کے یہاں جا پہنچتیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے کھسکتی گھسٹتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کو تھمیر پر بکٹا۔ کوتھمیر مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لئے سارے محلہ میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی دو گھونٹ غٹ لیے۔ شکر کی پھنکی مار لی گڑ کی ڈلی تالو سے چپکالی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈلی اٹھائی نیفے میں اڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر' آدھی ادھر اوپر سے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کو نکتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا شبہے پر ہی وہ تیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں' قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں بھی کیڑے پڑوائے۔

لتری' چور' اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقع تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی۔ پر جوں جوں محلّہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا مگر کنگوروں دار فیشن ایبل برقع کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو' پر پیچھے برقع بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقع صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنجوقتہ نماز کے لیے جائے نماز اور محلّہ کے کتے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی نے برقع کا گھیرا اس کے منہ پر پھنکارا۔ نانی کو برقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر ملی اور احتیاطاً" پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرزا اٹھتی تھیں جب یہ برقع بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈکوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے آج اس کے دالان میں تو کل اس کی صحنچی میں جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال لیا۔ جب دھتکار پڑی' کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقع اوڑھا آدھا بچھایا لبی تان لی۔

مگر برقع سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی ننھی' کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلّہ والے چوکنے ہو گئے۔ ان کی جوتیوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق و چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ننھی کو اس کے آبائی پیشہ یعنی اوپر کے کام پر لگا دے۔ بڑے سوچ وچار کے بعد انھوں نے اسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور بلبلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے

گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ نانی منڈیر پر جامن کی چھاؤں میں جھپکی لے رہی تھیں۔ ڈپٹیائن تو اپنے ماموں کے ہاں بیٹے کی بات لے کر گئی ہوئی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لیے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم' بید' چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی، چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلہ چھان مارا' کوئی سراغ نہ ملا مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھڑی کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگھی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔--- "ناٹزادی اچھا چھکا۔ یہاں آن کر مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوج گئیں۔ ٹھہر تو جا' سرکار سے کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر تک نہ چھپ سکی۔ نانی سر پر دوہتڑ مار مار چنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی مگر ڈپٹی صاحب--- محلے کے کھیا' تین نواسوں کے نانا' پنجوقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے منہ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی۔ آٹے گڑ کا حلوا کھلا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہی۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلّے کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نئیں--- نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی۔

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی۔"--- بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں۔

"کیا ہوا--- کیسے ہوا---" کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی--- مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں۔ ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھٹکار اور روڑاپن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں بلکہ ٹیڑھی میڑھی مورت جس پر کسی دیو نے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھگنی۔ موٹی کچوری سی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے چاہے کولھے' کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کی چٹکیاں بھرتے۔ مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان تھرک اٹھتا--- مگر اب نانی بجائے اسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانور بڑ کی گیند' ٹپا کھایا اور اچھل گئی۔

چند سال ہی میں ننھی کی چوکھی سے محلّہ لرز اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سنا مسجد کے ملاجی کو راجو کمہار نے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سنا صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھرنے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے لڑکے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلہ والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دلی، بمبئی میں اس مال کی کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے نگوڑی چپ چاپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی چپ چاپ آپ ہی آپ بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھالے۔" نانی کہتی۔

"نانی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سو جا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی۔۔۔ اے نانی بی ذری "سبحانک اللھم"۔ "سن لو۔" یاد ہے کہ نہیں، نانی نے سنا، فرفر سنا دیا!

"جا بیٹی اب سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سن کر کہا۔ "کبھی خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کر دیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔"

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی اور صبح ننھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آ جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹم ٹم ہے۔ منوں سونا ہے، بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرامنڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اسے سوناگاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطن بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو۔۔۔" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کلوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی ملاجی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ وہ پینترے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھونچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے بھڑوا۔۔۔ ڈاڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا۔" مگر جب ملاجی کبھی گلی کی نکڑ پر مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلہ کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے نگوڑے بندر تھے۔ جو پیڑھیوں سے اسی محلہ میں پلتے بڑھتے آئے تھے جو ہر فرد کا کچا چٹھا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بدذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انہیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں۔ انہوں نے بندروں کو ڈرانے کے لیے کسی بچے کی غلیل ہتھیالی تھی اور سر پر برقع کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب اچکتیں تو بندر تھوڑی دیر کو

ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے ان کے آئے دن باسی ٹکڑوں پر چخ چلتی رہتی۔ محلہ میں جہاں کہیں شادی بیاہ، چلا چالیسواں ہوتا، نانی جوٹھے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ چکمہ دے کر حصہ لیتیں۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اسے حسرت سے تکتیں! کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں۔ چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لیے نانی ٹاٹ کے بسیروں پر جھوٹے ٹکڑے پھیلا کر سکھا لیتیں پھر انہیں مٹکیوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چر مر کیے۔ پانی کا چھینٹا دیا چٹکی بھر نون مرچ بر کا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ ان پر ہیضہ طاری کر چکا تھا۔ چنانچہ بس جانے پر طوعا" و کرہا" ان ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں، تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموما" کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفتا" بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جھوٹے ٹکڑے جنہیں بٹورنے کے لیے نانی کو ہزاروں سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی سر پر برقع کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لیے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "لگے لگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو ان سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہاں بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے اور کیوں بد ذات لال پچھائے والا، ان ہی کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقع کے ساتھ ان کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ ان کی گڑیا، وہ اپنے سارے دکھ اس تکیہ ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انہیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیر سے لگی برقع کی آڑ میں نیفہ سے جوئیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے، یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا کوئی نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں۔ وہ چلائیں کہ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے، روٹی دے۔ جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹکی بھر ٹکڑے لٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اس کا جی نہ پگھلا اور اس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کیے۔ وہی غلاف جنہیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی اور آخری غلاف بھی اتر گیا اور بندر نے ایک

ایک کر کے چھجر پر سے ٹپکانا شروع کیے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی۔ نبو سقے کا انگوچھا---- حسینہ بی کی انگیا---- منی بی کی گڑیاں کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھنا----

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ----- منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیض کی آستین مع کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی کجلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ----- ملا جی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ

بسم اللہ کا سوکھا ہوا مال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ' دوب اور چاندی کا چھلا اور بشیر خان کا گلٹ کا تمغہ جو اسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکار عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا---- بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور---- بے ایمان---- کمینی۔"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے۔"

"پولس میں دیدو۔"

"ارے اس کی توشک بھی کھولو' اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا۔" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک' سرنیچا اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھر جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے ہل ہل سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں----- دم بھر کو اونگھ جاتیں پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی چپکی بیٹھی روتیں' کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلّہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کے رو پیٹ کے بھول چکے تھے--- وہ بے چارے خود کون سے لکھ پتی تھے' تنکے کا بوجھ بھی ایسے موقعے پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ شبن کی فتوئی اب سردیوں سے دھینگا مشتی کرنے کے قابل کہاں تھی' وہ اس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بے کار سمجھ کر اسے خیر آباد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیاں کا غرارہ کس مصرف کا وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گزر کر ہنڈ کلھیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان لینا تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانے میں ایک دیو تھا۔ اس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا' اس صندوق میں ایک اور صندوق اور صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا---- اور اس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑی' ادھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ پھر اس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مر گیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اتر گئی۔

ہوئی ضائع شدہ آنکھ بند رکھی۔ اپنی انگلیوں کے درمیان سے اس فضا کو دیکھا جو کہ فوکس میں نہیں آرہی تھی اور اس نے آخری حملے کے گھماؤ کی شدت میں اپنے آپ کو ایک جلن آمیز اندھیرے میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ بوندا باندی میں لپٹی صبح میں تلواریں چمک رہی تھیں ارد گرد کے سیاہی مائل درخت مسخ شدہ حالت میں تھے اور اس وقت تک جب تک ان کی تلواریں خون میں ڈوب نہیں گئیں اور جب تک انہوں نے لڑنا بند نہیں کیا اس وقت تک ان کے ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دیتی رہی' جبکہ لڑنے والے کسی راضی نامے کی امید بھی نہیں کر رہے تھے۔"

لمبے قد کے سفید بالوں والے شخص نے اپنے آپ سے کہا "یہ ابھی تک میرا پیچھا کر رہا ہے" میں مڑ کر اس کے یہاں تک پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اس سے کیا کہوں گا؟ کیا اب اتنے سالوں کے بعد میں اس سے سچی بات کہہ پاؤں گا۔ وہ اس کا یقین نہیں کرے گا۔ سچائی بھی انسانوں کی طرح زیادہ تیزی کے ساتھ بوڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سچائی نے کبھی کمزوروں کا ساتھ نہیں دیا۔ اور وہ موٹا ہے اور غمگین ہے۔ بس اس کے پاس صرف اس کی انا ہے۔ حتی کہ اس کی نفرت بھی اب محض اس کے احساس کا ایک چکر ہے۔ اس بے چارے بندے کے لئے میں اس وقت صرف اظہار افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ نفرت کا حوالہ تو کوئی موجودہ حقیقت ہی بن سکتی ہے۔ میری شرمندگی تو اب میری یادداشت میں بھی محفوظ نہیں رہی کیونکہ اب اس کا کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔۔۔۔ اور اس کا کوئی وجود پہلے بھی اس طرح بھی کبھی نہیں رہا جیسے کہ دوسری چیزوں کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اگر میں مڑ کر اسے دیکھوں تو اس سے کیا کہہ سکتا ہوں؟

"غدار گھٹیا 'مخبر"۔۔۔۔ خاموش تماشائیوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔ وہ اس شخص سے مخاطب تھا جس نے اس کے خیال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کے عوض اپنی آزادی خریدی اور اب وہاں کھڑا خاموشی کے ساتھ ان کے خلاف شہادت دے رہا تھا اور جس نے اس سے پہلے کبھی ان اپنے باغی تحریک کے ساتھیوں کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ چاروں طرف ذلت کا شور تھا۔ جج نے میز پر اپنا ہتھوڑا بجایا تو وہاں رکھے کاغذ ادھر ادھر اڑنے لگے اور وہ پھر اپنی کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ایک شخص کی مستقل خاموشی اور دوسروں کے شور کی وجہ سے جج سخت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ باقی کے سارے ملزمان نہایت مضطرب حالت میں بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں خاص طور پر وہ شخص زیادہ مضطرب تھا جس کے بھائی کے خلاف الزام عائد کیا گیا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک بھاری بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ اپنے بھائی پر عائد ہونے والے الزام کی ذلت کو صرف وہی بھگت رہا ہو۔ لیکن وہاں موجود ہر شخص ہی اس ملزم کی جانب دیکھ رہا تھا جو شاید اپنے خلاف ہونے والی باتوں کو سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ نہایت پر سکون انداز میں بیرکوں کی دیواروں کے ساتھ ہوا میں جھولتی درختوں کی شاخوں کو گھور رہا تھا۔

چھڑی والے شخص نے اپنے خیالات سے باہر آتے ہوئے اپنی رفتار کم کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "اس دن کے بعد سے ان میں سے ایک سے زیادہ آدمی میرے پیچھے لگے رہے ہیں" جنگ شاید کافی نہیں تھی۔ چاؤس میں بغیر کسی مقصد کے ایک لاکھ آدمی مارے گئے تھے۔ فتح کی پریڈ کے صرف ایک دن بعد یہ لغو لڑائی جو محض دو بھوتوں کے درمیان تھی شاکو کے سنگلاخ سورج کی گرمی میں سڑ رہی تھی اور پھر دوبارہ یہی لڑائی نئے انقلابات بغاوتوں اور سازشوں کے ایک نہ ختم ہونے والے دور کے ساتھ شروع ہوئی جس کے اپنے ہیرو اور اپنے غدار تھے۔ کل کے جلاد آج کے مجرم تھے اور آج کے مجرم کل کے جلاد تھے۔ اسے وہ کرنل یاد تھا جس نے

مانیج پارووسکی / پیروز بخت قاضی

سیڑھیاں

میں اپنی بیوی اور بارہ ماہ کے بچے کے ہمراہ اپنی ساس اور سسر کے مکان میں بالائی کمرے میں رہتا ہوں۔ یہ ایک عمدہ اور آرام دہ کمرہ ہے جہاں میں سو سکتا ہوں' کتابیں پڑھ سکتا ہوں' پائپ کے کش لگا سکتا ہوں اور اگر میرا بیٹا مداخلت نہ کرے تو ٹائپ مشین پر کام کر سکتا ہوں۔ لیکن باقاعدہ گھریلو زندگی نیچے میرے ساس سسر کے رہائشی حصہ میں یا موسم اچھا ہونے کی صورت میں باغیچہ میں گزاری جاتی ہے۔

مکان' باغیچہ' کتوں کا گھروندہ' شیڈ سب باڑ کے اندر ہیں اور باڑ کے پیچھے سو میٹر سے بھی کم فاصلے پر درختوں اور جھاڑیوں کے پتے ہوا سے چرمر چرمر ساز بجاتے ہیں۔ میرا بیٹا اکثر باڑ کے ساتھ اپنی ناک پچکا کر دور جھانکتا ہے جہاں کھلا میدان ہے اور اس کے آگے چرمر کرنے والے درخت ہیں اور سڑک ہے جہاں سرخ بسیں کچھ دیر رکتی ہیں اور پھر آگے روانہ ہو جاتی ہیں۔

میں باپ کے روپ میں اس کے قریب کھڑا ہوتا ہوں تاکہ میرا بیٹا کسی ممکنہ حادثہ سے بچا رہے۔ اس طرح میں ایک معصوم کے پروان چڑھتے شعور کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ دو تین سال کے عرصہ میں یہ شعور پروان چڑھ جائے گا۔ میرا بیٹا جو اولین تاثرات یاد رکھے گا وہ یہی درخت' بسیں اور تاروں کے جال ہوں گے۔ وہ پھر بھی یہاں آیا کرے گا کیونکہ اس منظر اور سٹیج پر اس کا بچپن گزرا ہوگا۔...... میں نے اپنا بچپن ایک اور جگہ دوسرے قصبہ میں گزارا ہے جہاں دیگر قسم کے گھر اور درخت تھے۔ میرے لئے یہ جگہ ایک اور جگہ ہے' محض راستے کا ایک پڑاؤ ہے' ایک بندرگاہ ہے جہاں میں کسی اور جگہ سے آکر رکا ہوں اور پھر کسی اور جگہ روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن میرے بیٹے کے لئے یہ جگہ نہایت اہم رہے گی۔

میرے لئے یہ امر زیادہ پریشان کن نہیں ہے کہ ہماری زندگیوں کی کہانیاں ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر کہانی اپنی جگہ انوکھی ہے۔ میری پریشانی کسی اور بات پر ہے۔ گھر کے اندر سیڑھیاں ہیں جو گراؤنڈ فلور سے لے کر بالائی چھت تک جاتی ہیں اور وہاں سے نیچے آتی ہیں۔ میرا بیٹا زیادہ وقت نیچے اپنے نانا نانی کے کمرے میں گزارتا ہے۔ وہاں ایک کوچ ہے جس پر وہ اچھلتا کودتا ہے۔ اس کے زیادہ تر کھلونے بھی وہیں پڑے ہیں۔ لیکن جب بھی بڑے کمرے کا دروازہ کھلا ہو وہ فوراً" موقع غنیمت جان کر اپنی ننھی ٹانگوں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا باہر نکلتا ہے اور سیڑھیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے بالائی کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیاں تقریباً" عمودی ہیں جو لکڑی کی سیڑھیوں سے مشابہہ ہیں اور ان کے اندر خلاء موجود ہے۔

میرے بیٹے کو اوپر چڑھنے کا جنون ہے۔ ایک گھٹنا پہلی سیڑھی پر رکھتا ہے اور پھر دوسری سیڑھی کی طرف لپکتا ہے اور اپنے منہ سے ہاتھ کے ساتھ اگلی سیڑھی پکڑ لیتا ہے جو اس کے سر سے بھی اونچی ہوتی ہے۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنے جسم کو اوپر اٹھاتا ہے اور اپنے سر کو سیڑھیوں کی ریلنگ کے سہارے ٹکا دیتا ہے۔ ہماری

طرف دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور وہ ہمارے قہقہوں اور تالیوں کا انتظار کرتا ہے۔ پھر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اگلی سیڑھی پر اپنا گھٹنا رکھ دیتا ہے۔ نانی اماں اسے ہمیشہ ایک خطرناک کھیل قرار دیتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ میں اپنے بیٹے کو فوراً" سیڑھیوں سے اٹھالوں' کمرے میں واپس لے آؤں اور اسے گیند یا دوسرے کھلونوں سے مصروف کر دوں۔ جہاں تک بچے کو خطرہ سے بچانے کا معاملہ ہے میں اس کی نانی اماں کے ساتھ پوری طرح متفق ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میں اپنے بیٹے کو سیڑھیوں کی بالائی حد تک چڑھنے دیتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک سیڑھیاں چڑھنے سے میرے بیٹے کی تربیت ہوتی ہے۔

میری رائے میں سیڑھیاں چڑھنا ایسی مصروفیت ہے جو اسے پختہ زندگی کے لئے تیار کر سکتی ہے۔ اس لئے میرا دل فخر کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میرا بیٹا اپنی مرضی سے سیڑھیوں کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہے۔ بدقسمتی سے جلد بلوغت آنے کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ وہ میری بجائے اپنی آنکھوں سے دنیا کو جلد دیکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس طرح وہ میرے کردار کی وہ خصوصیات بھی جلد جان جائے گا جن پر مجھے فخر نہیں اور جن کو میں نے اب تک چھپا رکھا ہے۔ مختصراً" یوں کہہ لیں کہ اس کے سیڑھیاں چڑھنے سے مجھے اپنا جانشین نسبتاً" جلدی میسر آجائے گا۔

اس طرح میں ان گنت شبہات میں گھرا ہوں۔ جب وہ اوپر چڑھتا ہے تو بلوغت کے مراحل' جدید طرز پرورش اور جلد زندگی شروع کرنے کی خوبیوں کے بارے میں میرے تمام خیالات لرزنے لگتے ہیں اور میرے شبہات کی تصدیق ہونے لگتی ہے۔

ہو سکتا ہے میں خود فریبی میں مبتلا ہوں لیکن اب مجھے یوں لگتا ہے کہ جلدی پختہ خیالی پا لینے میں کئی خطرے پوشیدہ ہیں۔ میرا بیٹا سکول میں قبل از وقت خود کو منوانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ وہ دوسرے لڑکوں کی نسبت اپنے فیصلوں پر جلد عمل شروع کر سکتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے پیشتر لڑکیوں میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ کب خود کو اتنا بالغ سمجھنے لگے کہ سگریٹ نوشی کر سکے۔ ان سب باتوں کا اس کے کردار پر اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ زندگی کی راہیں جس طرح سر کرے گا شاید اس کا فیصلہ اب ہو رہا ہے' جب وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے اور میں اسے اوپر چڑھنے سے منع نہیں کرتا۔

لیکن یہاں میرے مسائل ختم نہیں ہوتے۔ سیڑھیاں طے کرنے سے کسی کو زندگی میں کمال حاصل نہیں ہو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی اس سے کہیں مشکل ہے۔ شاید مجھے بچے کو سیڑھیوں سے نیچے اتار لینا چاہیے اور اسے کمرے میں بند کر دینا چاہیے تاکہ وہ سیڑھیوں کی طرف نہ بڑھے۔ اس طرح اسے معلوم ہو گا کہ زندگی کی ہر شے اتنی آسان نہیں جتنا سیڑھیاں چڑھنا۔ اسے ہمیشہ ہر قسم کی مشکلات کی گنجائش رکھنی چاہیے جن کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف میرے اندر کسی مرد کے ساتھ ----- چاہے وہ بارہ ماہ کی عمر کا ہو----- بچگانہ کھیل کھیلنے کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور میں سارے معاملے کو ایک اور انداز سے دیکھتا ہوں۔ تمام تر احتیاط کے باوجود سیڑھیوں سے گر جانا انتہائی آسان بات ہے۔ تو کیا میں یہ خطرہ مول لے لوں؟ جب تک ہم کمرے کے اندر اکٹھے ہیں اور قالین یا صوفے پر اچھل کود کر رہے ہیں۔ جب تک ہم گیند پھینک کر یا بلی کے کان مروڑ کر کھیل رہے ہیں اس وقت تک میں غیر محتاط رہتا ہوں اور بعض اوقات خود کو اپنے بیٹے کا باپ نہیں بلکہ بڑا بھائی سمجھنے لگتا ہوں۔ یہاں تک تو سب ٹھیک ہوتا ہے۔ لیکن جونہی اتفاق سے دروازہ کھلتا ہے اور میرا بیٹا ہال کی طرف جا کر سیڑھیوں تک پہنچ جاتا ہے تو میں پدرانہ ذمہ داری کا بھاری بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ

ہی خاموشی سے ایک ہچکچاہٹ میرے دل میں گھر کر لیتی ہے۔۔۔۔ اس امر کی ہچکچاہٹ کہ میں اسے وقت سے پہلے ذمہ داریوں کی چھڑی تو نہیں سونپ رہا؟

آگستو روا بستوس / محمود احمد قاضی

غدار سے ملاقات

اخبار فروش اس کی طرف بقایا ریز گاری بڑھا رہا تھا لیکن وہ ریز گاری وصول کرنے کے لئے اپنا ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا۔ یا پھر یہ کہ ایسا کرنا بھول ہی گیا تھا۔ اچانک اس کی توجہ فٹ پاتھ پر چلنے والے اس شخص کی طرف مرکوز ہو گئی جو اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو گھما رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ یہ تو وہی ہے "اس نے اپنے سے کہا' اسے وہی ہونا چاہئے" پلک جھپکنے کے لمحے میں گذرے وقت کے کئی چھوٹے بڑے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ اسی ایک واضح لمحے میں اس نے اسے پیچھے سے پہچان لیا تھا۔ کیونکہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں دائیں بائیں آگے پیچھے کہیں سے بھی دیکھا جائے تو ہم بغیر کسی غلطی کے ان کی فوراً شناخت کر لیتے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے چشم زدن میں ہاتھ میں چھڑی لئے اس شخص کو اجنبی لوگوں کے اس ہجوم کے درمیان فوراً" پہچان لیا تھا حالانکہ وہ اس کی طرف اپنی پشت کئے ہوئے تھے۔
لیکن دوسرے شخص نے جس کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی ذرا سا لرز گئی تھی اس کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اس کی کیفیت میں یہ واضح تبدیلی کسی خوف کی بنا پر نہ تھی' نہ ہی مدہوشی کی وجہ سے اور نہ ہی حیرانی کی بناء پر تھی بلکہ اپنے خیالات کی فوری تبدیلی کی وجہ سے تھی اور جس کا حوالہ وہ گزرا ہوا وقت تھا جو اچانک سمٹ کر اس ایک لمحے میں اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کی حالت اس شخص جیسی تھی جیسے غیر متوقع طور پر پھسلن والی ایسی اینٹوں پر سے گزرنا پڑ گیا ہو جنہوں نے اس کے ذہن کو بھی ہلا جلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اس پہلے شخص کو اخبار فروش سے اخبار لے کر اسے خوبصورتی سے تین تہوں میں تبدیل کرتے دیکھ لیا تھا۔ جب اخبار پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوئی تو اس نے اس کے ہاتھ کی حرکت کو محسوس کر لیا تھا۔ "یہ تو وہی ہے"۔ یعنی چھڑی والے شخص نے بھی اپنے آپ سے یہی الفاظ ادا کئے تھے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے مزید کہا "یہ ٹھیک ہے کہ یہ پہلے سے موٹا ہو گیا؟۔۔۔ مگر یہ وہی ہے"
پہلے شخص نے جس انداز سے ہاکر کو پیسے پکڑائے تھے اسی سے اس کے بارے میں اسے یقین ہو گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھے بغیر کہ اس دوسرے شخص نے بقایا ریزگاری واپس نہیں لی تھی اپنے آپ سے کہا "اب بھی اس کی وہی شان ہے" چھڑی والا شخص مڑا نہیں' یہ اس کی عادت تھی لیکن اس کی شخصیت بناوٹی نہیں تھی اگر اس کے رویئے میں کوئی بناوٹ جھلکتی تھی تو کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس سے حظ حاصل کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی رنگدار چھڑی نے اب دوبارہ وہی رفتار پکڑ لی تھی۔
جو شخص اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ پرانا قصہ جو اس کے ذہن میں محفوظ تھا اور ابھی باسی نہیں ہوا تھا دوبارہ اپنی تمام تر جزیات کے ساتھ اس کے ذہن میں زندہ ہو اٹھا تھا۔ وہ اپنے آگے چلنے والے شخص سے آگے نکلنے کے لئے اور تیزی سے چلنے لگا تھا۔ دوسرا شخص اپنی چھڑی کی نوک کو فٹ پاتھ پر

آہستہ سے رکھتے ہوئے اور اسے اپنی انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے آہستگی سے اس لئے نہیں چل رہا تھا کہ وہ بوڑھا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

وہ شخص جو اس کا پیچھا کر رہا تھا بڑبڑایا "بجو کا" "بالکل پہلے جیسا"۔ پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنے آگے چلنے والے شخص کا تجزیہ کیا۔ وہ سیدھا اور مضبوط تھا اس کے سفید ہوتے ہوئے بالوں کے نیچے اس کی گردن نوجوان جیسی تھی اور اگرچہ اس کا بایاں کندھا قدرے جھک گیا تھا اور س کی لمبی ٹانگوں میں وہ جوانوں والی پھرتی نہ تھی مگر پھر بھی اس کا فوجی انداز ابھی باقی تھا۔ یا یہ کہ اس کے انداز میں اسی فوجی شان کی بھونڈی نقل موجود تھی۔ وہ شخص جس کے ہاتھ میں اخبار تھا اس نے یہ بات نوٹ کی کہ اس دوسرے شخص کا سوٹ اگرچہ پرانا تھا مگر صاف ستھرا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس دوسرے شخص کی چست ملٹری جیکٹ کی تراش خراش پرانے وقت کے سٹائل سے مشابہ تھی۔ البتہ اس کے متعلق ایک بات بالکل واضح تھی کہ وہ اپنے موٹاپے کی طرف مائل جسم کی وجہ سے کھلے کھلے کپڑے پہننے پر مجبور تھا۔ پیچھا کرنے والے شخص نے اپنے ہاتھ کی پشت کو اپنے گیلے چہرے پر پھیرا۔ پسینے نے اس کے تہہ شدہ اخبار کو بھی نم آلود کر دیا۔

"وہ ہیں میرے پیچھے۔" چھڑی والے شخص نے اپنے آپ سے کہا "میں حیران ہوں کہ اب بھی وہی کچھ ہو رہا ہے گا۔ بے شک انہیں میری طرف سے ابھی تک اطمینان نہیں ہوا۔ تیس سال تک ہم ایک دوسرے کے لئے مردہ رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک اب اچانک زندہ ہو کر میرا پیچھا کرنے میں لگ گیا ہے۔"

دونوں اشخاص جنہیں کہ اس کی توقع نہ تھی اچانک ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے تھے اور اب ایک دوسرے ملک کی سڑک پر وہ زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے۔ لیکن چھڑی ہاتھ میں لے کر چلنے والے شخص نے اچانک محسوس کیا۔ کہ دوسرا شخص اس سارے گزرے وقت میں اس کا پیچھا کرتا رہا تھا اور سب چند قدموں کے فاصلے سے ان گزرے سالوں کی ساری اذیت اپنی تمام تر جزئیات اور وضاحت کے ساتھ دہرائی جا رہی تھی۔ یہ شخص اس نیوز سٹینڈ سے جہاں وہ اتفاقاً" رک گیا تھا اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا بلکہ اس زمانے سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا جب ایک مخبر کی رپورٹ پر "اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا تھا' اور پھر جب اس کا کورٹ مارشل ہوا تھا اور پھر اسے ایک دور افتادہ بنجر علاقے میں واقع اس جیل خانے میں ڈال دیا گیا تھا جہاں ناریل کے درختوں کے تنے سلاخوں کی طرح تھے اور جہاں کا خشک ماحول آزادی کے لئے ایک بھونڈا مذاق تھا۔ یہ شاکو کا وہی جنگلی علاقہ تھا جو چند ماہ بعد ہی سینکڑوں ہزاروں سپاہیوں کی ہڈیوں اور گوشت کو نگلنا شروع کر دیتا تھا۔ دونوں اشخاص اس جنگ میں اتفاقیہ طور پر بچ نکلے تھے اور شاید اس طرح وہ ایک دوسری طرح کی موت کا شکار ہونے کے لئے چن لئے گئے تھے۔ اور اب پھر ان میں سے ایک دوسرے کو شکار کرنے کے چکر میں تھا' جیسے کہ کچھ بھی نہ بدلا ہو اور جیسے کہ ابھی تک اس انتقامی جذبے' نفرت اور بے وجہ بے عزتی کی تلافی ممکنہ حد تک نہ ہوئی ہے اور جو ناراضگی پر مبنی ایک ایسی لاتعلقی میں ڈھل گئی ہو اور جس کا تعلق جسمانی نہیں روحانی ہو۔

"لڑائی بند کرو" ڈاکٹر نے ان کے قریب پہنچتے ہوئے کہا تھا "کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ یہ آدمی اب مزید نہیں لڑ سکتا"

لیکن اس نے بغیر جذبے اور حوصلے کے محض ہٹ دھرمی کی بنا پر لڑائی جاری رکھی تھی اور اس کے پیچھے سوائے اس کے کوئی اور وجہ نہ تھی کہ وہ بس آخر تک لڑنا چاہتا تھا' جیسے کہ شرابی لوگ بعض اوقات اپنی ضد میں بہادری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ اس نے اپنے خون آلود چہرے کے ایک طرف اپنا بایاں ہاتھ رکھا اور اس نے دھندلاتی

ہوئی ضائع شدہ آنکھ بند رکھی۔ اپنی انگلیوں کے درمیان سے اس فضا کو دیکھا جو کہ فوکس میں نہیں آ رہی تھی اور اس نے آخری حملے کے کھچاؤ کی شدت میں اپنے آپ کو ایک جلن آمیز اندھیرے میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ بوندا باندی میں لپٹی صبح میں تلواریں چمک رہی تھیں ارد گرد کے سیاہی مائل درخت مسخ شدہ حالت میں تھے اور اس وقت تک جب تک ان کی تلواریں خون میں ڈوب نہیں گئیں اور جب تک انہوں نے لڑنا بند نہیں کیا اس وقت تک ان کے ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دیتی رہی' جبکہ لڑنے والے کسی راضی نامے کی امید بھی نہیں کر رہے تھے۔"

لمبے قد کے سفید بالوں والے شخص نے اپنے آپ سے کہا "یہ ابھی تک میرا پیچھا کر رہا ہے" میں مڑ کر اس کے یہاں تک پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اس سے کیا کہوں گا؟ کیا اب اتنے سالوں کے بعد میں اس سے سچی بات کہہ پاؤں گا۔ وہ اس کا یقین نہیں کرے گا۔ سچائی بھی انسانوں کی طرح زیادہ تیزی کے ساتھ بوڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سچائی نے کبھی کمزوروں کا ساتھ نہیں دیا۔ اور وہ موٹا ہے اور غمگین ہے۔ بس اس کے پاس صرف اس کی انا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی نفرت بھی اب محض اس کے احساس کا ایک چکر ہے۔ اس بے چارے بندے کے لئے میں اس وقت صرف اظہار افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ نفرت کا حوالہ تو کوئی موجودہ حقیقت ہی بن سکتی ہے۔ میری شرمندگی تو اب میری یادداشت میں بھی محفوظ نہیں رہی کیونکہ اب اس کا کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔۔۔۔ اور اس کا کوئی وجود پہلے بھی اس طرح بھی کبھی نہیں رہا جیسے کہ دوسری چیزوں کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اگر میں مڑ کر اسے دیکھوں تو اس سے کیا کہہ سکتا ہوں؟

"غدار گھٹیا 'مخبر"۔۔۔۔ خاموش تماشائیوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔ وہ اس شخص سے مخاطب تھا جس نے اس کے خیال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کے عوض اپنی آزادی خریدی اور اب وہاں کھڑا خاموشی کے ساتھ ان کے خلاف شہادت دے رہا تھا اور جس نے اس سے پہلے کبھی ان اپنے باغی تحریک کے ساتھیوں کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ چاروں طرف ذلت کا شور تھا۔ جج نے میز پر اپنا ہتھوڑا بجایا تو وہاں رکھے کاغذ ادھر ادھر اڑنے لگے اور وہ پھر اپنی کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ایک شخص کی مستقل خاموشی اور دوسروں کے شور کی وجہ سے جج سخت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ باقی کے سارے ملزمان نہایت مضطرب حالت میں بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں خاص طور پر وہ شخص زیادہ مضطرب تھا جس کے بھائی کے خلاف الزام عائد کیا گیا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک بھاری بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ اپنے بھائی پر عائد ہونے والے الزام کی ذلت کو صرف وہی بھگت رہا ہو۔ لیکن وہاں موجود ہر شخص ہی اس ملزم کی جانب دیکھ رہا تھا جو شاید اپنے خلاف ہونے والی باتوں کو سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ نہایت پر سکون انداز میں بیرکوں کی دیواروں کے ساتھ ہوا میں جھولتی درختوں کی شاخوں کو گھور رہا تھا۔

چھڑی والے شخص نے اپنے خیالات سے باہر آتے ہوئے اپنی رفتار کم کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "اس دن کے بعد سے ان میں سے ایک سے زیادہ آدمی میرے پیچھے لگے رہے ہیں" جنگ شاید کافی نہیں تھی۔ چاؤس میں بغیر کسی مقصد کے ایک لاکھ آدمی مارے گئے تھے۔ فتح کی پریڈ کے صرف ایک دن بعد یہ لغو لڑائی جو محض دو بھوتوں کے درمیان تھی شاکو کے سنگلاخ سورج کی گرمی میں سڑ رہی تھی اور پھر دوبارہ یہی لڑائی نئے انقلابات بغاوتوں اور سازشوں کے ایک نہ ختم ہونے والے دور کے ساتھ شروع ہوئی جس کے اپنے ہیرو اور اپنے غدار تھے۔ کل کے جلاد آج کے مجرم تھے اور آج کے مجرم کل کے جلاد تھے۔ اسے وہ کرنل یاد تھا جس نے

کورٹ مارشل کی کارروائی کی سربراہی کی تھی۔ جنگ کے بعد چند بیرکوں میں ہونے والی بغاوت کے الزام میں اسے بھی جیل بھیج دیا گیا تھا جہاں غصے اور نفرت سے بھرے ننگے پاؤں والے گارڈ اسے ہر صبح لوہے کی تار کے ٹکڑوں سے مارتے تھے۔ آخر کار کرنل پاگل ہو گیا اور پھر وہ چمڑے کے موٹے تسموں میں لپٹا' جسم پر نئے زخم لئے مکھیوں کے جلوس میں ادھر ادھر آوارہ پھرتا سمجھ میں نہ آنے والے بے مزہ گیت گاتا رہتا تھا۔"

اس کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی لرز سی گئی تھی لیکن ہر قدم کے ساتھ اس کی رفتار میں کمی آتی جا رہی تھی جیسے کہ اس کا پیچھا کرنے والا شخص ابھی اس پر جھپٹ پڑے گا اور عین اس کے سامنے آجائے گا۔

"بڑی مدت سے ایک سے زیادہ اشخاص میرا پیچھا کر رہے ہیں" چھڑی والے شخص نے اپنے آپ سے کہا "میرے ساتھی -- میرے سابقہ ساتھی -- یہ وہی ہیں جو مجھے ابھی تک نہیں بھولے۔ ان میں سے کچھ مجھے دیکھ کر اپنے کندھے ہلاتے ہوئے' مجھ سے دوبدو ہونے کے خیال کو اپنے ذہن میں لاتے ہوئے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ بہت سارا وقت گزر چکا ہے۔ وہ اپنی شکل دکھاتے ہیں اور میری شرمندگی مجھے ایک بت کی صورت میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ایک طرح سے اس لڑائی نے اس چیلنج کی حقیقت نے میری زندگی کو بحال نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ ایک لعنتی شخص کے ساتھ کون لڑ سکتا ہے۔ بے شک' میں اپنے سابقہ سنتیس (۳۷) ساتھیوں سے کبھی بھی لڑنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ جو شخص ہے اس کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ یہ بہت پرجوش اور ناراض شخص تھا۔ اب اس کے پاس سوائے اس کی انا کے کچھ نہیں رہ گیا۔ اس کے پاس صرف وہ علم ہے جس نے اس کی زندگی کو دوسروں کی موت سے کم ہی نقصان پہنچایا ہے۔ اسے یقین کامل ہے اور وہ ابھی تک یقین کئے جا رہا ہے کہ میں......

وہ شخص ایک دم تیزی سے چلنے لگا' پھر اچانک مڑ کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ نہایت پرجوش انداز میں وہ اخبار لہرا رہا تھا جو کہ ایکطرف سے مڑا ہوا تھا۔ وہ شخص جس کا پیچھا کیا جا رہا تھا وہ بھی رک گیا۔ وہ تھوڑا سا مڑا اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو اپنے پیچھے رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی کمر پر باندھ کر اس کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

"تم جانتے ہو میں کون ہوں" وہ بڑبڑایا

"ظاہر ہے"

دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ پیچھا کرنے والے شخص کی آنکھوں میں وہ نفرت تھی جس نے اس کی آنکھوں کے رنگ کو خون آلود کر دیا تھا۔ پیچھا کئے جانے والے شخص کی ایک آنکھ ہی زندہ تھی دوسری نہیں لیکن وہ رحم دل اور روادار نظر آتا تھا۔ حالانکہ وہ دوسرے شخص سے اپنے جذبات پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"غدار -- گھٹیا۔ مخبر"

یہ الفاظ جو کہ وقت کے ساتھ کھوکھلے ہو چکے تھے اور اب اس پرانے عدالتی کمرے کی محض بازگشت لگ رہے تھے ایک بار پھر اس پر کوئی خاص رد عمل ظاہر نہ کر سکے۔ لیکن اچانک پھر تیس سالوں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ تہہ کیا ہوا اخبار ایک کوڑے کی طرح اپنے مدمقابل پر برسا۔ دوسرے شخص کی مصنوعی آنکھ اس کی چوٹ سے باہر نکل آئی اور فٹ پاتھ پر گر کر چند انچوں کے فاصلے پر موجود ایک دراڑ میں جا رکی۔

حملہ آور کا ہاتھ آنکھ کے اس طرح اپنے خانے سے گرنے کی وجہ سے وہیں ہوا میں رک گیا تھا اس

اچانک ردعمل کی وجہ سے اس کا غصہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائے غصے اور نفرت کے آثار بھی معدوم ہونے لگے تھے۔ اس کا یہ نیا اظہار شاید اس مزاحیہ سچویشن کی بنا پر تھا یا پھر اس کے پیچھے شاید اس کا رحمدلی کا جذبہ کار فرما تھا۔ اور ایسی عظمت کا مظاہرہ انسان صرف اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کا واسطہ کسی ایسی ہی بڑی بدنصیبی سے پڑتا ہے۔

اس پہلے شخص کے لئے اس مڑے تڑے اخبار کی محض چوٹ سے آنکھ کا اپنے خانے سے باہر آجانا ایک اچنبھے کی بات تھی اور اسی لئے وہ اس نیچے گری ہوئی آنکھ کی طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ جب وہ اپنے دشمن کی طرف مڑا تو وہ ایسی حیران کن بے چارگی سے دوچار ہوا جو صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب آپس میں ملنے والے دو اشخاص ایک دوسرے کو پہچان نہ پا رہے ہوں۔

اور اب تیس سالوں بعد وہ دوسرا شخص کیسے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا کہ مجروح وہ نہیں بلکہ "اس" کا بھائی تھا جو کہ ایک ہیرو کے طور پر شاکو میں مرچکا تھا۔ اور وہ خود البتہ اس سارے عرصے میں ایک ملامتی شخص کی طرح زندہ رہا تھا۔ اس کے اپنے راز کی طرح یہ فرق کچھ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اب بھلا وہ کس طرح اس بات کی وضاحت کر سکتا تھا کہ جو رول اس نے ادا کیا اس سے وہ خوب لطف اندوز ہوا تھا؟۔

پہلا شخص مٹی میں پڑی آنکھ کو اٹھاتے ہوئے معافی مانگنے کے انداز میں ہکلا رہا تھا۔

"رہنے دو" چھڑی والے شخص نے کہا "میرے پاس دوسری اس طرح کی کئی ہیں ---- اور ویسے بھی اب یہ پرانی ہو چکی تھی"

چند متجسس راہ گیروں نے ان کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ دونوں نے تماشائیوں کو ایک طرف ہٹایا اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیئے!!

ونتورا اگارشیا کالڈیرون / اعجاز احمد فاروقی

لاٹری کا ٹکٹ

شاید یہ کہانی آپ نے کہیں پہلے بھی سنی ہوئی ہو؟ خیر' کوئی بات نہیں ہے میں اس کو دوبارہ سنا رہا ہوں اس لئے کہ یہ ایک اخلاقی رمز لئے ہوئے ہے اور اس سے کہیں زیادہ ایک ذہنی کیفیت کی رمز لئے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں یہ موجودہ عہد کی رمز سے بھی خالی نہیں ہے۔

وہ رقاصہ جس کا نام' سالیلتو ہے وہ گزشتہ پندرہ برس سے ہسپانیہ کی مقبول ترین بیلی ڈانسر ہے۔ گرچہ وہ میڈرڈ کے ذوق کے مطابق نہیں تھی جس پر اس وقت ترکی کا نسوانی ذوق چھایا ہوا تھا جو ہر طرف سے بھرے بھرے نسوانی جسم کا رسیا تھا وہ وینس تھی اور مائیلو نہیں تھی جس کے کولہوں کا گھیر ہی تین فٹ اور گیارہ انچ ہو۔

آپ کو یاد ہو گا کہ سالیلتو اپنی طرز کے رنبا رقص میں اپنی گلابی انگلی آسمان کی جانب کئے رہتی تھی اور تماشائی اس کی ایک مزید جھلک کے لئے از خود بیگانہ ہو کر کس قدر اودھم مچایا کرتے تھے اور وہ کیسے ایک سیکنڈ کے لئے اس کی اجازت دیا کرتی تھی۔ اس وقت وہ ایک معزول شدہ فرشتے کی مانند مسکرا رہی ہوتی تھی۔ اگر آپ نے سالیلتو کا رنبا رقص کبھی نہیں دیکھا تو پھر آپ نہیں جان سکتے کہ گرم علاقوں کے رہنے والوں کی محبت کیسی شدید اور جوشیلی ہوتی ہے۔ سالیلتو 'اپنے رقص کے دوران اپنے جسم کی جنبشوں سے ہوس کو بھڑکانے کا ظالمانہ کھیل' کھیلتی تھی جو کہ ادھورا بھی ہوتا تھا وہ ہمیشہ 'ایرانی پروانے کی طرح آگ سے کھیلتی تھی لیکن خود نہیں جلتی تھی۔

سالیلتو نے رقص کرنا غرب الہند میں سیکھا تھا جو اس کہانی کا مرزبوم بھی ہے۔ نیم عریاں رقص تو بورژوا خاندانوں کے لئے ایک تماش بینی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں چھاتیوں کو بھی بڑے ہوس انگیز انداز سے جھلایا جاتا ہے۔ چھاتیاں جو دو خوبصورت پیالوں جیسی ہوتی ہیں۔ چھاتیاں جھلانے کے اس کھیل میں بعد کو ہوس انگیز اور بے لگام شال کی باری آتی تھی جسے دم بھر کے لئے ایک ناقابل فراموش لمحے کے لئے اتار پھینکا جاتا تھا۔

جب کوئی سالیلتو کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں لیکن اس سے خود سالیلتو کو کوئی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ روئے زمین پر کوئی عورت ایسی نہیں جو اس سے زیادہ مردوں کی ذہنیت کو جانتی ہو۔ ایک مرتبہ جب کیوبا کے دورے پر تھی تو اس نے مردوں کو دیوانگی' جوش اور از خود رفتگی کی ایسی منزل پر پہنچا دیا تھا کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے لاٹری ڈالنے کی ضرورت ناگزیر ہو گئی تھی۔ یہ تصور ہی کس قدر اچھوتا ہے تاہم لاطینی امریکہ کے ماحول کے لئے کوئی نرالی چیز نہیں ہے' جہاں ہر شے حتیٰ کہ حسین و جمیل عورتیں بھی اتفاق اور قسمت پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ شہد اور گنے کے اس جزیرے کے ایک دور افتادہ شہر میں جہاں سالیلتو رقص کرنے کے لئے آئی ہوئی تھی تماشائیوں نے ایک رات تھیٹر کے ٹکٹ اس لئے خریدے تھے کہ انہیں یہ موقعہ میسر آسکتا تھا کہ وہ رقص کے بعد سالیلتو کو شب بھر کے لئے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ جیتنے والا تو ایک ہی

تماشائی ہو سکتا تھا لیکن ٹکٹ گھر پر بے پناہ ہجوم تھا ہر ایک ڈان جان بنا ہوا تھا اور اپنے ممکنہ رقیب کو حقارت اور نفرت سے دیکھ رہا تھا جو خواہ اس کا پڑوسی ہی تھا' جو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی ہونے کا حق خرید رہا تھا۔

اس شام' سائیلنو خود بھی قدرے گھبرائی ہوئی تھی اور اس کی پژمردہ نگاہوں میں قریباً" حیا جھلک رہی تھی خصوصاً" جب وہ تماشائیوں کو دیکھتی تھی جنھوں نے اتنا اودھم مچایا ہوا تھا کہ موسیقی کی کوئی بھی اور دھن سننے سے انکار کر دیا تھا وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتے تھے کہ سائیلنو تھرکے' رقصاں قدم اٹھائے اور "ارزا" کے ملائم الفاظ گنگنائے۔ لیکن کوئی بھی جذبات سے مغلوب ہو کر چیخا چلایا نہیں اور نہ ہی کسی نے سائیلنو سے یہ استدعا کی کہ وہ ہوس انگیزی کو تیز کرے۔ ہر ایک اس دھن میں تھا کہ فی الفور لاٹری نکالی جائے اور جیتنے والے کے نمبر کا اعلان کر دیا جائے۔ لاٹری گھریلو کمیٹی کی طرح بڑی دیانت داری سے نکالی گئی۔

ایک بڑے ہیٹ میں ایسی تمام پرچیاں ڈال دی گئیں جن پر نمبر چھپے ہوئے تھے۔ صدارت کے فرائض بھی تھیٹر کے منیجر نے ادا کئے۔ وہ بھی اس خیال سے بڑا گھبرایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا کہ کسی کو اس پر دھوکہ دہی کا شک نہ ہو جائے۔ ایسے میں تو لوگ اسی وقت پٹائی کر سکتے تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ایسے میں کیا کچھ ہو سکتا ہے جب کہ اتنے سارے لوگ بس ایک لڑکی کے خواہاں ہو رہے ہوں۔ میری بات کا یقین کریں کہ یہ سب ایک خوبرو عورت کو پانے کی ہوس سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہسپانوی امریکیوں کے دلوں میں ایک یورپی ایکٹرس کے لئے کس قدر چاہ اور بے تابی ہوتی ہے۔ جو اندلس اور سانتا مارترے' کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے تو ایک فرانسیسی عورت ہی پورا پیرس ہوتی ہے اور ایک ہسپانوی عورت ان کے لئے پورا غرناطہ ہوتی ہے۔ یہ فنتاسیاں ایک قسم کا ذہنی خمار ہوتی ہیں اور ایک خوب صورت جسم بھی اس خمار کو کم کرنے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

عین آدھی رات کے وقت ایک شخص نے اپنی پشت کو ہیٹ کی طرف کیا اور پرچی نکالی اور کامیاب نمبر "۲۱۳" کو بلند آواز میں پکارا۔

سب کی نظریں جیتنے والے کو دیکھنے کے لئے متلاشی ہو گئیں۔ کچھ مزاحیہ آوازے بھی کسے گئے کہ جیتنے والا سٹیج پر آئے تاکہ لوگ اس کو سائیلنو کے ہمراہ جانے سے قبل دیکھ تو لیں۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور پورے ہال پر ایک متوقع خاموشی چھا گئی۔ ایک تماشائی جو کامیاب امیدوار کے قریب بیٹھا ہوا تھا اس نے اس کی کہنی پکڑ کر سیٹ نمبر ۲۱۳ سے اٹھایا۔

وہ ایک خوش شکل حبشی تھا۔ میکسیکو اور پیرو کے ہسپانوی فاتحین اس کو "آبنوس کا ٹکڑا" کہہ سکتے تھے۔ معمر خواتین تو ایسوں کو اب تک "حنا جیسا سیاہ" کہتی ہیں۔ وہ ایک دلکش اور مضحکہ خیز سنجیدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا جو رنگ دار لوگوں کا انداز ہے اس کی طنزیہ مسکراہٹ' لوگوں کی خوش باش نظروں کا شافی جواب لئے ہوئے تھے۔ اس نے دیدہ و دانستہ انداز میں اپنے ٹکٹ کو آہستگی اور تاخیر کے ساتھ بٹوے میں تلاش کیا جو اس کو ایک چکنے لفافے میں مل گیا۔ اس نے انعامی ٹکٹ کو سب کے سامنے لہرایا پھر اس کو پھاڑ کر پرزے پرزے کیا اور پرزوں کو ہوا میں ایسے اچھال دیا جیسے کوئی پرشاد تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہ تو گویا ایک کھلم کھلا اعلان تھا کہ اس نے سائیلنو کو دھتکار دیا ہے اور مسترد کر دیا ہے۔

لوگ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر رہے تھے کہ اس نے سائیلنو جیسے ہسپانیہ کے حسین ترین پھول کو مسترد کر دیا ہے۔ اس نے بڑی شان کے ساتھ سر ہلایا، وہ بہت متین اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا' اس نے جو احساس

شکست اور احساس ذلت پیدا کر دیا تھا اس سے وہ مسرور ہو رہا تھا۔
محکوم اور غلام نسلوں کی جملہ تلخی اس میں بھری ہوئی تھی۔ اپنے آباؤ اجداد کی جملہ احساس محرومی اس میں عود کر آئی تھی جو گنے کے کھیتوں میں غلام مزدوروں کی حیثیت میں کبھی کے مر کھپ چکے تھے۔ اس کے کوئلے جیسے سیاہ اور ضدی چہرے پر انتقام کی گرم جوش خوشی پھیل رہی تھی۔ اس نے اس انعام پر تھوک دیا تھا جس کے لئے ان گنت گورے مرے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے کاندھے جھٹکائے اور بڑی متانت' وقار اور ایک احساس برتری کے ساتھ تھیٹر سے جانے کی کرنے لگا۔
شکست خوردہ سائیلنتو ابھی سٹیج پر ہی ایستادہ تھی اور خالص ہسپانوی انداز میں اپنے ہاتھ اپنے کولہوں پر ٹکائے ہوئے تھے اس نے ایک ہسپانوی طیش کے ساتھ اپنی سبک سری اور نفرت کو اس پر تھوک دیا۔
سائیلنتو کو زبان ہلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تمام تماشائی اس سیاہ فام پر پل پڑے اور اس کو مارنے پیٹنے لگے۔
اس کو کل ہسپانیہ قبول نہیں تھا۔
وہ اندلس کی عزیزہ سے برگشتہ تھا اور متنفر و باغی بھی تھا۔
وہ اس کو اس کا مزہ چکھانا چاہتے تھے اور اس سیاہ کو ختم کرنا چاہتے تھے۔
کسی ہجوم کا ایک کو مارنا کوئی ان دیکھی بات نہیں تھی۔ بلاشبہ امریکہ میں کسی ایسے تنومند سیاہ فام کو اس بات کی سزا نہیں ملتی جو کسی سفید فام عورت کی عصمت دری سے انکار کر دے۔
کوئی آدھے گھنٹے کے بعد انہوں نے قریب المرگ سیاہ فام کو ہسپتال پہنچایا۔
اب چونکہ انہوں نے سائیلنتو کے لئے لاٹری نکالنے کا دھندہ اور کسب ترک کر دیا ہے اس لئے میں بھی آپ کو اس تھیٹر کا اتا پتا بتانے کی تکلیف نہیں کروں گا۔

رشید علیوف / ستار طاہر

بہار کا ایک دن

نور لیف کی شادی کے دن ایک ایسا واقعہ ہوا جواب کہانی بن چکا ہے اور میں یہی کہانی دہرا رہا ہوں۔

گاؤں میں شادی کے دن کافی چہل پہل تھی۔ نور لیف ویسے بھی گاؤں بھر کا چہیتا تھا اس لئے گاؤں میں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش پایا جا رہا تھا۔ نور لیف کے گھر کے اندر اور باہر گاؤں کے ہر عمر کے مرد جمع تھے۔ وہ بھی جو دلہن کے گھر دولہا کے ساتھ جانے والے تھے اور وہ بھی جنہیں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ گھر کے کمروں اور صحن میں عورتیں بھی گھوم رہی تھیں۔ شادی کے لباس میں کچھ بہت سج رہی تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جو شوخ رنگ کے کپڑوں میں کچھ زیادہ ہی بدصورت دکھائی دے رہی تھیں۔

سب دولہا کے انتظار میں تھے۔ جو غسل کے بعد ایک کمرے میں لباس پہن رہا تھا۔ جب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور نور لیف کمرے سے باہر نکل آیا تو سب آنکھیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ شادی کے روایتی لباس میں وہ خوب پھب رہا تھا۔ وہ طرحدار جوان تو تھا ہی دولہا کے لباس نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

نور لیف کی بوڑھی بیوہ ماں مریم نے اس کے گلے میں سرخ گلاب کے پھولوں کا بھاری ہار ڈالا تو مریم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ اب دولہن کے گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ نور لیف مسکرایا ماں کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو "ماں اجازت دو تو میں جاؤں ......" مریم کی بوڑھی آنکھیں اپنے بیٹے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اسے شاید وہ دن یاد آ رہا تھا جب نور لیف کا باپ ایسے سج دھج کر دولہا بن کر اسے بیاہنے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی مردوں اور بچوں کی بھیڑ میں راستہ بناتی ایک جوان عورت بوڑھی عورت کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

سب لوگ اسے تکنے لگے۔

وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی سیاہ لباس میں اس کا گورا چہرہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا جسم بڑا نازک اور ملوک تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں دہشت بھری ہوئی تھی' بے قرار آنکھیں' سر کے بال بہت کالے کوئلے سے بھی زیادہ سیاہ اور ہاتھ بہت گورے چٹے اور لمبی خوبصورت انگلیوں والے ....

وہ ادب سے بوڑھی مریم کے سامنے جھکی اور جب بولنے لگی تو سننے والوں نے سنا کہ ایسی شیریں آواز اس سے پہلے انہوں نے نہیں سنی تھی۔ "بزرگ ماں آج تیرے بیٹے کی شادی کا دن ہے۔ بڑی مسرت کا دن .... آج کے دن کیا تو میرے دامن میں کچھ نہیں ڈالے گی۔"

دیکھنے اور سننے والوں نے وہی کچھ دیکھا اور سنا جو دکھائی اور سنائی دے رہا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر خود کو راضی نہیں کر پا رہے تھے کہ ایسی جوان اور حسین دوشیزہ بھکارن بھی ہو سکتی ہے......

بوڑھی مریم نے اپنی بوڑھی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے پوچھا "تو کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟"

"بزرگ خاتون وعدہ کرو کہ آج کے دن میں تجھ سے جو مانگوں گی تو مجھے دے دے گی انکار نہیں کرے گی۔"

سال خوردہ تجربہ کار مریم نے کہا۔
"جب میں یہ نہیں جانتی کہ تو کیا مانگے گی تو میں وعدہ کیسے کر لوں۔" سب گویا دم سادھے اس انوکھے مکالے کو سن رہے تھے۔
"میں وہی کچھ مانگوں گی جو مجھے دے سکتی ہے لیکن اتنا ہی مانگوں گی جتنا میں حق رکھتی ہوں۔"
اچانک مجمع میں کھڑے کسی شخص نے کچھ کہا...... کچھ اور سرگوشیاں بھی سننے میں آئیں "نورلیف کیوں خاموش کھڑا ہے' اس کا چہرہ پیلا کیوں ہو رہا ہے۔ واقعی نورلیف کا رنگ زرد پڑتا جارہا تھا۔"
جیسے کوئی اندھا انجان کٹھن راستے پر ہمت کر کے خوف زدہ دلیری سے قدم اٹھاتا ہے اسی طرح مریم نے ہچکچاتی ہوئی ہمت سے پوچھا۔
"بتا تو کیا مانگتی ہے؟ میرے بس میں ہوا تو میں تجھے مایوس نہیں کروں گی' خاموشی کا بھاری لمحہ .... سب سانس روکے کھڑے تھے سب سوچ رہے تھے۔ وہ کیا مانگے گی.....؟
بڑی بڑی سیاہ اور بے قرار آنکھوں خوبصورت چہرے اور نازک ملوک جسم والی سیاہ پوش حسینہ نے کہا۔
"تجھ سے بہار کا وہ دن مانگنے آئی ہوں جس میں سوکھے درختوں پر پتے جنم لیتے ہیں۔ ہاں میں بہار کا ایک دن مانگنے آئی ہوں۔"
خزاں کے اس موسم میں جب چاروں طرف درخت لنڈ منڈ ہو چکے تھے اور رات کو برفباری ہوئی تھی۔ خزاں کا موسم اپنے جوبن پر تھا اور وہ سیاہ پوش حسین عورت بہار کا ایک دن مانگ رہی تھی۔
مریم نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
"میرے بس میں ہوتا تو میں تمہارے دامن میں بہار کا ایک دن ڈال دیتی..... تو ہی بتا میں کس طرح ایسا کر سکتی ہوں جو میری رسائی میں نہیں...."
سیاہ پوش حسینہ چیخنے لگی......
"پوچھ اس سے جو آنکھیں جھکائے کھڑا ہے..... پوچھ ناں اس سے ..... جس نے بہار کے پھولوں کی مہک سے لدے ہوئے دن میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ میری زندگی کو بہاروں سے سجائے گا..... پوچھ اس سے......"
اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ نورلیف کانپ رہا ہے......
بوڑھی مریم نے جیسے سب کچھ سمجھ لیا تھا...... جیسے سب کچھ پا گئی تھی..... اس نے اپنا جھریوں سے اٹا ہوا استخوانی ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے بیٹے کے ہاتھ کو پکڑا اور پوچھا۔
"بول ..... بول ...... کیا یہ سچ کہتی ہے....."
اور پھر عجب لمحہ آیا۔ اپنی ماں کے ہاتھ کو تھامے نورلیف ہنسنے لگا بے ساختہ ہنسی اور پھر یکدم سنجیدہ ہو گیا.....
"ماں تو اسے بہار کا دن دے دے.... ماں مجھے اس کے دامن میں ڈال دے.... ماں تو ہی کہتی تھی کہ میں تیری مرضی کی شادی کروں۔ میں تیرے سامنے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا' مگر دیکھ جس کا میں ہوں وہ مجھے مانگنے آگئی ہے۔ ماں ہم دونوں کو بہار کا دن دے دے۔"
بوڑھی مریم نے اپنا ہاتھ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے چھڑا لیا آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ سیاہ پوش حسینہ کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔
"ہاں میں سمجھ گئی میں تجھے بہار کا دن واپس دیتی ہوں۔"

عزیز نسن / احمد صغیر صدیقی

دم کٹے کتے

گاؤں کے دوروں کے دوران میں نے ایک عجیب بات نوٹ کی تھی۔ یہاں خاصی تعداد میں بڑے بڑے کتے تھے لیکن یہ سب کے سب دم کے بغیر تھے۔

میں نے ٹیچر سے اپنی حیرت ظاہر کی اور کہا کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ لوگ اپنے کتوں کو نڈر اور مضبوط بنانے کے لئے ان کے کان کتر دیتے ہیں لیکن یہ دم کاٹنے والی بات میرے لئے بالکل نئی ہے۔

"ممکن ہے کہ کتوں کی کوئی الگ نسل ہو" ٹیچر نے جواباً کہا۔

جس جگہ ہم ٹھہرے تھے میں نے اپنے بوڑھے میزبان سے دریافت کیا۔ "آخر یہاں کے کتے بے دم کے کیوں ہیں؟ کیا یہ کوئی نسل ہے؟"

بوڑھا میزبان ہنس پڑا۔ اور بولا۔ "یہ بھی ایک کہانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں سنا ہی دوں۔" پھر وہ شروع ہو گیا۔

"ٹاؤن شپ کے گورنر نے ہمیں حکم نامہ بھیجا تھا۔۔ "اس سال تمہیں تیس عدد جنگلی سور ہلاک کرنے ہوں گے"

جب یہ خبر گاؤں میں پھیلی تو ہمیں سکتہ سا ہو گیا۔ گاؤں والے میرے پاس پہنچے اور کہا۔۔ "تم ہم میں ایک سمجھدار آدمی ہو اور معاملہ کو سمجھتے ہو۔ ہماری طرف سے جا کر گورنر کو سمجھاؤ۔"

میں گورنر کے پاس گیا اور اس سے کہا۔۔ "جناب میں نے چودہ سال فوج کی نوکری کی ہے۔ میں یمن میں رہا ہوں، ترپولی میں رہا ہوں داردانیلز میں رہا ہوں "کاکیس" میں رہا ہوں۔"

"بس مزید بتانے کی ضرورت نہیں" گورنر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں۔ وطن کا قرض تھا جو تم نے ادا کیا تھا یہ تمہارا فرض تھا۔ کیا اس کا کوئی معاوضہ چاہتے ہو؟"

"ارے نہیں جناب۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں۔ اس کے بعد میں نے آزادی کی جنگ کے لئے بطور رضاکار خود کو پیش کیا تھا۔ میں نے نوجوانوں کی بھرتی کی تھی اور پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ مجھے ایک کئی گز لمبا کاغذ دیا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں اگلی صفوں کا کمانڈر ہوں"۔

گورنر نے دوبارہ مجھے روکا اور کہا۔۔۔ "تم فضول باتوں سے میرا وقت خراب کر رہے ہو۔ اور حکومتی کام میں تاخیر کا موجب بن رہے ہو۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔"

میں بولتا رہا۔۔ "خدا کا شکر ہے ہم فتح یاب ہوئے تھے۔ ہم نے جنگ جیت لی تھی۔ اس طرح جب میں گاؤں لوٹا تو میرے بدن پر گولیوں کے کئی سوراخ تھے اور نیزوں اور چاقو کے متعدد زخم بھی تھے۔"

گورنر نے پھر بے مہری ظاہر کی۔ "اچھا تو تم اپنی فوجی خدمات کے صلے میں پنشن چاہتے ہو؟ تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ ہمارا غریب ملک کن برے حالوں میں ہے؟"۔

"بالکل دیکھ رہا ہوں جناب ۔۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی ٹیکس کلکٹر نے میرا بھورا بیل قرق کیا ہے۔ مجھے بتانے دیجئے...... شکر ہے کہ انہوں نے میرے واجبات دے دیئے تھے۔ میرے پاس میرا سرخ ربن والا تمغہ موجود ہے اور کاغذات بھی ہیں جس پر حکومت کی طلائی مہر لگی ہوئی ہے۔

بہرحال ایک روز ایک ٹیچر میرے گاؤں میں آکر ٹھہرا' باتوں کے درمیان میں نے اسے اپنے تجربات سنانے شروع کر دیئے۔ پھر تو یوں ہوا کہ سردیوں کی لمبی راتوں میں وہ اکثر مجھ سے یہ قصے سننے لگا اور انہیں قلم بند بھی کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ کہیں اور چلا گیا۔ خدا اسے خیریت سے رکھے۔ وقت گذرتا رہا۔ پھر ایک روز گاؤں کا ایک لڑکا جب شہر سے پلٹا تو اس نے بتایا۔ "چاچا جی شہر کے اخباروں میں تو تمہارے بارے میں بہت ساری باتیں لکھی جارہی ہیں"۔

"ہوا یہ تھا کہ اس ٹیچر نے میری سرگذشت کو اخبار کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا..... بتاتا میں یہ چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں کبھی کوئی چیز رقم کی فراہمی کا باعث نہیں بنی۔ ان کہانیوں سے بھی مجھے کچھ نہیں ملا۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ حکوت نے مجھے لفٹیننٹ کا درجہ اول کا وارنٹ پہلے ہی دے رکھا تھا۔ پرانے زمانے میں چھٹیوں کے دوران ہمیں بلایا جاتا تھا اور ہم دارالحکومت میں ہونے والے مارچ پاسٹ میں حصہ لیتے تھے۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں س لئے حصہ نہیں لے سکتا۔ اس سفید داڑھی کے ساتھ اب بھلا میرے بدن پر فوجی وردی کہاں جچتی ہے۔ اب تو میری استطاعت اتنی بھی نہیں کہ ایک شلوار بنوا سکوں' فوجی وردی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انہوں نے مجھے اعزاز بخش دیا ہے یہ ان کی مہربانی ہے انہیں خدا خوش رکھے۔"

"ٹھیک ہے"۔ گورنر نے کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو۔ کیا وہ تمہیں پاشا کا رتبہ دینے والے تھے۔؟ مجھے دیکھو میں نے بہت پڑھا ہے مگر میں ابھی تک صرف ایک ریزرو لیفٹیننٹ ہوں"

"جناب" میں نے کہا" میری موجودہ حالت پر نہ جائیں۔ میرے پاس پانچ سو گھڑ سوار ہوا کرتے تھے۔ اور میری کمان میں ایک ہزار سپاہی تھے۔ اور مان لیں۔ میں نے دشمن کے چھکے چھڑا دیئے تھے کافر پاشاوں پہ میں نے زمین تنگ کر دی تھی۔ اب میری زندگی کتنی رہ گئی ہے؟۔ مجھے کوئی پنشن چاہیے نہ رقم اور نہ پاشا کا منصب۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہوں؟"

"گاؤں والوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ آپ نے حکم جاری کیا ہے کہ ہمیں گاؤں کے گردونواح سے تیس سور ہلاک کرنے ہیں اس سال۔ اور میں یہاں صرف اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ میرے سوا پورے گاؤں میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں جس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی سور دیکھا ہو۔ ہاں میں نے ایک بار ایک سور دیکھا تھا اس زمانے میں' میں پولینڈ میں تھا گیلیسین فرنٹ پر۔ وہاں ایک لفٹیننٹ تھا ایتم بے۔ معلوم نہیں زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں' اور بے حد مضبوط' آپ جیسے دبلے افراد کو تو وہ ان کی نوکوں میں باندھ کر تول سکتا تھا۔ ایک رات ہم دونوں گشت پر تھے کہ ایک آوارہ گولی میرے پیر میں آکر لگی۔ میں کراہا تو ایتم بے نے محسوس کر لیا۔ "کیا ہوا' گولی لگی ہے؟۔ میں نے کہا۔۔ "نہیں جناب" (اس زمانے کے لوگ ذرا مختلف ہوتے تھے)۔ مجھے لنگڑاتا دیکھ کر لیفٹیننٹ نے مجھے اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور اسی طرح چلتے ہوئے اس نے مجھے جرمنوں کے

فیلڈ ہاسپٹل تنت میں پہنچا دیا۔ تو جناب وہ جو سور میں نے دیکھا تھا اسی جرمن ہسپتال میں دیکھا تھا۔ جرمن انہیں پالتے تھے۔ میں نے خوف سے گوشت کھانا بند کر دیا کہ کہیں یہ جرمن مجھے سور کا گوشت نہ کھلا دیں۔ میں آپ کا دماغ چاٹنے کی معافی چاہتا ہوں۔ بوڑھے لوگ باتیں بہت کرتے ہیں۔ میرے گاؤں میں سوائے میرے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے' جس نے کبھی سور کی شکل دیکھی ہو۔

ٹاؤن شپ گورنر برہم ہو گیا۔ "بولا۔ دیکھو میاں۔ بس اب چپ رہو۔ اور سنو مجھے تمہارے گاؤں سے تیس عدد سور چاہئیں۔ تم لوگ نہ صرف انہیں دیکھو گے بلکہ مارو گے بھی سمجھے"

"جناب" میں نے احتجاج کیا۔ میرے گاؤں میں کوئی سور نہیں اور یہ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی نہیں ہیں۔ ہمیں سور کے بارے میں کچھ بتائیں' بہت زیادہ اگر معلوم ہے تو بھی اتنا کہ غصے میں ہم کہہ دیتے ہیں کہ سور کہیں کا۔ "اور زیادہ غصے میں ہوں تو"۔ سور کا بچہ۔ کہہ کر مخاطب کو گالی دیتے ہیں۔ بس۔ اور یہ حقیقت ہے کہ گاؤں والے اس سے زیادہ سوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

گورنر نے کئی کاغذات کھینچے اور کہا "کیسے جاہل لوگ ہو تم۔ اور حکومت تمہاری ہمدردی میں گھلی جا رہی ہے۔ یہ دیکھو کیا لکھا ہے تمہارے لئے یہ سب یہاں لکھا ہے۔ کیا تم پڑھنا جانتے ہو؟"

"نا۔ جی"

"اور تم ایک فرسٹ لفٹیننٹ تھے؟"

"جناب" میں چیخا۔" میں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"سنو" اس نے کہا۔ ان میں کیا لکھا ہے۔ ان میں لکھا ہے۔ فصلوں کے سب سے بڑے دشمن یہی سور ہیں۔ اور زرعی پیداوار ہمارے ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ فصلوں کو بچانے کے لئے ... تم سمجھ رہے ہو نا؟۔ تم سب کے مفاد کی بات ہے۔ سوروں کی ہلاکت بہت ضروری ہے۔ کیا تم کو ترکی زبان بھی نہیں آتی۔ سوروں کو ہلاک کرنا ہی ہو گا یہ مکئی کی فصل کے سب سے بڑے دشمن ہیں"

" ٹھیک ہے جناب" میں نے کہا "آپ ہمیں سوروں کا سراغ دے دیں ہم انہیں مار دیں گے لیکن ہمارے کھیتوں میں مکئی نہیں بوئی جاتی۔ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے آج تک ہم نے کبھی مکئی کی کوئی فصل نہیں اگائی۔

" اگر نہیں اگائی ہے تو اب اگاؤ۔ اس طرح یہ جنگلی سور ادھر ضرور آئیں گے۔ پھر تم انہیں مار دینا۔ اس طرح سرکاری حکم پر عمل در آمد ہو جائے گا"

"مگر جناب "میں نے اسے سمجھایا۔ "مکئی کی فصل ہماری زمینوں پر نہیں لگ سکتی۔ اس کی مٹی ناموزوں ہے۔ سردیوں میں سبھی کو پتا ہے کہ یہاں بہت برف پڑتی ہے۔"

"تم کمال آدمی ہو۔ ہر بات میں کیڑے نکال دیتے ہو" گورنر چیخا۔ "امریکہ کے کسان ' قطبین' پر بھی فصلیں اگا لیتے ہیں۔ اور تم کہہ رہے ہو تم سے کچھ نہیں ہو سکتا"۔

"ٹھیک ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "آپ حکام بالا سے کہیں۔ کہ اس سال وہ برف باری کو روک دیں۔ پھر ہم زمینوں پر مکئی کاشت کر دیں گے تاکہ سور ادھر آئیں اور ہم انہیں مار سکیں۔"

"سنو" گورنر نے برہمی سے مجھے دیکھا۔ "کیا تم سرکاری احکام کا مذاق اڑا رہے ہو۔ اس کی سزا دو سال کی قید ہوتی ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ عزت مآب۔" میں نے کہا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمارے گاؤں میں سور نہیں پائے جاتے" "تم مسلسل بولے جا رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "کس گاؤں میں سور ہیں اور کس میں نہیں یہ بات تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔ یا وہ جنہوں نے یہ احکامات جاری کئے ہیں؟ بولو۔"

"جناب ہم جاہل لوگ ہیں"۔ میں نے کہا۔ "ہم کیا جانیں۔ ہمیں بس یہ معلوم ہے کہ ہمارے گاؤں میں سور نہیں ہیں۔"

"سنو" گورنر نے کہا۔ "یہ احکامات جو لوگ جاری کرتے ہیں ایسے ہی نہیں کرتے۔ پہلے وہ نقشے دیکھتے ہیں، کتابیں پڑھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ تمہارے گاؤں میں سور ہیں۔ ممکن ہے ان کی اطلاع نہ ہو یا تم نے نہ دیکھا ہو۔ لیکن جب حکام کہیں کہ وہ ہیں تو سمجھ لو کہ وہ ہیں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔"

"ٹھیک ہے جناب" میں نے کہا۔ "مگر ہمارے گاؤں میں کہیں بھی کوئی سور نہیں"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا تمہاری کھوپڑی میں بھس بھرا ہے۔" گورنر نے جھنجلا کر کہا۔ "ہم سب لوگ تمہاری بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہماری وزارت زراعت نے یہ احکامات بھیجے ہیں اور یہ تمام صوبوں میں بھیجے گئے ہیں۔ گورنروں سے سوروں کی ایک خاص تعداد طلب کی گئی ہے۔ تو کیا ہم گورنر لوگ سور مارتے پھرتے۔؟ ہم نے یہ احکامات تم لوگوں کو بھیج دیئے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ مطلوبہ تعداد پوری کرو۔ میں نے ہر گاؤں سے یکساں تعداد کا مطالبہ کیا ہے۔ تمہیں بھی ہر صورت تیس سور مار کر لانے ہیں۔ کیا تمہارے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے؟۔"

"ہو سکتا ہے۔ جناب" میں نے کہا۔ "مگر میرے گاؤں میں تو سور ہیں ہی نہیں"

"کیا کہہ رہے ہو" گورنر نے برا سا منہ بنایا۔ "یعنی تمہارا خیال ہے کہ وزیر زراعت کو نہیں معلوم کہ تمہارے گاؤں میں سور نہیں ہیں۔ ان ماہروں کو بھی اس کا علم نہیں جنہوں نے یورپ میں پڑھا ہے؟۔ انڈر سکنڑیز کو بھی نہیں معلوم گورنر بھی نہیں جانتے۔ ضلع آفیسر بھی نہیں جانتے۔ بس ایک تم کو معلوم ہے۔ خوب۔ جہالت بھی کیا بری چیز ہوتی ہے۔ اور یہ الزام جو تم لگا رہے ہو جانتے ہو یہ کہاں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ مجھ سے چلتا ہوا......"

"خدا نہ کرے" میں نے لجاجت سے کہا

"خدا کو درمیان میں نہ لاؤ۔" گورنر اٹھ پڑا مگر پھر بیٹھ گیا۔ "حکومت تم سے مفت میں سوروں کا مطالبہ نہیں کر رہی ہے۔ تم ہلاک کئے جانے والے سوروں کی دمیں لے آنا۔ تم لوگوں کو ایک کاغذ دیا جائے گا۔ اسے بھر دینا۔ یہ زرعی ترقی کے ڈائریکٹر کو بھیجا جائے گا۔ پھر تم کو بینک سے ہر دم کے عوض ساڑھے بارہ کروش مل جائیں گے۔ اب اور کیا چاہئے تمہیں؟ اس وقت سوروں کے خلاف پورے ملک میں جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ذرا بتانا آجکل گیہوں کتنے سیر بک رہا ہے؟"

"بینک آٹھ کروش دیتا ہے"

"دیکھا تم نے۔ سور کی دم اس سے زیادہ مہنگی ہے۔ تم لوگوں کو ذرا بھی عقل ہوتی تو کھیتوں میں گندم اگانے کے بجائے سوروں کا شکار شروع کر دیتے اور حکومت کے ہاتھ ان کی دمیں بیچتے رہتے۔ ٹھیک ہے اب جاؤ حکم اپنی جگہ ہے اور تمہیں سور مارنے ہوں گے۔ حکم عدولی کی صورت میں 'میں تمہارے گاؤں میں پولیس بھیجوں گا اور وہ تمہیں اچھی طرح سکھا دیں گے کہ کیسے شوٹ کیا جاتا ہے؟۔"

"خدا آپ کی عمر دراز کرے" میں نے کہا اور واپس ہو گیا۔
"گاؤں پہنچ کر میں نے سب کو اپنی اور گورنر کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔
"کیوں نہ ہم سوروں کی افزائش شروع کر دیں اور پھر ان کی دمیں کاٹ کر گورنر کو بھیج دیں۔"
دوسروں نے اعتراض کیا اور کہا کہ وہ گاؤں میں اس جانور کی افزائش نہیں کر سکتے۔
ہمارے اندر ایک ہوشیار آدمی اور تھا۔ جس جگہ وہ ملٹری کی سروس میں رہا تھا وہاں بہت سے سور تھے اس نے ہمیں بتایا۔ "سرجنٹ آغا" اس نے مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے تم تھوڑی تکلیف کر کے وہاں چلے جاؤ اور تیس سوروں کی دمیں کاٹ کر لے آؤ"
وہ جگہ دو دن کے فاصلے پر تھی۔
"ٹھیک ہے" میں رضامند ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "ہر دم کے عوض ساڑھے بارہ کرش مل رہے ہیں۔ اب جبکہ میں جا ہی رہا ہوں۔ میں کچھ زیادہ تعداد میں سوروں کی دمیں لاؤں گا تاکہ میرے اخراجات بھی نکل آئیں۔ پھر ہم نے بنک سے کچھ قرض لیا۔ دو بورے سنبھالے اور سفر پر نکل پڑا۔
بالآخر میں اس جگہ پہنچ گیا۔ لیکن اس دنیا میں ہی تو اکیلا چالاک نہیں تھا۔ میری طرح وہاں بہت سے اور بھی دموں کی خریداری کے چکر میں پہنچے ہوئے تھے۔ اور بازار میں ہر طرف سوروں کی دمیں ڈھیر تھیں۔ لوگ انہیں پاگلوں کی طرح خرید رہے تھے۔
"ایک دم پچیس کی ہے"
اور ہمیں حکومت سے صرف ساڑھے بارہ مل رہے تھے۔ پھر سفر کے اخراجات الگ تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے پندرہ کرش کے ریٹ سے دمیں حاصل کیں۔ اور کوئی دو سو دمیں خرید لیں۔ میں انہیں لے کر اس سرائے میں گیا جہاں میں نے قیام کیا تھا اور وہاں لوگوں کو دکھائیں تو ان میں سے ایک نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اے میاں۔ کبھی پہلے تم نے کسی سور کی دم دیکھی ہے؟"
"کیوں؟ کیا کوئی گڑ بڑ ہے؟"
وہ پھر ہنسا۔ اور بولا۔ "میاں جی یہ سور کی دمیں نہیں ہیں یہ کتوں کی دمیں ہیں۔"
میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ میں کیا کروں۔
اس نے کہا۔ اب کیا کرو گے۔ یہی کر سکتے ہو بس کہ انہیں ذرا اور چھوٹی کر دو انہیں تیل میں کچھ عرصے بھگو رکھو اور پھر محکمۂ زراعت کے ڈائریکٹر کے پاس لے جاؤ۔ اسے خاک پتا نہیں چلے گا"
موسم گرم تھا۔ اور سفر لمبا۔ دموں سے بدبو نکلنے لگی تھی۔ ٹرین میں لوگ منہ بنا رہے تھے۔
جب میں گاؤں پہنچا تو لوگوں نے بتایا۔ "سرجنٹ آغا۔ اب کووں کے خلاف مہم شروع کر دی گئی ہے۔ ٹاؤن شپ گورنر کا نیا حکم آیا ہے کہ اسے دو سو کوے درکار ہیں"
"کوے تو یہاں بہت ہیں۔ مارو اور ان کے سر لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے اگلے ہفتے ٹڈوں کے خلاف مہم شروع ہو جائے اور اس نے اگر ان کے سر مانگے تو مزید مشکل ہو گی"
دوسرے گاؤں والوں کو پتا چلا تھا کہ ہمارے ہاں سور پائے جاتے ہیں اور وہ ادھر آ رہے تھے۔ میں نے دمیں ایک کرش کے نفع سے بیچنا شروع کر دیں۔ یہی نہیں میں نے گورنر کے پاس تیس دمیں بھی پہنچا دیں۔
خوب" اس نے کہا۔ "کمال ہے، کتنی بڑی بڑی دمیں ہیں۔ کافی بڑے سور تمہارے گاؤں میں ہیں اور تم کو

پتا ہی نہ تھا"

اس دن کے بعد سے لوگوں نے میرے گھر آنا بند کر دیا۔ یہ گھر گندہ ہو گیا تھا۔ مجھ سے کوئی ہاتھ بھی نہیں ملاتا تھا۔ کیونکہ میں نے یہ دمیں چھوئی تھیں۔ لہذا میں نے گاؤں کے چند ہوشیار لوگوں کو جمع کیا اور ان سے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"میں تمہیں راز کی بات بتا رہا ہوں۔ میں گندہ نہیں ہوا ہوں۔ یہ دمیں سوروں کی نہیں ہیں بلکہ کتوں کی ہیں۔ میں نے گورنر کو دھوکا دیا ہے۔" میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا۔ اس کے بعد انہیں میں سے ایک نے پھر اس کو کاروبار بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ تم کو اب سارے کتے دم کٹے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ شخص آجکل شہر میں ہے اور دموں کا کاروبار کر رہا ہے۔ میں ابھی چند دنوں میں اس سے شہر میں ملا تھا۔ اور پوچھا تھا "کیوں بھائی۔ کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا بڑا کرم ہے" اس نے کہا تھا۔ "کتوں کی بدولت مزے میں گزر رہی ہے"

عمر سیف الدین / عابدہ خان

شہید

کل حج تھا۔ عیدالاضحیٰ کے دن ذبح کئے جانے والے سفید بکرے اور دنبے چراگاہ میں اپنے باڑے کے اردگرد چر رہے تھے۔ چراگاہ کے بالکل سامنے یعنی آدھ میل کے فاصلے پر' زیگتوار Zigetvar کا قلعہ توگن پاشا کے قبضہ سے بچ گیا تھا۔ حتیٰ کہ پاشا نے اس کا محاصرہ کرلیا تھا۔ لیکن شدت کی سردی کی وجہ سے وہ کافی عرصہ تک قلعے کو حصار میں لینے کے باوجود اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اب یہ قلعہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح اپنے سیاہ درودیوار کو لئے کھڑا تھا۔ آج پھر موسم بڑا خراب تھا۔ افق پر کالے سیاہ بادلوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ کوؤں کے گروہ' شام کو اپنے گھروں کی طرف لوٹتے ہوئے' اس قلعے کے اوپر سے گزرتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں کائیں کائیں کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ ایک بری خبر کی پیشین گوئی کر رہے ہوں۔ چراگاہ کے دائیں صدر دروازے پر زرہ بکتر پہنے شہر کا قاضی بے جان بت کی طرح بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ وہ سامنے دھند میں چھپے ہوئے علاقے اور سلیٹی رنگ کے گھنٹہ گھر کو دیکھتے ہوئے جی میں کہنے لگا۔ "یہ سب علاقہ ترکوں کے ہاتھ میں ہے لیکن صرف یہ زیگتوار کا قلعہ ـــ آہ ـــ کاش کہ۔ اس کو بھی ہم فتح کرلیتے۔ قاضی نے اپنی سبز پگڑی کو ماتھے سے ذرا سا اوپر کیا۔ اور اپنی بھیگی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے رگڑنے لگا۔ قاضی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ہونے کے باوجود ہر جنگ میں حصہ لیا کرتا تھا۔ "اگر میرے پاس ایک دو ہزار سپاہی اور چار پانچ توپیں ہوں۔ تو ایک رات میں اس پر قبضہ کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔" لیکن اب معاملہ ذرا مختلف تھا۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا کر نہ سکتا تھا۔ کیونکہ گرجگال کا بادشاہ احمد اپنی فوج سمیت توگن پاشا کی فوج میں شامل ہو کر قاپشوار کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اور قاپشوار کو فتح کرنے کے بعد اس نے Zigetvar کے قلعہ کو فتح کرنے کی غرض سے اس کا محاصرہ کیا لیکن شدت کی سردی کی وجہ سے وہ اپنے قبضے کو آدھے میں ہی چھوڑ کر "بدین" چلا گیا اور وہ پھر اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس اپنے اس علاقہ میں واپس نہ آیا تھا بلکہ وہ توگن پاشا کے پاس چلا گیا تھا۔ گرجگال کے علاقہ پر اب قاضی کا حکم چل رہا تھا۔

"احمد پاشا سب' بہادر اور جنگ جو سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب اس علاقے میں صرف بیمار اور بوڑھے سپاہی اور محافظ رہ گئے تھے۔ سب ملا جلا کر ایک سو سترہ آدمی تھے۔ دشمن ان کی طاقت سے مرعوب تھا۔ ورنہ اس کے لئے ان حالات میں ان پر قبضہ کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ قاضی نے ذرا سا جھک کر نیچے نگاہ ڈالی۔ تین سپاہی سفید قربانی کے بکروں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ایک سپاہی ایک بکرے کو غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بکرا اس کو سینگوں سے مارنے کی کوشش کرتا۔ وہاں کھڑے سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ تھامے یہ منظر بڑی دلفریبی و انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ قاضی وہیں سے چلایا۔ "اس حیوان کے ساتھ مت کھیلو اسے تنگ نہ کرو"

سپاہیوں نے اپنی گردنیں' آواز آنے والی سمت اٹھائیں۔ قاضی کی سخت گیر طبیعت کی وجہ سے ہر کوئی اس

سے بہت ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ کافی غصیلا اور اصولوں کا پابند شخص تھا۔ دن رات عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ قلعے میں آج تک کسی نے بھی اسے سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ گورنر احمد اسے "چمگادڑ" کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ بعض لوگ اسے "رت جگے" کی بیماری کا نام دیتے تھے۔ قاضی نے وہیں بیٹھے بیٹھے دوبارہ آواز لگائی۔ "چلو۔ اب ان کو بند کرو' شام ہو رہی ہے"

سپاہیوں نے قاضی کا حکم سنتے ہی سب بکروں اور دنبوں کو اکٹھا کر کے بند کرنا شروع کر دیا۔ قاضی کی نگاہیں سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دوبارہ زیگتوار قلعے سے ٹکرا گئیں۔ کوے اپنی ٹولیوں کو توڑ کر باہر نکل چکے تھے۔ اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہوئے بڑی دردناک آوازیں نکال رہے تھے۔ قاضی کا دل ان آوازوں کو سن کر اداس ہو گیا تھا۔ وہ دعا کرتے ہوئے بڑبڑایا "انشاء اللہ خیر ہوگی" اس کا دل انجانے خوف سے گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا' ہاتھ کمر پر باندھے' سر آگے کو جھکائے ہوئے وہ بغیر دیکھے چلتا گیا۔ اور اندھیری گھپ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔

حج کے دن' وہ صبح سویرے اٹھا۔ سب لوگ ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اپنے وضو کو تازہ کرنے کی غرض سے اس نے کوزہ ہاتھ میں تھاما۔ باغ کی سمت والے دروازے کے اوپر قندیل کی دھندلی روشنی دیواروں پر لرز رہی تھی۔ اتنے میں اسے پہرہ دار کی آواز سنائی دی۔ جو کہ سپہ سالار کو آواز دے رہا تھا۔ اس آواز کی دہشت سے قاضی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کوزہ گر پڑا۔ قمیض کا بازو اوپر چڑھاتے ہوئے' ننگے پاؤں' ٹوپی سر پر پہنے وہ واپس اوپر کی طرف بھاگا۔ سیڑھیوں پر اسے نائب سپہ سالار نظر آیا۔ قاضی اسے دھکا دے کر پہرہ دار کے قریب پہنچا اور اس سے پوچھا! (کیا ہے؟)"

"قلعے سے دشمن باہر نکل رہا ہے۔" پہرہ دار نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

رات کی سیاہی میں زگیتوار کا قلعہ کالی چٹان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کالی چٹان سے سائے باہر نکل کر ان کے علاقے کی طرف آ رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ چلایا "وہ ہماری طرف آ رہے ہیں"

وہ فوراً" پہرے دار کی طرف گھوما۔ اسے حکم دیا۔ "جاؤ' جلدی غازیوں کو جگاؤ' قربانی کی عید ہم آج ہی منا لیتے ہیں۔ جلدی جاؤ' اور توپچی کو میری طرف بھیجو"

پہرہ دار' اپنی آہنی ٹوپی کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے سیڑھیوں میں غائب ہو گیا۔ قاضی' اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے کالی سیاہ قطار کی شکل میں آگے بڑھنے والے دشمنوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر اور پھیلا کر غور سے دیکھا۔ ان کے آگے کچھ توپیں بھی اسے نظر آئیں۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی دشمن کی تعداد اسے سپاہیوں سے زیادہ محسوس ہوئی۔ دشمنوں کی تعداد ہزار کے قریب تھی۔ حالانکہ اس قلعہ میں اس سمیت ایک سو چودہ شخص تھے۔ لیکن اسے خدا پر کامل یقین تھا کہ وہ ان کی ضرور مدد کرے گا۔ اور وہ اپنے سپاہیوں سمیت خون کے آخری قطرے تک لڑے گا۔ جاگنے والے سپاہی سب اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے چڑھ آئے۔ قاضی نے قلعے کے دروازے کو بند کرنے کا حکم دیا۔ اپنی پگڑی' بندوق' تلوار اور چغہ منگوا کر پہنا۔ بوڑھے توپچی کی آمد پر' قاضی نے اسے فوراً" "خبر کا گولہ" پھینکنے کا حکم دیا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے خبر پہنچانے والے گولے کو پھینکنا اس بات کی علامت تھی کہ اڑوس پڑوس کی ترک ریاستوں کو اس لڑائی کی خبر ہو جائے۔ اور وہ مدد کو پہنچ جائیں۔

تھوڑی دیر بعد دشمن کی فوج قلعہ کے سامنے صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ توپیں اژدھے کی طرح اپنے منہ کھولے کھڑی تھیں۔ دشمن کی طرف سے ترکی زبان میں ایک آواز آئی۔ "ہماری ایک پیشکش ہے۔ ہم اپنے پیغام بر کو

آپ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔"

قاضی نے آواز لگائی "ٹھیک ہے" بھیج دو"

قاضی کے تمام ساتھیوں اور سپاہیوں نے زرہ بکتر اور ڈھالیں پہن کر ہاتھوں میں تلواریں پکڑلی تھیں۔ تیر اور کمندیں تیار کرلیں تھیں۔ اس ریاست کی خوشحالی کو برقرار رکھنے والے دو دوست ابھی اس مشکل وقت میں اپنی ہنسی مذاق اور عجیب و غریب باتوں سے سب کو ہنسا کر ان کا حوصلہ بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر کوئی ان دونوں کو دیوانے کے نام ۔ سے پکارا کرتا تھا۔ ایک کا نام "دیوانہ مہمت" اور دوسرے دوست کا نام "دیوانہ خسرو" رکھا ہوا تھا۔ یہ دونوں سرحدی لڑائیوں میں' ناقابل یقین بہادروں کی کہانیاں سنانے کے لئے مشہور تھے۔ یہ دونوں انا طولیہ کے رہنے والے تھے۔ اپنی کہانیوں کے بہادر سپاہیوں کے کارناموں کی طرح لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔ ہر فتح کے بعد بادشاہ ان دونوں کو خلعت اور مرصع تلوار سے نوازتے اور انہیں اونچا عہدہ دینا چاہتے لیکن ان دونوں کو ان دنیاوی چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے:

"انسان کے فانی وجود کو صرف ایک کفن کی ضرورت ہے' نادان و جاہل کو یہ خلعت و انعام و کرام خوشیاں دے سکتا ہے"۔ جنگ ان کے لئے خوشی کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کے لئے جنگ عید کا پیغام لاتی تھی۔ گولیوں کی آواز' تیروں کی سنسناہٹ' توپوں کی گرج' تلواروں کی چمک شروع ہوتے ہی ان دونوں کو جوش آجاتا۔ انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہتا' نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے جان کی پرواہ کئے بغیر دشمنوں کی صفوں میں داخل ہو جاتے۔ اپنی الاؤ جیسی آنکھوں کے ساتھ بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

قاضی ان دونوں کے لطیفوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اتنے میں دشمن کے پیغامبر کو اس کے حضور پیش کیا گیا۔ پیغامبر کو دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ وہاں موجود سب لوگ دم سادھے بیٹھے تھے۔ یہ پیغامبر ترکی زبان جانتا تھا۔ اس نے بڑے گستاخانہ انداز میں اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے علاقے کو حصار میں لینے والا زگیتوار قلعہ کا کپتان ہے۔ اس کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ سپاہی ہیں۔ کپتان یہ چاہتا ہے کہ آپ اس علاقہ کو بغیر کسی مداخلت و جنگ کئے ہمارے حوالے کر دیں۔ وہ آگ' نور' صلیب' انجیل اور زبور کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو بالکل کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔ آپ جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ ہم آپ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

قاضی نے بڑے ٹھنڈے دل سے یہ ساری بات سنی اور اطمینان سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد دوپہر تک تمہارے کپتان کو پیغام بھجوا دوں گا۔" اور پیغامبر کو جانے کا حکم دیا اور پیغامبر کو قلعہ سے نیچے پھینکوا دیا' پیغامبر کے جانے کے بعد قاضی نے اردگرد کھڑے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا اور کہا:

"تم نے سن لیا غازیو! مجھے یقین ہے کہ قراجن کو ہمارے فوجیوں کی اصل تعداد ایک سو چودہ کے بارے میں علم ہے۔ اس لئے وہ بغیر جنگ کئے ہم سے یہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم لوگوں کو سپہ سالار کی رائے سے اتفاق ہے تو اپنے ہاتھ کھڑے کر دو۔ لیکن کسی کا بھی ہاتھ کھڑا نہ ہوا۔ قاضی نے سپاہیوں کے اقرار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ سب جنگ کے لئے تیار ہو جائیں"

ایک شور ابھرا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہم حاضر ہیں' تیار ہیں' ہماری تلواریں اور ڈھالیں تیار ہیں۔ آج نصرت ہماری ہے' ہماری"

قاضی نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے بلند کئے۔ قاضی نے ابھی یارب العالمین .... ہی کہا تھا کہ دیوانہ مہمت ننگی تلوار لئے قاضی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی گھنی و لمبی مونچھیں' چاند کی طرح خوبصورت منہ' چوڑا اور سفید چہرہ بالکل نئے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا۔

آفندی' دعا کو چھوڑو' جہاد دعا سے افضل ہے۔ اور اس دروازے کو کھولو' دل میں سے ڈر کو نکال پھینکو' دیکھو' ہم سب لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ شہادت ہماری شہ رگ سے بھی قریب آئی ہوئی ہے۔ اس موقع کو ہم اپنے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے۔ سب نے یک زبان ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا۔ "اس دروازے کو جلدی کھولو' کھولو' کھولو"

قاضی کی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں' چہرہ پیلا پڑ گیا۔ لمبی کالی داڑھی میں حرکت پیدا ہوئی۔ دونوں پاگلوں کو کانپنے پر مجبور کرنے والی' تمام غازیوں کے رونگھٹے کھڑے کر دینے والی بلند اور بھرپور آواز سے قاضی نے کہنا شروع کیا۔

"اے میرے عزیز از جان سپاہیو! ہمارے بادشاہ سلیمان غازی کے واسطے میری یہ بات غور سے سنو' میری مراد تم سب لوگوں کو مرنے سے منع کرنا بالکل نہیں ہے۔ آج مجھ سمیت ہم سب کے جان و مال فدا ہو جائیں .... کل عید الاضحیٰ ہے ..... لیکن سنو' میرے کہنے کا مقصد کیا ہے؟ آج جمعۃ المبارک ہے اور حج کا دن ہے۔ آج ہمارے حاجی عرفات کے میدان میں حج ادا کر رہے ہیں۔ دوسرے مومن مسجدوں میں ہماری طرح کے غازیوں کے لئے دعا گو ہیں۔ کیا میری اس بات سے کسی کو اختلاف ہے۔

"نہیں' نہیں' بالکل نہیں" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ سب لوگ بڑے انہماک سے قاضی کی تقریر سن رہے تھے۔

قاضی نے دوبارہ اپنی بات شروع کی "اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہم بھی اپنی نمازوں کو ادا کر کے اپنی اشک آلود آنکھوں سے خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنی فتح و نصرت کے لئے دعا مانگیں۔ ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کر کے انہیں بخش دیں۔ دنیا میں بھی نیک نامی حاصل کریں اور آخرت میں امت محمدیہ کے ساتھ اکٹھے ہوں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

تمام غازیوں کے دل پر اس بات نے کافی اثر کیا۔ دوپہر تک انہوں نے لڑائی کی پہل نہ کی' عبادت کی' نماز پڑھی' نعرۂ تکبیر بلند کئے۔ ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ فراجن کے سپاہی ان آوازوں اور شور کو سن کر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ لوگ آپس میں اس معاہدہ کے بارے میں تکرار کر رہے ہیں۔

اچانک دور دراز کے ترک قلعوں میں سے توپ کے گولوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ترک غازیوں کے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ چونکہ ان گولوں کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ ہم آپ کی مدد کو آ رہے ہیں۔ ہم نے خبر پہنچانے والے گولے کی آواز سن لی ہے۔ قاضی نے فوراً" اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ گرجگال کے غازی اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن دو طرف سے حملے کر رہا تھا۔ ایک طرف کے حملے کو "دیوانہ خسرو" روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف سے "دیوانہ مہمت" مقابلے پر ڈٹا تھا۔

وادی میں دور سے گرد کے دھوئیں بلند ہوئے۔ ترک سپاہی اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے آ پہنچے تھے۔ دشمن کو جب پتا چلا تو اس کے حواس جاتے رہے کیونکہ وہ درمیان میں گھرا ہوا تھا۔ جب یہ گرد کے بادل چھٹے' تو آنے والوں کی صحیح تعداد معلوم ہوئی۔ جو کہ صرف دس کے قریب تھی۔ دیوانہ مہمت اور دیوانہ خسرو دشمن کو بھاگنے کا

موقع نہیں دے رہے تھے۔ ان کی ہر راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ قاضی نے اپنا چغہ اتار پھینکا تھا۔ اور وہ تلوار لئے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں دیوانے دوست دیوانوں کی طرح دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ان کا قلع قمع کر رہے تھے۔ غیر یقینی طاقت کی برق رفتاری سے بھاگنے والے دشمنوں کو پکڑ کر قتل کر رہے تھے۔

قاضی نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیوانہ مہمت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اچانک اس نے وہ منظر دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ دیوانے مہمت کا کڑیل وجود ساٹھ قدم کے فاصلے پر زمین پر گرا پڑا تھا۔ ایک گھڑ سوار برچھی سے اس کے جسم پر ضربیں لگا رہا تھا۔ قاضی سے برداشت نہ ہو سکا۔ بھاگتے ہوئے آگے بڑھا۔ لیکن ایک پتھر کی ٹھوکر سے زمین پر گر پڑا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ قاضی فوراً" اٹھا۔ گری ہوئی تلوار کو اٹھایا بھاگتے ہوئے اس نے دوبارہ دیوانہ مہمت کی طرف دیکھا۔ گھڑ سوار گھوڑے سے اتر کر اس شہید کے سر کو اپنی تلوار سے اس کے جسم سے علیحدہ کر چکا تھا۔ اس ظالم نے اس کٹے ہوئے سر کو اپنے ہاتھ میں پکڑا۔ اور گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ اسی اثناء میں بائیں طرف سے خسرو نمودار ہوا۔ اس نے یہ منظر دیکھا۔ تو اپنی پوری قوت سے چلایا۔

"مہمت' مہمت تم نے اپنی جان تو دے دی۔ لیکن اپنے سر کو اس کے حوالے مت کرنا"

یہ نعرہ اس قدر متاثر کن اور زور دار تھا کہ قاضی اپنی جگہ سکتے کی حالت میں کھڑا ہو گیا اس نے دلخراش لہجے میں کہا "ہائے مہمت"

اس نعرہ کو سن کر اس شہید کے سر کٹے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک برقی رو کی تیزی سے اٹھ کر اس گھڑ سوار کا پیچھا کرنے لگا۔ جو کہ اس کا سر لیکر جا رہا تھا۔ اس سر کٹے وجود نے چالیس قدم کے فاصلے پر اس کو جا پکڑا۔ اپنے ہاتھ سے گھڑ سوار کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ گھوڑے سے لڑکھڑا کر گر پڑا اور سر بھی زمین پر آپڑا۔ سر کٹے وجود نے ہاتھ سے اس سر کو اٹھایا۔ اپنی صفوں میں واپس آکر زمین پر دوبارہ ڈھیر ہو گیا۔ قاضی نے آنکھ جھپکنے میں یہ سب کچھ دیکھا۔ باقی سب لوگ دشمن کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھے۔ صرف دیوانہ خسرو قاضی کی طرح اس واقعہ کا زندہ شاہد تھا۔ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اے دوست' تمہارا چہرہ نور کے ہالے میں سجا رہے" اس کے بعد وہ قاضی کی طرف گھوما۔ اور اس سے کہا "کیا تم نے یہ کرامت دیکھی؟"

لیکن قاضی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ وہ ایک بے جان وجود کی طرح وہاں سکتے میں کھڑا تھا۔ پاگل خسرو نے اس کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ چلو اپنی صفوں میں۔ دیکھو دشمن شکست کھا کر بھاگ رہا ہے"

خسرو کے جھنجھوڑنے سے قاضی کے وجود میں جان پڑی۔ درود شریف پڑھتے ہوئے وہ مجاہدین کی سمت بڑھا۔

جنگ شام تک جاری رہی۔ جنگ کے خون آلود میدان کو جب رات نے اپنی زلفوں میں سمیٹا۔ قاضی نے منادی کروا کے سب مجاہدین کو قلعہ میں آنے کا حکم دیا۔ زخمیوں کو قلعہ میں لایا گیا۔ شہیدوں کی تعداد معلوم ہوئی۔ کل انیس سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ دشمن ۶۴ لاشیں چھوڑ کر بھاگا۔ اور کافی لاشوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

قاضی صبح سے کچھ کھائے پیئے بغیر' آرام کے بغیر ابھی تک کام میں مصروف تھا۔ تمام شہیدوں کو قلعہ کے سامنے دفنایا گیا۔ شہید دیوانہ مہمت کی لاش کو اس نے خود ڈھونڈا۔ اس کا کٹا ہوا سر اس کے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ شہید پاگل مہمت کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا۔ قاضی نے

اس کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر زبانی "سورہ یاسین" پڑھی قلعے سے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ سامنے پہرہ دار پہرہ دے رہا تھا۔ "سورہ یاسین" پڑھتے پڑھتے قاضی نے دیکھا کہ اس کی قبر سبز روشنی سے منور ہے۔ قاضی کی آواز بند ہو گئی۔ ہونٹوں کی تھرتھراہٹ رک گئی۔ اس سبز نور کے اندر' دیوانہ مہمت کے خون آلود گردن سے ایک سفید پروں والا فرشتہ لپٹا ہوا اس شہید کے چوڑے ماتھے پر بوسے دے رہا تھا۔ یہ سبز نور پھیلتا گیا' پھیلتا گیا۔ اور اس نے اپنے اندر سارے عالم کو سمیٹ لیا۔ قاضی کی آنکھیں اس نور کی روشنی سے چندھیا گئیں' جسم بے جان ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

زندگی میں پہلی دفعہ قاضی کو نیند کی حالت میں دیکھنے والے اسکے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے اٹھایا۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر لائے۔ اسے ہوش میں لائے

قاضی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا وہ ساتھیوں کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا سارا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ دیوانہ خسرو کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے قاضی نے اس کے کمرے میں جھانکا کیونکہ اس کے خیال میں' دیوانہ خسرو دوست کی جدائی میں آہیں بھر رہا ہو گا۔ لیکن دیوانہ خسرو بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے قاضی کے پوچھنے سے پہلے ہی کہا "تم نے مہمت کی عظمت اور بڑائی کو دیکھا ہے' قاضی نے کچھ سمجھتے ہوئے فوراً" کہا "کیا تم نے وہ سارا واقعہ یہاں سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا ہے" خسرو نے جواب دیا "روحانی آنکھ کو پردے کی حاجت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے دیوانے خسرو نے دروازہ بند کر کے گنگنانا شروع کر دیا۔

قاضی نے رات بڑی بے صبری سے گزاری' صبح صادق کے وقت وہ دیوانہ مہمت کی قبر کی طرف چلا گیا اور اس کے بعد بھی قاضی اپنا پورا دن اس قبر کے سرہانے پڑھتے ہوئے گزارتا رہا قاضی اس شہید کی قبر کا مستقل مہمان تھا۔ اس نے ایک خوبصورت سا کتبہ قبر پر لگوایا۔ اسکی جو بھی حاجت ہوتی اس وسیلے سے مانگتا اور وہ پوری ہوتی۔

آخری ہنسی

ابا ہم کو بتایا کرتے تھے کہ وہ پچیس برس کے تھے تو ان کی ذاتی ملکیت فقط تین قیمتی اشیاء تھیں۔ پھرا کام پانگ کی متبرک مورتی جوان کی گردن میں حفظ جاں کے لئے جھولتی رہتی تھی۔ ان کی کلائی پر بندھا تکرودا کا گنڈا جو اپنے پہننے والے کو ضرر سے مامون رکھنے کی ضمانت تھا اور بانگلین ضلع کے ڈپٹی شیرف کے عہدہ پر ہونے کی وجہ سے پہنی جانے پولیس وردی۔

ابا نے ہماری امی سے یہیں بانگلبن میں شادی کی تھی۔ امی کے بھیا غنڈوں کے وہ گرو گھنٹال تھے کہ جن کے نام سے نکیورائی سے لے کر درم بنگنام تک کا علاقہ تھراتا تھا۔ باگسائی کی بزریا ان کی ملکیت تھی اور یہ علاقہ بانگلین تھانے کی حدود میں لگتا تھا، مگر ابا نے ہم کو یہ کبھی نہ بتایا کہ آخر انہوں نے ایک دادے کی بہن سے شادی کیسے کرلی۔

ابا اور ماموں دونوں اتنے ہی مختلف تھے جتنے چونا او پنیر۔ ہمارے ماموں تو جانی واکر کے علاوہ کسی دوسرے مشروب کو ہاتھ ہی نہیں لگاتے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی ڈیک چیئر پر ہی گزارا کرتے تھے۔ پاس ہی ان کی چکن کری اور بوتل بھی موجود رہتی۔ ان کی دس بیگمات میں سے دو صبح شام ہروقت ان کی پیشی میں رہتی تھیں۔ ایک پنکھا جھلنے کے لئے تو دوسری ان کی مٹھی چپی کرنے کے لئے۔ تاہم اکثر یہ بھی ہوتا کہ ان کا دل گھر کی مرغی سے بھر جاتا۔ تب وہ اپنے پورے جتھے کو ساتھ لے کر گلچھرے اڑانے کے لئے بنکاک کی طرف نکل جاتے جہاں پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے اور اپنے کارندوں کے لئے پوری ٹرالی بھر مرغ یا بلخ کے قورے کا آرڈر دیتے اور اس سے نپٹ کر پھر بڑھیا چینی ریشم کے چند بانگلبن پجاموں کی خریداری کے لئے دکانیں جھانکتے۔ پھر وہ اپنے گروہ کو مائے بوتانگ ٹروپ کا لوک تماشہ دکھانے لے جاتے جو اپنی قسم کا پہلا ٹروپ تھا کہ اپنے تماشوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی پیش کرتا تھا۔ اچھاوقت گزار کر وہ اپنے پورے غول کو سمیٹتے اور واپس گھر لے آتے۔ سفر کے دوران کشتی میں کبھی بھی کسی نے ان سے کرایہ طلب کرنے کی جرات نہیں کی۔ پورا دل کا دل آتے اور جاتے پھوکٹ میں سفر کرتا تھا۔

رہے ابا، تو وہ سوائے چاول کے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ زیادہ تر وہ اپنی نوکری میں ہی الجھے رہتے تھے اور اس دوران گھر کا پانی بھی امی خود بھر کر لاتی تھیں۔

حالات یوں کیوں تھے؟

ابا ایک ایماندار، فرض شناس اور محنتی سرکاری اہلکار تھے جب کہ ڈسٹرکٹ آفس (جہاں شیرف آفس بھی واقع تھا) کے عین سامنے دریا پار قمارخانہ قائم تھا۔ ماموں نے قمار خانوں کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ ماموں پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بالکل کار فضول کیونکہ ماموں نے ایک کرگا چوٹی پر بٹھا رکھا تھا جو سارا دن دریا

پارایمبھور پر نظر رکھنے کے علاوہ کچھ نہ کرتا تھا کہ ادھر وہ چھاپے کے لئے پولیس کی نقل و حرکت دیکھتا ادھر وہ ہشیار کر دیتا۔ جب تک پولیس کی نفری اکٹھی ہو کر کشتیوں پہ لدتی اور بانگلین سے بانگ سائی تک دریا پار کرتی اس وقت تک جائے واردات پر تاش کے پتوں کی گرد بھی باقی نہ رہتی۔ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی کہ ان لوگوں کے صبا رفتار گھوڑوں کے آگے پولیس کی کشتیاں سست رفتار تھیں۔

مگر رفتہ رفتہ علاقے کے لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں کہ آخر پولیس کیوں ماموں کو ماخوذ نہیں کرپاتی۔ وہ بے شک اس وقت تک پولیس کو جل دیتا رہے گا جب تک اس کا بہنوئی ڈپٹی شیرف ہے۔ بالالفاظ دیگر ابا ماموں کو خبردار کر دیتے تھے۔ ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ہوتا کیا ہے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابا کو ماموں کی گرفتاری کے لئے بھیجا جائے۔

جس وقت ابا نے دریا پار کیا تو بجز اس مورتی کے جوان کی گردن میں پڑی تھی وہ کشتی میں تن تنہا تھے۔ وہ تو اپنا ہتھیار بھی چھوڑ گئے تھے۔ جوں ہی قمار خانے کے مخبر کی نظر ان پر پڑی اس نے دوڑ کر ماموں کو ابا کی آمد کی اطلاع دے دی۔

"اکیلا آدمی کیا سمجھتا ہے کیا تیر مار لے گا۔ سب لوگ کھیل چالو رکھو" ماموں نے نتھنے پھلائے۔

ابا نے مارکیٹ کے گھاٹ پر کشتی چھوڑ دی اور قمار خانے تک جانے والی تنگ گلی میں پیدل ہو لئے۔ ماموں نے اس راہ داری کو بنوایا ہی اس طرح تھا کہ جب لوگ اس میں داخل ہوں تو ایک کے پیچھے ایک قطار بنا کر چلیں۔ اگر گلی کے دونوں سرے بند کر دیئے جائیں تو جو کوئی بھی گلی میں ہو چوہے کی طرح پھنس کر رہ جائے۔ مگر جب ابا آئے تو گلی کے دہانے پر موجود پہرہ دار نے ان کو روکا نہیں بلکہ ادب سے سلام کیا۔ دوسرے سرے والے پہرہ دار نے بھی اسی طرح سلام کیا اور ماموں کے ڈیرے کا دروازہ ان کے لئے کھول دیا۔

جب ابا اندر پہنچے تو سب سے پہلے ان کی نظر ماموں پر پڑی جو اپنی ازلی ڈیک چیئر میں لیٹے پڑے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ماموں نے گردن گھمائی اور بہت تپاک سے کہا۔

"لو بھئی ہمارے ڈپٹی شیرف صاحب ملنے کو آئے ہیں"

ابا نے بہت ملائمت سے ماموں کو سلام کیا اور خیر صلا پوچھی۔ ڈرامے کے اصل کردار اگر سکون اور اطمینان کی تصویر پیش کر رہے تھے تو چھوٹے چھوٹے کردار بڑی شرمناک حد تک سراسیمہ ہو گئے تھے اور انہوں نے بھاگ نکلنے کی جان توڑ کوشش میں دیواریں تقریباً" ڈھا دی ہوتیں۔

لیکن ماموں کا قمار خانہ وہ جگہ تھی جہاں پہنچ جانا تو آسان تھا مگر نکل جانا مشکل۔ دیواریں لوہے کی نالی دار چادروں کی تھیں اور آدمی کے قد سے دوگنی اونچی تھیں۔ تب جواری داؤ پر لگے اپنے مال کو بے تحاشا سمیٹنے میں جٹ گئے۔ اس ہڑبونگ میں دو آوازیں صاف سنائی دیں۔ ایک ماموں کو جو چلا رہے تھے۔ "سب ٹھیک ہے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو"۔ دوسری میرے ابا کی للکار کہ "بھاگنے کی کوشش نہ کرنا اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے" دوسری آواز نے جس میں وہ رعب و دبدبہ تھا جو قانون نافذ کرنے والے ایک معمولی اہلکار کی بات میں بھی وزن پیدا کر دے' سب ہی کو ان کا حکم ماننے پر مجبور کر دیا اور وہ وہیں جم کر رہ گئے جیسے سحرزدہ لوگ۔

ماموں نے بگڑے تیوروں سے دریافت کیا۔ "تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

ابا نے کہا "تمہیں لے جانے کے لئے" ماموں کے حقارت آمیز قہقہہ سے کمرہ گونج اٹھا۔ انہوں نے جانی واکر کی ایک لمبی چسکی لی " اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور تمہیں اپنی سی کرنے دیں گے۔ بالکل یوں

۔ ایس!"

"تم کیا کرو گے یہ تم جانو" ابا نے کہا "مجھے تو یہی کچھ کرنا ہے۔"

"اور جناب اگر کوئی یہ پوچھنے کی ہمت کرے کہ حضور یہ کام کریں گے کیسے؟" ماموں نے بہت شرافت سے پوچھا۔

"میں یہاں پر موجود ایک ایک فرد کو ایمپھور لے جاؤں گا" ابا نے بتایا۔

"اس دھندے میں اتنی لمبی مدت ہو گئی" ماموں بولے "مگر ہم نے تو تمہارے ایمپھور میں کبھی قدم نہیں دھرا اور نہ اب ایسا کرنے کا ارادہ ہے"

ابا بولے "بھئی اسی لئے تو ایمپھور خود چل کر نہتا تمہارے پاس آیا ہے خاص الخاص حضور سے درخواست کرنے"

"یعنی یہ خاص الخاص درخواست ہے اور وہ بھی اپنی بات جتانے کے لئے بغیر ہتھیار کے۔ ایں۔ ارے بھلے مانس میں ابھی تم کو کتے کی موت مار سکتا ہوں چاہے ڈپٹی شیرف ہو یا نہ ہو' پرواہ نہیں"

ابا بولے "تو شوق پورا کیجئے"

"اور وقت سے پہلے اپنی بہن کو بیوہ کر دوں؟" ماموں نے کہا۔

"رشتے داری کو اس معاملہ سے الگ رکھو' میں یہاں سرکاری کام سے آیا ہوں" ابا نے کہا اور دوسروں کی طرف مڑ کر بولے۔

"اچھا تو بھئی سن لیا تم سب نے اب چل دو سب کشتی کی طرف۔"

ماموں نے فقرا مارا "تم کو یقین ہے کہ ایک اکیلا آدمی اتنے سارے آدمیوں کو گرفتار کر سکتا ہے؟ بھلے آدمی یہ سب باہر نکلتے ہی چاروں سمت اڑن چھو ہو جائیں گے۔"

"وہ ایسا نہیں کریں گے اگر تم ان کو ایسا کرنے سے منع کر دو گے۔" ابا بولے

"اور اس دوران میں تم پر نظر رکھوں گا"

"کیسی دیوانے پن کی بات ہے؟" ماموں نے غصہ میں کہا "لانا تو میرا پستول اب میرا صبر جواب دے گیا ہے۔" ان کے ایک نائب نے ان کے ہاتھ میں پستول پکڑا دیا۔ انہوں نے کچھ غور سا کرتے ہوئے اس کو ہاتھ میں تولا اور اب بھی اپنی کرسی پر اسی طرح پڑے رہے۔

"اس کے بعد بھی تم سمجھتے ہو کہ مجھے باندھ لے جاؤ گے؟" مگر ابا کچھ نہیں بولے اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلے۔

ماموں نے بیزار ہو کر سر کو جھٹکا۔

"اتنے ساروں کو چھوڑ کر آخر تم ہی کیوں آئے ہو؟ کوئی اور کیوں نہیں آیا؟ کیا واقعی وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی بہن کے شوہر کا خون کر دوں؟"

"یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے" ابا نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ لوگ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم یوں ہی قانون شکنی کرتے رہو گے اور بچتے رہو گے کیونکہ تمہارا بہنوئی ڈپٹی شیرف ہے اور مجھے ثابت کرنا ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں۔ اس لئے اگر تم مجھ کو گولی مارو گے تو شاید یہ ہم سب کے لئے بہتر ہو گا۔ تب باتیں اڑانے والے یہ تو جان لیں گے کہ ایک آدمی ایسا بھی تھا جو اپنے فرض کو خاندانی ناطوں سے بلند سمجھتا تھا۔ تم ہوا کرو میری بیوی کے بھائی لیکن اگر قانون شکنی کرو گے تو میں نہیں بخشوں گا"

"تھوڑے بہت پتے پھڑکا لینے میں آخر کیا برائی ہے؟" ماموں کا مزاج جو عام حالت میں بھی زیادہ ٹھکانے پر نہیں

رہتا تھا۔ اب حدوں سے باہر نکلنے لگا تھا۔
"جوا قانوناً منع ہے" ابا نے درشتی سے جواب دیا۔ "ہر بات جو قانون کے خلاف ہو غلط ہے"
خبردار کئے بغیر ماموں نے پستول تانا اور ابا کا نشانہ لیا۔ ہر شخص آڑ ڈھونڈنے لگا مگر ابا اپنی جگہ ڈٹے رہے۔
ماموں سیدھے سبھاؤ بولے "میں نے تو قانون توڑنا اپنا روز کا معمول بنا لیا ہے مثلاً" لوگوں کو شوٹ کرنا خلاف قانون ہے پر میں تو آئے دن ایسا کرتا رہتا ہوں' اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب اس عمر میں آکر میں اپنی عادت بدلوں۔ ایک اور بندے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ابا پورے قد سے تن کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی کلائی کا بکرود اور ان کی گردن میں لٹکی مورتی آہستہ سے لرزیں۔ انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔
"میں یہاں ہز میجسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں' جو بھی مجھ کو مارتا ہے شہنشاہ کو زک پہنچاتا ہے"
یہ الفاظ سنتے ہی ماموں نے پستول یوں جھکالی جیسے وہ بہت بھاری ہو گئی ہو' وہ چکرا گئے۔ کسی زمانے میں وہ خود شاہی محل سرا میں ملازمت کر چکے تھے اور خود ان میں بھی اپنے خیال کے مطابق وفاداری کا ایک تصور موجود تھا۔
"اس بات کو چھوڑو' بھول جاؤ' مٹی ڈالو آؤ کسی قسم کا سمجھوتہ کرلیں"
"کوئی سمجھوتہ نہیں" ابا نے کہا" میں نہتا آیا ہوں اور خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا مجھے کارگزاری دکھانے کے لئے کچھ چاہیئے" "ماموں نے غصہ میں آکر پستول ایک طرف دے ماری۔
"سوچتا ہوں اب مجھے تمہارے تبادلے کا بندوبست کرنا پڑے گا" انہوں نے کہا۔
"ٹھیک ہے"۔ ابا بولے "جوجی میں آئے کرنا' مجھے خود یہاں رہنے اور تم کو بار بار اندر کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے کیونکہ میں باز آنے والا نہیں۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں" ماموں چلائے" اب لیے بنو اور ناز کرو اپنی قسمت پر کہ یہاں سے زندہ سلامت نکل گئے۔"
"میں بھی سچ کہہ رہا ہوں" ابا نے جواب دیا"۔ جو میں یہاں رہ گیا تو کبھی ہتھیار بند نہیں رہ سکوں گا اور ہتھیار تو مجھ کو بھی چاہیئے"
ماموں کچھ دیر ابا کا ایماندار چہرہ تکتے رہے۔ ابا کی آنکھوں سے ان کی خواہش صاف عیاں تھی۔ آخر کار عمل پر اکس کر ماموں کھڑے ہو گئے اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے پھر وہ ابا کے بالمقابل آکھڑے ہوئے۔
"اچھا بھلے آدمی جیسی تمہاری مرضی' لو ہم ایمپھو رجائیں گے۔ ذرا سی بات کا تم نے بتنگڑ بنا ڈالا۔"
ابا چلائے "سنا تم سب نے اس شخص نے کیا کہا۔ چلو سب کے سب کشتی کی طرف۔ چلو"
یہ سنتے ہی ماموں بھڑاڑ گئے" تمہاری جان کی قسم یوں نہیں ہونے کا' تم سمجھتے ہو میں تم کو ایسا کر لینے دوں گا' کیا سمجھتے ہو مجھے کس کرلے جاؤ گے۔ کتنی انہونی بات ہو گی! بالکل انہونی! تم بھول جاتے ہو کہ بات کس سے کر رہے ہو!"
"مگر ابھی ابھی تم نے خود کہا تھا...." ابا بولے "...... تم نے وعدہ کیا تھا' تم نے ہی کہا تھا کہ تم قانون کے سامنے پیش ہو جاؤ گے۔"
"بالکل کہا تھا" ماموں بولے "اور ایسا ہی ہو گا لیکن میں یوں کسی بھینچر کی طرح گرفتاری نہیں دینے کا' میں اپنی مرضی سے جاؤں گا اور اپنے وقت پر جاؤں گا۔ میں تم کو زبان دیتا ہوں۔ اب تو تم جاؤ گھر۔ میں کل صبح تمہارے جاگنے سے پہلے ہی ان سب چڑ قاتیوں کو گھیر گھار کر تمہاری حوالات میں پہنچا دوں گا۔"

ابا نے کچھ دیر اس بات پر غور کیا اور پھر کاغذ پنسل مانگی کہ سب کے نام لکھ لیں۔ "میں یہ فہرست اپنے پاس رکھوں گا" ابا بولے "کل جب تم ان کو لاؤ گے تو میں اس فہرست سے ملا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے یوں ہی سہی" ماموں نے حامی بھرلی۔

ابا اپنی کشتی کی طرف خالی ہاتھ لوٹے تو بس وہی فہرست سنبھالے ہوئے تھے۔ جب وہ ایمپھور پہنچے تو جن نگاہوں سے ان کا سامنا ہوا وہ حقارت سے پر اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ کچھ تو اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے پوچھ بھی لیا کہ ماموں کو چھوڑ آنے کے لئے ابا کتنا پیا لے مرے، مگر ابا چپ ہی رہے۔

اس رات جب وہ امی کو دن بھر کی روداد سنا رہے تھے تو اس وقت ان کی آواز کانپ رہی تھی، جب انہوں نے بتایا۔

"آج میں تمہارے بھائی کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔"

"تعجب ہے کہ اس نے تم کو مار نہیں ڈالا" امی چلائیں۔

"وہ تو قریب قریب کر ہی گزرا تھا" ابا نے کہا۔ پھر انہوں نے پورا واقعہ سنا دیا جس کے بعد کافی رات گئے تک ہم امی کے رونے کی آوازیں سنتے رہے تھے یوں لگتا تھا کہ ابا بھی اطمینان سے سو نہیں سکے تھے۔

اگلی صبح ماموں اپنے تمام بحری قزاقوں کو ہنکاتے ہوئے ایمپھور میں پیشی کے لئے لے آئے۔ وہ سب ماموں کی اپنی موٹر لانچ میں آئے تھے جو کہ یوں کھچا کھچ لدی ہوئی تھی گویا کٹھن کے جشن کے جلوس میں آئی ہو۔ خود ماموں اپنے بڑھیا سیاہ ریشمی لباس میں نہایت شاندار لگ رہے تھے۔ ساری کارروائی کے دوران وہ اطمینان سے پان چباتے رہے۔ وہ خود کشتی کے ماتھے پر گدیلوں پر مسند نشین تھے اور جب کشتی ایمپھور کے گھاٹ پر لگی تو وہ جلوس کے آگے آگے سربراہی کرتے ہوئے عمارت میں داخل ہوئے۔

گفت و شنید کے بعد ایک قابل قبول رقم جرمانے کے طور پر طے کی گئی جس کی ادائیگی کی صورت میں قانون شکنوں کی فوری رہائی عمل میں آسکتی تھی، ماموں نے پورے غول کی طرف سے اپنی گرہ سے رقم ادا کردی جو کہ خاصی بھر مٹھی رقم بنتی تھی۔ اس کا کچھ حصہ ابا کو ان کی گرفتاریوں کے لئے بطور انعام دیا گیا۔ تب ماموں الٹے پیروں گھومے اور پلٹ کر ایک نظر دیکھے بغیر اپنی منڈلی کو واپس دریا پار لے گئے۔ وہ ہماری امی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے بھی نہیں رکے۔

اس رات ابا انعام میں ملی ہوئی رقم اپنے ساتھ گھر لائے اور امی کو پوری داستان سنائی۔

"مجھ کو اس رقم میں سے کچھ نہیں لینا۔" ابا نے کہا "اور اب میں سب سے پہلے یہ رقم تمہارے بھائی کو لوٹانے جاؤں گا۔"

ہیبت سے امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

انہوں نے سرگوشی کی "اب کے وہ تم کو ضرور مار ڈالے گا۔" اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

تھیب مہاپوریا / محمود احمد قاضی

چمپون

سپیشل وارڈ کی طرف جانے سے پہلے ہسپتال کے ڈائریکٹر نے اطلاعا" مجھ سے کہا "اس مریض کا تعلق بہت اچھے خاندان سے ہے اور اس کی کہانی' جو کہ اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہے' کا تعلق ان با اثر اور دولت مند لوگوں سے ہے جو کہ ابھی زندہ ہیں۔ اس کی بیماری کی علامات ایسی ہیں کہ ہم اپنے اس ہسپتال میں ان کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ خاص طور پر طبی نقطہ نگاہ سے ہم اسے فاتر العقل قرار دینے سے قاصر ہیں۔ اصولا" میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مریض کو کوئی شدید صدمہ ہوا ہے۔ اس بات کو پانچ ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو اس صورت حال سے باہر نہیں نکال سکا۔ سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔ جس نے اسے اس حال تک پہنچایا ہے اسے صرف وہی واقعہ یاد ہے۔ اس کا دماغ کسی اور چیز کو قبول ہی نہیں کرتا۔ اور یہی ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ ہم نے اسے نارمل حالت میں واپس لانے اور چیزوں کے بارے میں اس کے نارمل ردعمل کو واپس لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ صحت یاب ہو جائے گا اور اگر ناکام رہتے ہیں تو......

ڈاکٹر نے مایوسی کے انداز میں اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے۔

مریض کی عمر ستائیس یا اٹھائیس برس کے قریب تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا اور اس کی بیماری نے اس کی ظاہری حالت کو بالکل متاثر نہیں کیا تھا جیسے کہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ تو لاغر اور کمزور تھا اور نہ ہی اس کی رنگت زرد تھی۔ ظاہری طور پر وہ بالکل بیمار نہیں لگتا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک ذہین اور بھلا شخص لگتا تھا۔ اس نے مناسب لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے ایک مہذب شخص کی طرح اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کی شخصیت ایک پیروکار کی نہیں بلکہ ایک لیڈر کی سی تھی۔

ڈاکٹر نے جب میرا اس سے تعارف کرایا تو اس نے میری طرف عجیب سے انداز سے دیکھا۔ وہ پریشان کر دینے والی خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نے جو بھی کہا یا پوچھا مجھے اس کا جواب نہیں ملا۔ مجھے ڈاکٹر کے تنبیہی الفاظ یاد آنے لگے۔

"میرے خیال میں تم کچھ عرصے تک بھوکت میں ضرور رہے ہو؟"

"نہیں --- بھوکت میں نہیں --- میں تائی مانگ میں رہا ہوں جو کہ پننگنگا میں واقع ہے--- وہاں میں ایک لمبے عرصے تک رہا ہوں۔"

تائی مانگ "بہت سے کان کنی کے اضلاع کا مرکز ہے--- میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟ وہاں کی زندگی تو بہت پر لطف رہی ہو گی۔"

"وہاں کی زندگی تو جہنم سے کم نہیں تھی۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی ۔۔۔ "کیا؟" کیا وہاں کوئی ایسی صورت حال تھی جو دوسری جگہوں پر نہیں ہوتی۔ مثلاً" ہاوایائی کی طرح۔ ہاوایائی اور اس جیسی دوسری جگہیں عورت' شراب اور جوئے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مگر تائی مانگ کی وجہ شہرت اس کے چپون' مگرمچھ اور آہنی زنجیریں ہیں"

"میں سمجھا نہیں ۔۔۔ بھلا چپونوں' مگرمچھوں اور آہنی زنجیروں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

اس نے کہا "میں تمہیں ان کے متعلق بتاتا ہوں۔"

اس کے بعد تو وہ شروع ہو گیا۔ میں اس کی خاموشی توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ آگے جو کچھ بیان ہو گا وہ تمام کی تمام وہ کہانی ہو گی جو کہ میں نے اس سے حاصل کی۔ اس کہانی میں جہاں کوئی خلا موجود تھا اسے میں نے دوسری جگہوں سے ملنے والی اطلاع سے پر کر لیا تھا۔ جگہوں اور اشخاص کے نام البتہ فرضی تھے۔

"میرا باپ پہنگنگا کا گورنر تھا۔ میں نے اپنے وقت کے بنکاک کے بہترین سکول سے تعلیم حاصل کی جب میں سولہ برس کا ہوا تو میری عادتیں کچھ بگڑ گئیں میرے باپ نے مجھے واپس پہنگنگا جانے کا حکم دیا اور میں سکول کے بورڈنگ میں واپس چلا گیا۔ میں وہاں پانچ سال رہا اور یوں میں نے اپنی سکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ انہی دنوں میرا باپ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔ میرا باپ ایسے لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے بہت پہلے سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہم تھائی باشندوں کو غیر ملکی معاشی غلبے سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ مجھے گورنمنٹ کی ملازمت کے بجائے بزنس لائن میں جانے کی ترغیب دی۔ اس نے آسانی سے اپنی بات منوالی۔ مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ میرا باپ ریٹائرمنٹ کے بعد بنکاک چلا گیا تو میں خود مختار ہو گیا اور میں نے کان کنی کی ایک آسٹریلوی کمپنی میں کلرکی اختیار کر لی۔ میں اپنے تعلیمی حوالے سے اس کام کے لئے بالکل موزوں تھا کیونکہ میں مالے' ہوکن اور ہیلم تین زبانیں بول سکتا تھا۔ فرم اس شخص کو جو انگریزی اور تھائی زبان کے علاوہ تین زبانیں جانتا ہو منہ مانگی تنخواہ دینے کو تیار تھی۔

تاہم میں نے آسٹریلویوں کے ساتھ صرف دو سال کام کیا۔ یوکن گولڈ مائننگ کمپنی نامی ایک امریکی فرم نے تائی مانگ کے قریب ایک کان میں کھدائی شروع کی تو انہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ایشیائی مزدوروں کی دیکھ بھال کر سکے اور ساتھ ہی حکومتی کارندوں کے درمیان رابطے کا کام بھی دے سکے۔ میں نے وہاں فوراً" درخواست دے دی اور دس سے زیادہ لوگوں میں سے میں جو سب سے کم عمر تھا مجھے اس کام کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ مجھے تقریباً" چار سو بھات ملنے لگے۔ منیجر نے اس کے علاوہ مجھے کچھ اضافی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور یوں میری آمدنی آٹھ سو بھات ماہانہ تک جا پہنچی۔

ویسے تو بھوکت میں کسی چوبیس سالہ نوجوان کا آٹھ سو بھات ماہانہ کمانا کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن اس آمدنی کی وجہ سے میری زندگی میں ایک واضح اور لازمی تبدیلی تو آنی ہی تھی۔ جب میری آمدنی صرف دو سو بھات تھی تو میں کچھ پیسے بچا بھی لیتا تھا اس وقت میں ایک خاموش سی زندگی بسر کر رہا تھا ان دنوں میں صرف مطالعہ کرتا تھا اور کام کے بعد ریڈیو سنا کرتا تھا۔

لیکن جب میں نے آٹھ سو بھات کمانے شروع کر دیئے تو گزارہ کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا۔ پیسے کم پڑنے لگے اور یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ تائے اسنوئے یعنی میں نے معاشرے کے ایک خاص طبقے میں بہر حال اپنے لئے ایک جگہ بنا لی تھی۔ جہاں کہیں بھی عورت' شراب اور جوئے کی محفل سجائی جاتی وہاں میرا ذکر خیر ضرور ہوتا ۔۔۔ میں ان محفلوں کی جان تھا۔

میں کچھ اور چیزوں میں بھی آگے تھا۔ میں کسی کو بھی اپنے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ میں پیروکار کبھی نہ بنا بلکہ لیڈر ہی رہا اور میں نے اپنا کردار بہت اچھی طرح سے نبھایا۔ مجھے یقین ہے اس سلسلے میں میری سماجی حیثیت نے بھی اپنا رول ادا کیا تھا۔ چاہے مقامی لوگوں کی یا غیر ملکیوں کی محفل ہوتی میں اسی کا حصہ بن جاتا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میری دولت نے ہر ایک کو میرا دوست بنا دیا تھا۔

میری پسندیدہ جگہیں جہاں میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتا تھا وہ تائی مانگ کے مختلف کلب تھے۔ ہمارا قصبہ اس علاقے کا مرکزی علاقہ تھا جہاں سے سڑکیں ہر اطراف کو جاتی تھیں۔ یہاں سے آدمی بہت سے علاقوں کی طرف جا سکتا تھا اور میری کمپنی کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے بہت نزدیک واقع تھا۔ ساری ہی دلچسپیوں کے سامان یہاں اردگرد موجود تھے۔

اب جو کچھ میں بیان کرنے جا رہا ہوں اس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

تائی مانگ سے دریا کے دہانے تک پہنچنے کے دو راستے تھے اور وہیں میری کمپنی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ یہاں سے دوسرے کنارے کی سمت میں دریا کے بہاؤ کے مخالف رخ میں چلتے ہوئے کسی کشتی کے ذریعے ہم نکواپانگ میراؤ روڈ تک جا سکتے تھے۔ اگر آپ بس پر جانا چاہیں تو آپ دریا کے بہاؤ کی سمت میں تائی مانگ کی طرف چلتے ہوئے دریا کے دہانے تک پہنچ سکتے تھے۔ البتہ اس طرح وقت زیادہ لگتا تھا۔ اس طرح متواتر پانچ چھ گھنٹوں تک بیٹھے رہنے سے آدمی اکڑ کر رہ جاتا تھا۔ اور طرفہ تماشہ یہ تھا کہ بس کا مل جانا بھی کوئی یقینی بات نہیں تھی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ کشتی کے ذریعے دریا کو عبور کر کے دریا کے دہانے کے قریبی علاقے میں پہنچ جائیں۔ پھر جنگل میں سے پیدل چلتے ہوئے آپ تائی مانگ جا نکلیں۔ اس طرح تین گھنٹوں میں آدمی وہاں پہنچتا تھا۔ لیکن اس سفر کی کچھ اپنی قباحتیں بھی تھیں۔ جنگل کے ان راستوں سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر آپ جنگل میں گم بھی ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دریا کا یہ حصہ نہایت خونخوار قسم کے مگرمچھوں سے اٹا پڑا تھا۔ جب میرا باپ نکرون سرتماراج کا گورنر تھا تو میں پاک پیور ضلع میں اس کی مگرمچھوں کے شکار کی مہموں میں اس کے ساتھ آیا کرتا تھا کیونکہ یہ علاقہ مگرمچھ کے شکار کے لئے نہایت موزوں تھا۔ پھر بھی ہماری کان کنی کے قریب کا دریائی علاقہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہاں کے مگرمچھ کشتی میں سوار لوگوں پر اچانک اچھل کر حملہ کر دیتے تھے۔ اسی لئے یہ بات حیران کن نہیں تھی کہ یہ ایک ویران سا علاقہ تھا اور گنتی کے چند خاندان ہی یہاں دریا کے کناروں پر آباد تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ چھوٹی کشتیوں پر یہاں سے دریا عبور کرنے کی کوئی کم ہی ہمت کرتا تھا۔ بھوکت صوبے کا یہ بہت بدنام ضلع تھا۔ تائی مانگ کے علاقے کے لوگ جو ہماری کانوں کو دیکھنا چاہتے تھے اس وقت تک رضامند نہیں ہوتے تھے جب تک انہیں یہ یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ کشتی جس میں وہ سفر کریں گے بہت مضبوط ہو گی اور اس کی دیواریں بھی دونوں طرف سے اونچی اور محفوظ ہوں گی۔

بہر حال میں خود کمپنی کی بڑی اور محفوظ کشتی استعمال کرتا تھا۔ اس طرح میں نہایت ہی خطرناک ترین علاقوں سے بھی گزر جاتا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں سے ہو لیتا تھا۔ یہ راستے اب خوب اچھی طرح سے میری پہچان میں آچکے تھے۔ پھر بھی میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ میں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے جنگل کو عبور کر لوں۔ شیر کے پاؤں کے نشانات اس علاقے میں اکثر دیکھے جاتے تھے۔

ہاں تو اب آپ سمجھے کہ یہ کتنی پرکشش جگہ تھی یعنی اپنے تضاد کے حوالے سے۔ حتیٰ کہ یہاں کے شیر اور

مگر پھر بھی آپس میں تال میل نہیں رکھتے تھے۔ میں شیخی نہیں بگھار رہا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تائی مانگ کا ہر دلعزیز شخص تھا۔ علاقے میں اپنی اسی پسندیدگی کی بنا پر تائی مانگ بلکہ سارے بھوکت کے ایک نہایت اہم شخص کے ساتھ میری ٹھن گئی تھی۔ یہ شخص تاؤ کے سون تھا۔

تاؤ کے سون یہاں "بگ برادر سون" کے نام سے بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ اب اگر یہ شخص بنکاک میں پلا بڑھا ہوتا تو اس کے نام کو چینی زبان کے معنوں میں پکارا جاتا۔ لیکن جنوب کے علاقے کے لہجے کے مطابق اسے چینی انداز سے ہر دو طرح سے ادا کیا جا سکتا تھا جیسے موقع محل کے مطابق کسی غیر ملکی کو پکارا جا سکتا تھا۔ بھوکت کے اردگرد کے علاقے میں تاؤ کے سون کی ہر ایک کے ساتھ دوستی تھی اور تعلقات تھے۔ لیکن جن جگہوں پر وہ بہت پر اثر تھا وہ تائی مانگ' تکواپا' پنگنگا' کاؤ کلائے اور تنگ پراؤ تھیں۔ اس علاقے کا کوئی بھی قانونی یا غیر قانونی کیس ہوتا تھا تو وہ عدالت میں جانے سے پہلے پہلے تاؤ کے سون یعنی بگ برادر کے ذریعے ہی حل ہوتا تھا۔ وہ اونچے رتبے کے سارے ہی حکومتی اہل کاروں کو خوش رکھتا تھا۔ جب انہیں تائی مانگ آنا ہوتا تھا تو وہ بگ برادر کی کار ہی میں آتے تھے اور وہ انہیں بہترین جگہوں پر ٹھہراتا تھا۔

اس علاقے کی تمام تر آسائشات وہ ان کو بہم پہنچاتا تھا۔ یہاں کے ہر اہم افسر کے منہ سے نکلی ہر بات فوراً پوری کی جاتی تھی۔ بگ برادر پر تکلف مہمان نوازی کے لئے مشہور تھا۔ نوجوان حکومتی اہل کار اس کی مہیا کردہ آسائشات کے جال میں یوں پھنس جاتے تھے کہ پھر وہ اس کے آلہ کار بن کر رہ جاتے تھے۔

بگ برادر بہت پکا قوم پرست تھا۔ وہ بے شک اپنے ملک کے مفاد کے لئے کام کرتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی سرکاری سرزنش کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔

میں خود بھی بہت متشدد قسم کا قوم پرست تھا اور میں صرف اسی وقت اس کی مخالفت کرتا تھا جب وہ کسی لمحے اپنی ذات کو بھلا کر بدسلوکی پر اتر آتا تھا۔۔۔ لیکن تاؤ کے سون نے سرعام کسی کی بھی بے عزتی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک طنز آمیز نکتہ سنجی کا رویہ اپنائے رہتا تھا۔ میں بھی اپنے آپ کو اس جیسا ہی نکتہ سنج سمجھتا تھا' اسی لئے ظاہری طور پر میں کبھی بھی جارحانہ رویہ نہیں اپناتا تھا۔ وہ ایک منجھا ہوا جوئے باز تھا جب کہ میں ابھی نوجوان تھا اور اس کھیل کا نیا نیا کھلاڑی تھا۔ اگرچہ بہت سے موقعوں پر میں نے اپنے ایجاد کردہ ذاتی ہتھکنڈوں سے اس "شیر کی طاقت" کو کمزور کیا تھا۔ لوگ میری کامیابیوں کو سراہنے لگے تھے اور درپردہ طور پر اس پر ہنستے تھے۔ اور یہی چیز سون کے نزدیک ناقابل معافی تھی۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل تو کبھی نہیں آئے تھے مگر ہمارے جھگڑے کی دھوم سارے علاقے میں مچی ہوئی تھی' اور یہ بات ہمیشہ ہی میری سمجھ سے باہر رہی کہ چینی اور تھائی باشندے ہمیشہ اس موقع کا انتظار کیوں کرتے رہتے تھے کہ کب ہم دونوں کا آمنا سامنا ہو اور ہم براہ راست آپس میں جھگڑ پڑیں۔ میرے خیال میں میرے جیسے نوخیز اور نو آموز شخص کا سون جیسے جہاندیدہ شخص کے مقابل آنا ان لوگوں کے لئے شاید ایک پرجوش کھیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس دن کے بارے میں تشویش لاحق رہتی تھی جب ان لوگوں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے کھلے دشمن بننے والے تھے۔ سون اس سارے علاقے' اس جنگل کا ایک لمبے عرصے سے بادشاہ چلا آرہا تھا اور یہ صورت حال اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ جنگل کا بادشاہ ایک شیر کسی دوسرے جانور کو اپنی سلطنت کو فتح کرنے کی کبھی اجازت دے سکتا تھا؟ میں سوچا کرتا تھا کہ آخر کار ایک دن یہ سب کچھ تو ہونا تھا چاہے یہ دن کی روشنی میں نہ ہو لیکن رات کی تاریکی میں تو یہ سانحہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال اپنی اور اسکی دشمنی کے حوالے سے میں

اب محتاط رہنے لگا تھا۔۔۔۔ حتیٰ کہ ....."

"کیا آپ چمپون کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

میں اس کے اس سوال اور اس کی کہانی کے اس نئے موڑ پر قدرے حیران ہوا۔ ڈاکٹر مجھے اپنے مریض کے پاس اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا اس لئے میں نے اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے فوراً جواب دیا "ہاں میں نے اس کے متعلق سنا تو ہے لیکن آج تک کبھی اسے دیکھا نہیں"

"یہ بنکاک کا ایک غیر معمولی پھول ہے لیکن جنوبی علاقوں اور خاص طور پر تائی مانگ کے گرد و نواح میں یہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔۔۔۔ میں اس کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں اس پھول کا تعلق چمپک خاندان سے ہے۔ یہ چمپی کی طرح دکھائی دیتا ہے لیکن جب ابھی اس کی پتیاں برآمد نہیں ہوئی ہوتیں اور ابھی یہ نشوونما کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ ایک مخملیں کٹورے میں چھپا ہوتا ہے۔ جب یہ مخملیں حصہ کھلتا ہے تو اس کی پتیاں برآمد ہوتی ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ تب کیسی خوشبو پھیلتی ہے۔ اس کی پتیاں موٹی اور سخت ہوتی ہیں اور ایک موی تہہ اپنے اوپر لئے ہوتی ہیں۔ یہ پھول چمپی کی طرح جلد ہی مرجھا نہیں جاتا۔ چمپون جب مکمل جاتا ہے تو پھر کئی روز تک کھلا رہتا ہے۔ اس کی مہک اردگرد کے تمام پھولوں کی مہک پر حاوی ہوتی ہے۔ اس کی مہک نہایت طاقتور ہوتی ہے یہ آدمی کو مست اور بے خود کر دیتی ہے۔

کیا یہ چیز عجیب و غریب نہیں کہ سون اپنی تمام تر قوم پرستی کے زیر اثر اپنی بیٹی کا نام اس پھول کے نام پر رکھتا ہے؟ چمپون! غالباً" وہ یہ جانتا تھا کہ یہ نام اس کے لئے کتنا موزوں تھا۔ انیس سال کی عمر میں چمپون ایک خوبصورت اور دلآویز شخصیت کی مالک لڑکی بن چکی تھی۔ اس پھول کے نام کی طرح وہ پہلی نظر میں کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب سنجیدگی کے ساتھ اس پر دوسری نظر ڈالی جاتی تھی تو اس کی خوبصورتی پوری طرح سے آشکار ہونے لگتی تھی۔ ایسے نام والی لڑکی سے جس قسم کے جذبے کی توقع رکھی جا سکتی ہے وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ اس کے جذبوں میں ویسی ہی تبدیلیاں واقع ہوتی تھیں جیسے کہ ایک پھول کی مہک کی اثر پذیری میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ وہ چمپون پھول کی طرح ایک آدمی کو مست اور بے خود کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ چمپون جب کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

بارہ سال کی عمر تک چمپون بھوکت کے ایک سکول میں پڑھتی رہی لیکن اس کے بعد اس کے باپ نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اچھی چینی لڑکیوں کی طرح گھر میں ہی رہنا چاہیے۔ لیکن چمپون جو اس وقت چوتھی جماعت کی طالبہ تھی اس نے اپنے باپ کے متعین شدہ طریقہ کار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے خلاف بغاوت کرنے کا گر سیکھ لیا تھا۔ سون کسی حد تک تو اس رویے کو پسند کرتا تھا کہ اس کی بیٹی نے اسی کی طرح اپنی مرضی کا مالک ہونے کا وطیرہ اپنا لیا تھا۔ اس لئے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اسے پھیننگ کے کانونٹ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس چیز سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سون چمپون کی مزید تعلیم کا مخالف نہیں تھا بلکہ وہ تو اسے تھائی زندگی کی طرز میں اپنے آپ کو ڈھالنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ سون قطعی طور پر نہیں چاہتا تھا کہ چمپون کسی تھائی باشندے سے شادی کرے۔

سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد چمپون اور اس کے باپ کے خیالات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ تاؤ کے سون نے اپنی بیٹی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کئے رکھا۔ اور چمپون اس رویے کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ باپ

اور بیٹی کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چپون چینی روایات کی اتنی پابندی تو کرتی تھی کہ وہ بغیر اجازت گھر سے باہر نہیں رہتی تھی اور گھر کے سامنے والے صحن میں نظر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے باپ کی ناراضگی مول لے سکتی تھی لیکن جہاں وہ جانا چاہتی تھی اور جہاں پر اس کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی تو وہ وہاں جانے سے پہلے اپنے باپ کی مرضی پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ اپنی بیٹی کی اس خود سری پر اس کا باپ اپنی رائے کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ کسی حد تک مفاہمت کا رویہ اپنا لیتا تھا۔

مجھے یہاں آپ کو بتا دینا چاہیے کہ یہاں کے جنوبی علاقے میں مکان کس انداز سے تعمیر کئے جاتے ہیں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ کیوں چپون مکان کے سامنے والے پورچ میں نظر نہیں آنا چاہتی تھی۔

جنوبی علاقوں میں گھر بالکل بنکاک کی طرز پر بنائے جاتے تھے یعنی گلی کے کنارے کنارے ایک کمرے کے پیچھے دوسرا کمرہ۔ یہ گھر بنکاک کے گھروں کی طرح ایک ہی طرح کی لمبائی کے لگتے تھے لیکن اصل میں ان کی لمبائی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک گھر تیس سے چالیس "واہ" کی لمبائی کا ہو سکتا ہے۔ جبکہ ایک "واہ" ایک میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ مناسب روشنی کے حصول کی خاطر چھت کئی جگہوں سے کھلی ہوتی ہے۔ ان کھلی جگہوں کو شیشے یا ٹین سے ڈھانپ دیا جاتا تھا یعنی مالک اپنی حیثیت کے مطابق ایسا کرتا تھا۔ شیشے یا ٹین کے یہ کور ایک میکانکی عمل کے تحت ہٹائے جا سکتے تھے اور بارش کے وقت کھلی جگہوں کو پھر سے ڈھانپا جا سکتا تھا۔ امیر ترین چینی باشندے اس علاقے میں ایسے ہی گھروں میں رہائش پذیر تھے۔ چینی تاجر پیشہ لوگ دکھاوے کے لئے خوبصورت بنگلے تعمیر کراتے تھے لیکن وہ بھی اپنے آپ کو اصل ماحول میں رکھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

تاؤ کے سون کا گھر اسی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا جیسے کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ لیکن شہر سے باہر واقع تھا۔ یہ کسی پر ہجوم گلی میں نہیں تھا اس گھر کا پچھواڑا جنگل کے قریب تھا۔

چینی گھروں میں لڑکیاں مکان کے اگلے حصے میں دکھائی نہیں دیتی تھیں اگرچہ چپون لڑکیوں کو گھروں میں قید کر کے رکھنے کی حامی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ گھر کے اگلے حصے میں نظر نہیں آتی تھی اور اڑوس پڑوس کے لوگوں سے اس کا رویہ اس ضمن میں مختلف تھا۔ وہ اپنے آپ کو گھر گرہستی کے کاموں اور کشیدہ کاری وغیرہ میں مصروف رکھنے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ وہ مطالعے کی بہت شوقین تھی اور اس مقصد کے لئے وہ پھنینگ اور بنکاک سے کتابیں منگواتی تھی اور جنگل کی مہم جوئی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

ہم دونوں اتفاقاً" ملے اور پھر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے جیسے کہ تقدیر نے ہمارے لئے طے کیا تھا۔ ہماری محبت اتفاقیہ تھی مگر بہت مضبوط اور گہری تھی۔ حقیقت میں ہم اپنی محبت کو راز میں رکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری کوششیں رائیگاں گئیں کہ یوں اس کی شدت میں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ تاؤ کے سون ہماری محبت کو قطعاً" برداشت نہیں کرے گا اور اس شخص سے جس سے وہ نفرت کرتا ہو اور وہ اس کا بدترین دشمن بھی ہو وہ اس سے اپنی لڑکی کی شادی کی اجازت دینے سے پہلے اسے جان سے مار دینے کو ترجیح دے گا۔

میں یہاں اس بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ چپون ایک پختہ ارادے والی لڑکی تھی پھر بھی اس نے میرے ساتھ بھاگ جانے سے انکار کیا۔ اس کی تعلیم اور تربیت کے انداز نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ ایک سچی اور گہری محبت تھی۔ اور میں خود بھی اس حوالے سے اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر ہم بھاگ جانے کا

فیصلہ بھی کر لیتے تو تب بھی ہم نے اپنی روایات کی پاسداری ضرور کی ہوتی اور چھون نے بھی زندگی کی آسانیوں کے بجائے اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے پر ترجیح دی۔
تائی مانگ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور کوئی بات زیادہ دیر تک یہاں پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور پھر ہماری محبت کی داستان ۔۔۔۔ اس کی کہانی تو جنگل کی آگ کی طرح فوراً" پھیلی اور چھون کے باپ کو بھی جلد ہی اس کی خبر ہو گئی۔
میں اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ گھر میں پابند کر دی گئی تھی کیونکہ میرے آدمی جو اس کے گھر کے اردگرد پھیلے رہتے تھے ان کے بقول انہوں نے اسے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اس تک اپنا پیغام پہنچانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ حتیٰ کہ میں نے ایسے شخص کے لئے انعام دینے کا اعلان کیا جو کہ میرا رقعہ اس تک پہنچا دیتا اور جو اس کا جوابی رقعہ مجھ تک پہنچاتا اس کے لئے انعامی رقم میں مزید اضافے کا بھی اعلان کیا۔ کئی لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی بھی ان میں سے میرا پیغام اس تک پہنچانے یا اس کا پیغام مجھ تک لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف یہ ہوا کہ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ضرور ڈالا۔
اپنی دشمنی کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک میں اور تاؤ کے سون چند تہذیبی اصولوں کے پابند ضرور رہے تھے۔ ظاہراً" ایک دوسرے کے لئے ہمارا رویہ نرم ہی تھا۔ لیکن اب تو یہ ایک کھلی جنگ تھی۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے لیکن اب جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہو جاتا تو ہم ایک دوسرے کو گھورنے لگتے تھے۔ جہاں تک چھون کا تعلق ہے اس کے متعلق تھوڑی بہت اطلاع مجھے اپنے آدمیوں کے ذریعے ملی تھی۔ اسے مارا پیٹا گیا تھا۔ اسے اس بڑے اور اندھیرے گھر میں خاصے تشدد کا سامنا تھا' وہ وہاں ایک قیدی کی طرح رہ رہی تھی۔
مجھے بھی ایک لمبے عرصے کے لئے بھوکت سے دور رہنا پڑا۔ میری جلا وطنی اس علاقے کا سب سے بڑا موضوع بنی ہوئی تھی۔ میرے چند دوستوں نے ایک موٹر بوٹ کرایے پر حاصل کی اور میری تسلی کے لئے میرے گھر پر کچھ جنگجو قسم کے لوگ متعین کر دیئے۔ جنگجو لوگوں کی یہ پارٹی ایک خاص انداز کی تھی۔ ان کا سٹائل وہی تھا جس کے لئے بھوکت مشہور تھا۔ یعنی خوراک' شراب اور عورت!
میں یہاں خوراک اور شراب کے معیار کے متعلق آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ہاں میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ایسی زبردست چیزیں کسی بھی قیمت پر حاصل نہیں کی جا سکتی تھیں۔
پھینگ سے خاص طور پر میرے لئے ایک طوائف منگوائی گئی تھی۔ اس موقعہ پر البتہ اسے یہاں آنے کی دعوت دی گئی تھی اور اس نے قبول کر لی تھی۔ زندگی کے سیاہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کسی وجود کے لئے ایک سیاہ اندھیری رات میں بہت معمولی سی روشنی ہی کافی ہوتی ہے۔ اسی لئے جب کسی شخص کی زندگی سے ایک عورت نکل جاتی ہے تو وہ کسی دوسری کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہے' میرے دوستوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ میری مدد کر رہے تھے۔ میں نے شیطان کا یہ تحفہ قبول کر لیا۔
اس کا نام انتیا تھا۔ وہ ایک فلپائنی عورت تھی جس کی رگوں میں پرتگیزی خون کی آمیزش تھی۔ وہ ایک تھائی لڑکی کی جگہ لے سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوبصورت چیز تھی اور اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ایک طوائف تھی۔

میں نے اور میرے دوستوں نے تین دن اور تین راتیں کشتی پر گزاریں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ رونگ لے جانا چاہتے تھے مگر میں کسی ضروری کام کی وجہ سے ان کے ساتھ جانے سے قاصر تھا۔ وہ تو چلے گئے مگر انیتا یہیں میرے پاس ٹھہر گئی۔ پانچ چھ دنوں بعد واپس آکر ان کو انیتا کو اپنے ساتھ واپس بھینینگ لے جانا تھا۔

میں نے انیتا سے دوستوں کے ساتھ رونگ جانے کو کہا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس نے یہاں اسی ویران اور دور افتادہ جگہ پر رہنا پسند کیا۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں رک گئی تھی۔ اس نے جواباً" کہا کہ اسے میری جوانی' خوبصورتی اور اچھے اخلاق نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔

کہ اس کی اس تعریف کا مجھ پر کیا اثر ہوا؟ یا یہ کہ انیتا جیسی خوبصورت عورت میری زندگی اور روح میں کیا کچھ تبدیلی لا سکتی تھی؟ وغیرہ وغیرہ

مگر فوری طور پر یہ ہوا کہ جونہی دوست روانہ ہوئے انیتا میرے ساتھ میرے گھر میں آگئی۔ ایک دوسرے کو جاننے کے سلسلے میں ہم دونوں کچھ زیادہ ہی پرجوش تھے۔ میرا گھر ایک بھدا سا لکڑی کا بنا بنگلہ تھا۔ تین کمروں کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے جہاں سے زمین کے فرش پر اترنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ پہلا کمرہ تو میرا بیڈ روم تھا اور دوسرے میں میں کھانا کھاتا تھا۔ اسی کمرے سے ایک راستہ کچن اور باتھ روم کو جاتا تھا۔ آخری کمرہ عام طور پر بند رہتا تھا کیونکہ میں وہاں اپنے ضروری کاغذات رکھتا تھا۔ حتی کہ رات کے وقت بھی میں اپنے بیڈ روم میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔

میرا بنگلہ کمپنی کے دوسرے گھروں سے ذرا پرے دریا اور جنگل کے قریب واقع تھا۔ یہ بہت پرسکون' خاموش اور الگ تھلگ سی جگہ تھی۔ دن کے وقت میرے پاس ایک نوکر اور باورچی ہوتا تھا۔ اور شام کو سب کارکن اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور وہاں وہ جوا کھیلتے تھے یا اور دوسرے طریقوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

انیتا کی آمد پر ایک شام کو میں کمپنی کے انجینئروں کی طرف سمندر کے قریب دی گئی رات کے کھانے کی دعوت میں شریک تھا۔ وہاں کھانے کے بعد ڈانس وغیرہ کا اہتمام بھی تھا اور دونوں انجینئروں نے وہاں اچھا وقت گزارا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ انیتا سے ملنا چاہتے تھے اور اس ضمن میں میری طرف سے دعوت ملنے کے متمنی تھے۔ ایک لمبے عرصے سے وہ یہاں عورتوں اور نہایت ہی خوبصورت عورتوں کے بغیر رہ رہے تھے اور وہ یقیناً" عورتوں کے لئے مرے جا رہے تھے۔ ان کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ مہذب اور اچھے اطوار کے مالک لوگ تھے۔ انہوں نے انیتا کے ساتھ ڈانس کیا اور کچھ خوش فعلیاں بھی کیں۔ یہ پارٹی ساری رات چلتی رہی۔

میں ذرا ہلکی نیند لینے والا آدمی ہوں اور مجھے سونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ لیکن اس رات کی پارٹی کے بعد میں فوراً" ہی سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد' میں جاگ گیا۔ شاید یہ دروازے کے قبضوں کی جنہیں کبھی تیل نہیں دیا گیا تھا چرچراہٹ کی آواز تھی۔ یہ بہت عجب بات تھی ۔۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ سونے سے پہلے میں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں وجہ معلوم کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھلے دروازے سے صبح کے سورج کی کرنیں سیدھی میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ پھر میں نے دروازے میں کسی کے جسم کا سایہ دیکھا۔ میں اس پر یقین نہ کر سکا اور پنی آنکھیں ملنے لگا۔

اوہ میرے خدا ---- کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ یا میرا دماغ چل گیا تھا؟ اپنی آنکھیں بند کئے میں ابھی تک دروازے میں موجود اس سیاہ بھوت کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ چپون تھی ---- بالکل برہنہ ---- اس کے لمبے سیاہ بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی کمر اور ٹخنوں کے گرد لوہے کی ایک زنجیر تھی۔

ہم دونوں ہی دم بخود تھے۔ میں نے اس کی نگاہوں کو اپنے چہرے سے پرے ہٹتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ہپناٹائز ہو چکی تھی۔ میں کچھ دیر تک اپنا سانس روکے رہا پھر ایک ساتھ ہی ہم دونوں کی نظریں انیتا پر پڑیں۔ جالی دار مچھر دانی کے نیچے بستر پر اس کا جسم مجھ سے لپٹا پڑا تھا وہ سو رہی تھی اور آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ چپون کی برہنگی کو دیکھ کر مجھے کوئی شرم کیوں محسوس نہیں ہوئی لیکن انیتا کی جسمانی نمائش نے ایک دم مجھے شرمندگی میں ضرور مبتلا کر دیا اور میں نے جلدی سے اس کے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

میں چپون کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں اس کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔ میرا سر چکرانے لگا؟ کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو چپون جا چکی تھی۔

"چپون نے اپنے باپ کے سامنے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ نائے امنوئے یعنی مجھ سے محبت کرتی تھی اور یہ کہ ہم میں میل ملاقات بھی تھی۔ لیکن یہاں اس نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ اس نے ایسا کرتے ہوئے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ جس سے اس پر یا اس کے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔ سون نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اسے واقعی یقین نہیں تھا کیونکہ وہ یہ بات کہنے سے قاصر تھا کہ کوئی عورت ایک مرد سے میل ملاپ رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو محفوظ کیسے رکھ سکتی تھی۔ سون کے گھر میں خود اس کی اپنی چھ عدد داشتائیں تھیں۔ اور اس کے علاوہ ایک صحت مند نوجوان آدمی ہوتے ہوئے اور ایسی چیزوں کا رجحان رکھتے ہوئے نائے امنوئے جو کہ اس کا دشمن تھا اور جو کہ واحد شخص تھا جو اس لمبے عرصے میں اس سارے علاقے میں اس کے سامنے یوں اکڑا ہوا تھا اس کی بیٹی کے ذریعے اس سے بدلہ لینے سے کیسے باز رہ سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص کے ساتھ جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا چپون نے محبت کر کے اس کے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا۔ اس نے اسی بنا پر اس کی وضاحت اور دلیلوں کو رد کر دیا تھا۔

جب باپ اور بیٹی دونوں اپنی بات پر اڑے رہے اور دونوں میں سے کوئی اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوا تو پھر آنے والے وقت میں جو کچھ ہونا تھا اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں جنگ و جدل پر آمادہ ہو گئے۔ سون نے جلتی ہوئی لکڑی کا ایک ٹکڑا چپون پر دے مارا۔ چپون نے اپنے آپ کو اس وار سے بچا لیا۔ تاہم اسے بے دردی سے پیٹا گیا۔ اتنا شور مچا کہ ہمسائے بھی متوجہ ہو گئے۔ چپون نے البتہ ناقابل برداشت درد کی شدت کا اظہار محض سسکیوں کی صورت میں کیا۔ تاؤ کے سون جب یہ تشدد کرتے کرتے تھک گیا تو چپون فرش سے اٹھی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح پاکیزہ ہوں لیکن تم میری بات کا یقین نہیں کر رہے۔ تم نے مجھے گالیاں دیں اور مارا پیٹا۔ میں اب سیدھی امنوئے کے پاس جاؤں گی اور اپنا آپ اس کے سپرد کر دوں گی ---- اب خدا ہی میری مدد کرے گا"

ہر کسی کو معلوم تھا کہ چپون جو کچھ کہتی تھی وہ کر گزرتی تھی ---- ایک ہفتے بعد جب اس کا باپ گھر پر نہیں تھا تو وہ وہاں سے نکل آئی۔

اس چینی خاندان کے سربراہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس گھر کے لئے ایک حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر چپون یہاں سے بھاگی تو وہ سب لوگوں کو یعنی اپنی بیویوں' بیٹیوں اور نوکروں کو اس بات کی سزا دے گا۔ چپون کے لئے بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔ گھر کے سب ہی افراد نے چپون کو پیچھے سے جکڑ لیا اور کسی نے گھر کے مالک کو بھی اس بات کی اطلاع دے دی۔ پہلی بار بھاگنے کی کوشش پر چپون کو سزا دی گئی۔

اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسے ایسا کرنے سے روکنے کے لئے تاؤ کے سون نے حکم دیا کہ اسے اس کے بیڈ روم میں ایک ستون کے ساتھ زنجیر سے باندھ دیا جائے۔ رات کے وقت البتہ اس نے اس کی زنجیر کی لمبائی اتنی رکھنے کی اجازت دے دی کہ وہ آسانی سے کمرے میں حرکت کر سکتے لیکن تب بھی زنجیر اس کے ٹخنوں سے بندھی ہوتی تھی۔ زنجیر میں بندھے ہونے کے باوجود بھی جب چپون نے بھاگنے کی کوشش ترک نہ کی تو سون نے اس کی سوتیلی ماؤں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ رات کو سونے سے پہلے اسے کپڑوں سے بالکل آزاد کر دیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ اقدام کافی فائدہ مند رہے گا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس سلسلے میں پیچھے نہیں ہٹے گا چاہے اس معرکے میں ان دونوں میں سے کوئی ایک تباہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ایک صبح انہوں نے چپون کے بیڈ روم کو خالی پایا۔ چھت کھلی ہوئی ملی اور شیشے کا کور اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ چپون نے اوپر چڑھنے کے لئے اپنی بیڈ شیٹ استعمال کی تھی۔ چپون اپنے چاہنے والے فائے امنوئے کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ تک پہنچنے میں کیا کیا تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت نہ کی ہوں گی۔

شاید چپون نے اپنے ٹخنوں سے بندھی زنجیر اوپر اٹھا کر اس کا ایک سرا اپنی کمر کے گرد باندھ لیا ہو گا۔ وہ اپنے کپڑوں کی الماری پر چڑھ کر چھت پر آ گئی ہو گی۔ اور اس نے چھت میں موجود ڈھکن اپنے پاؤں کی مدد سے کھولا ہو گا اور یوں وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہو گی۔ وہ ایک صحت مند اور مضبوط جسم کی مالک لڑکی تھی اور اس کے لئے یوں فرار ہونا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا ہو گا۔

لیکن اس کا میرے گھر تک پہنچ جانا تو واقعی ایک معجزہ تھا۔ اس نے مگرمچھوں سے اٹا پڑا دریا کس طرح عبور کیا ہو گا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ لوگ بھی اتنا کہہ پاتے تھے کہ وہ بس کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گئی ہو گی۔ کھلا دروازہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ یہاں موجود تھی۔

میں برآمدے کی طرف لپکا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ وہاں اس کا کوئی سراغ موجود نہ تھا۔ میں نے اسے دریا کے کنارے تک ڈھونڈا۔ میں شام تک اسے دیوانہ وار تلاش کرتا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنے تھوڑے سے عرصے میں زیادہ دور تک جا سکی ہو اور اس نے میری آوازیں نہ سنی ہوں میں نے اسے اتنی زیادہ مرتبہ پکارا تھا کہ مجھے اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ میں کارکنوں کے کوارٹروں میں گیا اور میں نے حکم دیا کہ بیس آدمی ادھر ادھر پھیل جائیں اور دریا کے آس پاس اس کا سراغ لگائیں۔ میں نے رات گئے تک انہیں اسے تلاش کرنے کو کہا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم لوٹے۔

میں اپنے بنگلے میں واپس جانے کے بجائے تائی مانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر چپون مجھے اس باپ کے گھر میں بخیر و عافیت مل گئی تو میں شکریے کے طور پر تاؤ کے سون کے قدموں پر جھکنے کے لئے بھی تیار ہو جاؤں گا۔

جب میں تائی مانگ پہنچا تو مجھے میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ چپون گھر پر موجود نہ تھی۔ بہرحال میں اپنی

تسلی چاہتا تھا اس لئے میں چپون کے باپ سے ملنے چلا گیا۔ ہم دونوں کی آپس میں شدید نفرت کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اہم تھی کہ چپون ہم دونوں ہی کو بہت پیاری تھی۔ لیکن وہ تباہ حال شخص تو صحیح معنوں میں ایک وحشی جانور تھا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اگر چپون اسے اس شرمناک حالت میں واپس مل بھی گئی تو وہ اسے جان سے مار دے گا اور اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ کر مجھے بھیج دے گا۔

میں واپس گھر پہنچا اور میں نے وہاں سے تیس آدمی لئے اور انہیں میں نے دو گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے چپون کی تلاش میں دریا کے دونوں کناروں کو چھان مارا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوائے دریا کے پانی کے کہیں سے بھی نہیں گزری تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ دریا کے تنگ ترین راستے سے گزری ہو۔ میں نے دونوں گروپوں کی نگرانی کی اور دریا کی مخالف سمت میں سفر کرتا رہا۔

میں چوبیس گھنٹے تک چلتا رہا اور بھاگتا رہا۔ میں نے اس دوران برانڈی کے دو چار گھونٹ کے سوا شاید کچھ بھی نہیں لیا تھا۔ اس دوران شاید میں اونگھ بھی گیا تھا کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی تو میری کشتی بس دریا کے کنارے سے ٹکرانے ہی والی تھی۔ میں نے کسی ایک ملاح سے پوچھا تھا کہ ہوا کیا ہے اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا تھا اور کہا تھا۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ مگرمچھ ایک انسان کو کیسے نگل لیتے ہیں؟"

بہر حال مگرمچھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ سالم انسان کو نگل نہیں سکتا۔ اس کا منہ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ کسی جسم کے ٹکڑے نہیں کر سکتا پھر اس کی دم اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کے جسم کو چیر پھاڑ نہیں سکتا۔ وہ اس جسم کو کھانے کے لئے کنارے پر ضرور آتا ہے۔ وہ جسم کے ایک حصے کو اپنے منہ میں لے کر اسے کسی درخت کے ساتھ بار بار مارتا ہے۔ اور جو حصہ علیحدہ ہو کر گر پڑتا ہے وہ اسے کھا لیتا ہے' وہ ہر مرتبہ کوئی حصہ کوئی ٹکڑا کھا لیتا ہے حتیٰ کہ وہ جسم غائب ہو جاتا ہے۔

اس لمحے مریض بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا اس نے خلا میں گھور کر دیکھا۔ اس کی خاموشی نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے سوال کر دیا۔

"کیا ملاحوں نے چپون کو پا لیا تھا؟"

"نہیں"۔ مریض نے کہا "انہیں صرف ایک انسانی ٹانگ ملی تھی جس کے گرد ایک زنجیر لپٹی ہوئی تھی اور یہ گھٹنے کے اوپر سے کٹی ہوئی تھی۔ یہ ایک درخت کی نچلی شاخ پر ٹنگی ہوئی تھی.....

"جناب کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ چپون نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دریا میں موجود مگرمچھوں کے سپرد کر دیا تھا؟" یا یہ کہ وہ دریا کو عبور کرنے کے بعد تیر کر واپس اپنے باپ کے پاس پہنچ کر اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ایک غلط آدمی سے محبت کی تھی؟"

جیرو او سارا گی / سلطان سکندر خان

بغیر نام کا آدمی

شہر میں پہنچ کر سائیکو تاکانو کو ایک ہندوستانی سنار کی دکان دکھائی پڑی اور اس نے عبداللہ کو کار روکنے کو کہا۔ یہ سڑک تو مشہور تھی مگر تنگ اور گندی تھی اور دکان بھی بہت چھوٹی تھی۔ اس میں صرف ایک شیشے کا شوکیس تھا جس میں چند حقیر سی بالیاں پڑی تھیں۔ ہندوستانی سنار پان چبا رہا تھا اور اس نے پیک تھوک تھوک کر فرش کو سرخ بنا رکھا تھا۔ فرش پر قدم رکھنے سے سائیکو کو سخت کراہت محسوس ہوئی۔ ہندوستانی سوتی کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کے منہ پر بہت لمبی داڑھی تھی وہ اس کے استقبال کے لئے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے پاس ہیرے ہوں گے؟" سائیکو نے شستہ ملائی میں اس سے پوچھا۔ اس نے اپنے پگڑی والے سر کو ایک طرف سے دوسری طرف ہلایا۔ "نہیں" وہ مسکرایا اس کی آنکھوں کی سفیدی اس کے چہرے کے مخصوص سرمئی رنگ پر زیادہ ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سائیکو نے جان لیا کہ وہ کوئی چیز چھپا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "ڈر کی کوئی بات نہیں۔ تم نے ضرور کچھ ہیرے چھپا رکھے ہوں گے۔"

"صرف کچھ لعل ہیں"

"اچھا چلو وہی دکھا دو"

باہر دوپہر کی تیز دھوپ پڑ رہی تھی اس لئے دکان نسبتاً نیم روشن معلوم ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی سائیکو کو جو ابھی ابھی ڈرائیونگ کر کے آئی تھی۔ دکان میں حبس کا احساس ہوا۔ اس نے اوبی میں سے اپنا جاپانی پنکھا نکالا اور باہر سڑک پر دیکھنے لگی۔ اس کی نظر سے ایک بھی جاپانی نہ گذرا' صرف چند ملائی عورتیں اور کچھ چینی مرد گذرے۔ سڑک کے پرلی طرف کی دکانیں ویران دکھائی دیتی تھیں' ان کے کواڑ بند تھے اور وہ باہر سے نہایت گندی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے شائد کسی کے پاس بھی بیچنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کے چھتوں کے پار دو میناروں والی ایک سبز رنگ کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ درختوں کی ہریالی کے ساتھ مل کر پورا منظر اداس اداس سا تھا۔ سائیکو کو یہ احساس نہ ہوا کہ یہ عمارت وہی گرجا ہے جس میں سینٹ زیویر کی یادگار تھی۔

بغیر کچھ بولے اس نے چند لعلوں کو دیکھا اور ان میں سے ایک کو دکاندار کی منہ مانگی قیمت پر خرید لیا۔ اور یہ کہا "تمہارے پاس ضرور کچھ ہیرے بھی ہوں گے"۔ اس نے لعل محض اس غرض سے خریدا تھا کہ بعد میں دکاندار ہیرے بھی نکالے گا۔ اس کی توقع کے عین مطابق دکاندار کا رویہ بدلنے لگا۔

"جاپانی فوج سارے کے سارے ہیرے لے گئی ہے"

"ٹھیک ہے۔ لیکن تمہارے پاس بھی ایک دو ضرور پڑے ہوں گے۔ سنگاپور میں بھی چینی دکاندار گاہک کو دکھانے

کے لئے دکان کی پچھلی طرف سے ایک آدھ ہیرا نکال ہی لاتے ہیں۔"
"تم دکھاؤ تو سہی"
دکاندار کے داڑھی بھرے پر نخوت چہرے پر کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ جو ہیرا وہ لایا وہ صرف تین قیراط کا تھا۔
جب اس نے اسے اپنی مخروطی انگلیوں میں اٹھایا تو اس کی روشنی اس کی جلد پر پڑنے لگی۔
"مجھے ذرا اس سے کوئی بڑا دانہ دکھاؤ۔"
دکان کے گیٹ پر سائیکو کو ایک ہندوستانی بھکاری کھڑا نظر آیا۔ اس کا جسم سوکھا سڑا تھا اور اس کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ عبداللہ نے اسے دیکھ کر دھتکارا پھر سائیکو کے کہنے پر اسے چند پیسے دے کر بھگا دیا۔
مالکہ (Malacca) ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سب سے بڑی شاہراہ پر پانچ منٹ ڈرائیو کریں تو آپ مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ جہاں مکانات کم دکھائی دیں گے اور ناریل کے جھنڈ اور کھیت زیادہ۔ اور جہاں اونچے فرش والی ملائی طرز کی رہائش گاہیں دکھائی دینے لگیں وہاں مالکہ ختم ہو جاتا تھا۔
سائیکو نے عبداللہ کو چائنا ٹاؤن چلنے کو کہا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد جنوب کا سارا مال اور ساری دولت چینیوں کے قبضے میں آگئے تھے۔
دریائے مالکہ ایک نہر کی طرح مکانوں کی قطاروں کے درمیان سے بہتا تھا۔ اس کا پانی گدلا اور بدبودار تھا۔ دریا کے اوپر ایک پل تھا اور پل کی دوسری جانب ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چائنا ٹاؤن پھیلا ہوا تھا۔ دکانیں صرف پل کے نزدیک والی گلی میں ہی تھیں۔ ان سے پرے پرسکون رہائشی احاطے تھے جن میں سنگاپور سے آئے ہوئے ریٹائرڈ آدمیوں کے گھر تھے۔ ان رہائش گاہوں کے گیٹ اس وقت دن میں بھی سختی سے بند تھے اور سڑک پر شاذ ہی کوئی شخص دکھائی دیتا تھا۔ مکان سب ایک ہی طرز کے تھے۔ ان کے چھت کھپریل کے تھے اور سامنے والی دیواریں سفید تھیں جن میں گیٹ لگے ہوئے تھے گیٹ کے اندر دروازوں کے پٹ موٹی رنگ کی ہوئی لکڑی کے تھے اور ہر گیٹ کے اوپر ایک تختی تھی جس پر اس قسم کی دعا لکھی تھی:۔ آسمانوں کا دیوتا اس گھر پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور پانچ خوشیاں یہاں نازل ہوتی رہیں!۔ حروف لکڑی کے اندر کھدے ہوئے تھے اور پھر سیندوری یا سبز رنگ کے پینٹ سے انہیں بھرا گیا تھا۔ یہ گیٹ بند ہی رکھے جاتے تھے تاوقتیکہ باہر سے کوئی شخص انہیں کھولنے کی درخواست نہ کرے۔ گھر کے مکینوں کی آوازیں کبھی باہر سڑک پر سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ان گھروں میں زندگی بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اس تیز دھوپ میں یہاں مکمل خاموشی تھی۔ سائیکو کو یہاں سے گزرتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خالی گھروں کی قطاروں کے آگے سے گذر رہی ہے۔
سائیکو نے ہندوستانی سنار کی دکان سے تین ہیرے خریدے تھے۔ اسے یقین تھا کہ یہاں اسی قسم کے اور بھی سٹور ہوں گے اور وہ کار کی کھڑکی سے انہی کو دیکھ رہی تھی۔ مگر یہاں تو صرف مکانوں کی لامتناہی قطاریں تھیں جو کہ قلعوں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ کچھ مایوس ہو گئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مالکہ ریٹائر شدہ لکھ پتیوں سے بھرا پڑا ہے اور اسے یہاں بہت سے جوہریوں کی دکانوں کے ہونے کی توقع تھی۔
سائیکو کو پہاڑی پر کام کرتا ہوا مصور یاد آگیا اور اس نے ڈرائیور کو واپس مڑنے کا حکم دیا۔ پل کے پاس ان کے سامنے ایک گاڑی سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔ تقریباً" ساری لوکل گاڑیاں جاپانیوں نے بیگار میں پکڑلی تھیں اور اب انہیں جاپانی فوج کے مختلف محکمے استعمال کرتے تھے۔ یہ کار ایک نئے ماڈل کی کیڈی لک تھی جس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا اور ڈرائیور ٹائر تبدیل کر رہا تھا۔ کار کے مسافر باہر نکل کر درختوں کے سائے میں کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک وردی میں ملبوس بحریہ کا نوجوان افسر تھا اور دوسرا سول کپڑوں میں ایک درمیانی عمر کا آدمی جس نے ہلمٹ پہن رکھا تھا۔

"ذلا! ٹھہرو۔" سائیکو نے ڈرائیور کو رکنے کا حکم دیا۔

اچانک بریک لگانے سے بہت سی گرد اڑی۔ سول کپڑوں والے آدمی نے اپنے ہلمٹ پر ہاتھ رکھا اور گرد سے بچنے کے لئے اپنا منہ موڑ لیا۔ یہ شخص کیپٹن اوشیگی تھا جو کہ بحریہ کے اڈے پر ایک سٹاف آفیسر تھا اس سے پہلے سائیکو اسے محض ایک گاہک کے طور پر ملی تھی اور اسے کم گو اور کم آمیز پایا تھا۔ جیسے کہ وہ سٹاف آفیسر کی حیثیت سے اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹائر پھٹ گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ کیپٹن نے اسے اپنی مخصوص چترائی نظروں سے دیکھا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے اس سوال کی بدذوقی کو محسوس کیا "میں نے پہلے ملاکہ نہیں دیکھا تھا اس لئے میں نے محکمہ اطلاعات کے ایک دوست سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے یہاں گھما لائے۔" "سیرو سیاحت کے لئے؟۔"

"جی ہاں ...... اوہ 'ہیلو۔" سائیکو مسکرا کر نوجوان افسر سے بولی جو کہ کیپٹن کے نائب کی حیثیت سے اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔

"سیرو سیاحت کے لئے تو یہ وقت مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مگر تم نے کہا تھا کہ تم کسی کے ہمراہ ہو۔"

"ہاں ۔ اس وقت وہ تصویر کشی کر رہا ہے۔"

کپتان اپنی عادت کے مطابق لکڑی کی طرح اکڑ کر کھڑا تھا۔ "کیا تم آج ہی سنگا پور جا رہی ہو؟" اس نے سنگا پور کا جاپانی نام لیا جیسا کہ قانونی حکم تھا۔

"جی ہاں مجھے اپنے ریستوران کی فکر ہے۔ لیکن آپ کی کار کا کیا بنا؟ یہ جلدی ٹھیک نہ ہو تو آپ بلا جھجک میری کار لے جائیں۔"

"نہیں کوئی خاص جلدی بھی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے تم رات کو واپس نہ جاؤ۔ یا تو سویرے سویرے چلی جانا۔ یا پھر کسی جگہ ہمارا انتظار کرو۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ دن کے وقت تو خیر ٹھیک ہے لیکن رات کے وقت جوہور کے علاقے میں عجیب و غریب واقعات کے رونما ہونے کی اطلاعات ملی ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ کچھ پر اسرار واقعات ہوئے ہیں؟" سائیکو نے بڑی کامیابی سے اپنے چہرے پر معصومانہ خوف کے تاثرات پیدا کر لئے۔

"خیر جنوں بھوتوں کی تو بات نہیں ہے"۔ وہ پہلی بار ہنسا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ گوریلا سپاہی آجاتے ہیں۔ پھر رات کے وقت شیر بھی ہوتے ہیں۔ یہ ضلع شیروں کے لئے مشہور ہے۔"

"میں نے اتنی لڑائیاں دیکھی ہیں کہ اب میں شیروں سے تو نہیں ڈرتی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کا ہمراہی لیفٹیننٹ ایمانیشی (Imanishi) شیروں کا شکار کرنے کے لئے مشہور ہے۔"

نوجوان لفٹیننٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

کیپٹن اوشیگی بھی مسکرایا لیکن کچھ ایسے غائبانہ انداز سے جیسے کہ اس کے ذہن میں کوئی نیا خیال آگیا ہو۔ "تم خطرے کا اس طرح مذاق نہ اڑاؤ بہتر ہو گا اگر تم ہمارے ساتھ واپس چلو' کیونکہ اکیلی کار کے لئے بہت خطرہ ہے۔ یہ کیوں نہیں کرتیں کہ تم اسی وقت ہمارے ساتھ چلو۔ اس طرح جس شخص سے ہم ملنے جا رہے ہیں تم اسے صحیح جاپانی لباس بھی دکھا سکو گی۔"

"آپ لوگ جا کہاں رہے ہیں"
اس کا رویہ ایک دم فوجی ہو گیا جیسے کہ وہ کوئی سرکاری فیصلہ سنانے چلا ہو۔ "بتانے سے پہلے میں تمہیں یہ تنبیہہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی واقع ہو تمہیں اسے راز ہی رکھنا ہو گا۔ یہ اگرچہ میرا ذاتی معاملہ ہے پھر بھی ہم یہاں سے کہاں جائیں گے اور کس سے ملیں گے۔ اس کے متعلق کسی کو تم ایک لفظ بھی نہیں بتا سکتیں۔"
عام کپڑوں میں اور نائبوں اور ماتحتوں کی غیر موجودگی میں افشیگی بالکل بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سائیکو سے بات چیت میں اتنا غیر رسمی انداز اس نے کبھی بھی نہ اپنایا تھا۔
"وہ مصور کہاں ہے جس سے تم ملنے جا رہی تھیں؟ اسے اس طرح انتظار کرتے چھوڑنا کوئی اچھی بات تو نہیں مگر اب اسے کوئی گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑے گا۔"
"وہ اس بات کا بالکل برا نہیں منائے گا۔ جب وہ تصویر کشی شروع کرتا ہے تو سارا سارا دن اکیلا ہی لگا رہتا ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے میں اسے جا کر بتا آؤں۔"
"نہیں۔ بعد میں ہم ایجوٹنٹ کو بھیج دیں گے۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک جگہ بتا دو تو وہ اسے ڈھونڈھ ہی نکالے گا۔ مالکہ میں اتنے زیادہ جاپانی نہیں کہ اسے ڈھونڈنے میں غلطی کر سکے۔" اس کے ساتھ ہی کپتان خاموش ہو گیا۔ اس کے ہلمٹ کا سایہ اس کی پیشانی پر پڑ رہا تھا۔ اس خاموشی میں بڑا سکون تھا۔
"آپ جا کہاں رہے ہیں؟"
کپتان نے پھر اسے اپنی پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے جواب کا سائیکو کے سوال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ "اس نے شاید پچھلے دس سال سے جاپانی لباس میں ملبوس عورت کو نہیں دیکھا۔ مگر ہم نے چند ضروری باتیں کرنی ہیں اس لئے تم اس وقت کمرے میں داخل ہونا جب ہم باتیں ختم کر چکیں۔"
"کیا یہ شخص بھی بحریہ کا ملازم ہے؟"
"نہیں۔" ایسے روکھے اور مختصر جواب کے بعد سائیکو کو مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔
آخر کار ٹائر مرمت ہو گیا۔ وہ اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ گئے اور کپتان کی کار اسی راستے پر بڑھنے لگی جس پر سے سائیکو ابھی ابھی آئی تھی۔ کار کی کھڑکیوں سے گرم گرم ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ ایک گلی میں آگئے جس کے کنارے پر دھات کی ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر "ہیرن سٹریٹ" لکھا ہوا تھا۔ یہ وہی چینی مکانوں والا علاقہ تھا۔ سفید دیواروں میں بڑے بڑے رنگ شدہ دروازے بالکل بند تھے۔ کپتان کی کار کی رفتار کم ہو گئی جس سے سائیکو کو پتہ چل گیا کہ وہ اپنی منزل مقصود پر آپہنچے ہیں۔ ایجوٹنٹ ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ کار کے دروازے سے باہر کی طرف جھک کر گیٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک کاریں کھڑی ہو گئیں۔ پہلے ایجوٹنٹ باہر نکلا۔ دھوپ سے چمکتی سڑک پر اس کا تاریک سایہ پڑنے لگا۔ عبداللہ نے باہر نکل کر سائیکو کی کار کا دروازہ بھی کھولا مگر اس سے پیشتر کہ وہ باہر نکلے نوجوان ایجوٹنٹ بڑھ کر اس کے پاس آیا۔
"آپ مہربانی کر کے تھوڑی دیر اندر ہی رہیں" اس نے کہا۔ کپتان بھی اندر ہی رہا۔ سائیکو کو اس کی کار کے پچھلے شیشے سے کپتان کا سفید سوٹ نظر آ رہا تھا۔ لیفٹیننٹ نے پتھر کی دو سیڑھیاں چڑھ کر گیٹ کے قریب واقع گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اپنی انگلی گھنٹی کے بٹن پر رکھے گیٹ کے قریب کھڑا لیفٹیننٹ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔
ویران اور خاموش گلی میں دھوپ چمک رہی تھی۔ گلی ویران تھی۔

سائیکو نے لفٹنین کے سر کے اوپر گیٹ پر بڑھی ہوئی بیلوں کو دیکھا۔ ان کے سرخ رنگ کے پھول دیوار کے اوپر لٹکے ہوئے بھلے لگتے تھے۔ دور سے اسے موٹر سائیکل کے آنے کی آواز سنائی دی۔ جب یہ قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ بازو پر ملٹری پولیس کا بلا لگائے یہ ایک جاپانی سپاہی تھا۔ چینی مکانوں کے سامنے گاڑیوں کو کھڑا دیکھ کر وہ متعجب معلوم ہوتا تھا۔ آہستہ سے نزدیک سے گزرتے وقت اس نے انہیں اشتیاق سے دیکھا۔

مالکہ کے چینی مکانات کی ساری گلیاں بالکل ایک جیسی تھیں۔ اور جب آدمی مکان کے اندر داخل ہوتا تھا تو اسے پتہ چلتا کہ سب مکانوں کا ڈیزائن بھی تقریباً" ایک جیسا ہی ہے۔ یہ تنگ اور گہری عمارتیں تھیں۔ اگر کسی مکان کا گیٹ ہیرون سٹریٹ پر ہوتا تو مکان عقب میں ساحل سمندر تک پھیلا ہوتا تھا۔ کیونکہ مکانوں کے پلاٹ کم چوڑائی کے تھے اور سارے پلاٹ پر عمارت بنی ہوئی تھی۔ گیٹ سے اندر ہوتے ہی ایک چھوٹا سا باغیچہ ہوتا تھا جس سے گزر کر آدمی براہ راست بیٹھک میں داخل ہو جاتا تھا۔ بیٹھک میں سامنے والی دیوار کے ساتھ پتھر کے فرش پر آبنوس کا ایک میز ہوتا تھا جس کے آگے کرسیاں بچھی ہوتی تھیں۔ اس دیوار کے دائیں اور بائیں کنارے پر دروازے ہوتے تھے جن میں سے گزرنے پر آدمی اسی قسم کے ایک اور کمرے میں داخل ہو جاتا تھا۔ سامنے والی دیوار کے دائیں اور بائیں کنارے پر پھر دروازے تھے اور ان کے آگے ایک اور کمرہ۔ بعض کمروں میں دروازوں کے سامنے والی دیوار پر کچھ چینی اشعار یا دعائیں لکھی ہوتی تھیں اور بعض کمروں کو مندر کی طرح سجایا گیا تھا اور ان میں بدھ مت کی نذر گاہیں تھیں جن پر نذر نیاز رکھی جاتی تھی۔ ان کمروں میں سے کسی ایک میں ضرور دیواروں پر فریم شدہ پورٹریٹ تصویریں ہوتیں۔ یہ ایک قسم کی مکان کی تاریخ تھی۔ یہ تصویریں یکے بعد دیگرے اس مکان کے پہلے سربراہ خاندان سے لے کر اب تک کے سربراہ خانہ اور ان کی بیویوں کی تھیں۔ پرانے پورٹریٹ جو کہ کیمرے کی ایجاد سے پہلے کے تھے۔ مانچو عہد کے لباس میں ملبوس بوڑھے آدمیوں کی رنگین تصویریں تھیں جن کے لباس پر ڈریگن کڑھے ہوئے تھے اور جن کی ٹوپیوں پر مور کے پر لگے تھے۔ اور ان کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں جن کے پاؤں بچپن میں سختی سے باندھ دیئے گئے تھے مگر جن میں سے ہر ایک کا بالوں کا سٹائل ایک ہوتا تھا۔ پہلے کے فوٹوؤں میں لوگوں کے کپڑے سادہ سے چینی طرز کے تھے جن میں جنوبی علاقوں کے موسم کے مطابق ترمیم کر لی گئی تھی۔ لیکن ایک دو نسل بعد کے لوگوں نے مغربی سوٹ پہن رکھے تھے جن کے بٹن' سن یات سین کے فوٹو کی طرح انہوں نے اوپر تک بند کر رکھے تھے۔ اور ان کی بیویوں نے ملائی سٹائل میں سوتی چھینٹ کے سارونگ پہنے تھے اور اوپر تنگ جیکٹیں جن کے بٹن سامنے سے بند کئے ہوئے تھے۔ اس سے اگلی نسل کے لوگ عام مغربی لباس میں ملبوس تھے۔ لیکن سب سے آخری تصویروں میں عورتوں نے یا تو ملائی طرز کا لباس پہنا ہوتا یا کینٹن سے درآمد شدہ جدید چینی فیشن کے کپڑے۔ ان فوٹوگرافوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے چین چھوڑنے سے لے کر اب تک کی اس گھرانے کی ساری تاریخ آپ کو دیوار پر سے گھور رہی ہو۔

ان کمروں کی آرائش طشتریوں میں بنائے گئے چھوٹے چھوٹے مصنوعی باغات یا گملوں میں اگائے گئے چینی کنیر کے پودوں سے کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مغربی مجسمہ سازوں کی بنائی ماربل کی دوشیزائیں' گھوڑے اور کتے بھی تھے۔ دیواروں پر گھڑدوڑ اور شکار کے رنگین مناظر کے ساتھ ساتھ قدیم چینی خوشنویسی کے نمونے بھی لٹکے ہوتے۔ یہ مجسمے اور تصویریں اس خاندان کا بڑا بیٹا آکسفورڈ یا کیمرج سے ڈگری لے کر لوٹتے وقت آرائشی ٹیبل کلاک یا اسی قسم کی دوسری چیزوں کے ہمراہ لایا ہوتا۔ یہ خاندان کی تاریخ کا نیا ورق تھا! اور یہ بیٹا جس نے باپ کے مرنے کے بعد خاندان کا سربراہ بنتا تھا۔ عموماً" آکسفورڈ لہجے میں روانی سے انگریزی بول سکتا تھا۔

کمروں کے اس لمبے سلسلے کے بعد باورچی خانہ آتا تھا جو کہ ایک قسم کا اندرونی صحن تھا جس کا فرش کچا تھا اور اوپر چھت بھی نہیں تھی۔ اس میں ایک کنواں تھا اور ایک تنور۔ یہاں سے سیڑھیاں اوپر چڑھنے پر دوسری چھت ذرا آگے کو نکلی ہوئی ہونے کی وجہ سے باورچی خانے کا صحن دھوپ سے بچا ہوا تھا۔ اور قطار میں رکھے ہوئے پانی کے گھڑوں پر خنک سائے کھیل رہے تھے۔

ملازم کیپٹن اوشیگی کا کارڈ لے کر آیا اور سیڑھیوں سے صحن میں اتر کر نوجوان آقا کو دیا۔ آقا ذرا بھاری جسم کا تھا وہ خوبصورت سرمئی رنگ کے لاؤنج سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے چمکیلے بالوں میں بڑی احتیاط سے کنگھی کی گئی تھی۔

"یہ صاحب جاپانی ہیں؟" اس نے ذرا سختی سے ملازم سے پوچھا اور پھر دوسرا لفظ کہے بغیر اتر کر باورچی خانے میں آگیا اور اس کے کچے فرش سے گزر کر عقب میں چلا گیا۔

عقب میں ایک اور عمارت بنی تھی۔ پرانے زمانے میں یہ ایک قسم کا گودام تھا جب مال سے لدی کشتیاں مکان کے عقب میں ساحل سمندر کے سرے تک آجاتی تھیں۔ اس وقت وہاں جا بجا کم گہرے پانی والے ٹکڑے نہیں تھے۔ اور مالکہ ایک پر رونق تجارتی بندرگاہ تھی۔ لیکن تجارت اب سنگاپور منتقل ہو گئی تھی اور مالکہ کے چینی مکانات پر سکون رہائش گاہوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ گودام اب استعمال میں نہیں تھا اور اس کی چھت کا کچھ حصہ گر چکا تھا۔

نوجوان آقا جس کا نام مسٹر ژے (Yeh) تھا' دروازے تک گیا اور آواز دی۔ "ذرا سنئے تو۔" کھڑکیوں میں سے اسے سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ گودام خالی معلوم ہوتا تھا۔ سب سے آخری کمرے سے جوابا" آواز آئی۔ مسٹر ژے دروازے سے گزر کر اس کمرے تک پہونچا۔۔۔۔ سمندر سے نزدیک والے برآمدے کے سرے پر کوئی شخص کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی بید کی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔ جاپانی بحریہ کا افسر ہے۔" مسٹر ژے نے انگریزی میں کہا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کارڈ کو دوبارہ غور سے دیکھا مگر وہ ٹھیک طرح سے نام نہ پڑھ سکا۔ وہ اگرچہ چینی تھا مگر اسے زیادہ چینی حروف پڑھنے نہیں آتے تھے۔ اور پھر یہ نام بھی کسی جاپانی کا تھا۔

دوسرا شخص کچھ بولے بغیر بڑھ کر اس تک آگیا۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی چینی عبا پہنے ہوئے تھا۔ وہ جنوبی ایشیا کے چینیوں کی نسبت زیادہ صحت مند تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور اس کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ وہ شریفانہ اطوار کا دولت مند شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کارڈ ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ اگرچہ پچاس برس کا تھا مگر نسبتا" جوان لگتا تھا اور اس کی جلد بچوں کی طرح گلابی رنگ کی تھی۔

"گھبراؤ مت۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "یہ میرا پرانا دوست ہے۔ حال ہی میں میں نے اسے خط لکھا تھا۔ شاید خط پا کر وہ مجھے ملنے آگیا ہے۔ کیا وہ اکیلا ہی آیا ہے؟"

مسٹر ژے کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کے تاثر سے پتہ چلتا تھا کہ اسے اس بات کی کوئی خبر نہیں۔

"کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا۔ لیکن میں صرف اسی سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر ژے! براہ کرم یہ بات اسے کہہ دو۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے لوگ ہیں تو وہ باہر ہی انتظار کریں۔ اسے یہیں بلا لاؤ' لیکن صرف اسی کو۔"

"جی' بہت بہتر۔"

ڑے چلا گیا۔ دوسرے شخص نے دوبارہ جاپانی کارڈ پر نگاہ ڈالی۔ کسی تند جذبے کے زیر اثر اس کے چہرے پر کرختگی آگئی۔ اپنے جوش پر قابو پانے کے لئے وہ اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور باہر سمندر کو دیکھنے لگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی سمندر دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پانی کے چڑھتے وقت جھاگ پتھریلی سیڑھیوں کے نیچے تک آگئی تھی مگر اب پانی اتر چکا تھا۔ اور ہر طرف گندہ کیچڑ پھیلا تھا۔ باورچی خانے کے صحن کے لمبے درختوں نے گودام کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ اور ان کے سبز استوائی پتے کھڑکی تک پہنچ رہے تھے۔ پتوں کے درمیان میں سے سمندر کو دیکھنے سے سمندر کا پانی گہرا سبز دکھائی دیتا تھا۔ کمرہ ٹھنڈا تھا مگر اس میں روشنی کم تھی اور اس میں صرف ایک بستر، ایک ٹرنک اور چند مغربی کتابیں تھیں۔

موریا کو کیپٹن اوشیگی کے قدموں کی متوازن چاپ باورچی خانے کے صحن سے پہنچتی سنائی دی۔ اس نے اس کو عمارت میں داخل ہوتے اور لکڑی کے کاریڈور پر چلتے سنا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر قدم رک گئے۔ اس نے سمندر کی طرف سے رخ موڑا تو اس نے کیپٹن اوشیگی کو اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا۔

"موریا! یہ تم ہی ہو۔ ابھی تک زندہ ہو؟"

موریا مسکرایا اور چند لمحے جواب دیئے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ "تم" وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کی آواز میں بے پناہ اداسی تھی۔ "بہت عرصہ گزر چکا ہے کہ کسی نے مجھے میرے نام سے بلایا ہو۔ کئی برس گزر چکے ہیں لیکن تم میرا نام نہیں بھولے۔ تم آخر آہی گئے۔"

"تمہارا خط پا کر مجھے بہت حیرانی ہوئی تھی لیکن مجھے پہچاننے میں دیر لگی۔ تمہارا نام انگریزی حروف میں تھا۔ کیو گو موریا۔ یہ کون ہو سکتا ہے میں نے سوچا۔"

"اوشیگی! تمہاری صحت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کیا تم ابھی سے کپتان بن گئے ہو!"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" اوشیگی مسکرایا۔ "لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے۔"

"جس شخص کی کوئی خاص شہرت نہ ہو وہ کہیں بھی پہنچ جائے حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اس دفعہ تو مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔ میں ساٹرا سے بحری جہاز میں سوار ہوا تھا اور جب سنگاپور پہنچا تو جنگ چھڑ چکی تھی۔ "پرنس آف ویلز" بندرگاہ سے نکل رہا تھا اور آتے وقت میرا جہاز اس جہاز کے پاس سے گزرا تھا مگر مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ میں شہر میں گیا اور پکڑا گیا۔ شہروں پر جاپانی بمبار طیارے اڑ رہے تھے۔ وہ بحریہ کے طیارے تھے۔ کتنی عجیب سی بات لگتی ہے۔"

"ہاں موریا! اگر حالات نہ بدلتے تو تم ان طیاروں میں سے کسی ایک میں ہوتے"

"میرے دل میں یہ خیال تو بالکل نہیں آیا۔ میں بس اپنی زندگی کے متعلق فکر مند تھا۔ میں شاہی بحریہ کی بمباری سے مر بھی تو سکتا تھا۔ قسمت بھی عجیب کھیل دکھاتی ہے۔ میرے دل میں بس ایک یہی خیال تھا۔"

"تم سنگاپور کس لئے آئے تھے؟"

"تاکہ یورپ واپس جانے کے لئے جہاز میں سوار ہو سکوں۔" اس کے طفلانہ چہرے پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔ "پھر چھاتہ برداروں نے سنگاپور پر حملہ کر دیا۔ گلی گلی میں جاپانی سپاہی تھے۔ اگرچہ میں نے زندگی بھر کبھی بھی کسی جاپانی سے راہ و رسم نہ رکھنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا پھر بھی ان سپاہیوں پر میری نظر پڑے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اگر وہ پیشہ ور سپاہی ہوتے تو میں ایک دفعہ ان کو دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا مگر یہ تو معصوم اور بے بس بچے دکھائی دیتے تھے۔ ان کو اس طرح دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ میں جاپان واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اب جاپانی یہاں

تک آ گئے تھے۔"

"تم نے ان میں سے کسی کے ساتھ بات کی؟"

"ہاں۔ لیکن کیوگو موریا کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایسے غیر ملکی کی حیثیت سے جو جاپانی بھی بول سکتا ہو۔ یہ سپاہی یورپ میں ملنے والے جاپانیوں سے مختلف تھے یہ کسی کی ذاتی زندگی کے متعلق سوال نہیں پوچھتے تھے۔ میں نے کئی دردناک قصے سنے ۔ ۔ ۔ جاپان نے کتنی خوفناک جنگ شروع کر رکھی ہے۔ کیوں اوشیگی! تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس موضوع کے چھڑ جانے سے کپتان کا چہرہ سخت ہو گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ فوجی آدمی کی زندگی تو حکم ماننے تک محدود ہے اور یہ بات موریا کو بخوبی معلوم ہونی چاہیے تھی۔

"اگر میں ابھی تک یورپ میں ہوتا تو میں جاپان کی قسمت کے متعلق زیادہ فکر مند نہ ہوتا۔ لیکن اتفاق سے میں سنگاپور میں ہوں جہاں ہر جگہ جاپانی سپاہی نظر آتے ہیں۔ میں بعض اوقات ان سے باتیں بھی کر لیتا ہوں۔ اس وجہ سے صورت حال مختلف ہے۔ تم لوگ یہ جنگ ضرور ہار دو گے۔ کیا ابھی تک تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا۔"

کپتان اوشیگی تلخ سی ہنسی ہنسا۔ "اس موضوع پر میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔ میرا خیال ہے ہم کسی اور موضوع پر بات کریں۔"

"بے شک' بے شک۔ معاف کرنا میرے منہ سے نہایت بے تمیزی کی باتیں نکل گئی ہیں۔ میں اب بالکل جاپانی نہیں رہا۔"

"موریا! کبھی تم نے دوبارہ بحریہ میں آنے کا نہیں سوچا؟ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی جگہ نکل ہی سکتی ہو گی۔ میرا خیال ہے بات بن سکتی ہے اور اسی بات کے لئے میں آج تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم محض ہمدردی کے لئے یہ باتیں کر رہے ہو۔ کیا واقعی جاپانی بحریہ کی حالت اتنی پتلی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو واپس لے لے گی جس نے سرکاری غبن کیا ہو اور جو ملک سے باہر بھاگ گیا ہو؟"

"میں تمہیں بھی ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" غصے سے کپتان کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ "مجھے اب معلوم ہے کہ کیا وقوع پذیر ہوا تھا۔ تم اتنے برے نہیں ہو جتنے کہ تم اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے خواہ مخواہ الزام اپنے سر لے لیا تھا حالانکہ قصور تمہارا نہیں تھا۔ ہے نا یہی بات؟"

"کیا تمہیں مجھ پر ترس آ رہا ہے؟" موریا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھ پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاپان سے باہر دس سال گزارنے کے بعد اس قسم کی جذباتیت ختم ہو جاتی ہے۔ میں تو ایک قسم کا آوارہ گرد یہودی بن گیا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے اوشیگی کہ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں تم سے کس انداز میں باتیں کروں۔ تم کسی اور نقطہ نظر سے بات کرتے ہو اور میں کسی اور نقطۂ نظر سے۔ اسی وجہ سے مشکل پیدا ہو رہی ہے تم ان سالوں میں ذرہ برابر نہیں بدلے۔ تم ذہنی طور پر محض ایک خط مستقیم میں بڑھتے گئے ہو' اس لئے جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ تمہارے فوجی نقطۂ نگاہ سے بالکل درست ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ تم جلد یا بدیر اس جنگ میں مارے جاؤ گے اور تم اتنے احمق نہیں کہ یہ سمجھ لو کہ تم یہ قربانی جنگ میں جاپان کی فتح کے لئے دے رہے ہو۔ تمہیں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بخوبی علم ہے۔ جاپان کو مکمل شکست ہو کر رہے گی......"

"بس ختم کرو۔" کپتان نے سختی سے کہا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ایسی باتیں سننے یہاں نہیں

آیا۔ میں تو تمہیں جاپانی کپڑوں میں ملبوس ایک خاتون سے ملانے آیا ہوں۔"
موریا نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ "تمہارا مطلب ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ کہیں چلنا ہو گا؟"
"نہیں نہیں۔ میں تمہیں کسی خوبصورت جاپانی خاتون سے ملانا چاہتا تھا اس لئے میں نے راستے میں سے ایک کو ساتھ لے لیا۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خاتون بھی ہیں۔ ان سے بعد میں ملیں گے۔ پہلے میں تم سے چند باتیں اور کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں خط لکھنے کا خطرہ مول لینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ میں نے سنا ہے کہ تم یہاں پر سٹاف آفیسر ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ایک کام کر دو۔ جن لوگوں کے پاس میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں ان کا ایک مکان سنگاپور میں بھی ہے۔ بحریہ کو اس مکان کی کسی وجہ سے ضرورت ہے اور انہوں نے اسے خالی کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ میرے میزبان کی بوڑھی ماں وہاں رہتی ہے جو بیمار ہے۔ اور اسے کسی دوسرے مکان میں لے جانا ناممکن ہے۔ اگر تو بحریہ اس مکان میں کوئی کلب یا ریستوران کھولنا چاہتی ہے تو اس کے لئے یہ لوگ کوئی دوسرا مکان پیش کر دیں گے تاکہ بوڑھی عورت کو دوسری جگہ جانے کی زحمت نہ ہو۔ اور اگر ہر قیمت پر وہی مکان خالی کروانا ہے تو مریضہ کو لے جانے کے لئے تم کوئی گاڑی بھیج دینا۔ تمہیں معلوم ہے کہ چینیوں کو اپنی گاڑیاں استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"
"بس اتنی سی بات! یہ کام تو آسانی سے ہو سکتا ہے۔"
"نہیں۔ یہ آسانی سے ہونے والا کام نہیں ہے۔ تمہارے کچھ سپلائی افسر بڑے ظالم قسم کے ہیں۔ وہ تو چینیوں کی بات بھی سننا گوارہ نہیں کرتے۔"
"یہ کام میں کر دوں گا۔ ذرا مجھے مکان کا محل وقوع سمجھا دو۔"
"میں نے پورا پتہ اس کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ میں اس مہربانی کے لئے تمہارا از حد ممنون ہوں گا۔ میں نے ان لوگوں کو کافی زحمت دی ہے۔ کسی غیر قوم کے شخص کو گھر میں رکھنا آسان کام نہیں۔ اگر تم یہ کام کر دو تو مجھے از حد خوشی ہو گی۔"
"تم بالکل بے فکر رہو۔ ویسے بھی شاہی بحریہ ایسی کمینی حرکتیں نہیں کرتی جن سے بوڑھوں اور مریضوں کو تکلیف پہنچے۔"
"میں تمہارا بہت مشکور ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تم وقت نکال کر میرے پاس ملاقات کے لئے آگئے۔ میں یہ احسان تا زندگی نہیں بھولوں گا۔"
کمرے میں چھائی اداسی اور گھٹن کی وجہ سے اوشیگی آزردہ سا ہو گیا۔ "کیا تم صرف یہی ایک بات کرنا چاہتے تھے؟ دوران جنگ کا سارا عرصہ تم نے اس جگہ پر گذارا ہے؟"
"نہیں۔ یہاں تو میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی آیا ہوں۔ اس سے پیشتر میں سنگاپور میں اسی مکان میں ٹھہرا ہوا تھا جس کے متعلق ہم بات کر رہے تھے۔"
"فوجی پولیس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟"
"میرے پاس چینی پاسپورٹ ہے۔ اگر جاپانی فوجیوں کو پتہ چل جاتا کہ میں ابھی ابھی یورپ سے لوٹا ہوں تو ضرور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ لیکن میرے چینی میزبانوں نے اور دوسرے لوگوں نے جنہیں اس بات کا علم ہے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس وجہ سے میں محفوظ رہا ہوں۔ لیکن تم اس جاپانی عورت کی بات کرو۔ کیا

اس سے ملنا غیر مناسب نہ ہو گا؟"

"وہ کسی کو کچھ بھی نہیں بتائے گی۔ ذرا اس سے بات چیت میں احتیاط برتنا۔ پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔ کسی کو یہ معلوم نہ ہو گا کہ کیو گو موریا کون ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات درست ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری وفات کی افواہ بھی مشہور ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے اگر میں جاپان جاؤں تو مجھے وہاں اپنی قبر دکھائی دے جائے گی۔" موریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہمان خانے میں کچھ ٹھنڈک ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا فرش پتھروں کا تھا اور وہاں دھوپ نہیں پڑتی تھی۔ مہمانوں کو کافی' کیک اور پپیتا کی قاشیں پیش کی گئی تھیں جن کے ساتھ چاندی کی چمچیں تھیں۔ کپتان اوشیگی کا مزاج خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس تعارف کراتے وقت موریا کا نام نہیں لیا تھا۔ بلکہ اس نے موریا سے کہا: "سائیگو ساگانو سے ملو۔ یہ سنگاپور میں شراب خانہ چلاتی ہیں" "شراب خانہ کہیں تو کتنا برا لگتا ہے" سائیکو نے احتجاجی لہجے میں کپتان سے کہا۔ پھر وہ موریا سے کہنے لگی۔ "میری عزت افزائی ہو گی اگر آپ میرے ہاں تشریف لائیں۔"

اس نے اندازہ کر ہی لیا تھا کہ چینی کپڑوں میں یہ شخص حقیقت میں جاپانی ہے۔ یہ کسی خاص مشن پر آیا ہو گا' اس نے سوچا یہی وجہ ہے کہ یہ چینی خاندان کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اور اس کا نام بھی خفیہ رکھا جا رہا ہے۔

"مجھے آپ کے ہاں آکر انتہائی خوشی ہو گی .... کمونو پہنے کسی کو دیکھے مجھے مدت ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ ایک چھوٹے سے جرمن قصبے میں میں نے مشہور فنکار اوتامارو کے لکڑی کے بلاکوں کے پرنٹ دیکھے تھے' مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی .... جاپانی کپڑے کسی جاپانی کے جسم پر کتنے خوبصورت لگتے ہیں!"

"کیا آپ یورپ سے واپس آرہے ہیں؟"

اس کی نظریں اوشیگی کی نظروں سے ملیں۔ "نہیں میں تو یورپ میں ہی رہتا ہوں' خوبصورت جگہ ہے۔ مثلاً" پیرس کی عورتوں کو لباس پہننے کا واقعی علم اور ذوق ہے۔ لیکن زیادہ عرصہ وہاں رہو تو ان کی خود نمائی اعصاب پر سوار ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے جاپانیوں کا بھی یہی تجربہ ہو گا' جب آدمی میری عمر کو پہنچتا ہے تو انتہائی خوبصورت غیر ملکی عورت بھی دل کو اچھی نہیں لگتی۔"

"لیکن جاپان میں بھی حالات بدل رہے ہیں جب اس طرح کی خاتون کو اتنا حوصلہ ہو جائے کہ وہ اتنے لمبے فاصلے پر پرواز کر کے پہنچ جائے تو اس کا مطلب ہے نیا زمانہ آگیا ہے۔" کپتان اوشیگی نے کہا۔

"اب تو جاپان اور بھی بدل جائے گا۔" سائیکو بولی

"تمہارا مطلب جنگ سے ہے۔ جنگ خواہ جیتی جائے یا ہاری جائے یقیناً" لوگوں کے طرز بود و باش پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مجھے گمان ہے کہ اس کے بعد جاپانی عورتیں ہمیشہ کے لئے کمونو پہننا چھوڑ دیں گی۔"

سائیکو ہنسنے لگی "مجھے اس سے اختلاف ہے" اس نے کہا۔ "اچھی چیزیں کسی نہ کسی شکل میں باقی رہ جاتی ہیں۔"

"میرا یہ خیال نہیں۔ چینیوں کے متعلق تو یہ بات ایک حد تک درست ہو سکتی ہے مگر جاپانیوں کے متعلق نہیں۔ جاپانی بہت جلد غیر ملکی اثر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ زیادہ جدت پسند لوگ ہیں۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے ہر کسی کو جاپانی کلچر کے اچھے پہلوؤں کا احساس ہونے لگا ہے۔"

"لیکن یہ خیال غلط ہے کہ بعد میں اس کا بھی رد عمل ظاہر نہیں ہو گا۔ جنگ کے اثرات خواہ کسی سمت میں

بھی ہوں بہت ہی طاقتور ہوتے ہیں۔ اوشیگی' میں حیران ہوں کہ آخر وہ لوگ جو جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں انہیں اس بات کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔"

کیپٹن اوشیگی خاموش رہا۔ موریا نے اس کی خاموشی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب مکمل تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں بچے گا۔"

کیپٹن اوشیگی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "دو بج چکے ہیں' میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ چلے ہی جاؤ گے۔"

"نہیں ہمیں اب جانا ہی چاہیے۔ ہم نے سورج غروب ہونے سے پہلے جانے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔" اس نے اپنے نائب اور سائیکو کو آنکھ سے اشارہ کیا وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔

"جو کام تم نے مجھے کہا ہے اس کے متعلق فکر نہ کرو۔ میں سب انتظام کر دوں گا۔ کبھی کبھار اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔" اوشیگی نے کہا۔

"بے فکر رہو میں تمہیں آئندہ زحمت نہیں دوں گا۔"

جب کپتان جانے کے لئے مڑا تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "موریا! عنقریب ایک جہاز میری کمان میں دیا جائے گا۔" موریا کا سارا جسم اکڑ سا گیا۔ "اس کا مطلب ہے تم سنگاپور سے جانے والے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں' شاید ہم دوبارہ نہ مل سکیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔"

"میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ جنگ میں تمہاری قسمت مبارک ہو۔"

اوشیگی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ "اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ میں اب دوبارہ جاپان دیکھ سکوں گا۔ لیکن شاید تم جلد یا بدیر وہاں جا سکو گے۔"

"میں: ناممکن۔ یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟"

"بس ایسے ہی۔" اوشیگی مسکرایا۔ "ایسا ہونے کا امکان بہت ہے۔ یہ صرف میرا خیال ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے بیٹے کی وفات کے بعد میں اپنا فرض زیادہ دلجمعی کے ساتھ ادا کروں گا۔"

"تمہارا بیٹا؟ کب؟ کیسے؟"

"راستے میں جاپان سے آنے کے دوران۔ وہ تیئس سال کا تھا۔ معاف کرنا' مجھے اب چلنا چاہیے۔" وہ فوجی انداز میں چل پڑا۔ موریا نے جلدی سے اسے جا لیا۔ "اوشیگی۔"

کپتان نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "نوجوانی میں میں نے جو احمقانہ حرکات کی ہیں میں ان پر شرمسار ہوں لیکن تم .... تمہیں اس احمقانہ جنگ میں نہیں مرنا چاہیے۔ کسی نہ کسی طرح زندہ رہو اور واپس جاپان جاؤ۔ اس جنگ کو جلد از جلد ختم کرانے کے لئے زندہ رہو۔ تمہاری پوزیشن کا شخص ....."

"اب وقت گزر چکا ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اس نے پیٹھ موڑی اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ چند لمحوں کے لئے ان کی نظریں پھر ملیں یہاں تک کہ گاڑی نے ہولے ہولے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

"لیفٹیننٹ!" کپتان نے لفٹین ایمانیشی سے کہا۔ "چلو پہلے ملٹری پولیس کے ہاں سے ہو آئیں۔ ہو سکتا ہے ضرورت نہ ہو لیکن میں اس بات کا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ بعد میں گڑبڑ نہیں ہو گی۔ ایک سارجنٹ ہمیں دیکھتے ہوئے گزرا تھا۔ یہ سب نہایت احمق ہوتے ہیں۔ اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

(ناول کا باب)

کنائی مینکور / ڈاکٹر سلیم اختر

افلاطونی محبت

اگر مجھے اس عورت پر یہ حقیقت ثابت کرنی ہو کہ اپنی کہانیوں کی میں ہی "حقیقی مصنفہ" ہوں تو اس مقصد کے لیے شاید مجھے مقالہ لکھنا پڑے یا کتاب تحریر کرنی پڑے گی' میرا اس سے اولیں تعارف۔۔۔ مگر ٹھہریے! اس ضمن میں لفظ تعارف مناسب نہ ہو گا۔ بہرحال ماجرا کچھ یوں ہے کہ میرے اور اس کے پراسرار رابطہ کا آغاز میری پہلی کہانی کی اشاعت کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ کہانی کی اشاعت کے فوراً بعد مجھے ایک خط ملا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا۔

"۔۔۔۔ تمہارے نام سے چھپنے والی کہانی دراصل میری تحریر کردہ ہے۔"

اس زمانے کے بعد سے میری ہر کہانی کے چھپنے کے بعد مجھے اسی مضمون کا خط ملتا یوں میرے پاس اپنی کہانیوں اور اس کے خطوط کی مساوی تعداد جمع ہو گئی۔ اگرچہ میں ان خطوط سے ہر ممکن طریقہ سے اغماض برتنے کی کوشش کرتی مگر میں اس معاملہ میں ناکامی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ یوں میرا کہانیاں لکھنا۔۔۔ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔۔۔ جیسی بات بن گئی۔ ان خطوط پر نہ تو اس کا نام ہوتا اور نہ ہی جواب طلبی کے لیے پتہ درج کیا جاتا۔ یعنی میرے پاس "اپنی" کہانیوں کی "حقیقی مصنفہ" سے رابطہ کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا گویا میرے اور "حقیقی مصنفہ" کے درمیان صحیح معنوں میں یک طرفہ تعلق قائم تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ یک طرفہ تعلق بھی صرف میرے لیے تھا' اس کے لیے نہ تھا' کیونکہ مجھے تو یہ تک بھی معلوم نہ تھا کہ خطوط لکھنے والی واقعی عورت ہی ہے۔

اب تو اس کے ابتدائی خطوط کے لفافے بھی مرجھا کر زرد ہو چکے ہیں۔ مختلف انداز اور کاغذ کی دبازت کے حامل سفید مربع لفافے' مختلف اوقات میں سبز' جامنی اور سرخی مائل رنگت کی روشنائی استعمال کی گئی تھی اور یہ تینوں رنگ ہی میرے لیے کوئی خاص جاذب نظر ثابت نہیں ہوتے اسی لیے مجھے ان سے نفرت ہے۔ اس کے انداز تحریر میں بھی کوئی خاصی انفرادیت نہ تھی۔ واضح رہے کہ جنگ کے دور سے خطاطی کا وہ اسلوب تقریباً متروک قرار پا چکا ہے جس میں قلم سے خوشخطی کے جوہر اجاگر کیے جاتے تھے۔ اس کی تحریر میں الفاظ کی ساخت جمالیاتی نہ تھی' یوں محسوس ہوتا گویا اس نے کسی کتاب کو سامنے رکھ کر مطبوعہ الفاظ سے تحریر کی مشق ہو۔۔۔ ایسی تحریر جو صحیح معنوں میں بھونڈی بھی نہ قرار دی جا سکتی ہو ویسے آپس کی بات ہے خوشخطی کے معاملہ میں میں بھی خاصی پھسڈی ہوں میری غیر تربیت یافتہ تحریر زبان حال سے یہ اعلان کرتی ہے اگر یہ قابل فہم ہے تو پھر تمہیں بے جا شکایت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔

"غالباً" یہ خطوط کوئی ایسی ہستی لکھ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی جو میرے انداز اسلوب میں کہانیاں لکھنے میں ناکام رہی اور اب وہ میری کہانیوں پر ہاتھ صاف کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی

ہوتا ہے جیسے میرا کوئی ہم عمر شاعر میری پہلی شاعرانہ کاوش دیکھ کر یہ دعویٰ کر کے مجھے متعجب کر سکتا ہے کہ ایسی ایسی نظمیں تو میں صرف ایک رات میں گھڑ سکتا ہوں۔ بالفاظ دیگر ایک دو ایسی تحریریں جن پر کہانی کا الزام دھرا جا سکتا ہو۔۔۔ کے مطالعہ کے بعد اس نوع کے خطوط تحریر کئے جا سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ اس انداز کے خطوط کی وصولیابی ناممکنات میں سے نہیں۔

تکرار و توراد سے قطع نظر ہر لحاظ سے یکساں مواد کی حامل کہانی کا قلم بند کیا جانا ناممکنات میں سے تو نہیں۔۔۔ ہے نا! کیا تمام ادب پارے بنیادی لحاظ سے ایک ہی ٹکسال کے سکے نہیں ہوتے؟ چنانچہ نادیدہ مصنفہ کا اولین خط۔۔۔ احتیاط سے تہہ کئے گئے غیر ملکی ریپر کاغذ کو کھولتے وقت عجب سی صوتی سرسراہٹ یادوں میں گونج گئی۔۔ پڑھتے وقت مجھے اعتراف ہے کہ میں بدمزگی کے اس احساس کو نہ دبا پائی جو میری مصنفانہ انا سے مملو تھا۔ تاہم یہ احساس بھی برقرار رہا کہ مجھے اس بات سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا کہ "حقیقی مصنفہ" کون ہے وہ یا میں؟

"یہ میری تحریر ہے" کے احساس کے ساتھ وابستہ فخریہ احساسات جلد ہی معدوم ہو سکتے ہیں بشرطیکہ یہ میری ہی تحریر ہو' تو پھر کیوں نہ میں اس کہانی کی "مصنفہ" ہونے کا حق اس نادیدہ ہستی کو تفویض کر کے خود کسی اور کہانی کی "مصنفہ" بن جاؤں۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے! میں اب قطعی طور سے جداگانہ نوعیت کی کہانی کی مصنفہ کہلواؤں گی!

میری ہر کہانی کی اشاعت کے بعد اس کا مراسلہ مل جانا گویا طے شدہ امر بن گیا اور اب تو میں اکتاہٹ سی بھی محسوس کر رہی تھی۔ ظلم یہ بھی ہے کہ میری ان تھک اور لازمی قاری بھی وہی ثابت ہوئی تھی۔ حالانکہ قاری کے برعکس وہ تو کہانیوں کی خالق ہونے کی دعویدار تھی اور کیا پتہ کل کو اتفاقاً" وہی بچی ثابت ہو جائے۔ بہرحال یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ایک کہانی تو واقعی اس کے خط کے نتیجہ میں (میں نے یا اس نے؟) قلم بند کرلی تھی۔ میں کیونکہ اس نادیدہ وجود کی کوئی توجیح نہ کر سکتی تھی اس لیے خاصی دیر تک میں نے اسے سب سے چھپائے رکھا' نہ جانے ایسی کیا انجانی وجہ تھی جو میں اسے راز رکھنے پر مجبور تھی تاہم جب کبھی بھی میں کوئی کہانی لکھتی تو وہ لازماً" اس کی "حقیقی مصنفہ" ہونے پر اصرار کرتی۔

میں اس سے استفسار کر سکتی تھی "بھلا تمہاری تحریر میں نے کیسے پڑھی ہو گی؟" تو جواب میں وہ مسکراتی۔۔۔ لاشعوری طور پر میں نے اس کی مسکراہٹ کو خوبصورت تصور کر رکھا تھا۔۔

وہ مسکرا کر جواب دیتی "واہ! تو تمہیں یہ بھی یاد نہیں؟"

ظاہر ہے کہ میں اس سے یہ سب دریافت نہ کر سکتی تھی' لہٰذا وہ جو لکھتی میں پڑھنے پر مجبور تھی۔ گویا یہ بھی ایک اعزاز تھا جس کے لیے بطور خاص مجھ ہی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ہمارا تعلق صرف کہانیوں تک ہی محدود رہا۔ اس کی وجہ سے اگرچہ میں خلجان میں بھی مبتلا رہتی تھی مگر بتدریج اس کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش بھی تقویت پکڑتی گئی۔ وہ کیسی ہے' کس قماش کی ہے' اسلوب حیات کیا ہے' پسند و ناپسند کیسی ہے' کون سی چیزیں مرغوب خاطر ہیں' تجربات زیست کیسے ہیں اور خیالات و تصورات کس نوع کے ہیں؟

اسے جسمانی پیکر دینے کی کوشش میں الجھن کی شکار ہو گئی' ابھی تک تو صحیح طور سے یہ بھی علم نہ ہو سکا تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے بطور خاص اپنا جسم' بعینہ نہیں اس لیے اس "حقیقی مصنفہ" کے جسم کو خوبصورت تصور کرنا' خاصہ مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے کسی کو گرفتار الفت شاعر کی مانند گیت

گایا--- تم صاحب پیکر ہو' اوہ! یہ تحیر خیز پیکر! جو میرے (ہمارے) خوابوں میں رونما ہوتا ہے---
میں نے تو یہ بھی سوچا کہ اگر یہ چند کج مج سی تحریریں میری نہیں بلکہ واقعی اسی کے قلم سے نکلی ہیں (اور کیا کج مج سے اس کی تحقیر نہیں ہوتی؟) تو کم از کم مجھے یہ تسکین تو حاصل ہو جائے گی کہ ان تحریروں سے میرا کوئی تعلق نہیں--- خس کم جہاں پاک! تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہی تو تھا جس نے کہانی کی تشکیل کرنے والے الفاظ صفحہ پر تحریر کئے یا جب ان ہاتھوں سے میں کچھ بھی نہ لکھوا سکتی تھی! اس ضمن میں' میں نے دیگر اہل قلم احباب سے بھی پوچھنے کا سوچا کہ کیا ان کی تحریروں کی اشاعت کے بعد انہیں بھی ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں ان کی تخلیقات کے "حقیقی مصنف" ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہو۔ یوں مجھے یہ تو علم ہو جاتا کہ اس قسم کے بھید بھرے مگر کسی حد تک شائستہ مذاق کی میں ہی واحد شکار نہ بن رہی تھی ویسے اس کا کوئی ثبوت بھی تو نہ تھا کہ یہ مذموم مگر مستقل نوعیت کی شرارت نہ تھی۔
میں یہ بھی واضح کر دوں کہ وہ چوبیں گھنٹے میرے اعصاب پر سوار نہ رہتی تھی۔ میری اپنی زندگی تھی جس سے لطف اندوزی کی میں کماحقہ صلاحیت رکھتی تھی۔ اکثریت کی مانند میں بھی عام سی زندگی بسر کر رہی تھی جس سے بعض اوقات اکتاہٹ بھی محسوس ہوتی مگر یہ اکتاہٹ اتنی متواتر یا شدید نہ ہوتی کہ اعصابی ہوا بن جائے مجھے ان نت نئے یا انوکھے تجربات کا مزا چکھنے کا بھی کوئی ایسا خاص شوق نہیں جن کے نتیجہ میں حقیقت خصوصی قدر و قیمت اور بدقسمتی ٹھوس وجود حاصل کر لیتی ہے۔ میں نے خود رحمی پر مبنی ان الجھنوں سے بھی صرف نظر کرنا سیکھ لیا تھا جو کم فہمی کے معصومیت سے پر طرز احساس کو جذب کر لیتی ہیں یعنی ایسے احساسات جو اس بے ہنگم دنیا سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں جنم لیتے ہیں جب کبھی میں دباؤ پیدا کرنے والی اس دنیا میں خود کو لکھنے کے معاملہ میں بے بس پاتی ہوں--- (کیا میں نے پھر سے لکھنے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے؟) تقریباً تمام اہل قلم کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے--- تو اپنی کہانیوں پڑھنے کے بجائے (ہرچند کہ وہ یہ تسلیم نہیں کرتی اور اس کے بموجب یہ اس کی تحریریں ہیں) میں اپنے پسندیدہ مصنفین کی تخلیقات کا مطالعہ شروع کر دیتی ہوں' رشک کے اس احساس کے باوجود جو ایسے مطالعہ کا خاصہ ہوتا ہے۔
میں یوگا واڑہ جانے کا ارادہ باندھتے ہوئے نئی کہانی لکھنے کے لیے تحریر کردہ یادداشتیں ساتھ لے جانے کا سوچتی ہوں' ایک مجموعہ میں شمولیت کی غرض سے کچھ تحریروں پر نظرثانی کرنے کا ارادہ بھی کرتی ہوں ساتھ ہی کئی ایسی کتابیں بھی لے لیتی ہوں جن کا اب تک مطالعہ نہ کر پائی تھی علاوہ ازیں "کچھ اپنی تخلیقات کے بارے میں" کے عنوان سے قلمبند کئے گئے اس مضمون کا مسودہ بھی سنبھال لیتی ہوں جو نہ جانے کس عجیب ترغیب کے زیر اثر سپرد قلم کیا گیا تھا' ہرچند کہ یہ معاملہ بھی بحث طلب ہے کیا میں اپنے فن کے بارے میں کچھ لکھنے کی اہل بھی ہوں؟ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل تو یہ ہے کہ میرے پاس کتابوں کی رائلٹی سے اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ گرم پانی کی ندی کے کنارے واقع اس مقام پر کچھ دن آرام سے گزارے جا سکتے تھے۔ آپس کی بات ہے تخلیقی مقاصد کے لیے اہل قلم کے گرم پانی کے کنارے پر واقع مقامات پر قیام پذیر ہونے کی روایت نے مجھے بھی متاثر کیا ہے۔
نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم اپنے تخلیقی منصوبوں یا زیر تحریر ادب پارہ کے بارے میں خاموشی سادھنا چاہتے ہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ بالآخر ہم خود ہی ان کا چرچا شروع کر دیتے ہیں یوں--- نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری--- کے بجائے الفاظ کا سرچشمہ رواں ہو جاتا ہے۔ ہم درحقیقت واہ کرنے سے بات کا آغاز کرتے

ہیں مگر حقیقت کی پردہ پوشی والا اسلوب اپنا لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال بے جا نہ ہو گا کہ اپنے فن کی بابت بات کرتے وقت کن تقاضوں کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے اور کن امور کی توقع بے جا نہ ہو گی۔ شاید یہ بھی خود اعترافی ہی کا ایک انداز ہو اور پھر اعتراف کرنے کے عمل ہی میں ایسی صورت بھی پیدا کر دی جائے جس میں واہموں میں تبدیل ہو جانے والی کتابیں فنکار انداز سے خوابیدہ ملتی ہیں۔ بہرحال تمام تگ و دو کا حاصل یہ ہے کہ میں اعتراف کے معاملہ میں تہی دست ثابت ہوتی ہوں البتہ یہ ہوا کہ اپنی کہانیاں پڑھتے وقت مجھ پر عجب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فرض کریں واقعی یہ کہانیاں اسی کی تحریر کردہ ہوں' فرض کیا واقعی اسی نے ہی قلم بند کی ہوں تو گویا اب میں اس کو قاری بن چکی تھی۔ میری عجب حالت تھی۔ ادھر میں تھی کہ میری صرف مجوزہ کہانی کا عنوان بھی میرے پاس تھا۔ "افلاطونی محبت!" اسے کون قلم بند کرے گا۔۔۔ وہ یا میں؟

حسب توقع "افلاطونی محبت" کے بارے میں' میں ایک لفظ بھی نہ لکھ پائی' میری یادداشتوں کی کتاب میں اس کہانی کے لیے ایک لفظ بھی نہ تھا۔ میں پانچ دن تک خالی الذہن سارا سارا دن گھومتی رہتی' رات آتی تو کتاب پڑھتی رہتی یا تنہا کچھ کھا پی لیتی' میں نے اپنے فن کے بارے میں بھی کچھ لکھنا چاہا مگر بات نہ بنی حالانکہ تین برسوں قبل اس ضمن میں ابتدائی کام کر چکی تھی لیکن اب تو میرے الفاظ اس کے الفاظ میں تبدیل ہو چکے تھے کہ یہ اس کے خطوط سے مستعار تھے۔

اس کے خلاف ذہنی مزاحمت کے عمل کے دوران' میں نے خرگوش کی کھال کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کی کوشش کی جو ہاناماکی میں کریانہ کی ایک دوکان کے خاکستری رنگ کے چوبی دروازہ میں کیل میں پروئی ہوتی تھی (اس کی جلد کا وہ حصہ سامنے رہتا تھا جہاں بہتا خون جم کر گویا لئی میں تبدیل ہو گیا تھا) یا پھر اوات جاتے وقت گاڑی کی نشست پر سوتے میں خرگوشوں کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا اسی کو کہانی کا موضوع بنانا چاہا۔

میں نے ھاناماکی کو دبانے والے سرما کے آسمان کو یاد کرنا چاہا' قطار اندر قطار گلیاں' ہر طرح کی انفرادیت سے عاری اس عام اور پسماندہ قصبہ کی سرمئی' خاکستری اور زردی مائل نیلی شریانوں پر سفید چمکیلا مگر زندگی سے عاری آسمان۔۔۔ پھر وہی اندیشہ! میں تو وثوق سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں واقعی اس قصبہ میں جا چکی تھی۔ کسی بستی کی آبادی کے لیے کچھ چیزیں لازم ہوتی ہیں جیسے لوگوں کی چہل پہل بلکہ بعض اوقات تو اس کی پیدا کردہ الجھنیں بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہیں مگر ان سب کا میری جان پہچان کے ہاناماکی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ غالباً" یہ بستی میری یادوں کی بھول بھلیاں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی اگرچہ اس خاموش بستی کی روح نے ہی مجھے ادھر کا راستہ منتخب کرنے پر مجبور کیا تھا مگر خود یہ اپنی شناخت کے خدوخال گنوا چکی تھی حتیٰ کہ خرگوش کی کھال بھی غائب ہو چکی تھی جبکہ اسے دیکھنے کا مکمل یقین ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ ان سب کا احوال میں نے کسی کہانی میں پڑھا ہو۔ یہ میں نہ تھی جس نے انہیں دیکھا اور قلم بند کیا یقیناً خرگوش کی کھال' اس نے خاکستری' زردے اور سرخ رنگ اور لئی جیسا منجمد خون اور اس میں گھلی ملی چربی۔۔۔ بلاشبہ میں یہ سب پہلے ماضی کی کسی پڑھی ہوئی کہانی میں کیل پروئی دیکھ چکی تھی۔۔۔ کیا واقعی ایسا نہیں؟

میں غیر پیشہ ورانہ انداز سے چلائے جانے والی اور جس گندی اور بدنما سرائے میں مقیم تھی اس میں سورج ڈوبتے سے ایسی خاموشی ہوتی گویا میرے علاوہ یہاں اور کوئی مقیم نہ ہو۔ مغربی دریچوں سے نظر آنے والا سلسلہ کوہ سیاحوں کے ایک بڑے ہوٹل کی دیوار کے سرمئی کنکریٹ کے پردہ میں روپوش تھا لہٰذا یہاں قیام و طعام کے سستے نرخ نسبتاً" زیادہ طویل قیام کے لیے مناسب تھے۔ عیارانہ تاثرات کے حامل ایک سارس کی بھدی

تصویر پھسلنے والے دروازہ پر بنائی گئی تھی جس کے رنگوں کو برسوں سے شام کے سورج نے اب زرد بنا دیا تھا' ادھر قرطاس پر برف میں پھنس جانے والے ایک بگلے کی دکھ بھری منظوم داستان' طاقچہ میں آویزاں تھی۔ ان کے بالمقابل چھوٹا سیاہ اور سفید ٹیلی ویژن' قدیم چھوٹی چوبی میز پر بیئر کے گلاسوں کے پیندوں کے دائرے اور چائے کے برتن' آئینہ سٹینڈ پر پرانا ریشمی کپڑا پڑا تھا وقت نے جس کے نقوش ملگجے کر دیئے تھے' کپڑوں کے ریک میں لٹکتے تین ہینگر۔۔۔ بس یہی کل کائنات تھی اس کمرہ کی!

میں ہر شام غسل کرتی' چاروں طرف پھیلی خاموشی میں افسردگی سے کچھ چنتی' سرائے کی مالکہ کا پکایا ہوا کھانا زہر مار کرتی' کھٹا میٹھا گوشت اور عام سا سلاد!

اگر تنہا خوری کی خوبیاں گنوانے کو کہا جائے تو جواب ہو گا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کھانے کے دوران کتاب کا مطالعہ بھی کرتے جائیں تو آپ کو دیکھ کر کوئی بدمزہ نہ ہو گا۔ اسی تنہا یاترا (ویسے میں پہلے بھی ایسے کئی سفر تنہا کر چکی ہوں) کے دوران یہ یاد دہانی مسلسل پیچھا کرتی رہی کہ میں یہاں کہانی لکھنے آئی تھی۔ کہانی شروع کرنے کے لیے میں اندر کی آواز کو بغور سننے کی کوشش بھی کرتی مگر کچھ لکھ نہ پاتی۔

دوران غسل جب ڈوبتے سورج میں باتھ ٹب کا پانی چمکیلی گلابی دھات کی مانند چمک اٹھتا تو میری آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ "مرد" یا "عورت" اب اس منظرنامہ سے غیر حاضر تھی۔ دراصل غائب ہونے والا اس کا وجود نہ تھا بلکہ سرے سے کہانی ہی غائب تھی اور یوں یہ احساس اجاگر ہو کر آنکھوں کو مزید اشک آلود کر دیتا۔ اسی بڑے باتھ ٹب میں میرا جسم گویا صابن کی جھاگ کی مانند گھل جاتا۔ جسم جسم نہ رہتا۔ یہ صرف گرم پانی ہی نہ تھا جو بڑے ٹب میں جسم کو گھیرے میں لے کر دبا رہا ہوتا بلکہ اپنے علاوہ بھی پانی میں اور کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ایسا وجود جو زندگی کے ساتھ میرا بندھن مضبوط کر کے اس سے ہم آہنگ کر دیتا۔ خاموشی اور سکوت کے عالم میں' دودھیا سفید بھاپ میں' ڈوبتے سورج کا گلابی رنگ لرزاں لرزاں سا نظر آتا' وقت کا دائرہ پھیلتا جاتا۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں سے مشابہہ عالم میں باتھ ٹب پھیلتا جاتا۔ عالم خواب میں' میں نہ تھی' وہ عالم خواب میں تھی' میں تو اس کے خواب میں محض ایک کردار تھی۔ تب یہ دھندلکوں جیسا پر اسرار منظر گویا پانی میں گھل جاتا۔ یہ تھا میرے (ہمارے) خواب کا منظرنامہ۔۔۔۔ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟

ایک دوپہر' کھانے کے بعد' میں دامن کوہ میں سڑک کے ساتھ پارک میں سے ہو کر بہتی ندی کے کنارے جا رہی تھی کہ ایک اجنبی عورت نے مجھے پکارا' جو انداز میں جھجک کے باوجود دخل اندازی والے لہجہ میں مجھ سے مخاطب تھی' گویا میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔ وجدانی طور پر مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ یہی "حقیقی مصنفہ" ہے۔ ذہن کے نہاں خانہ میں اس کی مرتب کردہ تصویر میں میرے لاشعور نے امید اور نمائش پسندی کے رنگ بھر رکھے تھے۔ میں اس کے لیے خوبصورت کا لفظ استعمال کر چکی ہوں مگر "حقیقی مصنفہ" ایسی نہ تھی (ویسے بھی جزئیات میں الجھ جانا میرے مزاج کا خاصہ نہیں تاہم ایسا کرنا غیر مہذبانہ بھی نہ ہوتا)

اس نے مجھے دوپہر کا کھانا کھانے کو کہا کیونکہ ابھی تک اس نے کھانا نہ کھایا تھا۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ اگرچہ میں کھانا کھا چکی ہوں تاہم ساتھ دینے کو چائے یا اور کچھ کھا پی لوں گی۔ ہم پارک کے دروازہ کے قریب ایک کافی شاپ میں کھڑکی کے ساتھ میز پر آمنے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ خاصہ مہنگا کھانا منگواتی ہے' میں کافی پر اکتفا کرتی ہوں۔ مجھے اب درست طور پر تو تمام گفتگو یاد نہیں تاہم اتنا احساس ہے کہ کھانا چبانے کی آواز کے ساتھ وہ ناتحریر شدہ کہانی "افلاطونی محبت" کے بارے میں گفتگو کرتی رہی تھی۔ جی ہاں! "افلاطونی محبت" کی

"حقیقی مصنفہ" کہانی کے بارے میں اظہار خیال کر رہی تھی اس دوران روسٹ بیف سینڈوچ سے بہہ نکلنے والی تری کو اپنی انگلیوں پر سے چوستی بھی رہی اور میں۔۔۔ نہ صرف اس سے یہ استفسار کر سکی کہ مجھے یوں خطوط لکھنے سے اس کا کیا مقصد تھا بلکہ اس کے سینڈوچ سلاد اور کافی کے تین پیالوں کا بل بھی مجھی کو ادا کرنا پڑا۔ میں تین بجے سرائے واپس پہنچی۔

مجھے علم تھا کہ میں جب چاہوں "افلاطونی محبت" مکمل کر سکتی ہوں مگر اب جیسے لکھنے کی ضرورت اور خواہش دم توڑ چکی تھی۔

سفر سے گھر واپس لوٹی تو حسب توقع "حقیقی مصنفہ" کا خط آیا رکھا تھا۔ خط میں لنچ کے بل کی ادائیگی کا شکریہ ادا نہ کیا گیا تھا بلکہ یہ "افلاطونی محبت" کا مسودہ تھا جس کے بارے میں وہ گفتگو کرتی رہی تھی۔

میں نے خود کو یہ باور کرانے کی بہت کوشش کی کہ اسے پڑھے بغیر بھی میرا گزارا ہو سکتا ہے۔ اسے پڑھے بغیر کوڑادان میں پھینک کر یا نذر آتش کر کے سرے سے یہ قصہ بھی ختم کیا جا سکتا تھا۔ بھلا اس میں مشکل کیا تھی؟ میں اپنی میز پر دھرا لفافہ اٹھاؤں' جس پر اس نے بدخطی میں میرا نام لکھا ہے (گویا میں نے خود ہی لکھا ہو) اور اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یوں چھٹکارا حاصل کر لوں کہ دوبارہ اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو' یہی نہیں بلکہ اپنے نام اس کے تمام خوط بھی باغیچہ میں لے جا کر ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر' ماچس کی تیلی جلاؤں اور ان کی چتا روشن کر دوں۔ ہاں' آگ پھیل جانے کے خدشہ کے پیش نظر پانی سے بھری بالٹی ضرور پاس رکھ لینی چاہیے۔ قلیل مدت میں شعلہ تمام خطوط کو چاٹ کر بھسم کر لے گا' زردی مائل سرخ دھواں آسمان کی جانب اٹھے گا' ذرا سی دیر میں زمین پر خطوط کے کاغذات کی جگہ سیاہ راکھ باقی رہ جائے گی' جس پر پانی ڈال کر پاؤں سے مسلا جا سکتا ہے۔

یاس کے بوجھل احساس تلے دبی میں کرسی پر ڈھے سی جاتی ہوں مجھے علم ہے کہ کچھ بھی تو ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بالآخر میں "افلاطونی محبت" کو نہ صرف چھپواؤں گی بلکہ یہ بھی تسلیم کروں گی کہ یہ میری ہی تحریر ہے۔

می شیمایو کیو / خالد سعید

پریم کتھا اک پروہت کی

ایشن کی "مبادیات نجات" کے مطابق پوتر دھرتی کی مسرتوں کے مقابلے میں اس دنیا کی دس لذتیں ساگر میں محض ایک بوند کی مانند ہیں۔ اس جہاں کی زمین زمرد سے بنی ہے۔ اور وہ سڑکیں جو ہمیں اس پار لے جاتی ہیں' دو رویہ سنہری جھالروں سے آراستہ ہیں۔ انکی سطح بے حد ہموار ہے اور اس سرزمین کا کوئی انت نہیں۔ ہر مقدس احاطہ میں پانچ کھرب ہال کمرے اور مینار ہیں۔ جن پر سونے' چاندی' شوخ لاجورد' بلور' مرجان' عقیق اور موتیوں کا کام ہوا ہے۔ اور سنہری شہ نشینوں پر حیران کن حد تک خوبصورت ملبوسات دور دور تک پھیلے پڑے ہیں۔ ان ہال کمروں اور میناروں کے اوپر ان گنت فرشتے ہمہ وقت الوہی سازوں کے ساتھ ناتھا گاتا بدھ کی شان میں مناجات پڑھتے ہیں۔ ہال کمروں' میناروں اور خانقاہوں کے گرداگرد واقع باغ میں سونے اور زمرد سے بنے ہوئے تالاب ہیں۔ جہاں پر دھرم دار لوگ' اشنان کر سکتے ہیں۔ سونے سے بنے تالابوں کے کنارے دو پیلے رنگ کی ریت سے بنے ہیں جبکہ زمردیں تالاب کے کنارے بلوریں ہیں۔ یہ تالاب کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہیں' جو ہر وقت بدلتے ہوئے مختلف خوبصورت رنگوں میں دمکتے ہیں۔ اور جب معطر ہوا پانی کی سطح پر لرزتی ہے تو عظیم الشان روشنیاں اک دوجے کو قطع کرتے ہوئے تمام سمتوں میں پھیل جاتی ہیں۔ رات اور دن فضا' سندر ناریوں کے چہرے والے سارسوں' ہنس راجوں' بطخوں' موروں' طوطوں' رسیلی آواز والے کالا و نکاموں اور چینی سیانوں کے گیتوں سے گونجتی ہے۔ یہ سارے اور سینکڑوں قسم کے زیوروں سے لدے پھندے دوسرے بے شمار پرندے بدھ کی تعریف میں میٹھی تانیں لگاتے ہیں۔ (ان کی آوازیں بے شک' بہت رسیلی سہی مگر اتنی تعداد میں پرندوں کا ہونا بہت شور کا باعث ہوتا ہوگا۔)

تالابوں کے گرد اور دریاؤں کے کنارے کے ساتھ ہی گزرگاہوں میں مقدس قیمتی پیڑ لگے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کے تنے سونے' شاخیں چاندی' اور شگوفے مرجان سے بنے ہیں۔ اور ان کا بے پناہ حسن پانیوں میں منعکس ہوتا ہے۔ ہوا میں ہر طرف جڑاؤ تاریں لہراتی ہیں۔ ان تاروں کے ساتھ بے حساب قیمتی گھنٹیاں لٹکی ہیں جن سے مترنم آوازوں میں بدھ کا قانون اعلیٰ بیان ہوتا ہے۔ موسیقی کے عجیب و غریب ساز جو کسی لمس کے بغیر خود بخود بجتے ہیں اور ان کی آواز دور دور تک شفاف آسمانوں میں پھیل جاتی ہے۔

اگر کسی کو اشتہا محسوس ہو' تو خود بخود سات قیمتی دھاتوں سے بنی میز آجاتی ہے۔ جس کی چمکتی ہوئی سطح پر سات ہی قیمتی دھاتوں سے بنے ڈونگے ظاہر ہوتے ہیں جن میں انتہائی نفاست اور نزاکت سے منتخب کھانے وافر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ پر ان کھانوں کو اٹھا کر منہ میں ڈالنے کی قطعا" کوئی ضرورت نہیں۔ بس صرف ان کے پرکشش رنگوں کو دیکھو' خوشبوؤں سے لطف اندوز ہو' پیٹ خود بخود بھر جائے گا اور جسم کو توانائی مل جائے گی۔ لیکن بندہ جسمانی اور روحانی طور پر پاک ہی رہے گا۔ جب اس طرح بنا کھائے پئے آدمی کو اپنا بھوجن مل جائے گا

تو میز اور ڈونگے فوراً ہی اور خود بخود غائب ہو جائیں گے۔

اس طرح جسم کو خود کارانہ انداز میں' سے' دھوئے' رنگے اور مرمت کئے بغیر لباس بھی مل جاتا ہے۔ بجلی اور لالٹین بھی غیر ضروری ہیں کیونکہ آکاش ہر وقت ایک الوہی روشنی سے دمکتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کا درجہ حرارت بھی معتدل رہتا ہے۔ لہٰذا اسے گرم یا ٹھنڈا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہزاروں خوشبوئیں ہمہ وقت فضا کو معطر رکھتی ہیں اور کنول کے پھولوں کی پتیاں مسلسل برستی رہتی ہیں۔

معائنہ کے دروازے کی فصل میں ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ اس سرزمین سے ناآشنا لوگ چونکہ اس پوتر دھرتی کو گہری نظر سے دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے لہٰذا ان کے لئے لازم ہے کہ وہ دھیان کی مشقیں کریں' تاکہ پہلے خارجی تخیل کی قوتیں بیدار ہو جائیں اور پھر وہ درجہ بدرجہ استقلال سے اپنی قوتوں کو بڑھاتے جائیں۔

تخیلاتی قوتیں ہمیں دنیاوی بندشوں سے نجات کا آسان اور سادہ راستہ مہیا کرتی ہیں تاکہ مقدس بدھ کا دیدار ہو سکے۔ اگر ہمارا تخیل سرکش اور شورش زدہ ہے تو ہم اپنی توجہ کنول کے ایک پھول پر مرکوز کر سکتے ہیں اور اس کی مدد سے بے انت آکاش کا تجربہ کر سکتے ہیں۔

کنول کے پھول کا خوردبینی مشاہدہ اور فلکیاتی انعکاس کا وسیلہ ہمارے لئے کائنات کے مکمل اور جامع نظریے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اور اس کے ذریعے ہم سچ کو پا سکتے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ کنول کے پھول کی ہر پتی میں چوراسی ہزار وریدیں ہوتی ہیں اور ہر ورید سے چوراسی ہزار قسم کی روشنیاں خارج ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان پھولوں میں سب سے چھوٹے پھول کا قطر دو سو پچاس یوجانہ ہوتا ہے۔ مقدس لکھتوں کے مطابق ایک یوجانہ تقریباً" پچھتر میل کا ہوتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اپنی چھوٹی جانب سے کنول کے پھول کا قطر انیس ہزار میل ہوتا ہے۔

اب ایسے ہر پھول میں چوراسی ہزار پتیاں ہوتی ہیں۔ اور ہر پتی میں دس لاکھ جڑاؤ زیورات ہوتے ہیں' اور ہر زیور سے ایک ہزار روشنیاں خارج ہوتی ہیں۔ پھول کی آراستہ مسند کے اوپر سے چار جواہر جڑے ستون اٹھتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ستون رفیع الشان سمیرو پہاڑ سے ایک ارب گنا زیادہ ہے جو بدھی کائنات کے مرکز میں واقع ہے۔ ان ستونوں سے بہت بڑے بڑے مرصع پردے لٹکے ہیں۔ اور ہر پردے میں پانچ کھرب زیورات جڑے ہوئے ہیں۔ ہزار قسم کے سنہرے رنگ میں اور ان میں سے ہر سنہری رنگ کی ہر وقت مختلف انداز میں کایا کلپ ہوتی رہتی ہے اس طرح کے متخیلہ پر توجہ مرکوز کرنا دراصل "کنول کی مسند کے بارے میں سوچنا ہے کہ جس پر خدائے بدھ براجمان ہے۔" اور یہ وہ تصوراتی دنیا ہے جو ہماری کہانی کے پس منظر میں مسلسل منڈلاتی ہے۔ وہ دنیا جس کے بارے میں اب تک اس پیمانے پر سوچا گیا ہے۔

شیگا (جاپان کا ایک قصبہ) کے مندر کا مہا پروہت اپنی نیکی' پاک دامنی اور حسن سیرت میں بے مثال تھا۔ اس کی آنکھوں کی بھنویں مکمل طور پر سفید تھیں اور وہ اپنی بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ ایک لاٹھی کے سہارے بمشکل مندر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک لنگڑاتے ہوئے اور اٹک اٹک کر پھرا کرتا۔ اس عالم پروہت کی نظر میں یہ دنیا محض کوڑے کا ایک ڈھیر تھی۔ اور طویل برسوں سے وہ اس گندگی کے ڈھیر سے الگ زندگی بسر کرتا آیا تھا۔ اپنی موجودہ کٹیا میں رہائش پذیر ہونے کے بعد یہاں اس نے صنوبر کا ایک ننھا سا پودا لگایا تھا جو اب ایک جوان اور تنومند درخت بن چکا تھا۔ جب کبھی تیز ہوا چلتی تو اس کی شاخیں خوشی اور سرمستی سے پھول پھول جاتیں۔ ایک ایسا راہب اور پروہت' جس نے اتنا عرصہ اس عارضی دنیا کو ترک کرنے میں بے مثال کامیابی

حاصل کی تھی۔ اب اپنی حقیقی اور اخروی زندگی کے بارے میں خود کو مطمئن اور محفوظ محسوس کر سکتا تھا۔

جب بھی مہاپروہت' امرا اور معززین شہر کو دیکھتا تو ان پر ترس کھاتے ہوئے مسکرا دیتا۔ اور حیرت سے سوچتا 'کیسے ہیں یہ لوگ جو حقیقی دنیا کی ازلی خوشیوں پر خالی خوابوں کو ترجیح دیتے ہیں؟ جب کبھی اس کی نگاہ خوبصورت عورتوں پر پڑتی تو اس کا بھلا دل ان مردوں کے لئے رحم کے جذبات سے بھر جاتا جو بلاشبہ توہمات کی دنیا میں رہتے تھے اور ابھی تک نفسانی لذتوں کی لہروں پر ڈگمگاتے ڈولتے پھرتے تھے۔

جس لمحہ میں کوئی شخص مادی دنیا کے تقاضوں سے ماورا ہو جاتا ہے تو یہ دنیا اطمینان و سکون کا کامل نمونہ بن جاتی ہے۔ مہاپروہت کی نگاہ میں یہ دنیا صرف اطمینان کی آسائش تھی۔ کاغذ کے ٹکڑے پر بنی ہوئی شبیہ محض کسی اجنبی سرزمین کا ایک نقشہ جب کسی کو دل کا سکون مل جائے تو دنیائے موجود کی ہوائے نفس تحلیل ہو جاتی ہے۔ اپنے دل کا ڈر بھی اپنے پاس نہیں رہتا۔ اور پروہت کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر زنگ کا جواز ہی کیا ہے؟ وہ بنا کسی شک و شبہ کے اچھی طرح جانتا تھا کہ اب دنیائے موجود کی ہوا و ہوس اس کے لئے بے معنی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنی انا کو مکمل طور پر تیاگ چکا تھا اس لئے اسے قطعاً" یہ محسوس نہ ہوا کہ دراصل ایسا ہونا اس کی بے مثال حسن سیرت کے سبب تھا۔ جہاں تک اس کے سریر کا تعلق تھا' کہا جا سکتا ہے کہ وہ کافی حد تک اپنے ماس سے فارغ ہو چکا تھا۔ ایسے موقوں پر جیسے غسل کرتے ہوئے' اسے یہ دیکھ کر بے اندازہ خوشی ہوتی کہ اس کی آگے کو بڑھی ہوئی ہڈیاں مرجھائی ہوئی کھال سے غیر معین انداز میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اسے محسوس ہوتا کہ اب وہ اس کا اسی طرح سامنا کر سکتا ہے جیسے اس وجود کا تعلق کسی اور شخص سے ہو۔ ایسا جسم' صاف ظاہر ہے کہ مقدس سرزمین کی نمو کے لئے زیادہ مناسب تھا۔ بہ نسبت زمینی آب و جو کے۔

اپنے سپنوں میں وہ شاہانہ انداز میں مقدس سرزمین کا باسی ہوتا۔ اور جب کبھی اس کی آنکھ کھلتی تو اسے اچھی طرح پتہ ہوتا کہ دنیائے موجود میں رہنا ایسے ہی ہے جیسے بندہ کسی بہت جلد فنا ہونے والے اور اداس خواب میں قید ہو جائے۔

پھولوں کی رت میں بہت سے سیاح دارلخلافہ سے شیگا گاؤں میں آتے۔ یہ بات پروہت کو ذرہ برابر پریشان نہ کرتی' کیونکہ وہ بہت عرصہ سے ایسی کیفیات سے ماورا ہو چکا تھا کہ دنیا کا شور و ہنگامہ اس کے اطمینان قلب کو متاثر کر سکتا۔

بہار کی ایک شام اپنی لاٹھی کا سہارا لئے اور اس پر جھکے وہ اپنی کٹیا سے باہر نکلا اور جھیل کی جانب چل دیا۔ روشن سہ پہر میں جھٹ پٹے سائے اپنا رستہ بنا رہے تھے۔ پانی کی سطح بالکل ساکن تھی۔ پروہت جھیل کے کنارے کھڑا ہو گیا اور جل دھیان کی مقدس رسم ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔

عین اسی لمحے ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ گاڑی کی سجاوٹ اور زیبائش سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کسی اونچے رتبے کی شخصیت کی ملکیت ہے۔ گاڑی چکر لگا کر اس مقام پر کھڑی ہو گئی جہاں پروہت کھڑا ہوا تھا۔ اس گاڑی کی مالک ایک درباری خاتون تھیں جن کا تعلق دارالحکومت کے "کائیوگوکو" ضلع سے تھا۔ جہاں انہیں رفیع الشان شاہی گیشیا (طوائف) کا بلند منصب حاصل تھا۔ یہ خاتون شیگا میں بہار کا نظارہ کرنے آئیں تھیں۔ اپنی واپسی پر اس نے گاڑی ٹھہرائی اور جھلملی (نظر روک) اٹھا کر جھیل پر آخری نگاہ کی۔

ناگاہ مہاپروہت نے اس کی جانب دیکھا اور اس کا جلوہ اسے ڈھیر کر گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ نہ تو اس نے نگاہیں چرانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس خاتون نے اپنی نظر وہاں سے ہٹائی۔ بات یہ نہ تھی کہ اس کی

آزاد روح مردوں کو بے حیا نظروں سے دیکھنے کی دعوت دیتی بلکہ اس کا احساس یہ تھا کہ اس تارک الدنیا بوڑھے پروہت کے محرکات عام انسانوں جیسے نہیں ہو سکتے۔

تھوڑی دیر کے بعد خاتون نے جھلملی کے پردے گرا دیئے۔ اور اس کی گاڑی شیگا پاس سے ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ دارالحکومت کو جانے والی سڑک پر ہولی۔ رات گہری ہو گئی۔ اور گاڑی روپہلے مندر والی سڑک سے گزرتے ہوئے شہر کی جانب بڑھنے لگی۔ جب تک گاڑی دور کے درختوں میں اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوئی' مہا پروہت وہیں کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

استہزائی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دنیائے موجود نے مہا پروہت سے اپنی اہانت کا انتہائی خوفناک بدلہ لے لیا تھا۔ وہ دنیا جسے اس نے محفوظ سمجھ لیا تھا' اب کھنڈرات میں بدل چکی تھی۔ وہ مندر کی طرف لوٹا۔ بدھ کی واضح شبیہہ کو ذہن میں لایا اور مقدس نام لے کر اس کی دہائی دی۔ لیکن اب وہ آلودہ خیالات کے دھندلے سایوں کی زد میں تھا۔ ایک عورت کا جمال' اس نے اپنے آپ سے کہا "ایک اڑتا ہوا' خیالی پیکر ہے۔ ایک عارضی منظر' جو ماس سے بنا ہے۔ وہ ماس اور پنجر جو بہت جلد تباہ ہو جائے گا"۔ لفظوں میں ناقابل بیان اس حسن و جمال کو وہ جتنا زیادہ اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا جس نے اسے اس لمحہ جھیل کنارے بے بس کر دیا تھا' اتنی ہی شدت سے اب وہ بے انت فاصلوں سے آنے والی شکتی اس کے دل کو گھیر رہی تھی۔ پروہت' جسمانی یا روحانی طور پر نہ تو اس قدر نوجوان تھا کہ اپنے اس نئے احساس کو ماس کی اس کے وجود کے ساتھ چال سمجھتا۔ ایک بندے کا جسم اتنی جلد تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نرم اور لطیف مگر زود اثر زہر میں ڈبو دیا گیا ہو اور یکایک اس کی آتما کی کایا کلپ ہو گئی ہو۔

پروہت نے اپنی عصمت برقرار رکھنے کی قسم کبھی نہ توڑی تھی۔ جسم کے تقاضوں کے خلاف اپنی نوجوانی میں لڑی باطنی جنگ نے اسے اس نتیجہ تک پہنچایا تھا کہ عورت محض وجود شہوانی ہے۔ واحد حقیقی ماس دراصل وہ ماس تھا جو اس کے تصور میں وجود رکھتا تھا۔ اس وقت اور اسی کارن ماس اس کے نزدیک ایک طبعی واقعہ کی بجائے ایک ذہنی تجرید تھا اور اسے زیر کرنے کے لئے اس نے اپنی روحانی قوتوں پر مکمل انحصار کیا تھا۔ اس کاوش میں اسے وہ بے مثال اور شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی' جس پر اسے جاننے والا کوئی شخص شبہ کرنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

اس سب کے باوجود جس عورت نے جھلملی اٹھا کر جھیل کے پار نگاہ کی تھی' وہ نظر اس قدر شفاف' درخشاں اور ہم آہنگ تھی کہ اسے کوئی جسمانی شے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ خود مہا پروہت اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ اور وہ اس ششدر کر دینے والے لمحے کے بارے میں کچھ یوں سوچ سکتا تھا کہ جیسے اس کے اندر بہت دور کہیں گھات لگائے ہوئے کسی چھپی شے نے دفعتاً" خود کو آشکار کر دیا ہو۔ اور یہ شے بلاشبہ دنیائے موجود کے علاوہ کچھ نہ تھی' جو اب تک اپنے اطمینان کی نیند میں تھی اور جس نے اب یکایک اتھاہ تاریکی میں اپنا سر اٹھایا۔ اور ایک بھڑکتے ہوئے الاؤ کی صورت میں دہک اٹھی۔

یہ تو ایسے ہی تھا جیسے وہ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے دارالخلافہ کو جانے والی شاہراہ اعظم پر کھڑا دور بہت بڑی اور تیز رفتار بیل گاڑیوں کو ایک دوسرے سے نکلنے کی دھن میں گڑگڑاہٹ پیدا کرتے دیکھ رہا ہو کہ اچانک انگلیاں کانوں سے نکل جائیں اور بیرونی دنیا کا بھیانک اور کان پھاڑنے والا شور اس کے چاروں اور چکرانے لگے۔

ہر آن تبدیل ہوتے ہوئے مظاہر کے ادراک کا مطلب ہے کہ کان اس بے ہنگم شور سے پھٹیں اور بندہ دنیائے موجود کے حصار میں بند ہو جائے۔

جتنا زیادہ وہ بدھ کے اقوال زریں خود سے دوہراتا' اتنی ہی زیادہ بلکہ اس سے کہیں شدید درد و کرب کی ٹھنڈی سانسیں اسکے سینے سے وا ہوتیں۔ وہ سوچتا' ممکن ہے فطرت ہی اس کی بیکل آتما کو شانتی دے سکے۔ پھر اس نے اپنی کٹیا کی کھڑکی سے' شام کے آسمان تلے دور کے بلند و بالا پہاڑوں پر نگاہیں جما دیں۔ مگر اس سب کے باوجود اس کا خیال اس حسن بے پناہ پر مرکوز ہونے کی بجائے اڑتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کی مانند دور اور دور ہٹتا چلا گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں چاند کی جانب کیں' مگر اس کے خیالات بدستور پہلے کی طرح بھٹکتے رہے۔ اور جب اس نے انتہائی جانکاہ کاوش سے اپنی ذہنی طہارت کے حصول کے لئے دوبارہ بدھ کی مرکزی شبیہ کی طرف رجوع کیا تو بدھ کا چہرہ تبدیل ہو کر بیل گاڑی والی عورت ایسا ہو گیا۔ اس کی کائنات ایک چھوٹے سے دائرہ میں محدود ہو چکی تھی۔ اس دائرے کے ایک نقطہ پر مہاپروہت اور اس کے عین بالمقابل دوسرے نقطہ پر شاہی مہا گیشیا تھی۔

"کائیو گوکو" کی شاہی گیشیا نے بہت جلد اس بڈھے پروہت کو بھلا دیا جسے اس نے شیگا جھیل کے کنارے انتہائی انہماک سے اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسی نہ کسی طرح ایک افواہ اس تک بھی پہنچی اور اسے وہ واقعہ یاد آگیا۔ ایک ان گھڑ دیہاتی نے مہاپروہت کو اس وقت دیکھا جب وہ ایک جگہ پر کھڑا اس عورت کی گاڑی پر نظریں جمائے اسے دور فاصلوں میں گم ہوتا ہوا دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے اس محیرا لعقول واقعہ کا ذکر ان درباری شرفا کے سامنے کیا جو شیگا میں پھول رت کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ اور مزید اضافہ یہ کیا کہ اس دن کے بعد سے پروہت پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا تھا۔

گیشیا نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس افواہ پر ذرہ برابر یقین نہ آیا ہو' پروہت اپنی نیکی اور مجاہدے کے لئے سارے دارالخلافہ میں مشہور تھا۔ اور اس خاص حادثہ سے اس خاتون کی انا کو بلاشبہ بہت تسکین تو پہنچنا ہی تھی۔ ایک تو وہ دنیا دار مردوں کی محبت سے بے حد بیزار ہو چکی تھی۔ وہ اپنے حسن جہاں تاب سے پوری طرح باخبر تھی' اور کوئی بھی دوسری قوت با آسانی اسے اپنی جانب کھینچ سکتی تھی۔ مثلاً "مذہب جو اس کے ظاہری حسن اور دنیاوی مرتبے کو بے حیثیت سمجھے۔ دنیائے موجود سے شدید اکتاہٹ کے کارن وہ پوتر دھرت پر مکمل ایمان رکھتی تھی۔ لہٰذا لازم تھا کہ جوڈو بدھ مت جس کے مطابق بصری دنیا کا حسن و جمال اور چک دمک محض ایک نجاست تھی' درباری طوائف ایسی شخصیت کے لئے خصوصی کشش کا حامل تھا' جو دربار کے ظاہرانہ ٹھاٹھ باٹھ اور بناوٹی زندگی سے پورے طور پر بیزار ہو چکی تھی۔ یہ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ جو بلا کسی شک و شبہ کے علامت تھا زوال کے دنوں اور انکے قوانین کی۔

وہ لوگ جو محبت کے فن میں خاصی دلچسپی لیتے تھے شاہی گیشیا کی بے پناہ عزت و تکریم کرتے اور اسے درباری تہذیب' نفاست اور شائستگی کی زندہ مثال سمجھتے۔ یہ امر واقعہ کہ اس نے کبھی کسی مرد سے جسمانی محبت نہ کی تھی' اس کی شہرت اور نیک نامی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

اگرچہ وہ شہنشاہ کے حضور اپنے تمام فرائض انتہائی خوش اسلوبی اور شائستگی کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ مگر پھر بھی کسی کو اس بات پر کبھی یقین نہ آیا تھا کہ وہ اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہے۔ شاہی گیشیا ان شدتوں اور حدتوں والی محبت کے سپنے دیکھتی جو "غیر ممکن" کی حدود پر دھرا پڑا تھا۔

شیگا مندر کا مہا پروہت اپنی نیکی اور پاک دامنی کے لئے شہرت رکھتا تھا۔ دارالخلافہ میں ہر شخص جانتا کہ اس بزرگ راہب نے کس طرح دنیائے موجود کو ترک کر دیا تھا۔ مگر یہ افواہ بے حد حیران کن اور حواس اڑا دینے والی تھی کہ وہ شاہی گیشیا کے غمزوں' عشووں اور ادا کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس کے لئے اس نے مستقبل کی حقیقی دنیا بھی قربان کر دی تھی۔ پوتر دھرتی کی نعمتوں کو اس وقت ترک کرنا جب وہ تقریباً" اس کی پہنچ میں تھیں اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی' اس سے زیادہ بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

شاہی گیشیا عیاش نوجوانوں اور خوش شکل معزز امرا کے درباری جتھے کو قطعاً" خاطر میں نہ لاتی۔ مردوں کے جسمانی اوصاف اب اس کے لئے کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔ وہ صرف ایسے مرد کی تلاش میں تھی جو اسے گہری اور ممکنات سے باہر محبت کے بھیدوں سے شناسا کر سکتا۔ ایسے ارادوں کی حامل عورت صحیح معنوں میں ایک خطرناک وجود ہوتی ہے۔ اگر وہ صرف ایک عام سی درباری عورت ہوتی تو بلاشبہ دنیاوی دولت سے مطمئن ہو جاتی۔ شاہی مہا گیشیا تو پہلے سے ہی ان تمام اشیا سے لطف اندوز ہو چکی تھی جو دنیاوی دولت سے مہیا کئے جا سکتے تھے۔ وہ تو اس مرد کی منتظر تھی جو اسے ہر حال میں آنے والے سدا بہار جگوں کا انمول تحفہ پیش کر سکتا۔

مہا پروہت کی والہانہ محبت کی افواہ پورے دربار میں پھیل گئی۔ اور آخر میں یہ کہانی نیم مذاق اور کچھ لطیفے کی صورت میں خود شہنشاہ معظم کو بھی سنائی گئی شاہی مہا گیشیا اس ہتک آمیز گپ سے قطعاً" لطف اندوز نہ ہوئی۔ اس نے اپنا سنجیدہ اور لاتعلق انداز برقرار رکھا۔ کیونکہ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ عام حالات میں ایسے ممنوعہ معاملے میں درباری لوگوں کی آزادانہ لطیفہ گوئی کی دو ہی وجوہات تھیں: پہلے تو یہ کہ مہا پروہت کی محبت کا حوالہ دے کر وہ اس عورت کے حسن و جمال کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جو اس جیسے نیکی کے پتلے میں بھی وہ جوش ولولہ اور تحریک پیدا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے دھیان کو چھوڑ بیٹھے۔ دوسرے ہر شخص پوری طرح جانتا تھا کہ بڈھے پروہت کی اس عورت سے محبت کی بار آوری کا کوئی امکان نہ تھا۔

شاہی گیشیا نے اپنے ذہن میں اسی بوڑھے پروہت کے چہرے کی بازیافت کی جسے اس نے اس دن اپنی گاڑی کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔ اس کی شباہت میں کسی ایسے چہرہ کی ذرہ برابر جھلک نہ تھی جنہوں نے اب تک اس سے محبت کی تھی یا محبت کے دعوے کئے تھے۔ بے حد عجیب' کہ محبت کا چشمہ اس مرد کے دل سے پھوٹے جو عاشق بننے کے ادنیٰ ترین معیار تک پہنچنے کا اہل بھی نہ ہو۔ خاتون نے اس طرح کے اقوال دوہرائے۔ "او میری بے آس اور شکستہ دل محبت" یہ مقولہ' جو محل میں اناڑی کوی کٹھور دل حسیناؤں کے دل جیتنے کے لئے اکثر و بیشتر دوہراتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس پروہت جس امید شکن صورتحال میں گرفتار تھا وہ ان میں سے بدقسمت ترین رئیس عاشق کے لئے بھی ناقابل رشک تھی۔ اور ان کی شاعرانہ تک بندی اسے محض دنیاوی ناز و انداز کے ایسے پھندے لگتی جس سے ان کی جھوٹی انا کی تسکین تو ہو مگر جو سچے اور گہرے سوز و گداز سے کلیتاً" خالی تھی۔

اب یہ بات قارئین پر واضح ہو گئی ہو گی کہ عام یقین کے مطابق شاہی گیشیا محض درباری شان و شستگی کی پتلی نہ تھی بلکہ ایک ایسا فرد تھی جسے یہ علم ہو چکا تھا کہ زندگی کا اصل رس چاہے جانے کی آگہی میں ہے۔ اپنے تمام اعلیٰ مراتب کے باوجود سب سے پہلے تو وہ ایک عورت تھی اور اس کے نزدیک تمام طاقت و اختیار محض کھوکھلی اشیا ہیں اگر ان میں وہ آگہی نہ موجود ہو۔ اس کے قرب و جوار کے مرد' بے شک خود کو سیاسی اقتدار کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیں' مگر وہ دنیا کو مختلف طریقوں سے فتح کرنا چاہتی تھی۔ خالص نسائی ذرائع سے۔ اس کی جاننے والی بہت سی عورتوں نے سرمنڈا کے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ ایسی عورتوں کا صرف ٹھٹھہ ہی اڑا سکتی تھی

کہ عورت چاہے ترک دنیا کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ کہے وہ کبھی اپنی ملک اور اشیا سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ صرف مرد ہی حقیقی طور پر اپنی ملکیت کو چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جھیل کنارے کے بوڑھے پروہت نے زندگی کے ایک خاص مرحلہ پر عارضی دنیا اور اسکی مسرتوں سے کنارہ کر لیا تھا۔ شاہی گیشیا کی نظر میں وہ ان تمام معزز امرا سے بڑا مرد تھا جنہیں وہ اس دربار میں جانتی تھی۔ اور جس طرح اس نے اس عارضی دنیائے موجود کو ترک کیا تھا' بالکل اسی طرح اب وہ اس کی خاطر مستقبل کی اس دنیا کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔

گیشیا کنول کے مقدس پھول کو اپنے دھیان میں لائی جسکے گہرے اور واضح اثرات اس کے ذہن پر خود اس کے بچے عقیدے نے مرتسم کئے تھے۔ وہ دو سو پچاس یوجانہ چوڑے عظیم الجثہ کنول کے پھول کو اپنے تصور میں لائی۔ یہ فرق عادت پودا اس کے ظرف کے زیادہ نزدیک تھا بہ نسبت ان حقیر کنول کے پھولوں کے' جنہیں وہ دارالخلافہ کے تالابوں کی سطح پر تیرتا ہوا دیکھتی۔ رات کو جب وہ اپنے باغ کے درختوں میں ہوا گزرنے سے پیدا ہونے والی سائیں سائیں کی آواز سنتی تو اسے یہ صدا پوتر دھرتی کے مرصع درختوں میں سے معطر ہوا کے گزرنے سے پیدا ہونے والی نفیس و نازک موسیقی کے مقابلے میں انتہائی بے رنگ و بے ذائقہ لگتی۔ جب وہ آکاش میں لٹکے ہوئے عجیب و غریب آلات کے بارے میں سوچتی جو کسی پور کے لمس کے بغیر خود بخود بجتے ہیں تو اسے محل کے ہال کمروں میں بجنے والی بربط کی آوازوں کی گونج ایک ادنیٰ نقالی لگتی۔

اور شیگا کا مہا پروہت ایک جنگ لڑ رہا تھا وہ جنگ جو اس نے اپنی جوانی میں ہوا و ہوس کے خلاف شروع کی تھی' اس ناقابل شکست امید پر کہ وہ مستقبل کی پائیدار اور حقیقی دنیا میں تیرتا ہوا نکل جائے گا۔ لیکن پکی عمروں کی یہ جانکاہ لڑائی ایک ناقابل تلافی گھاٹے کے احساس سے سلسلے جوڑتی چلی گئی۔

شاہی گیشیا تک اپنی محبت کے پیغام پہنچانے کے کام کا ناممکن ہونا' اتنا ہی واضح تھا جیسے شفاف آسمان پر چمکتا ہوا سورج۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پوتر دھرتی کی جانب اس کا سفر بھی اس وقت تک ناممکن العمل ہے جب تک وہ محبت کے اس شکنجے میں جکڑا رہے گا۔

پروہت جو اب تک اسی شفاف اور آزاد ذہنی کیفیت میں رہ رہا تھا' جس کے ساتھ کسی طرح کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا ایک جھماکے کے ساتھ اتھاہ تاریکی میں گھر گیا تھا۔ اس کا مستقبل پورے طور پر دھندلا چکا تھا ہو سکتا ہے کہ جوانی میں کوئی ریاضت کی جرات اس خود اعتمادی اور تکبر سے پیدا ہوئی ہو کہ وہ رضا کارانہ طور پر ان لذتوں سے خود کو محروم رکھ رہا تھا جو اگر وہ چاہتا تو اس کی ہو سکتی تھیں۔

ہر اس پروہت کو پھر اپنی کڑی گرفت میں لے چکا تھا۔ جب تک شیگا جھیل کے کنارے وہ شاہی گاڑی نہ پہنچی تھی' وہ اس شے میں یقین رکھتا تھا جو خود اس کی منتظر تھی' بے حد قریب' اور جو آخر کار نروان کے حصول سے کمتر نہ تھی۔ لیکن اب دنیائے موجود کی اتھاہ تاریکی میں اس کی وحشت زدہ آنکھ کھلی تھی جہاں آگے بڑھ کر ایک قدم دیکھنا بھی محال تھا۔ اور کچھ پتہ نہ تھا کہ اسکی گھات میں آگے کیا ہے؟

مذہبی ارتکاز کی تمام مشقیں اور انکی سب صورتیں کار بے خیر ثابت ہوئیں۔ اس نے گل داؤدی' محیط گل اور اجزا پر استغراق کی مشقیں آزمائیں۔ مگر جب بھی اس کا خیال مرکوز ہونے لگتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے گیشیا کی من موہنی اور سندر شبیہ ابھر آتی۔ جل دھیان سے بھی کام نہ چلا کیونکہ ہر بار جھیل کی موجوں پر اس کا تمتماتا ہوا پیارا چہرہ جھلکتا۔

بلاشبہ یہ اسکی احمقانہ فریفتگی کا منطقی نتیجہ تھا۔ دھیان کی مشقوں سے پروہت کو بہت جلد معلوم ہو گیا' کسی فائدہ کی بجائے نقصان ہی ہوا تھا۔ اور پھر اس نے پراگندگی کی مشقوں کے ذریعے اپنی آتما کو غیر حساس کرنے کی کوشش کی۔ اسے بے حد اچنبھا ہوا کہ روحانی ارتکاز کا بالکل الٹ نتیجہ نکلا۔ وہ اپنے توہمات اور واہموں میں اور گہرا دھنستا گیا: لیکن اسے بہت جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ انتشاری طریقہ کا استعمال اور اسکی کوشش در حقیقت ان توہمات کو قبول کرنے کے مترادف تھا۔ جیسے ہی پروہت کی روح نے ہتھیار ڈالنا شروع کئے تو پروہت اس نے فیصلہ کیا کہ بچاؤ کی بے کار کاوشوں سے فرار ہی بہتر ہے اور اس نے ارادی طور پر گیشیا کی شبیہ پر اپنا تصور مرکوز کر دیا۔

مہا پروہت نے مختلف طریقوں اور انداز سے اس دیوی کی شبیہہ کی پوجا میں ایک نئی خوشی دریافت کی' بالکل جیسے وہ نمگیرہ اور مکت لئے مہاتما بدھ کے بت کی پرستش کرتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے اپنے پریتم کو ایک دور دنیا کے جگمگ کرتے ناممکن الحصول وجود میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور اس سے اسے عجیب طرح کی ایک لذت ملتی۔ مگر کیوں؟ بے شک اس کے لئے یہ بات زیادہ فطری ہوتی کہ وہ شاہی مہا گیشیا سے ایک عام عورت کی طرح آنکھیں چار کرتا' جو اس کے قریب بھی ہوتی اور جس میں عام بشری خطائیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں کم سے کم تخیل کی حد تک وہ اس سے مستفید ہو سکتا تھا۔ جب وہ اس سوال پر انتہائی استغراق کے عالم میں غور کر رہا تھا تو اس پر اس سچ کا سورج طلوع ہوا کہ شاہی مہا گیشیا میں وہ کسی گوشت پوست کی بنی مخلوق کا مشاہدہ نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی وہ کوئی سراب تھا بلکہ یہ تو حقیقت کی ایک رمز تھی اشیا کے جوہر کی علامت۔ بلاشبہ اس میں عجیب و غریب بات یہ تھی کہ اس جوہر کو عورت کے جسم کی شکل میں کھو جانا جائے۔ مگر بہر حال اسے تلاشنے کی وجہ کوئی دور از کارشے نہ تھی۔ کیونکہ اس محبت میں مبتلا ہونے کے باوجود شیگا کے اس مہمان پروہت نے دھیان کی مشقوں کی لمبے سالوں کی عادت ترک نہ کی تھی جس کے ذریعے وہ مسلسل تجرید کرتے ہوئے اشیا کے جوہر تک پہنچنے کی کوشش میں مگن رہتا تھا۔ "کائیوگوکو" کی گیشیا اب اس کے لئے دو سو پچاس یوجانہ قطر کے وسیع و عریض کنول کے پھول کی شبیہہ سے ہم آہنگ ہو چکی تھی اس سے جب وہ پانی پر کنول کے پھولوں کے سہارے بیٹھی ہوتی تو وہ سمیرو پہاڑ کیا بلکہ پوری کائنات سے زیادہ وسیع تھی۔

جتنا زیادہ پروہت اسے کسی ناممکن الحصول شے میں تبدیل کرتا چلا گیا اسی تناسب سے وہ مہاتما بدھ سے دور ہٹتا گیا اور اس محبت کا غیر ممکن ہونا نور سچائی کے غیر ممکن ہونے سے منسلک ہو تا گیا۔ فکری سطح پر وہ اپنی محبت کو جتنا زیادہ مایوس کن سمجھتا' ان سپنوں کی دنیا اسے اتنی ہی زیادہ تقویت دیتی اور وہ اپنے آلودہ خیالات میں پختہ تر ہو تا گیا۔ جب تک وہ اپنی محبت کو دور از کار طور پر ہی سہی' مگر کسی حد تک قابل حصول سمجھتا رہا' ایک مخمصانہ انداز میں وہ راضی رضا رہا۔ مگر اب جب کہ وہ گیشیا ایک مبالغہ آمیز اور وسیع وجود میں ڈھل گئی تو پروہت کی محبت ایک بے انت مگر ساکن جھیل کی مانند ہو گئی جو انتہائی مضبوطی اور سختی سے زمین کی ساری سطح کو ڈھانپ لیتی ہے۔

وہ پر امید تھا کہ کسی نہ کسی طور اسے پھر اس دیوی کے رخ انوار کا دیدار ہو گا مگر ایک اندیشہ اسے اندر ہی اندر گھول رہا تھا کہ جب وہ کنول کے پھول ایسی بے پایاں شبیہہ اس کے سامنے ظاہر ہو گی تو اپنا نشان پتہ چھوڑے بغیر تحلیل ہو جائے گی۔ اگر یہی کچھ ہونا ہے تو بلا شائبہ اسکی نجات تو ہو جائے گی۔ ہاں' اس بار وہ ہر حال میں اپنی مکتی کو پا لے گا۔ اور اس بات کے امکان سے ہی پروہت کا دل خوف و دہشت سے بھر جاتا۔ اسے ٹھنڈے

پسینے چھوٹنے لگتے۔ پروہت کی یکتا محبت نے عجیب و غریب اور خود فریبانہ حیلے تراشنے شروع کر دیئے۔ اور آخر کار جب اس نے گیشیا کے پاس جا کر اسے ملنے کا فیصلہ کیا تو وہ اس توہم کے زیر اثر تھا کہ اب اسے اس مرض سے تقریباً" نجات مل چکی ہے جو اس کے وجود کو بے طرح گھائل کر رہی تھی پروہت کا دماغ اس قدر مختل ہو چکا تھا کہ اس نے بلا تامل اس فیصلے سے پیدا ہونے والی طمانیت کو حتمی طور پر موجودہ جال سے رہائی سمجھا۔

شاہی گیشیا کے ملازمین کو بڈھے پروہت کی آمد سے قطعاً" کوئی اچنبھا نہ ہوا جو انتہائی خاموشی سے باغ کے ایک کونے میں اپنی لاٹھی پر جھکا ایک گمبھیر اداسی سے اس کی رہائش گاہ کی طرف نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ تپسوی اور فقیر اکثر اوقات دار الخلافہ کے محلات اور بنگلوں کے باہر دان کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ مہا گیشیا نے سرسری انداز میں جھلملی اٹھا کر باغ میں جھانکا۔ تازہ سبز پتوں کے پس منظر میں کھڑے پژمردہ اور اڑی ہوئی سیاہ رنگت کا جبہ پہنے' بوڑھے پروہت نے اسے دیکھ کر اپنا سر جھکا دیا۔ کچھ دیر تک وہ خاتون اسے تکتی رہی۔ جب ملیں کا شک یقین میں بدلا کہ یہ وہی پروہت تھا جسے اس نے شیگا جھیل کے کنارے دیکھا تھا تو اس کا زردایا چہرہ اور زرد ہو گیا۔

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے حکم دیا کہ باغ میں پروہت کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا جائے اس کے ملازمین اپنے سروں کو جھکا کر احکام بجالاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔

اسے پہلی بار اتنے شدید اضطراب کا تجربہ ہوا۔ اپنی زندگی میں اس نے بے شمار ایسے لوگ دیکھے تھے جنہوں نے دنیا تیاگ دی تھی مگر اس سے پہلے اس کی نگاہ کبھی ایسے شخص پر نہ پڑی تھی جس نے دنیائے حقیقت کو ترک کیا ہو۔ یہ منظر ناقابل بیان طور پر بھیانک اور ڈراؤنا تھا۔ اپنے تخیل میں پروہت کی محبت کے تصور سے حاصل ہونے والی ساری خوشی و سرشاری چشم زدن میں ہوا ہو گئی۔ اگر پروہت مستقبل کی دنیا اس کے لئے قربان کر بھی دے تو بھی' اب اسے پوری طرح احساس ہو چلا تھا کہ یہ اس تک منتقل کبھی نہ ہو گی۔

شاہی مہا گیشیا نے ایک نظر خوش قطع بھڑکیلے لباس اور خوبصورت مرمریں ہاتھوں پر ڈالی۔ اور پھر ایک نگاہ بڈھے پروہت کے بے ڈھنگے نقوش اور تار تار جبے پر ڈالی۔ ان دونوں میں کسی ناتے کے واقعہ میں ایک ہولناک دلکشی تھی۔

یہ سارا سلسلہ اس شاندار تصور سے کس قدر مختلف تھا۔ اور پروہت تو ایسا شخص لگ رہا تھا جو ابھی ابھی اور سیدھا نرگ سے لنگ مارتا ہوا نکلا ہو۔ ظاہری چج کے آدمی میں اب باقی کچھ نہ بچا تھا۔ پوتر دھرتی کی چمک دمک وہ اپنے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ نور جو اس کے وجود میں پنہاں تھا اور جو پوتر دھرت کی یاد دلاتا تھا کامل طور پر تباہ و معدوم ہو چکا تھا۔ اگرچہ بنا کوئی شک یہ وہی شخص تھا جو اس دن شیگا جھیل کنارے موجود تھا۔ مگر اب یہ وہی ہوتے بھی وہ نہ تھا۔

دربار کے دوسرے بہت سے افراد کی طرح شاہی گیشیا بھی اپنے جذبات کے خلاف ایک دفاعی حصار کھڑا رکھنا چاہتی تھی۔ خصوصاً" جب اس کا سامنا ایک ایسی شے سے ہو جو اسے بہت گہرے اور انوکھے انداز میں متاثر کر سکتی ہو۔ یہ سوچ کر اس کا دل بہت برا ہوا کہ جس عشق کامل کے سپنے وہ اب تک دیکھتی رہی تھی اتنی بے رنگ صورت میں ظاہر ہو گا۔

جب پروہت آخر کار اپنی لاٹھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا دار الخلافہ پہنچا تھا تو وہ اپنی تمام تر تکان اور کوفت قریب قریب بھول چکا تھا۔ چوری چھپے وہ "کائیوگوکو" میں واقع گیشیا کی رہائش گاہ سے متصل میدان تک پہنچا۔

اور باغ کے پار دیکھا کیا۔ ان جھلملیوں کے پیچھے اس کے خیال میں اس کی محبوب کے سوا کوئی اور نہ تھا۔
اب جبکہ اس کی محبت ایک معصوم صورت دھار چکی تھی۔ تو مستقبل کی دنیا نے پھر سے اس پر جادو جگانا شروع کر دیا اس سے پہلے اس نے پوتر دھرتی کے اس پہلو پر اتنی شدت سے کبھی دھیان نہ دیا تھا اور اس کے لئے اسکی چاہت تقریباً" ہوس انگیز بن چکی تھی' باقی کچھ نہ رہا تھا۔ ماسوا اس ظاہر کی رسم کے کہ وہ شاہی گیشبا سے ملے' اپنی محبت کا اظہار کرے اور سدا کے لئے ان آلودہ خیالات سے نجات پالے' جنہوں نے اسے دنیائے موجود سے باندھا ہوا تھا۔ کرنے کے لئے بس اب یہی کچھ تھا۔
اس کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ وہ اپنے بوڑھے وجود کو لاٹھی کے سہارے ایستادہ رکھے۔ مئی کے سورج کی شعاعیں پتوں سے چھنتی ہوئی اسکی چندیا پر تلملاتی رہیں۔ بار بار اسے لگتا جیسے وہ بے ہوش ہو رہا ہے' اور اس لاٹھی کے سہارے کے بغیر یقیناً" وہ گر پڑتا۔ اگر وہ خاتون اس صورتحال کو پوری طرح محسوس کرے اور اسے اندر بلا لے تو وہ اپنے فرض سے فارغ ہو جائے۔ مہا پروہت انتظار کرتا رہا۔ اپنی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تکان اور بے حالی کو لاٹھی کا سہارا دیتے ہوئے' وہ منتظر رہا۔ بالآخر شام کے بادلوں نے سورج کو مات دی اور ایک دھندلکا چھانے لگا۔ مگر ابھی تک اسے شاہی گیشبا سے اندر آنے کا کوئی اشارہ نہ ملا۔
بلاشبہ گیشبا کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ پروہت خود اس کے وسیلے اس سے پار اور ماورا پوتر دھرت میں جھانک رہا تھا۔ بار بار وہ جھلملی کو اٹھا کر باہر دیکھتی۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ بے حس و حرکت۔ باغ میں چراغ روشن ہونے لگے مگر پھر بھی وہ وہیں اور اسی طرح کھڑا رہا۔
خوف و دہشت نے شاہی گیشبا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسے لگا جیسے وہ باغ میں اس گہرے واہمہ کو مجسم شکل میں دیکھ رہی ہو جس کے بارے میں اس نے مقدس کتابوں میں درج منتروں میں پڑھ رکھا تھا نرگ میں گر پڑنے کا خوف اس پر حاوی ہو گیا اب جبکہ اس نے اتنے عالی مراتب اور نیک پروہت کو گمراہ کیا تھا تو وہ پوتر دھرت کی توقع کیسے کر سکتی تھی۔ بے شک پاتال ہی اس کا ٹھکانہ تھا جس کی تفصیلات اور جزئیات سے وہ اور اس کے تمام قریبی لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے جس الوہی محبت کے خواب دیکھے تھے وہ تو پہلے ہی بکھر چکے تھے۔ اس کا یوں چاہا جانا جیسی کہ وہ تھی بذات خود ازلی پھٹکار کی رمز تھی۔ جیسے مہا پروہت اسکے وسیلے اور اس سے ماورا پوتر دھرت کو دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح اب وہ پروہت کے ذریعے پاتال کی بدترین اور گہری دلدل میں مسلسل دھنستی جا رہی تھی۔
اس کے باوجود "کائیو گوکو" کی اس معزز خاتون میں اتنا غرور ضرور تھا کہ بے جگری سے مقابلہ کئے بغیر اپنے خوفوں کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس نے اپنی تمام جبلی کٹھور قوتوں کو مجتمع کیا۔ "مہا پروہت" اس نے اپنے آپ سے کہا' "جلد یا بدیر ختم ہو ہی جائے گا" اس نے یہ سوچتے ہوئے جھلملی کو اٹھا کر دیکھا کہ اب تک وہ یقیناً" زمین پر گر چکا ہو گا۔ اس کے غیض کو اور غضب دلانے کے لئے ایک خاموش ہیولہ ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا تھا۔
رات چھا گئی اور پورے چاند کی بھرپور چاندنی میں پروہت کے خطوط سفید چاک ایسی ہڈیوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ ڈر سے اسکی نیند ہوا ہو گئی۔ اس نے کھڑکی سے پردہ اٹھا کر باہر دیکھنا بند کر دیا۔ اور باغ کی جانب پشت کر لی۔ اس کے باوجود ہر لحظہ اسے مہا پروہت کی چیر کر اندر آتی ہوئی نگاہیں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

شاہی گیشیا نے پہلے سے کہیں زیادہ خلوص سے پوتر دھرت کے حصول کے لئے دعا کی۔ وہ اپنی ذاتی جنت کے لئے دعا گو تھی۔ ایک ایسی سورگ جو اس کے دل میں محفوظ و مامون تھی۔ یہ پروہت کی سورگ سے ایک مختلف سورگ تھی' اور نہ ہی اس کی محبت سے اس کا کوئی ناتہ یا بندھن تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اگر کبھی اس نے پروہت سے اسکا ذکر بھی کیا تو یہ فوراً" منہدم ہو جائے گی۔

"پروہت کی محبت کا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "مجھ سے کیا ناتہ" یہ ایک یک طرفہ سلسلہ تھا' جس میں اس کے جذبات اور احساسات کا کوئی دخل نہ تھا۔ اور اس کارن وہ پوتر دھرت سے محروم نہ کی جا سکتی تھی۔ چاہے پروہت مشتعل ہو کر گر ہی کیوں نہ جائے' اور مر بھی جائے۔ اسے کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ مگر جوں جوں رات بڑھتی گئی اور ہوا میں سرد ذائقے گھلے' تو اس کا یہ اعتماد بھی اسے دغا دینے لگا۔

پروہت ابھی تک باغ میں کھڑا تھا۔ مگر جب چاند کو بادلوں نے ڈھانپ لیا' تو وہ ایک عجیب و غریب ناہموار اور بل دار پیڑ لگنے لگا۔ "باہر کھڑی اس ہیئت کا مجھ سے کیا ناتہ" بے چینی اور اضطراب سے اپنے آپ سے باہر ہوتے ہوئے گیشیا نے سوچا' اور الفاظ اس کے دل میں تیزی سے گرجنے لگے۔ آخر یہ سب کچھ ہوا ہی کیونکر اور کیسے؟"

حیرت انگیز' کہ اس وقت مہا گیشیا نے اپنے بے پناہ حسن و جمال کو فراموش کر دیا تھا۔ یا پھر یہ کہنا زیادہ صحیح تھا کہ اس نے اپنے آپ کو یہ امر بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ بال آخر اتھاہ تاریک آسمان میں روشنی کے مدھم نشانات ابھرے۔ اور پروہت کا سراپا صبح کے سرمئی اجالے میں ظاہر ہوا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ مہا گیشیا اپنی بازی ہار چکی تھی۔ اس نے ایک ملازمہ کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ باغ سے پروہت کو لے آئے اور اس کی کھڑکی کے نیچے سہارا دے کر کھڑا کر دے۔

مہا پروہت فراموشی کی ان سرحدوں پر کھڑا تھا جب گوشت پوست بکھر جانے کو ہوتا ہے۔ اسے اب اس بات کا کوئی ہوش نہ تھا کہ اس وقت وہ وہاں اپنی محبوب کا منتظر تھا یا مستقبل کی اٹل دنیا کا۔ اگرچہ اس نے رہائش گاہ سے ملازمہ کے ہیولے کو ملگجے اندھیرے میں ڈوبے' باغ میں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا' مگر اسے قطعاً" محسوس نہ ہوا کہ وہ جس شے کے لئے وہاں منتظر کھڑا تھا۔ آخر کار اس سے محض دو ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔

ملازمہ نے اسے اپنی مالکہ کا پیغام پہنچا دیا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو پروہت کے منہ سے ایک خوفناک تقریباً" غیر انسانی چیخ نکلی۔ ملازمہ نے اسے سہارا دے کر لانے کی کوشش کی' مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اپنی محبوب کے دوارے پے تلے' حیرت انگیز طور پر ہموار اور مضبوط قدموں سے چلا۔

جھلملی کے دوسری جانب اندھیرا تھا۔ اور باہر سے خاتون کی صورت کو دیکھنا تقریباً" ناممکن تھا۔ پروہت اپنے قدموں پر جھک گیا۔ اور چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر وہ بے تحاشہ رو دیا۔ بغیر کوئی لفظ کہے وہ بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا اور اس کا جسم بید مجنوں کی طرح لرزتا رہا۔

پھر صبح کے ملگجے اندھیرے میں ایک خوبصورت مرمریں ہاتھ جھلملی کے نچلے حصے میں سے دھیرے دھیرے طلوع ہوا۔ شیگا مندر کے پروہت نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے اپنی پیشانی اور گالوں سے لگا کر دبانے لگا۔

"کائیو گوکو" کے دربار کی مہا گیشیا کو ایک عجیب یخ ہاتھ محسوس ہوا جو اس کے ہاتھوں کو مس کر رہا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک تپتی ہوئی نمی سے بھی آگاہ تھی۔ اس کے ہاتھوں پر کسی کے آنسوؤں سے بنی شبنم لرز رہی تھی۔ پھر جب صبح کی روشنی کی ہلکی زرد رو کرنیں جھلملی سے اندر آنے لگیں تو گیشیا کے پر شوق عقیدہ نے اسے ایک حیرت انگیز الہام کی برکھا میں شرابور کر دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ نامعلوم ہاتھ جو اسے چھو رہا تھا سوائے بدھ کے کوئی اور نہ ہو سکتا تھا۔

پھر ناری کے دل پر نئی عظیم الشان کہکشائیں اتریں۔ سورگ کی زمردیں دھرتی' سات زیوروں سے بنے لاکھوں بلند مینار' موسیقی بجاتے ہوئے فرشتے' روپہلی ریت کے کناروں والے سونا تالاب' جگمگ جگمگ کنول اور کالا ونکاس کے رسیلے نغمے۔ یہ سب نئے سرے سے پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ وہی پوتر دھرت تھی کہ جو اسے وراثت میں ملنا تھی اور جس پر اب اسے یقین کامل تھا تو وہ کیوں نہ مہا پروہت کی محبت کو قبول کر لے۔؟

وہ منتظر رہی کہ بدھ کے ہاتھوں والا مرد اسے وہ پردہ اٹھانے کو کہے کہ جو ان دونوں کو جدا کر رہا تھا۔ وہ اسے ابھی اس لمحہ کہے اور پھر وہ اس رکاوٹ کو ہٹا دے گی اور اس کا بے پناہ حسین جسم اس کے سامنے اسی طرح ظاہر ہو گا جیسے اس روز شیگا جھیل کے کنارے ہوا تھا' اور وہ اسے بلا تامل اندر آنے کی دعوت دے گی۔

مہا گیشیا منتظر رہی۔

مگر شیگا مندر کے پروہت نے ایک لفظ نہ کہا اس نے اسے کسی شے کے لئے نہ کہا کچھ دیر کے بعد اس کے بوڑھے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور ناری کے برف ایسے سفید ہاتھ جسم کے اجالے میں اکیلے رہ گئے پروہت لوٹ گیا۔ مہا گیشیا کے دل پر برف کی دبیز تہہ کا بوجھ بڑھتا چلا گیا۔

چند دنوں کے بعد دربار تک یہ خبر پہنچی کہ بالآخر مہا پروہت کی آتما نے شیگا میں واقع اپنی کٹیا میں نروان حاصل کر لیا۔ اس خبر کے ملنے پر "کائیو گوکو" کی مہا گیشیا نے اپنے خوبصورت خط میں' مقدس منتروں کے دیوان پر دیوان نقل کرنے شروع کر دیئے۔

اوتیا آؤسملیانی / خلیل باور

ریل سے نظارہ

میرا گھر ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ میری چاہت تھی کہ ریل گاڑی کا ڈرائیور بنوں۔ سترہ سال کی عمر میں انجن ڈرائیور کے ساتھ بطور مددگار کام شروع کیا اور اس دن سے آج تک ریل گاڑی میرا دوسرا گھر ہے۔
آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ریل گاڑی بھاگ دوڑ کے لئے بنی ہے۔ اس وقت اگر Khashuri پر ہے تو ایک گھنٹے کے بعد Moliti کے ڈھلانوں میں سے گزرتی ہو گی۔ آپ کے خیال میں وہ Zestophani میں ہو گی لیکن ممکن ہے کہ وہ ہوا کو چیرتی ہوئی کسی سرنگ میں سے نکلتی رہی ہو۔ چھک چھک کرتی ہوئی ایک پہاڑی کو عبور کر کے دوسری پہاڑی کی جانب اڑ رہی ہو۔ ریل' ہر سو بھاگنے والی کبھی نہ رکنے والی گاڑی۔
ہم ہر چھوٹے اسٹیشن پر لمحہ بھر کے لئے رک جاتے ہیں۔ اسٹیشن کے قریب چرنے والے سفید دھبوں سے مزین بیل خوف کے مارے کھائیوں کو عبور کرتے ہوئے پہاڑیوں کے اندر چھپ جاتے ہیں۔
ہم مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارا اژدھا ہوا سے ٹکراتے' سرسراتے ہوئے اپنی لمبی دم کو کھینچ رہا تھا۔ میں اندر کھڑا پیچھا کرنے والی بگھیوں کو اتنا ہلکا محسوس کر رہا تھا جیسے خود ان سب کو کھینچ رہا ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ اس طرح تو میں اپنے اسٹیشن کو بھی کھینچ سکتا ہوں اور کسی پہاڑی کو بھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس وقت پہلے دریا کو بھی روکنے کی ہمت مجھ میں ہو۔ اگر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاؤں تو آسمان کو بھی ایک ہاتھ پر اٹھا لوں۔ اس وقت پوری دنیا میرے لئے کستوری کی مانند تھی۔
انجن ایک لمبی قطار کو کھینچتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا' میں نے وسل کارڈ دبایا تو انجن نے جواباً" ایک افسردہ چیخ ماری جس سے ہر جاندار خوفزدہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے اوپر کی طرف نکلے۔ بچوں نے کانوں میں انگلیاں دیں۔ جانوروں کے بچے لپک لپک کر آنکھوں سے اوجھل ہوئے۔ قریب بندھی ہوئی بکریاں رسی کی لمبائی تک بھاگ سکیں اور انجن ان سب سے بے نیاز پلوں پر سے کڑکڑ کرتا ہوا وادیوں میں سے گزرتا آگے بڑھا۔

دیہات' دریا' میدان' انگور کے باغات' شاہ بلوط اور چنار..... مرد عورت' زمین آسمان سب کے سب میری دسترس میں تھے۔

پل تجھے سلام!
ہلو بچو!
انگور کے بیل اور چنار تمہیں سلام!
پہاڑیو!
لوگو! تم سب کو بھی سلام!

نزدیکی پہاڑی کے ساتھ ایک مکان نظر آیا۔ لکڑی کا بنا ہوا بغیر باڑھ کا مکان۔ مکان کی کھڑکی میں سے سرخ رنگ کی کوئی چیز نظر آئی۔ یہ کیا ہو سکتی ہے؟ پہاڑی اونچی ہوتی جا رہی تھی اور مکان پیچھے اوجھل ہو تا گیا۔ پہلے کمرہ پھر کھڑکی اور پھر پورا مکان۔ بلیک بیری کے درخت جس پر سبز رنگت غالب تھی ہمارے اتنے قریب تھے کہ ان تک میرا ہاتھ آسانی سے پہنچ رہا تھا۔

بلیک بیری تمہیں سلام!

پہاڑی پھر آہستہ آہستہ نیچے کو بیٹھتی گئی اور مکان بھی آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگا..... اب مکان کو پورا دیکھ سکتا تھا' کھڑکی کھلی ہوئی تھی' ایک لڑکی کھڑکی کے کنارے سرخ لباس میں لپٹی ہوئی ہاتھ میں نیلی جلد والی کتاب پکڑے بیٹھی تھی۔

ہیلو!

میں نے ہاتھ ہلا کر لڑکی کو محبت بھری مسکراہٹ دی لڑکی نے کتاب والا ہاتھ ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا اور مسکراتی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکی اور دوبارہ ہاتھ ہلایا۔

گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی مکان ایک دم گزر گیا۔ لڑکی نے بھی آنکھوں سے اوجھل ہونا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ بالکونی کی طرف نکل گئی۔ کونے والے ستون سے لپٹ کر آگے کی طرف جھک گئی اور میری طرف ہاتھ اٹھا کر ہلاتی رہی۔ ٹرین برابر آگے بڑھتی گئی۔

خدا حافظ!

ریل پہاڑی کے نکلے ہوئے حصے پر چکر کاٹ رہی تھی جس کی وجہ سے لڑکی چھپتی گئی۔ پہلے لڑکی پھر مکان اور آخر میں آنگن..... میں پنجوں پر کھڑے اسے ایک بار پھر دیکھنے کے لئے پیچھے مڑا۔ گاڑی بہت جلدی میں تھی۔ سو سو کرتی ہوئی بہت سے مکانوں' پلوں' دریاؤں اور درختوں میں سے گزر گئی۔

ہم ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی کی رفتار کم ہوئی مگر دوبارہ تیز ہوئی' اور تیز ہوتی گئی۔ اونچے پہاڑ' گہری وادیاں' جھاگ بھری ندیاں.... ہاتھوں کا ہلانا' مویشیوں کا بدحواس ہونا' دل کش سبز گھاس سے ڈھکے ہوئے ڈھلان' خوبصورت پھولوں سے لدے ہوئے مرغزار۔

سورج غروب ہو رہا تھا' رات کی سیاہی بڑھ رہی تھی۔ بھاری بھرکم ٹینک کھینچتی ہوئی ٹرین پٹڑیوں کو روند رہی تھی۔ پٹڑی بھی اندھیرے میں غائب ہوتی جا رہی تھی۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ نہ جانے کون تھا' کیا تھا؟ بس وہاں تک پہنچنا چاہ رہا تھا' لیکن مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اب اندھیرا ہو جائے گا۔ کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی۔ یہاں اسٹیشن تھا' پتھر تھے لیکن سب بے جان۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا' بے جان پتھر پیچھے دوڑتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو رہے تھے۔ پہاڑیاں' مکانات' آنگن اور کھلی کھڑکیاں سب کچھ۔ یہ ڈھلان اس وادی کا خوبصورت ڈھلان تھا' اور اب تو خوبصورت ترین' پھولوں سے بھرا ہوا ناقابل فراموش۔ پٹڑی کے ساتھ سبزہ زار میں ایک آنگن تھا۔ قریب میں اس جیسا کوئی آنگن نہ تھا' نہ اس جیسا مکان' نہ کھڑکی۔

میں نے اٹھ کر ویسل کارڈ دبایا۔ گاڑی چیخ اٹھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ ہلائے اس توقع سے کہ لڑکی کہیں آنگن میں ہو گی اور مجھے دیکھ لے گی۔ وہ اندر بچھڑے کو سبز گھاس کھلا رہی تھی' گاڑی کی پکار سنتے ہی پیچھے مڑی اور مڑتے ہی دونوں ہاتھ ہلانے لگی جبکہ گھاس ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھی۔ گاڑی سائیں سائیں اور کڑکڑ کرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک

پہاڑی حائل ہوئی اور بلیک بیری کے درخت جو بالکل قریب تھے۔

یہ دن بھی انتہا کو پہنچا۔ میں ایک روشن ماحول والے دفتر میں داخل ہوا۔ کوئی شخص اندھیرے میں چل رہا تھا۔ جسے میں کھڑکی کے شیشے میں دیکھ سکتا تھا۔ کیا یہ میں ہوں؟ اتنا دھواں آلود؟ میں نے ایک احمقانہ قہقہہ لگایا۔ کھڑکی کے شیشے میں صرف اپنے دانت دیکھ سکا تھا اور کچھ نہیں۔ کیا میں ہمیشہ اتنا میلا ہوتا ہوں۔ کیا میرے چہرے پر اتنا دھواں جما ہوا ہے کہ دانتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا؟ کیا کوئی لڑکی مجھ سے ملنا پسند کرے گی؟..... جب سے گھر پہنچا ہوں میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکا۔

اگلے روز پھر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا۔ تمام مسافر اپنے اپنے معاملات میں مصروف تھے۔ بکنگ سٹال پر کافی رش تھا۔ گاڑی کا انجن آگے پیچھے کھسک رہا تھا۔ بھاری جسامت والا اسٹیشن ماسٹر جو سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گیا۔ وقت مشکل سے گزر رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی جیسے ڈائل کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔

اسی دوران انجینئر بھی نظر آیا۔ اس کے آنے سے میں کھل اٹھا اور آخر کار گاڑی نے بھی اپنے لمبے سفر کا آغاز کیا' جو آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی تیز ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر تیز سے تیز تر ہو گئی۔ پھر معمول کے مطابق زبان درازی اور کھلبلی پر آ گئی۔ درخت' پہاڑیاں' ندی' نالیاں' دریا' جانور' بچے' ٹیلی فون کے کھمبے اور باغات------

پھر گھر' اسٹیشن' پہاڑ' پل اور پھول ..... میں گاڑی کے ساتھ اپنی نظریں دوڑانے کی سخت کوشش کرتا رہا' جبکہ مجھے اندازہ تھا کہ ڈھلان' پہاڑی' مکان' کھڑکی ابھی کافی آگے ہیں' لیکن بار بار ایسا محسوس ہوتا کہ اب یہ پہاڑی سلسلہ ختم ہو گا تو سب کچھ نظر آجائے گا' بس اس موڑ کے گزر جانے کے بعد...... ایک سلسلہ ختم ہوا' دوسرا شروع ہوا' وہ ختم ہوا' تیسرا' چوتھا.......

آف۔ آخر کار اس ڈھلان پر بھی پہنچ گیا۔ وہی مکان' وہی کمرہ' وہی کھڑکی اور وہی سرخ لباس۔ کیا یہ وہی؟ ہاں' ہاں یہ وہی ہے' لیکن پھر وہی پہاڑی پہاڑی حائل ہوئی۔ وہی بلیک بیری کے درخت' جسے میں تقریباً" چھو سکتا تھا اور پھر دوبارہ وہی سب کچھ۔ مگر وہ لڑکی کہاں ہے؟ دیکھا تو سفید رومال ہاتھ میں لئے بالکونی میں انتظار کر رہی تھی۔ اس نے خوش آمدید کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا اور میں نے بھی جوابا"۔

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سفید دانتوں کا کیا تاثر لے رہی ہے۔ میں اپنی ٹوپی اتار کر ہلانے لگا' گاڑی تیزی سے چل رہی تھی اور بگھیاں ان کے پیچھے۔ لڑکی ستون سے لپٹی ہوئی ہاتھ ہلاتی رہی۔

گاڑی مزید آگے بڑھی۔

خدا حافظ محبوبہ!

واپسی پر پھر اس ستون سے چپکی ہوئی بایاں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس مرتبہ کوئی سبز رنگ کی شے ہاتھ میں تھی' شاید رومال تھا۔

دن یہ دن گزرتے گئے' صبح پھر کھڑکی کھلی تھی وہ میرے انتظار میں تھی' شام کو بھی میرا انتظار کرتی رہی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے خوش آمدید کہتی تھی' ستون سے لپٹتی' مسکراتی اور رومال ہلاتی۔

گاڑی نے اپنی سرسراہٹ اور چمک میں مزید زور پیدا کیا۔ زرد پتے گر رہے تھے اور ریل کی ہوا انہیں گھما رہی تھی۔

جو منظر انہوں نے دیکھا ان کے لئے حیران کن اور بالکل بعید از قیاس تھا۔ جدھر نگاہ ڈالتے آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے یا دھوئیں کے بادل، لمبی گھاس جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ درخت سلگ رہے تھے۔ دور دور تک جہاں نظر جاتی تھی آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

جین چیخنے اور رونے لگی......

جمی بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ وہ بڑا تھا' لیکن تھا تو بچہ ہی۔ اس کا اپنا دل خوف سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی رونا اور چیخنا چاہتا تھا' لیکن ضبط کیے رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے اس کی بہن کو بہت تکلیف ہوگی۔

اس نے اپنی بہن کا بازو پکڑا اور پھر دونوں آگ اور دھوئیں سے بچتے بچاتے کھنڈر کے علاقے سے باہر نکلے۔ جب وہ سڑک کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا سڑک میں کئی جگہ بڑے بڑے گڑھے پڑے ہیں اور ان میں سے دھواں اب تک اٹھ رہا تھا...... دراصل ان کا پورا قصبہ ہی آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔

جین نے آہستہ سے کہا' "جمی یہ کیا ہوا"

"جنگ .... دشمن کے ہوائی جہاز......." جمی کی آواز بوجھل تھی۔

"ممی ..... ڈیڈی ...." جین نے سسکی لی اور پھر یکدم رک کر زارو قطار رونے لگی......

جمی کا اپنا دل رو رہا تھا.... اس نے آہستہ سے کہا:

"جین گھر چلتے ہیں...... رونا بری بات ہے.... ہمت سے کام لو۔"

قصبہ تباہی اور بربادی کا ایک ایسا منظر پیش کر رہا تھا جس کا تصور بھی وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہر مکان جل رہا تھا یا دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے تھے کہ موت نے انہیں آلیا۔

بچوں کے پارک کے قریب پہنچ کر دونوں کے قدم گویا زمین میں گڑ گئے پارک ایک ایسے زخمی مریض کی طرح تھا جس کے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ پارک اجڑ گیا۔ درخت جھلسے ہوئے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ پھول نظر نہیں آرہے تھے۔ کیاریاں گڑھوں میں بدل گئی تھیں۔ گھاس جھلس گئی تھی۔ انہوں نے بہت سے کھلونے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھے' ادھ جلے ... اور مسخ ... جین نے دل ہلا دینے والی چیخ ماری......

جمی نے اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی طرف دیکھا' پھر ادھر دیکھنے لگا جدھر جین کی نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔

دو تین بچے مردہ پڑے تھے' ان کے جسم کے کئی اعضا کٹ کر ادھر ادھر گرے ہوئے تھے۔

جمی سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اب وہ بھی زارو قطار رونے لگا۔

چند منٹوں کے بعد اس نے جین کا بازو پھر تھاما.... وہ چل دیئے.....

ان کا اپنا محلہ تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انہونی کے ہونے کے تصور نے بچوں کے چہرے کا رنگ دودھ کی طرح سفید کر دیا۔

وہ اپنے تباہ شدہ گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

چھتیں گری ہوئی تھیں۔ دیواریں زمیں بوس تھیں۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ جمی تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔

جین اس کے پیچھے لپکی۔

اس آنگن میں ایک خطرناک کتا بھی تھا' لڑکی مجھے دیکھ کر حواس باختہ دوڑتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی
اندر تشریف لائیں!
تم کیسی ہو مایا!
میں آپ کو نہیں جانتی۔
نہیں جانتی؟
نہیں۔ تم کون ہو؟
میں ..... میں .... تم نہیں .... میں ویسے ہی یہاں سے گزر رہا تھا' تو پانی پینے کی غرض سے آپ کی طرف آیا۔
پانی؟ ہاں آپ تشریف لائیے۔
میں معذرت کئے بغیر اندر داخل ہوا' وہاں کی ہر چیز مانوس لگ رہی تھی اور مجھے کہہ رہی تھی کہ معذرت کی ضرورت نہیں۔
میں ایک منٹ میں آپ کے لئے ٹھنڈا پانی لے آتی ہوں' وہ دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی' اور ایک جگ اٹھا کر واپس نکل آئی۔ وہ پانی کے لئے روانہ ہوئی کہ ..... کہیں دور ہلکا سا دھواں نمودار ہوا۔ گاڑی کسی گہری کھائی میں سرسر کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ لڑکی مجھے بھول گئی' پانی اور اپنی میزبانی کو بھی۔ گاڑی مسلسل چھک چھک کرتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔
وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھی۔ کھڑکی کھولی پھر بالکونی کی طرف گئی ایک قدم آگے بڑھایا اور گاڑی کے آنے تک راہ تکتی رہی۔ گاڑی پہنچ تو گئی مگر صرف ایک جھلک نظر آئی' کیونکہ اوپر کو اٹھتی ہوئی پہاڑی درمیان میں حائل ہوئی اور بلیک بیری کے درخت جو ہاتھ کی رسائی کے فاصلے پر تھے۔
گاڑی حسب معمول دوبارہ نظر آئی' لڑکی دوڑتی ہوئی اندر آئی اور ایک سفید رومال اٹھا کر نکل گئی' پھر دونوں ہاتھ ہلانے کے لئے اٹھائے' مگر اس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح نہیں ہل سکے اور واپس نیچے ہو گئے۔ انجن ڈرائیور کھڑکی کے ساتھ سر لگائے ہوئے میدانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ہر آدمی کی سوچ الگ ہی ہوتی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ سے رومال گر گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ غالباً" سرہانے کے نیچے سر دبا کر رو رہی تھی۔ میں نے رونے کی آواز سنی تو بہت احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے آنگن سے باہر نکل گیا۔ اس کو خبر کئے بغیر پہاڑی سے جلدی جلدی اترا۔ گاڑی کا انتظار کئے بغیر پاسنگ کار لے کر سیدھا اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا اور اسٹیشن پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سے کسی تمہید کے بغیر کہا "میں اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے واپس اپنی ڈیوٹی پر آنا چاہتا ہوں.........."

جرمن گراؤنڈ/ ستار طاہر

سہاروں کے پیوند

گھر جل چکا تھا اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔
جب قصبہ پر حملہ ہوا تو وہ دونوں بھائی بہن اپنے گھر سے پون میل کے فاصلے پر پرانے باغ کے کھنڈر میں کھیل رہے تھے۔
جمی اور جین کی یہ محبوب جگہ تھی۔ جب بھی انہیں فرصت ملتی کھیلنے کو جی چاہتا تو دونوں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشارہ کرتے پھر اپنی ممی سے کہتے' ممی ہم کھیلنے جا رہے ہیں؟
"کہاں جاتے ہو تم کھیلنے؟" ان کی ممی پوچھتی "سامنے والے پارک میں تو تم دکھائی نہیں دیتے۔"
جمی ہنس کر سر کو جھٹکا دیتا اور کہتا:
"ممی: ہم نے ایک خفیہ جگہ ڈھونڈ رکھی ہے۔ یہ ہمارا راز ہے۔"
جین بھی ہنسنے لگتی۔ ممی انہیں ہنستے مسکراتے دیکھ کر خوش ہو جاتیں اور یہ پوچھنا بھول جاتیں کہ آخر وہ کہاں کھیلنے جاتے ہیں۔
پون میل دور پرانا باغ تھا جو اجاڑ پڑا تھا۔ چند ایک درخت تھے جو سوکھ چکے تھے۔ وہاں لمبی لمبی جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک بوسیدہ پرانی عمارت تھی جو اب کھنڈر کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ویسے بھی جب قصبے کے باغ میں ہرے بھرے پارک ہوں اور ان میں جھولے اور دلچسپی کے دوسرے سامان ہوں تو اس ویران اور دور جگہ پر آنے کی کسی کو کیا ضرورت تھی۔ یہ جگہ جمی کی دریافت تھی اور اس میں کوئی راز کی بات بھی ضرور تھی۔

دونوں بہن بھائی آٹھ اور سات برس کی عمر کے تھے ایک ساتھ اسکول جاتے۔ اسکول میں تو ان کے اپنے اپنے دوست تھے لیکن سکول کے باہر انہوں نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ بہن بھائی کو ایک دوسرے سے اتنی محبت تھی کہ وہ کسی دوسرے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے' اسی لئے اسکول سے آ کر وہ خود ہی کھیلتے رہتے۔ پارک جاتے تو وہاں بھی دوسرے بچوں سے الگ تھلگ ہی رہتے۔
ایک دن جب جین کی طبیعت کچھ خراب تھی اور جمی کو اکیلے اسکول جانا پڑا اس کا جی اپنی بہن کے بغیر بہت اداس تھا۔ اسکول میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ اس نے استاد سے چھٹی لے کر گھر کا رخ کیا۔ بے خیالی میں وہ گھر کی طرف آنے والے راستے کے بجائے کسی دوسرے راستے پر چلنے لگا۔ اسے اپنی بھول کا احساس اس وقت ہوا جب وہ اس کھنڈر کے قریب پہنچ چکا تھا۔
معصوم تجسس اور اشتیاق کی وجہ سے اس نے یہ جگہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ لنڈ منڈ درخت' لمبی لمبی جنگلی گھاس' ٹوٹی پھوٹی عمارت اور گہری خاموشی نے اسے پہلے تو خاصا خوفزدہ کر دیا لیکن جلد ہی اسے یہ جگہ بہت

پرسکون اور اچھی محسوس ہونے لگی۔ گھر آیا تو اسے مسرت تھی کہ اس نے ایک نئی پرسکون جگہ دریافت کی ہے۔
دو دن بعد وہ جین کو بھی یہاں لے آیا اور اسے بھی یہ جگہ بہت اچھی لگی۔
اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ وہ کھیلنے کے لئے یہاں آجاتے۔ وہ اسے اپنی خفیہ جگہ' قرار دیتے تھے۔ ان کی ممی اور ڈیڈی بھی ان سے پوچھتے تو وہ بات ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ آج تک انہوں نے اپنے والدین کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں کھیلنے جاتے ہیں۔
جین اور جمی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جنگ عظیم اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ اب ان کا ملک جرمنی ہارنے لگا ہے اور مختلف محاذوں پر جرمنی کو شکست ہو رہی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی قلت کا بھی انہیں پورا احساس ہو چکا تھا تاہم وہ ہر بچے کی طرح سمجھتے تھے کہ جنگ ان کے قصبے سے بہت دور لڑی جا رہی ہے اور ان کا قصبہ پوری طرح محفوظ ہے۔
اس روز وہ صبح ناشتے کے بعد کچھ دیر تو گھر کے کام کاج میں مصروف رہے۔ اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی۔ ان کے ڈیڈی بھی گھر پر تھے۔ جب ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ جین اور جمی نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ دونوں کھنڈر اپنی خفیہ جگہ پر کھیلنے کے لئے ذہنی طور پر فیصلہ کر چکے تھے۔
"ہم کھیلنے جا رہے ہیں"۔ جمی نے اعلان کیا۔
"اپنی خفیہ جگہ جا رہے ہو۔" ممی نے جملہ کسا۔
"ہاں ممی" جمی اور جین نے قہقہہ لگایا۔
"سنو۔ جلدی آجانا....." ان کے ڈیڈی نے کہا۔ "دوپہر کے بعد ہمیں تمہارے انکل کے ہاں جانا ہے۔"
"ہم ایک بجے تک آجائیں گے۔"
یہ کہہ کر دونوں بہن بھائی ہنستے ہوئے گھر سے نکل گئے۔

کھنڈر کے ایک کمرے میں انہوں نے اپنے کچھ کھلونے' کچھ کتابیں چھپا رکھی تھیں۔ کھنڈر میں پہنچ کر انہوں نے کھلونے نکالے اور ان سے کھیلنے لگے۔ یہاں دونوں بچے اپنے آپ کو بے حد مسرور اور آزاد محسوس کرتے تھے۔ ان کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ جب ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوا تو یکایک آسمان گرجنے لگا اور زمین کانپنے لگی۔ دونوں بہن بھائی سہم گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھنڈر کے کمرے سے بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔
آسمان پر ہوائی جہاز اڑ رہے تھے اور ابھی وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ ہی رہے تھے کہ آسمان سے بم برسنے لگے۔ خوفناک دھماکوں سے دونوں بچے لرز اٹھے۔ جین تو ڈر کے مارے چیخنے لگی۔
جمی نے اس کا بازو پکڑا اور تیزی سے کھنڈر کے اندر لے گیا۔ وہاں دونوں بہن بھائی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔
باہر دھماکے ہوتے رہے۔ تڑ تڑ گولیاں برستی رہیں اور دھڑ دھڑ چیزوں کے جلنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک یہی کیفیت رہی..... اور پھر یکدم سناٹا چھا گیا.......

جمی نے جین کو سہارا دے کر اٹھایا اور بازو پکڑے وہ کھنڈر کے کمرے سے باہر نکلے....

جو منظر انہوں نے دیکھا ان کے لئے حیران کن اور بالکل بعید از قیاس تھا۔ جدھر نگاہ ڈالتے آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے یا دھوئیں کے بادل، لمبی گھاس جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ درخت سلگ رہے تھے۔ دور دور تک جہاں نظر جاتی تھی آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

جین چیخنے اور رونے لگی......

جمی بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ وہ بڑا تھا، لیکن تھا تو بچہ ہی۔ اس کا اپنا دل خوف سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی رونا اور چیخنا چاہتا تھا، لیکن ضبط کیے رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس سے اس کی بہن کو بہت تکلیف ہو گی۔

اس نے اپنی بہن کا بازو پکڑا اور پھر دونوں آگ اور دھوئیں سے بچتے بچاتے کھنڈر کے علاقے سے باہر نکلے۔ جب وہ سڑک کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا سڑک میں کئی جگہ بڑے بڑے گڑھے پڑے ہیں اور ان میں سے دھواں اب تک اٹھ رہا تھا...... دراصل ان کا پورا قصبہ ہی آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔

جین نے آہستہ سے کہا، "جمی یہ کیا ہوا"

"جنگ........ دشمن کے ہوائی جہاز......" جمی کی آواز بوجھل تھی۔

"ممی..... ڈیڈی...." جین نے سسکی لی اور پھر یکدم رک کر زار و قطار رونے لگی......

جمی کا اپنا دل رو رہا تھا.... اس نے آہستہ سے کہا:

"جین گھر چلتے ہیں...... رونا بری بات ہے.... ہمت سے کام لو۔"

قصبہ تباہی اور بربادی کا ایک ایسا منظر پیش کر رہا تھا جس کا تصور بھی وہ کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہر مکان جل رہا تھا یا دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے تھے کہ موت نے انہیں آلیا۔

بچوں کے پارک کے قریب پہنچ کر دونوں کے قدم گویا زمین میں گڑ گئے پارک ایک ایسے زخمی مریض کی طرح تھا جس کے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ پارک اجڑ گیا۔ درخت جھلسے ہوئے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ پھول نظر نہیں آ رہے تھے۔ کیاریاں گڑھوں میں بدل گئی تھیں ۔ گھاس جھلس گئی تھی۔ انہوں نے بہت سے کھلونے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھے، ادھ جلے ... اور مسخ ... جین نے دل ہلا دینے والی چیخ ماری......

جمی نے اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی طرف دیکھا، پھر ادھر دیکھنے لگا جدھر جین کی نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔

دو تین بچے مردہ پڑے تھے، ان کے جسم کے کئی اعضا کٹ کر ادھر ادھر گرے ہوئے تھے۔

جمی سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اب وہ بھی زار و قطار رونے لگا۔

چند منٹوں کے بعد اس نے جین کا بازو پھر تھاما.... وہ چل دیئے.....

ان کا اپنا محلہ تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انہونی کے ہونے کے تصور نے بچوں کے چہرے کا رنگ دودھ کی طرح سفید کر دیا۔

وہ اپنے تباہ شدہ گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

چھتیں گری ہوئی تھیں۔ دیواریں زمیں بوس تھیں۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ جمی تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔

جین اس کے پیچھے لپکی۔

دونوں چیخ رہے تھے۔ آوازیں دے رہے تھے' پکار رہے تھے:

ممی... ڈیڈی..... ممی.... ڈیڈی...."

وہ پکارتے رہے' روتے رہے' چیختے رہے پھر ایک ادھ گری دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کانپتے اور آنسو بہاتے رہے.....

دونوں کے معصوم ذہنوں نے تلخ اور لرزا دینے والی حقیقت کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں دیوار کے ساتھ کھڑے کھڑے آنسو بہاتے سسکتے ہوئے تھک گئے تو اسی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے......

کئی گھنٹے دونوں خاموش بیٹھے رہے خاموشی سے آنسو بہاتے رہے۔ وقت اپنی معینہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا.... وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کوئی مدد کے لئے آئے گا..... کوئی ضرور آئے گا۔ .... وہ نہیں جانتے تھے کہ جنگ ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جرمنی شکست سے دوچار ہو چکا تھا۔ ان کی مدد کے لئے کوئی بھی نہیں آنے والا تھا۔

جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو جمی نے جین کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی......

دونوں کے چہروں پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ چلنے لگے۔ جین کو کچھ علم نہ تھا کہ جمی اسے کہاں لئے جا رہا ہے۔ خود جمی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ کدھر جائیں گے....... قصبے کے بازار میں ہر دکان جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

جمی نے شدید بھوک محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی اس کا معصوم دل درد سے بھر گیا کہ اس کی چھوٹی بہن کو بھی بڑی بھوک لگی ہو گی........

اس نے گری پڑی دکانوں کو دیکھا جو ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں اور ان سے دھواں اٹھ رہا تھا.......

پورا قصبہ مر چکا تھا......

اس پورے قصبے میں ان آٹھ اور سات برس کے بچوں کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہ تھا.......

جین لڑکھڑا رہی تھی۔ بھوک اور غم کی شدت نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔

جمی کے ذہن میں ایک خیال آیا.......

دس کلومیٹر کے فاصلے پر نیو گرٹ نامی قصبہ ہے.... وہیں سے کچھ کھانے پینے کو مل سکتا ہے...... وہیں سے مدد مل سکتی ہے۔

دوسرے لمحے اس نے سوچا کیا جین دس کلومیٹر پیدل چل سکے گی......

"جین تم یہاں رکو۔" اس نے ایک کونے میں جین کو بٹھاتے ہوئے کہا" میں ابھی آتا ہوں"

جین سے کچھ بولا نہ گیا۔ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا کر اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

جمی بھاگا...... بازار میں اس کے قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا.... گھبرایا ہوا...... سہا ہوا دوڑتا رہا۔ ایک دو بار اس نے پلٹ کر اپنی بہن کی طرف دیکھا جو تاریکی میں گھل مل گئی تھی...

اولموس کی دکان کے سامنے وہ رکا۔ یہ سائیکلوں کی دکان تھی۔ کرائے پر بھی سائیکل ملتے تھے۔ دکان کے باہر اسے کئی سائیکل مڑے تڑے ادھر ادھر بکھرے اور گرے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے انہیں بڑے غور سے دیکھا

اور پھر سائیکل اٹھا اٹھا کر انہیں دیکھنے اور نیچے پھینکنے لگا۔ بالآخر ان سائیکلوں میں اسے ایک سائیکل اپنی مرضی کا مل ہی گیا۔

بے اختیار پہلی بار مسکراہٹ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ مسکراہٹ اداسی میں تبدیلی ہو گئی۔

اس نے سائیکل کو پھر اچھی طرح جانچا اور پھر اس پر سوار ہو گیا....

جب وہ اس جگہ کے قریب پہنچا۔ جہاں وہ جین کو چھوڑ کر گیا تھا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پہلی نظر میں اسے جین دکھائی ہی نہیں دی' پھر اس نے دیکھا کہ جین زمین پر پڑی ہے۔

"دیکھو میں سائیکل لے آیا ہوں' ہمیں یہاں سے جانا ہے.... قصبہ تباہ ہو چکا..... ہم نیو گرٹ جا رہے ہیں۔ یاد ہے آج ڈیڈی نے کہا تھا' ہمیں نیو گرٹ انکل کے ہاں جانا ہے' ہو سکتا ہے کہ ممی اور ڈیڈی بھی وہاں ہوں۔"

یہ جملہ اس کی زبان سے نکلا تو وہ زارو قطار رونے لگا۔

"آؤ جین سائیکل پر بیٹھو.... ہم نیو گرٹ جا رہے ہیں۔"

"وہ کچھ نہیں بول سکنے کی سی کیفیت میں مشینی گڑیا کی طرح رکتے رکتے قدم اٹھاتے سائیکل کے قریب پہنچی۔ جمی نے اسے سہارا دے کر سائیکل پر بٹھایا اور پھر خود بھی سائیکل پر بیٹھ کر پیڈل مارنے لگا۔

قصبے کے سنسان دھواں اگلتے بازار سے گزرتے ہوئے جمی کو وہ کہانیاں یاد آگئیں جن میں جن شہروں اور بستیوں پر قابض ہوتے ہیں تو شہر اور قصبے ویران ہو جاتے ہیں۔

قصبے کے باہر جانے والی سڑک پر اسے خاص طور پر بڑی احتیاط سے سائیکل چلانی پڑی۔ سڑک پر گڑھے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کو گھورتا تھا۔ سائیکل کے ساتھ لیمپ نہیں تھا کہ اس کی روشنی کی رہنمائی کر سکتی۔ جب وہ قصبے سے باہر نکل آئے تو ہوا کی ٹھنڈک نے اسے کپکپا دیا۔ ہوا دھوئیں کے بوجھ سے آزاد ہو رہی تھی.... اس نے آہستہ سے جین کو پکارا۔

"جین ---- کوئی بات کرو..... بولو.... ہم انکل کے ہاں جا رہے ہیں"

جین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ بھوک صدمے خوف اور جانے کیسے کیسے خیالات نے جمی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ سائیکل چلاتے چلاتے وہ ہانپنے لگا' کمزوری کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ گر جائے گا۔ پیاس سے اس کا برا حال ہو رہا تھا......

کم سن آٹھ سال کے جمی نے اپنے آپ سے کہا'

"ہمارے والدین مر چکے ہیں۔ اب میں زندہ ہوں اور میری بہن ... میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔ میں ہمت سے کام لوں گا۔"

راستہ تاریک تھا۔ اسی راستے پر کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ ہنستے کھیلتے انکل سے ملنے نیو گرٹ جایا کرتے تھے۔ بس میں وہ کتنی شرارتیں کرتے اور قہقہے لگایا کرتے تھے' لیکن آج......

جمی کا دل بھر آیا لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالا دیتے اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا......

جین خاموش بیٹھی تھی......

نو ساڑھے نو کلومیٹر کا فاصلہ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ جب وہ نیو گرٹ کے قرب وجوار میں پہنچے تو جمی کا دل ڈوب گیا۔

قصبہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا......

اپنے تھکے ہوئے وجود اپنی خاموش بہن اور سائیکل کو گھسیٹتے ہوئے وہ کسی طرح اپنے انکل کے مکان کے سامنے جا پہنچا......

مکان کیا۔۔۔ پورا علاقہ اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے سائیکل روکی۔ بڑی محبت اور احتیاط سے جین کو اتار کر سائیکل ایک طرف کھڑی کی...... اور اپنے انکل کے مکان کو گھورتا رہا......

مکان کا بیرونی گیٹ بند تھا۔ اس میں تالا لٹک رہا تھا۔ جین سے کچھ کہے بغیر وہ آس پاس کے مکانوں کی طرف بھاگا... سب کے بیرونی دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھاگتا ہوا آخری سرے تک جا نکلا۔

ہر مکان مُقفل تھا...... ہر مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہر جگہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر گھر پر چپ کے پہرے لگے تھے......

کسی انسان کے وجود کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

سب کہاں چلے گئے تھے... کیوں چلے گئے تھے... اس نے واپس آکر جین کو دیکھا وہ اکڑوں بیٹھی تاریکی کو گھور رہی تھی۔

جمی کے چھوٹے ذہن نے فوراً ایک فیصلہ کر لیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اینٹ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے بیرونی گیٹ کے دروازے کے قفل پر اس سے ضرب لگانی شروع کر دی۔

تالا ٹوٹ گیا...... اندر کے دروازے کے تالے کے ساتھ بھی اسے یہی سلوک کرنا پڑا...... اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر جانے کیوں اس کے دل میں خیال آیا کہ روشنی صرف اندر کے کمرے کی جلانی چاہئیے... باہر کی روشنیاں گل رہیں تو اچھا ہے۔ اندر کے کمرے کی روشنی جلا کر وہ باہر آیا۔ ایک ہاتھ میں جین کو سہارا دیا' دوسرے ہاتھ سے سائیکل پکڑا اندر آکر سائیکل ایک دیوار سے کھڑا کر دیا' پھر جین کو سہارا دے کر اندر کمرے میں لے گیا۔ اسے وہاں صوفے پر لٹایا اور واپس آکر پہلے بیرونی دروازہ اندر سے بند کیا' پھر اندرونی دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اس کے بعد اسے میز پر رکھا ٹیبل لیمپ نظر آیا۔ جمی نے جلدی جلدی کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے کھینچے اور پھر جلتی بتی بجھا کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔

جین نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

جمی کا بدن دکھ رہا تھا۔ بھوک سے سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ دودھ کا ایک پیکٹ دیکھ کر گویا اس کی جان میں جان آگئی۔ بسکٹوں کا ایک ڈبہ بھی مل گیا۔ ایک الماری میں کافی چینی کے علاوہ مچھلی اور اچار کے دو چار بند ڈبے دیکھ کر اس کی ساری تھکن جاتی رہی۔

ایک گلاس میں دودھ بھر کر بسکٹ طشتری میں رکھ کر وہ جین کے پاس آیا۔

نیوگرٹ میں اس کے انکل اور آنٹی کا گھر ان کی عدم موجودگی میں بھی ان کی میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا......

جین کی آنکھوں میں دودھ اور بسکٹ دیکھ کر چمک پیدا ہوئی......

اور پھر وہ خاموشی سے دودھ پینے اور بسکٹ کھانے لگی......

جب وہ بسکٹ کھا چکی اور دودھ پی چکی تو خاموشی سے صوفے پر لیٹ گئی۔

جمی نے باورچی خانے میں جا کر دودھ پیا اور کچھ بسکٹ کھائے۔
جب وہ واپس اس کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ جین گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ دوسرے صوفے پر لیٹ گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ کب اس کی آنکھ لگی اور وہ بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح جب جمی کی آنکھ کھلی تو وہ خود کچھ دیر سراسیمگی اور حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ کہاں ہے؟
جب اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ نیو گرٹ میں اپنے انکل کے گھر ہے تو اس کے ساتھ ہی جیسے سارے زخموں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔
سامنے صوفے پر گہری نیند سوئی ہوئی جین کو دیکھ کر اس کا دل غم سے بوجھل ہو گیا.....
وہ کم سن تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی' لیکن آلام و مصائب کے چند گھنٹوں نے اسے کھینچ تان کر بڑا کر دیا تھا۔ اس کی سوچ پختہ ہو گئی تھی۔
نیو گرٹ وہ انکل کے ہاں پناہ لینے آئے تھے لیکن انکل کا گھرانہ یہاں سے جا چکا تھا۔ جمی کے معصوم ذہن نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ چونکہ گرٹ سلامت ہے کوئی مکان تباہ نہیں ہوا اور گھروں کو تالے لگے ہوئے ہیں اس لئے لوگ یقیناً" دشمن کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔
جمی اپنی زندگی کا مقصد متعین کر چکا تھا۔
اسے اپنی بہن کی حفاظت اور پرورش کرنی تھی۔ اسے اپنے اور اپنی بہن کے لئے کوئی محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ یہاں نیو گرٹ میں وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ دشمن کی فوجیں کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتی تھیں۔
جین نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔ جب اس کی نگاہ جمی پر پڑی تو وہ یکدم صوفے سے اٹھی اور اپنے بھائی سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگی۔ کل کی سکتے کی کیفیت سے وہ نکل چکی تھی۔ اس کے ذہن نے بھی حقائق کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔
بہن بھائی بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔
نیو گرٹ ویران پڑا تھا۔ دونوں پہلے تو پیدل چلتے رہے۔ پھر قصبے سے باہر نکل کر کھانے پینے کی چیزوں کا موٹی بیگ سائیکل کے کیریئر پر رکھ کر جین کو سوار کر کے جمی سائیکل چلانے لگا۔
نیو گرٹ سے چھبیس کلومیٹر کے فاصلے پر شوانزٹ نامی ایک ریلوے اسٹیشن اور بڑا قصبہ تھا۔ اب یہی ان کی منزل تھی.....
وہ صبح نو بجے کے لگ بھگ روانہ ہوئے تھے۔ ساڑھے دس بجے وہ راستے میں ستانے کے لئے رک گئے۔ جمی تو رکنا نہیں چاہتا تھا' لیکن جین کا اصرار تھا کہ وہ ستا لے ورنہ وہ تھک جائے گا۔
وہ پھر سائیکل پر اپنی بہن کو سوار کئے سائیکل چلانے لگا۔۔۔۔ وہ شوانزٹ سے چند میل کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ایک فوجی گاڑی ان کے پیچھے سے آئی اور ان کے قریب آ کر رک گئی......
وہ دونوں سائیکل سے گرتے گرتے بچے۔
ایک امریکی افسر گاڑی سے باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر تجسس واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں پوچھا .... کون ..... کدھر.....
جمی نے ان سے اپنے قصبے کی تباہی اور اپنے والدین کی موت کا ذکر کیا تو فوجی افسر نے اپنا سر جھکا لیا۔ فوجی

گاڑی میں سوار دوسرے امریکی سپاہی بھی ان بچوں کو اب دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"اب کدھر......"

"شوانزٹ" جی نے جواب دیا۔

"تم ...... وہاں کیا کرو گے؟"

"ہم اپنے انکل کو ڈھونڈنے چلے ہیں۔"

امریکی فوجی افسر کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شش وپنج میں جتلا ہے۔ فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ وہ بوجھل لہجے میں بولا:

"ہمارے ساتھ چلو.... گاؤں میں.... ہم تمہارے انکل کو ڈھونڈیں گے۔"

"سچ آپ ہمارے انکل کو ڈھونڈ لیں گے۔" جین بے اختیار بولی۔

"ہاں.... ہم ان کا پتہ ... آسانی سے چلا لیں گے"

چند منٹوں کے بعد ان کا سائیکل فوجی گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ دونوں بہن بھائی فوجی گاڑی میں سوار تھے۔ امریکن فوجی افسر نے انہیں بسکٹ دیے۔

شوانزٹ پہنچے تو اچانک جی نے کہا

"ہمیں آپ یہاں اتار دیں؟"

مگر..... کیوں ... ہم میونخ جا رہے ہیں .... وہاں ہم تمہارے انکل .... ڈھونڈیں گے .... نہ ملے تو ہم تمہارا کوئی انتظام ....."

"شکریہ"۔ جی نے بڑوں کی طرح کہا۔ "انکل تو .... شوانزٹ ہی میں ہوں گے۔"

فوجی افسر نے سپاہی کو اشارہ کیا انہوں نے سائیکل اتار کر نیچے رکھ دیا۔

جین اور جی نے امریکی فوجی افسر سے ہاتھ ملائے .... فوجی گاڑی میں سوار امریکی افسر دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔

شوانزٹ میں انسانوں کا ہجوم تھا۔ آس پاس کے قصبوں کے لوگ بھی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ لوگ کھانے پینے کی چیزوں کے لئے ترس رہے تھے۔ فاتح اتحادی فوجوں کے یونٹ لوگوں کی تلاشی لیتے، جانچ پڑتال کرتے، مفرور جرمن فوجیوں اور جنگی مجرموں کی ٹوہ میں رہتے۔

تباہ حال اور خالی ہونے والے قصبوں کے لوگ کیمپوں میں جمع تھے۔ جی کا دل جانے کیوں گواہی دیتا تھا کہ اس کے انکل شوانزٹ ہی میں ہوں گے لیکن ہزاروں انسانوں میں جو کئی کیمپوں میں پھیلے ہوئے تھے، انکل کی تلاش آسان نہ تھی۔

یہ مشکل جلد ہی آسان ہو گئی۔

ہر شخص افراتفری میں اپنی ہی ضرورتوں کی فکر میں گھلا جا رہا تھا۔ کوئی کسی سے بات کرنے کے لئے بھی چند منٹ نکالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ایسے خود غرض انسانوں کے ہجوم میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک بوڑھے جرمن نے ان دونوں بچوں کو حیران و پریشان دیکھا تو خود ان کے پاس پہنچا۔ ان کا احوال بڑی محبت اور ہمدردی سے پوچھا اور سب کچھ سننے کے بعد اس نے پہلے تو جی کو اس کی ہمت کی داد دی، اس کے بعد بولا:

"ہر کیمپ میں ایک دفتر معلومات ہے جہاں سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کر دیا جاتا ہے چلو میں تمہارے

ساتھ چلتا ہوں"

تین کیمپ تھے اور ان میں تین دفاتر معلومات تھے۔ تینوں دفاتر سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرا دیا گیا۔ دوپہر سے سہ پہر ہوئی اور پھر شام .... لیکن جمی اور جین کے انکل کا کوئی اتہ پتہ نہ ملا۔ بوڑھا جرمن ان کے ساتھ رہا ایک پل کے لئے بھی ادھر ادھر نہ ہوا......

"بچو میرا خیال ہے کہ تمہارے انکل یہاں نہیں ہیں اب کیا ارادہ ہے۔"

جمی اور جین کے چہرے پر گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

بوڑھے جرمن نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"میرے دو بیٹے تھے۔ دونوں جنگ میں کام آئے۔ ایک بیٹا شادی شدہ تھا۔ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بس تمہاری ہی عمر کے ہوں گے۔ دشمن نے بمباری کی تو میری بہو اور پوتا پوتی بھی مارے گئے۔ میری بیوی مدت ہوئی مر چکی ہے۔ میں اکیلا رہ گیا...."

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے کہا:

"کیا تم میرے پوتا پوتی بننا پسند کرو گے؟"

دونوں بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بوڑھے جرمن کی طرف .... اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بیک وقت بوڑھے جرمن کے ساتھ لپٹ گئے..... تینوں بہت روئے۔ تینوں کو سہارے کی ضرورت تھی..... جب آنسو تھمے تو پھر تینوں بے اختیار مسکرانے لگے۔ ان کی مسکراہٹیں سچی اور بے ریا تھیں۔

چودہ برس بعد میونخ ٹائمز میں جمی نے دوسری جنگ عظیم اور بچپن کے واقعات پر ایک فیچر لکھا۔ اس وقت جمی اس اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے لکھا......

"جین ڈاکٹر بن چکی ہے۔ میں ایک صحافی اور قلمکار ہوں... میں اپنے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ لکھتا اگر ہمارے دادا جان کا انتقال نہ ہوا ہوتا۔ چند دن پہلے وہ اس دنیا سے سدھار گئے۔ انہوں نے ہمیں ایک دادا کی طرح ہی پالا۔ ہماری ہر ضرورت پوری کی۔ کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ ہم ان کے سگے نہیں ہیں۔ جب وہ بہت خوش ہوتے تو کہا کرتے "پوتی ملی ... پوتا ملا..... مجھے انہی سہاروں کی ضرورت تھی ....."

"آج میں ان کی عظیم شخصیت کو صرف ایک جملے میں خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں.....

"جب خود غرضی کی لہر نے پورے جرمنی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا تو ہمارے دادا جان نے ہمارے ہاتھ تھامے اور ہمارا حقیقی سہارا بن گئے۔ ہم ان کے لئے کیا سہارا بن سکتے تھے وہ ہمارے لئے سہارا بنے تھے۔"

یوحان کی موت کے بعد اس کی وصیت پڑھی گئی تو لکھا تھا:

"اپنی پوری جائیداد میں جمی اور جین کو دیتا ہوں۔ میں ایک ایسا بوڑھا تھا جس کا دل زندگی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اگر یہ دونوں بچے مجھے اپنا سہارا دے کر دادا نہ مانتے تو میں یہ سطور کبھی نہ لکھتا۔ میں اتنا مایوس تھا کہ جس روز مجھے یہ بچے شوازنٹ میں ملے' اس روز اگر یہ مجھے نہ ملتے' میرا سہارا نہ بنتے تو میں خودکشی کا پختہ ارادہ کر چکا ہوتا۔ ان معصوم بچوں نے میرا سہارا بن کر مجھے نئی زندگی دی تھی....."

هنرخ بول / سید عاصم محمود

یہ میرا چہرہ ہے

میں بندرگاہ کے کنارے کھڑا ان سمندری پرندوں کو دیکھ رہا تھا جو بار بار پانی میں غوطہ لگا کر اپنے جسم کو بھگو رہے تھے اور پھر پروں سے پانی جھاڑتے انہیں پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کے پروں سے پانی کے قطرے یوں ٹپک رہے تھے جیسے پھول پر شبنم ٹپکتی ہے۔ میں ان کا یہ کھیل دیکھنے میں محو تھا۔ میری نگاہیں شاید اس منظر کے علاوہ کوئی اور چیز دیکھنا پسند نہیں کر رہی تھیں۔ سمندر کے پانی پر بکھرے ہوئے تیل نے سطح کو اور زیادہ چمکیلا اور گہرا بنا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت اردگرد کوئی بھی جہاز موجود نہیں تھا۔ بندرگاہ پر موجود زنگ آلود کرینیں خاموش سی دھتکاری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ساحل پر موجود عمارتیں بھی بالکل سنسان تھیں۔ ان کی ویرانی کا یہ عالم تھا کہ چوہے بھی ان میں داخل ہوتے ہوئے شاید گھبراتے ہوں گے۔ اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس ساحل میں غیر ملکی جہازوں کی آمد و رفت ممنوع ہے۔

اچانک ایک پرندہ غوطہ لگا کر پھڑپھڑاتا ہوا اڑا اور پھر ہوا میں غوطہ لگا کر سمندر میں آگرا۔ اس نے ایک بار پھر پانی میں گردن تک غوطہ لگایا اور پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے' ہولے ہولے تولتے ہوئے دوبارہ پرواز کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے پانی سے چھیڑ چھاڑ میں لطف آرہا ہے۔ میں نے جب اسے ہوا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے محبوب کو تلاش کر رہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس وقت اسے اپنے محبوب سے زیادہ شکار کی تلاش تھی۔ اسی لئے تو وہ پانی کی اوپر نیچے ہوتی ہوئی تیز و تند لہروں کی پرواہ کئے بغیر اپنا جسم ان کے سپرد کر کے شکار کی جستجو کر رہا تھا۔ جب تک سانس اس کے ساتھ رہتی وہ پانی میں گردن ڈالے رکھتا لیکن اس کی چونچ شکار سے محروم رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ مایوس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کاش اس وقت میرے پاس ڈبل روٹی کا ٹکڑا ہوتا تو میں اس طرح اسے تھکنے تڑپنے اور بھٹکنے نہ دیتا۔ میں روٹی کے ٹکڑے اسے ڈالتا رہتا اور یوں پانی کی سطح پر اس کے کھیل میں خود بھی شریک ہو جاتا۔

لیکن اس وقت میرے پاس ڈبل روٹی کا ایک بھی ٹکڑا موجود نہیں تھا۔ میں تو خود بھوک سے بے تاب اور پرندوں کی طرح بے بس تھا۔ میں نے اپنی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور اپنی خواہش دل ہی میں دبا کر بیٹھ گیا۔

اچانک کسی نے میرے کاندھے پر زور سے ہاتھ رکھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ پولیس کا سپاہی تھا۔

مجھے اس کی یہ دخل اندازی ناگوار محسوس ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کے مضبوط ہاتھ کو جھٹک کر ایک بار پھر معصوم پرندے کو تکنے لگوں۔ اس وقت تک جب تک اس کی چونچ میں خوراک کا کوئی ٹکڑا نہ آجائے۔ لیکن اب تو میں خود سپاہی کے مضبوط ہاتھوں میں شکار کی طرح پھنسا ہوا تھا۔

"کامریڈ" اس نے میرے کاندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی سر۔" میں نے عاجزی سے جواب دیا

"سر یہاں سر نہیں چلتا۔ "سب لوگ کامرڈ ہیں۔ سپاہی کی آواز میں طنز نمایاں تھا۔
"تو پھر۔ پھر آپ نے مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے۔ "کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟"
"وہ مسکرا کر بولا" "جرم" تم اداس نظر آ رہے ہو۔"
میں اس کی بات سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔
"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" سپاہی کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔
میں سوچنے لگا شاید وہ اس وقت بوریت محسوس کر رہا ہے۔ اور شاید اسی لئے غصے میں بھی ہے۔ آج شاید سمندر کے کنارے اسے کوئی شکار ہاتھ نہیں آیا۔ نہ کوئی طوائف نہ کوئی مدہوش شرابی اور نہ جیب کترا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ واقعی وہ اس وقت شدید طیش میں ہے اور مجھے اپنا شکار بنانا چاہ رہا ہے۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی بڑھایا اور مجھے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس وقت میری حالت اس پرندے کی طرح تھی جو جال میں پھنس کر پھڑپھڑا رہا ہو۔ میں نے سپاہی کی گرفت میں پھنسے پھنسے صاف و شفاف فضا کا جائزہ لیا' سمندر کو اپنی نگاہوں میں سمویا اور اپنے شکاری کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کی گرفت میں آنے کا مطلب ہے کہ اب طویل عرصے کے لئے مجھے تاریکی میں دھکیل دیا جائے گا۔ اور یہ تو سمندر میں ڈوب جانے سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ جیل کا خیال آتے ہی میں ایک دم اپنے خیالات سے باہر نکل آیا۔
میں ہکلاتے ہوئے بڑبڑایا "جناب میرا قصور کیا ہے؟"
"قصور ----- اس ملک کا قانون یہ کہتا ہے کہ ہر شخص ہروقت خوش خوش نظر آئے۔"
لیکن میں تو بہت خوش ہوں۔ "میں نے پوری گرم جوشی سے جواب دیا۔"
"بالکل غلط۔"
لیکن میں تو ملک کے اس قانون سے ناواقف ہوں۔
"کیوں کیا تم نے سنا نہیں؟ اس قانون کا اعلان چھتیس گھنٹے پہلے کیا جا چکا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد ہر اعلان قانون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"
لیکن ----- لیکن میں تو اس اعلان کے بارے میں ابھی سن رہا ہوں۔"
"یہ اعلان تو ملک کے سب اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں پر اعلان ہو چکا ہے ---- ان چھتیس گھنٹوں میں تم کہاں تھے؟"
وہ اب بھی مجھے اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ میں سردی کی وجہ سے بری طرح ٹھر رہا تھا اور بھوک الگ ستائے جا رہی تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ میری داڑھی بھی خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ اور اعلان کے مطابق ہر شخص کو صاف ستھرا لباس پہن کر ہنستے مسکراتے ہوئے نظر آنا چاہیے۔
تو یہ تھا میرا جرم۔ "جب ہم پولیس سٹیشن کی طرف جا رہے تھے تو مجھے محسوس ہونے لگا جیسے راہ میں چلتے ہوئے ہر شخص نے خوشی کا نقلی چہرہ لگا رکھا ہے۔ جیسے ہی کوئی ہمیں دیکھتا تو رک جاتا۔ سپاہی اس کے کان میں کچھ کہتا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا۔ حالانکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر کوئی بولایا بولایا پھر رہا ہے۔ ہر کوئی دن بھر کام کاج کرنے کے بعد جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا ہے۔ ہمارے راستے سے گزرنے والا ہر شخص ہم سے بچ کر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ کہیں سپاہی کی تیز نگاہیں اس کے اصلی چہرے کو نہ پہچان لیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر کوئی پولیس والے کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک چوک پر ہماری مڈبھیڑ ایک ضعیف سے شخص سے ہوئی جو چہرے مہرے سے سکول ماسٹر دکھائی دیتا تھا۔ ہم اس کے اتنے نزدیک پہنچ گئے کہ وہ بچ کر نہیں نکل سکا۔ قانون کے مطابق اس نے بڑے احترام سے سلام کیا اور میرے منہ پر تین بار تھوکتے ہوئے کہنے لگا "غدار کہیں کا"

اس کی اس حرکت سے قانون کا فرض تو پورا ہو گیا لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے اس فرض کی ادائیگی سے اس کا گلا سوکھ گیا ہے۔

میں نے آستین سے تھوک کو پونچھنے کی کوشش کی تو ایک دم میری پیٹھ پر زوردار گھونسا پڑا اور سپاہی غرا کر بولا "قدم بڑھاؤ۔"

میں نے اپنی سزا کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا۔

سکول ماسٹر تیز ڈگ بھرتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب راستہ بالکل صاف تھا۔ کیونکہ ہر راہگیر ہم سے کترا کر نکلنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

ہم چلتے چلتے اس جگہ آن پہنچے جہاں مجھ سے تفتیش کی جانی تھی۔ اچانک اسی وقت بگل بج اٹھا۔ جس کا مطلب تھا کہ سب مزدور اپنے اپنے کام چھوڑ دیں اور نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوش خوش نظر آئیں۔ قانون کے مطابق فیکٹری سے باہر جاتے ہوئے ہر مزدور خوش باش نظر آ رہا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ وہ کام سے چھٹکارا پا کر خوش ہو رہے ہیں۔

میری خوش نصیبی کہ بگل دس منٹ پہلے بجا دیا گیا۔ اور یہ دس منٹ مزدوروں نے ہاتھ منہ دھونے میں صرف کئے۔ ورنہ میں جس مزدور کے سامنے سے گزرتا وہ قانون کے مطابق میرے چہرے پر تین مرتبہ تھوکتا۔

مجھے جس عمارت میں لے جایا گیا وہ سرخ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ دو سپاہی دروازے پر پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے بھی قانون کے مطابق میری پیٹھ پر بندوقوں کے بٹ رسید کئے۔ اس عمارت کے اندر ایک وسیع میز بچھی ہوئی تھی جس پر ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میز کے پاس ہی دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

مجھے کمرے کے عین وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔ میز کے قریب ہی ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اور شخص خاموشی سے اندر آ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سادہ لباس میں ملبوس تھا۔ جب کہ دوسرا فوجی لباس پہنے ہوئے تھا۔

اب مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"ایک عام کامریڈ ہوں۔"

"تاریخ پیدائش؟"

"یکم جنوری ۱۹۰۱ء"

"تم یہاں کیا کرتے رہے ہو؟"

"جی میں ایک جیل میں بند تھا"

میرا جواب سن کر وہ دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔

"کس جیل میں"

"جیل نمبر ۱۲۔ کوٹھری نمبر ۱۳۔ میں کل ہی رہا ہوا ہوں۔"

"رہائی نامہ کہاں ہے؟"

میں نے جیب سے رہائی نامہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہارے خلاف جرم کیا تھا؟"

"جی میں اس دن خوش خوش نظر آ رہا تھا۔"

وہ دونوں دوبارہ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

"کھل کر بتاؤ؟"

"اس دن ایک بہت بڑا سرکاری افسر فوت ہو گیا تھا۔۔۔ حکومت نے اعلان کیا کہ سب لوگوں کو سوگ میں شریک ہونا ہے۔ مجھے اس افسر سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے الگ تھلگ رہا۔ ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا اور یہ بیان دیا کہ میں سوگ کرنے والوں سے الگ تھلگ خوشیاں منا رہا تھا۔ اسی لئے مجھے سزا سنا دی گئی۔"

"کتنے برس؟"

"پانچ برس۔"

جب میری پوچھ گچھ ختم ہو گئی تو اچانک دو سپاہی اندر آئے اور مارنے پیٹنے لگے۔ مجھے جلد ہی فیصلہ سنا دیا گیا۔

مجھے دس برس قید کی سزا ہو چکی تھی۔۔۔ جی ہاں خوشی سے کھلا ہوا چہرہ میرے لئے پانچ برس قید کا موجب بنا اور اب میرے ماتمی چہرے نے مجھے دس برس کی سزا دلوا دی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں رہا ہو کر باہر آؤں گا تو شاید میں چہرے سے محروم ہوں گا۔ میرا کوئی چہرہ نہیں ہو گا۔ نہ ہشاش بشاش اور نہ اداس و غمگین۔

جورنسٹین جورنسن / ستار طاہر

باپ

(اس انسانی المیہ کی کہانی جب جوان بیٹے کے لاشے کو باپ اپنے بازوؤں میں اٹھاتا ہے)

وہ اپنے علاقے کا سب سے امیر اور بارسوخ آدمی تھا۔ اس کا نام تھورڈا دود آس تھا ایک دن وہ پادری کے ہاں پہنچا اور کہا کہ اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا ہے اور وہ اس کا بپتسمہ کرانا چاہتا ہے۔ پادری نے بچے کے نام کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا۔ اس کا نام میں اپنے باپ کے نام پر فن رکھ رہا ہوں' دوسری ضروری باتوں کے بعد جب پادری نے پوچھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے تو اس دہقان تھورڈ نے کہا۔ میری خواہش ہے کہ میں اسے خود بپتسمہ دوں۔ پادری کو قدرے تعجب ہوا لیکن اس نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے آنے والے ہفتہ کا دن طے کر لیا۔ جب وہ جانے لگا تو پادری نے پھر پوچھا کوئی اور بات دھقان تھورڈ نے اپنی مڑی تڑی ٹوپی اٹھائی اور چلنے لگا تو پادری نے اس کا بازو پکڑ کر کہا میری خدا سے دعا ہے کہ وہ تمہارے بیٹے کو فضل و کرم سے نوازے۔"

سولہ برس کے بعد ایک دن پھر دہقان تھورڈ پادری کے ہاں پہنچا۔ پادری اسے دیکھ کر حیران رہ گیا زمانے کی گردش نے تھورڈ کی صحت پر رتی بھر اثر نہ ڈالا تھا۔ وہ سولہ برس پہلے جیسا ہشاش بشاش اور صحت مند تھا۔ پادری نے کہا "تمہاری صحت تو قابل رشک ہے ہمیں بھی تو بتاؤ اس کا راز کیا ہے؟ تھورڈ نے جواب دیا جناب اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پادری یہ جواب سن کر خاموش رہا پھر بولا' اچھا تو پھر آج کیسے آئے ہو؟

کل میرا بیٹا امتحان پاس کر رہا ہے۔ اس کو سند ملے گی"

ہاں وہ بڑا ذہین لڑکا ہے پادری نے اعتراف کیا۔

میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس کے لئے دعا کیجئے کہ وہ گرجے میں اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ وہ سب سے بہتر ہے اول....

یہی میں نے سنا تھا۔ یہ دس ڈالر کی رقم ہے۔ نذرانہ....

پادری نے اس سے پوچھا کوئی اور بات۔ تھورڈ نے کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے چل دیا۔ آٹھ برس گزر گئے کہ پادری نے اپنے مطالعہ کے کمرے کے باہر لوگوں کا شور سنا۔ پادری نے دیکھا تو تھورڈ کئی آدمیوں کے ساتھ ادھر آرہا ہے۔ تھورڈ سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔ پادری نے اسے پہچان کر کہا "کہو آج کیسے آنا ہوا" تھورڈ نے کہا' میرے بیٹے کی شادی کیرن سے ہو رہی ہے وہ اس وقت میرے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے۔

خوب وہ تو اس علاقے کی سب سے دولت مند لڑکی ہے۔

ہاں لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ دہقان تھورڈ نے کہا' پادری نے ضابطہ کے مطابق ہونے والی شادی کا اندراج رجسٹر میں کیا۔ جن لوگوں کے دستخط کرائے تھے ان سے دستخط کرائے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو تھورڈ نے تین ڈالر پادری کی میز پر رکھ دیئے۔ اس وقت میرے پاس اتنی ہی رقم ہے پادری نے رقم اٹھائی اور بولا تھورڈ تم تین دفعہ یہاں آئے ہو اور تینوں بار اپنے بیٹے کے لئے آئے ہو تھورڈ مسکرایا اور پھر الوداع کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

پندرہ دن کے بعد باپ اور بیٹا کشتی کو کھینچتے ہوئے سٹور لاڈی شادی کے انتظامات کے لئے جا رہے تھے۔

"کشتی کا یہ تختہ ٹیڑھا ہے بیٹے نے باپ سے کہا اور یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو کر اس تختے کو سیدھا کرنے لگا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لمحہ وہ تختہ اس کے قدموں کے نیچے سے ہل گیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے چیخ ماری اور پھر پانی میں گر گیا۔ چپو کو مضبوطی سے پکڑلو باپ نے اسکی طرف چپو بڑھاتے ہوئے چیخ کر کہا۔ لیکن بیٹا چپو تک نہ پہنچ سکا۔ میں ابھی تمہارے پاس آتا ہوں۔ حوصلہ رکھو باپ نے یہ کہہ کر کشتی کا رخ اسکی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ جس طرف بیٹا پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور پھر جب تک کہ باپ اسکی مدد کو پہنچا بیٹا پانی میں ڈوب چکا تھا۔ تھورڈ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اپنی کشتی کو روکے وہاں دیکھتا رہا جہاں اس کا بیٹا ڈوبا تھا جیسے اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا پانی کی تہہ سے نکل کر پانی کی سطح پر ضرور آئے گا لیکن وہاں پانی میں کچھ دیر تک بلبلے بنتے رہے پھر پانی کی سطح شیشے کی طرح چمکدار اور ہموار ہو گئی۔

لوگوں نے دیکھا کہ تین دن اور تین راتیں .... بغیر کچھ کھائے پیئے اور پلک جھپکے بغیر وہ جھیل کے اس حصہ میں کشتی دھکیلتا رہا جہاں اس کا بیٹا ڈوبا تھا اس نے جھیل کو چھان مارا اور پھر اسے اپنے بیٹے کی لاش مل گئی۔ اس لاش کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے وہ اپنے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

اس واقعہ کے ایک برس بعد موسم خزاں کی ایک تاریک شام کو پادری نے اپنے دروازے کے سامنے کی راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی - پادری باہر نکلا اس نے ایک لمبے اور دبلے آدمی کو دیکھا جس کی کمر جھک گئی تھی اور بال سفید تھے۔ پادری کو اسے پہچاننے میں کافی دیر لگی۔ وہ تھورڈ تھا پادری اسے اندر لے آیا اور پوچھا' اتنی شام گئے تم کہاں سے آ رہے ہو۔ تھورڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں دیر تو ہو چکی .... اور بیٹھ گیا۔ پادری اس کے سامنے بیٹھ گیا دونوں کافی دیر تک خاموش رہے' آخر کار تھورڈ نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

میں اپنے ساتھ کچھ لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے میرے بیٹے کے نام پر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے کچھ رقم میز پر رکھ دی اور پھر بیٹھ گیا۔ پادری رقم گننے لگا یہ تو اچھی خاصی معقول رقم ہے" آج میں نے اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے یہ اسکی نقد رقم ہے۔

پادری کو چپ لگ گئی۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا' اچھا تو اب تم کیا چاہتے ہو۔۔ بہتری چاہتا ہوں۔ ایک ثانیے کے لئے وہ پھر خاموش بیٹھے رہے - تھورڈ نے اپنی آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ پادری نے اپنی آنکھیں تھورڈ پر گاڑ رکھی تھیں۔ پادری نے نرمی اور آہستگی سے کہا۔ بالآخر تمہارا بیٹا تمہارے لئے بابرکت ثابت ہوا۔

ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ تھورڈ نے آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دو بڑے بڑے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

پیٹر بکسل/ منیرالدین احمد

امریکہ کا کوئی وجود نہیں ہے

میں نے یہ کہانی ایک آدمی سے سنی ہے جو پیشہ ور قصے سنانے والا ہے۔ میں نے اسے کئی بار کہا ہے کہ میں اس کی کہانی کو نہیں مانتا

"آپ جھوٹ بولتے ہیں" میں نے کہا۔ "آپ دھوکہ بازی کرتے ہیں۔ آپ بڑ ہانکتے ہیں۔ آپ الو بناتے ہیں۔"

اس بات سے وہ ذرہ بھر مرعوب نہ ہوا۔ وہ اطمینان سے کہانی سناتا رہا اور جب میں نے للکار کر کہا۔ "جھوٹے، دغا باز، بڑ مار، دھوکہ باز" تو اس نے نظر اٹھا کے میری طرف دیکھا۔ سر کو ہلایا، مسکرایا، ایک اداس مسکراہٹ۔ پھر اس نے اس قدر دھیمے سے کہا کہ میں شرما سا گیا۔ "امریکہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کی خاطر اس کی کہانی کو لکھنے کا وعدہ کیا۔

اس کی ابتداء پانچ سو برس ادھر ایک بادشاہ کے دربار میں ہوتی ہے۔ سپین کے بادشاہ کے ہاں، محل، ابریشم اور مخمل، سونا چاندی، داڑھیاں، تاج، شمعیں، نوکر چاکر اور لونڈیاں، درباری جو منہ اندھیرے ایک دوسرے کے پیٹوں میں چھرے گھونپتے تھے، وہی جنھوں نے اس سے پہلی شام ایک دوسرے کو چیلنج کیا ہوتا تھا۔ میناروں پر بگل بجانے والے محافظ، ایلچی جو گھوڑوں پر سے چھلانگ لگا کر اترتے ہیں اور ایلچی جو جست لگا کر کاٹھیوں پر جم جاتے ہیں۔ بادشاہ کے خیر خواہ دوست اور بناوٹی یار۔ عورتیں خوبصورت اور فاتن، شراب اور محل کے گردا گرد عوام جنہیں سوائے اس کروفر کی قیمت ادا کرنے کے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔

مگر بادشاہ کو بھی اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی سوائے اس طرح کی زندگی بسر کرنے کے اور انسان چاہے کیسی ہی زندگی کیوں نہ بسر کرے، عیاشی کی یا غربت کی، میڈرڈ میں، بارسلونا میں یا کسی اور جگہ، بالآخر روز روز کا معمول ایک سا ہوتا ہے اور انسان کا دل اچاٹ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے لوگ جہاں کہیں بھی وہ رہتے ہوں بارسلونا کو خوبصورت دنیا تصور کرنے لگتے ہیں اور بارسلونا کے باسی کسی دوسرے مقام کی طرف سدھارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

غریب لوگ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو خوبصورت تصور کرتے ہیں اور انھیں یہ بات چبھتی ہے کہ بادشاہ سمجھتا ہے کہ غریب لوگوں کے لیے غربت ہی مناسب حال ہے۔

صبح دم بادشاہ بیدار ہوتا ہے۔ شام کے وقت بادشاہ استراحت کرتا ہے اور دن بھر وہ بور ہوتا رہتا ہے۔ اپنے مسائل کی بدولت، اپنے نوکروں، اپنے سونے، چاندی، مخمل، اپنے ابریشم، اپنی شمعوں کی وجہ سے۔ اس کا پلنگ ٹھاٹھ باٹھ والا ہے مگر انسان اس میں بھی سوائے سونے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

نوکر چاکر سویرے جھک کر کورنش بجا لاتے ہیں۔ ہر صبح ایک جتنی کمر خیدہ کر کے۔ بادشاہ اس کا عادی ہو

چکا ہے اور وہ ایک نظر تک اٹھا کے نہیں تکتا۔ کوئی شخص اس کو کانٹا پکڑاتا ہے۔ کوئی اسے چھری دیتا ہے۔ کوئی اس کی کرسی درست کرتا ہے اور لوگ جو اس سے بات کرتے ہیں کہتے ہیں۔ "بادشاہ سلامت" اور دوسرے بہت سے خوبصورت الفاظ اور بس۔

کوئی اسے نہیں کہتا۔ "ارے بدھو' ارے گاودی" اور جو کچھ وہ اسے آج کہتے ہیں وہ اسے کل کہہ چکے ہوتے ہیں۔

بس یہ حال ہے۔

اس وجہ سے بادشاہ درباری مسخرے رکھتے ہیں۔ انہیں کھلی چھٹی ہے بادشاہ کو ہنسانے کے لیے جو چاہیں کرنے کی اور کہنے کی جوان کے دل میں آئے۔ اور جب اس کو ان کی باتوں پر ہنسی نہیں آتی تو وہ انہیں مروا دیتا ہے وغیرہ۔

اس طرح اس کا ایک زمانے میں ایک مسخرہ تھا جو لفظوں میں ردو بدل کرتا تھا۔ بادشاہ کو یہ بات بھاتی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ "شادباہ سلامت" بجائے "بادشاہ سلامت" کہنے کے اور کہتا تھا "حمل" بجائے "محل" کے اور "صبح خبیر" بجائے "صبح بخیر" کے۔

مجھے یہ بات بیوقوفانہ لگتی ہے۔ بادشاہ کو یہ چیز اچھی لگتی تھی۔ پورے نصف برس تک اسے یہ بات بھاتی رہی۔ سات جولائی کے دن تک۔ جب وہ آٹھ تاریخ کو بیدار ہوا اور مسخرہ آیا اور اس نے کہا "صبح خبیر شادباہ سلامت" تو بادشاہ نے کہا "میری جان چھڑاؤ اس مسخرے سے۔"

ایک دوسرا مسخرہ' ٹھگنا اور موٹا' جس کا نام پیپے تھا' بادشاہ کو صرف چار روز تک پسند آیا۔ وہ بادشاہ کو اس طرح ہنساتا تھا کہ وہ عورتوں اور مردوں' راجوں' نوابوں' خان بہادروں اور جرنیلوں کی کرسیوں پر شہد لگا دیتا تھا۔ چوتھے روز اس نے بادشاہ کی کرسی پر شہد لگا دیا اور بادشاہ کو ہنسی نہ آئی' اور پیپے کی مسخرے پن سے چھٹی ہو گئی۔

اب بادشاہ نے دنیا بھر کے بدترین مسخرے کو خریدا۔ وہ بدشکل تھا' بیک وقت دبلا اور موٹا' لمبا اور ٹھگنا اور اس کی ایک ٹانگ ٹیڑھی تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ آیا اسے بولنا آتا تھا اور وہ جان بوجھ کے نہیں بولتا تھا یا یہ کہ وہ گونگا تھا۔ اس کی نظر فاسدانہ تھی' اس کا چہرہ مرجھایا ہوا۔ صرف ایک اچھی چیز اس میں پائی جاتی تھی اور وہ اس کا نام تھا۔ میاں مٹھو۔

سب سے زیادہ وحشتناک اس کی ہنسی تھی۔ وہ شروع ہوتی ہلکی آواز میں کانچ کے بجنے کی طرح پیٹ کی گہرائیوں میں سے۔ غرغراتی ہوئی اوپر کو چڑھتی' آہستہ آہستہ ڈکار میں بدل جاتی اور میاں مٹھو کے سر کو لال بھبوکا بنا دیتی۔ اس کا سانس قریب قریب رک جاتا۔ یہاں تک کہ وہ دھماکے سے جیسے پھٹ جاتا۔ گڑگڑاتا' چیخ مارتا۔ پھر پاؤں کو زمین پر دے مارتا' ناچتا اور ہنستا تھا۔ صرف بادشاہ اس پر خوش ہوتا تھا' دوسرے لوگ زرد پڑ جاتے' کانپتے اور ڈرنے لگتے اور جب محل کے گردو نواح کے لوگ ہنسی کو سنتے تھے تو دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتے تھے بلکہ کھڑکیوں کے حفاظتی کواڑ بھی بھیڑ لیتے تھے۔ بچوں کو بستر میں گھسیڑ دیتے اور اپنے کانوں میں موم ڈال لیتے تھے۔

میاں مٹھو کی ہنسی تمام چیزوں سے جو پائی جاتی ہیں بڑھ کر ہولناک تھی۔

بادشاہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتا تھا۔ میاں مٹھو ہنستا تھا۔

بادشاہ ایسی باتیں بھی کہتا تھا جن پر کوئی شخص نہیں ہنس سکتا مگر میاں مٹھو ہنستا تھا پھر ایک روز بادشاہ نے کہا "میاں مٹھو میں تمہیں پھانسی کی سزا دیتا ہوں۔"

اس پر میاں مٹھو ہنسنے لگا۔ بالکل پھٹ پڑا اور ایسی ہنسی ہنسا جیسی وہ کبھی نہ ہنسا تھا۔

تب بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ میاں مٹھو کو صبح سویرے پھانسی پر لٹکایا جائے۔ اس نے پھانسی کا چوکھٹا بنوایا۔ وہ اپنے فیصلے کے بارے میں سنجیدہ تھا۔ وہ میاں مٹھو کو پھانسی کے چوکھٹے کے سامنے ہنستا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سب لوگوں کو اس وحشیانہ تماشے کو دیکھنے کا حکم دیا۔ مگر لوگ چھپ گئے۔ انہوں نے اپنے دروازوں کی کنڈیاں لگا دیں۔ صبح کے وقت بادشاہ' جلاد اور نوکروں چاکروں سمیت اور ہنستے ہوئے میاں مٹھو سمیت اکیلا کھڑا تھا۔

اس نے اپنے نوکروں کو ڈانٹ کر کہا "لوگوں کو میرے حضور لے کر آؤ۔" نوکروں نے سارا شہر چھان مارا اور انہیں کوئی نہ ملا۔ بادشاہ غصے سے کھول رہا تھا اور میاں مٹھو ہنستا جا رہا تھا۔

بالآخر نوکروں کو ایک چھوکرا ہاتھ لگا۔ وہ اسے کھینچ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ چھوکرا ٹھگنا سا تھا' زرد اور شرمیلا۔ بادشاہ نے پھانسی کے چوکھٹے کی طرف اشارہ کیا اور اسے دیکھنے کا حکم دیا۔

چھوکرے نے پھانسی کے چوکھٹے کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھا اور مسکرانے لگا' ہاتھ پر ہاتھ مارا' کچھ ٹھٹکا اور کہنے لگا۔ "آپ یقیناً ایک نیک دل بادشاہ ہیں کیونکہ آپ نے کبوتروں کے لیے ایک مچان بنا دی ہے۔ دیکھیں تو سہی دو کبوتر اس پر آن بیٹھے ہیں۔"

"تم بدھو ہو۔" بادشاہ نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں بدھو ہوں۔ بادشاہ صاحب اور میرا نام ہے کولبو۔ میری ماں مجھے کولمبین کہہ کے پکارتی ہے۔"

"ارے بدھو" بادشاہ نے کہا "یہاں پر ایک شخص کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔"

"کیا نا ہے اس کا؟" کولمبین نے پوچھا اور جب اس نے نام سنا تو کہنے لگا "خوبصورت نام۔ اچھا تو میاں مٹھو کہتے ہیں اس کو۔ بھلا ایسے خوبصورت نام والے انسان کو کیسے پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہے؟"

"اس کی ہنسی بہت ہولناک ہے۔" بادشاہ نے کہا اور اس نے میاں مٹھو کو ہنسنے کا حکم دیا اور میاں مٹھو پہلے روز سے دوگنا ہولناک آواز سے ہنسا۔

کولمبین کو حیرت ہوئی۔ تب اس نے کہا "بادشاہ صاحب' کیا آپ اس کو ہولناک ہنسی سمجھتے ہیں؟" بادشاہ حیرت کے مارے کوئی جواب نہ دے پایا۔ پھر کولمبین نے آگے کہا "مجھے اس کی ہنسی کچھ ایسی پسند نہیں ہے مگر کبوتر اب بھی پھانسی کے چوکھٹے پر بیٹھے ہیں۔ اس نے انہیں بالکل خوفزدہ نہیں کیا۔ انہیں اس کی ہنسی کچھ ایسی ہولناک نہیں لگتی۔ کبوتروں کی حس سماع بہت تیز ہوتی ہے۔ میاں مٹھو کی جاں بخشی کر دینی چاہیے۔"

بادشاہ نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "میاں مٹھو' جاؤ تم بھاڑ میں۔"

اور میاں مٹھو نے پہلی بار ایک لفظ کہا۔ اس نے کولمبین سے کہا۔ "شکریہ" اور مسکرایا اور ایک خوبصورت انسانی ہنسا اور چلا گیا۔

بادشاہ کے پاس اب کوئی مسخرہ نہیں تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کولمبین سے کہا۔

"بادشاہ کے نوکر چاکر اور لونڈیاں' نواب اور باقی کے سب لوگوں نے سمجھا کہ کولمبین نیا درباری مسخرہ

تھا۔

مگر کولمبین ذرہ بھر ہنس مکھ نہ تھا۔ وہ بس کھڑا رہتا اور حیران ہوا کرتا تھا۔ بہت کم بولتا تھا اور ہنستا بالکل نہیں تھا۔ وہ محض مسکراتا تھا اور کسی دوسرے آدمی کو تو بالکل نہیں ہنساتا تھا۔

"یہ شخص مسخرہ نہیں ہے۔ یہ تو بدھو ہے۔" لوگ کہتے تھے اور کولمبین جواب دیتا تھا "میں مسخرہ نہیں ہوں۔ میں بدھو ہوں۔"

اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس بات کا پتہ اگر بادشاہ کو چل جاتا تو وہ ناراض ہو جاتا مگر کولمبین اسے بتاتا ہی نہیں تھا۔ اس وجہ سے کہ اسے اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ اس کا مذاق اڑایا جائے۔

دربار میں طاقتور لوگ ہوتے تھے اور عقلمند' بادشاہ بادشاہ تھا۔ عورتیں خوبصورت تھیں اور مرد جی دار' پادری خدا ترس تھا اور باورچن محنت کش' صرف کولمبین' کولمبین کچھ بھی نہ تھا۔

اگر کوئی شخص کہتا تھا "کولمبین آؤ میرے ساتھ کشتی لڑو" تو کولمبین کہتا تھا "میں تم سے کمزور ہوں۔"

اگر کوئی شخص کہتا تھا "دو ضرب سات کتنے ہوتے ہیں؟" تو کولمبین کہتا تھا "میں تمہارے مقابلے میں نالائق ہوں۔"

اگر کوئی شخص کہتا تھا "کیا تم ندی پر سے پھلانگنے کی ہمت رکھتے ہو؟" تو کولمبین کہتا تھا "نہیں' میں اس کی ہمت نہیں رکھتا۔"

اور اگر بادشاہ پوچھتا تھا "کولمبین تم کیا بننا چاہتے ہو؟" تو کولمبین جواب دیتا تھا "میں کچھ نہیں بننا چاہتا۔ میں کولمبین ہوں۔"

بادشاہ نے کہا "تمہیں ضرور کچھ بننا چاہئے" اور کولمبین نے پوچھا۔ "انسان کیا بن سکتا ہے؟"

بادشاہ نے کہا "وہ داڑھی والا شخص' بھورے چہرے جیسی شکل والا۔ وہ ملاح ہے۔ وہ ملاح بننا چاہتا تھا اور ملاح بن گیا ہے۔ وہ سمندروں کو پار کرتا ہے اور اپنے بادشاہ کے لیے سرزمینیں دریافت کرتا ہے۔"

"اگر تم چاہتے ہو' میرے بادشاہ" کولمبین نے کہا "تو میں ملاح بنوں گا۔"

اس پر سارے دربار کو ہنسی آ گئی۔

اور کولمبین بھاگ نکلا چلاتا ہوا دربار سے باہر۔ "میں ایک سرزمین دریافت کروں گا۔ میں ایک سرزمین دریافت کروں گا۔"

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر ہلانے لگے۔ کولمبین محل سے نکلا۔ شہر میں سے گزرا' کھیتوں میں سے' کسانوں کو' جو کھیتوں میں کھڑے تھے اور اس کی طرف دیکھ رہے تھے' اس نے چلا کر کہا۔ "میں ایک سرزمین دریافت کروں گا۔ میں ایک سرزمین دریافت کروں گا۔"

وہ ایک جنگل میں پہنچا اور ہفتوں تک جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہا اور ہفتوں تک کسی نے اس کی بابت کچھ نہ سنا اور بادشاہ اداس ہو گیا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا اور درباری شرمندہ ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے کولمبین کا مذاق اڑایا تھا۔

انہوں نے تب کہیں جا کر اطمینان کا سانس لیا جب ہفتوں کے بعد حفاظتی مینار کے محافظ نے بگل بجایا اور کولمبین کھیتوں سے گزرتا ہوا لوٹا' شہر میں سے گزرا' گیٹ کو پار کیا۔ بادشاہ کے حضور حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

"میرے بادشاہ' کولمبین نے ایک سرزمین دریافت کر لی ہے۔" اور درباری چونکہ اس کا مذاق نہ اڑانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سنجیدہ چہرے بنائے رکھے اور پوچھا۔ "کیا نام ہے اس کا اور وہ کہاں پر واقع ہے؟"

"اس کا ابھی کوئی نام نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے اسے ابھی دریافت کیا ہے اور پائی جاتی ہے وہ باہر سمندر کے بیچوں بیچ۔" کولمبین نے جواب دیا۔

اس پر وہ داڑھی والا ملاح اٹھا اور کہنے لگا۔ "خوب' کولمبین' میں "آمیریگو ویسپوچی" اس سرزمین کی تلاش میں جاتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں پر واقع ہے۔"

"آپ سمندر کا رخ کرتے ہیں اور پھر سیدھے جاتے ہیں اور آپ کو کشتی رانی کرنی ہو گی اس وقت تک جب تک آپ اس سرزمین کو دریافت نہ کر لیں۔ آپ کو ہمت نہ ہارنی چاہئے۔ کولمبین نے کہا اور اسے سخت ڈر لگ رہا تھا کیونکہ وہ جھوٹا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس سرزمین کا وجود نہیں پایا جاتا اور اس کی نیند جاتی رہی۔

مگر آمیریگو ویسپوچی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

کسی کو علم نہیں کہ وہ کس طرف گیا تھا۔

شاید وہ بھی جنگل میں چھپا رہا۔

پھر بگل بجے اور آمیریگو واپس لوٹا۔

کولمبین کا چہرہ لال سرخ تھا۔ وہ اپنے اندر مشہور ملاح کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ ویسپوچی بادشاہ کے سامنے ایستادہ ہوا۔ اس نے لمبا سانس لیا' کولمبین کو آنکھ ماری اور اونچی اور قابل فہم آواز میں کہا' اس طرح کہ سب اسے سن سکتے تھے۔ "میرے بادشاہ" کہا اس نے "میرے بادشاہ' وہ سرزمین پائی جاتی ہے۔"

کولمبین جو کہ بہت خوش تھا کہ ویسپوچی نے اس کا بھید نہ کھولا تھا' اس کی طرف بھاگ کے گیا۔ اس سے مصافحہ کیا اور پکارا۔ "آمیریگو' میرے پیارے آمیریگو۔"

اور لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس سرزمین کا نام تھا اور انہوں نے اس سرزمین کو جس کا وجود نہیں پایا جاتا "امریکہ" کا نام دے دیا۔

"اب تم ایک پورے مرد ہو" بادشاہ نے کولمبین سے کہا۔ "آج سے تمہارا نام کولمبس ہو گا۔"

اور کولمبس مشہور ہو گیا اور سب لوگ اس کی عزت کرنے لگے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ "اس نے امریکہ دریافت کیا ہے۔"

اور سب لوگ سمجھتے تھے کہ امریکہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ صرف کولمبس کو یقین نہ تھا۔ عمر بھر اسے اس بارے میں شک رہا مگر اسے ہمت نہ ہوئی اصل حقیقت کے بارے میں پوچھنے کی۔

جلد ہی دوسرے لوگ امریکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر بے شمار لوگ۔ اور جو لوگ واپس لوٹے وہ کہتے تھے "امریکہ پایا جاتا ہے۔"

"میں" اس شخص نے کہا' جس سے میں نے یہ کہانی سنی ہے۔ "میں کبھی امریکہ نہیں گیا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آیا امریکہ پایا جاتا ہے۔ شاید لوگ یونہی کہہ دیتے ہیں کولمبس کا دل رکھنے کی خاطر۔ اور جب دو آدمی ایک دوسرے سے امریکہ کی باتیں کرتے ہیں تو وہ اب بھی ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں۔ "امریکہ" وہ شاید ہی کبھی کہتے ہیں۔ اکثر مبہم طور پر کہتے ہیں "سٹیٹس" یا "سمندر پار" وغیرہ۔

شاید لوگوں کو' جو امریکہ جانا چاہتے ہیں' ہوائی جہاز میں یا بحری جہاز میں کولمبین کی کہانی سنائی جاتی ہے

اور پھر وہ کہیں چھپ جاتے ہیں اور بعد میں واپس لوٹتے ہیں اور کاؤ بوائز' آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتوں' آبشار نیاگرا' مسی سپی' نیویارک اور سان فرانسسکو کی باتیں سناتے ہیں۔

بہرصورت سبھی ایک سی باتیں سناتے ہیں اور سبھی وہی کچھ سناتے ہیں جو انہیں سفر سے قبل معلوم تھا اور یہ بات بہت مشکوک ہے۔

لوگ اب تک اس بارے میں آپس میں جھگڑ رہے ہیں کہ کولمبس کون تھا؟

مجھے اس کی حقیقت کا علم ہے۔

کرٹ کوزن برگ / منیر الدین احمد

انجن ڈرائیور کی سالگرہ

چونکہ انجن کا نام "طوفان" تھا' اس وجہ سے گاڑی کا نام بھی انہوں نے یہی رکھ دیا تھا' کیونکہ وہی گاڑی کو کھینچتا تھا۔ دراصل گاڑی کچھ ایسی لمبی نہ تھی اس کی صرف تین بوگیاں تھیں' ہر کلاس کے لیے ایک بوگی۔ ایک شام' جھٹ پٹا ہو رہا تھا' "طوفان میل" پڑونیا سٹیشن سے طالپیس کی طرف' جو قریبی سٹیشن تھا' روانہ ہوئی۔ گاڑی تیزی سے چلی اور جلد اپنی تیز ترین رفتار کو پہنچ گئی۔ اتنی سرعت کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہ تھی اور یہ بات واضح تھی کہ وہ طالپیس میں وقت سے بہت قبل پہنچ جائے گی۔

انجن ڈرائیور بہترین موڈ میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس روز اس کی سالگرہ تھی جس کو منایا جانا چاہیے۔ اس وجہ سے اس نے کاج میں قرنفل کا پھول سجا رکھا تھا' وقتاً" فوقتاً" شراب کی بوتل میں سے گھونٹ بھر لیتا تھا اور اپنے فائرمین کو بھی فراخدلی کے ساتھ اس کا موقعہ دے رہا تھا۔ درحقیقت اس کی سالگرہ نہ تھی' فائرمین کی بھی نہیں' حتیٰ کہ انجن کی بھی نہ تھی۔ اس غلط فہمی کا وہ اکثر شکار ہو جایا کرتا تھا۔ مہینے میں کم از کم دوبار' یہ اس کی خصوصیت تھی۔

فرسٹ کلاس کی بوگی ہمیشہ گاڑی کے درمیان ہوا کرتی تھی' وہاں پر جو محفوظ ترین جگہ ہے۔ اس سے آگے انجن ہوتا تھا بمعہ کوئلے کی گاڑی کے اور اس سے پیچھے سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کی بوگیاں ہوتی تھیں۔ اس سے غرض یہ تھی کہ خواہ گاڑی کسی سدراہ سے مزاحم ہو یا اس کو پیچھے سے ٹکر لگے' تو ایسے مسافروں کا بچاؤ ہو سکے جو سب سے زیادہ قیمت ادا کرتے تھے۔

بوگیوں کے درمیان پل نہ پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے چیکر گاڑی کے چلنے کے دوران ایک بوگی سے دوسری میں نہ جا سکتا تھا۔ اپنی ڈیوٹی کے مقام کو وہ صرف سٹیشنوں پر بدل سکتا تھا۔ فرسٹ کلاس کی بوگی میں وہ بیک وقت خوشی سے اور بد دلی سے جاتا تھا۔ خوشی سے اس لیے کہ وہ معزز لوگوں کی صحبت میں جاتا تھا اور بد دلی کے ساتھ اس وجہ سے کہ وہ اسے اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کا لاپرواہی کا مظاہرہ کرنا اور مودبانہ انداز اس فوجی افسر کی مانند جس نے دنیا دیکھ رکھی ہو' سراسر بے سود تھا جس انداز میں لوگ اسے ٹکٹ دکھاتے تھے' اس سے وہ جان جاتا تھا کہ وہ اسے محض نوکر چاکر کا درجہ دیتے تھے جو انہیں خواہ مخواہ ستا رہا ہو۔

نہیں' اسے تھرڈ کلاس کی بوگی میں ہونا سب سے زیادہ پسند تھا۔ اپنے طبقے کے لوگوں کے پاس۔ وہاں پر اس کی شاندار وردی اپنا رعب جماتی تھی۔ وہاں پر لوگ اسے ادب کے ساتھ بلکہ جھجکتے ہوئے ٹکٹ دکھاتے تھے اور اطمینان کا سانس لیتے تھے اگر وہ درست نکلتا تھا۔ چیکنگ کے بعد چیکر بلا تکلف مسافروں کے درمیان بیٹھ جاتا تھا' یوں جیسے وہ ان میں سے ہو۔ وہ چھوٹی موٹی گفتگو کیا کرتا تھا اور نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ جو رفیق سفر کے بغیر ہوتی تھیں دل لگی کیا کرتا تھا۔

سیکنڈ کلاس میں طبقوں کی گڈمڈ ہوتی تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ کو اپنے ہمسائے سے بڑھ کر منوانا چاہتا تھا۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ہمسایہ کہیں کنجوس دل کا کوئی امیر کبیر نہ ہو' جو صرف اس وجہ سے سیکنڈ کلاس میں بیٹھا تھا کہ وہ پیسے کی بچت کرنی چاہتا تھا۔ مسافروں کا سلوک چیکر کے ساتھ بھی جھنجلاہٹ اور تنگ مزاجی کا ہوتا تھا۔ اگر کوئی غلط سمت میں سفر کرتا ہوا یا غلط لائن پر پکڑا جاتا تو وہ فوراً اس کی ذمہ داری گاڑی کی کمپنی کے سر تھوپ دیتا تھا۔ اگر اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا تو حجت و تکرار تک نوبت آجاتی۔ چیکر ہر بار اطمینان کا سانس لیتا تھا جب وہ اس بوگی سے پلٹتا تھا۔

"طوفان میل" چھکا چھک جا رہی تھی۔ انجن ڈرائیور اور فائرمین نے بغیر کسی قسم کے تردد کے بوتل ختم کر دی تھی' کیونکہ کمک موجود تھی۔ چیکر تھرڈ کلاس کی بوگی میں بیٹھا تھا اور اس نے اپنا کان ایک بڈھے کسان کی طرف لگا رکھا تھا جو ایک الجھی ہوئی داستان سنا رہا تھا۔ فرسٹ کلاس کی بوگی کے ایک ڈبے میں ایک شخص اٹھا۔ اس نے پستول نکالا اور اور اپنے ہمسفروں کو حکم دیا نقدی یا قیمتی چیزیں جو ان کے پاس تھیں اس کے حوالے کرنے کا۔ اسلحہ کی موجودگی میں اکثریت نے ذرہ بھر تردد نہ کیا اور جہاں تہاں کہیں اس کا اظہار ہوا وہاں پر اس آدمی نے دو دو ہاتھ دکھائے۔ پھر تیلے ہاتھ کے ساتھ وہ بٹوؤں کو اپنے قبضے میں کرتا گیا۔ ہاروں اور بازو بندوں کو کھولتا اور انگوٹھیوں کو اتارتا گیا۔ جب کام ختم ہو جاتا تو وہ پچھلے قدموں دروازے کی طرف جاتا اور ڈبے کو باہر سے چٹخنی لگا دیتا۔

بغیر کسی قسم کی جلد بازی کے وہ ایک کے بعد دوسرے ڈبے میں گیا۔ ہر جگہ اس نے وہی کام کیا۔ اس کا مال غنیمت بڑھتا چلا گیا۔ اس بارے میں اس نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے کوٹ کی اندرونی طرف بے تحاشا بڑی جیبیں موجود تھیں۔ ہر ڈبے کے بعد اس کے کوٹ کا سائز بڑھتا گیا اور آدمی بھاری بھرکم ہوتا چلا گیا اور اس کی ہیبت ہیبت ناک بنتی چلی گئی۔ جونہی وہ ایک ڈبے سے فارغ ہونے کے بعد چٹخنی لگا دیتا تھا تو مرد غصے سے بولتے تھے کہ وہ کیونکر باہم اس پر قابو پا سکتے تھے' اب اس کام کا وقت گزر چکا تھا۔

آخری ڈبے میں ایک واقعہ پیش آگیا۔ شطرنج کے دو کھلاڑی جو کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے اور کھیل میں اس درجہ محو تھے کہ انہوں نے ڈاکو کے حکم کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اس نے اسے دہرایا۔ "پستول تو بھرا ہوا ہی نہیں ہے!" ایک بچے نے پکار کر کہا۔ ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے آدمی نے اپنے پستول کو تانا اور شطرنج کی چوکی پر سے بادشاہ کے ایک مہرے کو اڑا دیا۔ اس حملے نے شطرنج کے کھلاڑیوں کو چونکا دیا اور اب آکے انہیں سمجھ لگی کہ وہ آدمی کیا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک نے اسے نہ صرف اپنا بٹوہ حوالے کیا بلکہ دو پستول بھی پکڑا دیئے۔ جس قدر مسلح وہ اب تھا اس سے بڑھ کر بھلا کوئی ڈاکو کیا مسلح ہو سکتا تھا۔ صرف تیسرے بازو کی کمی تھی۔ وہ ڈبے سے نکلا اور اسے بھی چٹخنی لگا دی۔ اس کے ڈاکے کی کارروائی تمام ہو چکی تھی۔

اب وہ گینگ وے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ ہر ڈبے کے سامنے رکتا اور اندر نظر ڈالتا کہ آیا لوگوں کا طرز عمل شریفانہ تھا یا نہیں۔ مرد کھسیانے ہو کر اس کی طرف دیکھتے یا شرمندگی سے نظریں چراتے تھے۔ چند ایک عورتیں جنہیں ڈاکو کی جرات نے مرعوب کر دیا تھا اس کی طرف تحسین کی نظروں سے تکتی تھیں مگر اسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ اس کی جھگڑالو مگر خوبصورت بیوی موجود تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا اور جس کی طرف وہ جس قدر جلد ہو سکے واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی کو بغیر مزاحمت کے چھوڑنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

دریں حال کہ انجن کے مرد آتش شراب سے دل بہلا رہے تھے' انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کی گاڑی طاپلیس سے گزر گئی تھی۔ صرف مسافروں نے اس بات کو نوٹ کیا۔ انہوں نے پلیٹ فارم پر دوسرے مسافروں کو دیکھا جو حیرت بھری نظروں کے ساتھ ان کے پیچھے تک رہے تھے۔ طاپلیس سے کہیں آگے جا کے انجن ڈرائیور نے میٹر پر نظر ڈالی۔ سوئی شدید دباؤ دکھا رہی تھی۔ "ضرورت سے زیادہ بھاپ!" اس نے چلا کر کہا اور فائرمین کے ہاتھ سے بوتل چھین لی۔ "شراب تمہیں چڑھ جاتی ہے۔ تم ایک دیوانے کی طرح کوئلہ ڈالتے ہو۔" اس نے لیور کو کھینچا اور بھاپ نکالی۔ چونکہ اس نے لیور کو لیور جانا اس لیے کسی قدر بریک بھی ماری۔ بھاپ کے گہرے بادل گاڑی کے ساتھ دوڑنے لگے۔ جب ڈاکو نے محسوس کیا کہ گاڑی قدرے آہستہ چل رہی تھی تو اس نے دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ نرمی سے گرا' اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا رستہ لیا۔ اس نے چھلانگ لگانے کا وقت خوب چنا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد "طوفان میل" نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

اتنے میں طاپلیس کے سٹیشن ماسٹر نے اپنے ہم پیشہ کو گیگوش میں جو دوسرا سٹیشن تھا ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ کیا واقعہ ہوا تھا۔ "یہاں سے وہ گزر چکا ہے۔"

"ہمارے ہاں سے ابھی نہیں۔" دوسرے نے جواب دیا۔ اس سے انہوں نے نتیجہ نکالا کہ گاڑی کو ان دونوں سٹیشنوں کے درمیان ہونا چاہئے۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" گیگوش کے سٹیشن ماسٹر نے کہا "کہ کیا وہ یہاں پر بھی نہیں رکے گا۔"

فائرمین نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی۔ "ہمیں کبھی کا طاپلیس پہنچ جانا چاہئے۔" اس نے کہا۔ انجن ڈرائیور نے باہر کی طرف دیکھا اور باوجود تاریکی کے جگہ کو پہچان گیا۔ "ارے گدھے کے کان" وہ چلایا "ہم وہاں سے گزر چکے ہیں۔ واپس چلو!" اس نے انجن کو مشکل سے روکا اور واپسی کا گیر لگایا۔ اب انجن پیچھے کی طرف جا رہا تھا اور گاڑی کو اپنے آگے دھکیل رہا تھا۔

جب فرسٹ کلاس کے مسافروں نے دیکھا کہ گاڑی پیچھے کو جا رہی ہے تو انہیں لگا جیسے ہر چیز معکوس انداز میں ہونے لگے گی' ڈاکو آئے گا' انہیں چھینا ہوا مال واپس کرے گا اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ جائے گا۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ زندگی کا رخ صرف ایک سمت میں ہوتا ہے اور گاڑی کی واپسی بھی اس کا ہی ایک حصہ ہے۔

یہ کہ وہ طاپلیس سٹیشن کے پاس سے گزر گئے تھے' اس بات کو چیکر نے جان لیا تھا مگر اس نے سمجھا تھا کہ اس کا حکم اوپر سے آیا ہو گا۔ مگر جب گاڑی پیچھے کی طرف چلنے لگی' انتہائی تیزی کے ساتھ احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔ وہ ایک کھڑکی میں چھت پر چڑھ گیا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ اوپر پہنچ کر پہلے وہ سیکنڈ کلاس کی بوگی کی چھت پر پھلانگ کر گیا' پھر فرسٹ کلاس کی بوگی کی چھت پر۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟" اس نے انجن ڈرائیور کی سمت پکار کر پوچھا۔

"ہم غلطی کا ازالہ کر رہے ہیں۔" وہ جواب میں چلایا "لو اسے پکڑو۔ آج میری سالگرہ ہے۔" اس نے چیکر کی جانب ایک بوتل پھینکی جسے اس نے ہوا میں پکڑا۔ اس نے اپنے آپ کو تقویت کا سزاوار جانا اور ایک اچھا خاصا گھونٹ بھرا۔ پھر وہ ایک ماہر کی طرح نیچے اترا ایک کھلی کھڑکی کے رستے فرسٹ کلاس کی بوگی میں جونہی وہ گیلری میں نمودار ہوا۔ ڈبوں میں بند مسافروں نے دیوانوں کی طرح اشارے کرنے شروع کر دیئے اور دروازوں کو پیٹنے لگے۔ چیکر نے یکے بعد دیگرے سارے ڈبے کھولے' لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور اس نے سارا

قصہ سنا۔ شراب نے، جو اس نے پی رکھی تھی، اس کی جھجھک چھین لی تھی۔ "ارے ارے" اس نے کہا آدھا تنبیہہ کے رنگ میں اور آدھا حقارت کے ساتھ "اتنے سارے مرد ایک آدمی کے مقابلے میں۔ میں ہوتا تو اسے فرش پر دے پٹکتا۔" اس کے ساتھ ہی وہ فرش پر پڑا تھا۔ غصے سے بھرے ہوئے لوگوں نے اس کا وہ حشر کیا جو وہ اب ڈاکو کا نہ کر سکتے تھے۔

گیگوش اور طاپلیس کو ملانے والی پٹڑی سنگل لائن ہے اس وجہ سے ضروری تھا کہ دونوں سٹیشن ماسٹر اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔ طاپلیس والا دوسرے کو منوانے میں لگا ہوا تھا کہ "طوفان میل" یقیناً گیگوش سے بھی گزر چکی تھی اور کبھی کی آگے والے سٹیشن کی طرف رواں دواں تھی۔ "گویا لائن اب خالی ہے۔ میں دوسری گاڑی کو روانہ کر رہا ہوں۔" ایک نے کہا عین یہی بات دوسرے نے بھی اسی لمحے انہی الفاظ میں کہی چونکہ دونوں بول رہے تھے اس وجہ سے دونوں نے سنا۔ اس طرح ایک غلطی فہمی نے جنم لیا۔ طاپلیس اور گیگوش سے بیک وقت ایک ایک گاڑی چل دی۔

"طوفان میل" میں بدقسمتی نے ابھی پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ "بائیلر جلنے والا ہے۔" انجن ڈرائیور چلایا۔ "پانی تو ہے ہی نہیں اس میں، کوئلہ فوراً باہر نکالو۔" اس نے رفتار کم کر دی اور آگ والا دروازہ کھول دیا۔ دونوں مردوں نے بیلچے تھامے، لال سرخ کوئلوں کو نکالنے اور باہر پھینکنے لگے، کچھ دائیں طرف اور کچھ بائیں طرف۔ ارے، کس طرح وہ چمکتی ہوئی شے گاڑی کی کھڑکیوں کے پاس سے اڑنے لگی۔

اس آتش بازی کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ انجن ڈرائیور متوجہ ہو گئے جو "طوفان میل" کی جانب آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے انجن کی رفتار گھٹا دی۔ بہت آہستگی کے ساتھ گاڑیاں آپس میں مل گئیں۔ صرف تھوڑا سا دھچکا لگا اور "طوفان میل" کی فرسٹ کلاس کی بوگی، جس کی بطور خاص حفاظت مطلوب تھی، ذرہ سی پچک گئی مگر کسی مسافر کو کچھ ایسے قابل ذکر زخم نہ آئے۔

تینوں گاڑیاں اب کھڑی تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہونا چاہئے۔ گیگوش اور طاپلیس کے سٹیشن ماسٹر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ کوئی بھی دوسرے کو گاڑی کی آمد کی اطلاع نہ دے سکتا تھا۔ اگرچہ بھیجی دونوں نے تھیں۔ گیگوش سے طاپلیس جانے والی اور طاپلیس سے گیگوش جانے والی گاڑیاں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ چونکہ صورتحال الجھی ہوئی تھی اس وجہ سے انہیں آگے جانے کی اجازت نہ مل رہی تھی۔ سٹیشن ماسٹروں کی گفتگو ٹیلیفون پر الجھتی گئی، بے مطلب بنتی گئی۔ اب کیا ہونا چاہئے؟

کچھ ایسی عمدہ سالگرہ نہیں ہے۔" "طوفان میل" کے جھلائے ہوئے انجن ڈرائیور نے فائرمین سے کہا۔

"عمدہ نہ سہی" فائرمین نے جواب دیا "مگر ہلچل خوب ہے۔"

تقریباً اسی وقت، جب تینوں انجن ڈرائیوروں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا اور اکٹھے طاپلیس کی طرف روانہ ہوئے، ڈاکو اپنے گھر پہنچا۔ اس نے اپنی بیوی کو بوسہ دیا، جوتے اتار کر سلیپر پہن لئے اور شراب کا ایک گلاس پیا۔ "سناؤ۔۔ کیا پھر خالی ہاتھ؟" عورت نے طنز سے پوچھا۔ وہ صرف مسکرانا چاہتا تھا مگر اس کی ہنسی پھوٹ نکلی۔ اس نے اپنے کوٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور لوٹ کے مال کو میز پر ڈھیر کر دیا۔ "کافی ہے کیا؟" پوچھا اس نے "سالگرہ کا میز کیسا سج رہا ہے؟" انجن ڈرائیور کے برعکس عورت کی سچ مچ سالگرہ تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے پیسوں کی گنتی کی ہاروں اور کڑوں کو پرکھا۔ پھر اس نے اپنے مرد کو ایک بوسہ دیا۔ بعد میں، شام کے کھانے کے بعد، اس نے اسے کچھ اور بھی دیا۔

ہرمن ہیس / عبدالوحید رانا

مسی زگلر

مسی زگلر کا مختصر تعارف کچھ یوں ہے کہ وہ براگاس کے شہر میں رہتا تھا اور ان لاپرواہ قسم کے لڑکوں میں سے تھا جن کو ہم ہر شام سڑکوں پر بے فکری سے آوارہ خرام دیکھتے ہیں اور جن کے چہرے ہمیں کبھی یاد نہیں رہتے' اس لئے کہ وہ سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں' اجتماعی چہرے۔ وہ ایک خوش فہم انسان تھا اور اپنے بارے میں بہت سے مغالطوں کا شکار تھا۔

وہ احمق تو ہرگز نہیں تھا لیکن اسے کوئی باصلاحیت انسان بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اسے دولت سے محبت تھی' عیش و آرام کی تمنا تھی اور ہر خوبرو نوجوان کی طرح خوش لباسی کا زعم تھا' ہر محتاط انسان جیسا کہ ہوتا ہے وہ کسی حد تک بزدل بھی تھا۔

زگلر میں عام بشری کمزوریوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ ایسا مطمئن نوجوان تھا جس کے لئے اس کی اپنی شخصیت سب سے بڑھ کر اہم ہوتی ہے۔ وہ خود کو معاشرے کا ایک منفرد انسان خیال کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس حقیقت سے ہمیشہ لاعلم ہی رہا کہ اس کی حیثیت انسانوں کے اس بپھرے ہوئے ہجوم میں ایک پرکاہ سے بڑھ کر نہیں۔ وہ دنیا کے بیشتر مسائل پر اپنی الگ اور اٹل رائے رکھتا تھا اور ایسا تو ہوتا ہی ہے کہ حقائق ہماری خوش فہم دنیا میں آکر اکثر خوبصورت خیالات کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔

زگلر روشن خیال انسان تھا اس لئے اس کے دل میں دولت کی بے پناہ اہمیت تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید دنیا کی دوسری بڑی قوت سائنس کا بھی زبردست مداح تھا۔ سائنس کی صحیح تعریف سے تو وہ شاید خود بھی واقف نہ تھا لیکن اسے ریاست کی ترقی کے لئے سائنس کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

زگلر کا باپ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مرا تھا۔ اس وجہ سے اسے ان تمام تحقیقات سے خاص دلچسپی تھی جن کا مقصد کینسر کا علاج دریافت کرنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ایسا ہو سکے گا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس خطرناک بیماری کے خوف سے آزاد ہو جائے گا۔ زگلر خوش لباس تھا وہ فرد کی آزادی کا شدت سے قائل تھا اور کردار اور افعال میں کسی قسم کی بندش گوارا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کرتا لیکن اس بات کا اہتمام ضرور کرتا کہ اس کے نظریات کا علم حکومت یا اس کے افسران کو نہ ہونے پائے۔

میرے خیال میں زگلر کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تفصیلی باتیں ہو گئی ہیں مختصر یہ کہ وہ ایک دلکش انسان تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے سانحہ کا ہم سب سے گہرا تعلق ہے کیونکہ وہ بے چارہ ایک حیران کن اور افسوسناک انجام سے دوچار ہوا۔

اتوار کی ایک خوشگوار صبح وہ خالص تفریح کے ارادے سے ہمارے شہر میں وارد ہوا۔ وہ یہاں بالکل اجنبی

تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے شہر کے عجائب خانے اور چڑیا گھر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ عجائب خانے میں صبح کے وقت داخلہ مفت تھا اور چڑیا گھر کے لئے شام کے اوقات میں خاص رعایتی ٹکٹ کا انتظام تھا۔

چنانچہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کئے جس پر کپڑے کے قیمتی بٹن لگے تھے' وہ تاریخی عجائب گھر کو روانہ ہوا' اس کے ہاتھ میں بید کی خوبصورت چھڑی تھی جس نے اس کی شخصیت کو باوقار اور شاندار بنا دیا تھا۔ بدقسمتی سے اسے یہ چھڑی عجائب گھر کے دروازے پر ہی چھوڑنی پڑی۔

عمارت کے عظیم الشان ہال میں شیشے کے بڑے بڑے شوکیسوں میں تاریخی نوادرات رکھے تھے اور خوبصورت کتبوں پر سائنس کے ان عظیم شاہکاروں کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔ وہ بغور شوکیسوں میں رکھی زنگ آلود چابیوں اور سال خوردہ جواہرات کے بارے میں پڑھتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ "واقعی سائنس عظیم ہے بہت جلد' ہاں! بڑی جلدی' یہ کینسر کا علاج دریافت کر لے گی۔ بہت ممکن ہے ہم مستقبل قریب میں موت کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیں۔"

دوسرے کمرے میں دیوار گیر شیشہ نصب تھا۔ زگر نے چند ثانیئے کے لئے رک کر اپنے سراپا کا جائزہ لیا' کوٹ' پتلون' قمیض' ٹائی کی گرہ' سب کچھ شاندار تھا وہ آگے بڑھ گیا۔

یہاں اس کی دلچسپی کا مرکز لکڑی پر نقاشی کے وہ نمونے تھے جن کی آب و تاب صدیاں گزر جانے کے باوجود قائم تھی۔ وہ خاموشی سے انسانی ذہن کی شعبدہ کاریوں کو سراہتا آگے بڑھتا رہا۔ وقت کافی گزر چکا تھا وہ اب بور ہونے لگا تھا۔

اس نے قدرے اکتاہٹ کے عالم میں اپنی خوبصورت گھڑی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں غرور آمیز روشنی نمودار ہوئی' خالص سونے کی گھڑی' یہ اسے اپنے باپ کے ترکے میں ملی تھی۔

ابھی دوپہر کے کھانے میں کافی وقت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک نسبتاً" خاموش کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کا تجسس پھر سے جاگنے لگا یہاں قرون وسطی کے توہمات سے متعلق اشیاء جمع کی گئی تھیں۔ سامنے جادو' تعویز گنڈوں اور چڑیلوں کو تسخیر کرنے کے علم کی کتابیں رکھی تھیں' ایک کونے میں کیمیا گری کا مکمل سامان رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے آخری سرے پر مہمانوں کے لئے ہدایات درج تھیں کہ یہاں رکھی اشیاء کو چھونا خطرناک ہے لیکن آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اس قسم کی تحریروں پر کون دھیان دیتا ہے اور پھر اس وقت زگر کے علاوہ کمرے میں اور کوئی بھی نہ تھا۔

اس نے تجسس بھری نگاہوں سے یہاں موجود پراسرار نوادرات کی طرف دیکھا اور چپکے سے چند ایک کو چھوا بھی۔ زگر نے پرانے زمانے کی توہمات کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سب نامعقول باتیں ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں کو چاہیے تھا کہ جادو وغیرہ جیسی بکواس چیزوں پر پابندی عائد کر دیتے ہاں البتہ کیمیاگری قابل معافی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بطن سے جدید کیمیا کی سائنس نے جنم لیا ہے۔ بے دھیانی میں زگر کا ہاتھ کسی نرم سی چیز سے جا ٹکرایا یہ روئی کی مانند ملائم کوئی قدیم جڑی بوٹی تھی۔ اس نے خشک اور بے وزن بوٹی کو انگلیوں میں دبا کر اس کی گولی سی بنا ڈالی۔ شاید یہ کوئی پرانے نسخے سے تیار کردہ مرکب تھا۔ اس بلا ارادہ شغل کے بعد وہ گولی کو واپس اپنی جگہ رکھنے کی بابت سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری' کوئی آرہا تھا' زگر نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں وہ تیزی سے واپس چل

پڑا گولی ابھی تک اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ افراتفری میں عجائب گھر سے باہر نکلا اور تیزی سے قریبی گلی میں داخل ہو گیا۔ دور دور تک خاموشی تھی اور قریب کوئی نہ تھا اس نے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا، گولی ابھی تک اس کی مٹھی میں تھی وہ اسے نالی میں پھینکنے ہی والا تھا کہ اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے مٹھی کھول کر اس نرم اور قدیم کیمیائی مرکب کی طرف دیکھا اور ناک کے قریب لا کر اس کی مہک کا اندازہ کرنے کی کوشش کی "فرحت بخش! بھئی کمال ہے" گولی میں سے عجیب سی مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔ زگر نے ہاتھ واپس جیب میں رکھ لیا اور قریبی ریستوران میں داخل ہو گیا۔

چڑیا گھر کا وقت شروع ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے، بھوک بھی شدید ہو چکی تھی۔ زگر نے اپنے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دیا اور دھیرے دھیرے خوش ذائقہ مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ گولی جیب سے نکالی اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن خدا جانے کیوں زگر کو خود بھی اس کا علم نہیں تھا اس نے گولی منہ میں رکھ لی، وہ بے ذائقہ تھی، وہ چند لمحے اسے چوستا رہا پھر مشروب کے ایک بڑے گھونٹ سے اسے حلق میں اتار لیا۔ یہ ایک معصوم اور قدرے بچگانہ حرکت تھی۔ بہر حال گولی کا قصہ تمام ہوا، کھانا خوش ذائقہ تھا اس نے پیٹ بھر کر کھایا۔

دو بجے وہ چڑیا گھر کے دروازے کے اس حصے کی جانب بڑھا جہاں چوپایوں کے پنجرے تھے۔ وہ افریقی لنگوروں کے پنجرے کے سامنے جا کھڑا ہوا، لنگور نے خوش مزاجی سے اس کا استقبال کیا "کہو بھیا، کیسے مزاج ہیں۔"

زگر حیرت کے بے پناہ سمندر میں ڈوبنے لگا پھر خوف کی سرد لہر اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

بندر کی ناراضگی اور نفرت سے بھری ہوئی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

"آخر یہ کس بات پر اتراتا پھرتا ہے، احمق، ذلیل کہیں کا"

مگر اس کے پاس مٹھائی کہاں تھی، بندر غصے میں اس کی نقلیں اتارنے لگے۔ انہوں نے زگر کو نکما، آوارہ اور نہ جانے کیا کچھ کہا، وہ دانت نکال کر اس کا منہ چڑا رہے تھے، یہ سخت ذلت آمیز رویہ تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی معقول آدمی وہاں کیسے ٹھہر سکتا تھا۔

زگر کو یقین تھا کہ ہرن اپنی روائتی شائستگی کا مظاہرہ کرے گا اور اس کا سلوک ان گھٹیا جانوروں سے یقیناً مختلف ہو گا۔

جالیوں کے قریب ایک لمبا سا بارہ سنگھا کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک زگر دہشت سے کانپ اٹھا "اف میرے خدا"

صورت حال واضح ہوتی جا رہی تھی، گولی کھانے کے بعد وہ حیرت انگیز طور پر جانوروں کی زبان سمجھنے لگا تھا۔

بارہ سنگھے نے اپنی بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی اداس آنکھوں میں وقار اور حسن تھا مگر زگر کو وہاں حقارت کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ ان پر شکوہ آنکھوں میں نفرت اور غصے کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

زگر اپنے شاندار سوٹ، طلائی گھڑی، طمطنہ دار شخصیت اور بارعب چہرے کے باوجود پنجرے میں بند اس بے بس جانور کے سامنے کسی حقیر کیڑے کی طرح سہا کھڑا تھا، قابل نفرت اور مکروہ انسان۔

بارہ سنگھے کے بعد وہ باری باری پہاڑی بکرے، نیل گائے، جنگلی سور، ریچھ اور دوسرے جانوروں کے قریب

گیا لیکن سب کا رویہ ناقابل فہم تھا' غیر ہمدردانہ اور مایوس کن' زگر نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی تاکہ ان بظاہر بے زبان چوپاؤں کی انسان کے بارے میں رائے سے آگاہ ہو سکے۔ یہاں اسے اس اذیت ناک حقیقت کا علم ہوا کہ انسان تکلیف دہ حد تک بے توقیر مخلوق ہے' پنجروں میں قید چوپائے حیران تھے کہ یہ غلیظ' بے وقار اور متعفن دوپایہ جس کا نام انسان ہے اور جو اپنی کل زندگی میں فقط بہروپیا' اور مسخرہ ہے' آزاد کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

زگر نے اس سنجیدہ بلی کی طرف دیکھا جو باوقار انداز میں اپنے بلونگڑے کو حکمت بھری باتیں سنا رہی تھی' ایسی باتیں جو انسان کم ہی کر سکتے ہیں۔

اس نے خوبصورت چیتے کی باتیں بھی سنیں۔ وہ بڑی تمکنت سے چڑیا گھر میں پھیلے خلقت کے اجتماع اور ہا' ہو کے بارے میں اپنے شاندار خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

یہیں وہ شاہانہ بالوں والا شیر بھی تھا جس کی آنکھوں میں دشت کی بے کراں وسعت تھی' دشت جہاں کوئی قفس نہیں ہوتا اور قفس بنانے والے انسان نہیں ہوتے۔

زگر نے خوش رنگ پرندوں کو قید قفس میں غمگین لیکن مغرور حالت میں دیکھا۔

قریب ہی ایک بریدہ شاخ پر نیل کنٹھ بیٹھے تھے' وہ اپنی آزادی کھو جانے پر ملول تھے لیکن ان کی چہچہاہٹیں ابھی زندہ تھیں۔

افسردگی اور کرب کے جذبات لئے زگر انسانوں کے وسیع ہجوم کی طرف چل پڑا' وہ کسی ایسے انسان کو ڈھونڈ رہا تھا جو اس کے دکھ اور شرمندگی کو محسوس کر سکے' اس نے لوگوں کی باتیں اس امید کے ساتھ سننے کی کوشش کی کہ شاید محبت کے دو بول اس کے غم کا مداوا کر سکیں۔ وہ ہر چہرے کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا' شرافت اور سچائی کی تلاش میں' لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہاں فقط شور تھا اور بے معنی الفاظ تھے' اشارے تھے' حرکات تھیں مگر سب کچھ ناقابل فہم۔

اس کے ماتھے پر کسی چوپائے کی آنکھیں ثبت ہو چکی تھیں اسے وہاں صرف بدطینت اور بدکار لوگوں کے بے تکے اجتماع کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا ماحول بھانت بھانت کی حیوانی جذبوں والی مخلوق سے اٹا ہوا تھا۔

دل شکستہ زگر دیر تک چڑیا گھر میں گھومتا رہا' اسے اپنے وجود سے شرم محسوس ہو رہی تھی وہ کافی دیر پہلے اپنی منقش چھڑی اور دستانے جھاڑیوں میں پھینک چکا تھا لیکن جب اس نے اپنا ہیٹ' ٹائی اور جوتے بھی اتار پھینکے اور بارہ سنگھے کے پنجرے کی سلاخوں سے سر ٹکرا کر سسکیاں بھرنے لگا تو اس کے چاروں طرف ہجوم اکٹھا ہو گیا' پھر محافظوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے پاگل خانے کی طرف لے جا رہے تھے۔

ازیٹی ایگبونا / ستار طاہر

سورج کی بیٹیاں

بوڑھی عورت نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے کوئی تکلیف محسوس نہ کی وہ یوں سورج کو گھورنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس نے مضبوط اور بے لچک چھڑی کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا تھا لیکن وہ صاف ستھری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سامنے دریا تھا جو غیظ و غضب سے پھنکارتا ہوا جھاگ اڑا رہا تھا۔ اس لمحے ایک اجنبی اس کے پاس پہنچا اور آہستہ سے بولا۔

"بڑی اماں! آپ خیریت سے تو ہیں؟"

بوڑھی عورت نے اجنبی کو گھورتے ہوئے پوچھا "کیا مجھے کچھ کہہ رہے ہو؟" بوڑھی عورت کی آواز اونچی اور اپنی عمر کے مقابلے میں بیس برس جوان تھی۔ "میں نیم بہری ہوں ذرا اونچی آواز سے بولو" اجنبی جوان ایک صحت مند شخص تھا اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہو گی۔ اس کا قد لانبا تھا لیکن وہ تھوڑا سا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ یقیناً "کسرت کا عادی تھا۔ کیونکہ اس کا جسم بہت مضبوط و توانا دکھائی دے رہا تھا۔

"بڑی اماں! میں نے آپ کی خیریت پوچھی تھی۔ کیا آپ کی میں کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" اجنبی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ہاں بیٹے! کیا تم میرا یہ برتن اٹھا لو گے' اس میں چشمے کا ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ میں چشمے پر پانی بھرنے اس وقت آئی تھی جب سورج آسمان پر خاصا اونچا تھا۔ اب تو وہ ڈوبنے والا ہے"۔ "بڑی اماں! کیا آپ اتنی دیر تک کسی کا انتظار کرتی رہیں۔؟"

"ہاں بیٹے! یہاں سے کوئی گزرا ہی نہیں جسے مدد کے لئے پکارتی۔ آج کل فصل کاٹنے کا موسم ہے' سب کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ غلطی تو مجھ سے ہوئی کہ اتنا بڑا گھڑا اٹھا لائی جو مجھ ضعیفہ سے اب اٹھایا نہیں جاتا۔ مجھے کوئی چھوٹا برتن لانا چاہئے تھا۔"

آپ فکر نہ کیجئے بڑی اماں اب کسی کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں یہ پانی کا گھڑا میں اٹھا لوں گا۔

اجنبی مرد نے پانی کا بھاری اور بڑا گھڑا اٹھا لیا! عورت چھڑی ٹیکتی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ انہیں دریا کے پل کے اس پار جانا تھا۔ جب وہ پل پار کر گئے تو بوڑھی عورت اچانک ایک جگہ کھڑی ہو گئی اجنبی اس بوجھ سے کسی طرح نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا "ٹھہر کیوں گئی ہو؟ بڑی اماں" اجنبی نے پوچھا۔

بوڑھی عورت نے سر ہلاتے ہوئے کہا "کتنی اداس کر دینے والی بات ہے!"

"بڑی اماں! کیا کہا؟"

بوڑھی عورت نے بڑے پر اسرار لہجے میں کہا۔

"اب تو انہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ سورج ڈوبنے والا ہے۔ وہ ضرور سورج سے دوسری طرف چلی گئی ہوں

گی۔"

"بڑی اماں! کن کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟ کون سورج کے دوسری طرف چلا گیا ہوگا؟"

"تم تو بچوں جیسے سوال پوچھ رہے ہو۔ میں سورج کی بیٹیوں کی بات کر رہی ہوں۔" بڑی اماں! میں نے تو کبھی سورج کی بیٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں سنا"

"کبھی نہیں؟" بوڑھی عورت نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ "تو یقیناً" کسی دور دراز کے علاقے سے آئے ہو۔"

"بڑی اماں! آپ نے درست کہا۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ سفر کرنا میرا پیشہ ہے میں' پرانی لوک داستانیں جمع کرتا ہوں۔ اور ان کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ آپ نے تو میرا اشتیاق بڑھا دیا ہے۔ بڑی اماں !کیا آپ مجھے سورج کی بیٹیوں کی کہانی سنائیں گی؟"

"میرے بیٹے! سورج کی بیٹیوں کی کہانی شاید تمہارے مطلب کی نہ ہو۔ یہ تو سچی اور حقیقی کہانی ہے"۔

'اب تو میں ضرور سنوں گا بڑی اماں آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں لوک کہانی سنانے والے کو بھاری معاوضہ بھی دیتا ہوں؟"

"تم سے معاوضہ لینے سے تو یہی بہتر ہے کہ میں کنوئیں میں ڈوب مروں۔ تم نے تو میرا یہ گھڑا اٹھا کر معاوضہ ادا کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے اسے میرے گھر تک پہنچا دو گے۔ میں تمہیں بڑے سکون سے کہانی سنا دوں گی۔ پہلے ہم گھر تو پہنچ لیں"

جب وہ بوڑھی عورت کے جھونپڑے تک پہنچے اور پانی کا وہ بھاری گھڑا اجنبی نے رکھ دیا تو بوڑھی عورت اور وہ دونوں باہر کھلی ہوا میں بیٹھ گئے۔ آسمان سفید تھا اور اس پر ستارے نمودار ہونے لگے تھے تب بوڑھی عورت نے کہانی شروع کی۔

"اس زمانے کا قصہ ہے جب مرد مرد ہوتے تھے اور عورتیں صحیح معنوں میں عورتیں۔ مردوں کے جسم طاقت اور وجاہت کا جیتا جاگتا نمونہ اور عورتیں طاقت اور حسن کا مرقع ہوتی تھیں یہ کہانی اس دور کی ہے۔ ایسی کہانیاں ایسے ہی دور میں جنم لے سکتی ہیں۔ یہاں سے بہت دور پہاڑیوں کے اس پار ایک چھوٹا سا پر سکون گاؤں آباد تھا۔ پورے گاؤں کی آبادی صرف ایک آدمی پر مشتمل تھی کسی کو اس کا نام معلوم نہ تھا' کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس چھوٹے سے گاؤں میں اکیلا کیوں رہتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاتا تھا پڑوس کے دیہاتی اسے اس وقت ہی دیکھتے جب وہ ہاتھی دانت اور چیتوں کی کھالیں بیچ کر آیا کرتا تھا۔ وہ شخص بہت جسیم بھاری اور طاقتور تھا۔ اس کے جسم پر زخموں کے اتنے نشان تھے کہ سر پر اتنے بال بھی نہ ہوں گے۔

گاؤں کے لوگ اسے بہادر شکاری کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ بہادر شکاری شراب نہیں پیتا تھا اس زمانے میں بہادر ہونا بڑی کشش رکھتا تھا۔ نوجوان لڑکیاں بہادر مرد سے شادی کرنے کے لئے بیتاب رہتی تھیں۔ لڑکیوں کے والدین کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی تھی کہ ان کی بچیوں کی شادی کسی بہادر مرد سے ہو جائے' لیکن وہ بہادر شکاری لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ بڑے بوڑھے اس سے پوچھتے کہ وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا تو وہ کندھے اچکانے لگتا اور کوئی جواب دیئے بغیر اپنے گاؤں کا رخ کرتا۔

وہ جس گھر میں رہتا تھا اس کی چھت جنگلی درندوں کی کھالوں اور دیواریں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھیں۔ گھر کے اردگرد جو باڑ تھی وہ شیر کے دانتوں سے تیار کی گئی تھی۔ اب تک اس نے کتنے جانور شکار کئے تھے اس

کا اندازہ اسے بھی نہیں تھا۔ وہ جس پیالے سے پانی پیتا تھا وہ بھی ایک جنگلی بندر کی کھوپڑی تھی۔
وہ مزے کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اس کا ایک دشمن بھی تھا اس دشمن کا نام تھا "بوریت" کبھی کبھی وہ اتنی شدید اکتاہٹ اور بوریت محسوس کرتا کہ اسے اپنی زندگی بے معنی دکھائی دینے لگتی۔ اسے شراب عورت اور رقص سے کوئی دلچسپی نہ تھی' شکار اس کی زندگی تھی اور اس نے اتنا شکار کھیلا تھا کہ وہ بعض اوقات اس دلچسپی سے بھی بور ہو جاتا' غصے سے دانت پیستا رہتا کہ کسی طرح اس بوریت سے نجات حاصل کرے۔ ایک دن اسے بوریت سے نجات حاصل کرنے کی ایک نادر ترکیب سوجھی اس نے سوچا کیوں نہ کسی ایسے جانور کی تلاش میں نکلا جائے جسے آج تک کسی نے شکار نہ کیا ہو۔ اس خیال سے اس کے پورے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں اس نے ایک ایسے قدیم جنگل کا ذکر سنا تھا کہ جو کوئی ایک بار اس میں گیا پھر کبھی واپس نہ آیا۔ آخر اس جنگل میں کیا اسرار اور بھید تھا! اس نے اس قدیم داستانی جنگل کی تلاش میں جانے کا تہیہ کر لیا اسے یقین تھا کہ اس کا نام تاریخ میں لکھا جائے گا۔

چند روز بعد وہ اپنی اور چند ضروری اشیاء کے ساتھ اس پر اسرار قدیم داستانی جنگل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نے سات سرزمین اور سات سمندر عبور کئے۔ اور پھر ایک دن وہ اپنی منزل تک جا پہنچا۔ سامنے وہی جنگل تھا جس کے اندر داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ جنگل بہت پراسرار تھا۔ اسے دھوئیں اور دھند نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہی اس بہادر شکاری کا دل بھی بیٹھنے لگا۔ کسی جی کڑا کر کے وہ جنگل کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر بالکل سناٹا تھا' وہ دور تک چلتا گیا۔ مگر اسے کوئی جانور تو کیا کوئی کیڑا مکوڑا بھی دکھائی نہ دیا۔ ادھر ادھر ان پرندوں کی ہڈیاں اور پر بکھرے پڑے تھے جنہوں نے اس جنگل کے اوپر سے پرواز کرنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں تھیں۔ بہادر شکاری جنگل میں چلتا گیا اور اس کے دوسرے کنارے تک جا پہنچا۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ دوسرے سرے پر سبز رنگ کا وسیع و عریض سمندر ہے۔ وہ سبز پانی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے سمندر میں کوئی چیز دور فاصلے پر نظر آئی۔ وہ چیز آگ کے بڑے گیند کی طرح تھی جو پانی کی سطح پر لڑھکتی چلی آ رہی تھی۔ بہادر شکاری خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بھاگتا ہوا ایک قریبی درخت کے اوپر چڑھ کر اس لپکتے اور لڑھکتے گیند جیسے شعلے کو دیکھنے لگا۔

وہ لڑھکتا ہوا گول شعلہ جنگل کے کنارے پر آ کر ٹھہر گیا۔ زوردار دھماکے سے وہ بڑے گیند جیسا شعلہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے اندر ایک کشتی تھی جس میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ لڑکیاں ایک جیسی حسین تھیں۔ ان کی شکل و شباہت بھی ایک تھی۔ وہ گردوپیش کا بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھیں کہ آس پاس کوئی ہے تو نہیں۔ بہادر شکاری نے اپنا سانس روک لیا۔ جب لڑکیوں کو یقین ہو گیا کہ وہاں ان کے سوا اور کوئی بھی نہیں تو ایک نے دوسری سے کہا۔

"پیاری بہن! تم پہل کرو۔"

دوسری لڑکی کھڑی ہو کر کہنے لگی

"میں سورج کی توام بیٹیوں میں سے ایک ہوں۔ یہاں اعلان کرتی ہوں کہ میں پندرہ برسوں کی تفریح کے لئے انسانوں کی دنیا میں جا رہی ہوں۔ میں آکوزو شہر کی ایک عورت کے بطن سے جنم لوں گی۔ میرے نئے والدین بہت دولت مند ہیں ان کے تین بیٹے ہیں۔ میں ان کی چوتھی اولاد اور اکلوتی بیٹی ہوں گی۔ سارا شہر مجھ سے بے حد پیار کرے گا۔ جب میں چودہ برس کی ہو جاؤں گی تو بہت بڑا طوفان آئے گا۔ ایک درخت کا بھاری حصہ ٹوٹ

کر مجھ پر گرے گا اور مجھے اسی لمحے موت آجائے گی۔ میں وہاں اپنا مادی وجود چھوڑ کر جلدی سے یہاں چلی آؤں گی جہاں کشتی میری منتظر ہو گی۔ یہاں میں اپنی بہن کی واپسی کا انتظار کروں گی۔" جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو اس نے اپنی بہن کی طرف سر ہلایا اور بیٹھ گئی دوسری بہن کھڑی ہوئی کہنے لگی۔

"میں سورج کی توام بیٹیوں میں سے ایک ہوں۔ یہاں اعلان کرتی ہوں کہ میں سترہ برس کے لئے تفریح منانے انسانوں کی دنیا میں جا رہی ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں اوکیجا میں پیدا ہوں گی۔ جس گھر میں پیدا ہوں گی وہاں میرے والدین دونوں کی عمر ستر برس ہو گی۔ وہ دونوں بے اولاد ہیں۔ میں سولہ برس تک ان کے پاس رہوں گی سولہویں سالگرہ کے بعد میں اپنے باپ سے کہوں گی کہ وہ مجھے ایک بیل خرید کر دے۔ اس بیل کے خریدے جانے کے تین دن بعد وہ بیل مجھے روند ڈالے گا۔ جونہی مجھے دفنایا جائے گا میں اپنا مادی وجود وہاں چھوڑ کر جلد از جلد یہاں پہنچوں گی۔"

جب وہ اپنی بات مکمل کر چکی تو دونوں بہنیں کشتی سے اتریں اور خاموشی سے جنگل کے اندر چلی گئیں۔ بارہ قدم چلنے کے بعد وہ دونوں رک گئیں ایک نے دوسری سے کہا۔ "وعدہ کرو تم وقت پر یہاں پہنچ جاؤ گی۔"

"ہاں ضرور اور تم بھی وعدہ کرو۔"

دو بہنیں ایک دوسری کا ہاتھ تھام کر وعدے کرتی رہیں اور پھر جنگل میں غائب ہو گئیں۔ بہادر شکاری درخت سے اترا اور بھاگنے لگا۔ وہ بھاگتا چلا گیا۔ اس نے ایک لمحہ کا توقف بھی گوارا نہ کیا' یوں منزلیں طے کرتا سات سرزمینیں' سات سمندر پار کر کے وہ اپنے گاؤں پہنچا جہاں سورج کی توام بیٹیوں میں سے ایک نے ستر برس کے جوڑے کے ہاں جنم لینا تھا۔ اس گاؤں میں پہنچ کر اس نے اس بوڑھے جوڑے اوبنیڈل اور آکیڈیو کا گھر پوچھا' لوگوں نے کہا بہادر شکاری! اس بوڑھے قریب المرگ جوڑے سے تمہیں کیا کام آن پڑا ہے۔ بہادر شکاری نے کوئی جواب نہ دیا تو لوگوں نے بوڑھے جوڑے کے جھونپڑے تک اسے پہنچا دیا۔ دونوں میاں بیوی سوکھے لکڑی کے ٹھنٹھ کی طرح تھے۔ زندگی کا تمام رس خشک ہو چکا تھا۔ وہ بہادر شکاری کو دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئے۔ بہادر شکاری نے تمہید باندھے بغیر کہا "میں تمہاری لڑکی سے شادی کروں گا' رشتے کے لئے آیا ہوں"

بہادر شکاری کیا کہہ رہے ہو؟ ہماری شادی کو پچاس برس ہو چکے ہیں اور ہم بے اولاد ہیں"۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہاری اولاد نہیں" بہادر شکاری نے کہا۔

"لیکن مجھے علم ہے کہ تم ایک بچی کے والدین بننے والے ہو۔ وہ اتنی حسین ہو گی کہ روئے زمین پر اس کی مثال نہیں ملے گی۔ اس سے میں شادی کروں گا۔ کسی دوسرے کو اس سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔

بوڑھے جوڑے نے کہا۔ "بہادر شکاری! اس میں کچھ شک نہیں کہ تم نے اپنی زندگی میں بڑے انوکھے کارنامے انجام دیئے ہیں مگر جو بات تم اب کہہ رہے ہو' وہ تمہارے علم اور تجربے سے ماورا ہے۔ ہم اب اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ والدین نہیں بن سکتے۔"

بہادر شکاری جھونپڑے سے نکل آیا۔ وقت گزرتا گیا۔ پانچ ماہ کے بعد بوڑھا اوبینڈل بہادر شکاری کے گاؤں پہنچا۔ وہ کانپ رہا تھا اس کی آواز میں لرزش تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "بہادر شکاری: تم نے درست کہا تھا میری بیوی ماں بننے والی ہے۔"

چار ماہ بعد بوڑھی سترسالہ عورت ماں بن گئی۔ بہادر شکاری اس گاؤں میں پہنچا اس نے نو مولود بچی کو

دیکھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک حسین تھی اور پراسرار جنگل میں اس نے جو دو توام بہنیں دیکھی تھیں ان سے اس کی شکل ملتی تھی۔

ایک عجیب بات ہوئی۔ جونہی بچی نے بہادر شکاری کے وجود کو اپنے قریب پایا وہ رونے لگی اور جب تک وہ وہاں رہا وہ مسلسل روتی رہی۔

بہادر شکاری کے کہنے پر اس نومولود بچی کا نام ایجیمسا رکھا گیا۔ بوڑھا والد کہنے لگا "بہادر شکاری! تم نے اس کا نام ایجیمسا رکھا ہے جس کا مفہوم توام ہوتا ہے لیکن یہ تو اکیلی ہے۔"

بہادر شکاری نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا: تم اس مصلحت کو نہیں سمجھ سکتے۔ بوڑھے والدین نے بہادر شکاری سے بحث کرنا لا حاصل سمجھا وہ اسے غیر معمولی انسان سمجھنے لگے جسے مستقبل کا حال معلوم تھا۔ وہ بہادر شکاری کی ایک ایک بات پر اندھا اعتماد کرنے لگے تھے۔

وقت گزرتا گیا ایجیمسا بڑی ہوتی گئی۔ وہ جب کبھی بہادر شکاری کو دیکھتی رونے لگتی۔ وہ جب اور بڑی ہوئی تو بہادر شکاری سے کترانے لگی۔ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے۔ ایک دن بہادر شکاری نے بوڑھے جوڑے سے کہا! ایک بات اپنے ذہن میں پختہ کرو' حالات خواہ کیسے ہی ہوں کبھی بیل نہ خریدنا اور اسے اپنے گھر نہ لانا۔

"ایک بیل" بوڑھے نے کہا" کیسی عجیب باتیں کرتے ہو بہادر شکاری"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر تمہیں ہر حال میں عمل کرنا ہو گا کیا تم سمجھ گئے؟"

"بات تو سمجھ میں نہیں آئی لیکن ہم وہی کریں گے جو تم کہو گے۔"

وقت گزرتا گیا۔ ایجیمسا کے حسن کی دھوم سارے علاقے میں مچ گئی۔ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے بوڑھے والدین کو اس سے اتنی محبت تھی کہ بیان سے باہر۔ وہ ہردم اس کی ہر آرزو اور تمنا پوری کرنے کے لئے بے تاب رہتے۔ اسے کانٹا چبھ جاتا تو ان کی جان پر بن جاتی' وہ بہت لاڈلی تھی۔ ماں باپ ہی کی لاڈلی نہیں بلکہ پورے گاؤں کی لاڈلی۔ بس اسے بہادر شکاری پسند نہ تھا جسے دیکھ کر وہ چھپ جاتی۔ حیلے بہانے سے وہ گھر سے نکل جاتی' اور جب تک وہ موجود رہتا واپس نہ آتی۔ بہادر شکاری بوڑھے والدین کو یاد دلاتا کہ خواہ کچھ ہو اس گھر میں بیل نہ لایا جائے۔

انجیمسا کی سولہویں سالگرہ کا دن آگیا اس روز وہ صبح صبح اٹھی اور اپنے والدین کے پاس جا کر ان کو سلام کرنے کے بعد بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ اسے اداس دیکھ کر بوڑھے والدین مضطرب ہو گئے۔

"بیٹی کیا ہوا؟ اتنی اداس کیوں ہو۔ جلدی بتاؤ ہمیں پریشانی ہو رہی ہے۔ یہ اداسی ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔"

انجیمسا نے کہنا شروع کیا "میری پیاری اماں' میرے پیارے بابا آپ دونوں جانتے ہیں کہ میں نے آج تک آپ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔"

"ہاں بیٹی ہم جانتے ہیں اور تمہاری فرمائش فوراً" پوری کریں گے۔ ہم تمہیں ایک پل کے لئے بھی اداس نہیں دیکھ سکتے۔"

"مجھے ایک بیل تو لا دو" انجیمسا نے کہا۔

اس کے بوڑھے والدین یوں چونکے جیسے انہونی بات ہو گئی ہو۔

"تم نے کیا کہا بیٹی ؟"

"پیارے بابا! میں نے کہا ہے مجھے ایک بیل لے دو۔"

"بیٹی تم بیل کا کیا کرو گی؟ بھلا کسی لڑکی نے کبھی بیل کی فرمائش کی ہے؟"

"بابا بات کو الجھاؤ نہیں مجھے ایک بیل چاہئیے۔ مجھے ایک بیل لا دو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو مجھے ایک بیل ضرور لا دو۔"

"بیٹی تم نے ایک ایسا تحفہ مانگا ہے جو ہم نہیں دے سکتے!"

مگر کیوں انجیمسا نے پوچھا۔

ماں باپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' بہادر شکاری نے انہیں سختی سے منع کیا تھا کہ اس کو یہ نہ بتانا کہ بیل گھر نہ لانے کی ہدایت اس نے دی تھی جب اس کے والدین نے کوئی جواب نہ دیا تو بیٹی روتی ہوئی اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ ماں باپ کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں وہ اسے منانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن انجیمسا نے ایک نہ سنی جب شام تک کچھ نہ کھایا گیا تو بوڑھا باپ بہادر شکاری کے پاس پہنچا۔ اسے ساری بات سنائی اور آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "بہادر شکاری اس طرح تو وہ بھوک سے مرجائے گی بتاؤ اب ہم کیا کریں؟"

"وہ بھوکی رہتی ہے تو رہنے دیں۔" بہادر شکاری نے سختی سے جواب دیا۔ "تمہارا دل بڑا سخت ہے بہادر شکاری؟" بوڑھا بولا "تم درندوں کا شکار کرتے ہو اس لئے تمہارے دل میں نرمی نہیں رہی۔ ہم والدین ہیں وہ ہماری آخری عمر کی اکلوتی چہیتی اولاد ہے۔ ہم اسے بھوک سے مرتے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ وہ تمہاری منگیتر ہے کیا تم اس سے محبت نہیں کرتے' کیا تم اسے یوں مرتے دیکھتے رہو گے؟"

"تم ہر حال میں میری ہدایت پر عمل کرو گے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا تم بیل لے کر نہ دینا" بوڑھا بڑبڑاتا ہوا اپنے گھر پہنچا دوسرا دن ہو گیا انجیمسا نے کچھ کھایا نہ پیا وہ اسے سمجھاتے اور اس کے آگے ہاتھ جوڑتے رہے لیکن انجیمسا نے ان کی کوئی بات نہ مانی وہ ایک ہی بات پر اصرار کرتی رہی کہ جب تک اسے بیل نہیں ملے گا وہ کچھ نہ کھائے گی۔

بوڑھے والدین کا دل ڈوبنے لگا اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے "ہم آخر بہادر شکاری کا حکم کیوں مانیں؟۔ وہ ہماری بیٹی کا دشمن بن گیا ہے۔ اس کا دل پتھر کا ہے ہم اس کی بات کیوں مانیں' وہ ہے کون ؟ کسی کو علم نہیں کہاں کا رہنے والا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ کیا ہم اپنی جان سے زیادہ عزیز بیٹی کو یوں ایک سخت دل شکاری کے کہنے پر بھوکی پیاسی مرنے دیں۔" دوسرے دن جب مرغ اذانیں دے رہے تھے تو بوڑھا باپ پڑوس کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک شخص کے پاس کئی خوبصورت بیل تھے۔ اس نے منہ مانگے دام دے کر ایک خوبصورت صحت مند اور توانا بیل خریدا اور تیزی سے چلتا ہوا خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جونہی وہ صحن میں داخل ہوا انجیمسا اور اسکی بوڑھی ماں بیل کو دیکھ کر تیزی سے صحن کی طرف بھاگیں۔ انجیمسا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی وہ جوش سے بیل کے منہ پر تھپڑ مارنے لگی۔ بیل طیش میں آیا تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے انجیمسا کو ٹکر مار کر نیچے گرایا اور پھر اپنے قدموں سے کچلنے لگا اور اس سے پہلے کہ اس کے بوڑھے والدین بیل کو قابو کرتے انجیمسا مر چکی تھی۔

روتا سر پیٹتا خاک اڑاتا بوڑھا بہادر شکاری کے پاس پہنچا اور آنسو بہاتے ہوئے انجیمسا کی موت کا قصہ

سنایا تو بہادر شکاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ تیزی سے اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا' اپنی بندوق اٹھائی' ضروری چیزیں ایک کپڑے میں باندھیں باہر نکل کر اس نے بوڑھے سے کہا!

"اپنے گھر جاؤ اور جب تک میں واپس نہ آؤں اسے دفنانا مت' میری واپسی کا انتظار کرنا"....."مگر تم کہاں جا رہے ہو اس قیامت کی گھڑی میں ہمیں اکیلے چھوڑ کر؟"

بھاگتے ہوئے بہادر شکاری نے پلٹ کر غصے سے کہا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو۔"

بہادر شکاری برق رفتاری سے بھاگتا سات سرزمینوں اور سات سمندروں کو عبور کرتا اس پر اسرار جنگل کے پاس واقع سمندر تک پہنچا جب اس نے وہاں انجیمسا کو نہ دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا کہ وہ وقت پر وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر انجیمسا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد بہادر شکاری نے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا سورج ابھی ابھی افق پر نمودار ہوا تھا۔ انجیمسا ایک ملکہ کی طرح تمکنت سے چلتی آ رہی تھی۔ بہادر شکاری تیزی سے جھاڑی سے نکلا اور للکارا جہاں ہو وہیں رک جاؤ!

انجیمسا کے قدم رک گئے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"بہادر شکاری! تم نے مجھے کیوں روکا؟"

"تم اس سوال کے پوچھنے سے پہلے ہی اس کے جواب سے واقف ہو۔ میں نے تم سے شادی کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا بہادر شکاری! میں تمہاری دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ میں تو وہاں تفریح منانے گئی تھی۔ میں سورج کی بیٹی ہوں۔"

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں" بہادر شکاری بولا۔ "اسی لئے تو میں تمہیں سورج کے پاس جانے سے روکنے کے لئے یہاں پہنچ گیا ہوں! تمہیں میرے ساتھ میری دنیا میں واپس جانا ہو گا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو۔"

"میں تمہیں گولی مار کر کسی پرندے کی طرح ہلاک کر دوں گا۔" بہادر شکاری نے پر عزم لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے ایسا کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گی تب میں تمہاری دنیا کی رہوں گی نہ سورج کی۔ میں اپنی بہن سے کبھی نہ مل سکوں گی"۔ "میں یہ بھی جانتا ہوں اور اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی دنیا کی نہ رہنے سے بہتر ہے کہ میری دنیا کی ہو جاؤ۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے کہنے لگی۔

"بہادر شکاری مجھے اپنی بہن کے پاس جانے دو' مجھ پر رحم کرو مجھے سورج کی دنیا میں واپس جانے دو' ہم تمہیں دنیا کا امیر ترین آدمی بنا دیں گے' تم جو مانگو گے تمہیں دیا جائے گا۔"

بہادر شکاری نے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف اور صرف بوریت سے نجات چاہئے اور یہ نجات تمہاری رفاقت میں مل سکتی ہے۔ میں تم سے شادی کروں گا یا تم کو ہلاک کر دوں گا۔"

چند لمحے وہ سوچتی رہی۔ اس کے آنسو رک گئے۔ پھر وہ بولی "اچھا تو بہادر شکاری تمہارے عزم نے میرا دل جیت لیا۔ میں تم سے شادی کروں گی اب تم بھاگتے ہوئے اس گاؤں میں پہنچو جہاں میرا جسد خاکی پڑا ہے۔ لوگ وہاں میری لاش کے ارد گرد ماتم میں مصروف ہوں گے۔ اس بوڑھے جوڑے سے جو دنیا میں میرے والدین

تھے' کہنا کہ تم سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے' جس سے میں مری نہیں بلکہ بے ہوش ہوں' تم میرے رخساروں پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارنا پھر تم دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

"مجھے منظور ہے" بہادر شکاری بولا "لیکن تمہیں اپنا وعدہ نبھانا ہوگا۔ جانے سے پہلے میں تمہارے سر کے بالوں کی ایک لٹ اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تاکہ تم مجھے دھوکا نہ دے سکو' میں جانتا ہوں کہ تم سورج کی دنیا میں اس حالت میں واپس نہیں جا سکتیں کہ تمہارے سر پر پورے بال نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر بہادر شکاری نے جلدی سے اس کے سر سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ لی۔ انجیمسا بہادر شکاری کی بہادری کے علاوہ اس کی ذہانت کی بھی قائل ہو گئی۔ واقعی وہ سر کے پورے بالوں کے بغیر واپس سورج کی دنیا میں نہ جا سکتی تھی۔ پھر وہی ہوا جو کچھ انجیمسا نے کہا تھا۔ چھ ماہ بعد بہادر شکاری اور انجیمسا کی شادی ہو گئی وہ دونوں آخری عمر تک ہنسی خوشی دن گزارتے رہے۔ جب وہ مرے تو دونوں ایک ساتھ مرے ان کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں تھے۔"

بوڑھی عورت نے کہانی ختم کر دی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"کہو تمہیں یہ کہانی کیسی لگی۔ میرے بیٹے! یہ سچی کہانی ہے۔"

"واقعی بڑی دلچسپ اور خوبصورت کہانی ہے" اجنبی نے جواب دیا "میں نے کئی کہانیاں سنیں اور جمع کی ہیں لیکن ایسی کہانی اس سے پہلے نہیں سنی۔ پھر تم نے کہانی سنانے کا معاوضہ بھی مجھ سے نہ لیا"۔ "معاوضہ تو میں نے لیا ہے" بوڑھی عورت بولی "تم میرا گھڑا اٹھا کر میرے گھر تک لائے ہو یہی میرا معاوضہ ہے۔"

"بڑی اماں! یہ کس زمانے کی کہانی ہے؟" اجنبی نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب مرد' مرد ہوتے تھے اور عورتیں عورتیں ہوتی تھیں۔"

اجنبی غور سے بوڑھی عورت کو دیکھ رہا تھا وہ ایک ایک لفظ ہی بڑی ترتیب سے بیان ہی نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کے ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تاثرات بھی نرالے تھے۔ اجنبی مسکرانے لگا وہ جانتا تھا کہ بڑی اماں اونچا سنتی ہے۔ اس لئے مسکرا کر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "بڑی اماں بہت ذہین ہے' جانتی ہے کہ اس زمانے میں انسان دوسروں کا بوجھ اٹھانے سے کتراتا ہے۔ اس نے اپنی ضرورت کس ذہانت اور خلاقی سے پوری کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ لوگوں کو کہانی سنانے کا لالچ دے کر اپنا پانی سے بھرا بھاری گھڑا اٹھوا کر گھر تک لے آتی ہے۔ یہ کہانی سچی نہیں اس کی اپنی تخلیق ہے۔ وہ یہ کہانی لوگوں کو اتنی بار سنا چکی ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ ایک ترتیب سے اسے ازبر ہو چکا ہے' کتنی ذہین ہے یہ بڑی اماں؟" --- "کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا وہ بولی تمہیں بتایا تو تھا کہ میں نیم بہری ہوں۔"

"بڑی اماں میں کہہ رہا تھا اب مجھے اجازت دو"۔ "اچھا تو جاؤ۔" وہ بولی۔

دور دراز کے علاقے سے آیا ہوا نگر نگر کہانیاں جمع کرنے والا اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اس نے دل میں کہا آج میں نے جو کہانی سنی وہ اہمیت نہیں رکھتی اصل کہانی تو وہ بوڑھی عورت بنتی ہے۔ جس نے ایک کہانی تخلیق کر رکھی ہے۔ یہ بڑی اماں اصل کہانی ہے۔ جو یہ نہیں جانتی کہ دنیا میں ہر چیز پیسے کے بدلے مل جاتی ہے لیکن اس کے پاس پیسے نہیں۔ اس لئے وہ کہانی کا لالچ اور اشتیاق پیدا کر کے لوگوں سے اپنا بوجھ اٹھوا لیتی ہے۔

الیکس لاگیوما / زاہد نوید

دوران سفر کافی کی طلب

وہ مکئی کے کھیتوں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ اور اب دور تک پھیلے ہوئے نیم صحرائی قصبے میں سے گزر رہے تھے۔ جنوب کی طرف راستے میں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں بالکل کسی وسیع و عریض گرد آلود قالین کی طرح --- تارکول کی سڑک پر ان کی کار کے پہیے دندناتے جا رہے تھے۔

"ایک سینڈ وچ اور ----" زائدہ نے کہا۔ وہ پچھلی نشست پر کمبل میں لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی --- اسکی عمر چھ برس تھی اور وہ طویل اور تھکا دینے والے سفر سے خاصی اکتائی ہوئی نظر آ رہی تھی --- قدرتی مناظر کو دیکھنے کا جوش اب سرد پڑ چکا تھا۔ تکان اتنی تھی کہ اب اسے گزرتے ہوئے درختوں کی قطاروں میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

"ٹن میں تھوڑی سی چائے ہے۔ خود ہی لے لو" ماں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"رے! کیا تم بھی کچھ کھاؤ گے؟"

"بھوک نہیں ---" اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔

"ممی! کیپ ٹاؤن کتنی دور رہ گیا ہے؟" سینڈ وچ کھاتے ہوئے زائدہ نے پوچھا۔

"کل دوپہر تک ہم وہاں ہوں گے --" ماں نے جواب دیا۔

"کیا ابو وہاں ہمارے منتظر ہوں گے؟"

"یقیناً" ---"

رات بھر سے وہ گاڑی چلا رہی تھی۔ تکان سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ریت کے ذرے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں میں جا گھسے تھے۔ راستے میں وہ کچھ دیر کو رکے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سفر میں آئی ہوئی یہ رات کہاں گزاریں۔ ہوٹل تو صرف سفید جلد والوں کے لئے مخصوص تھے۔ اور سیاہ فام کو ان میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔ ویسے بھی اس علاقے میں سفید چمڑی والے ہی آباد تھے۔ مگر ان کے نوکر چاکر سیاہ فام تھے جو اصل آبادی سے دور کچے گھروں میں رہتے تھے۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ یہاں کسی سے ان کی جان پہچان نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو اسکے چہرے پر بلا کی اداسی تھی۔ اور وہ ذہنی طور پر سخت مضطرب تھی مگر اس اضطراب کو وہ اپنے بچوں سے چھپانا چاہتی تھی۔

اس نے پھر سفر شروع کیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ بچے بھی سو رہے تھے۔ اس کے سر میں شدید درد اٹھا۔ رات بھر کی بے آرامی اور پھر سر درد' اب وہ خاصی اکتائی ہوئی اور بے زار سی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں زائدہ کی آنکھ کھل گئی' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"ممی! کچھ کھانے کو مل جائے گا۔"

"مجھ سے کیوں پوچھتی ہو۔ پڑا ہے لے لو...." اس نے سخت بیزاری سے کہا۔ دونوں اطراف کے مناظر کسی

فلم کی طرح پس منظر میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کار کو ایک مقام پر آ کے کچے راستے پر اترنا پڑا۔ گرد اڑی تو کار کے پیچھے سرخ اور مٹیالا سا بادل پیچھے پیچھے آنے لگا۔ دفعتاً" ایک لمبی سی دم والا پرندہ ان کی کار کے ساتھ ساتھ اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

رے نے کہا "می اس بے وقوف پرندے کو دیکھو" ماں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران ہی کچھ سستانے کی کوشش میں تھی۔

"ٹرین پکڑ لیتے تو بہتر ہوتا۔۔۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "لیکن بل نے خط میں لکھا تھا کہ اسے اپنے کاروباری کاموں کے لئے کار کی اشد ضرورت ہے۔"

اس کے سر میں سخت درد تھا مگر وہ بروقت منزل پر پہنچنے کے لئے متواتر ڈرائیو کر رہی تھی۔

"مجھے تھوڑی سی کافی پینی ہے" رے نے کہا۔ اور اس نے ڈیش بورڈ کے نیچے ریک میں سے فلاسک نکالنی چاہی۔۔۔ رے اپنے چھوٹے موٹے کام خود ہی کر لیتا تھا۔

"تھوڑی سی کافی مجھے بھی دو۔۔۔" پچھلی نشست سے زائدہ بولی

"صبر کرو، تمہیں تو ہر وقت کھانے پینے کی فکر رہتی ہے" رے نے جواب دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ اس وقت میں صرف کافی پینا چاہتی ہوں۔"

"ابھی صبح تو تم نے کافی پی تھی۔"

"تھوڑی سی اور چاہیئے۔"

"لالچی، لالچی!"

"بچو" ماں نے غصے سے کہا۔ "بس کرو یہ فضول بحث۔"

"اس نے پہل کی تھی۔"

"چپ ہو جاؤ.... میں کہتی ہوں۔۔" اور اس وقت رے فلاسک کا ڈھکنا کھول رہا تھا۔

"ارے اس میں تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ یہ تو خالی ہے۔"

"اب میں کیا کروں مجھے تو کافی چاہئے تھی۔۔۔" زائدہ چیخ کر بولی۔

"تو کیا ہو گیا؟ تھوڑا صبر کرو..... رستے میں کوئی دکان آئی تو اور لے لیں گے۔" ماں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

اب تک سورج نکل آیا تھا۔ اور اس کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر وہ مسلسل ڈرائیو کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے پورے وجود میں ایک تناؤ کی کیفیت تھی۔ جیسے اس کے وجود کا ایک ایک حصہ رسیوں سے بندھا ہوا ہو اور کسی رسی کے ذرا سا ڈھیلے ہونے کی صورت میں اسکا پورا وجود ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ رستہ بھی عجیب و غریب تھا۔ کبھی گرد آلود چٹیل میدان اور کبھی پہاڑیوں کے تنگ سلسلے۔۔۔

"مجھے کافی چاہیے۔۔۔" زائدہ پھر بولی۔

"ابھی کوئی دکان آتی ہے تو خرید لیں گے۔ کیوں ضد کرتی ہو!" ماں نے جواب دیا۔

"مجھے اس وقت کافی چاہیے نا!"

"خاموش رہو.... سینڈوچ پڑا ہے وہ کھالو۔"

"سینڈوچ نہیں۔۔۔ کافی۔۔۔" زائدہ ضد پر قائم تھی۔

ان کی کار چند شکستہ جھونپڑیوں کے قریب سے گزری جہاں سڑک پر کھڑے چند ننگ دھڑنگ بچے پورے دانت باہر نکال کر ان کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔ رے نے مسکراتے ہوئے جواباً" ہاتھ ہلایا۔ اور پھر وہ بچے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر انہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز چیتھڑوں میں ملبوس تین سیاہ فام نظر آئے۔ کار زناٹے کے ساتھ ان کے قریب سے گزر گئی۔۔۔ ایک لوہے کے پل سے گزرنے کے لئے کار کی رفتار ست ہوئی۔ گلابی چہروں والے دو سفید فام نوجوانوں نے خشمگین نگاہوں سے ایک سیاہ فام عورت کا ایک چمکیلی کار ڈرائیو کرنے کا منظر گوارا کیا۔

"می اس جگہ کا نام کیا ہے؟" رے نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" ماں نے جواب دیا۔

"کیا اب ہمیں یہاں سے کافی مل سکے گی!" زائدہ بولی۔

"میرا خیال ہے ..." تم لوگ ذرا تمیز اختیار کرو تو....."

"کوئی ٹھنڈا مشروب پیو گے؟" ماں نے پوچھا۔

"مجھے تو بہت سی کافی چاہیے' بہت سی چینی کے ساتھ۔۔۔"

"ٹھیک ہے" ماں نے جواب دیا.....

سامنے ہی ایک ریستوران نظر آیا۔ ریستورات کے باہر لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ اوپر کوکا کولا کے سائن بورڈ آویزاں تھے۔ دیوار کے ساتھ خالی جگہ تھی جہاں سیاہ فام گاہکوں کو Serve کیا جاتا تھا۔ وہاں چیتھڑوں میں ملبوس کچھ کالے گرد اڑاتے کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے۔

ماں نے کار کیفے کے بڑے دروازے کے سامنے کھڑی کی۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا اور کھڑکیوں کے وینس کے بنے ہوئے شیشے بالکل شفاف تھے۔ ان پر گرد کا ایک ذرہ تک نہ تھا۔۔۔

"مجھے فلاسک دو۔۔۔۔" ماں نے رے سے کہا۔

"اور بچو' تم ذرا آرام سے بیٹھنا میں ابھی آئی۔"

کار سے باہر نکل کر جیسے اسکی جان میں جان آگئی۔۔۔ اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو قدرے سکون ملا۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور خود ہی اپنے جسم میں ایک لذت آمیز لہر محسوس کی.... سکون کا یہ احساس فقط ایک لمحے کے لئے تھا۔ یہ لمحہ گزرتے ہی اسے اپنے اعصاب میں پھر وہی تناؤ' سر میں پھر وہی درد محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنے چست لباس کی شکنیں درست کیں مگر جیکٹ کے بٹن کھلے ہی رہے۔ پھر وہ فلاسک لے کر سٹیل اور پلاسٹک کے فرنیچر کے درمیان سے گزرتی ہوئی کیفے کے اندر داخل ہو گئی۔۔۔ کیفے کے اندر کا ماحول بہت خنک تھا۔ شیشے کی الماریوں میں رکھے ہوئے نوادرات مستقبل کے کسی عجائب گھر کا پتہ دیتے تھے۔ عقب میں کسی کونے سے آلو تلے جانے کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر ایک موٹی بھدی سفید فام عورت کھڑی تھی۔۔۔۔

"یہ فلاسک کافی سے بھر دیجئے پلیز!" اس نے کہا۔

کاؤنٹر پر کھڑی عورت کا منہ دیوار میں پڑے ہوئے شگاف کی طرح کھلا۔۔۔ اس نے غضبناک ہو کر کہا "کافی! میرے خدایا! اے یسوع مسیح!۔۔۔ یہ منحوس کالی کلوٹی یہاں!" اس کی آنکھیں اپنے سامنے بہترین وضع کے قیمتی لباس میں ملبوس ایک خوبصورت' سمارٹ انڈین نقوش والی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئیں۔ وہ چلانے لگی۔۔۔۔

"قلی' کافر' جنگلی۔۔! نکل جاؤ یہاں سے" "تمہیں جرات کیسے ہوئی انگریزی بولنے کی" یہ بکواس سن کر اسے

ایک دھچکا سا لگا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے اسکے وجود میں کہیں کوئی پرانا زخم کھل گیا ہو۔۔۔ اس نے فلاسک لہرا کر اس سفید فام عورت کے منہ پر دے ماری۔

"کمینی، سفید بلی، رذیل ۔۔۔۔ تم خود قلی ہو گی"۔۔۔

خون کا فوارہ اسکی آنکھ کے اوپر سے بہ نکلا۔۔۔ اس نے ہاتھوں سے اپنی آنکھ دبائی اور پیچھے کو گر گئی۔۔۔ پاس کھڑے ہوئے سفید فام لڑکے کے منہ سے لولی پاپ نکل کر نیچے گر گیا۔۔۔ وہ چیختا ہوا باہر نکل گیا۔۔ باہر کھڑے ہوئے کچھ سیاہ فام خوف سے سمٹ گئے، وہ واپس مڑی اور غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی کیفے سے باہر نکل آئی۔۔۔ اس کے چہرے پر غصے کا تناؤ تھا۔ اس عالم میں اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ کیفے کی عقبی دیوار کے شگاف کے پاس کھڑے ہوئے کچھ سیاہ فام ذرا قریب آئے اور اپنے جیسی جلد والی کو حیرت سے تکنے لگے۔

اس نے جلدی سے کار سٹارٹ کی اور تیزی سے نکل گئی۔ اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر سختی سے جمے ہوئے تھے۔ غصے کی وجہ سے اسے کچھ اور بھی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ جب وہ کیفے سے کافی دور نکل آئی تو اس نے گاڑی کی رفتار ذرا سست کی اور سستانے کی کوشش کرنے لگی۔ بچے خاموش تھے انہیں احساس ہو چکا تھا کہ کوئی ناخوشگوار بات ضرور ہوئی ہے۔

کافی دیر کے بعد رے بولا "امی! کافی نہیں ملی!"

"نہیں۔ کافی کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

"ہائے مجھے کافی چاہیے تھی۔۔۔" زائدہ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"چپ ہو جاؤ، دیکھتی نہیں ہو، ماں کتنی تھکی ہوئی ہے۔۔۔" وہ بولی

"آپ فلاسک کہاں چھوڑ آئیں۔" رے نے پوچھا۔

"چپ رہو۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔

گرم زمین پر سورج کی روشنی سہ پہر کے کسی بھوت کی طرح رقص کر رہی تھی۔ سڑک پر سامنے کچھ گاڑیاں تھیں۔ وہ ان سب کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔۔۔ کار کے اندر خاموشی تھی۔ رے نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "گاڑی پاپا ڈرائیو کیا کریں گے؟"

ہاں، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے" زائدہ بولی۔

"ممی! تھوڑی دیر بعد تو ہمیں کافی مل جائے گی!" اس نے کہا۔

ہاں بیٹے! شائد!۔۔۔" ٹریفک کی رفتار سست دیکھ کر اس نے بھی ایکسیلیٹر پر سے اپنا پاؤں اٹھا لیا۔۔۔"

"اس پہاڑی کی طرف دیکھو۔۔۔۔ لگتا ہے کسی کا چہرہ ہے۔۔۔"

"کیا واقعی کسی کا چہرہ ہے؟" زائدہ نے استفسار کیا۔

"احمق ہو تم۔" رے بولا "یہ اصلی چہرہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یوں لگتا ہے جیسے کسی کا چہرہ ہو۔۔۔"

کار رکتی ہے۔ ماں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ آگے ٹریفک بند ہے۔ ایک چھوٹی وین، لینڈ کروزر، سڑک کے عین بیچ میں کھڑی تھی۔۔۔ دو پولیس والے گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔۔۔ انہوں نے ایک گاڑی چیک کی۔ گاڑی کے مالک کو سیلوٹ کیا اور گاڑی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی، پھر وہ پولیس والے دوسری گاڑی کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ صورتحال دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ اس نے گاڑی کو بریک لگائی اور اپنی باری کا

انتظار کرنے لگی۔ اتنے میں سپاہی اس کے قریب آیا اور بولا "یہ کچھ مشکوک لگتی ہے"۔۔۔ دوسرے سپاہی نے اپنی سٹین گن سیدھی کرلی۔ سپاہی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ کیا تمہیں یقین نہیں تھا کہ انہوں نے ہمیں فون پر اطلاع دے دی ہو گی۔۔۔؟"

کار میں بیٹھے ہوئے بچے بری طرح سہم گئے۔

"کیوں کیا ہوا۔۔۔" وہ بولی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ کیا ہوا۔۔۔" سپاہی نے جواب دیا۔

براؤن سوٹ اور دھوپ کی عینک والی کالی لڑکی!"

"تم سب کچھ اچھی طرح جانتی ہو۔۔۔ اور تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

"کیوں میں نے کیا کیا ہے" اس نے پھر کہا۔ اس کی آواز میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ مگر وہ اپنے بچوں کے لئے پریشان نظر آرہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔ پتہ چل جائے گا۔۔ جلدی!" سپاہی نے کہا۔

"گاڑی موڑو۔ اور سنو' کوئی چالاکی مت دکھانا۔" اس نے درشت لہجے میں حکم دیا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔ مجھے تو اپنے بچوں کو لے کر کیپ ٹاؤن جانا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ تم نے جو فساد کیا ہے اس کی سزا تو بھگتو گی نا!"

پولیس کار کے ڈرائیور نے کار سٹارٹ کی۔

"اس گاڑی کے پیچھے پیچھے آؤ۔۔۔" سپاہی نے ڈرائیور سے کہا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی سٹارٹ کرلی۔

"دیکھنا! کوئی چالاکی نہیں! سمجھیں!"۔۔۔

بادل نخواستہ وہ بھی پولیس والوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

پہاڑ سے واپسی

جی ہاں، مجھے پہاڑوں کے سینے میں واقع وہ کٹیا ابھی تک یاد ہے ابھی موسم گرما کی شروعات تھیں اور گھنے سبزے نے ہر چیز کو گہرے سبز رنگ میں رنگ دیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں ایک گہرا سانس لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پرانے چیل کے درخت کا سہارا لیا جو اتنا بلند تھا کہ آسمان کے لئے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ ہر چیز اس طرح تھی جیسے کہ وہ ہمیشہ سے تھی، پہاڑ گہرا تھا، پانی بہتا تھا، ہر رنگ کے درخت اور پودے اپنے گرمائی بوجھ تلے جھکے جھکے جاتے تھے۔ پرندوں کی عجیب آوازیں چاروں طرف پھیلی تھیں اور کوئی بھی آواز عام دنیا کی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن مجھے اپنے دل کے اندر کہیں بھی بدھ نہ مل سکا اور سب سے بری بات یہ ہوئی کہ سورج بھی ڈوب گیا اور ایک بار پھر رات چھا گئی۔ دن کے اس وقت کو گزارنا میرے لئے خاص طور پر مشکل ہوتا تھا۔ پہاڑ ابدی طور پر متین اور پراسرار تھا مگر وہاں کھڑے ہوئے مجھے معلوم تھا کہ میں آوارہ گردی میں ایک دن اور ضائع کر چکا تھا۔ میں کہا کرتا تھا کہ اپنے بچپن کے دوران ایک دن اچانک گیان بودھی ذہین کی روشنی اور آگہی نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا اور یوں میں پہاڑوں میں بدھ بھکشو کی حیثیت سے داخل ہو گیا تاہم اس خاص دن میری تمام تر کوششوں اور انتہائی بلندی تک پہاڑوں پر چڑھنے کے باوجود چوٹی میری نظروں سے اوجھل رہی۔ حقیقت میں اس کے نظر نہ آنے سے میری کوششوں میں اور بھی اضافہ ہوا اور میں نے اور بھی بلندی تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن جب ایک اور دن بغیر کسی کامیابی کے ختم ہوا تو میں صرف اتنا کر سکا کہ اپنے لئے کوئی ایسی جگہ تلاش کروں جہاں میں اپنے جسم کو لٹا سکوں جو دنیاوی آسائشوں سے آلودہ ہو چکا تھا۔ میں اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی ٹھوڑی کو اپنے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ پھر میں نے "کوان سی ام پوسل" کو یاد کیا اور ایک بار پھر ان کے مقدس نام کو عادتاً "دھرایا" میں انتہائی مایوس تھا اگر میں بھکشو نہ ہوتا اور اگر ایک عام آدمی کی طرح میرے بال بڑھے ہوئے اور کپڑے رنگ برنگے ہوتے تو میں سگریٹ پی لیتا اور کم از کم ایک لمحے کے لئے اپنے پراگندہ ذہن کو اس کے سرے سے جہالت کی طرح اٹھتے ہوئے دھوئیں کے درمیان آسودہ کر لیتا۔ مگر میں ایک بدھ بھکشو تھا جسے مچھلی گوشت اور شراب اور تمباکو سے اس طرح بچنا تھا جیسے طاعون سے بچا جاتا ہے۔ چنانچہ میرے لئے طمانیت کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ میں وہاں خالی مولی بیٹھ کر بدھوں اور پوسلوں کے ناموں کا ورد کروں۔ میں اس راستے پر کہنیوں کے بل اوپر چڑھنے کی جدوجہد اس لئے کر رہا تھا کہ میں اس عظیم استاد کی تلاش میں تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ان پہاڑوں میں کہیں رہتا ہے۔ میں نے اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ کچھ سن رکھا تھا سب سے پہلے اپنی شاندار جسمانی صحت اور باوقار انداز کی وجہ سے وہ ایک تارک الدنیا بدھ بھکشو جو دو پہاڑوں میں دنیا سے دور رہتا ہو، کے بجائے ہزاروں فوجیوں پر کمان کرنے والا ایک جنرل نظر آتا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں تھیں وہ کسی چیتے کی آنکھوں جیسی تھیں۔ اور ان سے مترشح ہونے والی شعائیں خود بخود ان میں

جھانکنے والے کے سر کو جھکنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ اور اس کی گرجدار آواز کا ارتعاش شیر کی دھاڑ سے اتنا ملتا تھا کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے شق ہو جاتے تھے۔ جہاں تک اس کی عمر کا تعلق ہے وہ دنیاوی حساب کتاب کے مطابق (۷۱) اکہتر سال کا تھا۔ لیکن وہ زندگی بھر مجرد رہا تھا اور اوائل عمری سے ہی اپنے بے داغ جسم کو بدھ اور لاوزی کی تعلیمات کے تابع کر دیا تھا۔ وہ اپنے جسم اور ذہن کو اپنے آقا کی تعلیمات کے مطابق ہی حرکت دیتا تھا۔ اور اب بھی جبکہ اس کی عمر اکہتر سال ہو چکی تھی ان تعلیمات سے انحراف نہیں کرتا تھا۔ وہ واقعی تمام زمانوں کا آقا تھا۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی اس کی آگہی کی حد اتنی وسیع تھی کہ دنیا کے تمام طور اطوار اور لامتناہی کائنات میں کار فرما' اصول و ضوابط' تمام زمان و مکان کے مسائل جو دوسرے کے لئے پیچیدہ اور لاینحل ہوتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ اسے بخوبی معلوم تھے۔ لیکن کسی انجانی وجہ سے اس کے ارفع اور خوبصورت نام کے بارے میں جب بھی کچھ سننے کو ملتا تھا وہ ہمیشہ افواہ کی شکل میں ہی ہوتا تھا۔ درحقیقت کسی نے کبھی بھی اس کی باوقار شخصیت کو دیکھا تھا نہ اس کی گونجیلی آواز کو سنا تھا۔ اس طرح کسی نے بھی اس کی مہربان رہنمائی میں آگہی کی منزل حاصل نہیں کی تھی۔ پھر بھی حیران کن طریقے سے اس کے نمودار ہونے اور اس کی تعلیمات کے بارے میں کہانیاں پہاڑوں سے اتر کر اس عام دنیا کی گرد و غبار سے اٹی ہوئی گلیوں میں پھیل چکی تھیں۔

اس کا نام "یک انگشت" تھا اس نے کبھی بھی اس نام سے پکارنے کو نہیں کہا تھا اسے یہ نام کہنے سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ملا تھا کہ جب بھی کوئی اس سے "صراط مستقیم" کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ صرف ایک انگشت بلند کر دیتا۔

مزید ستم ظریفی یہ کہ اس کی ایک انگشت موجود نہیں تھی اس کے بارے میں بھی ایک کہانی موجود ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب وہ ابھی ایک نوجوان نو آموز ہی تھا کہ ایک پہاڑوں میں سرگرداں بھکشو آقا کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے حاضر ہوا جو اتفاق سے اس وقت کہیں گیا ہوا تھا اس نے بھکشو کو خوش آمدید کہا اور آمد کا مدعا دریافت کیا۔ بھکشو گویا ہوا کہ وہ بڑے دور سے آقائے بزرگ کے دیدار کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اس نے بھکشو کو مطلع کیا کہ آقائے بزرگ کی آمد کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بھکشو نے اپنے ناکام ہو جانے کے بارے میں کچھ کہا اور جب اس نے زبان چپکائی تو اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھکن مایوسی میں بدل گئی نو آموز نے تب بھکشو سے اس کی اس قدر پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ بھکشو نے آسمان کی سمت نظر اٹھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے جواب دیا کہ وہ راستے کے بارے میں دریافت کرنے آیا تھا۔ نو آموز نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی اتنی شدید کوشش کی وہ ہر روز یہ سرگرداں بھکشو قطار در قطار یہی سوال پوچھنے آتے تھے اور ہر روز اس کا آقائے بزرگ خاموش رہتا اور صرف ایک انگشت بلند کر دیتا۔ نو آموز جانتا تھا کہ اسے راستے کے بارے میں صرف اتنا کرنا تھا کہ ان سوالات کا سینکڑوں بار پر اعتماد طریقے سے جواب دے۔ پروقار نظر آنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے وہ اپنی ٹانگوں کو مکمل کنول آسن کی شکل میں لاتے ہوئے بیٹھ گیا' بالکل بدھ کے مجسموں کی طرح جو اس نے دیکھ رکھے تھے' اور بھکشو سے راستے کے بارے میں سوال پوچھنے کو کہا۔ بھکشو جیسے سکتے میں آگیا مگر وہ نو آموز کی متانت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کی (نو آموز) نسل کے بزرگ بھکشوؤں نے ایک لکڑھارے کے کلہاڑے کی آواز سے اچانک بیداری حاصل کر لی تھی یا اس کے سارے شکوک و شبہات جانوروں کو کھیل میں مشغول دیکھتے ہوئے ختم ہو گئے تھے۔ اسے جو راستے' کی تلاش میں اتنی دور تک آچکا تھا کہ کسی آدمی

کی عمر کو بنیاد بنا کر اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کی بجائے زیادہ بہتر سمجھداری کا مظاہرہ کرنے چاہیے۔ اپنی حماقت پر خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے اپنے لباس کی شکنیں درست کیں اور نوآموز کی طرف یوں رخ کرتے ہوئے جیسے کہ وہ بذات خود آقائے بزرگ ہو' دوستانہ انداز سے تین بار رسمی رکوع تعظیما" پیش کیا اور پوچھا "راستہ کہاں ہے"؟ نوآموز نے کنول آسن میں رہتے ہوئے اپنی آنکھوں کو پرسکون انداز میں بند کئے ہوئے صرف ایک انگشت بلند کر دی اس پر تحیر زدہ بھکشو کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا وہ رخصت ہو جائے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد ہی آقائے بزرگ واپس آگیا اور نوآموز نے اسے پورا واقعہ سنا دیا۔ آقائے بزرگ نے باآواز بلند ہنستے ہوئے تالی بجائی اور پھر بڑی نرمی سے اپنے شاگرد کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایسا شیر کا بچہ اس کے زیر تربیت تھا۔ یہ سن کر نوآموز نے دریافت کیا کہ کیا اس نے ٹھیک کیا تھا جس پر آقائے بزرگ نے کہا کہ بالکل ٹھیک اور یہ کہ شیروں کے بچے شیر ہی ہوتے ہیں ہرن نہیں۔ لیکن پھر اس نے کہا کہ اب جب کہ نوآموز نے اس سے اسا کا کرتب چرا لیا تھا تو وہ اپنی کمائی کیسے کرے گا۔ اس (نوآموز) نے آقا سے پوچھا کہ اس کا مطلب (مدعا) کیا تھا۔ جس پر آقا نے جوابا" کہا کہ یہ غیر اہم بات تھی اور یہ کہ اب اسے (آقا کو) نوآموز سے راستے کے بارے میں دریافت کرنا چاہیے۔ "جو بھی چاہیں دریافت فرمائیں" نوآموز نے عرض کیا جس پر آقا تین بار کورنش بجا لایا اور دریافت کیا کہ راستہ کیا ہے؟ نوآموز نے فورا" اپنی انگشت بلند کر دی مگر پھر اپنا ہاتھ شدید درد کی وجہ سے فورا" ہی پیچھے کھینچ لیا۔ آقا نے اپنی مٹھی میں ایک خنجر چھپا رکھا تھا جس سے اس نے وہ انگشت کاٹ ڈالی تھی۔ نوآموز چیختے ہوئے اور اپنے لہولہان ہاتھ کو تھامتے ہوئے دھرم ہال سے بھاگ کھڑا ہوا مگر ایک کڑک دار آواز نے اسے روک لیا جس پر اس نے مڑ کر دیکھا تو صحیح آقا ایک انگلی اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ نوآموز نے اچانک ہی دائرے میں رقص کرنا شروع کر دیا بعد ازاں یہ کہا گیا کہ اس پر یک بارگی روشنی اور گیان سے اس حیران کن حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ سورج چاند اور ستارے' پہاڑ اور دریا اور ساری کی ساری کائنات اس واحد انگشت میں سما گئی تھی یہ وہ ساری کہانی تھی جو مجھے مندروں اور اس کمتر دنیا میں گھومتے ہوئے اس کی انگشت کے زیاں کے بارے میں معلوم ہوئی تھی لیکن یہ کہانی بھی ایک غیر مصدقہ افواہ ہی تھی اور اسی لئے میرے لئے اس سے ملاقات اور بھی ضروری تھی۔ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ اس کے بارے میں کسی بھی چیز کے یقینی علم نہ ہونے کی وجہ سے اس سے میری ملاقات کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر میں نے موسم سرما کے اعتکاف کے فورا" بعد ملک میں گھومنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پہاڑوں میں دور تک جا کر غاروں اور بازاروں میں واقع سیلونوں کو چھان مارا میں طوائفوں سے بھرے جسم فروشی کے اڈوں اور بدمعاشوں کے گڑھ جوئے خانوں' لٹیروں اور اٹھائی گیروں کے اڈوں اور گھٹیا ترین غلاموں کے ذریعے چلائے جانے والے بیگار گھروں میں گیا۔ اپنے نام' لباس اور جسم کو عام دنیا کے بدنما اور گھٹیا اڈوں میں لے جانے کی واحد وجہ اسے پانے اور اس سے راستہ دریافت کرنے کی شدید خواہش تھی لیکن اس نے اپنے پیچھے کبھی کوئی نشانی نہ چھوڑی کہ وہ پہلے کہاں تھا یا وہ آئندہ کہاں جا سکتا تھا اور جب کبھی میں نے اس کے کہیں سے گزرنے کے بارے میں کوئی افواہ سنی اور بھاگم بھاگ اسے ملنے وہاں پہنچا تو ہمیشہ اس سے پہلے ہی وہ اپنی چھڑی اٹھا کر کہیں اور جا چکا ہوتا تھا۔ میں بڑے طویل عرصے تک اس کی تلاش میں اس عامیانہ دنیا میں سرگرداں رہا جب آخر کار ایک دن میں نے خود کو چکلہ گھروں کی ایک قطار کے سامنے کھڑا پایا جن میں سرخ اور سبز رنگ کی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ ان چکلہ گھروں کے ہر کونے میں جسمانی لذائذ میں مشغول طوائفوں اور ان کے گاہکوں کی آوازیں

آرہی تھیں۔ میں نے ایک تنہا طوائف کو دیکھا جو ایک لٹکتی ہوئی لالٹین کی گہری روشنی میں اکیلی کھڑی تھی میں نے اس کے پاس سے جتنا جلدی ہو سکے گزر جانے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے آواز دی۔

"بھکشو ادھر آؤ"

جب میں اس کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ گہرا چیچک زدہ اور ناک سور جیسا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ بدصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اسکی نفرت انگیز صورت ہی تھی جس کی وجہ سے وہ کوئی سرپرست حاصل نہ کر سکی تھی اور رات کے اس پہر تک راہ چلتوں کو اپنی اداس آواز میں بے فائدہ پکار رہی تھی۔

"کیا تم مجھ سے بات کر رہی ہو"؟ میں نے سوال کیا مگر اس نے جواب دینے کے بجائے میری قمیض کے بازو کو سختی سے کھینچ لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو"؟ میں نے اس گھٹیا عورت کے ہاتھ سے اپنا بازو جھٹک کر چھڑاتے ہوئے اس سے سختی سے پوچھا۔ اس نے ناک میں بات کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا "تمہاری شکل سے ہی تم مجھے جنسی بھوک کا شکار نظر آتے ہو، میں تمہیں جسم کی پیشکش کیوں نہ کروں؟۔ میں بھونچکا رہ گیا مگر کسی نہ کسی طور پر اپنا وقار قائم رکھتے ہوئے جواب دیا کہ "ایک طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے بھکشو کے ساتھ تمہارے اس رویے کا کوئی جواز نہیں جو دنیا کو ترک کر چکا ہو اور سخت ترین بدھ تربیت حاصل کر رہا ہو۔"

اس نے مجھے ترچھی نگاہوں سے گھورا جیسے کہ طوائفوں کی عادت ہے پھر اس نے ایک ادھ کھلی آنکھ کو تقریباً" بند کر لیا اور اپنے مکے کو یوں بلند کیا جیسے مجھے مارنے لگی ہو۔ وہ پھر گویا ہوئی "تمہارے ساتھ کیا خرابی ہے"؟ ٹھیک ہے میں بدصورت ہو سکتی ہوں مگر یہاں کوئی بھی ایسی نہیں جو کم قیمت پر میرا مقابلہ کر سکے۔ میرے ساتھ ایک دفعہ کی جسمانی لذت تمہارے جسم کو پگھلا کر سرخوشی کی بلندی تک پہنچا دے گی۔ تم سیدھے طلائی لافانی انسان کی طرح جنت میں پہنچ جاؤ گے۔"

"کون سی ام پو سل"

پو سل کے نام کا ورد کرنے کے بعد میں نے اس طوائف کو لعنت ملامت کرنی شروع کر دی لیکن اس نے پھر پہلے کی طرح نازو انداز سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "فکر مت کرو میں یہ کام مفت میں کر دوں گی۔ مجھ جیسی گھٹیا عورت بھی یہ بات جانتی ہے کہ سخاوت کی بہترین قسم بغیر کسی جزا کے خیال سے سخاوت کرنا ہے۔ جب پیاسے کو پانی، بھوکے کو خوراک اور بیمار کو دوا دینا ایک صحیح عمل ہے تو اپنا جسم جسم کی خواہش میں ہلکان ہونے والے شخص کے حوالے کرنے کے میرے خیال پر تمہارا یوں سیخ پا ہو جانا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ بدھ کی تعلیم کے یہ اجزاء کہاں سے اکٹھے کر لئے تھے۔ مگر اس کا ان تعلیمات کو یوں ناقدری سے ضائع کرنے کے عمل پر میرا دل اسے ایک تھپڑ رسید کرنے کو چاہا تاہم میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے شعوری طور پر اس سے باوقار طریقے سے بات کی۔

"ایسا نہیں کہ تمہاری باتوں میں سچائی مطلق نہیں لیکن ایک بھکشو جو راستے کی تلاش میں ہو اس سے جسمانی خواہشوں کی باتیں کرنا بالکل غیر مہذبانہ فعل ہے۔" "جب تو بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے تو مجھے اس کی بھوک نظر آجاتی ہے اور مجھے تم میں ایک مندر کے کھنڈر نظر آرہے ہیں دس سال کی جسم فروشی کے بعد مجھ میں جو بچا ہے وہ میری مقعد میں تھرتھراہٹ اور انسانوں کو پڑھنے کی صلاحیت ہے اگر تم جنس زدہ نہ ہوتے تو

کبھی طوائفوں کے کوٹھوں کے گرد رات کے تمام اوقات کے دوران یوں چکر نہ لگا رہے ہوتے۔"

"اوہ" جب ایک بھکشو اپنے پہاڑوں کو چھوڑتا ہے تو اسے اس تمام ذلت سے گزرنا پڑتا ہے اگر تم ضرور جاننا چاہتی ہو تو سن لو کہ میں ایک عظیم آقا کی تلاش میں ہوں۔"

"کیا تم نے آقائے عظیم کہا ہے؟" "ہاں" "کیا تم اس کے بارے میں جانتی ہو؟"

تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اپنا جسم فروخت کرتی ہوں۔ چنانچہ صرف اس وجہ سے تمہارے آقائے عظیم کو نہیں جان سکتی؟۔ وہ طوائف مجھ پر ہنس دی اور اپنی سکرٹ سنبھالتی ہوئی رات کو سونے کے لئے گھر کے اندر جانے ہی والی تھی مگر اس بار اس کے بجائے میں نے اس کے بازو کو جکڑ لیا۔

"مجھے افسوس ہے یہ نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا مطلب ہے ناراض مت ہو۔ مگر ٹھیک ہے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم واقعی اس شخص کے بارے میں جانتی ہو جس کا میں نے ذکر کیا ہے میرا مطلب ہے کہ تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟" اس نے اپنی سکرٹ چھوڑ دی اور ہنسنا شروع کر دیا۔ "بالکل میں واقعی اسے دیکھ چکی ہوں۔ کیوں؟ وہ تو کل رات بھی یہیں تھا وہ شاید آج رات پھر یہاں آئے گا۔؟"

"کیا کہہ رہی ہو تم اس جیسا آدمی اور اس طرح کے....؟" میں نے جملے کے درمیان میں ہی خود کو روک لیا اور تیزی سے اپنے سوال کے پیرائے کو ہی بدل ڈالا۔ اگر جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ صحیح ہے تو براہ مہربانی مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ جب اس کی آنکھیں نرمی سے بند ہو گئیں تو اس نے اپنی بلند لرزتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"وہ پست لوگوں کا دوست ہے جو اسے محسوس ہوتا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے کمائی بہت پر مشقت اور دنیا کی بدصورتی ناقابل برداشت ہو چکی ہے تو وہ ہمیشہ ہمارے پاس آ جاتا ہے۔ لیکن وہ کبھی تمہاری طرح بڑے بڑے پیچیدہ الفاظ نہیں بولتا۔ ایک دفعہ جب مجھے سوزاک ہو گئی اور میں بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی تو اس نے میرے کپڑے تک دھوئے اور یہی نہیں' ایک دفعہ جب میری سہیلی سام دول نے غلطی سے ایک پولیس والے کو دعوت گناہ دے ڈالی اور یوں گرفتار کر لی گئی اور اسے اتنا مارا گیا کہ اس کی پیٹھ سے خون بہہ نکلا تو وہ آیا اور اس نے اس کی جان چھڑائی وہ کیس ....." وہ بغیر کہیں خاتمہ کئے اپنی بات کو تیزی سے جاری رکھے ہوئے تھی اور اس کی بات کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ بالآخر میں نے اسے روکنے کے لئے اسے بازو سے پکڑ کے جھنجھوڑا۔

"اگر تم اسے دیکھ چکی ہو تو مجھے اس کی شکل و صورت کے بارے میں بتاؤ؟" اپنی آنکھیں پہلے کی طرح بند کئے ہوئے اس نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا "وہ بالکل ہم جیسا ہی نظر آتا ہے۔ اسکا چہرہ بدصورت ہے اور اس کے ہاتھ کھردرے گٹھیلے اور دھوپ میں جلنے کی وجہ سے سیاہ تھے لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کبھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتا جنہیں سمجھنے میں دشواری محسوس ہو۔" یہ میرے لئے بالکل تباہ کن تھا اس کی مکمل طور پر احمقانہ گفتگو سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ یقیناً "پاگل ہو چکی تھی۔

"اوہ یہ سب فضول ہے میں کبھی بھی اپنے آقا کو نہیں پا سکوں گا" میں نے آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور واپس مڑ گیا مگر ایک بار پھر اس نے میرے کف کو پکڑ لیا اور کسی بھی قیمت پر وہاں سے نہ جانے دیا۔ "کیا مسئلہ ہے؟ میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑے گی اپنی عزت بچانے کی خاطر تم خاصی دیر تک مزاحمت کر چکے ہو۔ اب آؤ بھئی' آؤ رات گزارنے اندر چلے چلیں۔" "مجھے جانے دو" کس طرح ایک گھٹیا طوائف ایک مقدس بھکشو کے لباس پر ہاتھ ڈالنے کی جرات کر سکتی ہے۔ اس وقت تک میں واقعی غصے سے بھر

چکا تھا اور میں نے چلانا شروع کر دیا مگر نہ صرف یہ کہ وہ مجھے جانے کی اجازت دینے میں ناکام رہی بلکہ اس نے مجھے ایک ہاتھ سے کمر سے جکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ میری ٹانگوں کے بیچ پھیرنا شروع کر دیا۔

"مجھے اس لمحے جانے دو تم طوائف! تمہیں جرات کیسے ہوئی "کون سی اودم" جو تربیت میں وقار کے مقام سے گر جاتے ہیں وہ سارے مرجاتے ہیں اور مرتد بن کے جہنم میں واصل ہو جائیں گے۔" اسے دور ہٹانے کے لئے پوری قوت لگانا پڑی اور جب میں نے ایسے کیا تو وہ بیہودہ عورت زمین پر بیٹھ کر یوں لیٹ گئی کہ اس کے گرد آلود زیر جامے مجھے نظر آتے رہیں' پھر وہ اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی' میری تسبیح پر جھپٹی جو میری گردن میں حائل تھی اور اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانا شروع کر دیا۔

"تم کتیا کے بچے تم دنیا کے سب سے بڑے بہروپیا ہو تم بھکشو سے زیادہ ایک چور ہو اپنی طبعی رحمدلی کے باعث میں نے تمہیں اپنا جسم پیش کیا تم جو ظاہر باہر ایک جنس کے مارے بھکشو ہو اور تم نے زبانی اور جسمانی دونوں طریقوں سے میری توہین کی۔ (مجھے تکلیف پہنچائی)" اس شور شرابے سے طوائفیں اپنے زیر جاموں میں باہر نکل آئیں ان کے پیچھے ان کے گاہک نکل آئے جو اپنی پتلونیں ابھی چڑھا رہے تھے اور مجھ پر ہنس رہے تھے اور میں' میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے شدید ذلت اٹھانا پڑی ہے ابھی تک کچھ کرنے کے ناقابل ہوتے ہوئے بدھوں اور پوسلوں کے نام جاپ رہا تھا لیکن اس تمام ہنگامے کے دوران وہ گھٹیا عورت اپنے اوسان بحال کر کے مجھ پر اپنا حملہ مسلسل جاری رکھے ہوئے تھی۔ "تم کتیا زاد" تم تمام چوروں میں بدترین چور مجھے بتا رہے ہو کہ میں جہنم میں جاؤں گی۔ جہنم یہی ہے اور یہ مت سوچو کہ اس سے بری جگہ بھی کوئی ہو سکتی ہے یقیناً" صراط مستقیم پر چلنے کے بہانے سے تم اپنی انگلی تک کو حرکت نہیں دیتے اور دوسرے لوگوں سے اپنی خوراک چراتے ہو لیکن تم مر کر جنت میں جاؤ گے جبکہ ہم طوائفیں جو اپنا جسم بیچ کر اپنی خوراک خود مہیا کرتی ہیں ہم مر کر جہنم میں جائیں گی۔"

اچانک میرے گلے میں لٹکی مالا کی ڈوری ٹوٹ گئی اور میری گردن کے گرد حائل تمام دانے زمین پر بکھر گئے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اس طوائف نے اپنی چیخ و پکار اس طرح جاری رکھی۔ "ہاں یہ بالکل صحیح ہے ہم بدصورت اور گھٹیا جسم فروش کے جرم کی وجہ سے جہنم میں جائیں گی مگر مجھے امید ہے کہ تم نجیب الطرفین اور ذہین اپنے جنت کے دورے سے لطف اندوز ہو رہے ہو گے۔" یہ نظارہ دیکھنے والوں میں شامل ایک بوڑھی خاتون جو بدھ کے رحم و کرم سے آشنائی رکھتی تھی' کی مہربانی سے میں بال بال بچا لیکن نہ صرف یہ کہ میں انگشت واحد کو پانے میں ناکام ہو چکا تھا بلکہ ایک طوائف کے ہاتھوں بری طرح بے عزت بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ اب میں اس آلائش والی دنیا میں اور سرگرداں نہیں رہ سکتا۔ تاہم یہ بھی مجھے میری آقا کی تلاش کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا اور دنیا میں جتنی بھی گھٹیا اور گندی جگہیں ہو سکتی تھیں وہاں میں اپنے آقا کی جستجو میں گیا۔ ان سب جگہوں میں مجھے ایسی بے عزتی اور مایوسی ملی جو اس ذلت اور مایوسی سے زیادہ مختلف نہیں تھی جس سے میں جسم فروش کے اڈے پر دوچار ہوا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں دنیا میں سب سے ارفع و اعلیٰ کی تلاش میں سرگرداں' صراط مستقیم کی تلاش میں سرگرداں' ایک بھکشو دنیا کی تمام سخت اور ویران جگہوں میں صرف اس لئے بھٹکتا پھر رہا تھا کہ مجھے انگشت واحد رکھنے والے آقا سے ملنے کی اور صراط مستقیم کی آگہی اور شعور کے روشنی کے حصول کی شدید خواہش تھی لیکن یہ بات سمجھ نہ آ سکی کہ اسے دربار سے متعلق اعلیٰ نسل خواتین اور سرکاری افسران کی جانب سے وقف کئے گئے سونے اور چاندی سے لبالب مندروں سے نفرت کیوں تھی۔ اور اس کے بجائے وہ انتہائی نفرت انگیز اور گھٹیا جگہوں کا انتخاب کیوں کرتا تھا یہ واقعی ایک ایسا مسئلہ تھا جو مجھے

پریشان رکھتا تھا لیکن لوگ ہمیشہ اسے ایسی ہی جگہوں پر دیکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی تلاش میں مجھے جسم فروشی کے اڈوں کی طوائفوں، قمار خانوں کے بدمعاشوں اور آخر میں مشقت گھروں کے گھٹیا ترین غلاموں کے ہاتھوں بدترین قسم کی ذلتیں اٹھانا پڑیں۔ غلام بادشاہ کے لئے ایک نئی آرام گاہ تعمیر کر رہے تھے ان میں سے کچھ بیلوں کی طرح جتے ہوئے تھے۔ جبکہ دوسرے مکانوں جتنے بڑے بڑے پتھروں کو دھکیل رہے تھے۔ لیکن یہ سب مجھ پر تھوکنے کے لئے رک جاتے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر یہ کہتے ہوئے اپنی قسمت مجھے بتا رہے تھے کہ اس شدید محنت کی مصیبت سے بچنے کے لئے ان کے اور انکے اجداد کی پچھلی کئی نسلوں کے لئے موت ہی واحد راستہ تھی۔ یہ سن کر ازراہ ترحم میں ان کے لئے ایک بدھ منتر جاپنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"کوان سی اودوم پو سل" کسی پچھلے جنم میں کئے گئے گناہوں کی وجہ سے ہم اس جنم میں مصائب اٹھاتے ہیں اور اس لئے ہم کسی اور کو سوائے اپنے کرما کی رکاوٹوں کے' مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ نفرت اور کینہ گناہ کے بیج ہیں چنانچہ ہمیں خواہ مخواہ دنیا کو ملامت نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اپنے آپ کو بدھ کی عبادت کے لئے وقف کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر ان سب نے اجتماعی طور پر مجھ پر تھوکنا اور کوؤں کے ہجوم کی طرح مجھ پر چلانا شروع کر دیا۔

"تم ہمارے مصائب کی شدت کا کماحقہ ادارک نہیں کر سکتے کیونکہ تمہیں خوراک لباس اور جائے پناہ کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہے اور تمہیں صرف راستے یا گندگی کے ڈھیر یا جس کسی بھی چیز کے تم متلاشی ہو' کے لئے ہی کوشش کرنا ہے۔ تم انہیں جو موت کے دھانے پر پہنچ چکے ہیں' یہ بتا رہے ہو کہ انہیں جو غیر منصفانہ طور پر بھوک' بیمار اور جیلوں میں مقید ہیں' وہ اس حقیقت پر تسلیم و رضا اختیار کر لیں کہ یہ سب کچھ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہے! تم انہیں یہ درس دے رہے ہو کہ اگر وہ مستقبل کے کسی جنم میں بہتر جگہ میں پیدا ہونے کی خواہش رکھتے ہیں تو انہیں بدھ کی عبادت اختیار کرنی چاہیے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ تم فریبی اور منافق ہو۔" وہ ایسے جذبے سے بولے کہ جیسے وہ ابھی مجھے کچا چبا جائیں گے وہ مجھے یوں گھور رہے تھے کہ مجھے یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں سے زرد نیلی روشنی پھوٹ رہی ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر ان کی پیٹھوں پر لدا ہوا طوق انہیں اپنے وزن سے جھکا نہ رہا ہوتا تو وہ مجھے جان سے مار چکے ہوتے۔ بہر حال اس آلائش بھری دنیا میں بے رحم اور جاہل مخلوق رہتی تھی۔ اور یہ اتنی گھٹیا اور غلیظ تھی کہ یہ مجھ جیسے آدمی کے لئے موزوں نہیں تھی۔ ایک ایسا آدمی جو سب سے ارفع راستے کی تلاش میں ہو۔ جب میں کھڑا ہوا تو میرے گھٹنے جسم کے بوجھ تلے دکھ رہے تھے میں وہاں اتنے طویل عرصے تک اکڑوں بیٹھا رہا اور کبھی نہ ختم ہونے والے ایسے وسوسوں اور دکھوں کی مصیبت جھیلتا رہا جو ذہن انسانی کو بیمار بنا دیتے ہیں' کہ میری ٹانگیں سن ہو گئیں۔ مجھے چکر آ رہے تھے اور میں صرف کسی جگہ پڑ کر سو جانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ جلد ہی اتنا اندھیرا چھا گیا کہ میں چند قدم آگے تک بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر ندی اور نالے سے درندوں کی تنہا اور بھوکی دھاڑیں بلند ہو رہی تھیں۔ سو میں نے سوچا کہ میں نہ صرف آقا کو پانے میں ناکام رہوں گا بلکہ یہیں مر کر ان پہاڑوں کی آوارہ روح بن جاؤں گا۔ میں نے اپنے تھیلے کو باندھتے اور بوٹوں کے تسمے سخت کرتے ہوئے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں پوسلوں کے ناموں کا ورد کیا پھر درختوں کی ٹہنیوں کو پرے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ جب میں راستے کو تلاش کرنے کی کوشش میں چاروں جانب ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تو میں واقعتاً" بغیر کسی مقصد کے چکر لگا رہا تھا۔ عین اس وقت میں نے بالکل اپنے سامنے ایک روشنی کا نقطہ دیکھا۔ روشنی سے اندازہ لگاتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ یہ کوئی مکان تھا اور پہاڑوں میں اتنی دور ایک گھر یقیناً آقائے انگشت واحد کا گھر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے وہاں تک تمام راستہ بغیر کوئی دم لئے دوڑتے ہوئے طے کیا۔ وہ

سونے کی کان کنی کرنے یا جن سنگ بوٹی تلاش کرنے والوں کا ایک چھوٹا سا جھونپڑا نکلا۔ جہاں وہ پہاڑوں میں شب بسری کی صورت میں پناہ لیتے تھے اور باہر جھونپڑے کے سامنے چیڑھ کے بروزے (ریزن) سے جلنے والے لیمپ کی روشنی میں ایک بوڑھا آدمی اپنے بالوں سے جوئیں نکال نکال کر انہیں اپنے ناخنوں پر مسلسل مسل رہا تھا۔ بوڑھے کے سوکھے ہوئے جسم، پھٹے پرانے کپڑوں اور میل بھری آنکھوں سے واضح تھا کہ وہ کوئی بھکاری تھا جسے معاشرے سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میں آقا سے ملنے والا تھا اور اس کے بدلے میں اس نمونے سے ملاقات میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پہلے میں نے بس لیٹ جانے اور گیان دھان کے بارے میں سوچا لیکن یہاں تک اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اس سے کچھ تو پوچھنا تھا۔

"اے مرد بزرگ! کیا تم نے کبھی ایک آقا انگشت واحد کے بارے میں سنا ہے؟" لیکن بزرگ شخص نے یوں جیسے وہ بہرہ ہو میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مکمل طور پر جوئیں مارنے میں منہمک رہا۔ جب وہ انہیں ملتا تو وہ ایک مکروہ آواز پیدا کرتیں۔ "مجھے کچھ عقل سے کام لینا چاہیے تم جیسوں کو ارفع آقا کے بارے میں کیا پتہ ہو گا؟" میں نے اس بوڑھے آدمی کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے سوچا۔ پھر عادت کے طور پر مراقبے کے لئے بیٹھنے سے پہلے میں نے ایک بدھ منتر کو جاپنا شروع کر دیا۔

"شوری شوری مہا شوری سیحا اور بنھبوی انوتیجے شنجنون"

"کیا تم اپنا منہ بند نہیں کر سکتے' میں سونے کی کوشش کر رہا ہوں اگر تم دعا کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل میں دعا کرو کیا اس طرح کا کوئی (مذہب) قانون ہے کہ تمہیں لازما" باآواز بلند دعا کر کے کسی دوسرے شخص کے آرام میں خلل ڈالنا چاہیے؟"۔ یہ سن کر میں نے اپنی آنکھیں کھولیں مگر اس کی لالٹین پہلے ہی بجھ چکی تھی اور مجھے صرف اس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ اس آلائشوں بھری دنیا میں ایک پورے موسم تک گھومنے کے بعد میں بری طرح تھک چکا تھا۔ اور اس صبح خاص طور پر بہت دیر تک پڑا سوتا رہا تھا جب میں جاگا تو پہلے ہی سورج میرے سر کے اوپر تک بلند ہو چکا تھا اور بوڑھا آدمی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنے تھیلے سے بھوک مٹانے کے لئے پسے ہوئے چاول اور جو کا آمیزہ نکالا۔ پھر اپنے کھڑاویں (موزے) مضبوطی سے پاؤں کے ساتھ باندھے اور بوجھل دل کے ساتھ اپنے سامنے پھیلے ہوئے قطار در قطار پہاڑوں کو دیکھا۔ ایک اور دن آکر گزر چکا تھا۔ اب مجھے کہاں جانا تھا؟ مجھے آقا کو ڈھونڈنے کے لئے خاص طور پر کہاں جانا چاہیے؟ مجھے بالکل معلوم نہ تھا۔ لیکن مجھے بہر طور چلتے ہی رہنا تھا۔ اپنے بوجھل دل کے ساتھ جیسے کہ اس پر کوئی چٹان آگری ہو میں پرانی کٹیا کے پاس سے گزر رہا تھا کہ میں نے اچانک کسی کو بلاتے ہوئے سنا "اے معلم عظیم' اے معلم عظیم" میں نے اپنی سمت نہیں بدلی' صرف سر گھما کر دیکھا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا اور کسی وجہ سے وہ بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "تو تم حقیقی اور سچے آقا کی تلاش میں ہو" اوں "میں گنگ ہو گیا۔ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ بوڑھا آدمی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر مجھ پر یوں نظر ڈالی جیسے میں بیحد قابل رحم شخص ہوں' اور میرے شانے تھپتھپانے شروع کر دیئے۔ "احمق شخص تم کہتے ہو کہ تمہیں ایک سچے آقا کی تلاش ہے؟" "ہاں یہ صحیح ہے" میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا اور بوڑھے آدمی نے مایوسی کے عالم میں اپنی زبان بند کر لی پھر اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی "ان مسائل سے بھری دنیا کی موجودگی میں تمہارا خیال ہے کہ ایک سچا آقا ان پہاڑوں میں بیٹھا جوئیں مار رہا ہو گا؟" اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ میرے دل سے بھاری پتھر اٹھ گیا۔ ایک دم یوں لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر چیز روشن ہو گئی ہے۔ مجھے پہاڑ چھوڑنا پڑا۔ بوڑھے آدمی کی بات نے مجھے ایک دم بیدار کر دیا تھا۔ میں نے "بیداری" کہا ہے مگر

واقعتاً" یہ بے حد عام اور واضح سی چیز تھی۔ یہ بالکل واضح تھا کہ مجھے پہاڑ لازما" چھوڑنا تھا۔ مجھے پہاڑوں سے نیچے اتر کر گھٹیا اور غلیظ عام دنیا میں آکر عام لوگوں میں رہنا تھا۔ گوتم بدھ نے سچ کہا تھا کہ بدھی' حکمت اور اسکی بگڑی ہوئی شکلوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ خالص سرزمین اور یہ دنیا ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ اگر ہم اس ہر لحظہ اپنی جون بدلتی ہوئی خواہشات اور مصائب کی دنیا سے پیچھا چھڑا کر بھاگ گئے تو ہمیں خالص اور پاک سرزمین کبھی حاصل نہیں ہوگی۔ اور اگر یہ دنیا جس کے بارے میں جیسا کہ طوائف نے کہا تھا کہ ایک ایسا جہنم ہے جس میں لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے اپنا ہی گوشت فروخت کرنا پڑتا ہے۔ تو پھر مجھے اپنے لئے جہنم میں زندگی گزارنے کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے۔ آیا میں آقائے عظیم کو آخر کار ڈھونڈ لیتا ہوں یا نہیں؟ یا یہ کہ وہ بوڑھا آدمی جس نے مجھے میری انمول بیداری عطا کی تھی' جس کی مجھے اتنی شدت سے تلاش تھی' حقیقت میں آقائے عظیم ہی کا مظہر ہے یا نہیں؟ یہ تمام باتیں اب بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں لیکن مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے کہ آیا اسے حقیقت میں "ایک بیداری" کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟۔۔۔

اشجار

اس لئے کہ ہم برف میں اشجار کے تنے ہیں۔ وہ سطح پر سیدھا لیٹے ہوئے لگتے ہیں اور جیسے انہیں کوئی معمولی کوشش سے منتقل کرنے کے لائق ہے۔ نہیں، کوئی ایسا نہیں کر سکتا' اس لئے کہ وہ زمین کے ساتھ مضبوطی سے پیوست ہیں۔

لیکن دیکھو' یہ بھی محض بھیس ہی تو ہے۔

اگلا گاؤں

میرا دادا کہا کرتا تھا "زندگی حیران کن حد تک مختصر ہے۔
اب میں اس کی طرف پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ میرے ذہن کے لئے اس قدر از کار رفتہ ہو جاتی ہے کہ مثال کے طور پر مجھے یہ سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے کہ کس طرح ایک نوجوان شخص اگلے گاؤں تک سفر کرنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہونے کا فیصلہ اس خوف کے بغیر کر لیتا ہے کہ ممکنہ بدنصیبیوں کو امکان میں لائے بغیر' ہستی کا قسمت کی یاوری پر قائم عرصہ بھی اس سفر کے لئے یکسر ناکافی ہو گا۔

وانگ سی ین / ستار طاہر

نفرت

دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے ' ایک دن اور ایک رات تک مسلسل چلتے ہوئے اب ہم ایک پرامن علاقہ میں پہنچے تھے۔ کئی دنوں سے ہم مسلسل دشمن کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ تھکان نے ادھ موا کر رکھا تھا۔ اس علاقہ میں پہنچتے ہی ہم گھاس کے گٹھوں پر سو گئے۔ تھکاوٹ کے باوجود میں سو نہ سکا تھا۔ گھاس کے ان گٹھوں سے بو آرہی ہے۔ لیکن تب اتنا ہوش ہی کسے تھا کہ چھان بین کی جاتی۔ جب آنکھ کھلی تو میری آنکھیں درد محسوس کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کو کھول کر غور سے دیکھا تو اپنے اوپر غصہ آیا۔ رات بھر ہم جہاں سوئے رہے تھے وہ گھاس کے گٹھے نہ تھے بلکہ گدھے کا سوکھا ہوا گوبر تھا۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا رات تو ہم وہاں بسر کر ہی چکے تھے۔ ہم سپاہی آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ایک شخص ہماری طرف آتا دکھائی دیا' وہ کبڑا تھا۔ آتے ہی اس نے کہا کہ ہم نے رات یہاں کیوں بسر کی۔

اس کے گھر میں سونے کے لئے جگہ تھی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ "میں آپ کے لئے پانی گرم کراتا ہوں تا کہ آپ ڈھنگ سے منہ ہاتھ دھو سکیں۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ یہ زحمت نہ اٹھائے۔ دریا پاس ہے لیکن اس نے ایک نہ سنی اور چلا گیا۔ جب ہم دریا سے نہا کر واپس آئے تو اسی سے سامنا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔ "میں آپ کے لئے پانی گرم کرا چکا ہوں...." وہ چین کے عام دہقانوں کی طرح ہمیں بڑے سردار کے خطابات سے مخاطب کر رہا تھا۔ اور یہ مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ جب سے جاپان کے خلاف جنگ شروع ہوئی تھی میں نے دیکھا تھا کہ دیہات کے کسان کس محبت سے ہمیں ملتے اور ہماری آؤ بھگت پر آمادہ رہتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب دیہات میں یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ ڈاکو سے نہ ڈرو۔ فوج کے سپاہی سے ڈرو۔ اب معاملا اس کے الٹ ہو چکا تھا۔ دیہاتی اپنے سپاہیوں سے بڑی محبت کرنے لگے تھے۔ ان کو اپنا محافظ سمجھتے تھے۔

اس کبڑے کسان کے اصرار پر ہم اس کے گھر پڑے' جھکی ہوئی چھت والے تنگ و تاریک جھونپڑا نما مکان میں داخل ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ چولہے پر ایک برتن رکھا ہوا ہے۔ چولہے میں آگ تیزی سے جل رہی ہے اور برتن سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ چولہے کے پاس ایک پتلی دبلی عورت بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ البتہ ہم نے اس کے پیلے دانت ضرور دیکھ لئے۔ تاریک کمرے میں جب ہماری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو سکیں تو ہم نے وہاں دو چھوٹی بچیوں کو بھی دیکھا۔ ان کے جسم سکڑے اور سہمے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں ابل رہی تھیں وہ شرمائی شرمائی سی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ جب ان بچیوں نے دیکھا کہ ہم بھی انہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ تیزی سے اس عورت کے پیچھے جا کر چھپ گئیں۔ ہم نے کبڑے کسان سے بات چیت شروع کر دی۔

"میں کبڑا چانگ ہوں" اس نے ہنستے ہوئے بتایا "مجھ سے چھوٹے نوجوان نسل کے لوگ مجھے کبڑا چچا چانگ

کہ کر پکارتے ہیں۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے قہقہے میں بوکھلاہٹ ہے۔
"کیا یہ تمہاری بچیاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"یہ دو لڑکیاں.... ہاں.... یہ دو ایسے منہ ہیں جو سوائے کھانا کھانے کے اور کچھ بھی نہیں جانتے۔"
یہ کسان بھی عجیب فطرت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے دل کاغذ کے پنکھے کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک یہ بند رہتے ہیں تب تک مجال ہے جو ان سے ہوا بھی گزر سکے۔ لیکن جونہی یہ کھلتے ہیں' تو ہر چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کبڑے چانگ نے بھی بلا توقف اپنے مخصوص سادہ انداز میں اپنے دکھوں اور غموں کی کہانی سنا دی۔ اس نے جو واقعات سنائے' ان میں سب سے اہم چیز جس پر اس نے زور دیا تھا وہ تھی دشمن کے سپاہیوں ---- جاپانیوں کے خلاف نفرت ...... جنہوں نے ہمارے ملک کو تاراج کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔
"کیا وہ شیطان اس علاقے پر بھی حملہ کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"یہ علاقہ خاصا دور ہے۔ ان کی رفتار اتنی تیز نہیں ہو سکتی۔ اور پھر راستے میں انہیں شدید مزاحمت کا سامنا بھی تو کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے تسلی دی تھی۔
پچھلے سات آٹھ دنوں سے ہم نے ٹھیک سے ڈھنگ کا کھانا نہ کھایا تھا۔ دل بری طرح مناسب اور ڈھنگ کے کھانے کے لئے مچل رہا تھا۔ اتنے دنوں ہم نے کھٹے اور بدمزہ باسی آڑوؤں اور کیچڑ ملے پانی پر گزارہ کیا تھا۔ ہمارے پیٹ خراب ہو چکے تھے۔ لیکن اس گاؤں میں تو پہلے ہی بھوک اپنا جھنڈا لہرا رہی تھی گاؤں کے قابل ذکر اور اہم کنبے گاؤں خالی کر چکے تھے۔ چند نادار اور غریب گھرانے رہ گئے تھے۔ کبڑے چانگ نے ہمیں بتایا کہ چاول اور گوشت حاصل کرنے کے لئے دس میل کے فاصلے پر واقع منڈی میں جانا پڑے گا۔ اور اگر ہم اس پر اعتبار کریں تو ہم اسے دام دے دیں۔ وہ ہمارے لئے چیزیں خرید کر لے آتا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی بے اعتباری تو تھی نہیں اس لئے ہم نے اسے دام دے دیئے اور وہ اس وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔
جب وہ واپس آیا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کندھے پر رکھے بانس کے ایک سرے پر اس نے سامان باندھ رکھا تھا۔ اس نے بڑی تفصیل سے ہمیں ایک ایک چیز کے دام بتائے۔ پھر اپنی پیوند لگی جیکٹ اتار کر پسینہ پونچھا' اور مسکرا کر اپنے سفر کی روداد سنانے لگا۔
"بڑا خطرناک سفر تھا" اس نے بڑے پرجوش انداز میں ہمیں بتانا شروع کیا۔ سڑک پر سپاہی گھوم رہے تھے۔ کچھ گھڑ سوار سپاہیوں نے تو اسے روک بھی لیا تھا۔ کچھ نے تو اپنی سنگین اس کے سینے پر تان کر حکم دیا تھا کہ وہ چاول اور گوشت انہیں دے دے ورنہ وہ اسے جان سے مار دیں گے۔ اور اس نے جان خطرے میں ڈال کر انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے رائفلوں کے کندے مار کر رہا کر دیا۔ اور راستے میں ایک اور جگہ کچھ سپاہیوں نے اسے رکنے کا حکم دیا تھا لیکن وہ بھاگ نکلا اور ایک گولی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ گولی کان کے قریب سے گزر گئی۔ وہ اپنے الفاظ کے مطابق ---- بال بال بچا تھا ورنہ مارا گیا تھا۔
اس نے واقعی ہمارے لئے تکلیف اٹھائی تھی۔ میں نے اسے انعام میں کچھ دینا چاہا تو وہ ناراض ہو گیا۔ جیسے اس کی اہانت کی گئی ہو۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ بلکہ مجھے تو یوں لگا جیسے اس کی کمر کا "کب" بھی پھیلنے لگا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "بڑے سردار یہ آپ نے کیا کہا---- میں کبڑا چانگ اور اس کام کے بدلے میں انعام لوں---- نہیں جی---- ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔
"یہ انعام قبول کر لو۔ قومی فوج کے اصولوں کے مطابق یہ تمہارا حق بنتا ہے۔ جی ہاں میں غلط تو نہیں کہہ

رہا۔"

"ارے نہیں ۔۔۔ آپ .... آپ مجھے راضی کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ کیا ایسا اصول ہو سکتا ہے؟۔"

جب میں نے اسے سچے دل سے یقین دلانے کی کوشش کی تو تب بھی انعام کی معمولی سی رقم قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور کہنے لگا۔ "کیا آپ نے کبڑے چانگ کو بے حس سمجھ رکھا ہے۔ آپ ان شیطانوں کے مقابلے میں تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ اپنی جان وطن کے لئے خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اور میں آپ سے پیسے لے لوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

جب ہمارا کھانا پک گیا تو ہم نے اپنے ٹین کے پیالے بھاپ چھوڑتے ہوئے شوربوں سے بھر لئے۔

"واقعی مزیدار کھانا ہے۔ مگر نمک کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

اسی وقت زرد دانتوں والی عورت بھی کھانا پکا چکی تھی۔ اس نے پتلا سا گندم کا پھلکا تیار کیا تھا۔ کھانے کی حالت بتاتی تھی کہ گاؤں میں کتنا اور کس قسم کا اناج باقی بچا ہے۔ دونوں دبلی پتلی بچیاں جن کی ہڈیاں تک نظر آ رہی تھیں۔ اپنی ماں اور اپنے باپ کبڑے چانگ کے ساتھ کھانا کھانے لگیں۔ جب وہ لقمہ منہ میں ڈالنے کے لئے اپنے خون سے محروم پتلے لبوں کو کھولتی اور چوری چوری نظریں بچا کر ہمیں بھی دیکھ لیتی تھیں' مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ ہم ان کے سامنے نسبتاً" بہتر غذا کھا رہے تھے اور وہ بے چارے ..... میں نے کبڑے چانگ کو آواز دی۔

"چانگ چچا۔ ہم نے تمہیں بڑی زحمت دی ہے۔ اور پھر تم ہمارا حقیر سا نذرانہ بھی قبول کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اچھا اب ایک بات مان لو۔ تم ۔۔۔۔ تمہاری بیوی اور یہ دونوں ننھی بچیاں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ آؤ۔ ہماری یہ بات تو مان لو۔"

"بڑے سردار' یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے کتنے دنوں سے ڈھنگ سے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا ہو گا۔ پھر تم آدمی بھی زیادہ ہو اور کھانا کم ہے۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ ایسے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ میں اور میرا کنبہ مزے سے اپنا کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

اپنی کبڑی کمر جھکائے وہ پھر اپنی بیوی اور بچیوں کے پاس چلا گیا۔

جنگی طیاروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً" وہ قریب آ رہے تھے۔ آسمان گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ ہمارا دشمن واقعی پاگل ہو چکا تھا۔ جنگی طیارے نیچی پرواز کر رہے تھے۔ دھبوں کی صورت میں ہم اپنے دشمنوں کے دھندلے دھندلے چہرے دیکھ رہے تھے۔ جو کئی کئی ٹن کے بھاری بم قریبی دیہات پر گرا رہے تھے۔ بم پھٹنے کی ہولناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دور ۔۔۔ آسمان کا نصف حصہ دھوئیں میں چھپ گیا تھا۔ اور زمین قدموں کے نیچے کانپنے لگی تھی۔

کبڑا چانگ بے حد خوفزدہ ہو چکا تھا۔ اس کی حالت اس جانور جیسی تھی جس کا پیچھا خطرناک شکاری کتے کر رہے ہوں۔ اپنی جان کو بچانے کے لئے وہ دریا کے کنارے پانی میں کھڑے ایک گھنے درخت کے نیچے چلا گیا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس نے درخت کے تنے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ یکسر بدل چکا تھا۔ جب جنگی طیاروں کی آوازیں ختم ہو گئیں تو بھی وہ درخت کو مضبوطی سے پکڑے پانی میں پاؤں مار رہا تھا' جیسے وہ اپنے حواس کھو چکا ہو۔

کسی نے اس پر جملہ کستے ہوئے کہا "بوڑھے دیہاتی --- اب آجاؤ ---- جہاز تو چلے گئے۔"

"تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو' احمق' بم یہاں سے کم از کم پانچ میل کے فاصلے پر گرے ہوں گے۔"

"میں خوفزدہ کیسے نہ ہوں؟" اس کے لہجے میں پریشانی اور تشویش تھی۔ "کیا ایک بم بیس تیس میل کے درمیان تباہی نہیں پھیلاتا؟ میں نے سن رکھا ہے کہ ایک بم سے سو سے زیادہ آدمی مرجاتے ہیں۔"

اس دوران میں اس کی بیوی بھی گھر سے باہر آگئی۔ اس کی حالت بھی اپنے شوہر سے بہتر نہ تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ سپید پڑا ہوا تھا۔ وہ بم گرانے والے دشمنوں کو کوس رہی تھی۔ "شیطان کے بچے .... شیطان ..... بم گرانا بھلا انسانوں کا کام ہے۔ نہیں یہ تو شیطانوں کا کام ہے۔ بم گرانے والے شیطان غارت ہو جائیں۔"

دونوں بچیاں بھی خوفزدہ نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے بڑی مضبوطی سے اپنی ماں کے لباس کے دامن کو تھام رکھا تھا۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ نہیں جانتی ہیں کہ کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔

چند منٹوں میں موضوع بدل گیا' پھر کسی نے یہ ذکر شروع کر دیا کہ دشمن کے سپاہی کس طرح لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ بے رحم' سفاک' وہ مردوں کو پکڑ کر گھوڑوں کے پیروں میں باندھ دیتے ہیں۔ پھر کوئی گولی چلاتا ہے۔ گولی کی آواز سے گھوڑے خوفزدہ ہو کر بھاگتے ہیں اور اپنے ہی سموں سے قیدیوں کو کچل دیتے ہیں۔ ہاں یہ غیر انسانی سلوک۔

"اور جب وہ عورتوں کو پکڑتے ہیں تو ...."؟

"یہ تم مجھ سے سنو" ایک شخص نے بڑے فخر کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "ان شیطانوں کے دل سیاہ ہو چکے ہیں۔ انسانیت اور شرافت کی تو ان میں رمق تک نہیں رہی۔ وہ عورتوں میں سے جوان اور خوش شکل عورتوں کو چھانٹ لیتے ہیں۔ انہیں ہانکتے ہوئے کسی درخت کے نیچے لے جاتے ہیں۔ پھر جانتے ہو وہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ شیطان اکڑ کر ہاتھوں میں اپنی رائفلیں لئے' سنگین تانے بیٹھ جاتے ہیں۔ سنگینوں کا رخ عورتوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس وقت یہ شیطان اپنی مونچھوں کے نیچے ایک شیطانی انداز میں مسکرا رہے ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے اپنے ہاتھوں سے اپنا لباس اتار کر ننگی ہو جائیں۔ کوئی ہچکچاتی ہے تو وہ اپنے پاؤں اس کے پیٹ میں دے مارتے ہیں ہاں نیلے آسمان اور چمکدار سورج کی دھوپ میں ---- سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک کی باری ختم ہوتی ہے تو دوسرا تیار کھڑا ہوتا ہے...."

"اوہ .... اوہ ..... یہ شیطان ....."

جب آسمان پر تاریکی چھانے لگی تو ہمیں پیغام موصول ہوا کہ یہاں سے کوچ کر کے اپنے دستوں سے جاملیں جو ہم سے آگے نکل چکے تھے۔ ہم نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ اسی وقت چچا چانگ وہاں آگیا۔ وہ مجھے اپنی چیزیں سمیٹتے دیکھ کر پریشانی کے عالم میں بولا "بڑے سردار۔ یہ .... یہ ؟" اس سے پوری بات نہ ہو رہی تھی۔

"چچا چانگ کیا بات ہے .... کھل کر کہو۔"

"گدھے کے گوبر کے ڈھیر پر سونا مناسب نہیں ہے۔ میری چارپائی پر سو سکتے ہیں۔ میں۔ میری بچیاں اور ان کی ماں چولہے کے سامنے سو جائیں گے۔ گدھے کا گوبر ویسے بھی مرطوب ہوتا ہے۔"

"چچا چانگ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

"جا رہے ہیں؟" یہ اس کے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ "بڑے سردار آپ جا رہے ہیں؟ نہیں نہیں۔ آپ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں....؟"

بوکھلاہٹ اس کے لہجے سے صاف نمایاں تھی۔ میں نے اسے حقیقت بتائی۔

"ہم یہاں اپنی ٹانگوں کو تھوڑا آرام پہنچانے اور ستانے کے لئے رکے تھے۔ ہماری فوج ہم سے آگے جا چکی ہے اور ہمیں اس سے جا کر ملنا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں ہمارا فوج سے رابطہ کٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ شیطان کے سپاہی ہمارے تعاقب میں ہیں۔ مناسب بارود اور اسلحہ کی سپلائی بھی رکی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی ناکافی ہیں۔ اس لئے ہمیں جلد از جلد فوج سے جا ملنا چاہئے ورنہ ہمارے اور فوج کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ سمجھے؟"

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بے حد خوفزدہ نظر آرہا تھا۔ ادھر میں بھی جلدی میں تھا اور اسے دو ٹوک انداز میں بات سمجھانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ "دیکھو' اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کے عقب میں ہماری فوجیں موجود ہیں۔ تمہیں کسی طرح کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ان شیطان کے سپاہیوں سے نمٹ لیں گے۔"

"کیا کہا" اس کے لہجے میں بے حد فکر مندی تھی۔ "شیطان کے سپاہی آرہے ہیں اور آپ یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ ہم کسانوں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ جو کہیں جا نہیں سکتے۔ آپ ہمیں بے سہارا چھوڑ کر جا رہے ہیں تاکہ دشمن کے سپاہی آئیں ہمارے گھروں کو تباہ کر دیں۔ ہمارے مردوں کو گھوڑوں کے سموں سے باندھ دیں۔ عورتوں کو بے آبرو کر دیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ ہم پر بم برساتے رہیں۔ وہ بم جو ایک ہی وقت میں سو سے زیادہ انسانوں کو ختم کر سکتا ہے اور اس کے پھٹنے کی آواز اتنی تیز اور گونجدار ہوتی ہے کہ ...."

اس وقت میں نے دیکھا کہ کبڑے چانگ کی حالت اس کتے جیسی ہے' جسے کچلا دیا جا چکا ہو۔ اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا ہو' جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ چکا ہو' جانکنی کا وقت ہو۔

اس وقت وہ زرد دانتوں والی عورت بھی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اور کہنے لگی:

"کیا کہا؟ کیا دشمن کے سپاہی آرہے ہیں۔ ہم کیا کریں گے؟ ہمارا کیا بنے گا۔ آپ ہمیں تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"بڑے سردار آپ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں" کبڑے چانگ کی آواز خوف سے یوں تھرتھرا رہی تھی جیسے موت کے سیاہ ہاتھ نے اس کے گلے کو دبا رکھا تھا۔۔۔ آپ ہمیں یوں بے آسرا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اگر آپ ہمارے ہیں تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اے چھوٹی بچیوں کی ماں .... جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹ لے' ہم ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"ان کے ساتھ جا رہے ہیں؟ ان بچیوں کو کیسے ساتھ لے جائیں گے؟۔ کھیتوں میں کھڑی گندم کی فصل کا کیا بنے گا؟۔"

"تم جانا نہیں چاہتی ہو؟ یہ میں کیا سن رہا ہو' شیطان کے سپاہی آرہے ہیں اور تم جانے سے انکار کرتی ہو۔"

وہ تیزی سے اپنے تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ چیزوں کے گرنے کی صدائیں گونجنے لگیں۔ آوازیں اور چیخیں بھی ان صداؤں میں مکمل مل گئی تھیں۔ ان آوازوں سے پڑوسیوں کے کان بھی کھڑے ہو گئے اور وہ بھی آگئے۔

"کبڑے چچا۔ کیا بات ہے .... یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ پوچھنے لگے۔

"شیطان آرہا ہے .... اپنے لئے پناہ تلاش کر لو۔ اب تو اپنی زندگی بچانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ہمارے سپاہی

اور بڑا سردار یہاں سے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں تو ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"تمہارے گھر کا کیا بنے گا؟ تمہاری گندم کی فصل کا کیا ہو گا۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ شیطان کے سپاہیوں کے دل سیاہ ہیں۔ ان سے نفرت کرنی چاہیے۔ ان سے جان بچانی چاہیے۔"

ہم ان کا انتظار نہ کر سکتے تھے۔ گاؤں کے باہر ہمارے گھوڑے بے چینی سے ہمارا انتظار کرتے ہوئے ہنہنا رہے تھے۔ اور افراتفری کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ سارا گاؤں مدھم آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔ ان کو سنتے ہوئے ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور جلدی میں ہم یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ کبڑا چانگ ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ جب ہم ایکس نامی قصبے میں پہنچے تو یہ شہر ہماری فوج کے قبضے میں تھا۔ شہر کے جنوب میں ہماری فوج نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم وہیں ٹھہریں اور دشمن کے حملے کا انتظار کریں۔ اس کے مقابلے کے لئے تیاری کریں۔

جب تک جنگی منصوبہ بندی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنے لئے ایک گھر تلاش کر لیا جو ایک درخت کے سائے میں تھا جہاں ہم بے ترتیبی کے عالم میں گندم کے خشک گٹھوں پر لیٹے رہے۔ کچھ سپاہی اپنے کپڑے دھونے میں مصروف رہے۔ کچھ اپنے پاؤں رگڑ رہے تھے۔ کچھ لباس تبدیل کرتے ہوئے گا رہے تھے۔ گیت کے بول حسب حال تھے۔

"یہ قربانی دینے کا نازک لمحہ ہے....

ہمیں قربانی دے کر ملک کو دشمنوں سے بچانا ہے...."

کچھ سپاہی مقامی سٹور سے شراب کی ایک بوتل لے آئے تھے اور شراب پی کر شور مچا رہے تھے' ایک دوسرے کے ساتھ الجھ رہے تھے۔ ایسی مصروفیات کے لمحوں میں جب مشرق کی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی تو سب چونک اٹھے۔ خصوصی دستے کے لیفٹیننٹ نے سیٹی بجائی اور کئی ساتھی سپاہی اپنے ہتھیار اٹھائے بھاگ نکلے۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

"غالباً" دشمن کا ایک جاسوس پکڑا گیا ہے۔ اس نے حلیہ بدل رکھا ہے۔ جعلی کبڑا بنا ہوا ہے۔ ایک سنتری نے اسے رکنے کا حکم دیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ سنتری نے گولی چلا دی اور اب وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا ہے۔"

"کیا کہا۔ جاسوس....." ہم سب اسے دیکھنے کے لئے تیزی سے اس طرف چل دیئے۔

جاسوس پکڑا جا چکا تھا۔ کئی ساتھی سپاہی اسے اپنی نگرانی میں لئے ادھر آرہے تھے۔ اس کے کوٹ کا سامنے والا حصہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔ اس کا چہرہ موت کی طرح سفید تھا۔ وہ چلتا ہوا کانپ رہا تھا اور اس کی کمر پر ایک کب تھا۔ جو ہل رہا تھا۔

"چچا چانگ۔ ارے یہ تو تم ہو۔ تم یہاں کیسے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

جونہی اس نے میری آواز سنی۔ اپنی آنکھیں اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی دمک بڑھ گئی۔ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"میری زندگی بچا لو۔ تم ہی بچا سکتے ہو۔"

"آخر ہوا کیا؟" میں نے پوچھا۔ میرے دل میں اس وقت کئی شبہات خود بخود پیدا ہو رہے تھے۔

"بڑے سردار" اس نے بات شروع کرنی چاہی۔ تب تک سپاہی اسے بلند قامت درخت کے نیچے لے آئے تھے۔ درد سے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ ہانپنے لگتا۔ کبھی بات کا سلسلہ جاری رکھتا۔ وہ اپنی پوری قوت کو مجتمع کر کے اپنی روداد مکمل کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں ... وہ شام ... وہی شام تھی۔ سات تاریخ تھی اس دن جب آپ گاؤں سے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے ان جاپانیوں ان سیاہ دلوں والے شیطانوں سے نفرت تھی۔ میں ان کے سائے تک سے خوف کھاتا ہوں؛ ور وہ گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میری بیوی نے کہا تھا۔

"ہمارے اس گرے پڑے گھر کا کیا بنے گا۔ اگر ہم یہاں سے چل دیئے تو گندم کی فصل کون سمیٹے گا؟"

میں نے اسے کہا تھا "شیطان کے سپاہی آنے والے ہیں۔ کیا تم اب بھی نہ جاؤ گی؟۔ اب بھی یہیں رہو گی۔"

میں نے اپنی دونوں بچیوں کو بانس کے سروں پر باندھ کر بانس کندھے پر رکھ کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گاؤں چھوڑے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ میری کمزور و ناتواں بیوی میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ آٹھویں تاریخ کو ہم ایک کی منڈی میں پہنچے میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تیز چلو تیز۔ ہمیں بڑے سردار اور اپنی فوج سے جا کر ملنا ہے۔"

میری بیوی نے تیز چلنے سے انکار کر دیا۔ اس میں جان ہی نہ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی

"دیکھو مجھ میں تو اب چلنے کی ہمت نہیں رہی۔ مجھے ستانے دو مجھے یہاں پانی کے دو گھونٹ پینے اور ستانے کا موقع دے دو۔

"ہماری حالت بے حد خراب تھی۔ تھکن سے چور تھے۔ بچیوں کو ہیضہ ہو چکا تھا۔ میں اس مصیبت کے وقت ان کے لئے کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگا کہ ندی پر جا کر ہاتھ منہ تو دھولوں۔

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہوا۔ پھر اس نے پر سوز لہجے میں کہا۔

"آہ پھر دشمن کے جہاز آگئے۔ ہر شخص ... بھاگنے لگا۔ میں بھی بھاگا۔ بیوی اور بچوں کی طرف .... جہازوں نے بم برسانے شروع کر دیئے' کانوں کو پگھلا دینے والے دھماکے ہونے لگے۔ جان بچانے کے لئے میں بھاگتا رہا جب طیارے چلے گئے تو میں منڈی پہنچا۔ اپنی بیوی اور بچیوں کی تلاش میں۔ وہ وہاں مردہ پڑے تھے۔ اوہ' ان کے جسم .... اوہ ان کے چہرے .... دشمنوں کے بموں نے انہیں ہلاک کر دیا تھا... آہ ...وہ ..."

وہ آنسو بہانے لگا۔

"میں بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ کی تلاش میں ... آپ سے ملنے کے لئے میں میں ...."

اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں پھر اپنے دونوں ہاتھوں کے بل پر سیدھا ہو کر بیٹھنا چاہا۔ اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ گھٹ رہی تھی...

"میں آپ سے .... وطن کے سپاہیوں سے محبت کرتا ہوں۔ مگر میں ان سیاہ دلوں والے شیطان کے بیٹوں سے نفرت کرتا ہوں .... میں .... مروں گا نہیں میں نہیں مروں گا... کیونکہ دشمن کے خلاف میری یہ نفرت ... زندہ رہے گی میں نہیں مروں گا..."

اور اس کی آواز ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی!!

ایک معمولی سا واقعہ

میں گزشتہ چھ برس سے اپنے گاؤں کی بجائے دارالحکومت میں رہ رہا تھا۔ اس تمام تر مدت میں ایسے بے شمار واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے جنہیں خاص "حکومتی معاملات" کہا جاتا ہے۔ ان میں اکثر تو ایسے بھی تھے جو میرے دیدہ یا شنیدہ تھے لیکن میرا دل ان میں سے کسی ایک سے کبھی متاثر نہیں ہوا تھا اور اب تو ان کی یادیں بھی میری بدمزاجی میں اضافہ کرتی ہیں اور روز بروز عامتہ الناس سے میری محبت اور لگاؤ کو کم کرتی ہیں' تاہم ایک معمولی سا واقعہ ایسا ہے جو میرے لئے بڑا ہی معنی خیز ہے اور وہ مجھے بھلائے بھی نہیں بھولتا۔

ابھی نئی جمہوریہ کے قیام کا چھٹا برس تھا کہ ایک روز تیز و تند سسکتی ہوئی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ مجھے اپنے کار روزگار کے لئے فجر دم ہی بیدار ہونا پڑتا تھا اور جس وقت میں گھر سے نکلتا تھا اس وقت گلی کوچوں میں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آتا تھا۔ اس روز بھی رکشا مجھے بڑی تگ و دو کے بعد ہی ملا' میں نے اسے جنوبی دروازے کی طرف چلنے کے لئے کہا۔

کچھ دیر کے بعد ہوا کی شدت اور تیزی میں بھی کمی آگئی۔ ہواؤں نے گرد و غبار اتنا اڑایا تھا کہ سڑک بھی اچھی خاصی صاف ہو گئی تھی۔ رکشا بھی تیز تیز چل رہا تھا۔ ابھی ہم جنوبی دروازے تک پہنچنے ہی والے تھے کہ اچانک کوئی شخص بے دھیانی میں سڑک کو پار کرتے ہوئے رکشے سے ٹکرایا اور پھر آہستگی سے زمین پر گر گیا۔

وہ ایک معمر خاتون تھی اس کے بالوں میں سفیدی آرہی تھی اس نے غریبانہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ پہلو والی گلی سے نکلی تھی اور عین رکشے کے آگے سے سڑک پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ رکشے والے نے اس کے گزرنے کی گنجائش تو فراہم کر دی تھی لیکن اس کی پھٹی ہوئی اور کھلی ہوئی جیکٹ جو ہوا میں لہرا رہی تھی وہ رکشے کے بم میں الجھ گئی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ رکشے والے نے اپنی رفتار بہت کم کر دی تھی ورنہ تو وہ بہت بری طرح گرتی' اور بری طرح شاید زخمی بھی ہو جاتی۔ اور جب رکشا رک گیا تو وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی نہیں ہوئی تھی۔ اس حادثے کا کوئی بھی عینی شاہد نہیں تھا۔ اب مجھے اس بات سے بڑی کوفت ہو رہی تھی کہ رکشے والے نے رکشا روک لیا تھا اور کسی احمقانہ کارروائی میں خود کو ملوث کرنے کی راہ پر تھا۔ تاخیر میرے لئے ایک مصیبت کا باعث بن سکتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا ہے" میں نے کہا "اور تم چلتے چلو"۔
لیکن اس نے یا تو میری بات سنی نہیں یا پھر سمجھی نہیں اس لئے کہ اس نے رکشے کے بم زمین پر ٹکائے اور بڑے جذب دروں کے ساتھ اس کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کیا آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں؟" رکشے والے پوچھا
"نہیں، مجھے چوٹ آئی ہے"
میرا خیال ہے کہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بڑی بے ضرر انداز میں آہستہ سے گری تھی پھر اسے چوٹ کیسے لگ سکتی تھی۔ وہ یقیناً" بہانے سازی کر رہی تھی جو ایک نہایت واہیات اور فضول کام تھا اور رکشے والا خواہ مخواہ اپنے لئے مشکلات پیدا کر رہا تھا' بوڑھی کو اپنی تکلیف کا مداوا خود ہی کرنا چاہیے تھا۔
جب اس بوڑھی خاتون نے یہ کہا کہ وہ تو زخمی ہوئی ہے تو رکشے والے نے دم بھر بھی توقف نہیں کیا اور اس کو سہارا دے کر آگے کی طرف چلنے لگا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ دونوں سامنے پولیس تھانے کی طرف جارہے تھے۔ اس وقت تھانے کے باہر کوئی سپاہی کھڑا نہیں تھا اس لئے اس کو دروازے سے اندر لے گیا۔
اس گھڑی ایک بڑا سنسنی خیز احساس مجھ پر چھا گیا اب معلوم نہیں کہ کیسے یہ احساس ہوا کہ ہر گھڑی دور ہوتے ہوئے رکشے والے کے خاک آلودہ پیکر میں تو ایک بڑی مکرم ہستی موجود ہے وہ جتنا جتنا دور ہوتا گیا اتنا اتنا ہی قد آور ہوتا چلا گیا' اور اتنا قد آور ہو گیا کہ اب میں بھی سر کو اونچا کر کے ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھ پر کوئی ہمہ گیر جسمانی بوجھ بھی بڑھ رہا تھا' جو اسی رکشے والے کی جانب سے آرہا تھا اور یہ مجھے اس تمام پستی' کو تاہ قامتی اور بے ضمیری سے باہر نکال رہا تھا جو میرے فر کے کوٹ کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کمزور اور ناتواں ہو گیا ہوں میری توانائیاں تو جیسے نچڑ گئی ہیں اور میرا خون میری رگوں میں منجمد ہو گیا ہے۔ میں حیران و پریشان اور بے حس و حرکت بیٹھا رہا تاآنکہ میں نے دیکھا کہ تھانے سے ایک پولیس آفیسر نکل کر میری جانب آرہا تھا جیسے ہی وہ میرے قریب آیا تو میں بھی رکشے سے باہر آگیا۔
"آپ کوئی اور رکشا لے لیں وہ تو اب آپ کو نہیں لے جا پائے گا"۔ پولیس آفیسر نے کہا۔ تب میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر تانبے کے سکے نکالے
"نوازش ہو گی اگر یہ پیسے آپ اس کو دے دیں"۔ میں نے اس آفیسر سے کہا۔
اب ہوا بالکل تھم چکی تھی تاہم سڑک ابھی تک سنسان ہی تھی جب چلا تو گنگنانے لگا تھا لیکن اپنے بارے میں کچھ سوچتے ہوئے میں ڈر بھی رہا تھا۔ ابھی ابھی جو کچھ بھی ہوا تھا اسے نظر انداز کر کے میں مٹھی بھر سکوں کے بارے میں کوئی جواز تلاش کر رہا تھا۔ وہ میں نے اس کو کاہے کو دیئے تھے؟ کیا وہ کوئی جزا اور انعام تھے؟ کیا اپنے اخلاق کے پیش نظر میں اس امر کا اہل تھا کہ رکشے والے کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ کر سکوں؟
میں اپنے ضمیر کو' کوئی جواب دینے سے قاصر تھا۔
ابھی تک وہ تجربہ میری یادوں میں فروزاں ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں اور بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ اپنا محاسبہ کرتا ہوں۔ ان تمام برسوں کے فوجی اور سیاسی ڈرامے میرے لئے ایسے ہیں جیسے بچپن میں نے بچوں کے لئے کلاسیکی کہانیاں پڑھی تھیں اور بھلا دی ہیں۔ اب تو مجھے ان کی آدھی سطر بھی یاد نہیں ہے' لیکن یہ

ایک معمولی سا واقعہ ہر آن مجھے یاد رہتا ہے' مجھے شرمسار کرتا ہے سرافگندہ کرتا ہے اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لئے اکساتا ہے' امید اور ہمت کو بڑھاتا ہے۔
اور یہ مجھے تمام تر تفصیلات کے ساتھ یاد رہتا ہے جیسے کہ یہ پیش آیا تھا۔

پچاسواں خط / روزگار

میں جونہی اپنے دفتر میں داخل ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"کیا میں کامریڈ ننگ وائس چیرمین چائینیز انجمن برائے معذور افراد سے بات کر سکتی ہوں؟

"جی! میں بول رہا ہوں' فرمایئے۔"

"میں چن یان بول رہی ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ مجھے اب تک پچاس خطوط موصول ہو چکے ہیں۔" اس کے لہجے سے مسرت نمایاں تھی۔

"اچھا اچھا! بہت خوب مبارک ہو۔" میں نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔"

بیجنگ کے مضافات میں رہائش پذیر ایک اکیس سالہ دوشیزہ چن یان نے تین ماہ قبل مجھے ایک درد بھرا خط بھیجا جس میں لکھا تھا "میں ایک جواں سال دوشیزہ ہوں۔ میں نے سکول برائے نابینا افراد سے گریجوایشن کیا ہے۔ لیکن تین سال سے بے روزگار ہوں۔ میں اس وقت بہت پریشان ہو جاتی ہوں جب میرے والدین میرے آگے چاول کی پلیٹ رکھتے ہیں اور اس وقت تو میری پریشانی اور سوا ہو جاتی ہے جب میرے بہن بھائی بھی میری مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی چاہتی ہوں کہ کاش! میرا اپنا گھر ہو جہاں میں انہی کی طرف ایک نارمل عورت کی طرح زندگی گزاروں۔"

یہ ایک طویل خط تھا جو ان تمام محرومیوں اور مشکلات سے پر تھا جو ایک نابینا عورت کو زندگی میں پیش آتی ہیں اس میں اسی ناتمام آرزوؤں اور حسین مستقبل کے سنہری خوابوں کا بھی ذکر تھا جو ہر عورت دیکھتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حکومت معذور افراد کی فلاح و بہبود کے لیے حتی المقدور کوشاں ہے اور اپنے موجودہ ناکافی وسائل کے ساتھ ان کی مادی ضروریات تو کسی حد تک پوری کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن ان کی روحانی تسکین کے سامان فراہم کرنے سے بہرحال وہ بھی معذور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معذور افراد بھی عام انسانوں کی طرح جذبات اور خواہشات رکھتے ہیں وہ بھی انہی کی طرح سوچتے ہیں' انہی کی طرح اپنی روحانی تسکین کی خاطر معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے کے خواہش مند ہیں' بلکہ ان میں عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرنے کا جذبہ زیادہ قوی اور شدید ہوتا ہے۔ کیونکہ صرف اس طرح ہی وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتے ہیں اور اپنا آپ منوا سکتے ہیں۔ میں نے جواباً" اسے ایک تسلی آمیز خط لکھا اور اسکی اجازت سے اس کے خط کے بعض اقتباسات انجمن کے ماہوار ترجمان "نابینا" (The Blind) میں شائع کر دیئے۔ اس میں اپنی طرف سے میں نے یہ اپیل بھی شائع کر دی کہ اگر کوئی صاحب اس کے رفیق زندگی بن جائیں تو شاید اس کی محرومیوں کا کسی حد تک کچھ ازالہ ہو

سکے۔
"کامریڈ ننگ! میں بہت خوش ہوں۔ مجھے زندگی میں کبھی اتنے خط موصول نہیں ہوئے۔" اس کے لہجے سے مسرت جھلک رہی تھی۔
"پھر تم نے کسی کا انتخاب کیا ہے!" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیونکہ پچاس مردوں میں سے انتخاب کافی مشکل مرحلہ تھا۔"
"میں نے پچاسویں خط کا انتخاب کیا ہے۔"
"اوہ بہت خوب! تو وہ شخص کیسا ہے؟" میرے لہجے میں تجسس تھا۔
"وہ ایک عمر رسیدہ آدمی ہے۔"
"ایک عمر رسیدہ آدمی؟" میں پریشان ہو گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ کوئی انہونی نہیں۔ کیونکہ عموماً معذور لڑکیاں اپنے سے عمر میں بڑے مردوں کو اپنا جیون ساتھی بناتی ہیں کیونکہ وہ پختہ کار اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔

میرے اس تحیر آمیز استفسار پر دوسری طرف سے ایک نقرئی قہقہہ سنائی دیا "کامریڈ ننگ! آپ غلط سمجھے ہیں۔ آپ کی اپیل کے جواب میں ایک ماہ پیشتر اس نے مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا آیا میں ڈاکخانے کے لیے اخبار فروشی کا کام کرنا پسند کروں گی۔ یہ واحد خط تھا جس میں مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ اگلے روز ہی میں ڈاکخانے جا پہنچی۔ وہاں کے اکثر ملازم میرے متعلق جانتے تھے۔ انہوں نے میری مدد کرنے کا منصوبہ بنایا اور مجھے اس سے آگاہ کیا۔ اس کا مطلب ہے۔
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں نے بس کے اڈے پر اخباروں کا سٹال کھول لیا۔ شروع شروع میں مجھے ڈر تھا کہ میری معذوری سے فائدہ اٹھا کر لوگ میرے اخبار بغیر قیمت ادا کئے نہ اٹھالیں۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ میرا ایک اخبار بھی نہیں اٹھایا گیا۔ میں اس رات اس قدر مسرور شاداں تھی کہ میں خوشی سے ناچنے لگی اور میری زبان پر بے تکلف یہ نغمہ آ گیا۔
Fill the World With Love
کامریڈ ننگ! اس دن سے میری تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ یہ دنیا میرے لیے بڑی دلکش اور پر مسرت ہو گئی ہے۔ میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتی ہوں اور مسلسل ۱۰ گھنٹے اخبار بیچنے کے بعد شام گئے گھر واپس لوٹتی ہوں۔ جونہی میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنتی ہوں تو زور سے صدا لگاتی ہوں "اخبار" میں اپنے ہر خریدار کی ممنون ہوں لیکن جو شخص ازراہ ہمدردی مجھ سے بقایا پیسے نہیں لیتا اور مجھے زیادہ قیمت دینے کی کوشش کرتا ہے تو میں اسے بلا کر بقایا پیسے واپس کرتی ہوں۔ میں ان کی انتہائی مشکور ہوں لیکن میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتی کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے۔ میں تو عزت کی بھوکی ہوں اور میری خواہش ہے کہ لوگ مجھ سے ایک نارمل عورت کا سا سلوک کریں۔
"یہ امر حیران کن ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مجھ سے اخبار خریدتے ہیں یہاں تک کہ گلی کے دوسرے سرے پر اخباروں کی جو دکان پہلے سے کھلی ہوئی تھی وہ دکاندر وہاں سے اپنی دکان بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کہیں اور جا کر اپنی دکان کھول لی ہے۔ میں روزانہ ۴۰، ۵۰ روپے کما لیتی ہوں اور کل ہی مجھے نجی تجارت کا

اجازت نامہ (لائسنس) بھی مل گیا ہے یعنی اب مجھے روزگار مل گیا ہے۔"

"روزگار!" یہ لفظ سن کر حیرت سے میں کرسی سے تقریباً اٹھ کھڑا ہوا۔ واقعی ایک معذور عورت کے لیے روزگار کا حصول ایک اچھے جیون ساتھی سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

"باقی انچاس افراد کو بھی بذریعہ خطوط یہ بتانا نہ بھولنا کہ تمہیں روزگار مل گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے انہیں پہلے ہی خطوط لکھ دیئے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اس پر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں نے دفتر کی بند کھڑکی کھول دی جس سے تازہ ہوا اندر آئی۔ میں نے دل میں سوچا' آج کا دن بھی میرے لیے کتنا اچھا اور یادگار دن ہے۔

غریب آدمی

بوتاؤ نے دو دن سے کھانا چکھا تک نہیں تھا۔ تیسرے دن علی الصبح جب سورج کی روشنی نے اودے بادلوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع کیا تو بھوک کے درد نے اسے جگا دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے ٹھنڈے اور سخت بستر پر لیٹا رہا۔ اسکی چندھی چندھی آنکھیں ایک عجیب چمک کے ساتھ ایک خزاں رسیدہ درخت کو تک رہی تھیں مگر اس کا ذہن اپنے گاؤں کی لذیذ اور مزے دار چیزوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ پھل آلو' گنے' انجیر' تازہ کیکڑے' مینڈک' سمندری جھینگے۔۔۔۔۔ اور پھر "ڈریگن بوٹ" کے تہوار پر تخم لوٹس کے گرم گرم پکوڑے اور موسم خزاں میں تیزپات کے کیک .....! اس کا دھیان ہر اس چیز پر جا رہا تھا جو کھانے کی تھی۔ حالانکہ محض خیال آرائی اس کے خالی شکم کو پر نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے اپنے ذہن کو ہر لطافت کی تفصیل میں جانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ تصور نے اس کے بستر کے قریب رکھی ہوئی میز پر کھانے کی لذیذ اشیاء چننی شروع کر دیں حتی کہ میز بھر گئی۔ پھر دوسری' پھر تیسری میز' یہاں تک کہ اسکا کمرہ میزوں سے بھر گیا جن پر مزے دار کھانوں کے ڈھیر تھے' جو اسکی ذہنی اختراع نے اسکی خواہش کے مطابق لاکر جمع کئے تھے اور یقیناً" وہ اسے مرغوب تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں انہیں نگلنے سے پہلے منہ میں رکھ کر مزے لے لے کر چبا رہا تھا۔

"کتنی نامعقول بات ہے"۔ وہ خود پر ناراض ہونے سے نہ رہ سکا۔

وہ جھنجلا اٹھا اور دوبارہ اپنی بوسیدہ چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ جس پر کاغذ کے پھٹے ہوئے ٹکڑے لٹک کر اس طرح لہرا رہے تھے کہ اب گرے اور اب گرے۔ دیواروں پر لگے ہوئے کاغذ بھی بہت زیادہ بوسیدہ بدرنگ اور گندے ہو رہے تھے۔ ان پر جابجا مری ہوئی مکھیوں اور مچھروں کا خون جم کر کالا پڑ چکا تھا۔ کہیں کہیں کچھ تحریریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں لکھا تھا" ..... ایک راہب نے شادی کر لی ...." کہیں "فلاں فلاں شخص حرامی ہے....." کسی بچے یا بڑے نے شاید وہاں اپنی موجودگی جتانے کے لئے یہ تحریریں چھوڑی ہوں۔

"یقیناً" یہ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔۔۔۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا۔

درختوں اور کھڑکی کی بوسیدہ جالی میں سے دھوپ چھن چھن کر آہستگی اور نرمی سے اس پر پڑنے لگی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا کہ نرم ولطیف ہوا پر تیرتی ہوئی کسی بچے کے گانے کی مترنم آواز اسکی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ ہے وقت اٹھنے کا...... منی بہن......"

گانے کی آواز سن کر بوتاؤ کے چہرے پر ایک مکار مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ جلدی سے کود کر بستر سے باہر نکلا اور کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی کتابوں اور کاغذوں کے ڈھیر میں سے اس نے "موسم بہار میں ویسٹ لیک پر صبح" کی تصویر نکالی اور دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔

گانے والی ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ بستہ اس کے کاندھے پر جھول رہا تھا اور وہ سکول جا رہی تھی۔ بوٹاؤ نے اس بچی سے دو مہینے پہلے جان پہچان پیدا کی تھی۔ وہ اسے کبھی پوسٹ کارڈ اور کبھی تصویریں بھی دیتا تھا اور اس سے کھانے کی چیزیں لے لیتا تھا۔ اپنی اور اسکی عمروں کے درمیان کا فرق اور دوسری وجوہات سوچ کر اس کے چہرے پر شرم اور تذبذب کے تاثرات ابھرے۔

"یہ کوئی اچھی بات نہیں جو میں کرنے والا ہوں۔ بڑی ہی حقیر اور شرم کی بات ہے۔" اس کے دل نے کہا مگر خالی پیٹ میں بھوک کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اس کے اس خیال کو بھی جلا دیا اور بچی کی طرف بڑھ گیا۔

"منی لائی۔ یہ دیکھو" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر بچی کو دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "اسے پسند کرتی ہو؟"

"بہت اچھی ہے ---- لاؤ یہ مجھے دیدو" لڑکی نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کے اندر کیا ہے؟" بوٹاؤ نے اس کے سکول بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیک ہیں" لڑکی نے جواب دیا

"کیا تم یہ کیک مجھے اس تصویر کے بدلے میں دوگی؟" بوٹاؤ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ لے لو۔" لڑکی نے کیک دے کر تصویر لے لی اور خوشی خوشی وہاں سے چلدی--- کیک ہاتھ میں پکڑے ہوئے بوٹاؤ نے اپنے آپ سے کہا۔

"میں بہت بدنصیب ہوں--- ایک ننھی بچی کو اس کے ناشتہ سے محروم کرنا بہت ہی ذلیل اور گھٹیا حرکت ہے"

مگر بھوک کی شدت اس کے خیالات پر غالب آگئی اور اس نے کیک کو منہ میں رکھ لیا۔ چھوٹے سے کیک نے اس کا منہ کو بمشکل بھرا اور پھر وہ جلد ہی ہضم ہوگیا۔ بھوک کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی جسکی اسے امید نہ تھی کیونکہ اس نے سوچا تھا کہ نہ کھانے سے تھوڑا سا ہی کھا لینا بہتر ہے۔ مگر بھوک تو اسے پہلے سے بھی زیادہ ستا رہی تھی۔ تھکا دینے والی بدمزگی نے اس کے دبلے چہرے کو اور بھی بے رونق کر دیا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور ایسے لرزا جیسے اسے سخت سردی لگی ہو۔ اس نے انتہائی مایوسی سے سرگوشی میں کہا۔

"مجھے فاقہ ہی کرنا چاہیے۔"

بچی کے گانے کی آواز دور جا کر گم ہوگئی۔

دھوپ نے زمین پر گرمی کی ایک ہلکی سی چادر بچھادی اور گلی میں لوگوں کی چہل پہل ہوگئی۔

"میں نے بہت ہی شرمناک حرکت کی ہے۔ لیکن یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ میں ایسا ذلیل انسان ہو گیا ہوں---" اس نے خوفزدہ بھرائی ہوئی آواز میں خود کلامی کی ----- "بلاشبہ۔ مجھے آج ایک بیباکانہ حرکت کرنی چاہیے---- ایک بہادرانہ کارنامہ ----- کچھ بھی ------ مگر مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے---" وہ کپکپاتا ہوا گلی کی طرف چلدیا۔

جیسے ہی وہ دوسری گلی میں مڑا۔ ایک موٹا، کالا، چپٹی ناک والا کتا ایک ڈیوڑھی میں سے کود کر باہر نکلا۔ اس کے موٹے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی 'ٹن' 'ٹن' کر رہی تھی--- اس نے بوٹاؤ پر غرانا شروع کر دیا۔ بوٹاؤ کو پھر اپنی ذلالت اور کم مائیگی کا احساس ہوا۔ اس نے غصے میں پیر پٹختے ہوئے کہا----- "انسان اتنے دولت پرست ہیں کہ ان کے کتے بھی امارت پسند ہو گئے ہیں---- دراصل یہ ساری دنیا ہی دولت پرست ہے---"

کتا اور اسکے نزدیک آکر بھونکنے لگا۔ بوٹاؤ کا صبر جواب دے گیا اس نے ٹوٹی ہوئی اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر زور سے

کتے کو مارا۔ کتا اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور اینٹ کا ٹکڑا زور دار دھماکے سے ایک چمکدار سرخ رنگ کے گیٹ پر لگا۔ اس غیر متوقع نتیجہ نے بوٹاؤ کو ایک تمکنت بخشی کیونکہ اس گیٹ کے اندر امیر لوگ، دولت پرست لوگ ہی تو رہتے تھے۔ اور اسی گیٹ سے ایک باورچی لمبی کالی گاؤن پہنے ان کے لئے ٹوکروں میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے، مرغی اور بطخ کے روسٹ، پھل فروٹ اور دوسری مرغوب اور مزیدار چیزیں لے کر جاتا ہو گا۔ یہ تصور ہی دو دن کے ایک بھوکے آدمی کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ اندر اس کے دشمن ہیں۔

کتا ٹانگوں میں دم دبائے ہوئے دور سے اس پر غرا رہا تھا۔ لیکن بوٹاؤ تو اس کتے کو بھول چکا تھا۔ اس کا دھیان تو مٹن، چکن اور دوسرے مزیدار کھانوں پر لگا ہوا تھا۔۔۔ اسے پھر اپنے خالی پیٹ اور کمزور ٹانگوں کا تکلیف دہ احساس ہوا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ اف یہ بھوک!" وہ بڑبڑایا۔

موسم سرما کی یخ بستہ ہوا اس کے جسم سے ٹکرائی اس نے کپکپاتے ہوئے کہا "ٹھنڈ۔۔۔ اور۔۔۔ بھوک"

اپنے خیالوں میں گم جیسے ہی وہ ایک موڑ پر مڑا تو کوئی سخت چیز اس سے ٹکرائی اور ساتھ ہی کوئی زور سے چلایا۔

"اندھے ہو۔۔۔۔ دیکھ کر نہیں چلتے"

بوٹاؤ نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک چودہ پندرہ سال کا ہوٹل کا نوجوان لڑکا قریب کھڑا ہوا اسے نفرت اور غصہ سے گھور رہا تھا۔

"تم پر کیا مصیبت آئی تھی" لڑکے نے غصہ میں کہا اور سڑک پر بکھری ہوئی روٹیوں اور پراٹھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دیکھو۔۔۔ تم نے سب خراب کر دیں۔"

"کیا مصیبت ہے!" بوٹاؤ نے جھنجلا کر کہا

"مجھے ان کی قیمت ادا کرو" لڑکا تحکمانہ لہجے میں چیخا۔

"لیکن تم تو خود مجھ سے ٹکرائے تھے" بوٹاؤ نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "میں کیوں قیمت ادا کروں۔۔"

"تمہیں ان ضائع شدہ روٹیوں کی قیمت دینا پڑے گی" لڑکے نے زور دے کر کہا۔

"جب آدمی غریب ہو تو ہر معاملہ میں بد قسمت ہوتا ہے" کہتا ہوا

بوٹاؤ وہاں سے کھسکنے لگا۔ مگر لڑکے نے بھاگ کر اسکا میلا کچیلا گاؤن پکڑ لیا۔

"بھاگنا چاہتے ہو" وہ چیخا۔۔۔ "لاؤ میری پانچ روٹیوں اور پراٹھوں کی قیمت نکالو۔۔۔"

"دفعہ ہو جاؤ۔۔۔" بوٹاؤ طیش میں آگیا۔ اس نے لڑکے کو زور سے دھکا دیا اور آگے بڑھ گیا۔

لڑکا زمین پر گر گیا۔ اس نے جاتے ہوئے بوٹاؤ کو دیکھا پھر زور زور سے سسکیاں لیتے ہوئے زمین پر سے مٹی میں سنی ہوئی روٹیاں اکٹھے کرتے ہوئے بوٹاؤ کو کوسا

"تمہارا بیڑا غرق ہو۔۔۔۔ ڈاکو۔ بدمعاش"

لڑکے کی آواز بوٹاؤ کے کان سے ٹکرائی۔ "ڈاکو" کا لفظ کچھ دیر تک اس کے کان میں گونجتا رہا۔۔۔۔ ڈاکو۔۔۔ اس لفظ کے پس منظر میں اسے دولت کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ اس نے اس لفظ کے مختلف معنوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خود کلامی کی "ڈاکو" پھر دنیا بھر کے عیش و آرام اسکی نظروں میں پھر گئے۔ اس نے تصور کی آنکھ

سے دیکھا کہ ایک جنگل بیابان میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ جمع ہے۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور قریب سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف بھیڑیں، مرغیاں اور بطخیں جمع ہیں جنہیں وہ حسب خواہش بھون کر کھائیں گے۔ پھر وہ تصور ہی تصور میں ایک ملگجی سی چاندنی رات کو دور کسی جنگل میں ڈاکوؤں کی ایک کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل ہے ادھر سے ایک آفیسر یا امیر آدمی جو بھی وہ تھا' گزرتا ہے۔ بوتاؤ نے اس کا نشانہ لیکر گولی چلا دی۔۔۔۔۔۔! اور پھر۔۔۔۔۔۔۔؟ اس خیال نے اسے ایسی طمانیت بخشی کہ وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی نہ اس میں ہمت تھی نہ سکت۔۔۔۔

"ڈاکو" ۔۔۔۔ اس نے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ قریب سے ایک چھوٹی سی گاڑی گزری۔۔۔ پکے ہوئے میٹھے آلوؤں کی خوشبو اس کے ناک سے ٹکرائی۔۔۔ "آخاہ۔۔۔۔ مزیدار" ۔۔۔۔۔۔ پھر اسے اپنے خالی پیٹ کا شدت سے احساس ہوا۔

"مجھے آج کوئی نہ کوئی حوصلہ مند قدم اٹھانا چاہیے۔۔۔ کوئی کام کرنا چاہیے ۔۔۔ ایک کام ۔۔۔ صرف ایک کام ۔۔۔ " پھر وہ کچھ سوچ کر خود ہی ناراض اور دل برداشتہ ہو گیا۔

"یہی ایک بات ہونی چاہیے ۔۔۔۔ یہی ایک بات ۔۔۔۔۔ "

وہ بڑبڑایا اور شاید اس نے کوئی ارادہ کر لیا کہ طمانت اور فخر سے اسکا دل معمور ہو گیا اور وہ مضبوط قدموں کے ساتھ سڑک پر چلنے لگا ۔۔۔۔ مگر اس دفعہ اس کی سمت ادھر تھی جدھر سے وہ آیا تھا۔ اور جلدی ہی وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے غور کیا کہ کتنا طاقتور بلند حوصلہ اور خوشحال ہے اور۔ اس خیال نے اسے قہقہہ لگا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا تم اندر ہو؟" باہر سے آتی ہوئی ایک آواز نے اسکی ہنسی کا سلسلہ توڑ دیا۔۔۔۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ آواز اس کی بدنصیب مکان مالکہ کی ہے ۔۔۔ تنہا۔ سفید بالوں والی بڑھیا۔۔۔۔ جو کہ اس سے کرایہ مانگنے آئی تھی۔

"اندر آجاؤ" اس نے کہا

"مسٹر چن ۔۔۔ کیا آج تمہارے پاس میرے لئے کچھ رقم ہے" بڑھیا نے پوچھا۔

"بہت" اس نے خود اعتمادی سے کہا۔

یہ سن کر بڑھیا کے چہرے سے تعجب اور شک و شبہ نمایاں ہوا۔ پھر بھی اس نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب ۔۔۔ لاؤ مجھے کچھ دو تاکہ میں جا کر آٹا خریدوں۔ میں بہت بھوکی ہوں۔"

"میں ابھی جا کر رقم لاتا ہوں۔۔۔" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم رقم لے آؤ گے" بڑھیا ایک لمحے کے لئے جھجکی پھر اشتیاق بھرے لہجے میں بولی ۔۔۔ "تو پھر جلدی کرو۔۔۔ خدایا ۔۔۔ مجھے یقیناً" پیٹ بھرنے کے لئے کھانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" اس نے تکبر اور چنچلی سے کہا اور بڑھیا کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

"دھوکے باز ۔۔۔ ذلیل ۔۔ بدمعاش ۔۔۔ اس نے ابھی میرا تین مہینے کا کرایہ دینا ہے۔۔۔" بڑھیا اسے گالیاں دینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ بوتاؤ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی جان بچا کر نکل گیا ہے اور وہ ہر دفعہ اسے اسی طرح گالیاں کوسنے دیتی رہ جاتی تھی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بوتاؤ کے چھوڑے ہوئے

کاغذات اور کتابوں کے ڈھیر سے وہ پیٹ تو نہیں بھر سکتی تھی۔ بوٹاؤ گالیاں سنتا ہوا اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بات گونج رہی تھی کہ غریب واقعی ذلیل ہے۔ اسے کھانے کے لئے گالیاں تو مل سکتی ہیں مگر پیٹ بھرنے کے لئے روٹی نہیں۔۔۔

ٹووَ ڈبلیوسن / نصر ملک

جدیدیت کے پجاری!

گریٹے مرچکی ہے۔

---اس کو دفن بھی کیا جا چکا تھا اور تجہیز کے اس موقع پر میں پہلی بار اس کے خاندان والوں سے ملا۔ گریٹے کی ماں اس کی قبر پر کھڑی آنسو بہا رہی تھی اور اس نے جب اپنی پر نم آنکھوں سے مجھے دیکھا تو مجھے وہاں سے کھسکنا پڑا۔ اب تک مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ گریٹے شکل و صورت میں اپنی ماں سے اس قدر گہری مشابہت رکھتی تھی۔ میرا سسر ماتمی لباس پہنے ادھر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کے سارے منظر سے کافی محزون و ملول دکھائی دے رہا تھا۔--- "آہ!---- گریٹے اپنی زندگی بھر کبھی ایک دن کے لئے بھی تو بیمار نہیں پڑی تھی" اس نے آہستہ سے ہمکلامی کی۔ گریٹے کے تینوں بھائی جن کے بارے میں ہمیشہ سے میرا خیال تھا کہ وہ محض دیہاتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے گریٹے کے ساتھ مشابہت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی حرکات و سکنات بھی اس سے ملتی جلتی تھیں۔ میں ان سب میں پائی جانے والی اس مشابہت کو کسی بھی طرح قابو نہیں کر سکتا تھا کہ اسے اپنی کتاب کے صفحوں میں ایک پھول کی طرح یادگار کے طور پر محفوظ کر لوں بالکل اسی طرح جیسے میں نے ایک بار گریٹے کے خدوخال کو اپنی کتاب دل میں محفوظ کر لیا تھا۔-- اس کے ہونٹوں کے کونوں سے چھلکتا ہوا تبسم' اس کی آنکھوں کے نور کی کرنیں' اس کا اپنے ہاتھ کو بلند کر کے اپنے سر کے گھنے سنہری بالوں کے اوپر سے اشارہ کرنا۔-- کتنا جاذب اور پر کشش ہوا کرتا تھا۔-- ایسے موقع پر جہاں ہم سب آج اکٹھے تھے--- چپکے سے ایسی خاندانی مشابہت و مماثلت کی جھلک کا ظاہر ہونا اور پھر اچانک پلک جھپکتے ہی غائب ہو جانا--- میرے لئے ظاہری آنکھ سے نظارے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا!

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب وہ سبھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے--- اب یہاں مکمل سکوت اور خلوت تھی بالکل اسی طرح جیسے میں اپنی ذات میں سکوت اور خلوت محسوس کر رہا تھا۔-- لیکن' نہیں' میری ذات میں یہ خالی پن یہ خلوت تو گریٹے کی موت سے کہیں پہلے ہی مجھے محسوس ہونی شروع ہو چکی تھی۔

گریٹے کی ماں' پادری کی طرف سے تجہیز و تکفین کی رسم کی ادائیگی کے دوران مجھے مسلسل دیکھتی رہی تھی اور پادری بڑے عجیب و غریب طریقوں سے روحانی کرتب دکھا رہا تھا لیکن میں ان سے ذرا بھر بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ میرا باپ خود ایک پادری تھا اور اسے اس طرح کے مذہبی فریضے اور رسوم ادا کرتے دیکھ دیکھ کر مجھے پادریوں کے خداؤں میں کوئی خاص دلچسپی اور تجسس نہیں رہا تھا۔ جب بھی میرے باپ کا ایک گرجا گھر سے دوسرے گرجا گھر میں تبادلہ ہوتا یا وہ کوئی نیا عہدہ قبول کرتا تو اس کا بس ایک ہی کہنا ہوتا تھا کہ اس نے یہ سب

کچھ خدا کی ہی ہدایت اور اسی کی مرضی کی وجہ سے قبول کیا ہے لیکن یہ بھی اچھی صورت حال تھی کہ خدا نے اسے کبھی بھی پہلے سے زیادہ آمدنی یا منافع والا موقع یا ملازمت مہیا نہیں کی تھی۔

گریتے کی ماں شاید اس وجہ سے بھی مجھے بغور دیکھ رہی تھی کہ وہ میری آنکھوں میں گریتے کی موت کی وجہ سے پیدا ہونے والے رنج و غم اور افسوس کا اندازہ کرنا چاہتی ہو لیکن میری آنکھوں میں ایسا کوئی غم یا افسوس موجود ہی نہیں تھا۔ میں تو گریتے کے لئے ہمیشہ ہی مغموم رہا کرتا تھا لیکن اس کے لئے میرا یہ غم صرف اس کی زندگی میں ہی قائم تھا اور اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں یہ جان سکوں کہ میرے مستقل طویل غم اور گریتے کی بے وقت غیر ضروری موت کا ذمہ دار کون تھا!

میرے خیال میں گریتے کی موت اس ڈاکٹر کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی جسے گریتے کی موت کے بعد اس کی قیمت اپنے "پریکٹسنگ لائسنس" کی ضبطی کی صورت میں ادا کرنا پڑی' میرے نزدیک وہ بھی ہماری طرح محض ایک بدقسمت تھا کسی کی موت کے لئے حیلے بہانے کس کو یاد رہتے ہیں۔ اس خالی کمرے میں اب مجھے ڈر آنے لگا تھا اور میں اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا میرے سینے میں آگ کے آلاؤ بھڑک رہے تھے ----- کیا گریتے میری وجہ سے مرگئی تھی؟ ---- اور گریتے کیا تجھے محض اس لئے مرنا تھا کہ مجھے تمہارے پیٹ میں کسی اور مرد کے بچے کی موجودگی برداشت نہ تھی؟ اور میں اس بچے کی پیدائش کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا تھا۔ کیا کسی ایک کی موت دوسرے کو مجرمانہ غلطی کا احساس دلاتی ہے یا یہ کسی ایک کا کسی دوسرے مرنے والے کے متعلق محض ایک واہمہ ہوتا ہے ---- گریتے! کیا ہمیشہ موت کی ہی جیت ہوتی ہے؟ کیا تم اپنے کفن میں لیٹی مجھ زندہ کو الزام دے رہی ہو؟ نہیں نہیں! گریتے تو کسی کو بھی الزام نہیں دے سکتی --- لیکن اس کی ماں کا مجھے گہری نگاہوں سے دیکھنا آج خطرے سے خالی نہیں لگ رہا تھا --- لیکن گریتے کے خاندان والوں نے خود مجھ سے اس کی موت کے بارے میں کیوں کچھ نہیں پوچھا تھا؟ میرے ذہن میں سوالات کے یہ تابڑ توڑ حملے جاری تھے --- کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کی موت پر ایسی وضاحت سے مطمئن ہو سکتی ہے جیسی گریتے کی ماں نے میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی؟

گریتے سے میری ملاقات ان دنوں ہوئی تھی جب میری پہلی کتاب شائع ہو کر بازار میں آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہو گئی تھی۔ میری اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کی ادب نواز بیوی نے میری نہ صرف مدد کی تھی بلکہ اس نے بعض ایسے ادیبوں' مصنفوں' مصوروں اور فنکاروں سے میرا تعارف بھی کرا دیا تھا جن کی وجہ سے میں خود کو بہت حد تک مطمئن اور ایک طرح سے خوش نصیب سمجھنے لگا تھا۔ کم و بیش ایک سال تک میں اپنے دوستوں کے حلقے میں خصوصی طور پر متحرک رہا اور ان سے استفادہ کرتا رہا۔ اسی دوران میں کوپن ہیگن کے نواح میں گریتے سے میری ملاقات آما سکوائیر میں ایک پارٹی میں ہوئی۔ پہلے پہل گریتے میں مجھے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی اور میں نے اسے اٹھارہ بیس برس کی ان دوسری چھوکریوں کی طرح کی ایک چھوکری سمجھا جو ہمارے حلقے میں کبھی ایک تو کبھی دوسرے کے پہلو کی زینت بنتی اور پھر "خوب سے خوب تر" کی جستجو میں وہاں سے ایسے ہی غائب ہو جاتی تھیں جیسے چپکے سے داخل ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ گریتے پہلی نظر میں مجھے پرکشش لگی تھی اور ابھی تک میرے کسی ساتھی کے ساتھ اس کی کوئی خاص دوستی بھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی میرے ذہن سے اتر گئی اور جب بھی ہمارے حلقہ احباب میں "اس رات کی پارٹی" کا ذکر چھڑا' کبھی اس کا تذکرہ نہ ہوا۔ ان دنوں میں کوپن ہیگن میں ایک متوسط طبقہ کے علاقے میں رہ رہا تھا اور اکثر اپنے دوستوں کے

ساتھ گھر سے باہر ہی رہتا تھا لیکن ایک دن میں گھر لوٹا تو دیکھا کہ وہی لڑکی میرے دروازے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی "تم نے کبھی مجھے فون کیوں نہیں کیا؟" میں کچھ بھی وضاحت نہ کر سکا وہ نہایت پرکشش دکھائی دے رہی تھی اور میں نے دروازہ کھولتے ہوئے اسے اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایسا کیوں ہوا۔۔۔ میں آج بھی اپنے ماضی پر جتنا غور کرتا ہوں الجھن اتنی ہی اور بڑھنے لگتی ہے۔ مجھے اپنے ماضی کی زندگی کے واقعات کے آغاز کی وجوہات جاننے اور یاد رکھنے میں سخت دشواری ہوتی ہے اور میں کبھی بھی یہ یاد نہیں کر سکتا کہ میری زندگی کا فلاں واقعہ کیسے رونما ہوا اور میں زندگی کے جس موڑ پر ہوں یہ رخ میں نے کیسے بدلا؟ شاید میرے ہی ساتھ ایسا نہیں' لوگوں کی زندگی میں اچانک کوئی اور نمودار ہوتا ہے اور محسوس ہوئے بغیر زندگی یکدم اتنی بدل چکی ہوتی ہے کہ اس کا احساس مشکل ہو جاتا ہے۔

گرینیے بھی میری زندگی میں بالکل ایسے ہی داخل ہوئی تھی۔۔۔ ہوا کے جھونکے کی طرح یا پھول کی خوشبو کی مانند۔۔۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے گرینیے وہ پہلی لڑکی تھی جس نے مجھے اپنی بھرپور محبت سے نوازا تھا اور میرے ساتھ پیار کیا تھا۔ لڑکیوں کے سلسلے میں' میں نے ہمیشہ خواہشات کا قتل کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ کئی لڑکیوں نے مختلف پارٹیوں کے دوران مجھے اپنے ٹیلی فون نمبرز خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیئے لیکن میں نے ان کو کبھی فون نہ کیا۔ ان لڑکیوں میں شاید کوئی نہ کوئی ایسی تو ہو گی جو آج تک میرے فون کرنے کا انتظار کر رہی ہو گی یا اس نے کیا ہو گا۔ میرا حلقہ احباب اخلاقی طور پر وسیع الذہن' قدامت گری کی ہڈیاں توڑنے والا' جدید اور بڑا کھلا تھا اور اگر اس میں کوئی اخلاقی پابندی تھی بھی تو میں ہمیشہ اس سے بے خبر رہا ہوں۔ شادی شدہ اور منگنی شدہ عورتوں سے میں ہمیشہ دور رہا ہوں "جہاں بیکری میں تازہ کیک فراوانی سے مل جائیں وہاں باسی ڈبل روٹی کھانے سے فائدہ!" میں جانتا تھا کہ میرے بعض دوستوں کو میرا یہ طریق کار پسند نہیں ہو سکتا تھا۔

شروع شروع میں گرینیے کو میں محض دل لگی کا ایک بہتر کھلونا سمجھتا رہا۔۔۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس کے خیال میں ایک طرح سے کھویا کھویا بھی رہنے لگا تھا۔۔۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے مشورہ لینے لگی تھی یہاں تک کہ اگر اس نے اپنے لئے کپڑے خریدنے ہوں' میک اپ کا سامان خریدنا ہو یا پھر کوئی فلم ہی دیکھنی ہو وہ میرا مشورہ ضرور طلب کرتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے مشوروں پر بہت ہی زیادہ انحصار کرنے لگی تھی میں اپنی رائے میں کبھی اپنے حکم کو شامل نہیں ہونے دیتا تھا اور محتاط رہتا تھا اور اپنے مشورے کی قبولیت کے لئے میں نے اس پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا میرا مشورہ محض ایک رائے ہوتی تھی لیکن یہ عجیب بات تھی کہ وہ کرتی وہی تھی جو میں کہتا تھا اس سے میری خود اعتمادی میں بھرپور اضافہ ہوا اور میں آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگا لیکن شاید محض کہنا کہ میں آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگا' غلط ہو' کیونکہ اس میں کسی بھی قسم کا کوئی "عاشقانہ پہلو" شامل نہ تھا۔ اپنی محبت کو میں گرینیے کے لئے اپنی "ہمدردی" بھی نہیں کہہ سکتا۔ شاید آپ اسے "محبت و ہمدردی" دونوں ہی کہہ سکیں لیکن اس میں "عشق کا جنون" شامل نہ تھا۔۔۔ گرینیے بھی میری اس محبت یا ہمدردی سے سرشار تھی اور مجھ پر اتنا انحصار کرنے لگی تھی کہ اب ہر معاملے میں مجھ پر تکیہ کرنے لگی تھی۔ خود میں کبھی کبھی حیران ہوتا تھا کہ "اس شام" جب وہ میرے گھر کی دہلیز پر میرا انتظار کرتے ہوئے مجھے ملی تھی تو اس سے پہلے' وہ کیسے گزارہ کرتی رہی ہو گی۔

گرینیے ایک دفتر میں ملازم تھی اور اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ میں مختلف ادبی و علمی رسالوں اور جرائد

کے لئے افسانے' کہانیاں اور مضامین لکھتا تھا۔۔۔ میرا لکھا ہوا ناول کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اور اس کی وجہ سے میری تحریریں بھی کافی مقبول تھیں۔ میں اپنے اس پیشہ سے مطمئن تھا اور خوب کما لیتا تھا۔ ہم دونوں کے پاس اگرچہ اپنا اپنا الگ الگ فلیٹ تھا لیکن ہم روز اکٹھے رہتے تھے کبھی اس کے ہاں اور کبھی میرے ہاں۔ پھر ایکدن ہم نے سوچا کہ جب رہتے ہم اکٹھے ہیں تو دو فلیٹ رکھنے کا فائدہ؟ ہم نے اپنے اپنے فلیٹ چھوڑ دیئے اور ایک بڑا فلیٹ مشترکہ طور پر لے لیا۔۔ مجھے معلوم نہیں کیوں' لیکن گربنے اپنے خاندان والوں سے بدظن تھی وہ انہیں منہ نہیں لگانا چاہتی تھی اس لئے ہم دونوں نے نہایت خاموشی سے اپنی شادی کی رسم پوری کی۔۔۔ شادی کی شام ہم نے اپنے ہی حلقہ احباب کے ساتھ "بڑا کھانا" کھایا۔۔۔ اب ہم کوپن ہیگن کے نواح میں ایک خوبصورت فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ دو کمروں پر مشتمل' بڑی سی بالکونی' آرام دہ باورچی خانہ اور سب سہولتوں سے مزین غسل خانہ' ہمیں اور کیا چاہیے تھا! ہاں ہمارا فرنیچر قدرے پرانا ضرور دکھائی دیتا تھا۔ میرے پاس میرے باپ کا دیا ہوا کچھ فرنیچر تھا جو وہ گرجا گھر میں بطور پادری استعمال کرتا رہا تھا اور گربنے قدرے جدید طرز کا اپنا فرنیچر اٹھا لائی تھی۔ یہ فرنیچر اس نے مختلف دکانوں سے خریدا ہوا تھا۔

ہم دونوں اپنے اس فلیٹ میں بہت خوش تھے۔ میں نے اگرچہ کبھی ظاہر تو کیا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ شادی کے بعد مجھے زندگی کے بہت ہی عجیب و غریب مسرت و راحت آمیز لمحے میسر تھے۔۔۔ قدرت کی بنائی ہوئی۔۔۔ پتلی نما۔۔۔ گربنے اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی بھر میرے تحفظ میں تھی۔۔۔ مجھے اس سے خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔۔۔ کبھی کبھی میں رات گئے۔۔۔ نیند سے بیدار ہو کر بتی جلا کر اسے سفید چادر اوڑھے سوتی ہوئی دیکھتا رہتا۔۔۔ ایسے سے اس کا بچوں کی سی معصومیت سے درخشاں چہرہ' بجلی کی روشنی میں اور بھی چمکنے لگتا اور اس کے گال تو گویا گلاب لگنے لگتے تھے۔ میرا یہ احساس کہ میں اب کبھی بھی اکیلا نہیں ہوں گا مجھے بہت تقویت دیتا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنی شادی کے موضوع پر اپنی محبت سے بھرپور ایک نظم لکھنے کا ارادہ بھی کیا تھا۔۔۔ میں اس کی محبت میں ویسے تو کئی نظمیں لکھ چکا تھا لیکن میں نے اپنی یہ نظمیں اسے کبھی پڑھ کر سنائی نہیں تھیں۔ آخر ایک بار میں نے اسے اپنی ایک نظم سنائی جو اس نے مجھ سے لے لی اور پھر بڑے فخر سے اس نے میری وہی نظم ایک موقع پر دلچسپی رکھنے والے ہمارے دوستوں کو سنا ڈالی۔ اس موقع پر جب وہ نظم سنا رہی تھی میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں نے اس کی یہ حرکت پسند نہیں کی تو اسے بہت صدمہ اور دکھ ہوا۔۔۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں نے اس کی یہ حرکت پسند کیوں نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں میری اپنی تخلیقات کے متعلق میرا اپنا رویہ ایک مخصوص نظریاتی رہا ہے۔ میری تحریروں میں یہ تاثر ملتا تھا کہ میں کسی سے "متاثر" ہوں۔ اپنے اس احساس پر مجھے بذات خود ندامت محسوس ہوتی تھی اور میں اسے اپنے سینے میں ایک چبھن کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مجھے اس وقت سخت کوفت اور اذیت ناک احساس کا سامنا کرنا پڑتا تھا جب کوئی میرے اس پہلو کا تذکرہ کرنے لگتا تھا اس لئے میں نے کسی کو کبھی ایسا کرنے کے لئے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میرے پہلے ناول پر نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے جس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا اس سے میں مطمئن ہی نہ تھا بلکہ اس سے میرے کندھوں پر میرا سر اور اونچا ہو گیا تھا۔ کتابوں کی کسی دکان کی کھڑکی سے مجھے اگر میری کتاب کی ایک جھلک دکھائی پڑ جاتی تو میں ذرا رک کر اسے دیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میرے نزدیک ایک لکھاری کے لکھنے کا عمل اتنا عظیم اور اتنا شخصی ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جس سے گزر کر اس نے کوئی کہانی' افسانہ یا نظم تخلیق کی ہو۔۔۔ لیکن اس کا کیا کیا

جائے کہ بعض اوقات قاری کسی مصنف کی تحریر میں "وہ اپنی بانہوں میں ایک عورت کو لئے کھڑا اس کے ہونٹوں پر اپنے بوسے نثار کر رہا تھا" اس طرح کے جملے پڑھتا ہے تو وہ ایسے جملوں سے حاصل کردہ اپنے لطف کا اظہار کرنے کی بجائے مصنف کے طرز بیان پر اس کے لئے ندامت محسوس کرنے لگتا ہے۔ میرے اپنے حلقہ میں شامل لڑکیوں کے علاوہ بھی ایسی درجنوں لڑکیوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی جو میرے خیال میں "مجھے اچھی طرح سمجھتیں تھیں" اور میری تحریروں پر میرے ساتھ بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کرنے کی خواہش مند بھی دکھائی دیا کرتی تھیں لیکن اس طرح کی ہی لڑکیوں سے تو میں دور بھاگتا تھا--- گربینے کا کردار مجھے ان سب لڑکیوں سے کہیں الگ، منفرد اور اپنی جگہ پر مثبت محسوس ہوتا تھا--- گربینے نے آہستہ آہستہ میرے متعلق رائے قائم کر لی تھی کہ میری تحریریں محض پیسہ کمانے کے لئے ہوتی ہیں--- میں اس دن خوب قہقہہ لگا کر ہنسا تھا جب گربینے نے اپنی اس رائے کا مجھ پر انکشاف کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیتے ہوئے پوچھا تھا کہ ----- پھر میں کوئی ڈرامہ کیوں نہیں لکھتا --- اس طرح میرے پاس رقم کی کمی نہ رہے گی--- مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا-- مجھے اپنی وہ چھوٹی سی نظم گربینے کو نہیں دینی چاہیے تھی جو اس نے بھری محفل میں اس رات سنا دی تھی۔

گربینے اور میری شادی ہوئے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ گربینے کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ میں ہی نہیں ہمارے جاننے والوں میں بھی ایسا کوئی نہیں تھا جو اسے ذاتی طور پر کسی اور جگہ ملازمت دلا سکتا۔ اس کے بے روزگار ہو جانے پر میں کچھ زیادہ فکر مند نہیں تھا بلکہ میں اس سے لطف اندوز ہونے لگا--- میں اکثر گھر پر ہی تو رہتا تھا--- گھر میں اسے اپنے اردگرد گھومتے، تیزی سے میز کرسیوں کی جھاڑ پھونک کرتے، فرش دھوتے، کھانا بناتے اور میز پر لگاتے ہوئے۔ اسے دیکھ کر مجھے عجیب سی مسرت و راحت ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک معصوم ننھی بچی کی طرح جو بہت سے کھلونوں میں گھری ہو--- خود کو ہر وقت مصروف رکھتی تھی اور اس کے اسی انداز پر میں خوش تھا--- لیکن اب سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ نہیں! گربینے صرف وہی کام کرتی تھی جو بذات خود اسے پسند ہوتا تھا وہ ایسے کسی کھلونے سے نہیں کھیلتی تھی۔ جو اسے پسند نہ ہو۔

ہمارا ایک دوست "مصور" تھا اور اکثر و بیشتر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی اونچے قد والی ایک ایسی نوجوان عورت تھی جو اپنے اطوار میں قوت کا عمل زیادہ رکھتی تھی۔ بعض اوقات اس کے ساتھ گفتگو اس کے تند پنے اور لہجہ کی ترشی کی وجہ سے ناممکن ہو جاتی تھی۔ اس کمزوری کے باوجود نہ صرف وہ ذہین تھی بلکہ دیکھنے والوں کے لئے اس میں جاذبیت بھی تھی--- مجھے اس پر اس وقت غصہ آجاتا جب وہ اپنی اس ذہانت و قابلیت کو گربینے پر آزمانے لگتی تھی۔ ہمارے حلقے کی سبھی لڑکیوں میں آج کل ھمنگوؤ کی تازہ کتاب ---- "ٹیڈے کی شریر نظمیں" موضوع بحث بنی ہوئی تھی لیکن گربینے ان کی اس بحث وغیرہ میں شامل نہیں ہوتی تھی حالانکہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس "حقیقت کا اظہار" کر سکنے کے قابل تھی کہ "ٹیڈے کی شریر نظمیں" کیا ابدی پیغام دیتی ہیں---- لیکن نہیں، گربینے تو ایسے ادبی موقعوں پر، میرے پہلو میں صوفے پر بیٹھی میرے کندھے سے سر لگائے میرے سویٹر پر یوں ہاتھ پھیرتی رہتی تھی جیسے ایک بلی کو سہلا رہی ہو وہ اس طرح کی ادبی محفلوں میں بھی اپنے ہی رنگ میں ہوا کرتی تھی--- "کل میری ملاقات ٹام سے ہوئی" --- "صیفرڈ بہت اچھا انسان ہے" وغیرہ وغیرہ---- گربینے اس بات کا خیال کئے بغیر کہ لوگ یقیناً" اس سے ادبی گفتگو کی توقع کرتے ہوں گے--- وہ اردگرد کی ایسی باتیں کرنے سے ذرا بھر بھی ہچکچاتی نہیں تھی--- شاید میرے لئے، اسے اپنی محبت پر

ابھی تک بھر پور اعتماد تھا۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا پسند کرتا ہوں اور میں اس کی کس بات پر خوش یا ناخوش ہو سکتا تھا۔۔۔ لیکن اس کے اس غیر موضوعاتی رویے کی اگر کوئی اور وجہ ہو۔۔۔ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں۔۔۔ ضرور کوئی وجہ ہو گی۔۔۔ لیکن مجھے یہ وجہ کبھی بھی معلوم نہ ہو سکی۔

جس عمارت میں ہمارا فلیٹ تھا جونہی وہاں ایک اور فلیٹ خالی ہوا اور اس کے دروازے پر "کرائے کے لئے خالی ہے" کا بورڈ ہر آنے جانے والے کو متوجہ کرنے لگا۔۔۔ "سونیا اور آرنے" اس میں آگئے اور اس طرح ہم "احباب" ایک دوسرے کے مزید قریب ہو گئے اور عملی طور پر بھی دن ہو کہ شام ہم ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے اور اکثر راتوں میں تو کئی کئی گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہتے۔ سونیا اور گریینے تو اب اکثر و بیشتر اکٹھی ہی رہنے لگیں تھیں۔ میں جب بھی شہر سے گھوم پھر کر واپس آتا اور گریینے اگر گھر پر موجود نہ ہوتی تو اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔۔۔ میں آرنے اور سونیا کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور دروازہ کھلتے ہی میرے سامنے گریینے کھڑی مسکرا رہی ہوتی۔ سونیا اور آرنے' دونوں کے ساتھ ہماری اس دوستی نے ہم دونوں کے ایک مشکل کھڑی کر دی تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں اب زیادہ تر اپنا وقت ان کے ساتھ گزارنے لگے تھے اور ہمارے پاس اپنے لئے' اپنے معاملات' معمولات اور ان سے بھی بڑھ کر اپنے ازدواجی تعلقات پر بات تک کرنے کا بہت ہی کم موقع ہوتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے پاس اب خود اپنے لئے بالکل وقت نہیں ہوتا تھا۔ اب نہ تو ہم کبھی اپنے ہنی مون سفر کا ذکر کرتے تھے اور نہ ہی ہمیں بیتے دنوں کی یادوں میں مستقبل کے بارے میں بات کرنے اور سوچنے کا موقع ملتا تھا۔ گھریلو ضروریات اور باہمی دلچسپی کے پہلوؤں پر بات کئے تو ہمیں عرصہ ہونے والا تھا۔ میرے لئے یہ صورت حال اب شاید ایک الجھن میں بدل رہی تھی لیکن پھر بھی میں نے گریینے کے لئے اپنی توجہ کو جاری رکھنے کی کوشش میں فرق نہ آنے دیا۔ مجھے شک ہے کہ گریینے کو میری یہ کوشش ایک طرح سے احسان مندی محسوس ہونے لگی تھی اور اسے کسی کا احسان مند ہونا اور خاص کر کسی مرد کا احسان مند ہونا تو کسی بھی طرح قطعی پسند نہیں تھا۔ اگرچہ میں بھی باتونی نہیں ہوں لیکن گریینے تو اب بالکل ہی خاموش رہنے لگی تھی۔ آرنے اور میں ایک دوسرے کے پاس گھنٹوں کوئی بات کئے بغیر بیٹھے رہتے تھے۔ جب میں اور گریینے اپنے گھر پر ہوتے تو میں اپنے ٹائپ رائیٹر پر اپنے مسودے ٹائپ کرنے میں مصروف رہتا لیکن اب گریینے نے میرے مسودوں کو پڑھنے کی خواہش کا بھی کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں کبھی اسے ایسا کرنے کو کہتا تھا۔

اب آہستہ آہستہ ہم اپنے فلیٹ ہی میں خاموشی کی دھند کا شکار ہوتے گئے' ایسی خاموشی جس میں دم گھٹنے لگے اور انجان سا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگے اور آنکھیں سوال تو کریں لیکن ہونٹ جواب دینے کی قوت سے محروم ہو جائیں۔ گریینے کی صورت حال کا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن میرا حال ایسا ہی تھا جیسے اس طرح کے ماحول میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس وقت خوفناک مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا جب گریینے کو دیکھتے ہوئے بھی میری نظریں اس کی نظروں سے چار نہیں ہو پاتی تھیں۔ میں بعض اوقات ٹائپ کرتے کرتے اپنی نظریں گریینے کے چہرے پر جما دیا کرتا تھا اور پھر ٹائپ رائیٹر کو ایک طرف دھکیل کر کسی پر بگلا بن کر بیٹھ جاتا تھا اور بس! ایک دن میں نے گریینے کو اس کمرے میں جہاں میں اپنی لکھائی پڑھائی کا کام کرتا تھا وہاں بلایا۔ وہ آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یوں خاموش اور ناراض کیوں ہے؟ میرا اتنا پوچھنا تھا کہ گویا یکدم خزاں چھاگئی ہو یا ایسا طوفان آگیا ہو جس نے اپنے پیچھے' درد و کرب کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑا ہو۔

"میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں" گریینے بولی اس کی آواز اور لہجے میں ایک طرح کا

"دبدبہ" تھا "میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں---- مجھے بھی آزادی چاہیے ---- مکمل اور کھلی آزادی!" وہ بولے جا رہی تھی۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور میرے سامنے ایسے مناظر گھومنے لگے جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مجھے ایسے وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا جو میرے تحت الشعور میں تو شاید کبھی موجود رہے ہوں لیکن میرے ذہن یا لب پر کبھی نہیں آئے تھے۔ گربینے کی طرف سے "مکمل و کھلی آزادی" کے مطالبے نے میری "مردانیت" کے "مرمر" کو پاش پاش کر دیا تھا۔ گربینے کے لئے مجھے اپنے مخلصانہ پن اور ایک "ایماندار شوہر" ہونے پر تو کوئی شک نہیں تھا البتہ مجھے اس کی طرف سے میری ہی بیوی نہ ہونے پر شبہ ہی نہیں بلکہ یقین ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے گربینے سے پوچھا "کیا اب تم مجھ سے محبت نہیں رکھتی ہو؟" "یہ مجھے ابھی معلوم نہیں" گربینے نے کہا۔ "ہاں تم اگر مجھے میری آزادی لوٹا دو تو شاید میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ تمہیں محبت کرنے لگوں۔" "تو کیا تم طلاق لینا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔ میری حیرانگی بڑھنے لگی تھی اور مجھے غصہ بھی آنے لگا تھا۔

"نہیں تو! یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟ میں طلاق نہیں لینا چاہتی" گربینے نے بڑی بے چینی و اضطرابانہ پن سے جواب دیتے ہوئے کہا "ایسے وہم اپنے دل سے نکال دو---- کیا تم نہیں سوچ سکتے کہ میں آزاد ہوں گی تو تم بھی خود بخود آزاد اور خود مختار ہو جاؤ گے۔"

ہماری بحث طوالت پکڑتے ہوئے تو تو میں میں پر اترنے ہی والی تھی کہ میں نے خود کو اس سردرد سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو پیچھے دھکیل لیا اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا---- میری طرف سے وہ مکمل آزاد اور خود مختار تھی---- اس کے بعد گربینے کو میں نے کبھی چھوا تک نہیں تھا--- ہاں البتہ اس کی موت سے صرف چند لمحے پہلے ---- میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

ہماری اس روز کی تو تو میں میں کے بعد بھی اگرچہ اس کے قہقہے ----- ہمارے گھر کے کمروں میں مندر کی گھنٹیوں کی طرح سنائی دیتے رہتے تھے لیکن میرا ٹائپ رائیٹر خاموش ہو چکا تھا۔ میرے لئے کام کرنا اب بالکل ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی کبھی کمرے میں ادھر ادھر گھومتی میرے قریب آکر اپنے بازو میری گردن کے گرد ڈالتی تو میں دانستہ اس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا اس کے لئے میرا رویہ ہمیشہ سرد رہنے لگا تھا۔ میں اس کے خلاف تختی کے اظہار کے لئے ہر موقع تلاش کرنے میں لگا رہتا' اور کوئی ایسی وجہ یا بہانہ تلاش کر ہی لیتا جس کی بنا پر میں اسے ایک آدھ تھپڑ لگا سکتا تھا۔ میں جو جنسی لحاظ سے اس میں کبھی بھی کوئی خاص کشش محسوس نہیں کرتا تھا اب اپنے دل میں اس کے لئے خواہشوں کے الاؤ لئے ہوئے تھا لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی اسے تفریح کے لئے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اس سے مباشرت تو درکنار تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے اس رویے پہ وہ کافی پریشان اور مشکل میں تھی۔ میرا ذہن اب اس وقت مجھے نہایت پرسکون اور بالکل اعتدال پر لگتا تھا جب میں اسے اذیت و تکلیف سے دوچار کر دیتا تھا ایسا کرتے ہوئے مجھے ایک طرح سے سکون اور مسرت ہونے لگتی تھی---- معلوم نہیں وہ بھی کس مٹی سے بنی ہوئی تھی---- ایک دن وہ خود ہی کہنے لگی "ذرا سوچو تو جب آرنے گھر سے کہیں باہر جاتا ہے تو سونیا اس کی قمیض ہی استری نہیں کرتی بلکہ اس کی روانگی سے پہلے اسکی نکٹائی تک درست کر کے اپنی تسلی کر لیتی ہے کہ وہ بارعب اور پرکشش دکھائی پڑے---- تمہارے خیال میں کیا یہ اچھا نہیں؟" اتنا کہنے کے بعد وہ یوں ہنسنے لگی جیسے کسی شریر بچے کو ڈانٹ پلائی جائے اور وہ کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ہنسے بھی اور رونے کی کوشش بھی کرے۔

میں نے محسوس کیا کہ گربنیے دن بدن سونیا کے انداز اپناتی چلی جا رہی ہے اس کے چلنے' بیٹھنے اور باتیں کرنے کے انداز میں مدبرانہ پن پیدا کرنے کی کوشش کرنا' بھی کچھ سونیا کی ہی طرح تھا۔ اس نے اب وہی کتابیں پڑھنا شروع کر دی تھیں جو سونیا کی الماری میں پڑی رہتی تھیں اس کے کپڑوں اور میک اپ میں بھی سونیا کے ہی انداز کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

میں وہ شام کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا جب گربنیے پہلی بار گھر سے اکیلی باہر گئی تھی--- اس نے دیہاتی لڑکیوں والا روایتی لباس پہنا ہوا تھا۔ اپنے اس لباس میں وہ ایک پھول کی مانند لگتی تھی اور بے شک وہ جب بھی یہ لباس زیب تن کرتی تھی اسے دوسری عورتوں کی طرح اپنے رخساروں پر پاوڈر کی دھول جمانے اور ہونٹوں پر سرخی لگانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اس شام جب وہ یہی لباس پہنے گھر سے چلنے ہی والی تھی تو میں نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

"دیکھو! میرا خیال تھا کہ میں شاید تمہیں بتا ہی دوں--- لیکن اب میں جب بالکل آزاد ہوں تو تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی کچھ پوچھنا چاہیے کہ میں کہاں جا رہی ہوں یا کیا کرنے والی ہوں" اس نے بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا۔

اس کے اس جواب پر میرے اندر کوئی ایسی چیز رونما ہوئی کہ میں خود یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ کیا شے تھی--- پہلے تو میں غصے سے ایک طرح پاگل ہو گیا اور پھر بالکل یکسر حواس باختہ سا--- لیکن جونہی میں نے گربنیے کی غضب ناک آنکھوں میں دیکھا--- میرا سارا غصہ ہرن ہو گیا اور میں خاموش بت بنے اسے گھر سے باہر جانے کے لئے دروازے سے ---- نکلتی دیکھتا رہا۔ گھر سے باہر نکل کر جونہی اس نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا مجھے طرح طرح کے خیالات نے آن گھیرا--- وہ کسی مرد کے ساتھ کسی رقص گاہ میں ناچ رہی ہو گی ---- نہیں نہیں وہ یقیناً" کسی کی آغوش گرم کر رہی ہو گی--- یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی کے مرد کے ساتھ ----! نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا--- لیکن عین ممکن ہے کہ اگر وہ بذات خود ایسا نہ بھی چاہتی ہو تو بھی کوئی مرد اسے زبردستی ایسا کرنے پر مجبور کر دے--- لیکن کوئی زبردستی کیوں کرے گا آج کل تو وہ خود اس بات کی منتظر لگتی تھی کہ کوئی اسے اپنے بانہوں میں لے لے---- میں اپنے انہیں خیالات کے بھنور میں اذیت ناک کرب کی شدت سے دوچار تھا--- اب تو یقیناً" وہ کسی کا بستر گرم کر رہی ہو گی--- میری اس کرب ناک حالت میں اب مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

مجھے ہمارے حلقے کے احباب کی وہ تقریب بھی یاد آ رہی تھی جس کے دوران میں گربنیے ہمارے ایک مصور دوست کے ساتھ فرش پر محو رقص تھی اور رقص کرتے کرتے اس مصور نے گربنیے کا بوسہ لینے کے لئے جونہی اپنے ہونٹ گربنیے کے رخسار کے قریب کئے تھے اس نے نہایت پھرتی سے اپنا چہرہ لٹو کی طرح دوسری طرف گھما لیا تھا--- ہمارے حلقے میں یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی بات سمجھی گئی تھی لیکن مجھے اس سے روحانی و قلبی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ گربنیے کی اسی طرح کی دوسری باتوں اور طرز عمل سے اس کے لئے میری محبت ٹھوس اور مضبوط ہو گئی تھی۔ میں اسے قدرت کا اپنے لئے ایک عطیہ سمجھتا تھا۔

کبھی کبھی یہ سوچ کر میں خود کو تسلی دے دیتا تھا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے شاید وہ محض وقتی طور پر جدیدیت کی پٹڑی پر رواں ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سنبھل جائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ سونیا اور آرنے اور ہمارے حلقہ احباب کے کئی دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی جگہ انفرادی و اجتماعی طور پر جدیدیت کی اسی

راہ پر گامزن تھے۔۔۔ میں حلقے میں شامل تو ضرور تھا لیکن جدیدیت کی اس روش میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ آج شام وہ سبھی اکٹھے ہوں گے۔۔۔۔ نجانے میرے بارے میں کیا کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ میں پھر خیالات کے دھارے میں بہنے لگا تھا۔۔۔۔ وہ جب کبھی اس طرح شام کو اکیلی باہر جایا کرتی تھی وسوسوں کے تیز خنجر مجھ پر حملہ آور ہو جایا کرتے تھے میں ان کے لگائے ہوئے زخموں پر آنسو کا نمک چھڑک کر رات بھر کراہتا رہتا تھا اور صبح دوسرے روز اسے پھر گھر میں اپنے اردگرد گھومتے دیکھ کر میرے یہ زخم پھر ہرے ہو جاتے تھے۔

ہماری شادی کو ہوئے اب تین سال ہونے والے تھے کہ ان ہی دنوں دارالحکومت کوپن ہیگن میں سیاسی بے چینی اور تعلیمی اداروں میں گڑبڑ کے کارن کرفیو لگا دیا گیا۔ ہم باہر شہر میں جانے سے قاصر تھے اور سارا سارا دن گھر کے اندر رہنا ہمارے لئے مشکل ترین تھا۔ ایسے میں صرف آرنے اور سونیا ہی تھے جن کے ہاں آنا جانا تھا۔ ہم دونوں ان کے ہاں اگر دن کے وقت چلے جاتے تھے تو وہ دونوں شام گئے رات ڈھلے تک ہمارے ہاں رہتے تھے۔ وہ جب تک ہمارے گھر میں ہوتے مجھے یوں لگتا کہ سونیا کی ذہین آنکھیں میری جانب سوالیہ انداز میں گھورتی رہتی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگتا گویا وہ مجھ سے پوچھ رہی ہو "کیا مجھے کچھ خبر بھی ہے" لیکن مجھے یہ پتہ کبھی نہ چل سکا کہ وہ کس خبر کے متعلق پوچھ سکتی ہے۔ میرا رویہ سونیا کے لئے بھی ترش ہو چکا تھا اور میں اسے اپنی بدقسمتی کی وجہ سمجھنے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کے بارے میں کچھ اس طرح بھی خیال کرنے لگا تھا کہ پہلے کبھی اس کے متعلق یوں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں سرکس کے ایک ایسے گھوڑے کی مانند تھا جس پر دائرے میں چکر لگاتے لگاتے اچانک انکشاف ہو کہ اس کی لگام تو کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ سونیا کے مدبرانہ جملے میرے لئے اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے تھے جتنا کہ گربینے کے محبت بھرے بول۔

اب ایسے واقعات روز بروز خود بخود یوں رونما ہونے لگے کہ میں خود حیران ہوا جاتا تھا یہ عمل کچھ اسی طرح رونما ہو رہا تھا جیسے جھیل کے کنارے کسی پرانی کشتی میں رس رس کر پانی داخل ہونے لگتا ہے۔۔۔۔ آہستہ آہستہ سونیا میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔۔۔ نہیں نہیں۔۔ وہ تو اب ایک طرح سے میری ملکیت میں آ گئی تھی۔۔۔ وہ میری داشتہ تھی۔ ایک ذہین' مدبر اور محبت میں متشدد عورت۔۔۔ مجھے اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ سونیا کی اپنی بھی کوئی پسند تھی کہ نہیں میں اس بارے میں لاتعلق ہی رہنا چاہتا تھا۔ سونیا کے ساتھ ہم بستری کرتے داد و عشرت کے لمحوں میں تو درکنار میں ویسے بھی کبھی گربینے کا ذکر نہ کرتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ ایکبار سونیا نے خود ہی قصہ شروع کرنا چاہا "بیچاری گربینے تو اپنی برداشت سے بھی زیادہ ستم زدہ ہے" میں فخریہ طور پر اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اس سے اس کا کیا مطلب ہے کہ میرے فخر نے مجھ پر غلبہ پالیا اور میں نے گربینے کے "ستم زدہ" ہونے کے بارے میں پوچھنا تک گوارا نہ کیا دراصل سونیا کی قربت کے اس لمحے میں میں گربینے کو کسی بھی صورت اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن اب خیال کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ایسے وقت میں جب کسی انسان کے "ستم زدہ" ہونے کا مسئلہ اور معاملہ ہو اس وقت دوسروں کا اس "ستم زدہ" کی صورت حال پر فخریا غرور کرنا کتنا کمینہ پن ہوتا ہے۔۔۔۔ لیکن تب مجھے کیا اندازہ تھا کہ سونیا کسی انسان کی بات کر رہی تھی۔ میں سونیا کو کسی قسم کا الزام کیوں دوں۔۔۔ جدیدیت کی پرستش تو اس کا مذہب تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بذات خود سونیا بھی آرنے کی ایک داشتہ کے بارے میں نہ صرف جانتی تھی بلکہ کبھی کبھی وہ اس سے ملتی بھی تھی اور پھر اس کے ساتھ باتوں ہی باتوں میں نہایت دوستانہ طریقے سے آرنے کے متعلق ایسے "راز" فاش کرتی تھی کہ سننے والی دنگ اور انگشت بدندان رہ جایا کرتی تھی۔ اپنی اس طرح کی گفتگو کے دوران میں وہ بار بار یہ جملہ دہرایا کرتی تھی کہ

"تمہیں کیا معلوم خود میں نے آرنے کو محبت کی کن گہرائیوں سے چاہا ہے!" سونیا جب سو رہی ہوتی تھی تو اس کا چہرہ گریتے کے مقابلے میں کشش و جاذبیت سے خالی تو دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کے چہرے پر "ذہانت" اور اس کی وجہ سے "تحفظ" کی چمک نمایاں ہوتی تھی--- لیکن یہ عجیب امر تھا کہ وہ سوتے میں اکثر یوں پہلو بدلتی رہتی تھی گویا نیند میں بھی اسے سکون و آرام میسر نہ ہو۔ میں اب صرف عیش و عشرت ہی کے لئے نہیں بلکہ ویسے بھی ایک طرح سے سونیا کو ہی پسند کرنے لگا تھا بلکہ اب تو مجھ میں یہ خواہش بھی ابھرنے لگی تھی کہ شاید ایک دن میں دوسری عورتوں کو بھی چاہنے لگوں.....

گریتے آج کل کچھ زیادہ ہی وقت گھر پر ٹھہرنے اور صرف کرنے لگی تھی لیکن مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑا تھا میں تو اس سے بالکل بے پرواہ تھا۔ اور اس کی طرف قطعاً" کوئی توجہ نہیں دیتا تھا--- ہاں اگر سونیا اتنی دیر میرے پاس ٹھہرا کرتی تو بات ہی کچھ اور ہوتی--- لیکن یہ گریتے!--- یہ تو محض اسکا "خالصانہ" پن تھا جس سے مجھے کبھی پیار تھا اب تو اس کی صرف ایک جھلک ہی میرے لئے غم و غصے کے سوا کچھ نہیں ہوتی تھی---

گریتے کے لئے میرے جنسی جذبات میں کبھی ہیجان نہیں آتا تھا اور مجھے ہرگز ایسی کوئی خواہش یا تمنا نہیں تھی کہ میں اسے اپنے بدن کا حصہ بناؤں--- ہاں وہ کبھی کبھی میرے خوابوں میں ضرور آتی تھی--- میں اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ میں نے اگر کبھی گریتے سے ہم بستری کی بھی تو میرا وہ مردانہ ہیجان بھی یکسر جاتا رہے گا جو دراصل اسی کی نظروں کا دیا ہوا تھا۔

ایک رات، میں نے اچانک اسے بستر میں آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے سنا جس کا اب احساس کرنا میرے لئے سوائے ندامت کے اور کچھ بھی نہیں--- اس رات میں نے--- اس کے درد آمیز کراہنے کی پرواہ ہی نہ کی حالانکہ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت گریتے میری بھرپور توجہ کی مستحق تھی۔

وہ پہلی رات، جب گریتے گھر سے اکیلی باہر گئی تھی کاش، اس رات میں اسے روک لیتا اور اپنی جوانی کی لذت سے اسے مخمور کر دیتا اور اسے وہ نعمت دے دیتا جو وہ تلاش کرنے کے لئے اکیلی ہی گھر سے چل نکلی تھی--- کیونکہ میرا یقین ہے کہ اس رات کے بعد صرف میں اکیلا ہی نہیں بلکہ گریتے بھی واقعی دکھ جھیلتی رہی بلکہ شاید وہ مجھ سے زیادہ ہی اذیت میں مبتلا رہی--- گو اس کا اظہار اس نے کبھی خود نہ کیا اور نہ ہی میں نے کبھی پوچھا تھا--- لیکن آج رات اس کی اذیت ایک نیا رخ لے رہی تھی--- وہ بستر میں پڑی ابھی تک مسلسل کراہے جا رہی تھی۔

وہ ایک بچے کو جنم دینے والی تھی۔

مجھ سے اب رہا نہ گیا اور میں ایک طرح سے سرکتا ہوا اس کے بستر کے قریب پہنچا اور آنسو سے بھیگے ہوئے اس کے چہرے کو بے اختیار اپنے ہاتھوں میں لے کر خود بھی زار و قطار رونے لگا۔ مجھے اپنے بچپن سے ہی اس طرح رونے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میری اپنی خواہش نہیں بلکہ میری حسرت تھی کہ میں خود گریتے کے بچے کا باپ ہوتا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا محض اس لئے نہ ہونے دیا کہ میرے خیال میں گریتے ابھی ماں بننے کی عمر میں پہنچی ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ گریتے اس عمر میں ماں بن گئی تو اپنی جوانی کے نشے میں وہ معصوم بچے کی طرف بھرپور توجہ نہیں دے پائے گی اور محض ماضی کی یادوں میں کھوئی رہا کرے گی۔

میں نے ابھی تک اگر اسے چاہا ہوتا تو ماضی کی تلخیاں اپنی کچھ بھی اہمیت نہ رکھتیں--- محبت میں اونچ نیچ تو آ ہی جاتی ہے--- اگر کوئی ایک کسی دوسرے سے محبت کرتا ہے تو پھر آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود ہموار

ہونے لگتی ہیں لیکن مجھے تو اس سے محبت ہی نہیں تھی اور اب اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے "کسی اور کے بچے" کو تو میں ہرگز قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن میں سوالوں کا بھونچال لئے اور آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے مناظر دیکھتے میں گربینے کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لئے ابھی تک رو رہا تھا--- میرے ذہن میں ہتھوڑے بجنے لگے تھے--- سونیا بتاؤ، کم بخت آرنے تمہی جواب دو--- میں تم سبھی جدیدیت کے پجاریوں سے پوچھتا ہوں--- "تم ایسے بچوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ تم کتنی بار اسقاط حمل کے غیر قانونی منحوس کلینکوں میں گربینے جیسی کتنی عورتوں کو لاتے ہو؟ جواب دو--- جدید دور کے جدید دانشورو، مدبرو--- بولو--- تمہارے لبوں پہ سکوت کی مہر کیوں لگ گئی ہے--- بتاؤ، تمہاری اس بعید از قیاس "آزاد و مہار لطف" طرز زندگی کے کیا معنی ہیں--- کیا تمہاری اس دنیا میں گزری ہوئی ممکنات، ناکام دنوں اور مردہ بچوں کے لئے کوئی جگہ ہے؟

میں اب سونیا کے ساتھ ایک کلینک میں، گربینے کے بستر کے قریب کھڑا تھا--- اس نے ایک لمحے بھر کے لئے لبی سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں تھیں اور ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے قریب پاکر یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "مجھے تم دونوں کے بارے میں سبھی کچھ تو معلوم ہے" اور پھر اس نے زیر لب مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بالکل سونیا ہی کے انداز اور اسی کے ہی الفاظ دہراتے ہوئے کہا: "HOW's it going?

"Say, you two Swinger, وہ ابھی تک زیر لب یہی جملہ دہرانے کی پھر کوشش کر رہی تھی کہ اس کا چہرہ یکدم سفید پڑنے لگا اور ہونٹ کانپنے لگے اس نے اپنی آنکھیں موندھ لیں تھیں اور سونیا چپکے سے وہاں سے کھسک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی--- مجھے ڈاکٹر نے وہیں ٹھہرنے کی درخواست کی اور خود اس نے گربینے کو ایک انجکشن لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے پیٹ کے بچے کا باپ کون ہے؟" میں نے اپنے شانے اچکائے--- میرے خیال میں اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا--- میرے وہاں ہوتے ہوئے تو وہ ہوش میں نہیں آئی تھی--- اور نہ ہی مجھے اس کا امکان دکھائی دیتا تھا لیکن میں ڈاکٹر تو نہیں تھا--- میں نے وہاں سے چلنے سے پہلے گربینے کو ایک بھرپور بوسہ دیا لیکن نہایت محتاط ہو کر--- مجھے خوف تھا کہ وہ کہیں برا نہ مان جائے--- اسے کہیں دکھ نہ ہو--- میں نے ایسا شاید اس لئے ہی کیا تھا کہ میں اسے یہ آخری خطرناک کھیل کھیلنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا--- شاید---!

اب میں پرسکون ہوں--- کیونکہ میری تمامتر محبت، میری چاہتیں، میرا رنج و دکھ اور سبھی شکوے شکائتیں--- گربینے کے ساتھ ہی دفن ہو چکی تھیں--- یہی وجہ تھی کہ گربینے کی ماں میرے چہرے میں وہ تاثر نہ پا سکی جسے دیکھنے کے لئے وہ اپنی گہری نیلی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جمائے ہوئے تھی--- وہ گہری نیلی بڑی بڑی آنکھیں جو گربینے کی آنکھوں سے اتنی مشابہ تھیں کہ میں ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔

خوف!

آج صبح گھر سے نکلتے وقت بڑا بابو جارج بہت خوش تھا اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اپنا بیگ بغل میں دبایا اور بڑے خوشگوار موڈ میں گلی سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے جان پہچان والے چند ایک ہی ملے جنہیں اس نے نہایت ادب سے ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ حسب عادت وہ آج بھی بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ گھروں میں صبح سویرے دیر تک سونے والے لوگ گلیوں میں اخبار یا دودھ فروخت کرنے والوں کی ہی نہیں بلکہ عام چلنے والے لوگوں کے جوتوں تک کی آواز پسند نہیں کرتے تھے اور پھر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو بتاتے رہتے تھے کہ ---- "وہ ہے صبح سویرے امن کی نیند خراب کرنے والا" ---- بڑا بابو جارج یقیناً "کسی کی بھی نیند خراب کرنے والا "بدامن شہری" نہیں تھا۔ وہ تو کسی کو بھی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا تھا کام کرتا۔ تنخواہ پاتا اور اس میں سے باقاعدہ ٹیکس ادا کرتا اور کسی بھی وجہ سے اڑوس پڑوس میں 'گھروں' بنگلوں اور کوٹھیوں کے دروازوں' کھڑکیوں کے قریب تک نہ جانا اس کا ایک طرح سے اصول تھا وہ لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کے قطعاً" حق میں نہیں تھا۔ بڑی بڑی کاروں اور عالی شان بنگلوں اور موٹی توندوں والے ڈائریکٹروں کو صبح سویرے ان کی نیند سے وہ بدمزا کیوں کرے--- یہ وقت تو ان کے آرام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عین اسی وقت ہزاروں دوسرے لوگوں کی طرح بڑے بابو جارج کو انہیں کے آرام کی خاطر کام پر جانا ہوتا ہے۔ اپنے انہیں خیالات میں گم لیکن ساتھ ہی غیر ارادی طور پر محتاط جارج بابو تنگ گلی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر صبح کی سرمئی نیم روشنی میں جو دیکھا تو حیران رہ گیا کچھ لوگ فٹ پاتھ پر سوئے پڑے تھے---- "اوہ اچھا--- وہ بھی تو انسان ہی ہیں--- اپنی صبح سو کر گزارنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق .ت گزاریں--- آخر انہیں بھی تو اس کا حق حاصل ہے" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

بڑے بابو نے سامنے گرجا گھر کی دیوار پر وقت دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے معمول سے قدرے لیٹ ہو رہا تھا۔ اس نے اب اپنی رفتار تیز کر دی۔ گلی کے کونے پر اس کی مڈھ بھیڑ نیلسن موچی سے ہوئی جو اپنے کام پر جا رہا تھا۔ جارج بابو نے ہر روز کی طرح حسب معمول اپنا ہیٹ چھو کر اسے بھی سلام کیا لیکن نیلسن موچی اسکا جواب دیئے بغیر اس کے قریب سے یوں گزر گیا گویا اس نے بڑے بابو کو دیکھا ہی نہ ہو--- بڑا بابو پہلے تو قدرے حیران ہوا پھر اس نے سر جھٹک کر خود سے سرگوشی کی--- "شاید نیلسن آج جلدی میں ہو---- نہیں ممکن ہے وہ بھی میری ہی طرح اپنی سوچ میں گم ہو گا--- بعض لوگ اپنی سوچوں میں یوں کھو جاتے ہیں کہ وہ راہ چلتے ہوئے دوسرے افراد کی موجودگی محسوس ہی نہیں کرتے" جارج بابو کا موڈ قدرے خراب ہو گیا تھا--- "آخر نیلسن نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا--- اس نے مجھے دیکھا تو ضرور ہو گا' ہر صبح ہماری ملاقات

اسی وقت اسی جگہ ہی تو ہوتی ہے اور پھر میں اپنے جوتوں کی مرمت بھی تو ہمیشہ اسی کی دکان سے کراتا ہوں--- وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے--- اس نے جان بوجھ کر میرے سلام کو کیوں نظرانداز کر دیا؟"

جارج ابھی تک نیلسن موچی کے بارے میں سوچ رہا تھا--- "نہیں --- وہ شاید کسی اور طرف متوجہ تھا تبھی تو مجھے دیکھ نہیں سکا ہو گا" جارج بابو چلتا اور سوچتا جا رہا تھا۔ "نیلسن شاید اب اپنی دکان پر پہنچ گیا ہو گا وہ اپنے کسی ایسے گاہک کو جو اس کے ہاں اپنا جوتا پالش کرانے آیا ہو گا یہ بتا رہا ہو گا--- بڑے بابو جارج نے آج ابھی صبح جب مجھے اپنا ہیٹ چھو کر سلام کیا تو میں اسے خاطر میں لائے بغیر سیدھا دیکھتا اس کے قریب سے گزر گیا--- نہیں بلکہ میں تو بڑے بابو کے پہلو کے قریب تر تھا لیکن میں نے اسے اہمیت ہی نہیں دی"--- جارج بابو نے لمبا سانس لیا اور سوچا "کہتا ہے تو کہتا پھرے--- آخر نیلسن اور کر ہی کیا سکتا ہے وہ میرا کوئی ایسا پہلو یا معاملہ تو جانتا ہی نہیں جس پر وہ میرے بارے میں بات آگے بڑھا سکتا ہو یا پھر کسی افواہ کی بنیاد رکھ سکے!"

جارج بابو اپنے مکان کی قسطیں ادا کر چکا تھا۔ اس کی بیوی برگینیے اس سے پیار کرتی تھی۔ بچے مناسب تعلیم و تربیت کے ساتھ جوان ہو چکے تھے اس کے بارے میں کوئی اگر انگلی اٹھاتا بھی تو کیوں؟ لیکن پھر بھی نجانے کیوں یہ وقت ہی ایسا تھا کہ کسی ایک کے بارے میں کسی دوسرے کا ایک لفظ ہی اسے تباہ کرنے کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ جارج بابو کے بارے میں ایک بات واضح تھی کہ اس کا اپنا نقطہ نظر اور سیاسی یقین کیا ہے اور اس کی سیاسی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں۔ جارج بابو نے اس بارے میں خود ہی واضح کر دیا تھا۔ اور یہاں تک کہ نیلسن موچی کی دکان پر بیٹھنے اور کسی قسم کا سیاسی اثر و رسوخ نہ رکھنے والے افراد بھی جارج کی زبانی اس کے اپنے نقطہ نظر کے بارے میں متعدد بار سن چکے تھے کہ وہ تو محض اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور بس! جارج بابو کی رفتار میں اب مزید تیزی آ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں خیال ابھرا "ہو نہ ہو نیلسن موچی دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا ہو گا" اب تو جارج بابو اپنی سوچ میں یوں گم ہو گیا کہ اسے اپنی بھی خبر نہ رہی--- "مجھے اپنے بارے میں کم از کم اس موچی کی دکان پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی کہ میرا سیاسی نظریہ کیا ہے اور میں اپنے کن کاموں سے کام رکھتا ہوں۔" جارج اب خیالات کے تند و تیز دھارے میں بہے جا رہا تھا۔ "شاید اب وہ میرے گھر کا دروازہ پیٹ رہے ہوں گے--- میری بیوی برگینیے نے اپنا باتھ گاؤن پہنے ہی دروازہ کھول دیا ہو گا--- وہ برگینیے کو وضاحت کا موقع دیئے بغیر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہو چکے ہوں گے--- ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے برگینیے پر اپنا ریوالور بھی تان رکھا ہو شاید انہوں نے اس کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو"--- جارج بابو مسلسل سوچے جا رہا تھا--- "ہم تمہارے خاوند کی تلاش کر رہے ہیں--- دیکھو! تمہیں بذات خود گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بتاؤ وہ کمینہ جارج کدھر ہے--- یہ معاملہ تمہارے خاوند ہی سے متعلق ہے" وہ بک رہے ہوں گے!"

جارج بابو اب ریل گاڑی میں بیٹھا پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے کانپ رہے تھے کہ وہ اپنا اخبار تک نہیں کھول سکا تھا--- یقیناً "یہ ایک اہم معاملہ تھا اور جارج کے لئے ایک بدترین واقعہ بھی--- لیکن یہ کوئی غیر سیاسی معاملہ بھی تو ہو سکتا تھا جس میں اتنا خطرہ بھی نہ ہو--- شاید یہ محض اس کی اسی طرح کی سوچ ہو جس طرح وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سوچنے لگ جاتا ہے لیکن یہاں اس شہر میں تو اب تک ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا--- ایک دوسرے سے سیاسی گفتگو کے باوجود--- سب خیریت ہوتی اور رہتی تھی۔ وہ جب اس علاقے میں منتقل ہوا تھا تو سبھی محلے والوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا--- اس کی

بیوی جلد ہی تمام دکانداروں کو پہچاننے لگی تھی اور وہ بھی اسے ایک خوش مزاج خاتون سمجھتے تھے۔ اس کے بچوں نے کئی دوسرے بچوں کو جلد ہی دوست بنا لیا تھا۔ ان میں ایسے بچے بھی تھے جن کے والدین بڑی بڑی کاروں' کوٹھیوں اور بنگلوں کے ساتھ جائیدادوں کے مالک تھے"۔۔۔۔ جارج بابو نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا "شاید حالات معمول پر آہی جائیں گے۔۔۔ حکومت ہی تو بدلی ہے آخر ہمیں اپنا سیاسی نظریہ رکھنے کا حق تو ہے ہی!" وہ سوچ رہا تھا۔۔۔ اس کے بچوں کے اپنے اپنے گھر ہوں گے' وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معاشرے کے پروقار باعزت شہری ہوں گے۔ وہ اپنا آمدنی ٹیکس ادا کرتے ہوئے سرکار کے ہاں بھی باعزت سمجھے جائیں گے!"

ریل گاڑی سے باہر نکل کر جارج بابو نے اسٹیشن کی گھڑی پر وقت دیکھا۔۔۔ اپنے دفتر وقت پر پہنچنے کے لئے اسے اب قدرے دوڑنا ہو گا۔ "اگر میں بروقت دفتر نہ پہنچ سکا تو لوگ خواہ مخواہ کی باتیں بنائیں گے" اس نے سوچا "ممکن ہے وہ کوئی سکینڈل ہی کھڑا کر دیں" اسے اپنے دفتر میں ہیڈ کلرک کا عہدہ سنبھالے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس سے پہلے مس ہنسن نے یہ عہدہ حاصل کرنے کے لئے بہت تگ و دو کی تھی۔۔۔ وہ تو ایک سفارش بھی لے آئی تھی۔۔۔ لیکن چونکہ ملازمت کے تجربے میں وہ جارج بابو سے ایک سال پیچھے تھی اس لئے وہ ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی۔ دفتر میں مس ہنسن کے مقابلے میں اگر اسے یہ عہدہ نہ ملتا تو تمام ملازمین یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ شاید وہ ہیڈ کلرک کی ذمہ داریاں نبھا سکے۔ جارج بابو کو اب بھی یقین تھا کہ اس کی طرف سے دفتری ذمہ داریوں میں یا وقت کی پابندی میں ذرہ بھر بھی کوتاہی یا تاخیر۔۔۔ لوگوں کو باتیں بنانے اور اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقع ضرور مہیا کر دے گی اور یقیناً" ایسا کر کے وہ خوش بھی ہوں گے۔ خاص کر مس ہنسن کو اگر ایسا کوئی موقع ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کے بارے میں افواہیں پھیلانے اور صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں ہر گز پیچھے نہیں رہے گی۔۔۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس کی دفتری بے قاعدگیوں کا ذکر نیلسن موچی سے بھی کر دے اور وہ دوسرے دکانداروں اور اپنے گاہکوں کے کانوں میں اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتا پھرے گا۔۔۔ آخر لوگ بات سے بات نکالتے' بال کی کھال اتارتے اور افواہوں کو ہوا دیتے پھیلاتے ہی تو ہیں!"

جارج بابو ابھی تک تیز تیز قدم اٹھاتا' ایک طرح سے دفتر کی طرف بھاگے جا رہا تھا "اف میرے خدا میں کن حالات میں گھرا ہوا ہوں۔۔۔ یہ خوف مجھے کیوں دبوچے جا رہا ہے" اس نے لمحے بھر کے لئے رک کر سوچا اور بھول گیا کہ اس کے دائیں ہاتھ والی سڑک کون سی ہے اس نے سر کو جھٹکا دے کر اپنی رفتار قدرے اور تیز کر دی "کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے اس سڑک کا نام یاد ہی ہونا چاہیے تھا۔" وہ چلتا چلتا زیر لب بڑبڑایا۔ لیکن اب وہ اپنے آپ میں خود پر ہی قدرے مشتعل بھی ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ سر پر پہنے ہوئے اپنے ہیٹ کو ہاتھ کا سہارا دے کر ہوا کے رخ سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور دفتر وقت پر پہنچنے کا بھوت اس پر اب پوری قوت کے ساتھ سوار تھا۔ لیکن اپنے تحت الشعور میں جارج بابو ابھی تک پیچھے والی اسی سڑک کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ بھول گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی نام آ رہے تھے۔۔۔ شاہراہ آزادی ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ وہ تو شہر کے بیچ ٹاؤن ہال کے دائیں طرف پڑتی ہے۔۔۔ آہا۔۔۔ وہ تو۔۔۔ خیابان جمہوریت تھی۔۔۔ ارے میں بھی کیا پاگل ہو گیا ہوں۔۔۔ یہ سڑک تو شہر داخل ہونے کے لئے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ابھی بنائی جا رہی ہے۔۔۔ ہاں اس سڑک کا نام ۔۔۔ شاہراہ ساحل تھا۔۔۔ یہ ہوئی نا بات! اسے اپنے آپ پر اعتماد آنے لگا تھا۔۔۔ وہ نیلسن موچی اگر مجھے سرراہ نہ ملتا تو اس کا کیا بگڑتا اور اگر اسے ملنا ہی تھا تو پھر اس نے میرے سلام کا جواب کیوں نہ دیا۔۔۔ جارج بابو پھر خیالات میں بہنے لگا تھا۔۔۔ لیکن سڑک کا نام یاد کر کے وہ ایک طرح

سے خود پر اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے اندر ہی اندر اپنے لئے ایک طرح سے تحفظ بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے جارج بابو خود کو ایسا غبارہ سمجھ رہا تھا جو کسی شریر بچے کے ہاتھ میں آجائے اور وہ بچہ کبھی تو اس میں ہوا بھرنے لگے اور پھر ہوا بھر کر نکالنے لگے۔ اور پھر یہ عمل مسلسل تب تک جاری رکھے تا آنکہ غبارہ پھٹ جائے۔

جارج بابو' ہانپتا ہوا جب دفتر پہنچا تو اس نے استقبالیہ کمرے میں مس ہنسن کو وہاں پہلے ہی سے آئینے کے قریب سامنے کھڑے اپنے بال سنوارتے ہوئے موجود پایا۔

"صبح بخیر" جارج نے قدرے دھیمی آواز میں کہا اور سوچا کہ "یہ بوڑھی جو ابھی تک "مس" ہی ہے اس کے لئے یہ کتنا تکلیف دہ ہوگا کہ وہ اپنی تمام زندگی ایک ہی دفتر میں ملازمت کرتی رہے۔۔۔ لیکن یہ عورت اب یہاں سے جا بھی کہاں سکتی ہے؟۔۔۔ یہ بھی اچھا ہی ہے کہ اب وہ اس عمر میں ہے کم از کم کوئی یہ تو نہیں کہہ سکے گا کہ میں ایک دن اسے اپنی رکھیل بنا لوں گا۔۔۔ یا اس سے شادی کر لوں گا۔۔۔ چلو خدا نے مجھے اس بدنامی سے تو محفوظ رکھا ہے"۔۔۔ جارج بابو اپنی اس عجیب و غریب سوچ پر خود حیران رہ گیا کہ مس ہنسن کے بارے میں آج یہ خیال اس کے ذہن میں اچانک کیسے آگیا۔ مس ہنسن اگرچہ ملازمت کے تجربے میں اس سے ایک سال پیچھے تھی لیکن عمر کے لحاظ سے پکھ نہیں تو وہ اس سے بیس برس آگے تھی۔۔۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کامیابی کے لئے' محض تجربہ ہی نہیں سرکاری دفتروں میں بعض اوقات عمر کا بھی کچھ حق سمجھ ہی لیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا کہ مس ہنسن دفتر میں ہیڈ کلرک نہ بن سکی تھی اور دفتری ملازمین نے اس ذمہ داری کے لئے اسے ہی مناسب اور موزوں قرار دیا تھا بلکہ ان ملازمین میں سے بعض کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ دراصل جارج پیدا ہی اسی منصب کے لئے ہوا تھا اور اکثر نے تو اسے "دیر آید درست آید" کا مقولہ یاد کراتے ہوئے کہا کہ اس ملازمت کا وہی تو حقدار تھا۔۔۔ بس کچھ دیر ہو گئی یہ منصب اسے کہیں پہلے مل جانا چاہیے تھا۔

"صبح بخیر۔۔۔ مسٹر جارج" مس ہنسن نے اپنے بالوں میں ربن لگاتے ہوئے کہا اور وہ اپنے خیالات سے چونکا۔۔۔

"مسٹر کیوں۔۔۔ محض جارج کیوں نہیں کہتی ہو؟" وہ خیالات کی دلدل سے نکل کر بولا۔

"اب آپ چونکہ ہیڈ کلرک بن چکے ہیں لہٰذا دفتری آداب کے تحت آپ کو اب "مسٹر" کہہ کر ہی مخاطب کیا جانا چاہیے۔۔۔۔ آپ اب مسٹر ہیں۔۔۔۔ مسٹر" مس ہنسن نے جواب دیا۔

غالباً" وہ پہلے بھی جارج بابو کو مسٹر ہی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور دوسرے دفتری ملازمین کی طرح وہ اس کے ساتھ کوئی خاص بے تکلف بھی نہیں تھی لیکن آج تو نہ صرف اس کی آواز بلکہ لہجے میں بھی ایک نمایاں فرق واضح عیاں تھا۔

"انسانی بدنیتی بھی کبھی کبھی عداوت و مخاصمت کی ایسی چھری بن جاتی ہے کہ انسان کو اس سے چھٹکارا پانے کے لئے خود اپنے آپ ہی کو مارنا پڑتا ہے اور انسان جب سوچتا ہے کہ دھرتی پر وہ کتنے مختصر سے وقت کے لئے ہے اور اسے اپنی حقیقی خوشی کے لئے بھی کچھ زیادہ درکار نہیں تو پھر دوستی و خیر سگالی ہی اسے اس کی راہ دکھاتی ہے اور پھر وہ "زندہ رہنے دو اور زندہ رہو" کا اصول اپنا لیتا ہے۔"

جارج بابو اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے نجانے کن فلسفیانہ خیالات میں کھو چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے دوران میں۔۔۔۔ جارج بابو کے ایک شریک کار نے اسے ایک ایسے کلرک کی کہانی سنانا شروع کر دی جو ایک زرعی فارم پر ملازم تھا۔۔۔ وہ کلرک ہر روز صبح سویرے فارم پر آنے والے لوگوں

سے دودھ خرید تا اور اسے شہر بھجوایا کرتا تھا--- فارم پر دودھ فروخت کرنے والے گوالے بھی عجیب وضع کے لوگ ہوتے ہیں --- جارج بابو--- اور پھر جارج بابو کے دوست نے اس متذکرہ کلرک اور دیہاتی گوالوں کے بیچ ہر صبح ہونے والے مکالموں کی نقل اتارتے ہوئے کہنا شروع کیا--- ہر صبح والے اس کلرک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے مسٹر فریڈرکسن --- مسٹر فریڈرکسن کہہ کر مخاطب کرتے' تھکتے نہیں تھے--- وہ گوالے بیچارے' اس کلرک کو اپنے خالصتاً" دیہاتی انداز فکر میں بتاتے کہ مسٹر فریڈرکسن--- موسم بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں--- اب دیکھئے نا--- موسم بہتر ہے تو ہم کتنے اچھے دن بسر کر رہے ہیں--- ہمیں کچھ زیادہ تو درکار نہیں بس گزر بسر چاہیے--- لیکن مسٹر فریڈرکسن--- آپ یقین جانیے کہ خزاں کے موسم میں تو یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا--- مسٹر فریڈرکسن--- یہ حقیقت ہے کہ خزاں کے سے ہمارے علاقے میں ہمارے ساتھ ہمارے مویشیوں کا بھی بہت ہی برا حال ہوتا ہے--- مسٹر فریڈرکسن--- آپ جانتے ہی ہیں خزاں آخر خزاں ہے اس میں بہار کہاں سے آئے گی! جارج بابو نے اپنے شریک کار کی کہانی بڑے اطمینان سے سنی اور جب اس کے شریک کار کو اپنی فتح کا احساس ہونے لگا تو اس نے منہ بھر کر قہقہہ لگایا--- اتنی تھوڑی سی دیر میں جارج بابو جواب سنبھل چکا تھا--- اپنے شریک کار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ----- "سنو--- جانسن--- کیا یہ بھی دودھ فروش' دوکاندار اور اس قبیل کے لوگ ایسے ایک ہی جیسے نہیں ہوتے؟---مثلاً"--- جارج بابو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میری گلی میں ایک موچی ہے---- روزانہ کام پر آتے جاتے ہوئے ہم ایک دوسرے کو گلی کی نکڑ پر ملا کرتے ہیں--- میں ہمیشہ اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کرتا ہوں وہ بھی مجھے صبح بخیر کی دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے--- کبھی کبھی ہم چلتے چلتے موسم پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں--- لیکن آج صبح تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟" جارج بابو نے اپنا پہلو بدلا--- کافی کی چسکی لی اور پھر بولا "میں نے حسب معمول اپنا ہیٹ اتار کر اسے سلام کیا لیکن وہ موچی مجھے دیکھتا ہوا گردن اکڑائے سیدھا چلتا گیا--- اب بتاؤ' تم اس کے اس رویے پر کیا کہو گے؟" جارج بابو کھانے کی میز پر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سبھی رفقاء کار کی طرف سے اپنی کہانی پر داد کا طلب گار تھا--- لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ان میں سے ایک دو محض ہلکا سا مسکرا کر رہ گئے اور کچھ نے صرف اپنے شانے اچکا دیئے اور باقی تو گویا ایسے تھے جیسے انہوں نے جارج بابو کی بات سنی ہی نہیں تھی--- انہیں اس بات پر ہرگز تعجب نہیں تھا کہ اس موچی نے جارج بابو کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا وہ بذات خود جارج بابو اور اس کی عادتوں سے پوری طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ جارج بابو کے بارے میں جو کچھ آج کل کہا اور سنا جا رہا تھا وہ اس موچی کو بھی معلوم ہی ہو گا۔ جارج بابو کے بارے میں اب ایسی باتوں کو پوشیدہ رکھنا مشکل تھا--- وہ تو زبان زد عام تھیں--- ہاں ان سے اگر اب تک کوئی آگاہ نہیں تھا تو وہ جارج بابو بذات خود ہی تھا--- وہ ان باتوں میں حقیقت سے تو خود بھی واقف نہیں تھے اور جارج بابو کے بارے میں اتنی سنگین افواہوں کے بارے میں خود سوچ بھی نہیں سکتے تھے--- جارج بابو تو ایک مکھی تک نہیں مار سکتا تھا--- اس نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی تھی ہاں وہ کسی اور کے ایسے مفاد میں جس میں کسی حد تک اس کا اپنا بھی فائدہ ہو اس کے لئے اپنا ذاتی نقطہ نظر بدلنے کو عار نہیں سمجھتا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کی دلجوئی اور مدد کا خیال رکھتا تھا جارج بابو ان کے نزدیک اس اصول پر کاربند تھا کہ بغیر وجہ کسی کو اپنے دشمنوں میں ہرگز اضافہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسے لوگوں کی ویسے بھی کمی نہیں ہوتی جو بغیر وجہ کسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

آج کل پورے ملک میں عوام میں ایک طرح سے اپنی اپنی رائے کے اظہار کا جنون پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی

اپنا اپنا نظریاتی اوور کوٹ اوڑھے اپنے ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور اپنے نظریات کا جھنڈا بلند کرنے میں مگن تھا۔ جارج بابو کے بھی اپنے نظریات تھے وہ ہر قسم کی قدامت پسندی' رجعت پسندی' تشدد و بربریت اور نفرت و حقارت سے بہت دور تھا۔۔۔ اسے مادر پدر آزادی کے پرستاروں اور بن بیاہی ماؤں کے جلوس بھی اچھے لگتے تھے مگر وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس کا اپنا مقام کیا ہے! جارج بابو اس بات سے آگاہ تھا کہ اپنی رائے کا بے باکانہ اظہار صرف دشمنوں میں اضافہ ہی تو کرتا ہے۔۔۔ بالکل اس موچی کی طرح جس نے صبح خاموش رہ کر اس کے سلام کا اگرچہ جواب نہیں دیا تھا البتہ وہ اپنی خاموش زبان سے بہت کچھ کہہ گیا تھا۔۔۔ جارج بابو ابھی تک اسے فراموش نہیں کر سکا تھا۔

دفتر سے گھر واپس جانے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو کر کھڑے کھڑے ہی سفر کیا۔۔۔ گاڑی سے باہر نکل کر جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو ہر چیز اسے چمکتی دکھائی پڑتی تھی۔ ہر چند کہ منحوس دن کا بوجھ اسے ابھی تک محسوس ہو رہا تھا لیکن گھر پہنچنے کے خیال سے وہ اسے کسی حد تک بھول چکا تھا۔۔۔ گھر جاتے ہی وہ سب سے پہلے نہائے گا۔۔۔ اتنی دیر میں اس کی بیوی میز پر شام کا گرما گرم کھانا سجا دے گی۔۔۔ جارج بابو اپنے ناک میں کھانے کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔ برگیتے نے اپنے گھر کے باغیچے سے پھول توڑ کر گلدان میں سجا رکھے ہوں گے۔۔۔ بچے اس کے گرد اکٹھے ہو کر آداب بجا لائیں گے۔۔۔ جارج بابو کچھ اسی طرح کے خیالات میں مگن تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔ "خدا کا شکر ہے میرے پاس اب اچھی اور مستقل ملازمت ہے۔۔۔ لیکن اس میں خدا کے شکر کی کیا بات آخر میں نے خود بھی تو ہمیشہ ہمت و ایمانداری سے محنت کی ہے۔۔۔ میں نے کبھی کسی کو اپنی راہ میں رکاوٹ بننے نہیں دیا تھا۔ میں نے کبھی کسی کو کوئی زحمت یا تکلیف نہیں دی۔۔۔ میں تو ہمیشہ دوسروں کے حقوق کی عزت کرتا ہوں تبھی تو اپنے حقوق کی ان سے عزت چاہتا ہوں" جارج بابو سوچے جا رہا تھا اور ہر نئے خیال کے ساتھ ہی وہ ایک انجانے خوف میں بھی جتلا ہو جاتا تھا۔۔۔ غیر ارادی طور پر اسے یاد آیا کہ وہ صبح اپنے ہی علاقے کی ایک معروف سڑک کا نام ہی بھول گیا تھا یہ خیال آتے ہی جارج بابو نے اس سڑک کا نام پھر سے یاد کرنا چاہا۔۔۔ "شاہراہ آزادی"۔۔۔ نہیں یہ تو نہیں۔۔۔ "شاہراہ جمہوریت"۔۔۔ ارے یہ تو شہر کے اس طرف ہے۔۔۔ اور پھر وہ بے ساختہ پکار اٹھا۔۔۔ "شاہراہ ساحل"۔۔۔ یہ ہوئی نا بات! وہ اپنی یادداشت پر قدرے خوش ہوتا تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے وہی نیلسن موچی' گلی کی دوسری جانب سے اسے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔۔۔ جارج بابو اسے دیکھتے ہی بیزار ہو کر اندر ہی اندر مشتعل ہو گیا اور اس نے نیلسن کے سلام کا جواب تک دیا۔۔۔ "شام بخیر۔۔۔ مسٹر جارج۔۔۔ آج موسم کتنا خوشگوار ہے" نیلسن موچی اس کے قریب سے گزر کر آگے جا چکا تھا۔

جارج کی جیسے جان میں جان آگئی ہو اور اسے پھر سے زندگی بسر کرنے کی مہلت مل گئی ہو۔۔۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔۔۔ وہ پل بھر کے لئے رکا اور اس نے دور جاتے ہوئے نیلسن کو پیچھے مڑ کر دیکھا۔۔۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل دیا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔۔۔ گھر کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے دستک دینے سے لمحہ بھر پہلے۔۔۔ شام کی بھوری روشنی میں کھلے آسمان کی طرف دیکھا تو اسے فضا میں بہار کی خوشبو محسوس ہوئی۔۔۔ "نیلسن موچی حق بجانب ہے۔۔۔ بوڑھا موچی۔۔۔ کیا شخصیت ہے اس کی۔۔۔ وہ کتنا پرلطف اور باذوق انسان ہے"۔۔۔ آج واقعی موسم کتنا بدل چکا تھا موسم کی یہ خوشگواری بہار کی آمد کا سندیسہ تھی۔۔۔ جارج بابو اپنے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

ولی سوؤ رنسن / نصر ملک

کوئلے والا

شعلہ' اپنے آپ کو ہمیشہ گرم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ شروع شروع میں یہ اس کے لئے بہت فائدہ مند تھا۔ اس کا یہ رجحان اس کی ماں کو بھی بہت پسند تھا۔ اسے نہ تو گھر کو گرم رکھنے کے لئے جلانے کی لکڑی خریدنی پڑتی تھی اور نہ ہی اس کے لئے زیادہ گرم کپڑے' لیکن سکول میں دوسرے بچے اس کے قریب بیٹھنا تو درکنار اسے اپنے پاس تک آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ اس سے ہروقت پسینے کی بو آتی رہتی تھی۔ اسے' پسینے سے بھیگی ہوئی اپنی قمیض کی وجہ سے اکثر ملامت اٹھانا پڑتی تھی۔ اس کے ہم جماعتوں نے مذاقاً" اس کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ہمیشہ ہی بھیگا رہتا ہے کیونکہ وہ ہروقت گرم پانی میں رہتا ہے۔ شعلہ ان اکڑبازوں سے ایک ایک کے ساتھ نمٹنے کے لئے کافی مضبوط تھا لیکن وہ ہمیشہ ہی گروہ کی صورت میں اکٹھے اس پر جھپٹتے اور پھر اسے تاڑ پچھاڑ کر یہ جا وہ جا---- "تم اس کے ساتھ نہیں جھگڑ سکتے" وہ کہتے ------ "یہ تو ہمیشہ ہی اپنے مدمقابل کو پسینے میں ڈبو دیتا ہے۔" یہ ایک بزدلی تھی۔

شعلہ جب بچہ تھا تو اسے آئس کریم کھانے کا بہت شوق تھا۔ رفتہ رفتہ جب وہ بالغ ہوگیا تو اس کا بدن کافی مضبوط اور پٹھے کافی قوت پکڑ گئے اور اس طرح اس کے بدن پر اب پسینے کے لئے اور بھی کافی جگہ بن گئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے منہ کے اندر کا لعاب بھی پسینہ بن کر اس کے بدن پر بہنے لگتا تھا۔ اس کا منہ ہمیشہ خشک اور ہونٹ سلے رہتے تھے۔ خاص طور پر جب اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ کسی کی بات کا جواب دے---- تب تو وہ بالکل منہ کھول ہی نہیں سکتا تھا۔ بالخصوص گرائمر پڑھتے ہوئے تو اس کی پوری زبان' اس کے تالو سے چمٹ جاتی تھی اسے اپنی زبان کو متحرک کرنے کے لئے اپنی پوری انگلی منہ میں ڈالنی پڑتی تھی۔ اپنی زبان کو تازہ رکھنے کے لئے اس نے پانی و مشروبات بکثرت پینا شروع کر دیئے تھے ---- اب وہ جتنا زیادہ پانی پیتا اتنا ہی اسے اور پسینہ آتا اور جتنا اسے پسینہ آتا ہے' ظاہر ہے اسے' اس سے بھی زیادہ پانی پینے کی ضرورت تھی۔

گرمی کے موسم میں شعلہ کپڑوں کے بغیر ننگا پھرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ جب وہ بچہ تھا تو لوگ عموماً" اس کے ننگے پن کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کے درمیان بہت کم جگہ گھیرتا تھا لیکن جب وہ بلوغت کی حد کے قریب پہنچا اور ننگا گلیوں میں گھومنے لگا تو پولیس نے اسے تب تک حراست میں رکھا جب تک اس نے کپڑے نہیں پہن لئے تھے۔ اب وہ گرمیوں کے دنوں میں سردی کے موسم کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ جب دوسرے لوگ سرما کے کپڑے پہنتے اور اپنے آپ کو خوب گرم قمیض' سویٹر' کوٹ اور پھر اوور کوٹ' دستانے' ٹوپی' جرابیں وغیرہ پہن کر باہر نکلتے' شعلہ اپنی ٹیرالین کی قمیض میں خوش و خرم اور مطمئن رہتا تھا۔ سخت سردی میں شعلہ کو یوں محض بنیان اور جانگیہ پہنے گھومتے دیکھنے والے لوگ اس کی ہمت و جوانمردگی اور حرارت خون پر حیران رہ جاتے تھے۔ موسم سرما کے دوران ایک بار شعلہ کو ایک گلی کے کونے پر بیٹھی ہوئی' تھرتھر کانپتی ایک لڑکی دکھائی دی۔ وہ فوراً ایک

نہایت بوسیدہ پھٹا پرانا کوٹ پہنے ہوئے تھے اور سردی سے یوں نیلی پیلی پڑ گئی تھی کہ محض اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی جنبش سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ شعلہ نے آگے بڑھ کر اسے اوپر اٹھایا اور پھر اسے سیدھی کھڑی کر کے اپنے بازؤں میں لے لیا۔۔۔۔ اب وہ دونوں اسی طرح گلیوں میں چلتے رہے اور یہ سلسلہ سردیوں کے سارے موسم میں جاری رہا۔ لڑکی شعلہ کے بازؤں میں رہتے ہوئے اپنی سردی بھول چکی تھی اور اس نے اپنا فرکا بوسیدہ کوٹ بھی اتار پھینکا تھا۔ شعلہ' بذات خود اب پاس بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔۔۔۔ لیکن' پھر ایک دن شعلہ کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے پسینے کی رطوبت بہت زیادہ ہے اور اس کے جسم میں بخارات رکے رہتے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر مسام' اس کے موٹاپے کی وجہ سے بند ہونے لگے ہیں۔

اب کی بار گرمی کے موسم میں شعلہ ۔۔۔۔ بہت ہی اکیلا تھا۔ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی وہ سائے کی تلاش میں چل پڑتا اور جنگل میں پگڈنڈیوں پر وہاں تک چلتا رہتا جہاں خود پگڈنڈیاں بھی اپنا راستہ کھو دیتی تھیں اور گرما کی شاموں میں اس وقت وہ خود بھی کہیں کھو جاتا تھا جب اسے قصبے کی طرف واپس جانا ہوتا تھا۔ کوئی ایسا ویسا اس کے قریب ہوتا نہیں تھا جس سے وہ سمت کے بارے میں پوچھتا۔ چاند اور تاروں کی روشنی کو صرف درختوں کی چوٹیوں تک ہی پہنچ پاتی تھی لیکن اگلی صبح کا سورج اس کی راہنمائی ضرور کر دیتا تھا اور پھر وہ جہاں کہیں بھی ہوتا جنگل میں واپس مڑ جاتا تھا۔

اب اس نے سردیوں کے موسم میں لوگوں کے گھروں پر جا کر کوئلہ فروخت کرنے کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایسی پرانی عمارتوں میں کوئلہ لے جاتا جن میں کوئلہ رکھنے کے لئے تہہ خانے نہیں ہوتے تھے اور اسے اس وجہ سے کوئلے کی بوریوں کو زینہ ۔۔۔۔ بہ زینہ' منزل بہ منزل اوپر لے جانا پڑتا تھا۔ اس کے لئے وہ ہمیشہ عمارتوں کی پچھلی سیڑھیوں کو استعمال کرتا اور یہ سیڑھیاں اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائی ہوئی کوئلے کی بوری کو سیڑھیوں کے بازؤں کی طرف کمر کر کے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ کوئلہ اگرچہ مہنگا تھا لیکن وہ جس دروازے پر جاتا لوگ اسے خوش آمدید کہتے۔ سردی کے مارے لوگ جب بھی اسے کوئلہ لاتے دیکھتے' اپنے بدن میں حرارت محسوس کرنے لگتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر یہ خواہش کرتے تھے کہ ان کے ہاں کوئلہ صرف اور صرف شعلہ ہی لایا کرے۔ وہ اسے کھانے پینے کی اشیاء دیتے اور جب وہ ان کے دروازے پہ بیٹھا ان کی دی ہوئی چیزیں کھاتا۔۔۔۔ وہ اس سے باتیں کرتے رہتے ۔۔۔۔ وہ اکثر بازار میں چیزوں کی قیمتوں اور خاص کر کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں میں دن بدن اضافے کا ذکر کرتے۔ شعلہ ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا لیکن خود چونکہ وہ کھانے میں مصروف ہوتا تھا اس لئے جواب دینے سے قاصر رہتا۔ قیمتوں میں اضافہ ان سب کے لئے افسوس ناک تھا۔ شعلہ ان افسوسناک باتوں کو بڑے غور سے سنتا اور جب انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتا تو ان کے دل خوشی سے گرم ہو جاتے اور پھر وہ گھروں کو گرم رکھنے کے لئے زیادہ کوئلہ استعمال کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شعلہ' ایک ہمدرد انسان تھا اور اسے خود بھی قیمتوں میں اضافوں کا احساس تھا اور اگلی بار جب وہ آئے گا تو ان کے لئے سستا کوئلہ لائے گا۔ شعلہ جاتے جاتے ہر بار ان کو تاکید کرتا کہ وہ تب تک کوئلے کا نیا آرڈر نہ دیں جب تک کہ وہ پہلا مکمل استعمال نہ کر چکے ہوں اور پھر جب وہ دوسری بار کوئلہ دینے آتا اور اگر ان کے چولہوں میں آگ جلتے دیکھتا تو واپس چلا جاتا۔۔۔۔ "تمہیں ابھی مزید کوئلے کی ضرورت نہیں" وہ کہتا ۔۔۔۔ لیکن وہ لوگ اسے روک لیتے۔

شعلہ کو بہتر کارکردگی کی وجہ سے اکثر لوگ ٹپ بھی دے دیتے تھے اور وہ یہ رقم شیشے کے ایک مرتبان میں

جمع کرنے لگا تھا تاکہ جب کچھ زیادہ رقم اکٹھی ہو جائے تو وہ دور کسی ایسے ملک میں جاسکے جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ وہاں ہمیشہ سردی ہوتی ہے۔ ایک بار اس نے اپنی اس خواہش کے بارے میں اپنے گاہکوں کو بتایا تو انہوں نے اسے اپنے لئے بدقسمتی سے تعبیر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ ان سے دور چلا جائے گا۔ ان کی اس طرح سے ہمدردی کے آگے شعلہ اپنی خواہش پر قائم نہ رہ سکا اور اپنی خواہش کی قربانی دینی پڑی۔

گرما میں ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ساحل سمندر پر پہنچ جاتا جہاں اسے پولیس کی طرف سے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا تھا وہ کم و بیش عریاں' اردگرد سے بے نیاز گھومتا یا پھر پانی کے قریب لیٹا رہتا اور پھر جب سورج سر پر آجاتا تو وہ جنگل کی طرف نکل جاتا اور سردیوں میں اس کا یہ سفر الٹ ہو جاتا تھا۔ پھر اسے 'کوئلے کی بوریاں اٹھائے' پسینے میں شرابور' لوگوں کے دروازوں پر جانا ہوتا تھا۔ وہ گرمیوں کو سردیوں پر ترجیح دیتا تھا۔ گرمیوں میں وہ جنگل میں پگڈنڈیوں کے درمیان سے گزرتا' جھاڑیوں کے کانٹوں سے خود کو بچاتا اپنے لئے کہیں نہ کہیں پناہ تلاش کر لیا کرتا تھا اور پھر گرما کے موسم میں رات کو جب جنگل کے تنہا عریاں درخت آپس میں سر جوڑ کر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگتے تو یہ سماں بہت بھلا لگتا۔ دن میں تو درختوں کی وجہ سے جنگل دکھائی ہی نہیں دیتا تھا جبکہ رات کے اندھیرے میں جنگل کے درخت غائب ہو جاتے تھے اور جنگل کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضا میں لکڑی کی باس' کسی فرکوٹ میں ملبوس لڑکی کے سانسوں کی خوشبو کی طرح محسوس ہوتی تھی۔

بہار کے موسم میں شعلہ کچھ زیادہ کام نہیں کرتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی ان دنوں میں اپنے سرما کے گرم کپڑے اتار کر عام کپڑوں میں آجاتے تھے۔ شعلہ بھی اپنی قمیض کے صرف اتنے بٹن کھولے رکھتا تھا کہ پولیس اسے پکڑ نہ لے' لیکن اس کی پیاس میں کمی نہیں ہوتی تھی اور اسے بار بار کچھ نہ کچھ پینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کئی بار تو اس کی زبان' منہ کے اندر تالو سے چمٹ جاتی تھی اور اسے بولنے کے لئے منہ میں انگلی ڈال کر زبان کو تالو سے الگ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی راہ میں آنے والے شرابیوں اور بھنگڑخانوں سے بچ کر گزرتا لیکن ان کی ---- بو' اسے یوں محسوس ہوتی جیسے اس کے نتھنے اس بو سے پہلے ہی آشنا تھے۔ وہ اس سے بچنے کے لئے جتنے تیز قدم اٹھاتا اتنی ہی جلدی وہ کسی دوسرے شرابی یا بھنگڑخانے کے سامنے ہوتا اور پھر اس کی اپنی بنیان یا قمیض جو بھی وہ پہنے ہوتا پسینے سے شرابور ہو جاتی اور زبان تالو سے لگ جاتی تھی۔

شعلہ' جانتا تھا کہ اپنی بچائی ہوئی پونجی اگر وہ ٹھنڈے مشروبات پینے پر صرف کرتا رہا تو پھر وہ جلد ہی اس سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح گرمیوں کے موسم میں پھر وہ گزارا کیسے کرے گا؟۔

ایک دن شعلہ کو ان گاہکوں کا خیال آیا جو اسے دعوت دیتے رہتے تھے کہ گرمی کے موسم میں وہ کبھی ان کے ہاں ضرور آئے۔ اس کا دل ان گاہکوں کو یاد کر رہا تھا۔۔۔ وہ لوگ شعلہ کو محض کوئلہ فروخت کرنے والا "کاروباری" ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک وہ ایک ایسا انسان تھا جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی بات کھل کر کر سکتے تھے۔ "دور دراز کے ملکوں میں جہاں سارا سال سردی ہی ہوتی ہے لوگ ایک دوسرے سے کیسے باتیں کرتے ہوں گے اور ایک اجنبی کے لئے ان کے ساتھ باتیں کرنا کیونکر ممکن ہوتا ہو گا وہ یقیناً" کوئی اور زبان بولتے ہوں گے؟" شعلہ یہ سوچتے ہوئے چلتا جا رہا تھا اور وہ شراب گھروں کے سامنے سے جلدی سے گزر جانا چاہتا تھا لیکن ایک جگہ اسے رکنا ہی پڑ گیا۔ اس کی پتلون پسینے سے تربتر' اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی تھی۔ جس جگہ شعلہ کو رکنا پڑا اس کے عین سامنے "آئیس کریم کا ایک بوتھ" تھا۔

آئیس کریم والے بوتھ پر شعلہ کی نگاہ پڑتے ہی وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ گرمی کا موسم اب زیادہ دور

نہیں تھا اور لوگوں نے آئس کریم فروخت کرنے کے لئے ابھی سے ہی دکانیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اس کے کانوں میں پرندوں کے گیتوں اور چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ یہ پرندے بھی آئس کریم بوتھ کے اردگرد اتر رہے تھے۔ اسے وہاں بہت سے بچے بھی نظر آئے۔۔۔ وہ پرندوں کی طرح اڑ تو نہیں سکتے تھے لیکن وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں ٹھنڈے سکے تھامے بوتھ میں آئس کریم فروخت کرنے والی عورت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شعلہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر جب ایک سکہ باہر نکالا تو اسے اپنی انگلیوں میں حدت کا احساس ہوا۔ وہ خود بھی آئس کریم کا شوقین رہا تھا۔ اب وہ بچوں کی قطار میں سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اپنے قد کی وجہ سے وہ اتنا بڑا تھا کہ بچوں کے سروں کے اوپر سے' آئس کریم بیچنے والی عورت کی مسکراہٹ سے اپنی مسکراہٹ کا تبادلہ کر سکتا تھا۔ عورت غالباً" بچوں کی آپس میں ایک دوسرے سے پہلے آئس کریم لینے کی خواہش اور اس وجہ سے ایک دوسرے کو ادھر ادھر دھکیلنے کی کوششوں پر مسکرا رہی تھی۔۔۔ شعلہ بھی ان کی طرح جلدی سے آئس کریم خریدنا چاہتا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے پسینے میں بالکل تربتر ہوتا جا رہا تھا اور کوئلے کی سیاہ دھول کی وجہ سے اس کے کپڑے اور شکل و صورت مزید کالے ہو رہے تھے اور دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ جہاں کہیں سے بھی آیا تھا وہاں بارش ہو رہی تھی۔ شعلہ آئس کریم والی عورت کو دیکھتا' مسکراتا اپنی باری کا منتظر تھا۔ وہ عورت سفید لٹھے کا بڑا خوبصورت ٹھنڈا اپرن پہنے ہوئے تھی۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ابھی بوتھ کا چھجا آگے بڑھانا پڑتا۔

"چاکلیٹ' وانیلا..... ٹاؤگاٹ۔۔۔ کونسی لوگے؟" جب شعلہ کی باری آئی تو عورت نے پوچھا۔

شعلہ کوئی جواب نہ دے سکا اس کی زبان تالو سے چمٹی ہوئی تھی اور اس نے اسے تالو سے الگ کرنے کے لئے' تاکہ وہ بول سکے' اپنی انگلی منہ میں ڈالی۔۔۔ عورت نے بڑی حیرانگی سے اسے دیکھا اور پھر پوچھا "کونسی؟۔۔۔ امریکن آئس' مارشالو یا عام آئس کریم!" جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے خود ہی سب سے قریب والی ایک آئس کریم اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ شعلہ نے جونہی آئس کریم کو اپنے ہاتھ میں پکڑا تو وہ فوراً" پگھلنے لگی اس نے جلدی سے اسے منہ میں ڈالا تو ایک سرد لہر اسے اپنے پورے بدن پر محسوس ہوئی۔ آئس کریم کے لئے بے تاب بچوں کو "ذرا صبر" کہتے ہوئے خود عورت نے شعلہ کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ شعلہ عورت کی متجسسانہ نگاہوں کے سامنے محض چپ رہ کر ہی جواب دے سکتا تھا۔ اس کا منہ تو آئس کریم سے بھرا ہوا تھا۔۔۔ عورت اب ایک بار پھر' شور مچاتے ہوئے بچوں کو آئس کریم بیچنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

آئس کریم نے' شعلہ کے معدے میں جاتے ہی اپنا اثر دکھایا۔ وہ یک لخت پسینے میں یوں شرابور ہو گیا کہ اس کے بدن پر سے بہتے ہوئے پسینے کے قطرے پانی کی طرح اس کے پاؤں میں گرنے لگے۔ بچے یہ دیکھ کر وہاں سے اس لئے بھاگ گئے کہ کہیں وہ پانی ان کے جوتوں کو خراب نہ کر دے۔ شعلہ اپنے منہ میں آئس کریم کا ذائقہ لئے' ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اب ایک بار پھر انہیں بھنگڑ شراب گھروں کی طرف چل دیا تھا جہاں سے وہ پہلے خود ہی دور نکل آیا تھا۔

اب جب بھی کبھی عورت اپنے آئس کریم بوتھ کے اندر کھڑے بچوں کو آئس کریم فروخت کر رہی ہوتی تو وہ شعلہ کو ان کے درمیان قطار میں فوراً" دیکھ لیتی تھی۔ وہ ہر روز بڑے صبر کے ساتھ گرمی میں جلتا ہوا بچوں کے درمیان قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کرتا اور ہر بار جب اس کی باری آتی' عورت اسے اپنے قریب ترین

پڑی ہوئی آئیس کریم تھما دیتی تھی اس نے کبھی یہ انتظار ہی نہیں کیا تھا کہ شعلہ کی اپنی پسند کیا تھی؟ ہر روز کا آئیس کریم کھانا، شعلہ کے بدن کی اندرونی تپش کی وجہ سے اس کے لئے ٹھنڈی راحت کی بجائے زحمت بن جاتا تھا۔ ایک دن جب وہ ایک لمحہ کے لئے، آئیس کریم خریدنے والا اکیلا ہی گاہک تھا اور آئیس کریم اس کے ہاتھ میں پگھل کر آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھی اس نے اپنی زبان کو منہ میں انگلی ڈال کر تالو سے الگ کیا۔۔۔۔۔"میں کوئلہ بیچتا ہوں"۔ وہ عورت کی توجہ چاہتے ہوئے بولا۔

"اس کاروبار میں کیا تمہیں سال کے اس حصے میں بھی کام کرنا پڑتا ہے؟" اس نے پوچھا۔۔۔"میں نے دیکھا ہے کہ تم میں گرم ہو جانے کا رجحان ہے۔"

"نہیں ۔۔۔۔ کاروبار تو اتنا نہیں جتنا پہلے تھا۔۔۔ پہلے کام زیادہ تھا اب نہیں۔۔۔۔ میں اپنے گاہکوں وغیرہ سے مل ملا کر، باتیں وغیرہ کرتے وقت گزارتا ہوں" وہ بولا۔

"اور اس طرح پسینے میں شرابور رہتے کیا تم لوگوں سے باتیں کرتے ہو یا پھر اپنے آپ ہی سے؟" عورت نے پوچھا۔

"نہیں، زیادہ تر گاہک ہی ہوتے ہیں جو مجھ سے باتیں کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں بڑا مہربان آدمی ہوں، اور وہ میرے ساتھ اپنے دل کی بات کر سکتے ہیں۔۔۔۔ یہ وہی تو ہوتے ہیں جو باتیں کرتے ہیں، میں خود تو کبھی کبھار ہی کچھ بولتا یا کہتا ہوں۔" شعلہ بولا۔

"۔۔۔۔ ہاں، ہاں!۔۔۔۔ میں نے خود بھی محسوس کیا ہے کہ تم کوئی زیادہ باتیں کرنے والے نہیں ہو" عورت نے کہا۔

شعلہ اس کی بات پر بڑی گرمجوشی اور خوشی محسوس کر رہا تھا کہ آخر کار کوئی تو ہے جو اسے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے کئی گاہکوں نے اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی اور بعض نے تو اس کے لئے بہت اصرار کرتے ہوئے زور بھی دیا تھا لیکن ان میں کتنے ایسے تھے جو یہ سمجھ سکے تھے کہ وہ کچھ زیادہ باتیں کرنے والا تو ہے ہی نہیں۔ ایسا غالباً" ایک بھی نہیں تھا وہ تو ہمیشہ ہی اپنے بارے میں یوں باتیں کرتے رہتے تھے جیسے شعلہ کے پاس اپنے بارے میں کچھ سوچنے اور کہنے کو تھا ہی نہیں۔ آئیس کریم والی عورت ہی پہلی ایسی عورت تھی جس نے شعلہ کی طرح اپنے بارے میں بالکل کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

شعلہ اس عورت کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ اس کے ساتھ باتیں کرتی رہا کرے بے شک وہ اپنے گاہکوں کے ہی بارے میں کچھ کہتی رہے۔ شعلہ اپنی اس ضرورت سے بھی آگاہ تھا کہ آخر کوئی تو ہونا چاہیے جس سے وہ بھی بات کر سکتا۔

شعلہ نے عورت کو "خدا حافظ" کہا اور جواب میں عورت نے بھی کچھ اسی طرح کے الفاظ کہے لیکن شعلہ اب بھگتو، شراب گھروں کی طرف واپس نہیں گیا تھا اور چاہنے کے باوجود اس کے لئے عورت سے دوبارہ گفتگو شروع کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"اب موسم میں گرمی آنے لگی ہے" شعلہ کھسیاتے ہوئے بولا۔ عورت نے کچھ توجہ نہ دی لیکن اس نے ایک کاغذی رومال اپنی ناک پر ضرور رکھ لیا اور ظاہر یوں کیا کہ موسم کی ایسی کیا وقعت کہ اس پر بات کی جاتی۔ "شاید وہ ٹھیک ہی سوچ رہی ہے" شعلہ کو خیال آیا۔۔۔۔ "آخر وہ لوگ جو ہر وقت محض موسم ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں ان کے پاس اس کے سوا کہنے کو اور کچھ ہوتا ہی کیا ہے" اس نے اپنے سر کو اپنی سوچ کے

سامنے جھکاتے ہوئے، خود سے معذرت کر لی تھی۔

"کوئلہ فروش کے لئے موسم میں تبدیلی بڑی اہمیت رکھتی ہے" شعلہ پھر بولا۔ "میں گرمیوں میں کام سے چھٹی پر ہوتا ہوں۔"

"گرما کی چھٹیاں؟" عورت نے متجسسانہ انداز میں کہا اور بچوں کو حسب معمول آئس کریم فروخت کرتے ہوئے ان سے پیسے وصول کرنے میں مصروف رہی۔ شاید وہ بہت ہی زیادہ مصروف تھی۔ شعلہ نے سوچا۔ آئس کریم خریدنے والوں کی بھیڑ کی وجہ سے فروخت کرنے والے دو ہونے چاہئیں اور وہ خود تو گرما میں بے کار تھا ہی ------ اس نے آگے بڑھ کر جب اپنا بازو آئس کریم بوتھ کے سٹینڈ پر رکھا تو سردی کی ایک لہر اسے اپنے چہرے سے ہوتی ہوئی پورے بدن پر سے گزرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہاں آئس کریم کے سفید بوتھ کے اندر، سیاہ جنگل کی کھائیوں سے کہیں زیادہ ٹھنڈ تھی اور پھر جنگل میں تو وہ محض اکیلا ہوتا تھا نہ ساتھی نہ جاننے والا---- کوئی بھی تو دوسرا وہاں نہیں ہوتا تھا۔ اب اتنی گرمی پڑنے لگی تھی کہ شعلہ راتوں کو بالکل سو نہیں سکتا تھا۔ وہ یہ سوچتا رہتا کہ کس طرح وہ بھی آئس کریم بیچنے کا دھندہ شروع کر سکتا ہے؟ سخت گرمی میں بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلتے وہ آئس کریم والی عورت کے تصور سے چمٹا رہتا اسے یقین تھا کہ اگر وہ ہمیشہ کے لئے اس کے قریب ہو جائے تو پھر اسے کبھی بھی پسینے میں شرابور نہیں رہنا پڑے گا۔

اب وہ آئس کریم بوتھ کے قریب کھڑا اس کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دروازہ کے پاس ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ بوتھ کے اندر، عورت کی جھلک دیکھ سکتا تھا مگر اپنی مصروفیت کی وجہ سے عورت شاید آئس کریم بوتھ کا ٹب کھولنا بھول گئی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ابھی اس کا وقت ہی نہیں ہوا تھا۔ بذات خود شعلہ اس بات پر خوش تھا کہ آج آئس کریم خریدنے والوں کی اتنی بھیڑ نہیں تھی کہ عورت کو سر کھجانے کی فرصت نہ ہوتی۔ اس طرح سے اب اسے اپنے مدعا کے اظہار کے لئے مناسب اور باا ثر الفاظ یاد کرنا آسان ہو گیا تھا۔ وہ آئس کریم بوتھ کے بند ہونے تک وہاں اس کے کونے پر کھڑا انتظار کرتا اور آخر کار جب عورت نے شلٹر نیچے گرانے کے لئے خود کو بوتھ سے باہر نکالا تو اس نے آگے بڑھ کر، اپنے مضبوط پٹھوں والے بازوؤں کی آستینیں چڑھا لیں---- "میں مدد کروں؟" وہ بولا۔

"نہیں، نہیں! یہ کام تو میں خود بخوبی کر لیتی ہوں---- شلٹر گرانا میرے لئے مشکل نہیں" عورت نے کہا۔ "مجھے نہ زیادہ زور لگانا پڑتا ہے اور نہ ہی پسینے میں تربتر ہونا پڑتا ہے۔"

"تم ضرور تھک گئی ہو گی، آخر سارا دن کھڑے کھڑے کام کرنا پڑتا ہے" شعلہ بولا۔

"میرے خیال میں سارا دن مصروف تو تم رہے ہو" عورت بولے جا رہی تھی---- "دیکھو تو کتنا پسینہ بہہ رہا ہے تمہارے بدن پر---- میرے خیال میں اگر تمہاری گرمی کی چھٹیاں شروع ہو چکی ہیں تو یہ چھٹیاں منانی چاہئیں--- تمہیں اس عمر میں اپنی پونجی دن بھر آئس کریم کھانے پر صرف نہیں کر دینی چاہیے۔" شعلہ نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور پھولے ہوئے سانس لیتے ہوئے، اپنی زبان کو حرکت دینے کے لئے اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور پھر بڑی دقت کے ساتھ وہ اعتراف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"مجھے ہمیشہ ہی سے گرم رہنے کا رجحان ہے۔"

"لوگوں نے ٹھیک ہی تو سمجھ رکھا ہے" عورت نے جواب دیا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ تم بہت ہی زیادہ اور بری طرح پسینہ خارج کرتے ہو؟"

آئیس کریم بوتھ سے نکلنے والی ٹھنڈ کی لہریں ابھی تک عورت پر حاوی تھیں اور شعلہ بھی اس ٹھنڈ سے فائدہ اٹھانے کے لئے عورت کے قریب ہونا چاہتا تھا لیکن اس کی پتلون اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی تھی اور عورت بھی اس سے کچھ اور پرے' دور ہو گئی تھی۔ شعلہ جتنا آگے بڑھ کر اس کے قریب جاتا وہ اتنی ہی پیچھے ہٹ کر فاصلے بڑھا دیتی تھی۔ عورت کو قریب رکھنے کے لئے اب شعلہ آہستہ آہستہ' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگا تھا۔ اپنے پسینے کی بھاپ میں جلتا ہوا شعلہ' عورت کی ٹھنڈ کو اپنے سانسوں میں شامل کر لینا چاہتا تھا۔

اب وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس عمارت کے بڑے دروازے سے گھس گیا تھا جہاں عورت داخل ہوئی تھی ---- وہ اس کے پیچھے اب سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے بنے ہوئے فوارے کے حوض میں ساکن پانی میں اس کے پسینے کے قطرے بارش کی بوندوں کی طرح گر رہے تھے۔ اس نے اپنی قمیض کا گریبان پھاڑ دیا تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں گرمی اس کا گلا ہی نہ گھونٹ دے۔

"یہاں سے دفع ہو جاؤ!" عورت نے ہانپتے ہوئے زور سے کہا۔ شاید وہ تھک چکی تھی۔ شعلہ کو ہمدردانہ خیال آیا۔ آخر وہ سارا دن گرمی میں کھڑی آئیس کریم بیچتی رہتی تھی۔

"یہاں سے دفع ہو جاؤ!" عورت پھر زور سے چلائی اور سیڑھیاں چلتی رہی۔ شعلہ بھی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تو عورت کو پیش کش کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا اور آئیس کریم فروخت کرنے میں ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔

"دفع ہو جاؤ--- ورنہ میں مدد کے لئے کسی کو بلانے کے لئے آواز لگا دوں گی!" عورت نے سخت تند لہجے میں دھمکی دے دی تھی۔

شعلہ اتنی حد تک آگے آجانے کے بعد اب واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے عورت کو پکڑنا چاہا مگر اپنی بھیگی ہوئی پتلون کی وجہ سے وہ بھاگ نہیں سکتا تھا اور سیڑھیاں پھلانگ سکتا تھا---- یہ تو خود عورت کے لئے سود مند تھا کہ عین اس وقت جب وہ دونوں اکٹھے سیڑھیوں پر اکیلے تھے وہ شعلہ کی بات سن لیتی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا--- شعلہ کتنی دیر سے اپنے دل کا مدعا لبوں پر لانے کی کوشش میں تھا لیکن اس کی زبان ---- ہاں اس کی زبان ہی تھی جو--- اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی' لیکن اب تو وقت تھا اور موقع بھی کہ عورت اسے اپنے دل کی بات کہہ لینے دیتی۔ عورت نے ایک دبی سی چیخ ماری لیکن وہ کچھ ایسی بھی نہیں تھی کہ عمارت میں رہنے والا کوئی دوسرا اسے سن لیتا--- اس کا سانس بند ہو رہا تھا--- شعلہ اس کے بہت ہی قریب پہنچ رہا تھا۔

شعلہ اب اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے بڑھائے' عورت کے سفید مرمریں ٹھنڈے بدن کو چھونے ہی والا تھا کہ ٹھوکر کھا کر سیڑھیوں پر گر پڑا--- اوپر تلے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے عورت اپنے دروازے تک پہنچ چکی تھی اور اسے جلدی جلدی کھولتے ہوئے اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ شعلہ عین اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا---- عورت نے زور سے دروازہ بند کیا۔ تپتا ہوا سورج' شعلہ کی آنکھوں کے سامنے رقص کناں تھا۔ اپنے دل میں موجود جذبات کی گرمی اور اس میں بڑھتی ہوئی شدت اور اپنی خواہش کے بارے میں وہ عورت کو کیسے آگاہ کرے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ عورت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور نہ ہی کوئی دکھ دینا چاہتا تھا---- وہ تو صرف اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

اب وہ دروازے کے باہر گھٹنوں کے بل بیٹھا دروازے کے "پوسٹ ہول" کے ساتھ منہ لگائے کچھ کہنے

کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ اپنا مدعا کہہ سکتا ہے۔۔۔ لیکن، وہ کہہ تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔۔۔ وہ تو محض منمنا رہا تھا اس کے منہ سے محض ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جو بالکل ناقابل فہم تھیں۔۔۔ خود اس کے اپنے کانوں کے لئے بھی وہ بہت عجیب و غریب آوازیں تھیں۔۔۔ بالکل بعید القیاس ۔۔۔ ناقابل فہم آوازیں۔۔۔! ۔۔۔ ان آوازوں کو سن کر خود اس کے اپنے کان کھڑے ہو گئے تھے اور وہ خود خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ آوازیں اس کے غصے میں مزید طیش کا سبب بن رہی تھیں اور وہ ان آوازوں کو اپنے منہ سے یکسر باہر نکالنے کے لئے، غضبناک ہو گیا تھا اس نے اپنا غصہ و غضب بند دروازے پر جھاڑنا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ سکے، لیکن نہیں، وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔۔۔ اب وہ نڈھال ہو کر دروازے پر گرا پڑا تھا اور عورت کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔۔۔ وہ اپنی اس حالت سے اپنے آپ میں خوفزدہ تھا۔ وہ اپنے بدن پر جہاں کہیں بھی ہاتھ لگاتا درد کی اک ٹیس سے اس کی چیخ نکل جاتی تھی۔۔۔ وہ برابر اپنے بدن پر ہاتھ پھیرتا ہوا جائزہ لے رہا تھا کہ آخر اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی تھی۔۔۔ اس کا پورا بدن جل رہا تھا۔۔۔ اس کے بدن کی آگ میں اور بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کے خیال میں اس آگ کو صرف آئیس کریم والی عورت ہی ٹھنڈا کر سکتی تھی۔۔۔ عورت! جو دروازے کی دوسری طرف گھر کے اندر موجود تھی۔

۔۔۔۔ اس نے جوں توں کر کے اپنا منہ پھر "پوسٹ ہول" پر رکھ دیا تھا اور عورت کو آوازیں دینی شروع کر دی تھیں۔۔۔ اس کے بدن کی گرمی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی اور اس کے نتھنوں سے بھاپ نما دھواں نکل نکل کر "پوسٹ ہول" سے کمرے کے اندر داخل ہو رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کمرے میں موجود عورت کے سانس کو بند کر دیتا اور کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا یا کمرے میں آگ بھڑک اٹھتی۔۔۔ عورت نے بڑے غصے سے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر گلی میں فائر بریگیڈ کے انجن کے سائرن کی آواز سنائی دی۔۔۔ لیکن عین اسی لمحے، بھڑکتے ہوئے شعلہ نے لپک کر عورت کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔۔۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا فرش پر گرے پڑے تھے۔ عورت نے اپنی بچی کھچی پوری قوت جمع کر کے ایک زوردار چیخ لگائی لیکن اس کی یہ چیخ۔۔۔ باہر گلی میں فائر بریگیڈ کے انجن کے سائرن کی آواز میں دب گئی تھی۔

امشب دوبارہ

آج رات نجانے کب' لیکن میں اچانک پھر وہاں جا نکلا اور میرے ساتھ جو کچھ پہلے ہو چکا تھا اس کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنے لگا۔ یہ عجیب و غریب پارک' جیسا کہ سبھی جانتے ہیں شہر سے باہر واقع تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا' تنگ سڑکوں' ٹیڑھی سیڑھی اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے گزرتا جا رہا تھا کہ یکایک مجھے اپنا آپ بہت ہی ہلکا محسوس ہونے لگا اور میں خود کو نوجوان سمجھنے لگا۔ مجھے اس بات پر حیرانگی ہو رہی تھی کہ تمام لوگ آہستہ آہستہ وہاں سے غائب ہو رہے تھے--- جوں جوں میں پارک کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا--- لوگ غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کیا میں دوسروں کی نسبت زیادہ قوی تھا یا مضبوط حواس رکھتا تھا؟ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں دوسروں کی نسبت زیادہ بے وقوف ہوں' یہ ایک بہت ہی غیر معمولی پارک تھا--- میں اگرچہ اپنے ذہن میں اس کی کوئی واضح تصویر لانے سے قاصر تھا لیکن میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ پارک واقعی بہت غیر معمولی تھا--- اور تو اور--- باوجود کوشش کے میں اس پارک کے کسی ایک کونے' کیاری یا گوشے کو اپنے ذہن میں عین اس طرح اجاگر نہیں کر سکتا تھا جس طرح میں اسے اپنی آنکھوں سے پہلے دیکھ چکا تھا۔

ناقابل یقین حد تک مختلف انواع و اقسام کے پھول' ان کی پتیوں کی ساخت اور رنگ' میرے لئے نہ صرف عجیب اور بالکل نئے تھے بلکہ میں ان میں سے کسی کو جانتا نہ پہچانتا تھا اور ان کے ناموں سے واقفیت کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ پارک میں قدرتی چشموں سے پھوٹنے والے پانی کی بلند پھواریں اور کھالیوں میں بہتے ہوئے پانی سے آنے والی غرغری سریلی آوازیں جو ابھی تک میرے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں--- یہ سب کچھ ایک عجیب سماں تھا' لیکن' میں اسے کسی بھی صورت اپنے تصور و بیان میں نہیں لا سکتا تھا۔ وہاں چہچہانے والے قوس قزاح کے رنگوں والے مختلف قسموں کے پرندے اور ان کی کانوں میں رس گھولتی آوازیں--- میری ان سے کوئی جان پہچان نہیں تھی--- لیکن' وہاں پائے جانے والے "عجیب الجثہ دیو--- کالے کتے" مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ ماحولیاتی حقائق کو سنوارنے اور برابر رکھنے کے لئے اس عجیب الجثہ مخلوق کو اسی نام سے جانا اور پکارا جاتا تھا اور بے شک ان کا رنگ کالا ہی تھا لیکن وہ کتے ہرگز نہیں تھے۔ میں اس عجیب الجثہ مخلوق کا حلیہ اپنے ذہن کی سکرین پر اجاگر نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں جب پہلی بار پارک میں گیا تھا تو یہ عجیب الجثہ دیو میرے راستے میں خود بخود زبردستی آ گئے تھے اور میں ان کو روبرو دیکھنے کی تاب و طاقت نہ رکھ سکنے کی بنا پر وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا لیکن' کیسے؟ یہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ میرے ذہن پر ابھی تک دھند چھائی ہوئی تھی اور کسی بھی چیز کا تصور واضح نہیں تھا۔ غالباً" یہی وجہ تھی کہ میں ہر چیز سے آگاہی اور واقفیت حاصل کرنے ہی کے لئے اپنی لڑکھڑاتی ٹانگوں اور بھاری قدموں کے ساتھ اب پھر

پارک کی طرف جا رہا تھا۔

میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی ابھر رہا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں' کہیں خواب میں تو نہیں اور میرے سامنے چمک دمک والے یہ عجیب الجثہ دیو کیا واقعی وہی ہیں جو میں دیکھ رہا ہوں؟

میں نے پھولوں' ان کے رنگ و روپ' خوشبو اور قطار اندر قطار کیاریوں کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے پرندوں اور فضا میں مدھر سریلی تانیں بکھیرتی ہوئی ان کی آوازوں کو ذہن کے خانوں میں محفوظ کرنا شروع کر دیا تاکہ جب میں بیدار ہوں تو یہ سب کچھ مجھے یاد رہے۔ میں نے پھر جب گھوم کر دیکھا تو وہ عجیب الجثہ دیو' پیٹ کے بل رینگتے' پھسلتے آہستہ آہستہ پارک کے دربان کے گھر سے میری جانب بڑھ رہے تھے۔۔۔۔ وہ چاروں طرف سے میری جانب بڑھ رہے تھے۔ اب میں نے مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ میں ان کے بارے میں وضاحت نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اس کے لئے ذہن پر زور دے سکتا ہوں کیونکہ میری یادداشت تو ان ہی کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔ میری طرح پہلے کے کئی لوگ بھی ان ہی کی وجہ سے اپنی یادداشت کھو چکے تھے۔ یہ دیو جو بظاہر عجیب الجثہ دکھائی دیتے تھے کسی نئی صنف یا وضع کے نہیں تھے لیکن علم حیوانات' جہاں تک میں نے پڑھ رکھا تھا اور لوگوں سے سن رکھا تھا اس میں ان کے بارے میں کوئی ذکر یا شہادت موجود نہیں تھی۔ ان میں سے ایک نے مجھ پر اپنا ہک دار پنجہ آزمایا جسے میں نے بری طرح محسوس کیا۔ میں نے سوچا کہ یہ بات تو کسی بھی طرح اچھائی کے زمرے میں نہیں آسکتی تھی اور یہ پھر معاہدے میں بھی تو شامل نہیں تھی۔۔۔۔ معاہدہ! میں نے کسی سے بھی کوئی معاہدہ نہیں کر رکھا تھا۔۔۔۔ مجھے خیال کیسے آگیا؟ وہ اپنی دیو قامتی اور شوریدہ سری سے مجھے خوف زدہ کرنے کے مجاز تو ہو سکتے تھے' لیکن خالصتاً" انسانی طریق سے انہیں مجھ پر غلبہ پا لینے اور مجھ پر محض اپنے غلبہ کی وجہ سے میرے ساتھ ہر قسم کے ربط و تعلق رکھنے کا اختیار انہیں ہرگز نہیں ہو سکتا تھا!

اب کی بار' وہاں پارک میں اور بھی لوگ موجود تھے اور جونہی زہر میرے پاؤں سے میرے سر کی طرف چڑھنے لگا۔۔۔۔ وہ اشارے کرتے ہوئے بولے۔۔۔۔ "دیکھو۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ کتے۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہے ہیں۔" میں خود ہی شاید ہکلا رہا تھا۔۔۔۔ ہاں! میں ہی ہکلا رہا تھا۔۔۔۔ "ان کے کچھ نہ کرنے کا بھی شاید کوئی مطلب ہو۔۔۔۔ وہ شاید اس لئے بھی کچھ نہیں کر رہے تھے کہ ان کے کچھ بھی نہ کرنے کا کوئی تو مقصد تھا۔۔۔! میں ہکلا رہا تھا۔ میری اس ہکلاہٹ پر وہاں موجود لوگ ہنس رہے تھے۔۔۔ ہاں' ہاں! ضرور ایسا ہی ہو گا۔۔۔۔ یقیناً"۔۔۔۔!"

اب میں نے خود اپنے آپ سے پوچھا کہ کل رات' پارک کی طرف جاتے ہوئے مجھے پارک' اس کی خوبصورتی اور وہاں موجود سبھی کچھ کے بارے میں سب کچھ شاید اس لئے یاد تھا کہ میں پہلے بھی اپنے خواب میں وہاں جا چکا ہوا تھا میں اپنے اس پہلے خواب سے بھی پہلے اپنے کئی خوابوں میں اس پارک کو دیکھ چکا تھا اور وہاں ہو آیا تھا۔۔۔۔ لیکن' کیا خواب بذات خود انسانی یادداشتوں کا ہی مرکب نہیں ہوتے اور اگر ایسا ہی ہے تو خواب' محض خواب تو نہیں۔۔۔۔ کیونکہ' کوئی بھی تو خواب اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتا۔۔۔۔ ہر خواب ایک مسلسل جاری رہنے والے لامتناہی عمل کا حصہ ہوتا ہے' ایک ایسا مسلسل عمل جو زندگی بھر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔۔۔۔ ایک زندگی ایک خواب' یعنی۔۔۔۔ "ایک خوابی زندگی" ۔۔۔ اور اس کے باوجود ہم اس میں حصہ لیتے ہیں اور پھر' حصہ در حصہ' ہم خود اس کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں اور محض ایک حصہ ہی رہتے ہیں مکمل نہیں ہو پاتے۔۔۔۔ محض ایک چوہا۔۔۔۔! چوہا جو "خوابی زندگی" کا کچھ ہوتا ہے۔ کیا ہماری روز مرہ کی زندگی صرف کسی

ساحرانہ پہاڑ کی چوٹی ہے؟ اور کیا یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے اپنے خیالات کو اکٹھا کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور ہم اپنے واضح مدعا۔۔۔۔ کی وضاحت تک نہیں پہنچ سکتے؟ کیا یہ سب کچھ ممکن بنانے اور کر جانے کے لئے ہمارا رات کو پارک میں گھومنا پھرنا ضروری ہے؟ ہمارا گھومنا پھرنا جو ہمیں متوجہ بھی کرتا ہو اور خوفزدہ بھی!۔۔۔۔ کیا ایسے جنت نظیر پارک میں جہاں عجیب الجثہ' دیو ہیکل' دوزخی مخلوق ہو' وہاں ہمارا رات کا گھومنا پھرنا ضروری ہوتا ہے؟۔۔۔ اور کیا واقعی ہمیں وہاں گھومنا پھرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر ہم ایسا کرنے کی خواہش کر ہی لیں تو کیا ہم حقیقتاً" وہاں گھوم پھر سکتے ہیں؟

جو آن بوش / محمود احمد قاضی

روح

ڈان دامین جسے کہ تقریباً "۱۰۴ درجے بخار تھا کومے میں چلا گیا۔ اس کی روح بہت زیادہ تکلیف میں تھی اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ زندہ جل رہی ہو اس لئے اس نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اس کے دل تک محدود کر لیا۔ جیسے کہ آکٹوپس کے ان گنت پاؤں ہوتے ہیں اسی طرح روح کے ان گنت ریشے تھے جن میں سے کچھ تو رگوں میں تھے اور جو بہت باریک تھے وہ خون کی نالیوں میں تھے۔ آہستہ آہستہ روح نے اپنے پاؤں سمیٹنے شروع کئے جس کے نتیجے میں ڈان دامین ٹھنڈا اور زرد پڑتا گیا پہلے اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہوئے پھر اس کے بازو اور ٹانگیں ٹھنڈی ہوئیں پھر اس کا چہرہ ایک مرے ہوئے شخص کی طرح اتنا سفید پڑ گیا کہ اس تبدیلی کو اس کے بستر کے اردگرد کھڑے لوگوں نے بخوبی محسوس کیا۔ نرس نے چیخ کر انہیں بتایا کہ ڈاکٹر کو فوری طور پر بلایا جانا چاہئے۔ روح نے اس کے الفاظ سنے اور سوچا "مجھے جلدی کرنی چاہئے ورنہ میں ڈاکٹر کی مہربانی سے یہیں جل بھن کر کباب ہو جاؤں گی"۔

یہ صبح کا آغاز تھا۔ کھڑکی سے اندر آنے والی ایک نیم روشن کرن ایک نئے دن کے طلوع ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ڈان دامین کے منہ سے جو کسی حد تک سانس لینے کے لئے تھوڑا سا کھلا ہوا تھا روح نے باہر جھانکتے ہوئے اس روشنی کو محسوس کیا تو اس نے اپنے آپ سے کہا کہ "اگر وہ بچ نکلنا چاہتی ہے تو اسے جلدی سے عمل کرنا ہو گا ورنہ دیر ہونے کی صورت میں کوئی نہ کوئی ضرور اسے دیکھ لے گا اور پھر اسے وہیں اپنے مالک کے جسم میں رہنے پر مجبور کر دے گا۔" ڈان دامین کی روح کچھ چیزوں کے بارے میں قطعی طور پر لاعلم تھی مثلاً وہ نہیں جانتی تھی کہ اگر وہ ایک بار آزاد ہو گئی تو پھر وہ مکمل طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔

مریض کے شاہانہ بستر کے قریب کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی وہ لوگوں کی ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ بھی سن رہی تھی۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے لاپرواہی برتتے ہوئے اپنے آپ کو اس قید سے رہائی دلانے کی کوشش میں لگی تھی۔ نرس اپنے ہاتھ میں ہائی پوڈرمک سرنج لئے کمرے میں واپس آگئی۔

بوڑھی نوکرانی چلائی "خدا کے لئے ۔۔ اب دیر مت کرو"

لیکن دیر تو ہو چکی تھی۔ کیونکہ عین اسی لمحے جب سوئی ڈان دامین کے بازو میں اتری تو روح نے اپنے بچے کھچے آخری ریشے بھی اس کے منہ سے باہر نکال لئے جیسے وہ باور کرانا چاہتی ہو کہ اب انجکشن کا لگنا سوائے پیسوں کے ضیاع کے اور کچھ نہ تھا۔ صرف ایک لمحے بعد جب کمرہ چیخوں اور تیزی سے ادھر ادھر حرکت کرنے والوں کی آوازوں سے بھر گیا تھا جن میں لازمی طور پر نوکرانی کی آواز اور ڈان امین کی بیوی اور اس کی ساس کے بین شامل تھے روح نے چھلانگ لگائی اور کمرے کی چھت کے درمیان لٹکتے بوہیمین طرز کے لیمپ سے چمٹ گئی۔ ڈان دامین کی لاش اب بالکل پیلی پڑ چکی تھی اس کے خدوخال بوہیمین گلاس کی طرح سخت اور

شفاف ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کی ہڈیاں زیادہ نمایاں ہو گئی ہوں اس کے جسم کی جلد پر مردوں جیسی چمک تھی۔ اس کی بیوی اس کی ساس اور نرس اس کے اردگرد منڈلا رہی تھیں جبکہ نوکرانی اپنے بوڑھے سر کو بستر پر رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ روح جانتی تھی کہ ان میں سے ہر ایک کیا سوچ رہا تھا اور کیا محسوس کر رہا تھا مگر وہ ان کو بغور دیکھتے رہنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ زیادہ ہوتی جا رہی تھی اور روح ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے وہاں بیٹھے ہوئے دیکھ نہ لیا جائے۔ اچانک ڈان امین کی ساس نے اپنی بیٹی کا بازو پکڑا اور اسے لے کر بڑے کمرے میں آئی وہاں وہ اس کے کان میں آہستگی سے کچھ کہنے لگی، روح نے اسے کہتے ہوئے سنا "ایسی بے شرمی کا مظاہرہ نہ کرو تمہیں کسی قدر غم زدہ نظر آنا چاہیے"۔

بیٹی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "ماما۔ لوگ کب آنا شروع ہوں گے؟"

"یوں سمجھو کہ آنے ہی والے ہیں۔ نرس کا دھیان رکھنا۔۔ وہ لوگوں سے یہاں کی ہر بات کہتی پھرے گی"

نئی نویلی بیوہ بستر کی طرف یوں دوڑی جیسے وہ غم سے پاگل ہوئی جا رہی ہو۔۔ "اوہ دامین ۔۔۔۔ دامین" وہ روتے ہوئے کہنے لگی "میرے پیارے ۔۔۔ میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی"

اگر یہ روح ذرا مختلف ہوتی اور کم دنیادار ہوتی تو ہکا بکا رہ جاتی مگر ڈان دامین کی روح نے اس عورت کو اپنا رول بخوبی ادا کرتے ہوئے توصیفی انداز سے دیکھا۔ ایسے ہی کسی موقع پر خود ڈان دامین نے ایسی ہی شاندار ایکٹنگ کی ہوتی جو کہ ایسے موقع پر ضروری ہوتی اور وہ کہتا "میں ایسا اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے کر رہا ہوں"۔ اب اس کی بیوی اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایسا کر رہی تھی۔

وہ ابھی تک نوجوان اور خوبصورت تھی جبکہ ڈان دامین کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ جب پہلی بار وہ اس واقعے سے باخبر ہوا کہ وہ کسی اور شخص کے عشق میں مبتلا تھی تو اپنے مرحوم مالک کے حسد کی وجہ سے اس کی روح چند ناپسندیدہ لمحات سے گزری تھی۔ روح کو چند ماہ پیشتر کا وہ واقعہ یاد آگیا جب بیوی نے اعلان کرتے ہوئے کہا تھا "مجھے میرے عاشق سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں نے تم سے محض دولت کے لئے شادی کی تھی۔"

اس پر ڈان دامین نے جواب میں کہا تھا کہ اس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر یہ حق حاصل کر لیا تھا کہ اس کا مضحکہ نہ اڑایا جائے۔ یہ ایک ناخوش گوار منظر تھا اس لمحے حسب معمول ساس نے مداخلت کرتے ہوئے طلاق کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ناخوشگوار حقیقت یہ تھی کہ کچھ اہم مہمانوں کے آجانے کی وجہ سے یہ بحث وہیں کی وہیں رہ گئی۔ دونوں میاں بیوی نے مہمانوں کا استقبال یوں مسکراتے ہوئے اتنے شاندار طریقے سے کیا کہ اس کے پیچھے موجود حقیقت کو صرف روح ہی محسوس کر سکتی تھی۔

روح وہیں لیمپ پر براجمان ان گزرے واقعات کو یاد کر رہی تھی کہ پادری تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کسی شخص کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ پادری اتنی صبح سویرے یہاں کیوں آیا تھا جبکہ وہ رات کے وقت بیمار شخص سے مل کر گیا تھا۔

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ ڈان دامین کہیں اپنے گناہ بخشوانے سے پہلے ہی اس جہان سے رخصت نہ ہو جائے"۔

ساس صاحبہ نے شیشے کے اندر سے پوچھا "لیکن فادر کیا اس نے رات ہی کو اپنے گناہوں کا اقرار نہیں کر لیا تھا؟"

وہ یہ بات اس لئے کہہ رہی تھی کہ فادر رات کو دروازہ بند کئے ایک گھنٹے تک ڈان دامین کے پاس اکیلے ٹھہرا رہا تھا۔ ہر شخص ہی سوچ رہا تھا کہ بیمار شخص نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ روح جانتی تھی کہ واقعی ایسا نہیں ہوا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فادر اس وقت اچانک کیوں چلا آیا تھا۔ ان کی لمبی ملاقات کا موضوع بحث خشک سا تھا اس کا تعلق روحانیات سے تھا۔ پادری چاہتا تھا کہ ڈان دامین ایک بڑی رقم شہر میں نئے تعمیر ہونے والے گرجے کے لئے چھوڑ جائے جبکہ ڈان دامین اس سے بھی بڑی رقم چھوڑنا چاہتا تھا مگر یہ رقم ہسپتال کے لئے تھی۔ وہ دونوں کسی بات پر متفق نہ ہو سکے اور پادری وہاں سے چلا آیا۔ جب وہ اپنی اقامت گاہ پر واپس پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی گھڑی تو وہیں بھول آیا تھا۔

روح ایک نئی طاقت پا کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ اب آزاد تھی وہ اب اپنی غیر حاضری میں پیش آنے والے واقعات سے بھی باخبر تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں اور یہ کہ وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ پادری نے اپنے آپ سے کہا تھا "مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی گھڑی ڈان دامین کے گھر میں اتاری تھی تاکہ دیکھ سکوں کہ وقت کیا ہوا ہے۔ میں یقیناً" اسے وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ چنانچہ روح اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ اس وقت پادری کے آنے کا مقصد روحانی ہرگز نہ تھا۔

پادری نے براہ راست ساس صاحبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں اس نے اقرار نہیں کیا تھا۔ پچھلی رات کو ہم گناہوں کے اقرار کے بارے مین کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے اور یہ طے ہوا کہ میں علی الصبح سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ اس کا اقرار سنوں گا۔" یہ کہہ کر پادری رکا پھر اپنی آواز میں زیادہ نرمی اور سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا "یا شاید مجھے اس کی آخری رسومات ادا کرنے آنا پڑے گا۔ بدقسمتی سے میں نے آنے مین دیر کر دی۔" اس نے بستر کے دونوں اطراف میں پڑے طمع شدہ میزوں کی طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید ان دونوں میں سے کسی ایک میز پر اس کی گھڑی پڑی ہو۔

بوڑھی نوکرانی نے جو چالیس سال سے ڈان دامین کی خدمت کر رہی تھی اپنی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ ایسی باتیں منہ سے نکالنے پر خدا مجھے معاف کرے۔ لیکن اس کی روح اتنی خوبصورت تھی کہ اسے گناہوں کے اقرار کی ضرورت ہی نہ تھی۔"

اس نے اپنے سر کو ہلایا "دامین کی روح بہت خوبصورت تھی"

خدا کی پناہ۔۔ یہ کیسی انہونی بات تھی۔ روح نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ خوبصورت تھی۔ اس کے مالک نے اپنی زندگی بڑے عجیب و غریب انداز میں گزاری تھی بے شک وہ ایک امیر کبیر شخص تھا اور بہترین لباس پہنتا تھا اور وہ اپنے بنک کے معاملات نہایت ہوشیاری سے اور خوش اسلوبی سے نبھاتا تھا تو ایسے میں اس کی روح کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ اپنے مالک کی مصروفیات سے وقت نکال کر اپنی خوبصورتی یا بدصورتی کے بارے میں غور کر سکے۔ اسے ایک مثال یاد تھی کہ جب اس کے مالک نے اپنے وکیل کے ساتھ مل کر ایک مقروض کا مکان ہتھیا لیا تھا تو اس نے اسے یعنی اپنی روح کو نہایت پرسکون رہنے کا حکم دیا تھا حالانکہ مقروض شخص کے پاس اب رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ایک اور موقع پر جب اس نے اپنے نوٹوں پر ہیروں کی مدد سے (جو اس لڑکی کی تعلیم یا اس کی بیماریوں کے علاج کے لئے تھے) غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک نوجوان

خوبصورت لڑکی سے ایسے مقاصد کے لئے بنائے گئے ایک شاہانہ اپارٹمنٹ میں ملاقات کی تھی اور تب بھی اس کے مالک کا حکم تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔۔۔۔ لیکن وہ خوبصورت تھی یا کہ بدصورت تھی؟"

روح جانتی تھی کہ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ اپنے مالک کے جسم سے باہر آئی تھی اور شاید اس کے تصور سے بھی بہت کم وقت ہی گزرا تھا کیونکہ یہ سب کچھ ۔۔۔۔ یہ سارے واقعات بہت تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے ڈاکٹر نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ "صبح تک بخار کے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا خاص خیال رکھیں اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوراً اطلاع کریں۔"

تو کیا ایسے حالات میں روح اپنے آپ کو جل بھن کر مرجانے کے لئے چھوڑ دیتی؟

اگر اس اصطلاح کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا اصل مرکز ڈان دامین کی آنتوں میں تھا جو کہ آگ اگل رہی تھیں اور اگر وہ یہیں ٹھہری رہتی تو ایک چوزے کی طرح روسٹ ہو کر ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن اصل میں اس کو اپنی جگہ چھوڑے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟ یقیناً یہ تھوڑے عرصے پہلے کی بات تھی اور اسی لئے وہ اب اس وقت صبح کی ہوا کی ہلکی ٹھنڈک میں بھی اس پہلے والی تھوڑی سی گرمی کی شدت کو محسوس کر رہی تھی۔ روح کا خیال تھا کہ اس کے مرحوم مالک کے اندر کی گرمی اور اس بوہیمین گلاس کی فضا کی گرمی میں بس تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ لیکن اگر کوئی تبدیلی تھی۔ یا نہیں بھی تھی تو یہ سوال یہاں بے معنی تھا کیونکہ اصل بات تو وہ تھی جو بوڑھی نوکرانی نے کہی تھی یعنی "خوبصورت" اور وہ ایک قابل اعتبار عورت تھی کیونکہ وہ اس لئے اپنے مالک سے محبت نہیں کرتی تھی کہ وہ کوئی بہت اہم اور دولت مند شخص تھا بلکہ وہ تو اس سے اس لئے محبت کرتی تھی کہ اسے اس کے ساتھ محبت تھی۔

بعد میں دوسروں نے جو ریمارکس دیئے روح نے ان میں بہت کم اخلاص پایا۔

پادری نے کہا "بھلا اس کی روح خوبصورت ہی کیوں تھی؟"

ساس نے کہا "اس کی ذات کے لئے لفظ "خوبصورت" ہی سے تو ابتدا نہیں کی جاسکتی"

روح نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ کر رہی تھی۔۔ ان آنکھوں کے اشارے میں ایک تنبیہہ اور حکم کی جھلک نمایاں تھی جیسے وہ آنکھیں کہہ رہی ہوں "اری احمق ۔۔۔ پھر سے رونا دھونا شروع کرو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ پادری یہ سمجھے کہ تم اپنے خاوند کی موت پر بے حد خوش ہو؟" بیٹی نے ماں کے اشارے کو سمجھتے ہوئے روتی آنکھوں کے ساتھ بین کرنا شروع کر دیا۔

"دنیا میں کسی شخص کی روح تمہارے جتنی خوبصورت نہیں تھی۔۔۔۔ دامین مجھے تم سے بے پناہ محبت تھی"

روح اب اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی اب وہ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ واقعی وہ خوبصورت تھی یا نہیں اور وہ ان منافقین سے بھی جان چھڑانا چاہتی تھی۔ وہ سیدھی باتھ روم کی طرف گئی قالین پر بے آواز چلتی ہوئی وہ وہاں لٹکتے قد آدم آئینے کے سامنے آنا چاہتی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ بے وزن اور غیر مرئی ہو چکی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ کسی نے اسے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا اور وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے تیزی سے دوڑ پڑی۔

لیکن خدا کی پناہ۔۔۔۔ اسے وہاں کیسی صورت حال سے واسطہ پڑا؟ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ پچھلے ساٹھ سال سے ڈان دامین کی آنکھوں سے دیکھنے کی عادی تھی اور یہ آنکھیں زمین سے پانچ فٹ بلند ہوتی

تھیں جن کے ذریعے وہ اس کا ترو تازہ چہرہ 'اس کی صاف شفاف آنکھیں 'اس کے چمکتے بال 'اس کی پھولی ہوئی چھاتی ' اس کے اٹھے ہوئے سر اور قیمتی لباس کو جو اس نے زیب تن کر رکھا ہوتا تھا دیکھنے کی عادی تھی۔ اب جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی وہ بالکل ویسا نہیں تھا بلکہ یہ تو بمشکل ایک فٹ لمبائی کی پہلی سی کوئی عجیب و غریب چیز تھی جس کی کوئی واضح شکل نہ تھی۔ اور جہاں کہ ڈان دامین کی طرح کی دو ٹانگیں اور دو پاؤں ہونے چاہئیں تھے وہاں تو بس آکٹوپس کی طرح کے کچھ ریشے سے تھے جن میں کوئی باقاعدگی نہیں تھی ان میں کچھ چھوٹے تھے کچھ باریک تھے اور یہ سب کے سب گاڑھے گندے دھوئیں سے بنے معلوم ہوتے تھے۔ یہ نامحسوس قسم کے کیچڑ سے بھی بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے جو شفاف تھے مگر نہیں بھی تھے۔ اور یہ کچھ جھکے ہوئے مڑے تڑے ناطاقتے سے تھے اور اپنی بدصورتی میں عظیم الشان بھی تھے۔ ڈان دامین کی روح اپنے آپ میں گم سی ہو گئی۔ بہر حال اس نے حوصلہ کر کے اور اوپر دیکھا۔ اس کی کوئی کمر نہ تھی۔ حقیقت میں اس کا کوئی جسم ہی نہیں تھا۔ گردن وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ جہاں ریشے آپس میں ملتے تھے وہاں ایک طرف کان کی طرح کی کوئی چیز چپکی ہوئی تھی اور یہ کسی سیب کے گلے سڑے چھلکے کی طرح لگ رہی تھی اور دوسری طرف کھردرے بالوں کا گچھا سا تھا۔۔ اس میں کچھ مڑے ہوئے کچھ سیدھے بال تھے۔ لیکن یہ بھی کوئی اتنی بری چیز نہ تھی اور نہ ہی وہ بھوری پیلی سی اجنبی روشنی اتنی بری تھی جو یہاں سے برآمد ہو رہی تھی بلکہ سب سے بری چیز تو حقیقت میں یہ تھی کہ اس کا منہ کسی گلے سڑے پھل میں بنے سوراخ کی طرح کا بے شکل سا گڑھا تھا اور اس سوراخ کی گہرائی میں ایک آنکھ چمک رہی تھی۔۔ اس کی واحد آنکھ جو کہ تاریکی میں سے دھوکے اور خوف کے تاثرات کے ساتھ جھانک رہی تھی۔ حالانکہ دوسرے کمرے میں ڈان دامین کے بستر کے قریب جس پر ڈان دامین کی لاش پڑی تھی کھڑی عورتوں اور پادری نے یہ کہا تھا کہ اس کی روح بہت خوبصورت تھی۔

"میں ایسے حلیے کے ساتھ باہر گلی میں کیسے نکل سکتی ہوں؟" اس نے مایوسی کی سیاہ سرنگ میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

"مجھے کیا کرنا چاہئیے؟"

دروازے کی گھنٹی بجی تو نرس بولی "مادام ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ میں انہیں اندر لاتی ہوں"

ڈان دامین کی بیوی نے جلدی سے اپنے مرے ہوئے شوہر کی دہائی دیتے ہوئے اور جس ظالمانہ تنہائی میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا اس پر افسوس کرتے ہوئے پھر سے بین کرنا شروع کر دیا۔

روح نے جو اپنا عکس دیکھ کر سکتے کے عالم میں تھی جان لیا تھا کہ وہ گم ہو گئی تھی۔ اسے ڈان دامین کے لمبے وجود میں پناہ لینے کی عادت تھی۔ وہاں کی ہر چیز کی غرضیکہ آنتوں کی بدبو' معدے کی گرمی' بخار اور زکام کی بھی عادی تھی۔ تب اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی اور ساس صاحبہ دھیمی آواز میں روتے ہوئے کہنے لگیں "ہائے ڈاکٹر صاحب یہ کیا ہو گیا ہے"

"کچھ نہیں ہوا خاتون آپ اپنے آپ کو سنبھالئیے۔"

روح نے مردہ شخص کے کمرے میں جھانکا۔ عورتیں بستر کے گرد جمع تھیں اور فادر دوزانو بیٹھا دعائیں پڑھ رہا تھا۔ روح نے فاصلے کو جانچ کر چھلانگ لگائی اپنے اس خاص وصف سے لاعلم رہتے ہوئے وہ تکیے پر کسی ہوا جیسی ہلکی چیز کی طرح اتر آئی یا ایک ایسے جانور کی طرح جو بغیر کوئی آواز پیدا کئے اور نظر آئے بغیر حرکت کر سکتا تھا۔ ڈان دامین کا منہ ابھی تک تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ یہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا لیکن یہ بات اتنی اہم نہیں تھی۔

روح اندر لڑھک گئی اور اس نے اپنے ریشے اندر اپنی جگہوں پر سمیٹنے شروع کیے۔ وہی وہ اپنی جگہ سنبھال ہی رہی تھی کہ اس نے ڈاکٹر کو سانس سے کہتے سنا "بس ایک منٹ پلیز" اتنے واضح طور پر نہیں لیکن روح ابھی تک ڈاکٹر کو دیکھ ضرور سکتی تھی۔ وہ ڈان دامین کی طرف بڑھا اس نے اس کی کلائی ہاتھ میں پکڑی پھر اس نے پرجوش انداز میں اپنا کان کچھ دیر کے لئے اس کی چھاتی پر لگائے رکھا۔ پھر اس نے اپنا بیگ کھولا اور سیتھو سکوپ نکال لی۔ اس نے اس کی دونوں ٹوٹیاں کانوں میں لگائیں اور درمیان میں لٹکتے آلے کو اس جگہ رکھا جہاں ڈان دامین کا دل تھا۔ اب اس نے پہلے سے بھی زیادہ پرجوش انداز میں سیتھو سکوپ کو ایک طرف رکھا اور ای ہائیوڈرمک سرنج نکالی۔ اس نے نرس کو اسے بھرنے کے لئے کہا اور خود اس نے ڈان دامین کی کہنی سے اوپر چھوٹے سے ربڑ کے ٹکڑے کو کس کر باندھ دیا۔ اس وقت وہ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی جادوگر ہو اور ابھی اپنا کوئی شعبدہ دکھانے والا تھا۔ ظاہری بات تھی کہ ان تمام تیاریوں کو دیکھ کر بوڑھی نوکرانی ہوشیار ہو گئی۔

"اگر وہ بے چارہ مر چکا ہے تو تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟"

اس نے نوکرانی کی طرف بڑے مغرور انداز میں دیکھا اور جو کچھ اس نے کہا وہ صرف اس کے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے تھا۔

"سائنس بہرحال سائنس ہے۔۔۔۔۔ اور میرا فرض ہے کہ ڈان دامین کو موت کے منہ سے نکالنے کے لئے وہ سب کچھ کروں جو کہ میرے بس میں ہے۔ آپ نے اس شخص جیسی خوبصورت روح کہیں اور نہیں دیکھی ہو گی اور جب تک میں اپنی ساری صلاحیت صرف نہ کر سکوں اسے مرنے نہیں دوں گا"۔

یہ گمبھیر مگر مختصراً" ادا کئے گئے الفاظ بیوی کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھے۔ اس کے اندر اترتی ایک سرد سی لہر اور اس کی آواز کی کپکپاہٹ کو محسوس کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔

"لیکن ۔۔۔۔۔ لیکن کیا وہ مر نہیں چکا؟"

روح اب تقریباً" اپنے جسم میں واپس جا چکی تھی، صرف اس کے تین ریشے ان رگوں تک پہنچنے کی تگ و دو میں تھے جہاں کہ وہ پچھلے کئی سالوں سے رہتے آئے تھے۔ حالانکہ اس کی توجہ پوری طرح ریشوں کو اپنی جگہ پر صحیح طور پر جمانے میں تھی مگر پھر بھی اس نے یہ پریشان کن سوال سن ہی لیا تھا۔

ڈاکٹر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے ڈان دامین کی کلائی پکڑی اور اسے اپنے ہاتھ سے سہلانے لگا۔ روح نے اپنے اردگرد زندگی کی گرمی کو محسوس کیا۔ جل مرنے کے خوف سے جن رگوں کو وہ خالی چھوڑ گئی تھی اب ان میں زندگی کی رمق واپس آ رہی ہے، اسی لئے ڈاکٹر نے ڈان دامین کے بازو کی رگ میں سوئی چبھو دی اور پھر سرنج پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھانے لگا۔ لمحہ بہ لمحہ ڈان دامین کے جسم میں زندگی کی گرمی واپس آنے لگی۔

"یہ ایک معجزہ ہے" پادری بڑبڑایا۔ اچانک وہ زرد پڑ گیا اور ذہنی طور پر ہیجان کا شکار ہو گیا۔ اب نئے تعمیر ہونے والے گرجے کے لئے چندے کا ملنا یقینی تھا۔ وہ ڈان دامین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ تمام وقت اس کے بستر کے قریب بیٹھا اس کے لئے دعائیں کرتا رہا تھا اور یہ اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ وہ اس سے کہے گا "ڈان دامین خدا نے میری فریاد سن لی اور اس نے تمہیں دوبارہ ہمیں لوٹا دیا" اس بیان کے بعد وہ بھلا چندہ دینے سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔

بیوی نے فوری طور پر محسوس کیا کہ اس کا دماغ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی کے ساتھ اپنے شوہر

کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ماں کی طرف مڑ گئی۔ وہ دونوں ہی نہایت خوفزدہ سنی پتھر بنی خاموش کھڑی تھیں۔

البتہ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے جذبات کو ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن وہ اپنے کام سے بے حد مطمئن تھا۔

نوکرانی چلائی "خدا کا شکر ہے۔۔ اور تمہارا بھی شکریہ ۔۔۔ وہ بچ گیا ہے۔۔۔۔ وہ بچ گیا ہے۔"

وہ ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑے ہوئے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "وہ بچ گیا ہے۔۔۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔۔۔ تم نے ڈان دامین کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں اس کی قیمت کبھی ادا نہیں کر سکتا"

ڈاکٹر سوچ رہا تھا کہ ڈان دامین اپنی دولت میں سے مجھے بہت کچھ دے سکتا ہے۔۔۔ البتہ اس نے یہ الفاظ ادا نہیں کئے بلکہ کہا "اگر ڈان دامین کے پاس ایک دمڑی بھی نہ ہوتی تو پھر بھی میں نے اس کی جان بچانے کے لئے یہی سب کچھ کرنا تھا۔۔۔۔ یہ میرا فرض تھا۔۔ ایسی خوبصورت روح کو بچانے کے لئے یہ میرا سماجی فرض تھا۔"

حالانکہ اس نے یہ الفاظ نوکرانی سے کہے تھے مگر اس کا مقصد دوسروں کو سنانا تھا تاکہ وہ اس کے ان الفاظ کو اس وقت ڈان دامین کے سامنے دہرا سکیں جب وہ بھلا چنگا ہو کر ان الفاظ کے معانی پر عملدر آمد کر سکے۔

ڈان دامین کی روح نے "جو اتنے بہت سارے جھوٹ سن سن کر تھک گئی تھی" سو جانے کا فیصلہ کیا۔

ایک لمحے بعد، ڈان دامین نے ہلکی سی آہ بھری اور تکیے پر اپنے سر کو ہلایا۔

ڈاکٹر نے کہا "اب یہ گھنٹوں سوتا رہے گا۔۔ اسے مکمل خاموشی کی ضرورت ہے"

اور اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے وہ خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایلیا ورشانلی / عین الحق فرید کوٹی

مٹی کی مہک

یوریشیا نامی شہر قطب شمالی سے لے کر خط استوا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے شرق و غرب میں دو عظیم سمندر ٹھاٹیں مار رہے تھے۔ کرہ عرض کے دور دراز حصوں میں اسی قسم کے چند اور شہر بھی آباد تھے مگر اپنی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے یوریشیا سب سے بڑا تھا۔ یہ زمین میں ایک میل کی گہرائی تک آباد تھا۔ اس کے گلی محلے در بہ در فضا میں بلند ہوتے ہوئے پچیس میل کی اونچائی تک پہنچ چکے تھے۔

اس شہر نے ایک دیو ہیکل تیندوے کی طرح زمین کو اپنے نیچے لے رکھا تھا اور اس کی لمبی لمبی شاخیں نواحی سمندروں میں دور دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ یہ شاخیں اس شہر کی کلبلاتی ہوئی آبادی کے لئے خوراک کی فراہمی کا واحد ذریعہ تھیں۔ شہر کی بالائی منزل بے شمار نتھنوں کے فرائض انجام دیتی تھی جہاں سورج اس شہر کے چالیس ارب باشندوں کے سانس کی گندی ہوا کو صاف کر کے آکسیجن میں تبدیل کر دیتا تھا اور اسے ایٹمی قوت سے چلنے والے بڑے بڑے پنکھوں کی مدد سے دوبارہ شہر کے آخری کونوں تک پہنچا دیا جاتا تھا تاکہ شہری باشندے دم گھٹ کر نہ مر جائیں۔

شہر کے زمین دوز حصے میں طرح طرح کے کارخانے قائم تھے کہ جو شب و روز شہر کے مکینوں کے لئے ضروریات زندگی تیار کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ زمین کے بالائی حصے میں پیچ در پیچ اور تہ در تہ مکانوں کا لامتناہی سلسلہ لوگوں کے پیدا ہونے، پھلنے پھولنے، کام کرنے اور مرنے کے لئے وقف تھا۔

کرہ ارض کے اس سب سے بڑے شہر کی زندگی بھی اتنی ہی متنوع اور پیچیدہ تھی کہ جتنی خود اس شہر کے مکینوں کی تھی۔ یہاں کے ایک سکول کے کمرے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی استانی نے جماعت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: "بچو! کل ہم زمین کے محفوظ شدہ حصے کی سیر کے لئے جائیں گے۔" جماعت میں بیٹھے ہوئے بڑے بڑے سروں والے زردی مائل رنگت کے بچوں کے چہروں پر خوشی اور حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک دھان پان سی لڑکی نے اپنی منحنی ٹانگوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "مس! یہ زمین کیا ہوتی ہے؟"

استانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: زمین وہ جگہ ہے جہاں پودے اگتے ہیں۔"

بالوں سے قریب قریب خالی سروں والے ننھے بچوں کے چہروں پر حیرانی کے آثار اور بھی گہرے ہو گئے اور وہ ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگے۔ لڑکی نے پھر پوچھا: "مس صاحبہ! یہ پودے کیا ہوتے ہیں اور اگنا کسے کہتے ہیں؟"

"پودے ..... ! آج سے ہزاروں سال پہلے کے قدیم عہد کا غیر مہذب انسان کہ جو ابھی فضائی تسخیر کے اولین دور میں ہی تھا تو وہ ہمارے عہد کی کیمیائی اغذیہ سے بالکل ناآشنا تھا اور وہ اپنے اردگرد پائے جانے والے پودوں اور جانوروں کو کھا کر گزارہ کرتا تھا۔"

"اوہو...! استانی صاحبہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ زمین! یہ پودے!! یہ جانور۔۔۔۔!!! ہم نے تو اس قسم کے الفاظ نہ تو آج تک کبھی پڑھے ہیں اور نہ سنے۔ آپ یہ کون سی دنیا کی باتیں کر رہی ہیں۔"

"بچو! جب تم تیسری جماعت میں داخل ہو گے تو اس بارے میں تمہیں سب کچھ پڑھایا جائے گا۔ قدیم زمانے میں جبکہ دنیا کی کل آبادی بمشکل پانچ ارب تھی' بس یہ سمجھو کہ ہمارے محلہ نمبر ۱۲ ان ب کے برابر تو روئے زمین کا ایک بڑا حصہ غیر آباد پڑا ہوا تھا۔ وہاں اس قدیم عہد کا انسان مختلف قسم کے پودے بویا کرتا تھا اور انہی پودوں پر اپنی گزر اوقات کرتا تھا۔"

"کیا یہ پودے خوش ذائقہ ہوتے تھے؟"

"اوہ!" استانی نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "سچ پوچھو تو خود مجھے بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ سب پودے نہیں کھاتے تھے۔"

"تو پھر وہ فالتو پودے بوتے کیوں تھے؟"

استانی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں! وہ کیوں بوتے تھے۔ اصل میں وہ سب پودے خود نہیں بوتے تھے بلکہ کچھ خود بخود پیدا ہو جاتے تھے۔"

"وہ کیسے پیدا ہوتے تھے؟ جیسے بچے پیدا ہوتے ہیں؟"

استانی نے محسوس کیا کہ وہ بچوں کے ان پیچیدہ سوالوں سے عہدہ براہ نہیں ہو سکے گی۔ اس نے جان چھڑاتے ہوئے کہا "جب تم اگلی جماعت میں جاؤ گی تو اس بارے میں سب کچھ وضاحت سے بتایا جائے گا۔ فی الحال یہ سمجھو کہ سورج اور زمین انہیں پروان چڑھاتے تھے۔"

کلاس ختم ہونے کے بعد بچے اپنے اپنے گھر پہنچے۔

"امی جان!" ایک بچے نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا:

"کل ہم زمین کے محفوظ شدہ حصے کی سیر کے لئے جائیں گے۔"

"سنتے ہو! کل ہمارا ز بچی زمین دیکھنے جا رہا ہے۔"

باپ نے کندھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا: "کیا ابھی تک یہ حصہ موجود ہے۔ میرا تو خیال تھا۔۔۔۔"

"ہاں! ہاں!! وہ ہے۔ ہماری استانی نے ہمیں آج ہی بتایا ہے۔ وہاں پودے ہوتے ہیں۔ وہ زمین سے ہی کچھ کھاتے اور پرورش پاتے ہیں۔ دیکھئے نا یہ کتنی عجیب بات ہے۔ وہ خود بخود ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

ماں نے کہا: "ہاں! مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے میں بھی وہاں گئی تھی۔ مجھے تو وہ جگہ بہت پیاری لگی تھی۔ بہت ہی پیاری۔"

باپ نے مشکوک لہجے میں کہا: "کیا وہاں کوئی خاص چیز تھی؟"

ماں نے خواب آلود مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "وہاں گھاس تھی۔ ہری ہری گھاس کا ایک فرش۔"

باپ نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا: "اس ہری گھاس کے فرش کے تصور سے آپ ہی دل بہلائیں۔ مجھے تو نرم نرم پلاسٹک کا فرش پسند ہے۔"

دوسرے دن بچے اپنی استانی کے ساتھ زمین کا محفوظ شدہ حصہ دیکھنے کے لئے تیار ہوئے۔ ایک برق رفتار لفٹ نے بچوں کو چند منٹوں میں ہی شہر کی چھت پر پہنچا دیا۔ وہاں کی تیز اور عجیب و غریب روشنی سے بچوں کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ سامنے مشرقی افق پر ایک سرخی مائل چمکدار گولہ فضاء میں معلق نظر آ رہا تھا۔

استانی نے بچوں کو ہدایت کی کہ سب بچے فوراً آنکھوں پر سیاہ چشمے پہن لیں ورنہ اسی روشنی سے اندھا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بچوں نے فوراً گہرے رنگ کے دھوپ چشمے پہن لئے اور مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ سرخ سا گولہ کیا ہے۔؟"

"یہی تو وہ سورج ہے کہ جس کا ذکر آپ کئی دفعہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں۔ اسی کی روشنی کو خاص آئینوں کی مدد سے شہر کے تمام حصوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ہمارے محلے میں دن کے وقت جو دھیمی سی روشنی رہتی ہے وہ بھی اسی سورج سے حاصل کی گئی ہے۔"

ایک بچے نے سورج کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا: "مجھے تو گرمی محسوس ہو رہی ہے کیا سورج گرم ہے؟"

"ہاں! نہایت ہی گرم۔ اس کی سطح پر چھ ہزار درجے تک گرمی ہوتی ہے اور اس کا اندرونی حصہ اس سے بھی زیادہ گرم ہے۔"

"نہیں! نہیں!! یہ اتنا گرم تو نہیں۔ بس ایسا ہی معمولی گرم محسوس ہوتا ہے کہ جتنا ہمارے مکان کی دیواریں۔ آخر حکومت ہمارے محلے میں بھی ایک ایسا ہی سورج کیوں نہیں لگا دیتی؟"

استانی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اسے معلوم تھا کہ اب بچے اس قسم کے بے ہنگم سوالوں کی بھرمار کر دیں گے۔ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا: جب حکومت نے ہمارے لئے مصنوعی روشنی کا اتنا اچھا انتظام کر رکھا ہے پھر ہمیں سورج کی تیز و تند روشنی کی کیا ضرورت ہے۔ چلو، جلدی کرو، راکٹ جہاز تیار ہے۔

راکٹ جہاز نے دیکھتے ہی دیکھتے انہیں سینکڑوں میل دور پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ دھوپ گاڑی کے ذریعے زمین اٹامک ایکسپریس کے سٹیشن پر پہنچ گئے۔

زمین اٹامک ایکسپریس بچوں کو لے کر تیز رفتاری سے نیچے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اب وہ روشنی، وہ حرارت، وہ تازہ ہوا، وہ کھلی فضائیں غائب ہو چکی تھیں اور اس کی جگہ وہی دھندلکے، وہی مصنوعی سوگوار سی آب و ہوا جیسے کہ ان کے جسم احساس سے عاری ہو چکے ہوں، بس مردہ خانے کی لاش کی طرح کہ جس کے لئے گرمی اور سردی اپنی حقیقت کھو دیتی ہے اور چاروں طرف فضاء میں بسی ہوئی ایک باسی قسم کی بو کہ جس کا اس سے پہلے انہیں کبھی احساس تک بھی نہیں ہو پایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے انہیں زندگی کی وسعتوں سے جلاوطن کر کے موت کی گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا گیا ہو۔

ایکسپریس نہایت سرعت رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ سفر شروع ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ استانی نے گھڑی پر نظر ڈالی سفر شروع ہوئے پورے پینتیس منٹ گزر چکے تھے بچے بے چینی سے کسمسا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ سفر کبھی ختم نہیں ہو گا۔ آخر ایک لڑکے سے نہ رہا گیا اس نے اکتا کر پوچھا:

"زمین ابھی اور کتنی دور ہے؟"

"بس اب پہنچے کہ پہنچے۔ صرف بیس منزلیں اور باقی ہیں۔"

ایک ننھی سی بچی نے منہ بسورتے ہوئے کہا! "مجھے تو یہاں اچھا نہیں لگتا۔ میں تو واپس گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"بیٹی! صرف چند لمحے اور صبر کرو۔" اگرچہ اب استانی خود بھی ایک قسم کا اضطراب سا محسوس کر رہی تھی۔

ایکسپریس اچانک جھٹکے سے رکی۔ وہ ایک نیم تاریک سے راستے پر کھڑے تھے جس کے آگے بالکل اندھیرا

تھا۔
"بچو! ایک دوسرے کی انگلیاں پکڑ لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" تھوڑی دور آگے ایک بلند و بالا آہنی دروازہ سامنے تھا۔ استانی نے ایک بٹن دبایا اور دروازہ ایک شان بے نیازی کے ساتھ آہستہ آہستہ کھل گیا۔
"یہ لو! ہم زمین کے اس حصے پر پہنچ گئے ہیں کہ جو آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔"
دروازے میں قدم رکھتے ہی بچوں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ شہر میں ہمیشہ رہنے والی ایک سی ہلکی ہلکی روشنی کے برعکس یہاں کی پوری فضاء روشنی سے معمور تھی۔ یہاں خاص قسم کے آئینوں کی مدد سے سورج کی روشنی کو اس کے حقیقی رنگ و روپ میں منعکس کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف پانی کا ایک جھرنا پھوار اڑاتا مدھر آواز کے ساتھ ایک طرف بہنے والے نالے میں گر رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی پھوار میں قوس قزح کے تمام رنگ اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جھلملا رہے تھے۔ اگرچہ اس حقیقی روشنی میں بچوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی جا رہی تھیں لیکن اپنے گرد و پیش کے نئے نئے مناظر میں وہ اتنے کھو گئے تھے کہ سیاہ چشموں کا خیال تک ان کے ذہنوں سے محو ہو چکا تھا وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان تمام آوازوں' ان تمام نظاروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ننھے منے ذہنوں میں سمو لینا چاہتے ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ اس قطعہ زمین کو دیکھنے کا نہ صرف یہ پہلا موقعہ ہے بلکہ غالباً" آخری بھی۔
"یہ رہا مالی" استانی نے کہا "ہم اس سے پودوں کے بارے میں بات چیت کریں گے۔"
بوڑھے مالی کے سرخ و سپید کتابی چہرے پر سفید نورانی داڑھی اور سر پر گھنے بال تھے۔ بچے اس کے چوڑے چکلے سینے' ورزشی جسم اور بازوؤں کے ابھرے ہوئے پٹھوں کو رہ رہ کر تک رہے تھے۔
"مس! کیا مالی سچ مچ کا انسان ہے؟" ایک لمبوترے سر والے منحنی سے بچے نے مالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"خاموش" استانی نے اسے آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا "جو کچھ سامنے آتا ہے اسے غور سے دیکھتے جاؤ اور فضول باتیں مت بناؤ۔"
"لیکن ہم ایک ہی وقت میں باتیں بھی کر سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔" بچے کو یوں محسوس ہوا جیسے مالی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہو۔
"یہ دیکھو" مالی نے کہا "گندم کے پچاس خوشے۔ قدیم زمانے کا انسان اسے غذا کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ اس سے چپاتی بناتا تھا اور اسے آگ پر بھون کر کھاتا تھا۔"
"کیا یہ کھانے میں لذیذ ہوتی تھی؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔
"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں" مالی نے جواب دیا "ایک طویل عرصے سے انسان اس کے استعمال کی ترکیب بھول چکا ہے۔"
استانی نے استفسار کیا "مالی صاحب! آپ ان گندم کے خوشوں کو کیا کرتے ہیں؟"
مالی نے جواب دیا: "محترمہ! ان سے حاصل ہونے والے بیجوں سے کچھ تو مختلف عجائب گھروں کو بھیج دیئے جاتے ہیں۔ چند بیج اس کے لئے مخصوص کیاری میں بو دیتے ہیں اور باقی کو جلا دیتے ہیں کیونکہ اگر انہیں ایسے ہی پھینک دیا جائے تو پھر وہیں ان سے نئے پودے پھوٹ پڑتے ہیں اور یہ سلسلہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر ختم نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس انہیں رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں گندم کی کیاری کے علاوہ ہمارے پاس بمشکل تمام اتنی

جگہ ہے کہ اس میں صرف گھاس کا ایک قطعہ، چند درخت اور پھولوں کے چند پودے لگا رکھے ہیں۔"
مالی بچوں کو پھولوں کی ایک کیاری کے پاس لے گیا "پھولوں کے اس پودے کو گلاب کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جبکہ کل انسانی آبادی صرف پانچ ارب کے قریب تھی تو زمین کا ایک بڑا حصہ یونہی بیکار پڑا ہوا تھا۔ ماہرین تاریخ کا کہنا ہے کہ اس وقت زمین کے ان حصوں پر لاتعداد رنگ رنگ کے خوشبو دار پھول کھلتے اور مرجھاتے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کا انسان زمین کے صحیح مصرف سے ناواقف تھا اور اسے اپنے وقت کی قدر و قیمت بھی معلوم نہ تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس عہد کا انسان اپنا بہت سا وقت محض اس قسم کے پھولوں کی نگہداشت و پرداخت پر صرف کر دیتا تھا کہ جن سے اسے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب لے دے کر پھولوں کی یہ صرف ایک کیاری محفوظ رہ گئی ہے۔"
بچوں نے سوال کیا: "مالی جی! ان پھولوں کو کون بناتا ہے؟"
استانی نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا! "بچو! یہ کون بناتا ہے؟ والا مسئلہ حل کرنے کے لئے انسان ہزاروں سالوں سے غور و فکر میں مصروف ہے۔ لیکن آج تک اس مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل تلاش نہیں کر سکا۔ حیرت ہے کہ آج تک کسی انسان نے کسی کو یہ پھول بناتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ بس پہلے ایک ننھا سا شگوفہ شاخ پر نمودار ہوتا ہے آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے، کھلتا ہے اور ایک دن مرجھا جاتا ہے۔ پھر اس کی جگہ ایک اور شگوفہ لے لیتا ہے اور روز اول سے یہ سلسلہ یونہی جاری ہے۔ بس اسی طرح کہ جیسے ایک بچہ پہلے چھوٹا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا اور جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔"
"مس! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس پھول کے پودے کا انسانوں کے ساتھ کوئی گہرا ہی رشتہ ہے۔"
"بچو یہ سوال ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے جب آپ تیسری جماعت میں ہو جاؤ گے تو اس بارے میں آپ کو تفصیل سے بتایا جائے گا۔"
ایک بچے نے مالی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "مالی جی! کیا ہم ان پیارے پیارے پھولوں کو چھو کر دیکھ سکتے ہیں؟"
"نہیں! ہرگز نہیں!! آپ جھک کر انہیں سونگھیں اور دیکھیں کہ ان کی خوشبو کتنی دلکش ہے۔"
ذہبی پھول سونگھنے کے لئے ایک پودے کے پاس دو زانو جھک گیا۔ پھول کی بھینی بھینی خوشبو نے جیسے اسے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ وہ پھول کو بالکل نزدیک سے سونگھنے کے لئے کچھ اور نیچے جھکا تو پھول کی خوشبو کے ساتھ ساتھ نمدار مٹی سے ایک اور عجیب قسم کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن کے تاریک گوشوں سے کوئی صدیوں پرانی بھولی بسری یادیں ابھر آئی ہوں۔ باقی جماعت گھاس پھولوں اور پودوں کا ملاحظہ کر چکی تھی لیکن ننھا ذہبی ابھی تک وہیں گلاب کے پھول کے پاس جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جیسے اس کی کوئی قیمتی شے اس سے چھن گئی ہو۔
استانی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بچو! وقت ختم ہو گیا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ کوئی دوسری جماعت زمین دیکھنے کے لئے پہنچنے ہی والی ہے۔ آپ اس خوشگوار سیر کے لئے مالی کا شکریہ ادا کریں۔"
تمام بچوں نے ایک ساتھ مل کر کہا "مالی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"خدا حافظ" مالی نے کہا "پھر کسی وقت آیئے گا۔"
استانی نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں! میں تو ضرور آؤں گی۔ لیکن اگلے سال دوسری جماعت کے ساتھ کیونکہ

شہر کے پروگرام کے مطابق اس کے لئے زندگی میں صرف ایک ہی موقعہ ملتا ہے۔"

بچے دروازے سے باہر نکل رہے تھے کہ زبی نے اپنے ننھے منھے کندھوں پر بھاری بھرکم ہاتھوں کی بڑی نرم نرم گرفت محسوس کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مالی نے مسکراتے ہوئے گلاب کا ایک سرخ و سپید اور ترو تازہ پھول زبی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ زبی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے دنیا بھر کے خزانے اس کی جھولی میں ڈال دیئے ہوں۔

اس شام ننھا زبی خلاف معمول وقت سے پہلے ہی اپنے سونیوالے کمرے میں چلا گیا اور سوائے سرہانے کی طرف لگی ہوئی ہلکی نیلی بتی کے کمرے کی تمام بتیاں گل کر دیں۔ اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ متواتر چھت کی طرف تکے جا رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ تکئے پر بالکل اس کے منہ کے سامنے گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ اس طرح اس نے یہ تمام رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح جب زبی سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے اپنے خاوند کو آواز دی اور کہا کہ ایسا لگتا ہے جیسے ننھا زبی رو رہا ہو۔ خاوند نے کہا کہ شائد وہ کل کے طویل سفر کی وجہ سے تھک گیا ہے۔ ویسے بھی کل شام جب وہ واپس لوٹا ہے تو کچھ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے سونے سے پہلے ہمیں شب بخیر بھی تو نہیں کہا۔

زبی کی ماں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ وہ بستر پر بیٹھا زور زور سے سسکیاں بھر رہا ہے۔ ماں اس کے پاس بیٹھ گئی' اسے گود میں لے کر زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور پیار سے پوچھا

"میرے لال! کیا بات ہے؟

"دیکھو!" زبی نے اپنی مٹھی کھول دی۔

"بیٹا! یہ کیا ہے"

زبی نے ہتھیلی پر پڑی ہوئی مرجھائی ہوئی پتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "امی! یہ گلاب کا پھول ہے۔ یہ مالی نے کل مجھے دیا تھا۔ اوہ! اس کا رنگ کتنا دلکش اور خوشبو کتنی پیاری تھی۔"

"اوہو! بیٹا!! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بھی کوئی روتا ہے۔ ہمارے پاس پلاسٹک کے کتنے ہی خوبصورت پھول موجود ہیں۔" وہ یہ کہہ کر ساتھ والے کمرے میں گئی اور پلاسٹک کے بڑے خوبصورت پھولوں کا گلدستہ اٹھا لائی۔

"اگر تمہیں خوشبو پسند ہے تو میں ابھی ایک پیاری سی خوشبو والا بٹن دبا دیتی ہوں۔"

"نہیں! نہیں!! یہ بٹن والی خوشبو مجھے نہیں چاہیے۔"

"لیکن یہ پلاسٹک کے پھول تو تمہارے گلاب سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔ اور یہ کیمیاوی خوشبو اس کی خوشبو سے بدرجہا بہتر ہے۔"

زبی نے زور زور سے سرہانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"نہیں! نہیں!! یہ بالکل جھوٹ ہے۔ یہ ہرگز گلاب جیسے نہیں ہیں۔ گلاب کا پھول تو ایسا ہے جیسے کہ۔۔۔۔ جیسے کہ۔۔۔۔" اس کے ننھے منھے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آ رہی تھی کہ جسے وہ گلاب کے پھول سے تشبیہ دے سکے اور وہ بے بسی کے عالم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اینطون چیخوف / محمد افسر ساجد

سطحِ سمندر پر۔۔ ایک ملاح کی کہانی

اب صرف نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی بندرگاہ کی مدھم ہوتی ہوئی روشنیاں سیہ آسمان کے پس منظر میں نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے سر پر منڈلاتے ہوئے طوفانی بادل بارش انڈیلنے کے لئے تیار تھے۔ ہوا اور سردی کے باوجود حبس بڑھ گیا تھا۔

ہم سب ملاح عملے کے اقامتی کوارٹر میں جمع ہو کر قرعہ نکال رہے تھے۔ فضا میں ہمارے اونچے اور مدہوش قہقہے گونج رہے تھے۔ ہمارا ایک ساتھی مستی میں مرغے کی طرح بانگ دے رہا تھا۔ میرے جسم میں پیٹھ سے ایڑی تک ایک ہلکی سی کپکپی دوڑنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سر کے پیچھے ایک سوراخ سے سردی کے جھٹکے گولی کی طرح میرے برہنہ جسم میں داخل ہو رہے ہوں۔ میں سردی اور کئی دوسری وجوہات (جنہیں میں یہاں بیان کروں گا) کی بنا پر کپکپی میں جلتا تھا۔

میرے خیال میں انسان عام طور پر غلیظ ہے اور ایک ملاح تو کبھی کبھی دنیا کی غلیظ ترین مخلوق نظر آتا ہے۔ ایک بدترین جانور (جس کے پاس کم از کم اپنی جبلتوں سے مجبوری کا عذر تو ہوتا ہے) سے بھی زیادہ غلیظ۔ ممکن ہے، ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں۔ کیونکہ زندگی کے بارے میں میرا تجربہ زیادہ نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک ملاح کو اپنے آپ کو کوسنے اور اپنی تحقیر کے مواقع دوسروں سے زیادہ میسر آتے ہیں۔ وہ ایک انسان ہے جو کسی بھی لمحے سر کے بل مستول سے گر کر لہروں کے نیچے روپوش ہو سکتا ہے۔ ایسا انسان جو اللہ جانتا ہے، کسی وقت بھی ڈوب سکتا ہے۔ جسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس کے لئے خشک زمین پر رہنے والوں کے دلوں میں کوئی رحم نہیں ہوتا۔ ہم ملاح اکثر واڈکا کے جام پر جام چڑھاتے ہیں اور بدکار ہوتے ہیں کیونکہ ہمیں خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ انسان کو سمندر پر نیکی کی ضرورت کیوں ہوتی ہے! تاہم میں اپنا بیان جاری رکھوں گا۔

ہم لوگ قرعے نکال رہے تھے۔ ہم بائیس ملاح پوری ڈیوٹی دینے کے بعد اب فارغ تھے۔ ان میں سے صرف دو کی قسمت میں ایک انوکھے منظر سے لطف اندوز ہونا لکھا تھا۔ اس رات ہنی مون کیبن تصرف میں تھا۔ اس کیبن کی دیوار میں صرف دو سوراخ تھے جن میں سے ایک میں نے خود ایک پیچ دار آرے کی مدد سے بنایا تھا۔ دوسرا میرے ایک ساتھی نے چاقو سے بنایا تھا۔ ہم نے یہ کام ایک ہفتے سے زیادہ مدت میں مکمل کیا تھا۔

"تمہیں ایک سوراخ ملا ہے"

"کیسے"

انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ "دوسرا کسے ملا ہے؟"

"تمہارے والد کو"

میرا باپ ایک کبڑا ضعیف ملاح تھا جس کا چہرہ ایک جلے ہوئے سیب کی طرح تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور

میری پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ "میرے بیٹے آج ہم بہت خوش قسمت ہیں" اس نے کہا۔ "تم سن رہے ہو بیٹے؟ خوش قسمتی ہم دونوں کے قدم ایک ساتھ ہی چوم رہی ہے۔ یہ بڑی معنی خیز بات ہے۔"

میں جہاز کے عرشے پر چلا گیا اور پائپ سلگانے کے بعد سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرا پھیلا ہوا تھا تاہم یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ میری آنکھوں سے وہ سب کچھ عیاں تھا جو میرے اندر اس وقت رونما ہو رہا تھا جبکہ میں کالی رات کے پس منظر میں تصویریں بنا رہا تھا اور ان چیزوں کو اپنی چشم تصور میں لا رہا تھا جو میری چھوٹی سی لیکن تباہ حال زندگی میں مفقود تھیں۔

آدھی رات کے وقت سیلون کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دروازے میں نظر ڈالی۔ دولہا۔ جو ایک خوبصورت سنہرے سر والا نوجوان پادری تھا۔ ہاتھ میں انجیل لئے ایک میز کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ ایک طویل قامت مگر منحنی سی انگریز عورت کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ دلہن جو ایک خوبصورت اور پرکشش نوجوان خاتون تھی، اپنے خاوند کے برابر بیٹھی اسے اپنی ہلکی نیلی آنکھوں سے تک رہی تھی۔ ایک لمبا مگر فربہ بڑی عمر کا انگریز جو پیشے کے اعتبار سے بینکار تھا اور جس کا چہرہ سرخی مائل لیکن خاصا مکروہ تھا، سیلون میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ اس ادھیڑ عمر عورت کا شوہر تھا جس سے پادری باتیں کر رہا تھا۔

"پادریوں کی عادت ہے کہ وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں" میں سوچ رہا تھا۔ "وہ صبح سے پہلے اپنی گفتگو ختم نہیں کرے گا۔"

ایک بجے میرا باپ میرے پاس آیا اور مجھے آستین سے کھینچ کر کہنے لگا۔ "وقت ہو گیا ہے۔ وہ لوگ سیلون سے چلے گئے ہیں"۔

یہ سن کر میں پلک جھپکتے کیبن کے راستے اس جانی پہچانی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے اور جہاز کے کنارے کے درمیان کچھ خالی جگہ تھی جس میں دھواں، پانی اور چوہے جمع تھے۔ مجھے جلد ہی بوڑھے آدمی (یعنی اپنے باپ) کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بوروں اور تیل کے کنستروں سے ٹکراتا، گالیاں بکتا وہاں وارد ہوا۔ میں نے دیوار میں سوراخ تلاش کر کے اس میں سے چوکور لکڑی کا ٹکڑا نکال لیا جسے میں نے بڑی محنت سے تراشا تھا۔ اب مجھے باریک شفاف ململ میں سے نرم گلابی روشنی چھن چھن کر آتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ روشنی کے علاوہ میرے چہرے کو ایک بھینی بھینی مہک بھی چوم رہی تھی۔ یہ بلاشبہ ایک رئیسانہ کمرۂ خواب کی خوشبو تھی۔ کمرے کو دیکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ململ دونوں انگلیوں سے ایک طرف کھسکا دی جائے جو میں نے فوراً کر دیا۔ یوں میں نے کانسی، مخمل اور گوٹے کو گلابی روشنی سے مرصع دیکھا۔ میرے چہرے سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر بستر رکھا تھا۔

"میں تمہاری جگہ آ جاتا ہوں" میرے باپ نے بڑی بے صبری سے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے بستر دیکھ سکتا ہوں۔" .... میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیٹے تمہاری نظر مجھ سے بہتر ہے۔ لہٰذا تمہیں یہ منظر دور یا نزدیک دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"خاموش رہو" میں نے کہا۔ "کہیں وہ ہماری آواز نہ سن لیں!" دلہن بستر پر ایک طرف بیٹھی تھی اور اپنے پیروں کو پاپوش میں لٹکائے ہوئے تھی۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی تھیں۔ اس کے سامنے اس کا نوجوان (پادری) خاوند کھڑا تھا۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ جو مجھے نہیں پتہ لگ سکا۔ جہاز کے شور کی بنا پر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جوشیلے انداز میں بول رہا تھا اور کچھ اشارے بھی کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

خاتون سن رہی تھی اور سر ہلا کر انکار کر رہی تھی۔

"شیطان اسے سمجھے!" میرا باپ بڑبڑایا۔

"کسی چوہے نے مجھے کاٹ لیا ہے"۔ میں نے اپنا سینہ ایسے دیوار کے ساتھ دبایا جیسے میرا دل باہر نکلا آرہا ہو۔ میرا سر بھی جل رہا تھا۔

دلہن اور دولہا نے بڑی دیر تک گفتگو کی۔

آخر کار اس نے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنے بازو بڑھاتے ہوئے اس کی منت سماجت شروع کر دی۔ خاتون نے پھر انکار میں اپنا سر ہلایا۔ وہ یکدم اچھل کر کیبن کے دوسری جانب چلا گیا۔ اس کے چہرے اور بازوؤں کی حرکت سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خاتون کو دھمکا رہا ہو۔ اب جواں سال دلہن اٹھ کر آہستہ آہستہ دیوار کے اس جانب آئی جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ سوارخ کے پاس آکر رک گئی اور سوچ میں گم مبہوت کھڑی رہی۔ میں نے کمال شوق سے یہ منظر اپنی نگاہوں میں بسالیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور ایک انجان سی داخلی کشمکش میں گرفتار۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے بظاہر وہ طیش میں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔

ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تقریباً" پانچ منٹ تک کھڑے رہے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی ہوئی کیبن کے درمیان آکر رک گئی۔ اب اس نے پادری کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ یہ بلاشبہ ایک دوستانہ انداز تھا۔ اس نے خوشی سے مسکرا کر اس کا ہاتھ چوما اور باہر چلا گیا۔

تقریباً" تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور پادری دوبارہ داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہی لمبا' فربہ انگریز تھا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ مو اخرالذکر بستر کی طرف گیا اور اس نے اس خوبصورت عورت سے ایک سوال کیا۔ وہ زرد نظر آرہی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ تب بینکار نے اپنی جیب سے ایک پیکٹ نما چیز نکالی۔ جو بظاہر نوٹوں کا ایک پلندہ تھا اور پادری کے حوالے کر دی۔ پادری نے انہیں جانچا اور گنا اور احتراماً" جھکتے ہوئے' باہر چلا گیا۔ عمر رسیدہ انگریز نے اس کے جانے کے بعد دروازہ مقفل کر دیا۔

میں دیوار سے اس طرح اچھلا! جیسے مجھے کسی کیڑے نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں مبہوت تھا۔ اور مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے ہوا ہمارے جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو اور ہم نیچے ڈوب رہے ہوں۔ میرے باپ نے جو ایک شرابی اور بدقماش انسان تھا' میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ چلو اب ہم یہاں سے چلیں ہمیں یہ منظر نہیں دیکھنا چاہئے' تم ابھی بچے ہو!"

وہ بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں اسے عموداً" گھومتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر لے گیا جہاں خزاں کی بارش پڑنی شروع ہو گئی تھی.....!

انطون چیخوف / فوزیہ طاہرہ

کم ذات

یہ بڑی پرانی بات ہے جب وہ خوبصورت اور جوان تھی۔ نکولائی بھی اس کے چاہنے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ اکثر اس کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ ان دنوں بڑی گرمی اور حبس تھا' نکولائی دوپہر کا کھانا کھا چکا تھا' آج اس نے شراب کی پوری بوتل بھی چڑھا رکھی تھی۔ اس کی طبیعت خاصی مضمحل تھی اور وہ قیلولے کے موڈ میں تھا۔ دونوں کچھ بوریت محسوس کر رہے تھے۔۔۔ لہٰذا وہ اس انتظار میں تھے کہ کب شام ہو اور وہ باہر گھومنے نکلیں...... اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی' نکولائی کرسی سے اٹھا اور سوالیہ انداز میں پاشا کی جانب دیکھا.....

"ہو سکتا ہے ڈاکیہ ہو یا کوئی میری ایکٹریس سہیلی ....." پاشا نے کہا۔

نکولائی کو ڈاکیے یا پاشا کی سہیلیوں سے اگرچہ کوئی سروکار نہیں تھا پھر بھی اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔۔۔۔ پاشا دروازہ کھولنے کے لئے جب آگے بڑھی تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئی کہ نہ تو وہاں کوئی ڈاکیہ تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ایکٹریس سہیلی ..... بلکہ ایک حسین و جمیل اجنبی عورت جس نے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا' اس کے سامنے کھڑی تھی' وہ کسی خاندانی گھرانے کی معلوم ہو رہی تھی' لیکن اس اجنبی عورت کے چہرے کی رنگت زرد تھی اور تھکاوٹ کے باعث گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ جیسے خاصی سیڑھیاں چڑھ کر یہاں تک پہنچی ہو۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے.....؟" پاشا نے اس سے پوچھا۔ اجنبی عورت جواباً" خاموش رہی اور اندر آ کر کمرے کی ہر شے کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگی..... وہ بڑی تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی اور چہرے سے تکلیف کے آثار بھی نمایاں تھے۔ سانس بحال ہوتے ہی وہ بولی.......

"کیا میرا شوہر یہاں رہتا ہے.....؟" بالآخر اس نے پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا' اس کی آنکھیں رونے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں.....

"کس کا شوہر۔۔۔؟" ... پاشا نے یکدم پوچھا' وہ سہم سی گئی' اسکے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے... کس کا شوہر۔۔؟" اس نے بے اختیار پھر پوچھا۔۔۔

"میرا شوہر نکولائی ....." اجنبی عورت نے بڑے یقین کے ساتھ پاشا سے مخاطب ہو کر کہا....

"نہیں .... محترمہ .... میں ..... میں تو اس کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتی....."

اجنبی عورت پاشا کا جواب سن کر کچھ دیر خاموش رہی اور بار بار اپنے رومال سے آنسو پونچھتی رہی۔ پاشا کی تو ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کرسی پر بیٹھنا ہی بھول گئی۔۔۔ وہ ٹکر ٹکر اپنی اجنبی مہمان کو سہمے ہوئے انداز میں دیکھے جا رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ یہاں موجود نہیں ہے۔۔۔ حرافہ....!"

عورت بڑبڑائی اور پاشا کی جانب نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی.....

"تو حرافہ عورت ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آج یہ بات میں تیرے منہ پر تجھے کہہ رہی ہوں...." پاشا کی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آگئے اور اس نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت وہ بھرپور میک اپ میں نہ ہوتی' تو وہ اپنے بازاری پن کو چھپا سکتی تھی۔ اور ایسے میں اس اجنبی عورت کو ترکی بہ ترکی جواب ضرور دیتی.....

"میرا شوہر.... کہاں ہے....؟" عورت نے اپنا سوال دوہرایا لیکن پھر آپ ہی آپ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی....

"مجھے اس کی پرواہ ہرگز نہیں کہ وہ کہاں ہے .... بس میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس کا غبن ظاہر ہو گیا ہے' اور وہ لوگ نکولائی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں' کسی نہ کسی دن انہوں نے اس کو گرفتار کرلینا ہے ..... آگے تم خود جانو...."

اجنبی عورت پریشانی کے عالم میں کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگی.... پاشا اس کو حیرت سے تکے جا رہی تھی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے.....؟

"آج اس کو ڈھونڈ کر گرفتار کر لیا جائے گا...." اجنبی عورت یہ کہہ کر پھر سے رونے اور آہیں بھرنے لگی....

"میں جانتی ہوں کہ اس کو اس مقام تک کون لے کر آیا ہے--- صرف تو.... حرافہ عورت ...... تیرے جیسی کمینی عورت نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے...." عورت کے چہرے سے وہ نفرت اور حقارت ظاہر ہو رہی تھی جو اس کے دل میں پاشا کے لئے تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی وہ اس کے منہ پر تھوک دے گی.....

"میں بے بس تھی..... مجبور تھی..... ظالم عورت...!..... تو مجھ سے زیادہ طاقت رکھتی ہے لیکن کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ میرے بچوں کے سر پر کون ہاتھ رکھے گا' میرا خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے..... وہ انصاف کرنے والا ہے.... وہ تجھ سے میرے آنسوؤں اور میرے رت جگوں کا حساب ضرور لے گا.... یہ وہ وقت ہو گا جب تجھے میرا خیال آئے گا.... تو پچھتائے گی.... وحشی عورت...." ماحول پر پھر سے ایک خاموشی چھا گئی ... "مجھے واقعی اس کا کچھ پتہ نہیں .... محترمہ....." پاشا یہ کہہ کر رو پڑی....

"تجھے کوڑھ پڑے' بے ایمان..... جھوٹی...." عورت چلائی..... "مجھے سب پتہ ہے' میں تیرے بارے میں بہت عرصے سے جانتی ہوں.... مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ گزشتہ چار مہینوں سے وہ ہر روز تیرے پاس آتا ہے...." عورت نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا.... پاشا جو خاموشی سے سب کچھ سنے جا رہی تھی' خاموش نہ رہ سکی...

"ہاں--- تو پھر کیا ہوا..... اس میں خرابی ہی کیا ہے... بہت سے لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں... میں ان سے کہنے کے لئے نہیں جاتی' کہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا کریں... وہ سب اپنی مرضی سے ہی تو آتے ہیں ...."

اجنبی عورت تو بس اپنی ہی ہانکے جا رہی تھی.....

"میں تجھے پھر بتا رہی ہوں کہ اس کا غبن پکڑا گیا ہے' اس نے اپنے دفتر سے پیسے صرف تیرے لئے چرائے ہیں' اس نے گناہ کیا ہے.... گناہ..... سن رہی ہے حرافہ...." یہ کہہ کر عورت پاشا کے قریب ہی تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گئی.....

"تم لوگوں کا تو کوئی اصول نہیں ہوتا.... لوگوں کو ٹھگنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ پر میں نہیں سمجھتی

کہ تو اتنی گئی گزری عورت ہے کہ تجھ میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہ ہو.... میں نکولائی کی بیوی ہوں.... اس کے بچے بھی ہیں' اگر اس کو غبن کیس میں سزا ہو گئی تو میں اور میرے بچے فاقوں سے مرجائیں گے.... خدا کے لئے سمجھنے کی کوشش کر.. ابھی بھی یک رستہ ہے.... اگر تو چاہے تو...... ہمیں اس ذلت اور تباہی سے بچا سکتی ہے......
اگر میں آج بھی نو سو روبل جمع کرا دوں تو میرا شوہر اس مقدمے سے بری ہو سکتا ہے' صرف نو سو روبل...."
عورت نے اپنی رام کتھا سناتے ہوئے کہا۔

"نو سو روبل......" پاشا نے دوبارہ پوچھا....

"مجھے ۹ سو روبل کے بارے میں کچھ علم نہیں' نکولائی نے مجھے اتنی رقم آج تک نہیں دی...." پاشا نے یقین دلاتے ہوئے بتایا....

"میں جانتی ہوں کہ تیرے پاس کوئی پیسہ نہیں اور نہ ہی مجھے تیرے پیسوں کی ضرورت ہے.... میں تو تجھ سے کچھ اور مانگ رہی ہوں...... مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تم جیسی عورتوں کو زیور گہنے خرید کر دیتے ہیں' بس مجھے وہ چیزیں واپس کر دے جو تجھے میرے شوہر نے تحفے میں دے رکھی ہیں....."

"محترمہ! اس نے مجھے کبھی کوئی زیور وغیرہ بنا کر نہیں دیا...." پاشا نے چیخ کر کہا اب وہ سارا معاملہ بھانپ چکی تھی۔

"وہ پیسے کہاں رکھے ہیں" اجنبی عورت نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پاشا سے پوچھا۔۔۔

"وہ اپنے' میرے اور دوسرے لوگوں کے پیسے کھا پی بیٹھا ہے.... اس لئے میں تجھ سے ہاتھ باندھ کے کہہ رہی ہوں.... میری بات پر توجہ کر..... میں جانتی ہوں میں نے غصے میں جانے تجھے کیا کچھ کہہ ڈالا ہے لیکن اب میں ہوش میں ہوں اس لئے میں تیری منت کرتی ہوں کہ اگر تجھ میں ذرا سا بھی رحم دوسروں کے لئے موجود ہے تو تو خود کو میری جگہ رکھ کے دیکھ.... تجھے احساس ہو جائے گا.... میں پھر کہتی ہوں کہ وہ سب چیزیں مجھے لوٹا دے جو تجھے اس نے خرید کر دی ہیں۔" اجنبی عورت کا لہجہ اب دھیما پڑ چکا تھا لیکن پاشا بھی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی...... کندھے اچکا کر بولی.....

"بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا' لیکن میں سچ کہتی ہوں مجھ پر خدا کی لعنت.... اگر میں جھوٹ بولوں...... اس نے مجھے کبھی آج تک کوئی تحفہ نہیں دیا..... خدا کے لئے مجھ پر اعتبار کریں......" پاشا کو معاً ایک خیال آیا اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں البتہ ایک مرتبہ وہ میرے لئے دو چیزیں لے کر آیا تھا' اگر آپ چاہیں تو میں وہ چیزیں آپ کو لوٹا سکتی ہوں....." یہ کہہ کر پاشا نے اپنی میز کا دراز کھولا اور اس میں سے سونے کا ایک ہلکا سا کنگن اور ایک انگوٹھی جس میں سرخ رنگ کا پتھر جڑا ہوا تھا' اس کے آگے لا کر رکھ دی...... یہ چیزیں دیکھ کر اجنبی عورت کے چہرے کا رنگ یوں بدل گیا جیسے کسی نے اس کی بے عزتی کر دی ہو......

"مجھے یہ کیا دے رہی ہے تو..... میں تجھ سے خیرات نہیں مانگ رہی...... اپنا حق مانگ رہی ہوں جو تو نے میرے شوہر سے ہتھیایا ہے.... سادہ لوح مردوں سے مال ہتھیانے کا فن تم عورتیں خوب جانتی ہو۔۔۔" اجنبی عورت نے غصے سے پھنکارتے ہوئے مزید کہا...... "پچھلی جمعرات کو جب میں نے تجھے اپنے شوہر کے ساتھ جاتے ہوئے رستے میں دیکھا تھا تو تو نے ہیروں کا ہار اور ایک قیمتی انگوٹھی پہن رکھی تھی.... میں تجھ سے کسی قسم کی قربانی نہیں مانگ رہی...... آخری بار کہہ رہی ہوں کہ مجھے میری وہ چیزیں واپس کر دے......"

"محترمہ! آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں.... " پاشا سے نہ رہا گیا.... "میں نے تو آپ کے دکھ کو محسوس کیا تھا میں آپ کو یقین دلا چکی ہوں کہ اس نے مجھے اس کنگن کے سوا کبھی کچھ نہیں دیا۔ یہ صرف کیک.... " پاشا .... ابھی اپنی بات مکمل نہ کرنے پائی تھی کہ عورت جھٹ سے بولی .... "کیک..... میرے گھر میں بچوں کے کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے اور تو یہاں بیٹھی کیک اڑا رہی ہے.... صاف کیوں نہیں کہتی کہ تو چیزیں دینے سے انکاری ہے.... " پاشا خاموشی سے اس کی ڈانٹ پھٹکار سن رہی تھی۔ اجنبی عورت پاشا کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر قریب پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور اس مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی.... وہ گہری سوچ میں غرق تھی... کہ اگر اسے ۹ سو روبل نہ ملے تو اس کے شوہر کو سزا ہو جائے گی۔ پھر میرا اور میرے بچوں کا کیا ہو گا.... اسے خیال آیا کہ کیا مجھے اس بازاری عورت کے قدموں پہ گر جانا چاہیے.... میں کیا کروں.... وہ آپ ہی آپ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی' کچھ نہ بن پڑا تو منہ پہ رومال رکھ کر زارو قطار رونے لگی.....

"میں تیری منت کرتی ہوں..... تو نے ہی میرے شوہر کو برباد کیا ہے' اس کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ اب تو ہی اس کو بچا سکتی ہے.... اگر تجھے اس پر رحم نہیں آتا تو میرے معصوم بچوں پر ہی ترس کھا .... ان معصوموں کو کس بات کی سزا مل رہی ہے.... " عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک بار پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالی' پاشا کو بھی اس عورت کے بچوں کا خیال ستانے لگا جو واقعی بھوک سے بلک رہے ہوں گے.....

"میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں.... آپ کا خیال ہے کہ میں ایک ظالم عورت ہوں' اور میں نے اس کو تباہ کیا ہے لیکن میں خدا کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ مجھے اس سے کبھی بھی کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا.... میرے ساتھ تھیٹر میں کام کرنے والی لڑکیوں میں سے صرف ایک "موجا" نامی لڑکی ہی ہے جس کی دوستی ایک مالدار شخص سے ہے باقی ہم سب تو یونہی گزارہ کر رہی ہیں۔ نکولائی شکل و صورت میں بہتر اور پہننے اوڑھنے کا سلیقہ رکھتا ہے اس لئے اس کے ساتھ میری دوستی ہے.... " پاشا نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا... لیکن نکولائی کی بیوی کچھ بھی سننے کے لئے تیار نہ تھی.....

"میں تجھے ان چیزوں کی واپسی کے بارے میں کہہ رہی ہوں.... رو رو کر فریاد کر رہی ہوں..... اگر تو کہے تو میں تیرے پیروں کو بھی ہاتھ لگانے کو تیار ہوں' خدا کے لئے... ہمارے حال پر مہربانی کر.... " پاشا اجنبی عورت کی دلخراش باتیں سن کر لمحے بھر کے لئے ٹھٹھک سی گئی.... اسے بڑی شدت سے احساس ہونے لگا کہ یہ موہنی شکل و صورت والی عزت دار عورت اپنا مان' اپنا بھرم پس پشت ڈال کر اس کے قدموں پر گرنے کے لئے بھی راضی ہے.... اس کا دل دہل گیا.....

"اچھا میں' آپ کو کچھ چیزیں دیتی ہوں..... " پاشا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا... "لیکن جو کچھ میں آپ کو دوں گی وہ مجھے نکولائی نے خرید کر نہیں دیں بلکہ دوسرے مردوں نے تحفے میں دی ہیں۔"

پاشا نے میز کا دراز کھولا تو اس میں سے ہیروں کا ہار' کچھ انگوٹھیاں اور کچھ دوسری قیمتی چیزیں اس کے حوالے کر دیں.....

"یہ سب چیزیں رکھ لیں..... لیکن یہ چیزیں مجھے آپ کے شوہر نے ہرگز نہیں لے کر دیں... پھر بھی انہیں لے لیں.... شاید اس سے آپ کا کچھ بن جائے.... " پاشا نے بڑے دکھ سے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا.....

"اگرچہ آپ ایک خوبصورت شکل و صورت کی مالک تھیں..... بہتر یہی ہو گا کہ اپنے شوہر کو اپنے قابو

میں رکھیں..... میں آپ کو پھر یقین دلاتی ہوں کہ میں اس کو یہاں نہیں بلاتی وہ خود میرے پاس آتا ہے....."

نکولائی کی بیوی نے آنسو بھری آنکھوں سے میز پر بکھرے زیورات کو دیکھا اور کہا.....

"بس صرف یہی.... " بازار میں ان کی قیمت تو ۵۰۰ روبل سے زیادہ نہیں ہو گی.... " عورت کی بات سن کر پاشا پھر میز کی جانب گئی اور دراز میں سے ایک سونے کے ڈائل والی گھڑی' قیمتی سگریٹ کیس' سونے کے بٹن اور کچھ اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کے آگے لا کر رکھ دیں....

"اب اس سے زیادہ میرے پاس کچھ اور نہیں ہے' یقین نہ آئے تو بے شک خود دیکھ لیں...." نکولائی کی بیوی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری' ساری چیزوں کو کانپتے ہاتھوں سے ایک رومال میں باندھا اور اٹھ کر چل دی.....

ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا' نکولائی باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے' یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آج اس نے بہت ساری شراب ایک ساتھ پی لی ہو.... اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک موجود تھی....

"نکولائی! تو نے مجھے کونسی چیزیں لا کر دی تھیں..... مجھے بتا..... خدا کے لئے ..... میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں...." پاشا پر ہذیانی کیفیت طاری تھی اور وہ ایک ہی بات بار بار دہرائے جا رہی تھی....

"چیزیں..... واہیات...." نکولائی نے حقارت سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا.... "اف میرے خدا.... میری بیوی اور تیرے آگے فریاد کر رہی تھی.... اس نے اپنے آپ کو اس قدر گرا لیا...." لیکن پاشا تو پاگلوں کی طرح سے ایک ہی سوال کئے جا رہی تھی....

"نکولائی ..... مجھے بتا..... وہ کون سی چیزیں تھیں جن کے بارے میں تیری بیوی بار بار مجھ سے سوال کر رہی تھی..... تو نے مجھے کبھی کوئی چیز لا کر دی ہے.... بتا....؟" پاشا چلاتے ہوئے بولی... لیکن نکولائی جیسے بہرہ ہو چکا تھا' وہ تو بس اپنی ہانکے جا رہا تھا...

"میرے خدایا! میری عزت دار گھر والی.... شریف النفس عورت.... آج تیرے پیروں کو ہاتھ لگا رہی تھی.... یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا.... میں ..... میں..... خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا...." وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا... اس نے آشا کی طرف حقارت سے دیکھا....

"حرافہ عورت.... دفع ہو جا..... میری عزت دار بیوی نے تیرے پیروں کو ہاتھ لگایا.... اف میرے خدا....."

یہ کہہ کر اس نے پاشا کو پرے دھکا دیا اور اس کی جانب دیکھے بغیر... باہر نکل گیا.....

پاشا بے جان حالت میں کرسی پر بیٹھی رہی' اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی.... اسے دکھ تھا کہ اس نے اپنے سارے زیور' نکولائی کی بیوی کو دے ڈالے پھر بھی حرافہ .... اور کم ذات ہی کہلائی.... اسے اپنے چاروں طرف دکھ ہی دکھ نظر آیا.... اسے یاد آیا کہ تین سال پہلے بھی کسی سیٹھ نے اسے بے سبب بہت مارا تھا.... یہ سوچتے ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

ڈورس لیسنگ / احمد صغیر صدیقی

پہلی ملاقات

اس روز کیتھرائن سے میں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں اپنے نوجوان دوست فلپ سے اس کی ملاقات کراؤں گی۔ ہمیں فلپ سے ملنے کے لیے اس کے سکول جانا تھا اور ہم نے گیارہ بجے کا وقت طے کیا تھا مگر کیتھرائن نو ہی بجے پہنچ گئی۔ اس کا نیلا لباس نیا لگتا تھا اس نے جوتے بھی نئے پہن رکھے تھے۔ وہ اس وقت ایک ایسی لڑکی لگ رہی تھی جسے زندگی سے بہت سی توقعات ہوں۔

کیتھرائن ایک سفید رنگ کے مکان میں رہتی ہے جہاں سے سامنے بہتے دریا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ کو صاف ستھرا رکھنے میں مدد دیتی رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چھوٹی رہائش گاہیں بڑے مکانوں کے مقابلے میں زیادہ رومانی ہوتی ہیں۔ ہم نے چائے پی اور ہماری گفتگو زیادہ تر فلپ کے اردگرد ہی گھومتی رہی جو ابھی صرف پندرہ سال کا تھا' مگر اس کا ذوق بہت عمدہ تھا اور وہ خصوصیت سے اچھی موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ کیتھرائن نے اس کے کمرے کو دیکھا۔ وہاں بہت سی کتابیں پڑی ہوئی تھیں اس نے کہا کیا وہ آئزک بیبل کی کہانیوں کی کتاب مستعار لے سکتی ہے۔ وہ اسے ٹرین کے سفر کے دوران پڑھنا چاہتی تھی۔ کیتھرائن کی عمر ابھی تیرہ برس ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ بیبل کی کتاب اس کے لیے ذرا مشکل ثابت ہو گی لیکن اس نے کہا۔۔۔

"فلپ انہیں پڑھتا ہے نا؟ تو پھر کیوں نہیں؟"

سفر کے دوران میں نے اخبار سنبھال لیا اور کیتھرائن نے بیبل کی کتاب کھول لی۔ گاہے گاہے میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے کتاب کے ورق الٹ رہی تھی جیسے کوشاں تھی کہ فلپ اسے کسی بھی طرح مسترد نہ کر سکے۔

اسکول پہنچ کر وہ دونوں ساتھ ہو گئے اور سبزہ زار پر ٹہلنے لگے۔ میں عقب میں تھی۔ یہ سکول بہت عمدہ اور مہنگے قسم کا تھا۔ سورج کی روشنی ان کے سروں اور چہروں پر پڑ رہی تھی۔ کیتھرائن نے بائیں ہاتھ میں بیبل کی کتاب دبا رکھی تھی۔

لنچ کے بعد ہم تصویریں دیکھنے گئے۔ پہلے تو فلپ نے تبصرہ کیا اور کہا۔ "انہیں تفریحاً" تو دیکھا جا سکتا ہے لیکن یہ ذہین افراد کے کام کی نہیں ہوتیں۔ بالآخر ہم نے ایک ایسی فلم کو منتخب کیا جو شہر میں دکھائی جا رہی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ یہ فلپ کو بھی پسند آئے گی۔ یہ ایک پادری کے بارے میں تھی جو مجرموں کو سدھارنے کا کام کرتا تھا۔ مگر باوجود کوشش کے وہ ایک شخص کو پھانسی کی کرسی تک پہنچنے سے نہیں بچا سکا۔ اس فلم کو دیکھتے ہوئے کیتھرائن نے رونا شروع کر دیا۔ جب ہم دراوزے سے نکل رہے تھے تو گیٹ کیپر نے کیتھرائن کو روتے دیکھ کر اسے بازو سے پکڑ لیا اور بولی۔ "بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ وہ مجرم تھا' اسے سزا تو ملنی ہی تھی۔"

کیتھرائن بھونچکی سی اسے دیکھ رہی تھی' تب فلپ نے اس کی مدد کی اور گیٹ کیپر سے بولا "کچھ لوگ صحیح اور غلط

کی تمیز نہیں رکھتے" اور اسے گیٹ کیپر سے چھڑا کر چل پڑا۔ یہاں سے ہم اسٹیشن گئے۔ دونوں بچے خاموش تھے شاید دنیا کی سفاکی نے ان پر اثر ڈالا تھا۔

بالآخر کیتھرائن نے ایک سسکی کے ساتھ کہا۔۔۔ "یہ سب کس قدر اذیت ناک تھا۔ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اور فلپ نے کہا۔۔ "پھر بھی ہمیں اس پر سوچنا چاہئے۔ اگر ہم نے نہیں سوچا تو یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہ سکتا ہے۔"

واپسی کے سفر میں میں کیتھرائن کے نزدیک تھی۔ اس نے ببیبل کی کہانیاں کھول رکھی تھیں۔ پھر وہ بولی۔ "یہ فلپ بہت خوش نصیب ہے۔ کاش میں بھی اس کے سکول میں ہوتی۔ تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا جو اس سے باغیچے میں ملی تھی اور اسے ہیلو کہا تھا۔ میرا خیال ہے دونوں میں اچھی دوستی ہے۔ کاش ویسا لباس میرے لئے بھی ہوتا۔"

"مگر مجھے تو وہ لباس اس کے لیے موزوں نہیں لگا تھا کہ اس کی عمر کے لیے یہ لباس مناسب نہ تھا۔"

"واقعی؟"

اس نے کہا۔ اور پھر کہانیاں پڑھنے لگی۔ مگر فوراً ہی اس نے سر اٹھایا اور بولی۔۔ "کیا یہ کوئی بہت مشہور مصنف ہے؟"

"بہت مشہور اور بہت اچھا رائٹر۔"

"کیوں؟"

"سب سے اہم بات اس کی سادگی ہے۔ چند لفظوں میں بڑی باتیں کہہ جاتا اور اس کی کہانیاں طاقتور ہوتی ہیں۔"

"میں سمجھ گئی' کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"نہیں' اس کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ مگر تم تو اس طرح بتا رہی تھیں' میں سمجھی یہ زندہ ہے۔"

"ویسے میں اسے مردہ نہیں سمجھتی۔"

"اس کا انتقال کب ہوا تھا؟"

"اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی سال پہلے۔"

"اسی سال" اس نے کہا۔ "میں نومبر کے مہینے میں چودہ سال کی ہو جاؤں گی۔" مگر اس نے کہا۔۔۔ "تم نے بتایا اسے قتل کر دیا گیا تھا۔"

"ہاں۔"

"میرا خیال ہے جس نے اسے مارا ہو گا اسے افسوس ضرور ہوا ہو گا۔ ایک مشہور مصنف کو مار کر افسوس ہونا قدرتی بات ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"اپنی موت کے وقت کیا وہ بوڑھا ہو چکا تھا؟"

"نہیں۔ جوان ہی تھا"

"کس قدر بدنصیبی کی بات ہے۔" رک کر وہ بولی۔ "اس میں سب سے اچھی کہانی کون سی ہے؟"

میں نے اسے اس کہانی کے بارے میں بتایا جس میں ایک بطخ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ کہانی کو آہستہ آہستہ پڑھنے لگی۔ میں انتظار کرنے لگی اور سوچتی رہی کہ اچھا ہوتا کہ یہ آئزک بیبل سے محفوظ رہتی۔ میں کسی طرح اسے بیبل کے اثرات سے بچا سکتی۔

کہانی پڑھ کر اس نے کہا۔۔۔ "میں نے پڑھ لیا' کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ بیبل واقعات کو عجیب زاویئے سے دیکھنے کا عادی لگتا ہے۔ اب بتاؤ بھلا جوتوں میں کسی مرد کے پیر عورت کے پیر کیوں کر لگ سکتے ہیں؟ اس نے کتاب میری طرف سرکا دی۔ "میرے خیال میں یہ ساری باتیں مایوس کن ہیں۔"

میں نے محسوس کیا وہ ان باتوں کا اثر نہیں لے رہی ہے۔ میں نے کہا۔۔۔ "کیتھرائن' جب تم ذرا بڑی ہو جانا تو اسے پھر پڑھنا۔ تب تمہیں یہ اچھا لگے گا۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "فلپ مجھ سے دو سال بڑا ہے۔ ہے نا؟"

"ایک ہفتے بعد۔۔۔ مجھے کیتھرائن کا ایک خط موصول ہوا۔

"تم نے مجھے فلپ سے ملایا۔ تمہارا بہت شکریہ۔ وہ دن میرا بہت عمدہ دن تھا۔ میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں۔ میں مسلسل اس فلم کے بارے میں سوچتی رہی ہوں جس میں ایک بدمعاش کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ پھانسی کی سزا بہت غلط بات ہے۔ اسے منسوخ ہونا چاہیے۔ میں وہ باتیں بھی یاد کرتی رہی ہوں جو تم نے بیبل کے بارے میں کہی تھیں۔ وہی مشہور روسی ادیب بیبل۔ بلاشبہ میرا بھی اب یہی خیال ہے کہ اس کی سادگی ہی اسے ایک بڑا ادیب بناتی ہے۔ میں اپنے سکول میں' سادہ تحریر لکھنے کی مشق کر رہی ہوں۔

محبتوں کے ساتھ کیتھرائن۔

مکرر۔۔ فلپ نے میری پارٹی کے بارے میں کچھ کہا؟ میں نے اسے خط لکھا تھا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ ذرا پوچھنا وہ پارٹی میں آ رہا ہے یا خط کی طرح اسے بھی بھول گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ ضرور آئے۔ سوچتی ہوں اگر وہ نہ آیا تو میں مرجاؤں گی۔

مزید مکرر۔۔۔ پلیز' اس کو یہ بات مت بتانا۔ اگر اسے اس کا پتا چل گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔۔

(محبتوں کے ساتھ کیتھرائن)

مارکو دینیوی / احمد صغیر صدیقی

پر

ٹڈیوں اور جھینگروں کے مقابلے میں (جنہیں گانے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا اسی لئے ان کی نسل اب ناپید ہو چکی تھی) چیونٹیوں نے ابتدا ہی سے ایسا عمل اختیار کیا تھا کہ وہ ایک ترقی یافتہ سماج کی حامل کہی جا سکتی تھیں اور ترقی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ جب شروع ہوتی ہے تو پھر مشکل ہی سے رکتی ہے۔ اور پھر ہوا یوں کہ چیونٹیوں نے ایک بے سقم اور مکمل نظام حاصل کر لیا۔

اس ضمن میں مصنوعی سبزے کی ایجاد نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور اس کے لئے انہوں نے اپنے کارکنوں کو (جو گونگے بہرے اندھے بے خبر اور بے دماغ تھے) ایک کوٹھری میں بند کر دیا تھا جو روشنی سے عاری تھی اور جہاں لاروا کا ایک ڈھیر رکھا تھا جس میں سے ابھی کوئی چیز نہیں نکلی تھی۔ انہوں نے اس سے ایک ایسا مادہ وضع کیا تھا جو اپنے رنگ ' بو اور ذائقے میں بالکل قدرتی سبزے جیسا تھا۔ اس دریافت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس کی پیداوار کے لئے انہیں بلوں سے باہر نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گویا اس طرح انہوں نے بس ایک ہی جھٹکے میں ایسے تمام عناصر کا خاتمہ کر دیا تھا جو ترقی کی راہ میں مزاحم ہو رہے تھے۔

چیونٹیاں اب قدرتی اصولوں کی محتاج نہیں رہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر طرح خود کفیل ہو گئی تھیں۔ انہیں اب بل تک بنانے کی احتیاج نہیں رہی تھی۔ جو بل تھے بس انہیں کو کشادہ کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ ان کی آبادی بڑھ رہی تھی۔ وہ نہ رکنے والے انداز میں کام کر رہی تھیں اور ان بلوں کا جال زیر زمین سرنگوں اور گیلریوں اور شاخوں میں پھیل رہا تھا۔ کمرے بڑھ رہے تھے ہزاروں راہداریاں اسٹوروں اور ذخیرہ گاہوں سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس طرح بالآخر ایک بہت ہی بڑی رہائش گاہ وجود میں آ گئی تھی اسے ایک عظیم ترین بل کہا جا سکتا تھا اور اس عظیم بل پر صرف ایک عدد چیونٹی کی حکمرانی تھی۔ جو "عظیم چیونٹی" کے نام سے جانی جاتی تھی یہ کام بلا جدوجہد کے نہیں ہوا تھا لیکن آخر میں اسی عظیم چیونٹی کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس نے ہر طرف بکھرے ہوئے دوسری چیونٹیوں کے بلوں کو اپنے میں شامل کر لیا تھا۔ اور "اتحاد" کا قانون بنا دیا تھا تمام قومیتوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا اور ان کے ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔

ایک اور بات تھی۔ چیونٹیوں کو بڑی سختی کے ساتھ اس عظیم بل سے باہر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ باہر جانے پر مکمل پابندی تھی۔ وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔ کیونکہ عظیم چیونٹی نے (اس سے اس کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے) حکم دے دیا تھا کہ بل سے باہر نکلنے کے ہر راستے کو مدور کر دیا جائے تاکہ کوئی بھی چیز (زلزلے کی بات اور تھی) نمودار ہو کر اس مملکت کے امن کو تہ و بالا نہ کر سکے۔ اس طرح دو تین نسلوں کے گذرنے کے بعد چیونٹیاں ساری دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئیں۔ وہ بس یہی سمجھنے لگیں کہ عظیم بل ہی دنیا ہے اور بس۔ یہ صحیح ہے کہ پرانی چوکیدار چیونٹیوں میں سے جو دو چار زندہ رہ گئی تھیں انہیں کچھ کچھ باتیں یاد تھیں

(حالانکہ چیونٹیوں کی یادداشت اچھی نہیں ہوتی) کہ کبھی ایک ایسا وقت ہوا کرتا تھا جب انہیں عظیم بل سے نکل کر خوراک کی تلاش کرنی پڑتی تھی۔ ان پر جب ماضی کی یادوں کا دورہ پڑتا تھا تو یہ بھٹکتی ہی چلی جاتی تھیں۔

"نوجوان چیونٹیو!" یہ کہتی تھیں۔ "تم کیا جانو ہمارے زمانے میں زندگی کتنی مشکل تھی۔ وہ زمانے بڑی سخت جدوجہد کے تھے۔ لیکن ہم خوش تھیں اور ہمیں کوئی شکایت نہ تھی۔" یہ جملے سنتے ہی نوجوان چیونٹیوں کی سمجھ میں آجاتا تھا کہ یہ ایک تمہید ہے اب انہیں ماضی میں انجام دیا جانے والا کوئی بڑا کارنامہ سنایا جائے گا۔ مثلاً" ایک بھونرے کی دریافت کا قصہ۔ یا ان چیونٹیوں کا قصہ جو اس بڑی سی لاش کو پورے دو دن اور دو راتیں گھسیٹتی رہی تھیں اور راستے میں موجود بے شمار خطرات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے بالآخر اسے بل کے اندر لے ہی آئی تھیں۔ اس لاش کو لانے والے ہیرو تعداد میں چار تھے۔ اور وہ جب گیٹ پر پہنچے تھے تو تھکن ان پر اسقدر غالب آچکی تھی کہ تین ہیرو وہاں پہنچتے ہی مرگئے تھے۔ (تین ہیرو ورکر مرگئے تھے لہٰذا ان کے سردار نے یعنی چوتھے ورکر نے اپنی عزت کی خاطر خودکشی کرلی تھی) اور یہ پرانی اور بوڑھی چیونٹیاں کہتی تھیں۔ "تو بچو! یوں کرتے تھے ہم کام"

مگر اب ساری پرانی' چیونٹیاں مرچکی تھیں۔ اور نوجوان چیونٹیوں کے لئے یہ کہانیاں روائتی داستان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں بلکہ بعض چیونٹیاں تو ان کی سچائی پر بھی شبہ رکھتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تازہ نسل کے لئے بہت سے پرانے الفاظ اپنے معنی بھی کھو چکے تھے مثلاً" 'بارش 'گرمیاں 'بھونرے 'وغیرہ الفاظ سے وہ واقف تو تھیں مگر انہیں ان کے بارے میں کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ پھر ایک نسل اور گذری اور روایتی باتوں کا بالکل ہی خاتمہ ہوگیا۔ اب یہ حال تھا کہ چیونٹیوں کے درمیان صرف برین واشنگ سنتھیٹک سبزے اور اسی قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ پرانے دور کے کچھ الفاظ اگر وہ استعمال بھی کرتی تھیں تو وہ صرف استعاراتی طور پر مثلاً" دن کا ذکر صرف مصنوعی روشنی کی تیزی کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ عظیم بل روشن کیا جاتا تھا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ چار نسلیں گذرنے کے بعد چیونٹیوں کے ذہن سے ماضی بالکل نکل گیا تھا۔ جسے وہ ترقی کی راہ کا ایک روڑہ سمجھتی تھیں۔

اسی نئے دور کے ایک دن کا ذکر ہے کہ یہاں ایک غیر معمولی بات ہوئی۔

ہوا یوں۔ کیسے ہوا اس کا کچھ پتا نہیں۔ کہ ایک چیونٹی راہداریوں کی بھول بھلیوں میں راہ کھو بیٹھی تھی اور مسلسل کوشاں تھی کہ صحیح رستہ' ڈھونڈھ لے۔ یہاں ہر طرف اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ وہ ایک ایسی سرنگ کے پاس تھی جو تباہ ہو چکی تھی تو اسے اس کے اختتام پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی تو وہ ادھر بڑھی' وہ سخت پریشان تھی (چیونٹیوں کے لئے تنہائی دہشت ہوتی ہے) بڑی احتیاط سے وہ روشنی کے مخرج کی سمت بڑھی۔ قریب پہنچنے پر اسے پتا چلا کہ یہ باہر جانے کا کوئی راستہ ہے۔ روشنی باہر ہی سے آرہی تھی۔ غالباً" ورکر اس راستے کو مدور کرنا بھول گئے تھے یا پھر کوئی اور وجہ ہوئی کسی کو پتہ نہ تھا اس کا۔ چیونٹی نے دھڑکتے دل کے ساتھ راستے کی طرف دیکھا۔ پھر تجسس سے مغلوب ہو کر وہ باہر آگئی۔

اس نے خود کو عظیم بل سے باہر پایا۔

پھر اس نے قدم بڑھائے اور اسی طرح کی کیفیت محسوس کی جیسے وہ سوتے میں چل رہی ہو۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

اس نے جو کچھ دیکھا۔ اسے بیان کرنے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ

باغیچہ کیا ہوتا ہے' رات کیا ہوتی ہے' چاند کیا ہوتا ہے پانی کیا ہوتا ہے' گلاب کسے کہتے ہیں۔ اور اب اس کے سامنے ایک باغ تھا جو پورے چاند کی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے چاند کو دیکھا وہ اسے ایک بہت بڑی چیونٹی جیسا لگا مگر یہ گول اور زرد سا تھا۔ اس نے ستاروں کو دیکھا۔ اس نے گھاس دیکھی جو شبنم سے نم تھی۔ اس نے ایک گلاب دیکھا جس کی مہک فضا میں گھل رہی تھی۔ اس نے ایک مجسمہ دیکھا اور اسے بڑی حیرانی ہوئی جب اس نے جھینگر کی آواز سنی۔

چیونٹی اپنی جگہ ٹھٹک کر اسے سننے لگی۔ پھر وہ گھبرا کر بھاگی' کنکروں پر سے' گھاس پر سے' وہ ادھر ادھر دوڑنے لگی' پاگلوں کی طرح۔

"اے خدا۔" اس نے سسکارہ بھرا۔ "آہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور کس قدر خوب صورت ہے۔ بالکل پاگل کردینے والا..." وہ بہت ساری چیزیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اور چیزیں جو یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں محسوس کرنا چاہتی تھی۔ انہیں پینا چاہتی تھی۔ خوشبو اسے مست کر رہی تھی۔ رات کی آوازیں اس کے کانوں میں گیت گھول رہی تھیں۔ وہ جھینگروں کی صدائیں سنتی رہی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ مرجائے گی۔

وہ بار بار کہہ رہی تھی -- "آہ.... یہ سب کچھ کتنا خوبصورت ہے' ناقابل برداشت حسن..."

وہ اب گھاس میں رینگ نہیں رہی تھی پھدک رہی تھی کبھی وہ مجسمے پر چڑھتی تھی کبھی فوارے پر۔ دفعتہ" اسے اپنی بہن کا خیال آیا اور وہ ہنسنے لگی۔ "غریب" وہ بڑبڑائی "زیر زمین غار میں رہنے والی مصنوعی خوراک پر پلنے والی" اس نے سوچا۔ وہ واپس جائے گی اور سب کو بتائے گی کہ اس نے باہر کیا کیا دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ تب چیونٹیاں اپنے مقبرے سے نکل آئیں گی اور دوبارہ کبھی اس میں نہیں جائیں گی۔ (نہ جانے وہ کون تھا جس نے انہیں مقید کرنے کا حکم دیا تھا)

وہ بڑی تیزی سے چلی کودتی پھاندتی ہوئی۔ اسے اب عظیم بل کے راستے کی تلاش تھی۔ اس سوراخ کی جس میں سے وہ باہر آئی تھی۔ وہ یہیں کہیں تھا۔ وہ بہت عرصے تک اسے ڈھونڈھتی رہی اور بالآخر ایک روز اس نے اسے پا ہی لیا۔ اندر جا کر وہ برباد شدہ کھنڈروں سے گذری پھر وہ انہی راہداریوں میں پہنچ گئی جہاں اس کا راستہ گم ہوا تھا۔ یہ راہداریاں غیر آباد تھیں اس کا سر چکرا رہا تھا۔ باہر کی فضا سے وہ آئی تھی اسے اندر کا حال بہت ہی برا لگا اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ چلتی رہی' نڈھال اور زخمی' راہداریاں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر وہ تھکن سے چور ہو گئی اور اس نے ایک جگہ سر ڈال دیا اور ساکت ہو کر پڑ گئی۔ اسی لمحے اس نے کچھ آوازیں سنیں۔

چیونٹیوں کا ایک جتھا آپس میں بحث کر رہا تھا۔ موضوع تھا صنعتی میدان میں خود کار ترقی کا۔ دفعتہ" انہیں اپنے عقب میں کچھ چاپیں سی سنائی دیں۔ وہ سب کی سب مڑیں اور خوف سے لرز کر رہ گئیں۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک عفریت بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایسی کوئی مخلوق تھی جو دہشت ناک خوابوں سے نکلی تھی۔ اس کا جسم بہت حد تک چیونٹیوں جیسا ہی تھا مگر اس کے بدن میں بہت سی نئی باتیں موجود تھیں۔ مثلاً" یہ جسم سیاہ یا بھورا نہ تھا بلکہ سنہرا تھا۔ اسی طرح اس کے سر کی ساخت میں بھی کچھ تبدیلیاں تھیں اور اس کا بدن' پناہ بخدا' یہ کم از کم چار عدد چیونٹیوں کے برابر تھا۔ اور اس کی پیشانی پر جو انٹینا تھے وہ بھی چیونٹیوں کے مقابلے میں زیادہ لانبے تھے۔ یہاں تک تو خیر کوئی بات نہ تھی سب سے دہشت ناک بات یہ تھی کہ

اس مخلوق کی پشت پر بہت سی رگیں آپس میں جڑ کر کسی پنکھ کی طرح اوپر اٹھ گئیں تھیں اور یہ پنکھ یا بازو آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ان کی جسامت اس کے بدن سے کئی گنا تھی۔ اس کے رنگ عجیب تھے۔ نیلے زرد اور قرمزی، خصوصیت سے قرمزی رنگ بہت نمایاں تھا۔ یعنی پاگل پن کا رنگ۔

پھر چیونٹیوں کے اس جتھے نے ذرا بھی تذبذب کے بغیر یلغار کی۔ اور اس عفریت پر ٹوٹ پڑا اور اسے مار ڈالا۔

وہ شئے جسے چیونٹیوں نے عفریت سمجھا تھا۔ وہی چیونٹی تھی جو اتفاق سے اپنے عظیم بل سے باہر نکل گئی تھی۔ باہر کی فضا نے اس کے جسم پر کچھ کیمیائی اثرات مرتب کئے تھے اور وہ تومند ہو گئی تھی۔ مگر تنومندی کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی، اس کے ساتھ مشکل یہ ہوئی تھی (جو اس کی موت کا سبب بنے) کہ اس کے پر نکل آئے تھے۔

گریگوریولوپینز فو آنتے / اعجاز احمد فاروقی

خدا سے خط و کتابت

اس وادی کا واحد مکان ایک چھوٹی سی چٹان کے اوپر بنا ہوا تھا اس بلند جگہ پر کھڑے ہو کر کوئی بھی کھیتوں سے آگے بہتے ہوئے دریا مٹر اور چنے کے کھیتوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا یہ کھیت بڑی عمدہ فصل دیتے تھے اور اب جس چیز کی ان کھیتوں کو اشد ضرورت تھی وہ بارش تھی یا کم از کم اس کا ایک زوردار اور بھرپور چھینٹا تھا۔

لین شو اپنی زمین اور کھیتوں کے چپے چپے سے واقف تھا اس نے آج صبح سے اس کے ماسوا کوئی کام نہیں کیا تھا کہ آسمان کے شمالی مشرقی حصے کو مسلسل دیکھے جارہا تھا پھر اس نے کہا۔

"بی بی میرا قیاس ہے کہ بارش ہو گی"

بی بی جو ظہرانہ تیار کر رہی تھی اس نے یہ سن کر جواب دیا

"ہاں بارش ہو سکتی ہے اگر رب چاہے تو......."

اس وقت بڑی عمر کے لڑکے تو کھیتوں میں کام کر رہے تھے اور چھوٹی عمر کے لڑکے بالے مکان کے نزدیک کھیل رہے تھے۔ بی بی نے انہیں آواز دی۔

"آجاؤ' سب آجاؤ' کھانا تیار ہے۔"

اور جب سب مل کر کھانا کھا رہے تھے تو جیسا کہ لین شون نے قیاس آرائی کی تھی کہ بارش ہو گی اب واقعی بارش ہونے لگی تھی۔ اس کے گول گول اور موٹے موٹے شفاف قطرے زمین پر برس رہے تھے اور آسمان کے شمال مشرق کی جانب سے بادلوں کے پہاڑ چلے آرہے تھے۔ ہوا بھی تازہ اور تیز تھی۔ ایسے میں مرد باہر کھیتوں میں نکل گیا۔ اس کی اس ہنگامی چہل قدمی کی غایت اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ بارش سے پیدا ہونے والی ترنگ کو اپنے تن من میں رواں دواں دیکھے۔ اور پھر جب وہ اس چہل قدمی سے واپس آیا تو اس نے بڑی جذباتی اور جوشیلی آواز میں کہا۔

"جو کچھ اس وقت آسمان سے برس رہا ہے وہ بارش کے قطرے نہیں بلکہ سکے ہیں۔ بڑے قطرے اٹھنیاں ہیں اور چھوٹے قطرے چونیاں ہیں"

پھر اس نے بڑے مطمئین احساسات کے ساتھ یہ بھی کہا کہ غلے کے کھیت اور مٹر کے نورستہ پھول بارش کی چادروں میں لپیٹ کر بہت خوش ہیں۔ ابھی اس نے یہ کہا ہی تھا کہ یکبارگی ایک تند و تیز آندھی اٹھی اور پھر بارش کے ساتھ ژالہ باری ہونے لگی۔ اولے واقعی چاندی کے گول گول ڈلوں سے مشابہ تھے۔ بچوں نے

جو یہ منظر دیکھا تو وہ لپک کر اندر سے باہر آ گئے اور منجمد آبی موتی چننے میں جٹ گئے۔ بچے خوش لیکن ان کا باپ متفکر ہو گیا وہ محسوس کرنے لگا اور اپنے آپ سے کہنے لگا کہ "اب تو معاملہ بگڑنے لگا ہے" لیکن پھر بھی مجھے توقع ہے کہ یہ سب کچھ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور ہوا یہ کہ سب کچھ بہت جلد ٹھیک نہیں ہوا اور بہت دیر تک پورا گھنٹہ ' کھیتوں ' مکانوں ' پہاڑیوں اور وادیوں میں ژالہ باری ہوتی رہی' اولے گرتے رہے زمین تو ایسے سفید ہو گئی' جیسے اس پر نمک کی چادر بچھا دی گئی ہو۔ درختوں کی شاخیں بالکل ٹنڈ منڈ ہو گئیں۔ ان پر گنتی تک کا ایک پتہ بھی نہیں رہا۔ غلے کے کھیتوں کا ستیاناس ہو گیا تھا مٹر کے بیل دار پودوں کے نورستہ پھول ٹوٹ پھوٹ گئے تھے' لین شو کی روح قید خانہ غم میں مقید ہو کر رہ گئی تھی پھر اس نے اپنے بیٹوں سے کہا۔

"اگر ان کھیتوں پر ٹڈی دل نے بھی حملہ کیا ہوتا تو بھی ہمارے پاس اس سے تو بہت زیادہ بچ رہا ہوتا لیکن اس ژالہ باری نے تو ہمیں مطلق مفلس اور قلاش کر دیا ہے۔ اس سال کے لئے نہ تو ہمارے پاس غلہ ہے اور نہ ہی سبزی ...."

آئندہ شب ایک شدید شب غم تھی۔

"ہماری تمام محنت اکارت گئی"

"اس وقت کوئی نہیں ہے جو ہماری دستگیری کر سکے"

"اس سال تو ہمیں فاقے پہ فاقے کرنا ہوں گے"

اس نوعیت کے کڑوے حقائق سمجھ لینے کے باوجود ' وہ تمام لوگ جو وادی کے اس واحد مکان میں رہتے تھے وہ سب اپنے قلوب میں ایک ناقابل شکست امید لئے بیٹھے تھے اور ایک امداد ربانی پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔

"دل چھوٹے مت کرو ہمت مت ہارو"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سب کچھ تباہ ہو گیا ہے لیکن یاد رکھو بھوک سے کوئی نہیں مرتا"

"یہ تو محض محاورہ ہے کہ بھوک سے کوئی نہیں مرتا"

تمام لین شو کے خیالات اپنی واحد امید ' امداد ربانی کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ اس کو رب کریم کے بارے میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ علیم اور خبیر ہے اور انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے راز جانتا ہے۔

لین شو آدمی کے روپ میں ایک بیل تھا اور اگرچہ وہ اپنے کھیتوں میں تنومند جانوروں کی طرح ہی کام کرتا تھا تاہم اس کو لکھنے پڑھنے کی بھی کچھ نہ کچھ شدہ بدھ تھی۔ آئندہ اتوار تک اس نے اپنے آپ کو اس امر کا ایک پختہ اور کامل یقین دلا دیا کہ ایک نگران اور محافظ روح موجود ہے۔ اس یقین کے بعد اس نے ایک خط لکھنا شروع کیا اور اس کا ارادہ تھا کہ اس کو شہر جا کر ڈاک کے سپرد کر دے۔

یہ خط خدا کے نام تھا۔

"یا ربی"

اس نے خط لکھنا شروع کیا۔

اگر اس گھڑی تو نے میری مدد نہیں کی تو میں اور میرا کنبہ اس سال فاقوں کا شکار ہو جائیں گے اس وقت مجھے ایک سو روپوں کی اشد ضرورت ہے تاکہ میں کھیتوں کا حلیہ دوبارہ ٹھیک کر سکوں اور ان میں بوائی کر سکوں'

اور نئی فصل کی کٹائی تک زندہ بھی رہ سکوں کیونکہ ژالہ باری نے......."

لفافے پر اس نے یہ الفاظ لکھے

"یہ خط خدا کو ملے"

اس کے بعد اس نے لفافے کو خوب اچھی طرح بند کیا اور ایک غمگین دل کے غمگین احساسات کے ساتھ شہر کی طرف چل دیا۔ ڈاک خانے سے اس نے ٹکٹ خریدے انہیں لفافے پر چسپاں کیا اور لفافہ سپرد ڈاک کردیا۔ اس ڈاک خانے کے ایک پرانے ڈاکیے نے جو خطوں کی تقسیم کے ساتھ ان کی چھنائی کا بھی کام کیا کرتا تھا ہنستے ہوئے یہ لفافہ اپنے افسر کو پیش کردیا۔ اپنی ساری ملازمت کے دوران اس نے اس پتے پر کبھی بھی ڈاک نہیں پہنچائی تھی۔ پوسٹ ماسٹر ایک موٹا اور مرنجاں مرنج قسم کا آدمی تھا کہ وہ بھی اس ملفوف کو دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگا' لیکن اچانک قہقہوں کے درمیان وہ یکبارگی خاموش' سنجیدہ اور پر سکون ہو گیا اس وقت اس نے لفافہ میز پر رکھا اور کہنے لگا۔

" واہ' واہ کیا ذی شان ایمان ہے' کاش کہ مجھے بھی اس خط کے راقم جیسا ایمان نصیب ہوتا اور میں بھی ایسی ہی پریقین امید کا مالک ہوتا۔ کیا بات ہے اس لکھنے والے کی جس نے ایک پختہ امید پر خدا سے خط و کتابت شروع کردی ہے۔ واہ' واہ"

پھر اس نے اپنے تئیں یہ سوچا کہ ایسے ذی شان ایمان اور امید کو پاش پاش کرنا ایک اچھا کام نہیں ہے۔ اس لئے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ خط پڑھا جائے اور پھر اس کا جواب دیا جائے۔ اس لئے اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھا تب اس کو اندازہ ہوا کہ اس خط کا جواب' کاغذ' قلم' دوات' روشنائی اور دردمند نیک دلی سے کچھ زیادہ کا طلب گار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی سوچ اور بات پر قائم ہی رہا۔ اس نے اپنے ماتحت ملازمین کو ساری بات بتا کر ان سے چندے کی درخواست کی اور خود بھی ایک اچھی خاصی رقم حسب توفیق پیش کی۔ اس کے عملے نے بھی اس کار خیر میں حسب توفیق ہاتھ بٹایا۔

اب جس قدر رقم' لین شو نے طلب کی تھی اتنی توجمع نہ ہو سکی تاہم اس کے نصف سے کچھ زیادہ اہتمام تو ہو ہی گیا۔ پوسٹ ماسٹر نے تمام نوٹ ایک لفافے میں بند کئے پھر اس پر لین شو کا پتہ تحریر کیا' لفافے میں ایک چھٹی بھی لکھ کر ڈالی جس پر فقط "اس قدر دستخطا" رقم تھا۔

"خدا"

اگلے اتوار کو پھر لین شو بذات خود ڈاک خانے میں آیا اور پوچھا کہ آیا اس کے نام کوئی خط پتر آیا ہے یا نہیں۔ پوسٹ ماسٹر نے لین شو کا خط بذات خود اس کے حوالے کیا اور پھر اپنے اندر ایک ایسے آدمی کے احساسات طمانیت محسوس کئے جس نے کوئی کار خیر سرانجام دیا ہو۔ اس کے بعد وہ دروازے کی درز سے لین شو کی کیفیات دیکھنے لگا وہ دیکھ رہا تھا کہ نوٹ پا کر لین شو کو کوئی حیرت نہیں ہوئی ہے۔ اس کو تو جیسے اس امر کا پختہ یقین تھا کہ یہ رقم تو اس کو ملنے ہی والی ہے۔ پھر جب اسنے رقم گن لی تو بگڑ گیا اور بگڑ کر بڑبڑانے لگا اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔

" خدا نے تو ہرگز ایسی غلطی نہیں کی ہوگی اور نہ ہی اس کے پاس اس چیز کی کمی ہے

جو کچھ میں نے اس سے طلب کیا ہے وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر دے سکتا ہے"

پھر کچھ سوچ کر ڈاک خانے کی کھڑکی پر گیا اور کاغذ قلم طلب کیا اور پھر خط لکھنے کے لئے پبلک میز پر بیٹھ گیا

اس کی پیشانی پر ابھرنے والی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ جملے بنانے کے لئے اپنے ذہن کو بری طرح ٹٹول رہا ہے۔
اسی کیفیت کے ساتھ اس نے خط بمشکل ختم کیا اور خط ختم کر کے اسے لفافے میں اچھی طرح دیکھ بھال کے بند کیا اور پھر ٹکٹ خریدا اور اس کو ایک فیصلے اور زوردار کے کے ساتھ بند کیا۔
پھر جیسے ہی خط لیٹر بکس میں گرا تو ڈاکئیے نے فی الفور اسے نکال لیا پڑھا اس میں لکھا تھا۔

یار بی

جو رقم میں نے طلب کی تھی اس میں سے مجھے صرف ستر روپے ہی ملے ہیں۔ باقی رقم بھی فوراً" روانہ کریں۔ مجھے اس کی شدید ترین ضرورت ہے لیکن اب باقی رقم بذریعہ ڈاک مت روانہ کریں' اس لئے کہ اس ڈاک خانے کے ملازمین بے ایمانوں اور بددیانتوں کا جتھہ ہیں۔

لین شو

حسین علی حسین / عبداللہ جان عزیز

بید کی کرسی

میں بالکونی سے ہر چیز دیکھ رہا تھا۔ سگرٹوں کا پیکٹ میرے پاس پڑا ہے۔ پرانے اخبارات میز پر پرانے کپڑوں کی مانند ڈھیر کی صورت میں پڑے ہیں۔ چائے کی پیالی ٹھنڈی ہے اور پپڑی اس میں چپکی ہوئی ہے۔ بوڑھا شخص باہر زمین پر ڈھیر بنا اپنے عصا سے مبہم چیزوں کی خط کشی کر رہا ہے اور بچے جیسی دلپسند ہنسی ہنس رہا ہے۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پاگل پنے کی صورت اپنی بید کی کرسی کو ہلانے لگا۔ میں ڈرا یہ کہیں پھسل نہ جائے تو میں نے اسے ہلانا جلانا چھوڑ دیا۔ میں نے چائے کی پیالی پی اور اس میں آخری بقایا بھی سرک گیا۔ میں نے باہر کی ہوا کی ضرورت محسوس کی ہلکہ اور زیادہ ٹھنڈی تیز ہوا کی' تو میں نے بالکونی سے گردن باہر نکالی' اب خطوط بجھ چکے تھے اور بوڑھے کے عصا کے نیچے گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اس کا تبسم بھی ختم ہو چکا تھا اور اب صرف اس کا بغیر دانتوں کا منہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بھی لاشعوری حرکت سے اپنے دانت غائب ہوتے محسوس کئے اور انہیں ایسا پایا جیسے کہ پہلے سے ہی تھوڑے اور کم تھے۔ مجھے اپنے مستقبل کا غم لاحق ہوا تو میں نے بالکونی سے اس بوڑھے شخص کو غور سے دیکھنا چھوڑ دیا۔

اچانک بے خبری میں میرا ہاتھ پرانے اخبار کے ڈھیر پر جا پڑا اور میں نے اس کا ایک ورق اٹھا لیا اور کالے' سفید اور رنگدار الفاظ کو گلے میں اتارنے لگا۔ کوئی چیز نئی نہ تھی۔ اس کے بال پورے صفحہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ونسٹون ہی بہتر ہے وہ تمہیں چاند پر پہنچا دے گی۔ سافٹ لینڈا اپنے دادا کو خط ارسال کرے گی' مگر اس میں ہو گا کیا؟ پوتی اپنے دادا سے روشنی ڈلوانا چاہتی ہے یہ اس کا جائز حق ہے!! میں نے کہا دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔

اور جونہی میں نے اخبار اپنے ہاتھ سے پھینکا تو وہ زمین پر گر گیا۔ ہلکی آندھی اس کے صفحات پر ہلکے ہلکے صر صر کی مشق کرنے لگی۔ اس کی حرکت نے مجھے بور کر دیا۔ میں نے پاؤں سے کام لیا اور اس کی اس کوشش کو ختم کر دیا۔ میں نے اخبار کو لپیٹا کہ اسے باہر پھینک دوں۔ بوڑھے کی حرکت اب ختم ہو چکی تھی اس نے عصا سے اپنی پیٹھ کو سہارا دیا اور گزرنے والوں کو دیکھنے لگا۔ بلدیہ کی گاڑیاں منہ چڑاتی ہیں اور آئس کریم کی گاڑیاں۔ تو وہ ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ کیا چاہتا ہے میں نے کہا۔ یقیناً" وہ کچھ لینا چاہتا ہے۔ کرایہ کی ٹیکسی' تحفظ کی ضمانت' کنبہ کی تنظیم' محتاج خانہ یا کچھ اور۔ وہ مجھے بہت تیز نظر آیا۔ وہ ہر ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں بھی اس ہی کی طرح ہر چیز کو جلد از جلد دیکھنے لگا۔ لیکن مجھے کس چیز کی تلاش ہے؟ کتاب' اخبار' ریڈیو' چائے کی گرم پیالی' متحرک کرسی ---- کچھ نہیں کچھ نہیں ---- میں تو خالی خولی سال ہوں جو بے کار ضائع ہو رہے ہیں۔

میں نے سگریٹ سلگائی' چائے کی پیالی لی' اخبار پڑھا اس کو غور سے دیکھا۔ صندلی پہنی اور اپنی بید کی کرسی کو ہلانے لگا۔ اسی لمحے ایک دوسرا بوڑھا شخص آیا۔ کمان کی مانند جھکا ہوا۔ اسکی داڑھی چھوٹی اور سفید تھی اور اسکی

داڑھی کے بعض بال مہندی سے رنگے تھے! داڑھی کے اوپر کوئی سفیدی نہ تھی' اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بوڑھے کے خدوخال نرم پڑ گئے اور اسکے دونوں ہاتھ بات چیت میں اپنے کردار کی مشق کرنے لگے پھر اس نے عصا سے زمین پر لکھائی کا کام شروع کر دیا۔ اس نے تمام پرانے خطوط کا سروے کیا اور نئی خطوط کشی کرنے لگا۔ اس کا مہمان اسے دیکھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ جب اس کا کاروباری دوست اسے آمادۂ گفتگو نہ کر پایا، تو مہمان نے اپنا مسواک نکالا اور اپنے منہ میں اپنے مشق یافتہ ہاتھ سے مسواک کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے منہ میں مسواک کیوں کر رہا ہے۔ کیا اسکے دانتوں کو کوئی سخت کام کرنا ہے کہ گوشت کو مسواک کر رہا ہے؟ میں نے اپنے جی میں کہا اور لاشعوری طور پر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور پھر نئے سرے سے اپنے منہ میں کاشتکاری کرنے لگا۔

سورج نے اپنی چال تیز کی۔ سرخ ٹکیہ رکے رہنے سے تھک گئی اور پھر نیچے جانے لگی۔ آسمان کی سفیدی نے ایک ناپسندیدہ ظلمت کی شکل اختیار کر لی۔ بوڑھوں کا حلقہ بھی بڑھتا گیا۔ ان میں تیسرا اور چوتھا اور پانچواں شخص بھی شامل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کے مضبوط مدور حلقے نے فٹ پاتھ کا راستہ بند کر دیا' اور ہر وہ شخص جس کے بھی ہاتھ میں عصا تھا زمین پر خطوط کشی کرنے لگا۔ کھلی ہنسیاں چھپ گئیں اور ان کی جگہ غیر معمولی قسم کی سنجیدگی نے لے لی جیسے کہ اس کو ورکشاپ میں ڈیزائن کیا گیا ہو۔ منہ سے باتیں اور عصاؤں سے حرکات۔ اچانک پہلا بوڑھا زور سے بڑبڑاتے ہوئے کھڑا ہوا اور انہیں اپنے سے دور چلے جانے کا کہا ۔۔۔۔ جلدی سے ہر ایک نے اپنا عصا پکڑا اور وہیں نیچے چلا گیا اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس کا عصا اس کی پیٹھ کے پیچھے اور ہاتھ اسکی گود میں بندھے' منہ سے اول فول الفاظ نکل رہے تھے۔ میں نے قمیض اور پاجامہ پہنا اور اپنے بیٹھنے کی جگہ پر لوٹا۔ میرے پاس پانی کا گلاس اور نئی سگریٹ اور پرانا اخبار تھا میں نے بید کی کرسی پر اپنی جگہ بنا لی ۔ شام ہو چکی تھی اور ستارے کھلے آسمان کے وسط میں اپنی جگہوں سے غائب تھے اور ایسے ظاہر ہوتا تھا کہ بارش جلد ہی ہو گی لیکن میں نے اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا کیونکہ میں نے پہلے سے یہ تمام ضروریات پوری کر لیں تھیں۔

میں نے اپنے پاؤں کو تھوڑا ہلایا۔ میری انگلیاں سکڑیں اور پھر بید کی کرسی ہلی۔

براہ راست میری نظر بوڑھوں کی جگہ پر پڑی۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنا عصا آگے بڑھایا اور اس پر ٹیک لگائی اور کھڑا ہو گیا۔ فٹ پاتھ سے آہستگی سے اترا۔ گاڑیاں سیاروں کی مانند چل رہی تھیں' اس طرح کہ کسی کو ٹھہرنے کی قدرت نہ تھی چہ جائیکہ وہ راستہ سے گزر سکے۔ لیکن اس نے جوا کھیلا اور پھر وہیں سپرنگ کی مانند گاڑیوں کے جھنڈ میں حرکت کرنے لگا' یہاں تک کہ وہ دوسری جانب کے فٹ پاتھ پر جا پہنچا اور خاموشی سے گر گیا!!

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور سگریٹ سلگائی اور اپنی نظر ذرا دور بوڑھے کی لاش اور لوگوں تک بڑھائی جو اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ میں نے پیٹھ پھیری اور اندر چلا آیا۔ اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ بید کی کرسی خوفناک تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔

عبداللہ باقازی / عبداللہ جان عزیز

عقاب اور کائی

عقاب بلندی سے نیچے آنے لگا اور اس نے اپنی آنکھوں سے زمین کو جانچا۔ غور سے دیکھا زمین اس کی نظروں کے سامنے کچھ اس طرح تقسیم ہوگئی تھی جس میں سبزہ بھی تھا اور پانی بھی اور بلند پہاڑ بھی تھے۔ اس نے اپنی نظروں سے اوپر دیکھا تو اسے سفید بادل نظر آئے۔ اس کو بادل کے اطراف سے بارش کی خوشبو آئی۔ نیچے سبزہ اس کے سامنے بھرپور طور پر سبز تھا۔ اسے خوبصورت بلند و بالا پہاڑ اپنی آنکھوں کے سامنے دور و نزدیک بے ہوئے نظر آئے۔ عقاب نے اپنے حسب خواہش فضا میں کچھ چکر لگائے۔ اس کی حرکات میں تموج پیدا ہوا اور شبنمی بارش کی خوشبوؤں سے جا ملا جو اس بادل سے آرہی تھیں اور پھر وہ زمین پر اتر آیا۔

وہ اپنی تیز رفتاری کے ساتھ پانی کے چشمے کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے قریب ہی جگہ بنائی۔ اس کی نظر کائی پر پڑی' بدبودار اور سبز جو اس کے سامنے کے ایک حصہ پر پھیلی ہوئی تھی۔

عقاب نے کائی کو سوالیہ نظروں اور حیرت سے دیکھا اور کائی آہستہ آہستہ موجوں کے اوپر حرکت کرنے لگی اور اس سے بوجہ حرکت بدبو پھوٹنے لگی۔ کائی کی حرکت بڑھنے لگی اور اس کے سبز کناروں سے بدبو آنے لگی۔ کائی اپنے تئیں یہ کوشش کر رہی تھی کہ عقاب کے سامنے کے پانی کو اپنے نیچے چھپا دے۔

عقاب ابھی تک حیران سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کائی کی اس عبث کھینچ تان میں عقاب پانی کو نہ دیکھ سکا اور قریب نہ ہوا۔ کائی بے فائدہ کھینچ تان میں رہی اور یہ عقاب حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

عقاب کا تعجب اور استغراق بڑھنے لگا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کائی اپنی واضح بدبو کے باوجود اس چشمہ کے ایک حصہ کو بھی نہ بھر سکے گی اور اس کے باوجود وہ عبث کوشش کر رہی تھی کہ خود کو اس پر پھیلا دے۔ اور عفونت اور سڑاند لہر کے ابھرنے سے بڑھ جاتی ہے۔

عقاب نے کائی کو درد و اندوہ سے دیکھا اور وہ بھی یہ کوشش کر رہی تھی کہ پانی کے پھیلاؤ کے ایک حصہ کو اس کی نظروں سے چھپا دے تاکہ وہ اس کے قریب نہ ہو سکے۔ عقاب اس مایوسانہ اور عاجزانہ حرکت سے متعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ پانی کے اس چشمہ کے ایک حصہ پر جا بیٹھے اور اپنے ان عظیم پروں کو پانی کے اوپر پھڑپھڑائے۔ یہاں تک کہ کائی غائب ہو جائے اور وہ پھٹ جائے۔ اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس کے بلند مرتبے کے خلاف ہے اور ایک بار پھر اس نے اس چڑیل کائی کو دیکھا!!

عقاب پانی سے قریب ہوا۔ کائی اپنی مایوس کن پیش قدمی سے پھٹ چکی تھی اور اس کے متفرق چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس سے بدبو بھی پہلے سے زیادہ پھیل گئی تھی۔

عقاب نے پانی میں ڈبکی لگائی اور متعفن کائی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر دور ہو گئی۔

عقاب نے خیال کیا کہ وہ اپنے عظیم پروں کو زور سے جھاڑے۔ ایسے حال میں کہ وہ اب پانی سے اڑان

کرنا چاہتا تھا اور پانی بھی خاصا متعفن ہو گیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کی اس حرکت سے اس کے نام کو بٹہ لگے گا اور اس کی بلند مکانی مذموم ہو گی تو وہ خاموشی سے اڑ گیا اور جونہی وہ اپنی اڑان میں بلند ہوا تو قریب کے سرسبز ٹیلے کی خوشبودار شبنمی گھاس پھوس نے اس کا استقبال کیا۔

عقاب اب اونچا اور اونچا اڑنے لگا۔ یہاں تک کہ بادلوں کے قریب جا پہنچا۔ اب سورج بادل کی اوٹ میں اپنی سنہری روشنی کے ساتھ جھانک رہا تھا۔ عقاب کے رگ و ریشہ میں سرور و سکون سما گیا اور سورج کی سنہری کرنیں اس کے پانی سے بھرے گیلے پروں پر پڑ کر انہیں چمکدار بنانے لگیں اور ایک میٹھا سکون جاری و ساری ہو گیا۔

عقاب نے اپنی بلندی پر خیال کیا اور سورج اپنی سنہری کرنوں سے اسے پرسکون حرارت دے رہا تھا اور بادل نے اردگرد کی فضا کو اپنی چمکدار خوشبو سے بھر دیا تھا۔ بے چاری کائی جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، پھر سے اس کے سامنے ایک ہونے کی کوشش کر رہی تھی تو عقاب نے اس حالت پر خاصا افسوس کیا۔ اس کی چھٹی ہوئی حالت کو یاد کیا جس پر غبار کے ذرات چڑھے ہوئے تھے اور کائی پھر سے چشمے کے ایک کونے میں جا کر پھر نئی بدبودار کائی بننے کے لیے سرگرداں تھی۔

باپ

بچے ہمیشہ خوف اور شوق کی ملی جلی کیفیت میں باپ کے گھر لوٹنے کی راہ دیکھا کرتے۔ خوف ہوتا اس مخمور گھونسے کے منہ پر پڑنے کا جس سے خون بہہ نکلتا تھا اور ہونٹ دنوں تک سوجے رہتے تھے اور شوق ہوتا اس کھانے کا جو باپ بعض اوقات اپنے ساتھ لے کر آتا تھا یعنی بڑے بڑے پڑوں میں انڈوں اور ترکاریوں کے ساتھ تلے ہوئے گرما گرم نوڈلز۔ اصل میں باپ یہ پکوان لاتا تو تھا اپنے کھانے کے لئے' لیکن وہ عموماً" اتنا زیادہ مال لے آتا تھا کہ وہ خود بھی اس کو ختم نہیں کر پاتا اور پھر پس خوردہ مال کے لئے بچوں کی لٹس مچتی تھی جس کی گھات میں وہ میز کے آس پاس مستعد موجود ہوتے۔ جو ماں مداخلت نہ کرتی کہ سب کو برابر برابر مل جائے چاہے وہ اس ترمال کا ایک لقمہ ہی ہو تو سب سے بڑے اور توانا بچے سب کچھ جھپٹ لیتے اور چھوٹوں کے لئے ایک ریزہ نہ چھوڑتے۔

وہ چھ عدد بچے تھے۔ دو سب سے بڑوں میں ایک بارہ برس کا لڑکا اور دوسری گیارہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ دونوں چھریرے ہونے کے باوجود نڈر اور جاندار تھے اور جب کبھی چھوٹوں کو بھی کچھ نہ کچھ حصہ دلوانے کے لئے ماں وہاں موجود نہ ہوتی تو وہ سب کچھ آپس میں ہی بانٹ کھاتے۔ نو برس کے دو جڑواں لڑکے تھے' آٹھ سال کی ایک منحنی سی لڑکی تھی اور پھر ایک پیوں پیوں چلتا دو برس کا ننھا جو دوسروں کی طرح مال غنیمت میں سے اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے مچلتا۔

بچے اس ایک آدھ بار کو یاد کر سکتے تھے جب ان کے باپ نے اپنی فیاضی سے انہیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ واقعی ان ہی کی خاطر ترمال کے دو بھرے ہوئے پڑے لیکر آیا تھا جن کو مل جل کر کھاتے ہوئے وہ اتنے نہالوں نہال ہو گئے تھے کہ وہ اس کو جلدی جلدی ہڑپ نہیں کر سکے تھے یہاں تک کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹونگتے ہوئے ماں بھی کھلی جا رہی تھی۔

لیکن مسرت کی وہ گھڑی پھر کبھی نہ آئی۔ اب باپ کبھی بھی کھانے کو کچھ نہ لاتا۔ اب تو بچے اپنے آپ کو اس وقت خوش بخت سمجھتے تھے جب باپ دھت حالت میں نہ آتا' اور جب ان کی اور ان کی ماں کی ٹھکائی نہ کرتا۔

آس ان کو پھر بھی لگی رہتی اور اگر وہ اس وقت جاگ رہے ہوتے جب ان کا باپ رات گئے گھر آتا تو وہ اپنے دیدے پھاڑ پھاڑ کر یہ معلوم کرنا چاہتے کہ دھاگے سے لپٹا کوئی خاکی کپڑا تو اس کی انگلیوں میں نہیں لٹک رہا۔ اگر وہ دند مچاتا' پیر پٹختا آتا تو صاف ظاہر تھا کہ کھانے کو کچھ نہیں لایا' تب بچے اس خوف سے ایک دوسرے سے لپٹ کر دبک جاتے تھے کہ ان کی ذرا سی بھی آواز اس کو برہم کر دے گی اور اس کے بڑے ہاتھ کو ان کے چہروں کی طرف لپکنے کی دعوت دے گی۔

ان کی ماں کا منہ اکثر ٹوٹتا رہتا تھا۔ ایسی راتوں میں بچوں نے بارہا اس کو روتے بسورتے سنا تھا۔ اگلی صبح اس کے گال اور آنکھیں اس قدر سوجی ہوتیں کہ قریب کی اونچی حویلیوں میں کپڑے دھونے جانے میں اسے شرم آتی۔

جن راتوں میں باپ معمول سے زیادہ دیر میں اور معمول سے زیادہ بے سدھ حالت میں لوٹتا تو بچے اتنے سیانے تھے کہ وہ موئی موئی کو اس کی نظروں سے دور رکھتے۔ یہ اس لئے کہ آٹھ سالہ موئی موئی جو سدا کی روگی تھی اور ہر وقت بلونگڑے کی طرح روتی بلکتی رہتی تھی باپ کو بھڑکا دینے کا ایک سبب تھی۔ اس کی ناک ہمہ وقت بہتی رہتی تھی' منہ نرالی طرح پھڑکتا' ٹانگیں پھنسیوں سے پھلی رہتیں جن کو وہ دل لگا کر کھجاتی رہتی اور یوں گلابی رستے زخم بہتے رہتے حالانکہ ماں بار بار اس کو ایسا کرنے سے منع کرتی۔ مگر سب سے زیادہ بیزار کر دینے والی اس کی ریں ریں تھی۔ ایک کونے میں اسٹول پر سمٹی سمٹائی یا دوسرے بچوں کے ساتھ چٹائی پر لیٹی لیٹی وہ اپنی پتلی پچنی آواز میں گھنٹوں روتی رہتی۔ بڑا لڑکا اور لڑکی اس کی اس حرکت سے الجھتے تھے اور چیخ کر ماں سے شکایت کرتے تھے جو تھکی تھکی آواز میں بچی کو ڈانٹ دیتی تھی' لیکن جن راتوں میں باپ گھر میں ہوتا اور اپنے ادھے پونے لئے بیٹھا ہوتا تو وہ زیادہ دھیان رکھتے کہ موئی موئی ذرا بھی نہ ٹھنکے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کا بسورنا باپ کے اعصاب پر اتنا زیادہ ناگوار اثر ڈالتا تھا کہ وہ پوری شدت سے گھڑکتا اور رونا اس کے بعد بھی جاری رہتا تو وہ چل کر بچی تک جاتا اور اسے بری طرح پیٹ ڈالتا اور پھر وہ دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ان کو بھی دھن ڈالتا' گویا وہ اپنی اس بدبختی کا مجموعی طور پر ان سب کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔

اس رات باپ اپنے انتہائی غضبناک موڈ میں گھر آیا تھا کیونکہ اس کو لکڑی چیرنے کے کارخانے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت موئی موئی لمبی سسکیاں لے کر روئے جا رہی تھی اور دونوں بڑے بھائی بہن بھی اس کو چپ نہیں کرا پائے تھے حالانکہ انہوں نے اسے ڈانٹا' مارا بھی تھا۔ اگلے پل بغیر کچھ کہے سنے باپ کا گھونسا اس کی ننھی پھولی تھوتھنی پر پڑا اور لڑکی تیورا کر کمرے کے دوسری طرف الٹ گئی اور بے سدھ پڑ گئی۔ آفت کو بھانپتے ہوئے دوسرے بچے جلدی جلدی گھر سے نکل بھاگے اور ماں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار کر بچی کو ہوش میں لائی۔

مگر دو دن بعد ہی موئی موئی مر گئی اور جب ایک کلو میٹر دور تلینبھی میں واقع دیہی قبرستان میں دفنانے کے لئے اس کی میت اٹھائی گئی تو رونے والوں میں صرف اس کی ماں ہی تھی' پھر روگی بچی کو یاد کرتے ہوئے کچھ گرائیں تعزیت کرنے آگئے۔ باپ کے لئے جو منہ لپیٹے دلگیر بیٹھا تھا یہ جانتے ہوئے کہ وہ بے کار بھی ہے ان کی ہمدردیاں دہری تھیں۔ ایک رحم دل عورت نے کچھ چندہ جمع کیا اور دلجوئی کے طور پر باپ کو پیش کر دیا' جس پر وہ شخص جسے خود اپنی حالت پر ترس آرہا تھا' پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی اس بپتا کی خبر جلد ہی اس کے مالک کو مل گئی جو کہ ایک سخت گیر مگر ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے اس کے بیوی بچوں کی خاطر اس کو دوبارہ ملازمت دینے کا فیصلہ کیا اور دل کا بڑا ہونے کی وجہ سے وہ خود پر سا دینے آیا اور ساتھ ہی اس کی مدد کے لئے کچھ رقم بھی لایا (جو اس نے احتیاطاً" اس شخص کو دینے کی بجائے اس کی بیوی کو دے دی)۔ اپنے پرانے آجر کو وہاں دیکھ کر اور اپنی مردہ بیٹی کے لئے اس کی ہمدردی کے بول سن کر وہ شخص زار و قطار رونے لگا اور اسے چپ کرانے کے لئے پھر سے دلاسا دینا پڑا۔

اس کی خود رحمی اب اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک مصیبت کے مارے باپ کے روپ میں دیکھا جو اپنی لخت جگر کی بے محل موت کا ماتم کر رہا ہو۔ اس خود رحمی کے ساتھ ہی مری ہوئی بچی کے لئے بچے پیار کا سوتا پھوٹ نکلا اور وہ اندوہناک انداز میں بار بار بین کرنے لگا۔ "ہائے غریب موئی موئی' ہائے میری دکھیاری بیٹی" وہ اس کو اپنی تلینبھی میں بنی قبر میں لیٹی نظر آئی' دبلی' پتلی' چپٹی اور دھان پان' اور غم اور رحم کی لہروں نے اس کے گندمی بڑے بڑے شانوں اور بازوؤں کو یوں ہلا کر رکھ دیا کہ دیکھنے والے بھی سہم گئے۔ پڑوسیوں نے اس کی

ڈھارس بندھانے میں اپنی ہر ممکن کوشش کی اور چند ایک اپنی ڈبڈبائی آنکھیں لئے وہاں سے یہ کہتے ہوئے ٹل گئے کہ وہ بھلے ہی لاپرواہ اور بلانوش ہو پر اسے اپنی بیٹی سے سچا پیار تھا۔

غم کے مارے ہوئے باپ نے جلد ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو ایک خیال آیا۔ آج کے بعد سے وہ ایک بہت اچھا باپ بن جائے گا۔ اس نے اپنی جیب سے وہ رقم نکالی جو اس کے سیٹھ نے اس کی بیوی کو دی تھی (اور جو اس کی بیوی نے فوراً ہی اس کی جان کر اس کے حوالے کر دی تھی) اس نے نوٹوں کو گنا۔ وہ ان میں سے ایک بھی دارو پر خرچ نہیں کرے گا۔ نہیں۔ اب کبھی نہیں۔ وہ اٹھا اور فیصلہ کن انداز میں گھر سے باہر نکل گیا۔ بچوں نے اسے دیکھا اور تعجب کیا کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔ ان کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بستی کی طرف جا رہا تھا۔ ان کے منہ لٹک گئے' کیونکہ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اب اپنی بوتلیں لے کر ہی لوٹے گا۔

باپ ایک گھنٹہ بعد لوٹ آیا۔ وہ ایک بڑا سا کاغذی تھیلا اٹھائے ہوئے تھا جو کہ چھوٹے چھوٹے کاغذی پڑوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ اس نے وہ لا کر میز پر رکھ دیا۔ بچوں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ مگر کیا وہ چاکلیٹ کا ڈبہ ہے؟ انہوں نے اپنے دیدوں کو اور پھاڑا۔ ایک تو انگور کی تھیلی تھی' ایک ایسا ڈبہ تھا جو بظاہر بسکٹ کا معلوم ہوتا تھا۔ بچے آپس میں اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بڑے نے کہا یہ بسکٹ ہونا چاہیے۔ اس نے ایسے کئی ڈبے بستی میں ہو چیک کی دکان پر دیکھے ہیں اور بڑی لڑکی کا پرزور اصرار تھا کہ وہ مٹھائی ہو گی' اسی طرح کی جیسی ایک بار بڑی حویلی والی لوسو نے جہاں ماں کپڑے دھونے جاتی تھی ان کو دی تھی۔ جڑواں لڑکے ہر دو پر راضی تھے اور اس کی توقع میں فقط منہ پھاڑے مسکرا ہی سکتے تھے۔ وہ اسی طرح تکرار کرتے انکل لگاتے رہے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ باپ کے اشارے کے بغیر اس خزانے کو ہاتھ لگائے۔ وہ باپ کے باہر آنے کے انتظار میں بے صبرے ہو چکے تھے۔

کپڑے بدل کر وہ جلد ہی باہر آیا اور میز کے پاس گیا لیکن وہ اشارہ کہ جس پر بچے اس مرغوب خزانے کو ہاتھ لگاتے کبھی نہیں ہوا' بلکہ باپ نے وہ بڑا کاغذی تھیلا اٹھا لیا اور دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا۔ دونوں بڑوں نے اس کے ساعت سے دور جانے کا انتظار کیا اور اس خزانے سے دست بردار نہ ہونے کی خاطر جو تقریباً" ان کی دسترس میں تھا سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہا۔ " آؤ پیچھا کریں۔ دیکھیں وہ کہاں جا رہے ہیں۔" دونوں جڑواں لڑکوں نے بھی جانے پر ضد کی اور یوں چاروں محفوظ فاصلے پر پیچھے پیچھے چلے۔ عام حالات میں باپ نے ان کو دیکھ لیا ہوتا اور جھڑک کر گھر جانے کو کہا ہوتا لیکن اس وقت وہ اپنی دھن میں مگن تھا' اس نے ان کو دیکھا ہی نہیں۔

وہ تلینھی کے قبرستان پہنچ گیا اور جس قبر پر جا کر ٹھہرا وہ ابھی تازہ تھی وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور چیزیں کاغذی تھیلوں میں سے نکال نکال کر احتیاط سے قبر پر سجانے لگا اور روہانسی آواز میں کہتا گیا۔ "میری پیاری بیٹی' ان چیزوں کے سوا تمہارے باپ کے پاس تمہیں پیش کرنے کے لئے اور کچھ نہیں' امید ہے تم انہیں قبول کر لو گی۔" پھر وہ تا دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور بچے قریب ہی جھاڑیوں میں چھپ کر یہ دیکھتے رہے۔ آسمان سیاہ ہو چکا تھا اور گھنے بادل کسی بھی لمحے برسنے کو تھے لیکن باپ تھا کہ دعائیں مانگے جا رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ چھینٹا پڑ جانے پر بھی وہ دو زانو ہی رہا۔ پھر وہ اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ اس کی شرابور قمیض اس کے بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ بچے جو بہت زیادہ بے تاب ہو چکے تھے اس خزانے پر ٹوٹ پڑے۔ بہت کچھ بارش نے برباد کر دیا تھا لیکن جتنا کچھ بھی وہ بچا سکتے تھے انہوں نے جھپٹ لیا اور ایسی شاندار دعوت اڑائی جیسی وہ جانتے تھے کہ پھر کبھی نہ مل سکے گی۔

طیب صالح / ستار طاہر

زین کی شادی

"کیا تم نے سنا ہے۔ زین کی شادی ہو رہی ہے" دودھ بیچنے والی حلیمہ نے آمنہ سے پوچھا۔ برتن آمنہ کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا اور حلیمہ کو موقعہ مل گیا کہ وہ پورا دودھ دینے میں ڈنڈی مار سکے.....

دوپہر کے وقت انٹرمیڈیٹ سکول کا صحن خالی اور سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ طالب علم کلاسوں میں جا چکے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا' بھاگتا اور ہانپتا ہوا دوسرے سال کی جماعت کے کمرے کے سامنے رکا۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے دیکھا اور ڈانٹ پلا دی۔ "رحمان 'گدھے' دیر سے کیوں آ رہے ہو؟" لڑکے کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پوچھا۔

"جناب! کیا آپ نے وہ خبر سن لی؟"

"کیسی خبر' جانور......؟"

ہیڈ ماسٹر کا غصہ لڑکے کی مسکراہٹ پر اثر انداز نہ ہو سکا وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "جناب وہ تین دن بعد زین کی شادی کر رہے ہیں۔" حیرت سے ہیڈ ماسٹر کا نچلا جبڑا لٹک گیا۔ اور نوجوان دیر سے آنے کی سزا پانے سے بچ گیا۔

بازار میں عبدالصمد غصے سے لال پیلا چہرہ لئے شیخ علی کی دکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمباکو کے دکاندار شیخ علی نے اس کا قرض دینا تھا۔ جس کی واپسی میں وہ لیت و لعل سے کام لیتا چلا آ رہا تھا۔ آج عبدالصمد یہ تہیہ کر کے آیا تھا کہ وہ جائز یا ناجائز ہر طریقے سے اپنی رقم وصول کر کے رہے گا۔ وہ دکان کے پاس جاتے ہی شیخ علی پر برس پڑا۔

"تمہارے ارادے کیا ہیں؟ میں اپنی رقم وصول کر کے جاؤں گا۔"

شیخ علی نے عبدالصمد کو تشریف رکھنے اور کافی پینے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔ "خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمہیں رقم مل جائے گی۔" عبدالصمد چلا اٹھا۔ "لعنت بھیجتا ہوں تمہاری کافی پر اٹھو اور سیف کھول کر رقم نکال کر دے دو۔ اگر تم رقم ہضم کرنا چاہتے ہو تو بھی بتا دو....."

"حاجی عبدالصمد بیٹھو تو سہی۔ میں تو تمہیں ایک حیران کن خبر سنانا چاہتا ہوں۔" شیخ علی نے کہا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تم پر اور تمہاری خبر پر ضائع کروں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں تمہاری رقم میرے پاس محفوظ ہے بیٹھو تو سہی۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ زین کی شادی ہونے والی ہے۔"

"کس کی شادی ہونے والی ہے؟" عبدالصمد نے حیرت سے پوچھا۔

"زین کی شادی" شیخ علی نے جواب دیا۔

عبدالصمد بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور کئی منٹوں تک خاموش رہا۔ شیخ علی نے اطمینان بھری نگاہوں سے عبدالصمد کی طرف دیکھا۔ جس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ عبدالصمد نے کلمہ پڑھا اور پھر پوچھا۔

"ذرا کھل کر تو بتاؤ۔ زین کی شادی کے بارے میں...."
اس روز عبدالصمد شیخ علی سے اپنا قرض وصول نہ کر سکا۔

دوپہر تک گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر زین کی شادی کا قصہ تھا۔ زین سب کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا وہ حسب معمول گاؤں کے کنوئیں پر عورتوں کے گھڑے پانی سے بھر رہا تھا۔ بچوں کا ہجوم اس کے اردگرد جمع تھا اور بچے نعرے لگا رہے تھے۔ "زین کی شادی ہو رہی ہے۔ زین کی شادی ہو رہی ہے۔" بچے قہقہے بھی لگا رہے تھے۔ عورتیں ہنس اور چیخ رہی تھیں اور ان قہقہوں کی آوزوں میں خود زین کے قہقہے کی وہ مخصوص آواز بھی پہچانی جا رہی تھی جو گاؤں والے اس دن سے سن رہے تھے جس دن زین پیدا ہوا تھا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ بچے روتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں لیکن زین کا قصہ مختلف ہے۔ جس کے راوی اس کی اپنی ماں اور وہ عورتیں ہیں جو اس کی پیدائش کے وقت موجود تھیں۔ زین نے جونہی دنیا میں قدم رکھا۔ اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستا چلا گیا۔ تب سے اب تک وہ ہنستا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس کے منہ میں دو دانت تھے۔ ایک اوپر ایک نیچے اس کی ماں کا کہنا ہے کہ کبھی زین کا منہ موتیوں جیسے سفید دانتوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن ایک بار اسے لرزے سے بخار ہوا۔ کئی دنوں تک وہ بستر سے نہ اٹھ سکا اور جب وہ صحت یاب ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے تمام دانت سوائے اوپر نیچے کے ایک ایک دانت کے گر چکے ہیں۔

زین کا حلیہ بھی بڑا دلچسپ اور مضحکہ خیز تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ اس کا چہرہ بالوں سے صاف تھا نہ پلکیں نہ بھنویں اور جب وہ بالغ ہوا تو نہ اس کی مونچھیں نمودار ہوئیں نہ ٹھوڑی پر ڈاڑھی۔ اس کا یہ چہرہ ایک لمبی گردن پر ٹکا ہوا تھا۔ گاؤں کے بچے اسی لئے اسے زرافہ کہتے تھے۔ اس کی یہ گردن دو طاقتور کندھوں پر کھڑی تھی۔ اس کے دونوں لمبے بازو بندروں جیسے تھے۔ ہتھیلیاں اور ہاتھ سخت اور کھردرے' انگلیاں لمبی' جن کے سروں پر تیز لمبے ناخن تھے۔ (کیونکہ زین کو ناخن تراشنے کی عادت نہ تھی) اس کی کمر ہلکی سی جھکی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگیں لمبی اور کچھ ٹیڑھی سی تھیں اس کے پاؤں چپٹے اور کھردرے تھے اور ان پر زخموں کے نشان تھے۔ (کیونکہ زین جوتے پہننا پسند نہ کرتا تھا) اس کے ہر زخم کے پیچھے ایک کہانی اور حماقتوں سے بھرپور قصہ تھا۔ اس کی ساری زندگی ہی حماقتوں کی ایک دلچسپ طویل داستان تھی۔

مجوب اس کو چھیڑنے کا عادی تھا۔ وہ کہتا' "ہاں تو پھر نکمے بتاؤ تو وہاں شادی پر کیا ہوا تھا۔؟" زین اپنی آستین سے چہرے کو صاف کرتا اور بے ساختہ قہقہہ لگا کر دلچسپ کہانی شروع کر دیتا۔

شادی بیاہ کی تقریبات میں یہ کسی شخص کو گوارا نہ تھا کہ زین اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ کیونکہ وہ کھانے سے بھرا ہوا طشت پلک جھپکنے میں صاف کر کے کسی کے لئے کچھ کھانے کو نہ چھوڑتا تھا۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کی چوری کو بھی برا نہ سمجھتا تھا۔ جب پکڑا جاتا تو پھر اسے سزا ملتی اور اس کے جسم پر کئی نشان ایسی ہی سزاؤں کی نشانیاں تھیں۔

اور پھر ایک دن جب مجوب کے چھیڑنے پر لوگوں کے سامنے زین اپنی حماقتوں کے قصے ہنس ہنس کر سنا رہا تھا۔ جانے مجوب پر کیا اثر ہوا کہ اس نے پہلے تو کلمہ پڑھا۔ خدا سے معافی مانگی اور جب زین نے اس سے پوچھا۔

"سنو' کیا تم اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرو گے؟ تو مجوب نے بے اختیار جواب دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ سب لوگوں کے سامنے۔" مجوب بیحد سنجیدہ تھا۔ "جب تم اپنی گندم کی فصل اٹھا لو گے' اپنی کھجوریں جمع کر لو گے' کچھ پیسے اکٹھے کر لو گے تو ہم شادی کی تقریب منائیں گے۔" زین کو اس وعدے پر

پورا اطمینان ہو گیا۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ اس نے اپنے تصور میں علیویہ کو دیکھا..... مجوب کی بیٹی جس سے شادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ پھر وہ سب لوگوں کو مخاطب کر کے بولا۔ "بس تو پھر طے ہوا' بھائیو تم گواہ رہنا' اس شخص نے تمہارے سامنے زبان دی ہے۔ اب اسے مکرنے یا انکار کرنے کا کوئی حق نہیں رہا۔" وہ سب جو وہاں موجود تھے' احمد' اسماعیل' طاہر رواسی' عبدالحفیظ' حامد رئیس اور سعید دکاندار' ان سب نے کہا کہ "مجوب نے جو زبان دی ہے وہ اس کے گواہ ہیں۔"

مجوب کی بیٹی علیویہ سے زین کی شادی کا وعدہ اور رومان زین کی زندگی کا تازہ ترین واقعہ سمجھیئے۔ ایک دو مہینوں کے بعد وہ اس شادی کے وعدے اور رومان سے اکتا اور تھک جائے گا اور پھر کسی اور سے دل لگا لے گا۔ اگرچہ ان دنوں علیویہ ہر وقت تصور میں اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہتی ہے' اس کی ذہنی کیفیت اور وارفتگی کو سمجھنا بے حد مشکل ہے وہ کھیت میں کام کر رہا ہے' پسینے سے جسم شرابور ہے کہ اچانک وہ کام چھوڑ کر بلند' اونچی دور دور تک گونج پیدا کرنے والی آواز میں چیختا ہے۔" اوہ لوگو! مجھے علیویہ کی محبت نے ہلاک کر دیا ہے۔ آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے دسیوں لوگوں کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ جوان ہنستے ہیں اور بڑے بوڑھے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑبڑانے لگے' لیکن دوسرے لوگوں کے ردعمل کا زین پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ اچھلتا' کودتا' چھلانگیں لگاتا' چیختا اور اس کی آوازیں گاؤں کے ہر گھر تک پہنچ جاتیں۔ "سنو گاؤں والو! محبت نے مجھے علیویہ کے صحن میں ہلاک کر دیا ہے۔"

محبت میں زین پہلی بار اس وقت ہلاک ہوا تھا جب وہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا۔ ایک بات جس کا ہر شخص معترف تھا وہ زین کا انتخاب تھا۔ وہ ہمیشہ کسی بے حد حسین لڑکی پر فریفتہ ہوتا' اس نے پہلی بار عذرا سے محبت کی اور اپنے مرمٹنے کا نعرہ لگایا۔ عذرا گاؤں کی حسین ترین دوشیزاؤں میں سے ایک تھی۔ عمدہ کی بیٹی عذرا کی عمر اس وقت پندرہ برس تھی۔ اس کی جلد گندم کے کھیتوں کی طرح سنہری تھی۔ جن میں گندم کے خوشے پک چکے ہوتے ہیں۔ اس کے خدوخال نرم و ملائم اور پرکشش تھے اور پلکیں اتنی لمبی تھیں کہ جب وہ آنکھیں اوپر اٹھاتی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ عذرا کی خوبصورتی کا پہلا قتیل زین تھا۔ جس نے ایک روز بھرے گاؤں میں آواز دی "سنو اے گاؤں کے لوگو' عزیزو' عمدہ کی بیٹی عذرا نے مجھے محبت میں ہلاک کر دیا ہے۔" ایسی گستاخانہ اور جراتمندانہ بدتمیزی کا لوگوں پر شدید ردعمل ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سب لوگ زین کی مضحکہ خیز ہیئت کذائی کو دیکھ کر بے ساختہ ہنسنے لگے۔ تب وہ بکری کی کھال کی طرح ایک سوکھا ہوا لڑکا تھا۔ عذرا کا باپ بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ کام کرنے والے ہاتھ رکے تو عمدہ نے لوگوں کو کام کرنے کا اشارہ کیا۔ عمدہ ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ اسے لوگوں نے کم ہی ہنستے دیکھا تھا۔ لیکن اس روز وہ بھی بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے زین کو پکارا۔ "اگر تم آج شام تک محنت اور جانفشانی سے کام کرتے رہے تو ہم تمہیں عذرا کا ہاتھ تھما دیں گے؟ لوگ ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ زین البتہ خاموش رہا۔ اور پھر پوری تندہی سے کھیتوں میں کام کرنے لگا۔

ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے میں زین کی زبان عذرا کے نام اور اس کے باپ کے وعدہ کو ہر دم دہراتی رہی۔ عمدہ بڑا کائیاں آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس طرح زین سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ اس سے مشکل سے مشکل کام کرانے لگا۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ عمدہ کے باغ میں پانی پہنچاتا' ان کے گھر کے لئے درخت کاٹ کر ایندھن تیار کرتا۔ گھوڑوں گدھوں اور بچھڑوں کے لئے چارہ تیار کرتا۔ جب کبھی ہفتے دس دن میں ایک بار عذرا اسے مسکرا کر دیکھتی تو زین کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا' لیکن ایک ماہ کے بعد عذرا کی منگنی اس کے ایک کزن کے

ساتھ کر دی گئی جو ابو عشر میں ایک میڈیکل اسسٹنٹ تھا۔

کوئی بدمزگی، کوئی جھگڑا کوئی ناراضی پیدا کئے بغیر زین نے ایک دوسری جگہ دل لگا لیا۔ اس بار اس کی لیلیٰ ایک بدو خانہ بدوشوں سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ یہ بدو خانہ بدوش نیل کے شمال سے اس طرف آئے تھے۔ انہوں نے گاؤں سے دور اپنے خیمے نصب کئے تھے اور وہاں ان کی بھیڑ بکریاں چرتی دکھائی دیتی تھیں۔ زین ان خیموں میں یوں گھوم پھر رہا تھا کہ جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہو کہ ایک دوشیزہ نمودار ہوئی وہ اتنی حسین تھی کہ زین ششدر رہ گیا۔ وہ دوشیزہ پہلے سے ہی زین کے بارے میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ اس لئے اسے زین کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اس نے ہنس کر زین کو دیکھ کر پھر بڑے پرمزاح لہجے میں بولی "زین کیا مجھ سے شادی کرو گے؟" ایک لمحے کے لئے وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں چیخنے لگا۔ "سنو اے لوگو! اس نے مجھے قتل کر دیا ہے ...." لوگ خیموں سے باہر نکل آئے۔ اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ گاؤں میں بھی جہاں زین کے نئے عشق کا چرچا ہونے لگا۔ وہاں اس بدو خانہ بدوش لڑکی حلیمہ کے حسن کا بھی شہرہ ہو گیا۔ کئی لوگ اس سے شادی کرنے کے لئے ڈول ڈالنے لگے۔ اور پھر ایک دن ---- حلیمہ بھی ایک دولت مند سے بیاہی گئی۔

عذرا اور حلیمہ کی شادی نے گاؤں کی جوان بیٹیوں والی ماؤں کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ زین بڑا اہم آدمی ہے۔ وہ جس لڑکی کے عشق کا نعرہ لگاتا ہے وہ دنوں میں مشہور ہو جاتی ہے اور اس کے لئے اچھے سے اچھا رشتہ آنے لگتا ہے۔ یوں کنواری اور جوان بیٹیوں کی ماؤں کے لئے گویا زین ایک درمیانی رابطہ "ایک ذاکیہ" ایک نیک بختی کا شگون بن گیا۔ وہ اسے جہاں دیکھتیں اس کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہونے لگی اور پھر کسی لڑکی کا نام زین کے ہونٹوں پر آجاتا۔ وہ اپنی پتلی دبلی ٹانگوں پر بھاگتا، نعرے لگاتا، اپنے قتل اور ہلاک ہونے کا اعلان کرتا اور پھر جس لڑکی کی خوبصورتی کا وہ ڈھنڈورا پیٹتا۔ جلد ہی اسے کوئی خوب صورت، جوان، دولتمند بیاہ کر لے جاتا اور زین ----!

وہ سارا دن دوسروں کا کام کرتے دکھائی دیتا۔ گاؤں کی عورتوں کے گھڑے پانی سے بھرتا۔ کسی کے صحن میں ایندھن بنا رہا ہوتا۔ اس کے قہقہے گونجتے۔ سارا گاؤں اس کے قہقہوں کا عادی ہو چکا تھا۔ یوں کئی برس بیت گئے۔ بن بیاہی لڑکیوں کی مائیں اس کی تواضع میں مصروف رہتیں۔ کیونکہ جس لڑکی کا نام زین کی زبان پر آجاتا۔ اس کی شادی دو ایک ماہ میں ہو جاتی تھی۔

زین کی ماں کہا کرتی تھی کہ اس کا بیٹا اللہ کا نیک بندہ ہے۔ اس خیال کو زین کی حسنین سے دوستی نے بھی بہت تقویت بخشی۔ حسنین ایک مقدس انسان تھا، جس کا سارا وقت عبادات میں بسر ہوتا تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی مہینے روزے رکھتا۔ وہ کبھی کبھار مہینوں کے لئے گاؤں سے غائب ہو جاتا۔ وہ اپنا مصلیٰ اور پانی کا گھڑا اٹھاتا اور صحراؤں کی طرف نکل کھڑا ہوتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جاتا تھا، لیکن اس کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگ قسم کھاتے کہ اسے بیک وقت انہوں نے دو دور دراز مقامات پر دیکھا تھا۔ حسنین گاؤں کے لوگوں کو شاذو نادر ہی منہ لگاتا تھا۔ وہ بہت مقدس اور پراسرار تھا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کیا کھاتا پیتا ہے، لیکن پورے گاؤں میں ایک شخص ایسا تھا جس کے ساتھ حسنین کی دوستی تھی، اور وہ تھا زین۔ جب کسی راستے پر ان کی ملاقات ہوتی تو وہ زین کو سینے سے لگا لیتا اور کہتا "تم اللہ کے نیک بندے ہو" زین بھی جب کبھی حسنین کو آتے دیکھتا تو فضول گفتگو اور مضحکہ خیز حرکات فوراً چھوڑ کر اس کی طرف لپکتا۔ حسنین گاؤں کے کسی گھر

سے کھانا پینا پسند نہ کرتا تھا سوائے زین کے گھر کے۔ زین اپنی ماں سے کھانا تیار کرنے کے لئے کہتا اور پھر گھنٹوں زین اور حسنین اکٹھے رہتے' باتیں کرتے اور ہنستے۔ زین اور حسنین کی اس پراسرار دوستی کو سمجھنے کے لئے گاؤں والوں نے کئی بار زین کو کریدا' لیکن وہ ایک ہی جملہ کہتا "حسنین۔ اللہ کا برگزیدہ بندہ ہے۔"

زین کے انوکھے دوستوں کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ ایسے لوگ جنہیں گاؤں والے زیادہ توجہ کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ بہری آشمانہ لنگڑا موسیٰ اور بخت' جو اپاہج پیدا ہوا تھا اور اس کا بالائی ہونٹ نہ تھا۔ زین کو ان سب سے بڑی محبت تھی۔ وہ جونہی آشمانہ کو کھیت سے آتے اور سر پر لکڑی کا گٹھا اٹھائے دیکھتا۔ اس کی طرف بھاگ کر گٹھا اپنے سر پر رکھتا اور اسے اس کے گھر چھوڑ آتا۔ حالانکہ آشمانہ ایسی عورت تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر یوں خوفزدہ ہو جاتے تھے جیسے وہ انسان نہ ہو درندہ ہو' لیکن زین کی اس کے ساتھ گہری چھنتی تھی اور جب وہ خاموش ہنسی ہنستی تو بہت عجیب اور پرلطف دکھائی دیتی۔

لنگڑا موسیٰ کبھی غلام ہوتا تھا۔ جب حکومت نے غلامی کا نظام ختم کر دیا تو موسیٰ نے آزاد ہونے کے باوجود اپنے پرانے صاحب حیثیت آقا کے پاس ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا آقا موسیٰ سے بہت محبت کرتا تھا' لیکن جب موسیٰ کا آقا مر گیا اور اس کے بیٹے نے ساری جائیداد اللے تللوں میں اڑا دی تو موسیٰ کو بھی گھر سے نکال باہر کیا۔ بوڑھے لنگڑے موسیٰ کا تو دنیا میں کوئی بھی نہ تھا' گھر نہ خاندان۔ وہ بے چارہ آوارہ بے مالک کتے کی طرح گاؤں میں رہنے پر مجبور تھا۔ زین کو اس پر بڑا رحم آیا۔ اس نے اس کے لئے ایک کوٹھڑی بنا دی' دودھ کے لئے ایک بکری فراہم کر دی۔ ہر صبح زین اس کی خیریت دریافت کرنے جاتا اور غروب آفتاب کے بعد اس کے لئے کبھی کھجوریں' کبھی چائے' کبھی چینی' کبھی کھانے پینے کی دوسری چیزیں لے کر پہنچتا۔ اگر کوئی موسیٰ سے پوچھتا کہ اس کی زین سے دوستی کس نوعیت کی ہے تو وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا "زین اللہ کا نیک بندہ ہے۔"

گاؤں کے لوگ بھی زین کو صوفی' ولی اور اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھنے لگے تھے' لیکن زین اکثر اپنی حرکتوں سے لوگوں کا یہ تاثر ختم کر دیتا۔ جونہی وہ کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتا وہ اس پر مرمٹتا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں پورے گاؤں میں بھاگتے ہوئے اپنے قتل ہونے کا بلند بانگ لہجے میں اعلان کرنے لگتا۔۔۔۔!

اس گاؤں میں ایک ایسی دوشیزہ بھی رہتی تھی جو دوسری تمام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ شیریں اور پیارے خدوخال اور بے پناہ جھیل سی آنکھوں والی۔ وہ اکثر زین کو بھاگتے' شور مچاتے اور حماقتیں کرتے دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن جب زین عورتوں کے ہجوم میں گھرا شرارتیں کر رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا وہ لڑکی اچانک زین پر برس پڑی۔ "تم یہ بے ہودہ حرکات کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ کیا دنیا میں اچھے کام ختم ہو گئے ہیں۔" زین کو جھاڑنے کے بعد اس نے دوسری عورتوں کو بھی شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔ زین کا قہقہہ دم توڑ گیا' شرم سے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر جلدی سے وہاں سے چل دیا۔

اس خوبصورت' دوسروں سے مختلف جوان لڑکی کا نام نعیمہ تھا۔

○

آمنہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ اس نے دودھ بیچنے والی حلیمہ کو کریدا۔ "یہ تو بتاؤ کہ کس لڑکی کی شادی زین سے ہو رہی ہے۔" دودھ بیچنے والی حلیمہ نے جواب دیا "نعیمہ" حلیمہ کو پھر سماعت پر شبہ ہوا۔ "نعیمہ۔ ناممکن۔ بھلا وہ لڑکی کس طرح زین کے ساتھ شادی پر آمادہ ہو سکتی ہے۔؟" آمنہ کی حیرت پر آہستہ آہستہ غصہ اور رنج غالب آنے لگا۔ دو ماہ پہلے کے واقعات اسؑ کو یاد آنے لگے اور اس کے دل کی رنجش اور تلخی میں اضافہ

کرتے چلے گئے۔

نعیمہ کی ماں سعدیہ اور آمنہ میں ایک عرصے سے بول چال بند تھی۔ آمنہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ زندگی بھر سعدیہ سے گفتگو نہ کرے گی۔ لیکن اس کے بڑے بول کا اس کے اپنے بیٹے نے سرنیچا کر دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ جب آمنہ کی ماں کا انتقال ہوا تو سارے گاؤں کی عورتیں پرسہ دینے اور تعزیت کے لئے آمنہ کے گھر آئیں سوائے سعدیہ کے۔ آمنہ کو اس کا شدید رنج ہوا اور اس رنجش کی انتہا میں وہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر گئی کہ ان دنوں سعدیہ گاؤں میں تھی ہی نہیں۔ بلکہ میروی کے ہسپتال میں ایک مہینے تک بیمار پڑی رہی تھی۔ جب وہ ہسپتال سے گاؤں واپس آئی تو گاؤں کی سب عورتیں اس کی خیر خیریت دریافت کرنے گئیں۔ سوائے حلیمہ کے۔! اس کے بعد گاؤں کی عورتوں کے دو دھڑے بن گئے۔ ایک آمنہ کا حامی تھا اور دوسرا سعدیہ کا۔۔۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سعدیہ اور آمنہ میں بول چال مستقل طور پر بند ہو گئی۔

دو ماہ پہلے یوں ہوا کہ آمنہ کے بیٹے نے اپنی ماں سے اصرار کیا کہ وہ سعدیہ کے ہاں جائے اور سعدیہ سے اس کی بیٹی نعیمہ کے رشتے کی بات کرے۔ آمنہ بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ اپنے وقار اور قسم کو بھول کر وہ سعدیہ کے گھر چلی گئی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ جب کافی کا پانی چولہے پر ابل رہا تھا۔ پیالیاں اور شکر دانی وغیرہ میز پر رکھ دی گئی تھیں۔ سعدیہ نے آمنہ کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا اور اس سے بھی کہیں زیادہ ٹھنڈے لہجے میں اس سے پوچھا کہ کیا وہ کافی پیئے گی۔ آمنہ نے انکار کر دیا تو اس کے بعد سعدیہ نے اسے دوبارہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ آمنہ اپنے آپ کو بہت نکو اور شرمسار محسوس کر رہی تھی' لیکن اب چونکہ وہ وہاں آچکی تھی۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے اس نے دل کی بات کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا "سعدیہ بہن میں نے قسم کھائی تھی کہ خواہ مرگ ہو یا خوشی میں تمہارے گھر کبھی نہ آؤں گی۔ کیونکہ یہ صرف تم ہی تھیں جو میری والدہ کے انتقال پر مجھ سے تعزیت کرنے نہ آئیں تھیں' لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناطے سے میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ آج جو میں آئی ہوں تو اس کی ایک وجہ ہے۔ میں اپنے بیٹے احمد کے لئے آئی ہوں۔ میں اور احمد کے والد نعیمہ کو اپنی بہو بنا کر بہت خوش ہوں گے۔" جب اس نے بات ختم کی تو محسوس کیا کہ اس کی زبان لکڑی کا خشک ٹکڑا بن چکی ہے۔ سعدیہ خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر وہ جواب میں ایک لفظ بھی کہہ دیتی تو آمنہ کا ذہنی تناؤ ختم ہو جاتا۔

سعدیہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ سات دولتمند اور خوشحال بھائیوں کی بہن' جسے اپنے بھائیوں کی دولتمندی اور اثر و رسوخ کا پورا احساس تھا۔ اس کے والد کی لمبی چوڑی جائیداد تھی کھجوروں کے ان گنت درخت' گائیں اور دوسرے مویشی' اس کا خاوند بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ سعدیہ کے تین بیٹے تھے جنہوں نے سکول میں تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازم تھے اور پھر وہ نعیمہ جیسی حسین بیٹی کی ماں تھی۔ جس کے لئے کئی صاحب حیثیت نوجوانوں کے رشتے آچکے تھے۔ سعدیہ بہت دیر تک خاموش رہی اور اس دوران میں آمنہ کی جان گویا سولی پر اٹکی رہی۔ پھر اس نے بڑے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "خدا کی جو مرضی ہو گی وہ پوری ہو گی۔ قدرتی بات ہے کہ فیصلہ نعیمہ کے ابو نے کرنا ہے۔ آج وہ گھر آئیں گے تو میں بات کروں گی۔"

آمنہ کو آج دو ماہ پہلے کا یہ واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد آرہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ چند دنوں کے بعد رشتے سے انکار کر دیا گیا اور عذر یہ پیش کیا گیا کہ نعیمہ ابھی چھوٹی ہے۔ شادی کے قابل نہیں ہوئی اور اب وہ اسے اس بدہیئت اور مضحکہ خیز زین سے بیاہ رہے تھے۔ آمنہ نے سوچا کہ یہ محض اسے چڑانے اور اس کی اہانت

کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں نفرت اور غصے سے پھیلنے لگیں۔

○

نعیمہ کو بچپن کا وہ زمانہ اچھی طرح یاد تھا جب اس کی ماں سے ملنے کے لئے آنے والی خواتین اس کی خوبصورتی کی تعریف کیا کرتی تھیں اور اسے اپنے زانوؤں پر بڑی محبت سے بٹھایا کرتی تھیں۔ اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر بوسے ثبت کیا کرتی تھیں۔ بازوؤں میں بھینچتی اور سینے سے لگاتی تھیں۔ نعیمہ کو ایسی عورتوں کی ان حرکتوں سے نفرت تھی اور وہ اکثر چیخنے لگتی تھی۔ جب وہ لڑکی نہ رہی جوان ہو گئی تو وہ جہاں سے گزرتی کیا مرد کیا عورت اسے مڑ کر ضرور دیکھتے تھے' لیکن نعیمہ کے نزدیک اس کی خوبصورتی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح اس نے اپنے والد کو مجبور کر کے سکول میں داخلہ لیا تھا۔ ایک مہینے میں ہی اس نے لکھنا بھی شروع کر دیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں اس کا جی بہت لگتا تھا۔ اس نے قرآن پاک کا بہت سا حصہ زبانی بھی یاد کر لیا۔ بعض آیات تو ایسی تھیں جو اس پر وجد طاری کر دیتی تھیں۔ نعیمہ ایک سنجیدہ دوشیزہ کی حیثیت سے اپنی شخصیت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ بہت ذمے دار تھی۔ گھریلو کام کاج میں بڑے انہماک سے اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ اپنے والد کے ساتھ وہ ایسے ایسے موضوعات پر بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگی کہ بعض اوقات اس کا والد بھی حیران رہ جاتا۔ اس کا بھائی جو عمر میں اس سے دو برس بڑا تھا۔ وہ نعیمہ سے کہتا کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھے۔ "تم ایک وکیل یا ڈاکٹر بن سکتی ہو۔" لیکن نعیمہ کو اس طرح کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جواب دیتی۔ "اتنی تعلیم ہی کافی ہے کہ انسان قرآن پاک پڑھ سکے اور لکھ سکے۔" اس کا بھائی ہنس کر کہتا۔ "کل کلاں کو کوئی نوجوان تم سے شادی کر کے لے جائے گا اور ہم تمہاری محبتوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔"

گھر کا ہر فرد سمجھتا تھا کہ اس سنجیدہ لیکن بے پناہ خوبصورت چہرے والی لڑکی کے دل میں کوئی ایسی بات ہے جسے اس نے سب سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ جب وہ سولہ برس کی ہوئی تو گھر میں اس کی ماں سعدیہ ان خوشحال خوب صورت اور صحت مند لڑکوں اور ان کے خاندانوں کی بات چھیڑ دیتی۔ جن کے رشتے آ چکے تھے' لیکن ایسی تمام گفتگو سننے کے بعد نعیمہ اپنے کندھے جھٹک دیتی۔ اور جب آمنہ اپنے بیٹے احمد کے لئے نعیمہ کا رشتہ مانگنے آئی اور اس نے جواب میں کہا تھا کہ فیصلہ تو نعیمہ نے کرنا ہے۔ جب ماں نے بیٹی کو اس رشتے کے بارے میں بتایا تو نعیمہ نے کندھے جھٹک کر کہا تھا۔ "ابھی میں شادی نہیں کروں گی؟" سعدیہ نے اس پر کوئی بحث نہ کی۔ کیونکہ وہ تو خود آمنہ کے ساتھ رشتہ کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

ادریس کا رشتہ آیا تو گھر والوں کا ردعمل بڑا خوشگوار تھا۔ ادریس تعلیم یافتہ تھا۔ ثانوی سکول میں استاد تھا۔ حاجی ابراہیم (نعیمہ کے والد) سعدیہ اور نعیمہ کے تینوں بھائی اس رشتے کے حق میں تھے۔ نعیمہ نے اپنی نارضامندی کا اظہار کیا تو اس کا والد حاجی ابراہیم طیش میں آ گیا۔ وہ اسے طمانچہ مارنے ہی کو تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے چہرے میں کوئی ایسی چیز نظر آئی کہ اس کا ہاتھ رک گیا۔ اور غصہ بھی کافور ہو گیا۔ اس دن کے بعد نعیمہ کی شادی کی بات پھر گھر میں نہ ہوئی۔

جب نعیمہ اکیلی خیالوں میں گم ہوتی تو شادی کا خیال اس کے ذہن میں کئی بار آتا۔ شادی کا اس کے ذہن میں کچھ عجیب سا تصور تھا کہ شادی اچانک اور بغیر کسی منصوبے اور تیاری کے ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح خدا کے بندے اچانک بیمار ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ دریائے نیل میں اچانک طغیانی آتی ہے' طوفان آتے ہیں اور کھجوروں کے درخت پر پھل نمودار ہوتا ہے۔ شادی کا خیال اسے آتا تو اس سے اسے نہ مسرت ہوتی نہ نفرت نہ بیزاری'

بس وہ یہ سمجھتی کہ اس طرح اس کے کندھوں پر ایک اور بھاری ذمے داری آن پڑے گی۔ اس کی عمر کی ہر لڑکی کا ایک ہی خواب ہوتا ہے۔ جس میں وہ کسی شوہر کو دیکھتی ہیں' جو ایک دن اسے آکر لے جاتا ہے لیکن نعیمہ نے ایسا خواب کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے ذہن اور تصور کا عالم کچھ عجیب تھا۔ زین اس کے تصورات پر چھا چکا تھا اور جب زین کا خیال اس کے دل میں آتا تو وہ عجیب طرح کی سنسنی اور شفقت محسوس کرتی۔ ایسی ہی شفقت جو ماں اپنے بچوں کے لئے اپنے دل میں پاتی ہے۔ لیکن اس شفقت اور محبت کے جذبے میں رحم کا جذبہ قوی ہوتا تھا۔ زین نعیمہ کے لئے اجنبی تو تھا نہیں' وہ اس کا کزن تھا۔

زین کی ماں نے یہ کبھی پریشانی مول نہ لی تھی کہ اس کا بیٹا شب و روز کہاں بسر کرتا ہے۔ وہ ایک بے چین روح کی طرح تھا۔ جس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا' لیکن جہاں کہیں شادی ہوتی وہاں زین کا پایا جانا یقینی تھا۔ خواہ طوفان آیا ہو یا دریائے نیل بپھر رہا ہو۔ زین شادی کی تقریب میں ہر دشواری کا مقابلہ کر کے پہنچ جاتا تھا۔ فاصلے اور دوریاں اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔

ایک صبح جب موذن اذان دے رہا تھا اور مشرقی افق پر سرخی نمودار ہونے لگی تھی اور زین ابھی تک اپنے گھر نہ لوٹا تھا۔ اس کی ماں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ زین کے ماموں کے پاس جائے اور اسے کہے کہ وہ زین کا پتہ چلائے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک دھڑاک سے دروازہ کھلا اور پھر اس نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ وہ بے اختیار چیخ پڑی۔ حتیٰ کہ چار گھر دور حاجی ابراہیم نے بھی اس چیخ کو سنا جو فجر کی نماز پڑھنے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر لوگوں سے بھر گیا۔ زین کی ماں پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ کچھ لوگوں نے اسے سنبھالا دے رکھا تھا اور کچھ زین کے اردگرد جمع تھے۔ جس کے سر پر گہرا زخم تھا اور زخم داہنی آنکھ تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے لباس پر خون کے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ عبدالحفیظ نے چیخ کر زین سے پوچھا۔ "کون ہے وہ بدمعاش جس نے تمہارا یہ حال کیا ہے؟" نعیمہ دوسری عورتوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں زین کے زخم پر گڑی ہوئی تھی۔ "ڈاکٹر کو بلاؤ" حاجی ابراہیم نے کہا۔ محجوب بھی چیخا "ڈاکٹر کو بلاؤ" عورتوں کا رونا دھونا کچھ کم ہو گیا۔ احمد اسماعیل اپنے گدھے پر سوار ڈاکٹر کو لینے کے لئے چلا گیا۔

دو ہفتے کے بعد جب زین میروی کے ہسپتال سے واپس گاؤں آیا تو اس کا چہرہ اور کپڑے صاف اور بے داغ تھے اب جب اس نے قہقہہ لگایا تو کھلے منہ میں اوپر نیچے ایک ایک دانت دکھائی نہ دیا' بلکہ اس کے منہ میں موتیوں جیسے سفید دانت جڑے ہوئے تھے۔ اس کی ہیئت ہی بدلی ہوئی تھی۔ نعیمہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ زین میں اب کشش کا ایک عنصر شامل ہو گیا تھا۔ اس نے میروی کے ہسپتال میں اپنے قیام اور سفر کو بہت بلند کیا تھا جس کے قصے وہ بہت پرلطف انداز میں اپنے دوستوں کو سناتا۔ لوگ مزہ لینے کے لئے اسے سے پوچھتے۔ "زین یہ تو بتاؤ کہ وہ ہسپتال میں تمہیں کھانے کو کیا دیتے تھے' تمہارا پیٹ کیسے بھرتے تھے۔ زین کے منہ میں پانی بھر آتا۔ وہ طرح طرح کے کھانوں اور پکوانوں کا ذکر کرتا اور بتاتا کہ وہ کس طرح اپنے پیٹو پن کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ وہ بتاتا' ایک نرس میرا خاص خیال رکھتی تھی۔ وہ سب ہنستے اور پوچھتے۔ "کیا تم اس نرس پر بھی مرمٹے تھے؟"

زین کے دبلے پتلے جسم میں طاقت تو پہلے بھی بہت تھی' لیکن ہسپتال سے واپسی کے بعد تو اس میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ اس کے دوست بھی اس کی اس تبدیلی پر خاصے حیران ہوئے تھے اور پھر سیف الدین والے

واقعے نے تو سب کو چونکا دیا۔ کسی بات پر زین سیف الدین سے الجھ گیا۔ سیف الدین نے جواب میں کوئی سخت بات کہدی۔ زین اس پر پل پڑا اور چیخنے لگا۔ "میں اس گدھے کو قتل کر دوں گا۔" سیف الدین اپنے گلے کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت صرف کر رہا تھا لیکن زین کی گرفت سخت اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ طاہر' احمد اسماعیل اور دوسرے لوگوں نے سیف الدین کو زین کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی' لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ اب صورت حال بہت گمبھیر ہو رہی تھی۔ سیف الدین کا دم گھٹنے لگا تھا' آنکھیں ابلنے لگی تھیں۔ سب لوگ چیخ رہے تھے' زین کو سمجھا رہے تھے لیکن وہ کسی کی نہیں سن رہا تھا اور پھر چیختی آوازوں میں ایک ملائم لیکن مضبوط آواز سنی گئی۔ زین' اللہ کے بندے اسے چھوڑ دو۔" یہ حسنین کی آواز تھی جسے سنتے ہی زین نے نیم مردہ سیف الدین کو اپنے آہنی شکنجے سے آزاد کر دیا اور پھر چند منٹوں کے لئے وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ یہ محجوب جو سیف الدین پر جھکا ہوا تھا اس نے سر اٹھایا اور خوشی سے بولا۔ "اللہ کا احسان ہے کہ سیف الدین زندہ ہے۔" وہ سیف الدین کو اٹھا کر سعید کی دکان کے سامنے والے بنچ پر لے گئے اور اسے وہاں لٹا دیا زین خاموش کھڑا تھا وہ حسنین کے سامنے سر نہ اٹھا رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولنے لگا۔ "سیف الدین نے مجھ پر کلہاڑے سے حملہ کیا تھا۔ اس نے میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کی بہن اگر مجھ پر مرتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور....؟"

خاموشی اور خوف کی فضا میں زین کے معصوم اور بے ساختہ جملے نے دراڑ ڈال دی اور لوگ مسکرانے اور ہنسنے لگے۔

"سب لڑکیاں تمہیں پسند کرتی ہیں۔" حسنین نے کہا "اللہ کے بندے کل تمہاری شادی گاؤں کی سب سے اچھی لڑکی سے ہو گی۔"

محجوب نے اپنے دل کی دھڑکن کو یک لخت تیز ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے دل میں کہا "حسنین جیسے خدا کے برگزیدہ بندوں کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔ اور وہ جو پیش گوئی کرتے ہیں وہ ضرور پوری ہوتی ہے اس کے باوجود جانے اسے کیا ہوا کہ وہ بول پڑا۔ "اس جیسے پاگل کو اپنی بیٹی کون دے گا۔" حسنین نے محجوب کو سخت نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "زین پاگل نہیں' اللہ کا نیک بندہ ہے۔ کل اس کی شادی گاؤں کی سب سے اچھی لڑکی سے ہو گی۔" یہ سن کر اچانک زین اپنے مخصوص بے تکلفانہ سادہ انداز میں ہنسنے لگا۔ حسنین نے سیف الدین کو اشارہ کیا۔ جو اب ہوش میں آکر سنبھل چکا تھا اور اسے کہا۔ "ایک دوسرے سے صلح کرو ایک دوسرے کے سروں پر بوسہ دو' دل کی تلخی ختم کر دو۔" زین نے پہل کی اور سیف الدین کے ماتھے کو چوم لیا۔ پھر وہ حسنین کی طرف بڑھا اور اس کے ماتھے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ سیف الدین کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں اور چہرے پر پچھتاوہ تھا۔ وہ بولا۔ "زین میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی' مجھے معاف کر دو۔" پھر اس نے زین کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے بعد اس نے حسنین کا ہاتھ تھاما۔ اور اس کو عقیدت سے بوسہ دیا۔ حسنین نے نرم اور ملائم آواز میں اسے دعا دی۔ محجوب نے ہمت کر کے حسنین سے درخواست کی۔ "آج رات آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔" حسنین نے نرمی سے انکار کر دیا اور بولا۔ "میرا کھانا تو اللہ کے اس بندے زین کے گھر ہے۔ اس کے بعد وہ زین کو ساتھ لے کر چلے گئے اور تمام لوگ وہاں کھڑے ان کو شام کی تاریکی میں مدغم ہوتے دیکھتے رہے۔

اس روز سیف الدین اور زین کی لڑائی ایک ایسا واقعہ تھا جسے وہ آٹھ آدمی ساری عمر نہ بھول سکے جو اس وقت سعید کی دکان کے سامنے اس سارے واقعے کے چشم دید گواہ تھے یہ سب بوڑھے اور نانا' دادا بن گئے' لیکن یہ دن اور اس دن کا یہ واقعہ انہیں یاد رہا۔ یہ دن ایسا تھا جسے اس گاؤں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی

تھی۔ ان میں بعض تو ایسے تھے کہ انہیں پکا یقین تھا کہ زین کی آہنی گرفت ایسی تھی کہ سیف الدین مر گیا تھا۔ یہ تو حسنین جیسے خدا رسیدہ انسان کا معجزہ تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہو گیا۔ بہرحال اس حقیقت سے تو سیف الدین کبھی انکار نہ کر سکا کہ اس روز موت کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

سیف الدین ــــ۔ سنار بیضاوی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بیضاوی گاؤں کا دولت مند ترین آدمی تھا۔ مدتوں پہلے وہ سنار کا کام چھوڑ کر تجارت کرنے لگا تھا۔ لیکن لوگ اب بھی اسے سنار کے بیٹے کے نام سے ہی جانتے تھے۔ اب وہ زمیندار اور صاحب جائیداد تھا۔ سیف الدین کی پانچ بہنیں تھیں۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ والدین کا چہیتا تھا۔ بیضاوی نے اپنے بیٹے سیف الدین کی تعلیم پر بہت پیسہ خرچ کیا تھا' لیکن سیف الدین کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باپ نے بیٹے کو گاؤں میں کاروبار شروع کروایا لیکن ایک ماہ میں ہی سیف الدین نے کاروبار کا دیوالہ نکال دیا۔ پھر وہ اسے ایک کارخانے میں لے گیا کہ سیف الدین کوئی ہنر ہی سیکھ لے۔ لیکن سیف الدین وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ سب طرف سے ناکامی کے بعد بیضاوی نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے اسے ایک چھوٹے درجے کی سرکاری ملازمت دلوا دی' لیکن سیف الدین یہاں بھی نہ چل سکا اور اس کا باپ اسے گاؤں واپس لے آیا۔ گاؤں میں اس کے باپ نے اس پر سختی کرنی شروع کر دی۔ سیف الدین مویشیوں کے لئے چارہ تیار کرتا۔ کھیتوں میں کام کرتا' اس سے ایندھن تیار کروایا جاتا اس کے باوجود شام کو سیف الدین وہاں پہنچ جاتا جہاں شراب ملتی تھی۔ اس گھر میں سابقہ باندیاں رہتی تھیں جو اب آزاد ہو چکی تھیں اور لوگوں کا دل بہلایا کرتی تھیں۔ گاؤں والوں نے کئی بار اس گھرانے کو تباہ کرنے کی کوشش کی' لیکن وہ کہیں نہ کہیں اپنے لئے نیا ٹھکانہ بنا ہی لیا کرتی تھیں۔ سیف الدین نے ایک عورت کو اپنی داشتہ بنا لیا تھا۔ اس کے باپ کو اس کی کرتوت کی خبر پہنچتی تو وہ نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا' لیکن صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک دن جب بیضاوی نماز پڑھنے کی تیاری کر رہا تھا تو بیٹا سیف الدین ایسی حالت میں اس کے سامنے آیا کہ منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ شراب کے نشے میں اس نے بوجھل اور لڑکھڑاتی آواز میں اپنے باپ سے کہا۔ "میں سارہ سے شادی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" سارہ ان ہی سابقہ باندیوں میں سے ایک تھی جو اب آزاد ہو چکی تھی۔ بیضاوی نے سیف الدین کی پٹائی شروع کر دی۔ ماں رونے لگی' لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سیف الدین کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو عاق کر کے اسی وقت اپنے گھر سے نکال دیا اور اگلی صبح سیف الدین گاؤں سے غائب ہو گیا۔

سنار بیضاوی نے اپنی باقی ماندہ زندگی رنج و الم میں گزاری وہ کہا کرتا۔ "میرا بیٹا مر چکا ہے۔ حالانکہ سیف الدین کے بارے میں اسے خوفناک اور لرزا دینے والی اطلاعات اکثر ملتی رہتی تھیں' کبھی خبر ملتی کہ وہ دھوکہ دہی اور فریب میں جیل بھجوا دیا گیا ہے کبھی اطلاع آتی کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا اور وہ اب جیل میں سزا بھگت رہا ہے۔ سیف الدین کی عدم موجودگی میں اس کا ماموں بیضاوی کو مسلسل یہ ترغیب دیتا رہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد اپنی بیوی اور بیٹیوں کے نام لگا دے۔ گاؤں کے دوسرے معتبر لوگ بھی اسے یہی مشورہ دیتے' لیکن بیضاوی کہتا کہ ابھی میں بھلا چنگا صحت مند ہوں۔ جب مجھے احساس ہو گا کہ میں مرنے والا ہوں تو وصیت لکھ دوں گا۔

اور پھر رمضان کے مہینے میں ایک رات جب بیضاوی تراویح سے فارغ ہوا تو اس کا آخری وقت آ گیا۔ وہ ایک نیک آدمی تھا۔ اسی لئے رمضان کے مقدس مہینے میں اس نے انتقال کیا تھا اور پھر ابھی گاؤں میں بیضاوی کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا کہ سیف الدین اچانک نمودار ہو گیا۔ مشرقی سوڈان میں لوگ جس طرح کی لاٹھی لے کر چلتے ہیں۔ ایسی ہی لاٹھی اس کے ہاتھ میں تھی اور اس کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے سر اور

ڈاڑھی کے بال گندے اور الجھے ہوئے تھے۔ کسی نے اس کا استقبال نہ کیا' سب خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اس کا ماموں اٹھا اور اس نے سیف الدین کے چہرے پر نفرت سے تھوک دیا اور جب اس کی آمد کی خبر زنانے میں اس کی ماں اور بہنوں کو ملی تو وہ یوں بین کرنے لگیں جیسے بغدادی کا ابھی ابھی انتقال ہوا ہو۔ سیف الدین اس ساری نفرت کے باوجود اپنے باپ کا ترکہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ماموں اور دوسرے لوگوں نے البتہ اتنی ہوشیاری ضرور کی کہ بیوہ اور بیٹیوں کا حصہ ان کو دلوا دیا۔ سیف الدین اللے تللے میں زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ اکثر سفر پہ جاتا۔ کبھی خرطوم' کبھی قاہرہ۔ وہ گاؤں محض کام کے لئے آتا۔ زمین بیچنے اور پیسے کھرے کرنے۔ لوگ اسے کوڑھی سمجھتے تھے اور عموماً" اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس نے گاؤں کا سکون غارت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

لیکن پھر وہ واقعہ ہوا۔ جب اس نے زین پر کلہاڑے سے حملہ کیا اور زین نے اسے دبوچ لیا اور پھر حسنین نے ان کی صلح کرا دی۔ اس واقعہ نے سیف الدین کی گویا کایا ہی پلٹ دی۔ وہ اپنی ماں کے قدم چومنے لگا۔ اس نے اپنے سارے ماموں چچا بلوائے اور ان سے معافی مانگی۔ جو جائیداد اس کے پاس بچ گئی تھی۔ اس کا انتظام بھی اس نے اپنے ماموں کے سپرد کر دیا اور پھر لوگوں نے جمعہ کے دن سیف الدین کو مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے دیکھا۔ وہ مسجد میں صفائی کرتے ہوئے دیکھا جانے لگا' امام صاحب کا وعظ سن کر وہ رونے لگتا۔ اس نے گاؤں کے جس شخص کے ساتھ بھی زیادتی کی تھی وہ خود اس کے پاس گیا اور اس سے معافی کا طلب گار ہوا۔ اس نے شراب چھوڑ دی' بدقماشوں کی صحبت ترک کر دی۔ وہ اپنے باپ کے کاروبار اور عبادت میں مگن رہتا۔ اس کی منگنی بھی کر دی گئی اور پھر اس نے حج بیت اللہ کا قصد کر لیا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔

گاؤں کی زندگی بدل گئی تھی۔ اس گاؤں کے لئے حسنین جیسے خدا رسیدہ بزرگ نے فضل و برکت کی دعا کی تھی اور پھر وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گیا' لیکن زین ----- ابھی اس کی شادی نہ ہوئی تھی' لیکن ہر شخص جانتا تھا کہ گاؤں کی سب سے اچھی اور خوبصورت لڑکی نعیمہ ہے اور حسنین کی پیش گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ گاؤں کے سکول کا ہیڈ ماسٹر جو پچاس کے پیٹے میں تھا۔ وہ اس عمر میں کئی بچوں کا باپ ہونے کے باوجود نعیمہ سے شادی کا خواہاں تھا اور ایک دن وہ رشتہ مانگنے بھی چلا گیا۔ نعیمہ کے والد حاجی ابراہیم نے اسے کہا۔ "تم کسی بیوہ عورت سے شادی کر لو۔" اور پھر اسے گھر سے نکال دیا۔ گاؤں کی مسجد کے امام بھی نعیمہ سے شادی کی خواہش رکھتے تھے۔ گاؤں کے لوگ کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ لیکن زین اس ساری دھڑے بندی کو نظر انداز کر کے سب سے یکساں ملتا اور اپنی سادگی سے قہقہے لگاتا پھرتا۔ اور پھر افواہ اڑی کہ حسنین نعیمہ کے خوابوں میں آتے ہیں اور اسے کہتے ہیں۔ "تم زین سے شادی کر لو۔ وہ اللہ کا نیک بندہ ہے۔ تم خسارے میں نہ رہو گی۔" اور پھر ایک دن نعیمہ نے یہ خواب اپنے گھر والوں کو سنا دیئے اور انہوں نے نعیمہ کی شادی زین سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ اس گاؤں کی تاریخ کی سب سے انوکھی' سب سے شاندار اور تہلکہ خیز شادی تھی۔ وہ جو دلوں میں جل اور کڑھ رہے تھے جیسے آمنہ اور دودھ بیچنے والی حلیمہ اور کئی مرد' وہ بھی اس شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ امام مسجد نے شادی کی مذہبی رسوم مسجد میں ادا کیں۔ نعیمہ کی طرف سے اس کے والد حاجی ابراہیم نے اور زین کی طرف سے محجوب نے نمائندگی کی۔ جب نکاح کی رسم پوری ہوئی۔ نکاح نامہ لکھا گیا تو محجوب اٹھا اور اس نے جہیز میں ملنے والے اس طشت کو سب کی نگاہوں کے سامنے کر دیا۔ جس میں حاجی ابراہیم کی طرف سے بیٹی کے جہیز میں سونے کے سو پونڈ دیئے گئے تھے۔ امام مسجد نے دعا پڑھی اور پھر مبارک سلامت کا دور شروع ہوا۔

مبارک دینے والوں میں امام مسجد نے پہل کی۔ زین جو نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے کندھے پر امام مسجد نے ہاتھ رکھا اور بولا "مبارک ہو۔ اللہ تمہارا گھرانہ شادو آباد رکھے۔ خدا تمہیں اولاد سے نوازے۔
اور پھر باہر گلی میں ڈھول ڈھمکے کا شور شروع ہو گیا۔
شادی کی دعوت میں دور دور سے لوگ آئے۔ شادی کی دعوت کے لئے کتنے ہی اونٹ' گائے اور بیل اور بھیڑیں ذبح کئے گئے تھے۔ ہر وہ شخص جو اس ضیافت میں شریک ہوا اس نے پیٹ بھر کے کھایا۔ زین سجا سنورا بیٹھا تھا۔ اس نے شاندار لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی بج رہی تھی۔ مجوب نے اسے کہا۔ "اب تم مرد بن گئے ہو۔" دعوت میں اس علاقے کے سرکاری ملازم' بدو' خانہ بدوش تک شریک ہوئے تھے۔ گانے والوں کی بھی کمی نہ تھی اور پھر روایتی رقص بھی ہوا۔ جس میں ناچنے والوں نے زین کو بھی گھسیٹ لیا۔ بہری گونگی آشانہ اور لنگڑا یوسف تو زین کی شادی پر سب سے زیادہ خوش تھے۔ وہ تالیاں بجا بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہے تھے اور پھر شادی کے اس ہنگامے سے زین اچانک کہیں اٹھ کر چلا گیا۔
مجوب کو سب سے پہلے زین کی عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ اسے ہجوم میں تلاش کرنے لگا' لیکن وہ کہیں نظر نہ پڑا۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی اور پھر وہ اسے ڈھونڈنے لگے' لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ رات تاریک تھی اور گاؤں میں ناچ اور رقص کی آوازیں گونج رہی تھیں اور دلہا ۔۔۔ غائب تھا۔ اچانک مجوب کو ایک خیال آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "قبرستان چلو۔"
لوگ بے دلی سے مجوب کے ساتھ چل پڑے۔ بھلا اس وقت زین کا قبرستان میں کیا کام .... وہ قبروں میں سے گزر رہے تھے کہ جب شیخ حسنین کی اونچے کتبے والی قبر کے قریب انہیں ایک سایہ دکھائی دیا اور پھر سسکیاں .... ان کے قدم زمین پر گڑ گئے۔ تاریک رات میں قبرستان میں کوئی رو رہا تھا۔ مجوب آگے بڑھا۔ حسنین کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا زین آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے زین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "زین تم شادی کی رات یہاں کیوں آئے؟" زین نے کوئی جواب نہ دیا۔
اس کے گریہ میں شدت پیدا ہو گئی پھر وہ آنسو سے بوجھل آواز میں ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا۔
"اگر آج میرے شیخ حسنین زندہ ہوتے تو وہ بھی شادی میں شریک ہوتے۔"
مجوب نے نرمی سے سہارا دے کر آنسو بہاتے ہوئے زین کو اٹھایا اور کہا۔ "خدا شیخ حسنین کی روح کو آسودہ رکھے وہ اللہ کے نیک بندے تھے' لیکن زین آج تمہاری شادی کی رات ہے اور اس رات کوئی مرد آنسو نہیں بہاتا۔" زین اس کے ساتھ چل پڑا۔
شادی والے گھر میں روشنی تھی۔ فاطمہ گیت گا رہی تھی۔ ڈھول ڈھمکا ہو رہا تھا اور پھر زین نے چھلانگ لگائی اور رقص کرتے ہوئے لوگوں کے دائروں اور حلقوں میں گم ہو گیا.....

طیب صالح/احمد صغیر صدیقی

مٹھی بھر کھجوریں

میں اس وقت یقیناً بہت چھوٹا رہا ہوں گا۔ مجھے یہ بات تو بالکل یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی تاہم یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب اپنے دادا کے ساتھ باہر نکلتا تھا تو مجھے ملنے والے لوگ آکر میرے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے اور کچھ میری پیٹھ تھپتھپایا کرتے تھے' اور یہ ایسی باتیں تھیں جو وہ میرے دادا کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ میں عموماً" اپنے باپ کے ساتھ نہیں بلکہ دادا کے ساتھ باہر نکلا کرتا تھا۔ جب بھی وہ کہیں باہر جاتے تھے مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بس صبح کے وقت میں اکیلا جایا کرتا تھا۔ مسجد میں قرآن پڑھنے کے لیے۔ مسجد دریا اور کھیت ہماری زندگی میں یہی چیزیں سنگ میل کا درجہ رکھتی تھیں۔ میرے ساتھی بچے مسجد میں قرآن پڑھنے جانے سے عموماً" جی چراتے تھے لیکن مجھے جانے میں مزہ آتا تھا۔ بلاشبہ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ شیخ مجھے پسند کرتے تھے کیونکہ میرا حافظہ اچھا تھا اور میں سورتیں جلد یاد کرلیتا تھا۔ پھر جب مسجد میں کوئی اہم آدمی آتا تو شیخ مجھ سے کہتے تھے اور میں کھڑے ہو کر سورۃ فاتحہ کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ مسجد میں آنے والے لوگ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے' بالکل اس طرح جیسے اور لوگ میرا خیر مقدم کرتے تھے جب میں دادا کے ساتھ گھر سے نکلتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مجھے مسجد سے لگاؤ تھا اور مجھے دریا سے بھی بڑی محبت تھی۔ قرآن کے سبق سے فارغ ہو کر میں سیدھا گھر بھاگتا تھا۔ وہاں اپنا بستہ اور تختی پٹخنے کے بعد میں جلدی جلدی ناشتہ کرتا تھا اور پھر ہرنوں کی طرح چوکڑی بھرتا ہوا دریا کی طرف نہانے کے لیے نکل جاتا تھا۔ جب میں تیراکی سے تھک جاتا تھا تو کنارے بیٹھ کر پانی کو دیکھتا رہتا تھا مشرق کی سمت بہتے ہوئے جو آگے جاکر بہت سے درختوں کے درمیان چھپ گیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں اکثر تصوراتی باتیں سوچا کرتا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ ان درختوں کے پیچھے دیوزادوں کے قبیلے رہتے ہیں جن کے لوگ لانبے قد کے ہیں اور جن کی سپید سپید داڑھیاں ہیں اور نوکیلی ناکیں بھی--- بالکل میرے دادا جیسی۔ میرے دادا کی عادت تھی کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قبل اپنی ناک کو ضرور کھجاتے تھے یا پھر داڑھی میں انگلیاں پھیرتے تھے جو برف کی طرح سپید اور نرم تھی۔ اپنی پوری زندگی میں ایسی سفید داڑھی میں نے کسی اور کی نہیں دیکھی۔ میرے دادا کا قد بھی بہت لانبا تھا اور ان سے مخاطب ہونے والے کو اپنا سر اٹھانا پڑتا تھا۔ اسی طرح وہ جب بھی کسی دروازے میں داخل ہوتے تھے تو انہیں اپنا سر ضرور جھکانا پڑتا تھا۔ دریا بالکل اسی انداز میں خمیدہ ہو کر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے فوراً دادا کا دھیان آتا تھا۔ میں اپنے دادا کو بہت چاہتا تھا اور سوچا کرتا تھا جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو بالکل دادا کی طرح ہو جاؤں گا اور انہیں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنے دادا کا سب سے چہیتا پوتا تھا کیونکہ میں ذہین تھا جبکہ میرے عم زاد کند تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ دادا کب خاموشی پسند کرتے ہیں اور کب چاہتے ہیں کہ میں ہنسوں۔ میں ان کے نماز کے اوقات کو اچھی طرح یاد رکھتا تھا اور ٹھیک وقت پر ان کے لیے مصلیٰ لا کر بچھا دیا کرتا تھا۔ جب ان کے پاس خالی وقت ہوتا تھا تو وہ مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے یا سورتیں سنا کرتے تھے اور میری آواز میں قرآن سن کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک روز میں نے ان سے اپنے پڑوسی کے بارے میں پوچھا جس کا نام مسعود تھا۔ میں نے کہا۔ "دادا' لگتا ہے آپ مسعود کو پسند نہیں کرتے؟"

انہوں نے حسب عادت داڑھی کھجائی پھر کہا۔۔ "وہ ایک عیاش آدمی ہے اور میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔"

جواب میں دادا نے سر جھکا لیا۔ پھر سوچتے ہوئے بولے۔ "تم یہ وسیع و عریض کھیت دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے کھیتوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔ "جو اس حد سے لے کر دریائے نیل کے ساحل تک پھیلے ہوئے ہیں؟ "کیا تم کھجوروں کے ان درختوں کو دیکھ رہے ہو؟ اور ان درختوں کو۔۔۔ سنت کے' آکاسیا کے اور سیال کے؟ یہ تمام کی تمام چیزیں مسعود کو ملی تھیں۔ اس کے باپ کے ترکے کے طور پر۔"

دادا کی لحاتی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر میں نے ادھر دیکھا تھا جدھر دادا نے اشارہ کیا تھا۔ پھر میں نے سوچا۔۔ مجھے کیا یہ سب کس کے ہیں؟ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ کھجور کے درخت۔۔ یہ ٹیڑھے میڑھے پیڑ۔۔ یہ چٹخی ہوئی زمینیں۔۔۔ میری خوابوں کی دنیا کی ہیں اور میں یہاں کھیلتا ہوں۔"

"ہاں بیٹے" دادا نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ "چالیس سال قبل یہ تمام چیزیں مسعود کی ملکیت تھیں۔۔۔ مگر اب ان کا دو تہائی حصہ میرے پاس ہے۔"

یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی۔۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ تمام اشیاء میرے دادا کے پاس اس وقت سے ہیں جب سے دنیا وجود میں آئی تھی۔

"جس وقت میں اس گاؤں میں وارد ہوا تھا میرے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی۔ یہ ساری دولت اس وقت مسعود کے پاس تھی۔ مگر اب صورتحال بدل چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں سے بلاوا آنے سے قبل میں شاید اس کی بقیہ چیزیں بھی اس سے خرید لوں گا۔"

نہ جانے کیوں دادا کی یہ باتیں سن کر مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا تھا اور اپنے ہمسائے پر ترس بھی آیا تھا۔۔ میرا جی چاہا تھا کہ کاش دادا اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ پھر مجھے مسعود کی آواز کا خیال آیا تھا جو بہت مدھر اور میٹھی تھی اور جب ہنستا تھا تو لگتا تھا جیسے قریب کوئی چشمہ گنگناتا ہوا بہہ رہا ہو جبکہ میرے دادا کبھی نہیں ہنستے تھے۔

میں نے دادا سے پوچھا۔۔ "آخر مسعود نے اپنی زمینیں بیچ کیوں دیں؟"

"عورتیں۔" میرے دادا نے کہا۔ انہوں نے "عورتیں" کا لفظ اس طرح ادا کیا جیسے یہ کوئی خوفناک چیز رہی ہوں۔

"یہ مسعود جو ہے نا؟ میرے بچے' اس نے بہت سی شادیاں کی ہیں۔ ہر نئی شادی پر یہ اپنی کچھ زمین میرے ہاتھ بیچتا رہا ہے۔" وہ اس طرح کہہ رہے تھے جیسے مسعود نے کوئی نوے شادیاں کر رکھی ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ اس کی تین بیویاں ہیں' مجھے اس کا سراپا بھی یاد آیا جو بہت بھدا سا تھا۔ اس کا گدھا بھی لنگڑا تھا اور اس کی

کا تھی بھی پرانی اور شکستہ ہی نظر آیا کرتی تھی۔ میں ان خیالات سے گزر ہی رہا تھا کہ ہمیں مسعود اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ دادا نے مجھے اور میں نے دادا کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"ہم آج پیڑوں سے کھجوریں اتار رہے ہیں۔ کیا آپ لوگ چلنا پسند کریں گے؟"

مجھے نہ جانے کیوں اندازہ ہوا کہ وہ یہ بات تکلفاً" کہہ رہا ہے دل سے نہیں چاہتا کہ دادا ادھر جائیں۔ مگر دادا نے یہ موقعہ ہی چھوڑا اور فوراً تیار ہو گئے۔ بلکہ میں نے محسوس کیا جیسے ان کی آنکھیں چمک اٹھی ہیں۔ دادا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم لوگ مسعود کے ساتھ چل دیئے۔

پھر وہ کوئی ایک اسٹول اٹھا لایا' اسے دادا کے لیے بچھا دیا گیا جبکہ میں کھڑا رہا۔ وہاں اور بھی کئی لوگ تھے۔ میں انہیں جانتا تھا لیکن میری توجہ مسعود ہی کی طرف رہی۔ وہ تمام لوگوں سے الگ تھلگ اس طرح کھڑا تھا جیسے اس ساری کارروائی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو حالانکہ یہ ساری کھجوریں جو جمع کی جانے والی تھیں اسی کی تھیں۔ گاہے گاہے جب درختوں سے کھجوروں کا بڑا خوشہ نیچے زور سے گرتا تھا تو اس کی توجہ ادھر ہو جاتی تھی۔ ایک بار اس نے چیخ کر اس لڑکے سے کہا جو کھجور کی پھنگی پر ہنسیا لیے بیٹھا تھا۔ "اے لڑکے احتیاط سے کہیں کھجور کے دل کو نہ کاٹ دینا۔"

کسی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کھجور پر چڑھا ہوا لڑکا بھی بے نیاز ہی رہا اور ہنسیا تیزی سے چلا چلا کر کھجوروں کے گچھے گراتا رہا۔ کھجوریں اس طرح گر رہی تھیں جیسے آسمانوں سے برس رہی ہوں۔

میں نے البتہ مسعود کے جملے پر توجہ دی۔ یعنی "کھجور کے دل" والی بات پر۔ میں نے سوچا یہ پیڑ بھی ذی روح ہوتے ہیں۔ ہماری طرح احساسات رکھتے ہیں۔ ان کے پاس بھی دل ہوتا ہے جو ہمارے ہی دل کی طرح دھڑکتا بھی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا۔ ایک بار میں کھجور کی ایک شاخ کو گھسیٹ رہا تھا کہ مسعود نے دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا تھا۔۔ "بیٹے' تم شاید نہیں جانتے یہ درخت جو ہوتے ہیں نا۔۔۔ انہیں بھی دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے۔ اسی جملہ پر مجھے اندر سے بڑی کھسیاہٹ سی ہوئی تھی۔

دوبارہ جب میں نے ادھر نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ میرے ہم عمر ساتھی' درختوں کی جڑوں کے پاس حلقہ بنائے جمع ہو چکے ہیں اور کھجوریں اٹھا اٹھا کر کھا رہے ہیں۔ پھر یہ کھجوریں ڈھیروں کی شکل میں یکجا کر دی گئیں اور لوگ آنے لگے۔ انہیں تولا جانے لگا۔ پھر تھیلوں میں بھرا جانے لگا۔ پھر کوئی تیس بورے تیار کر لئے گئے۔ مجمع رخصت ہونے لگا۔ اب وہاں صرف دو تین افراد رہ گئے تھے۔ ایک تو سوداگر حسین تھا۔ دوسرا موسیٰ تھا جسکا کھیت قریب ہی تھا' دو اور آدمی تھے جن سے میں واقف نہ تھا۔

میں نے کچھ خرخراہٹ سی سنی تو دیکھا۔ دادا اونگھ رہے تھے اور خراٹے کی آواز ان کے منہ سے نکل رہی تھی۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ مسعود نے ابھی تک جگہ نہیں بدلی ہے' وہ جہاں تھا وہیں تھا' وہیں کھڑا ہوا تھا۔۔ صرف اس نے ایک کھجور منہ میں بھی ڈال رکھی تھی جسے وہ چبا بھی نہیں رہا تھا اور اسے منہ میں لئے اس طرح کھڑا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ وہ اس کا کیا کرے۔

یکایک میرے دادا چونک گئے۔ پھر وہ ایک دم سے اٹھے اور بوروں کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی ساتھ سوداگر حسین بھی چلا اور موسیٰ بھی اور وہ دونوں اجنبی بھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ مسعود البتہ ادھر بہت دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔ بالکل جیسے اسے کوئی زبردستی ادھر بڑھا رہا ہو۔ ان لوگوں نے کھجوروں کے بورے کے چاروں طرف حلقہ بنا لیا تھا۔۔۔ اور ان کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک آدھ نے' کھجوریں لے کر منہ میں بھی رکھ لی تھیں۔ دادا

نے ایک بورے سے مٹھی بھر کھجوریں نکالیں اور مجھے دے دیں۔ میں نے انہیں لے لیا اور کچھ کو منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ مسعود نے البتہ ایک بورے سے دونوں ہاتھ کا چلو بنا کر کچھ کھجوریں اٹھائیں۔ انہیں ناک تک لایا سونگھا اور پھر انہیں دوبارہ بورے میں انڈیل دیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہاں جمع لوگوں نے بوروں کی تقسیم شروع کر دی۔ تاجر حسین نے دس بورے لے لئے۔ بقیہ لوگوں نے پانچ پانچ۔ میرے دادا نے بھی پانچ بورے لے لئے تھے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے مسعود کی طرف دیکھا۔ جو ادھر ادھر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے۔

"تمہارے اوپر ابھی میرا پچاس پونڈ کا قرض رہ جاتا ہے۔" میرے دادا نے مسعود سے کہا۔ اس کے بارے میں ہم مسجد میں باتیں کریں گے۔"

حسین نے کچھ گدھے منگوائے' اجنبیوں کے پاس اونٹ تھے' ان کے بورے ان پر لادے گئے۔ ایک گدھے نے رینگنا شروع کر دیا جس سے اونٹ بدک اٹھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں مسعود کی سمت بڑھ رہا ہوں۔ اس سے نزدیک ہو رہا ہوں اور اس کی عبا کو چھونا چاہتا ہوں۔ پھر مجھے احساس ہوا جیسے اس نے حلق میں کچھ آواز پیدا کی ہو۔ یہ آواز ایسی ہی بھنچی بھنچی تھی کہ اس پر اس بکرے کی آواز کا گمان ہوتا تھا جسے قربان کیا جا رہا ہو۔ بلا سبب' نہ جانے کیوں مجھے اپنے اندر اک اذیت ناک تشنگی سی ابھرتی محسوس ہوئی۔

میں وہاں سے دوڑ کر تھوڑے فاصلے پر چلا گیا۔ میں نے دادا کی پکار بھی سنی مگر میں نہیں لوٹا' اور چلتا رہا۔ اس لمحے واقعی مجھے اپنے دادا بہت برے سے لگے۔ مجھے ان سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ لگتا تھا جیسے میرے اندر کوئی راز چھپا ہو جس سے میں چھٹکارا چاہتا تھا۔ میں دریا کے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہیں سے وہ مڑ کر درختوں کے پیچھے جاتا تھا۔ اور پھر نہ جانے کیوں۔۔۔ میں نے اپنی انگلی حلق تک گھمائی اور ان کھجوروں کی قے کرنے لگا جو میں نے کچھ دیر پہلے کھائی تھیں۔

جین آگسٹ سٹرنیڈبرگ/ ستار طاہر

اصلی پھول

وہ کاغذی پھول بنایا کرتی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ کوئی ایسا شوہر مل جائے جو اس کی زندگی کے چلن کو بدل سکے۔ وہ ایک مصور تھا جو چاہتا تھا کہ کسی ایسی عورت سے شادی کرے جو اپنی روزی خود پیدا کر سکتی ہو۔ وہ اسے خاتون خانہ بنانے کے حق میں نہ تھا۔ وہ اپنی اپنی دنیا میں رہتے تھے اور ادھر قسمت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ جو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے ان کی ملاقات ہو گئی اور پھر ان دونوں کی شادی بھی ہو گئی۔ انہوں نے پاس ہی علاقے میں تین کمرے کرائے پر لئے۔ بیچ والا کمرہ سٹوڈیو بنا لیا گیا۔ دایاں کمرہ بیوی نے سنبھالا اور بایاں لومڑنے۔ وہ چاہتے تو ایک ہی کمرے میں ڈبل بیڈ کا بندوبست کر سکتے تھے مگر یہ چیز انہیں کچھ اچھی نہ لگی کہ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں رہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے لباس تبدیل کریں۔ بہتر یہی سمجھا گیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہیں اور سٹوڈیو کی حیثیت غیر جانبدارانہ مشترکہ ہو۔

انہیں کسی ملازم کی ضرورت نہ تھی۔ صفائی کرنے والی ایک عورت صبح و شام آتی اور صفائی کر کے چلی جاتی۔ انہوں نے اپنے مشاغل کے بارے میں خوب اچھی طرح سے غور و فکر کیا تھا اور یوں ان کے دن بڑی خوشی سے بسر ہو رہے تھے۔

"جب ان کے ہاں بچے پیدا ہوئے تو یہ کیا کریں گے؟" ان کے ملنے والے کسی شکی آدمی نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ "وہ بچہ ہونے ہی نہ دیں گے۔" واقعی ان کی شادی بڑی کامیاب رہی تھی۔ وہ صبح کے وقت سودا سلف خریدنے منڈی چلا جاتا' پھر کافی بناتا۔ وہ تب تک بستر ٹھیک کر لیتی' کمروں کا سامان ترتیب سے رکھ دیتی اور پھر وہ سٹوڈیو میں جا کر اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے۔ جب وہ کام کرتے تھک جاتے تو گپ لگانا شروع کر دیتے۔ ایک دوسرے کو مشورہ دیتے' خوب ہنستے کھیلتے۔ جب دوپہر کے بارہ بجتے تو وہ باورچی خانہ میں آگ جلا دیتا اور وہ سبزیاں تیار کرنے لگتی پھر وہ گوشت پکانے لگتا۔ اس دوران میں وہ بھاگ کر سبزی والے کے ہاں بھی ایک پھیرا لگا آتی' پھر وہ کھانے کے لیے میز پر پلیٹیں رکھ کر کھانا چنتی۔ بلاشبہ وہ ایک دوسرے سے اسی طرح محبت بھی کرتے تھے جیسی میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے اور ہر شب ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ لیکن جب کبھی وہ اس کے دروازے پر دستک دیتا تو دروازہ اندر سے بند نہ ہوتا۔ جگہ واقعی مختصر تھی اسی لیے ہر صبح وہ اپنے اپنے کمرے میں پائے جاتے وہ دیوار کو کھٹکھٹا کر کہتا "صبح بخیر' کیسی طبیعت ہے تمہاری!" وہ جواب میں کہتی "طبیعت بالکل ٹھیک ہے پیارے کہو تم کیسے ہو!" اور اس کے بعد وہ ناشتہ کی میز پر اکٹھے ہوتے اور یہ ملاقات ایک ایسا تجربہ ہوتی جو کبھی باسی نہ ہوتا تھا۔ وہ دونوں اکثر شام کو گھومنے اور سیر کرنے کے لیے بھی جایا کرتے تھے اور اپنے دوستوں سے گپ شپ لگاتے تھے ان سے ملنے والا ہر شخص کہا کرتا کہ یہ ایک شادی شدہ جوڑا ہے۔ خوش و خرم اور مسرور!

جوان دلہن لوئزا کے والدین جو ان سے بہت دور رہتے تھے اس صورتحال سے خوش نہ تھے۔ وہ لوئزا کو لمبے لمبے خطوں میں طرح طرح کی باتیں پوچھا کرتے تھے۔ وہ ایک نواسے کی آرزو رکھتے تھے لوئزا ان کے خیالات کو قدامت پسندی کا نام دے کر دل میں اٹھنے والے سوالوں کو دبا لیا کرتی تھی۔ ایک بار اس کی ماں نے اسے خط میں لکھا کہ وہ جن جدید خیالات کی حمایت کرتی ہے کہیں اس کا مقصد مستقبل میں بنی نوع انسان کا خاتمہ تو نہیں ہے۔ لوئزا نے اس انداز سے کبھی سوچا نہ تھا۔ وہ اور اس کا شوہر خوش تھے اور دنیا ان کو مسرور دیکھ کر حسد کرتی تھی۔

زندگی بے حد پرسکون انداز میں گزر رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہ تھی۔ دونوں کماتے تھے اور اخراجات کا بوجھ دونوں نے برابر برابر اٹھا رکھا تھا۔ کبھی وہ زیادہ پیسے کما لیتا تھا' کبھی اس کی آمدنی زیادہ ہو جاتی' لیکن آخر میں انہوں نے جو مشترکہ فنڈ بنا رکھا تھا وہ برابر ہوتا۔

اس کی سالگرہ کا دن آگیا صبح اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب صفائی کرنے والی بوڑھی عورت پھولوں کا گلدستہ لیے اس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ پھولوں کے گلدستے کے اردگرد ایک مصور کا خط لپیٹا ہوا تھا اور اس پر یہ عبارت رنگوں میں تحریر تھی۔

"شگوفوں جیسی حسین خاتون کے لیے اس کے چاہنے والے کی طرف سے جو دل سے دعا گو ہے کہ ایسے کئی دن اس کی زندگی میں آئیں اور درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ناشتہ کر کے اعزاز بخشیں مگر ذرا جلدی۔" فوراً اس نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی "آ جاؤ۔" پھر وہ بستر پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے اس روز صفائی کرنے والی عورت کو سارا دن گھر کا کام کرنے کے لیے رکھ لیا گیا اور سالگرہ کا دن بڑی خوشی سے بسر ہوا۔

دو برس بیت گئے ان کی شادی میں کوئی رخنہ نہ پڑا۔ لوگوں نے ان کی شادی کے بارے میں جتنی پیش گوئیاں کی تھیں۔ وہ سب جھوٹی نکلیں وہ مزے کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سدا دن ایک سے نہیں رہتے۔ جب دو سال گزر گئے تو وہ بیمار پڑ گئی اس کا خیال تھا کہ دیواری کاغذ جن سے وہ پھول بنایا کرتی تھی اس میں کوئی زہریلا مادہ چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ اسکے شوہر کا بھی یہی خیال تھا کہ اس کی بیماری جراثیم کی وجہ سے ہے۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو اصل بات یہ تھی کہ اسے جیسا ہونا چاہئے تھا اب وہ ویسی نہ تھی' وہ پھولتی جا رہی تھی کیا اسے رسولی کی تکلیف تھی' ہاں۔۔۔۔ کہنے والے تو یہی کہتے تھے۔

اس نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا اور جب واپس آئی تو آنسو بہا رہی تھی واقعی اس کا پیٹ پھول رہا تھا لیکن ایک دن یہ پھل درخت پر لگنا ہی تھا' وہ ماں بننے والی تھی۔ وہ بات ہو کر رہی تھی جس سے وہ کتراتی تھی۔

وہ رویا تو نہیں مگر پریشان ضرور ہوا۔ پھر وہ کلب چلا گیا جہاں اس نے دوستوں میں بڑے فخر سے یہ خبر سنائی مگر اس کی بیوی آنسو بہاتی رہی۔ وہ سوچتی اب گھر میں اس کی کیا حیثیت ہو گی اور اب وہ کافی عرصہ تک کاغذی پھول بنا کر روپیہ نہ کمائے گی اور اسے اپنے شوہر کی کمائی پر زندہ رہنا ہو گا' اور اب انہیں کوئی نوکر بھی رکھنا پڑے گا۔ ان کی تمام پیش بندیاں تمام رکھ رکھاؤ اور احتیاطی تدابیر' قسمت کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے تھے۔

اس کی ماں اسے پرجوش اور مسرت سے لبریز خط لکھنے لگی' اسے سمجھاتی کہ شادی کا مقصد ہی بچوں کی پیدائش اور پرورش ہوتا ہے۔

ہیو گو اپنی بیوی کو سمجھانے لگا کہ وہ اس غم میں کیوں دبلی ہوتی جا رہی ہے کہ وہ مستقبل میں خود کما نہ سکے گی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں مل جل کر زندگی کا بوجھ اٹھائیں اور جب وہ بچے کی ماں بن کر اس کی نگہداشت اور پرورش کرے گی تو وہ اس کا پوری طرح ہاتھ بٹائے گی اور بچے کی پرورش کیا روپیہ کمانے سے بہتر کام نہیں ہے؟ اور پھر روپیہ بھی تو کام کر کے ہی کمایا جاتا ہے اور کیا بچے کو پالنا ایک بڑا کام نہیں ہے؟ یوں وہ اس سے کمتر نہ ہو گی بلکہ زندگی کے فرائض میں اس کے برابر ہو گی اور اپنا پورا حصہ دے گی۔

لوئز کو اپنے دل کو یہ سمجھانے میں کافی دیر لگی کہ اس کا شوہر اسے اپنے سے دور نہ کرے گا بلکہ اپنے پاس ہی رکھے گا' لیکن جب وہ ماں بنی تو اس کو ایک ایسی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اب وہ اس کی بیوی تھی اس کی ساتھی تھی اور اس کے بچے کی ماں بھی اور ہیو گو پر بھی یہ حقیقت پہلی بار عیاں ہوئی کہ عورت کا اس سے بہتر روپ تو ہو ہی نہیں سکتا!!

ایبو سے نکول / مرزا حامد بیگ

زندگی حسین ہے

اس کی ایک جانب سمندر اور نم ریت ہے' تو ہرے بھرے خود رو جنگلات دوسری جانب' اور اوپر دھیرج کے ساتھ منڈلاتے ہوئے بادل۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے سورج کا شفاف طشت اور آسمان کی نیلی چھتری' اس مختصر سی افریقی آبادی "کامنی" کے چوگرد احاطہ کئے ہوئے ہے۔

خود نما چھتوں والے چوکور کچے مکان مٹی سے لپے ہوئے ہیں جبکہ چند ایک کی بھری ہوئی جست سے ڈھکی چھتیں "کوکوا مشروب" کی تجارت میں صاحب خانہ کے استحکام کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بوڑھی بیوہ' بولا نے روغن ناریل کے پکتے ہوئے شوربے کو ہلایا' اور بے دھیانی میں خیال کیا۔ وہ اپنے مضبوط' بے دانت کے جبڑوں کی مخصوص تال کے ساتھ ناریل کی گری چبا رہی تھی' پھر یکایک اس کے جبڑوں کی جنبش' اس کی پوتی آسی کے رسی پھلانگنے کی آواز سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اس نے خالی نظروں سے سات سالہ ننھی آسی کی جانب دیکھا' جو بڑی چابکدستی سے ناریل کے پتوں کی بٹی ہوئی رسی کو ہر بار اپنے سر سے گزار کر' زمین سے چھواتے اور سرخی مائل گرد اڑاتے ہوئے انگریزی میں نمبر شمار بھی کر رہی تھی۔ یوں تو بولا زیادہ انگریزی نہیں جانتی تھی' لیکن روزمرہ کے لین دین کی خاطر وہ بیس تک گنتی گن ہی لیتی تھی۔

آسی بلند آواز سے پکاری: "چھ" اور پھر گننے لگی' نو ---- دس ---- گیارہ ----

بولا نے ٹوکتے ہوئے کہا: "بھئی چھ کے بعد سات ---- ارے اتنا تو میں بھی جانتی ہوں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

ہر چند کہ اب وہ بوڑھی ہو گئی تھی اور اس کی کوکھ اور چھاتیاں سوکھ چکی تھیں' لیکن ایک وقت تھا جب اس نے ہر دو سال بعد' تواتر سے بچے جنے تھے۔ چھ بار اس کے نرینہ اولاد ہوئی اور ہو کر مر گئی۔ بعضے تو نقاہت آمیز ابھارے سے کراہتے ہوئے بیت گئے اور باقی تپتپائے ہوئے جسموں کے ساتھ' تشنج کی حالت میں آنکھیں چڑھائے مر گئے۔ سب کے سب گزر گئے۔ یوں جیسے' وہ الگ الگ نہ تھے' ایک ہی تھا' اس نے خیال کیا ---- اسے یقین تھا کہ ایک ہی بے چین روح تھی جو ہر بار اس کی کوکھ میں جنم لینے کو کلبلاتی اور اس کا تمسخر اڑاتی۔ چھٹی بار موسیٰ نے' جو گاؤں کا ایک جادوگر تھا اور جسے وقت نے ایک معزز مسلمان میں بدل دیا تھا' اسے اور اس کے شوہر کو مشورہ دیا تھا کہ نوزائیدہ مردہ بچے کی بھربھری ہڈیاں توڑ مروڑ دی جائیں' تاکہ اسی کی آتما بار بار جنم لے کر انہیں اذیت سے دوچار نہ کرے۔ پر اس نے بچے کو بھینچے رکھا تھا اور انہیں ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بچے کو چٹائی میں لپیٹا جاتا اور وہ اسے لے جاتے' اس نے چپکے سے اس کے بائیں کولہے کو نوکدار چھڑی سے نشان زدہ کر دیا۔ جب ساتویں بار اس نے پھر بیٹا جنا تو ولادت کی رسوم کے بعد' یہ دیکھنے کے لئے کہ نشان ہے یا نہیں' اس نے بڑے طریقے سے بچے کو الٹایا۔ نشان موجود تھا۔ اس نے بوڑھی دایہ کو دکھایا اور اس کے بارے

میں استفسار کیا تو اسے دایہ کی یہ بات ماننی ہی پڑی کہ نشان اتفاقیہ ہے اور ان جڑی بوٹیوں کی رگڑ سے آیا ہے جن سے رطوبت سے سنے ہوئے بچے کو صاف کیا گیا تھا۔ لیکن یہ بچہ زندہ رہا' اور وہ میجی کہلایا۔ اور یہ کہ اب وہ تیس برس کا تھا اور نوے میل پرے ایک قصبے کے سرکاری دفتر میں درجہ دوم کا کلرک تھا۔ ننھی آسی' اسی کی بیٹی تھی' جسے اس نے اپنی بوڑھی ماں کی سپرداری میں دے رکھا تھا کہ وہ بڑھیا کے چھوٹے موٹے کام کرے' آس پڑوس میں دوڑ دوڑ کر پیغام رسانی کرے' باورچی خانے میں دھرے مٹکے سے پیالہ بھرپانی بھرلائے اور اپنی دادی کے ساتھ چمٹ کر سوئے۔

اس نے چٹکی بھر نمک اور دھلے ہوئے کساوے کے نچڑے ہوئے پتے ابلتے ہوئے سالن میں ڈالے اور اس کے بعد دہلیز پر سنبھل کر قدم رکھتی' خشک مرچیں لانے اندر چلی گئی۔ اس نے مرچیں ڈھونڈ تو نکالیں' لیکن نیچے گرا دیں اور دیوار کا سہارا لینے کے باوجود کراہتے ہوئے لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اس گھڑی' کھڑکی سے پلٹتے ہوئے' چاہت اور دکھ ملی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ میجی نے اس کی جانب نگاہ کی تھی۔

وہ اپنی آدھی آستین کی کھلے گلے والی سفید قمیض اور سلیٹی گباڈین کی پتلون' بازو کی طلائی گھڑی اور سابر کے بھورے جوتوں میں من و عن افریقی رسائل کے اس وجیہہ کلرک کی شبیہ تھا جو محض اس لئے ترقی کی منزل طے کرتا چلا جاتا ہے کہ اچھا کھاتا ہے اور مشتہر کی جانے والی قبض کشا دوا کا استعمال بھی باقاعدگی سے کرتا ہے۔ اس کی رنگت خاکستری مائل بھوری تھی' اور وہ اپنی گردن کے گرد ایک بڑا سرخ رومال باندھے ہوئے تھا۔

"میجی -------- شکر خدا کا"۔ بولا چلا اٹھی: "تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بھئی میں کمزور دل ہوں' اور اب اس قابل نہیں رہ گئی ہوں کہ تو مجھے یوں اچنبھے میں ڈال دے۔ کب آئے؟ کیسے پہنچے ------ لاری پر' ماہی گیروں کی کشتی پر؟ گھر میں کیوں کر داخل ہوئے؟ باہر تو کواڑ میں تالا پڑا تھا۔ چوروں کی بہتات ہے' ان دنوں۔ میں اتنی خوش ہوں' تجھے دیکھ کر ----- اتنی خوش ہوں۔" وہ اپنے بیٹے کے سینے پر سر رکھے' لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی' اور بالآخر رو اٹھی۔

میجی کی آواز رندھی ہوئی تھی' اس نے کہا: "میں بھی بہت خوش ہوں' ماں۔" اس نے پیار سے ماں کی کمر تھپتھپائی۔

"پاپا ---- پاپا" کہتی ہوئی آسی دوڑی دوڑی آئی اور میجی نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر گلے سے لگا لیا۔

"اسے جانے دو ماں' کہ میں کیسے پہنچا۔ میں یہاں ہوں' اور کیا یہ کافی نہیں؟" میجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آج تو کچھ ہونا چاہیے ---- ایک ٹھاٹھ کی دعوت۔ میں ہمسائیوں کو ابھی خبر کرتی ہوں۔ آسی بیٹا' لپک کر پادری اوائی صاحب کے ہو آؤ' اور انہیں اپنے پاپا کے گھر آنے کی اطلاع کر دو ---- پھر ادھر سے مائی گبیرا کو مزید سودے سلف کا کہتے ہوئے پاپا بولے کی طرف ہو آنا' گانے بجانے والوں کی خاطر------"

"بس بس" میجی نے ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا: "یہ سب غیر ضروری ہے۔ مجھے کسی سے نہیں ملنا' کسی سے بھی نہیں۔ میں تو بس آرام کرنا چاہتا ہوں' مکمل آرام۔ یہاں میری موجودگی کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

بولا انتہائی شکستہ خاطر دکھائی دینے لگی۔ میجی تو اس کا فخر تھا' اور وہ اسے دنیا والوں کو دکھانا چاہتی تھی۔ اتنے اہم مہمان کی آمد سے بے خبری پر' گاؤں کے لوگ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میجی کو اس بات کا احساس ہو چلا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی ماں کے کندھوں کو نرمی سے تھامتے ہوئے کہا: "انہیں بہت جلد پتہ چل جائے گا۔

کیوں نہ ہم تینوں ایک دوجے کی خاطر مل بیٹھیں 'گھڑی دو گھڑی۔ زندگانی مختصر ہے۔"
بولا' آسی کی جانب مڑی' مرچ کی پڑیا اٹھائی اور اس میں سے چٹکی بھر' باہر ابلتی ہوئی ہنڈیا میں ڈال آنے کو کہا اور تاکیدا" آگ کے قریب جانے اور اس سے کھیلنے کو منع کیا۔ آسی کے چلے جانے کے بعد اپنے بیٹے سے بولی: "کسی مصیبت میں ہو؟ پولیس کا معاملہ تو نہیں؟"
اس نے سر جھٹکا: "نہیں تو۔" وہ بولا: "صرف یہ کہ تمہاری طرف پلٹنے کو جی چاہا تھا۔ یہ صرف ہماری محبت کا بہاؤ ہے اور اس میں' میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے' اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنی ننھی بیٹی تمہارے پاس کیوں چھوڑتا۔" اس نے بے تکی ہانکتے ہوئے کہا: "عموما" لڑکیاں اپنے قریبی رشتے داروں کے رہ لیتی ہیں۔"
"کیا مجھے اس بات کا علم نہیں ہے"۔ بولا بولی: "لیکن تمہارا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی: "۔۔۔۔ اور تم اپنی گردن کو تھامے ہوئے ہو۔ کیا بیمار ہو؟" اس نے میجی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔
"۔۔۔ اور تمہارا جسم بھی ٹھنڈا ہے۔"
"باہر ہوا' مرطوب اور سرد ہے۔" میجی نے قدرے درشتی سے کہا: "اگر تم میرا کمرہ کھول کر صاف کر دو' تو میں ذرا آرام کر لوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ تھکن سے چور ہوں۔ میں نے آج ایک طویل سفر کیا ہے' اور یہ کوئی آسان سفر نہ تھا۔"
"بے شک بیٹے' بلاشبہ۔" بولا نے وہاں سے ہٹتے ہوئے' تیزی کے ساتھ لیکن مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
میجی تمام دوپہر' شام پڑے تک سوتا رہا اور اس کی ماں اس کے لئے کمرے میں ہی کھانا لیتی آئی اور بعدازاں خالی دیگچی وہاں سے واپس اٹھا لے گئی۔ وہ ایک بار پھر سو گیا' اور پو پھٹے تک سوتا رہا۔
اگلا روز' سنیچر تھا جو ایک مصروف دن ثابت ہوا۔ بولا' میجی سے اپنے اس وعدے کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ اس کے آنے کی خبر کسی کو نہیں کرے گی' بازار کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔ میجی نے ایک لمبی سیر کی خاطر' آسی کو اپنے ساتھ لیا اور ویران راستے سے ہوتا ہوا پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ آسی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ بلندیوں کی طرف نکل گئے۔ یہاں تک کہ نشیب میں سارا گاؤں ان کے سامنے تھا اور دور فاصلے پر سمندر اور کھلے سفید بادبانوں کے ساتھ کشتیاں۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے' سورج نے دن کے دوپہر مکمل کئے تھے اور مغرب کی طرف اس کا آدھا سفر ابھی رہتا تھا۔ آسی' اس وقت تک تمام خوردنی اشیاء' جیسے خشک مچھلی' چنبیلے خانہ ساز کیک اور سنگترے کھا چکی تھی۔ اس کے باپ نے بتایا تھا کہ اسے بھوک نہیں اور آسی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی' وہ چہکتی رہی' کھایا بھی اور اس کے بعد باپ کی جیب سے برآمد ہونے والے فاؤنٹن پین اور دیگر اشیاء کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے جلد ہی گھر کی راہ لی' اس لئے کہ میجی نے اندھیرا چھا جانے سے پہلے گھر پہنچنے کا وعدہ دے رکھا تھا۔ وہ چٹانوں کی سیدھی ترائیوں سے اترتے وقت آسی کو اٹھائے ہوئے تھا' اور وہ اس کے کندھوں سے چمٹی ہوئی تھی' اس لئے کہ میجی نے اپنی گردن کو زخمی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے نہ چھوا جائے۔ آسی نے کہا تھا: "پاپا" میں تمہارے پیچھے دیکھ سکتی ہوں' لیکن تمہارا سایہ نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"
تب وہ اسے گھما کر سورج کے سامنے لے آیا۔ جب سے آسی اونگھنے لگی تھی' اس نے سوالات پوچھنے شروع

کر دیئے تھے' جواب میں اس کے باپ نے جہیز جہاز اور ہنسی مذاق شروع کر دیا تھا۔
"پاپا" تمہاری گھڑی بارہ پر رک کیوں گئی ہے؟"
"اس لئے بیٹا' کہ دوپہر کو دنیا کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔" آسی یہ سن کر گنگنانے لگی تھی۔ "پاپا' آپ ہمیشہ اپنے گلے میں سکارف کیوں باندھے رہتے ہیں؟"
"اس لئے بیٹا' کہ ایسا نہ کروں تو میرا سر الگ ہو کر گر پڑے۔" وہ اس پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ لیکن کچھ ہی دیر میں وہ سو چکی تھی اور اس کا باپ اسے اٹھائے ہوئے گھر کی جانب رواں تھا۔
رات پڑنے سے کچھ ہی دیر پہلے' بہترین کپڑوں میں ملبوس ماں کے فوری اصرار پر وہ تینوں' آبادی سے بچتے بچاتے ایک خفیہ راستے سے میجی کے مرحوم باپ کی قبر تک گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا قبرستان تھا' جو یقیناً "بیس سال یا اس سے زیادہ پرانا نہیں تھا' اور یہ اس وقت قائم کیا گیا تھا جب دیہی صحت عامہ کے شعبے نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اب کسی کو بھی گھروں کے پچھواڑے نہ دفنایا جائے۔
بولا اپنے ساتھ ایک شراب کی بوتل' ایک گلاس اور چار عدد کٹے ہوئے ناریل کے کھوپے اٹھائے ہوئے تھی' نیم قوس میں تراشے گئے ناریل کے دو سرخ اور دو سفید ٹکڑے۔ وہ قبر تک پہنچ گئے تو بولا نے کچھ شراب گلاس میں انڈیلی۔ پھر اس نے مرحوم سے شفقت بھرے نرم لہجے میں کہا کہ وہ اپنے ساتھ اس کے بیٹے کو لیتی آئی ہے' اور یہ وہ تھا جسے خدا نے عروج بخشا تھا اور دشمن زیر تھے۔ یہ وہ تھا' جسے پینشن والی کلرکی ملی تھی نہ کہ وہ ایک کسان' مچھیرا یا مستری تھا۔ ان کی تمام تر ازدواجی زندگی میں لوگ اسے محض اس لئے چڑیل کہتے آئے تھے کہ اس کے جنے ہوئے بچے جی نہیں پاتے تھے۔ لیکن اس بچے نے اسے نیک بخت ثابت کیا تھا۔ اب تو اس کے خاوند کو جواب دینا ہی چاہیے نا' یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ واقعتاً "سن رہا ہے۔
اس نے ناریل کے چاروں کھوپے ہوا میں یوں اچھالے کہ سبھی اس کی قبر پر آ رہے۔ تین کٹے ہوئے رخ کے ساتھ اور ایک اوندھے منہ۔ بولا نے انہیں ایک بار پھر اٹھایا' ایک مرتبہ پھر مرحوم سے کچھ کہا سنا اور ناریل ہوا میں اچھال دیئے' لیکن ہر بار ان میں سے کوئی ایک' یا ایک سے زائد اوندھے منہ ہی رہا۔
ایسا ممکن نہ ہو سکا کہ وہ چاروں اپنے کٹے ہوئے رخ کے ساتھ گرتے' یا چاروں اوندھے منہ' تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہ بات سن رہا ہے اور اسے اس بات سے خوشی حاصل ہوئی ہے۔ بولا نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا' اس نے شکوہ کیا' اس نے درشت لہجہ اپنایا' مگر سب بے سود۔ تب اس نے میجی سے کہا کہ وہ عمل دوہرائے۔ اس پر وہ قبر کے پہلو میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔ پھر اس نے ناریل کے پیالے اچھال دیئے' جو کہ گر کر دیر تک گھوما کئے' بولا انہیں اپنی بوڑھی متجسس نظروں سے گھومتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ تھمے تو سب کے سب اوندھے منہ تھے۔ میجی نے شراب بھرا گلاس قبر پر انڈیل دیا' اور بڑبڑایا کہ وہ اس گھڑی اپنے باپ کو جس قدر قریب محسوس کر رہا ہے' زندگی بھر اتنا قریب محسوس نہیں کر پایا۔
اس وقت سورج ڈوب چکا تھا۔ پھر وہ تینوں ماند پڑتے ہوئے دھندلکے میں' چپ چاپ اپنے گھر کو لوٹ گئے۔
اس رات گھر سے باہر جاتے ہوئے بولا' اپنے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس یہ دیکھ کر انتہائی بھری حیرت سے دو چار ہوئی کہ میجی اپنے حصے کا کھانا بغیر کھائے باہر پھینکتا رہا تھا۔ جب وہ اسے شب بخیر کہنے کے لئے گئی تو اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا' البتہ اشارتاً "کچھ سونگھتے ہوئے یہ ضرور کہا کہ کمرے میں سڑاند سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میجی بولا کہ اس کے خیال میں تو چھت کی کڑیوں میں کوئی مرا ہوا چوہا ہے اور یہ کہ رات سونے سے

پہلے اسے نکال پھینکے گا۔
اس رات زوروں کی بارش ہوتی رہی تھی' آسمانی روشنی کی چادر پل دو پل کے لئے رات کے اندھیارے کو چاندی جیسے سویرے میں بدلتی رہی۔ اس کے بعد پھر وہی اندھیارا اور بارش۔ نصف شب کو بولا جاگی تو اسے یوں لگا جیسے کوئی دستک دے رہا ہو۔ وہ میجی کے کمرے میں گئی کہ اسے دروازہ کھولنے کو کہے' لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ بولا نے سوچا کہ شاید وہ کچھ دیر کے لئے باہر نکلا ہو اور غلطی سے دروازہ مقفل ہونے کے سبب باہر رہ گیا ہو۔ اس نے چراغ کو ہاتھ میں بلند کئے ہوئے سرعت سے دروازہ کھول دیا۔ وہ' برآمدے میں کھڑا تھا' معجزانہ طور پر خشک کپڑوں کے ساتھ اور اندر آنے سے انکاری۔
"مجھے جانا ہے۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کھانستے ہوئے کہا۔
"اندر تو آؤ۔" بولا نے التجا کی۔
"نہیں" اس نے کہا: "مجھے جانا ہے' جانے سے پہلے میں اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"
"کیا حماقت ہے؟" وہ بولی: "بارش میں کیوں کھڑے ہو' اندر آجاؤ۔"
"میں نے سوچا تھا کہ مجھے شکریہ ادا کئے بغیر نہیں جانا چاہیے۔"
بارش اور تیز ہوئی' دروازہ چرچرایا اور ہوا چنگھاڑی۔
"زندگی حسین ہے' پیاری ماں۔ شکریہ اور خدا حافظ۔"
وہ مڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔
عین اس وقت مدھم سی بجلی چمکی اور بولا نے دیکھا کہ آنگن خالی تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے لوٹ آئی اور بے چین نیند سو گئی۔ سونے سے پہلے وہ آپ سے آپ بڑبڑائی کہ اگلی صبح اتوار کو یا بہتر ہے سوموار کو ادائی صاحب سے ملنا چاہیے اور اسے یہ سب بتا دیا جائے' کہیں یہ نہ ہو کہ میجی کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اسے توقع تھی کہ میجی اس بات سے برہم نہیں ہو گا۔ وہ تو بہت اچھا بیٹا تھا۔
لیکن ہوا یوں کہ ادائی صاحب اتوار کی دوپہر کو خود ہی آپہنچے' چپ اور بجھے بجھے۔ اس وقت بولا برآمدے میں ایک پرانے سٹول پر بیٹھی آسی کی مینڈھیاں گوندھ رہی تھی۔
ادائی صاحب بیٹھ گئے اور دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا سے کہنے لگے: "خدا ہی عطا کرتا ہے اور پھر اپنی امانتیں لوٹا لیتا ہے۔" کچھ ہی دیر میں برآمدہ اور گھر کا صحن گاؤں کی قریباً" آدھی آبادی سے بھر چکا تھا۔
"لیکن' میں آپ کو بتاتی ہوں کہ ---- وہ جمعہ کے روز یہیں تھا اور اتوار کی صبح گیا ہے۔" بولا نے کہا: "وہ جمعہ کے دن نہیں مر سکتا۔"
قصبے سے بیٹے کی موت کی خبر پانے اور بے ہوش رہنے کے بعد' بولا کی طبیعت ابھی کچھ ہی دیر پہلے سنبھلی تھی۔ میجی کی بیوی' یعنی آسی کی ماں' موت کی خبر اور مرنے والے کا بچا کھچا ترکہ ساتھ لیتی آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ میجی جمعہ کی دوپہر اچانک مر گیا تھا اور ہفتے کی شام سورج ڈوبنے سے پہلے اسے دفنا بھی دیا گیا۔ وہ ضرور اسے دفنانے کو "کامنی" لاتے' اور اس نے ہمیشہ اس کی خواہش بھی کی تھی' لیکن وہ بروقت ایسا نہ کر سکے اور لاش ایک دن سے زیادہ نہیں رکھی جا سکتی تھی۔
"وہ یہاں تھا۔ وہ یہاں تھا۔" بولا نے اپنی پیشانی مسلتے اور روتے ہوئے کہا۔
آسی' سب سے الگ تھلگ چپ بیٹھی تھی۔ ادائی صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"خاموش خاموش ۔۔۔۔ وہ یہاں نہیں ہو سکتا' گاؤں میں اسے کوئی تو دیکھتا۔"

"اس نے کہا تھا کہ ہم کسی کو بھی اس کی خبر نہ کریں۔" بولا بولی۔

لوگ اپنے طور پر مسکرائے اور اپنے سروں کو جھکا دیا۔ "بیچاری" 'کسی نے کہا: "صدمے سے دماغ چل گیا بیچاری کا۔"

"وہ جمعہ کے روز مرا ہے۔" میجی کی بیوی نے دوہرایا: "وہ اپنے دفتر میں تھا اور اس نے باہر دیکھنے اور چپڑاسی کو بلانے کی خاطر کھڑکی کا پٹ اوپر اٹھایا تھا۔ ایسے میں کھڑکی کا چوکھٹا ٹوٹ گیا۔ کھڑکی نیچے آگری اور اس کی گردن توڑ کر رکھ دی۔ یہاں تک کہ چوکھٹے کے تیز دھار کنارے نے تقریباً" اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

"میرے ابو گلے میں اسکارف باندھے ہوئے تھے۔" آسی یکلخت چیخ اٹھی۔

"چپ۔" ہجوم پکارا۔

میجی کی بیوہ نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک طلائی لاکٹ نکالا اور آسی کو چپ کرانے کی خاطر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

"تمہارے ابو نے پچھلے ہفتے ہی' یہ تمہارے کرسمس کے تحفے کے طور پر بنوایا تھا۔ تم یہ ابھی سے پہن لو۔"

آسی اس سے کھیلتے اور اچھالتے ہوئے دائیں بائیں گھماتی رہی۔

"احتیاط سے بیٹا' یہ تمہارے باپ کا آخری تحفہ ہے۔" ادائی صاحب نے کہا۔

"میں' یاد کر رہی تھی کہ کیسے انہوں نے' ابھی کل ہی تو یہ کھولنے کو دیا تھا۔" آسی کہہ اٹھی۔

"نہیں' تم نے یقیناً" یہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میجی کی بیوی نے تنگ مزاجی اور غصہ ملی سراسیمگی سے کہا۔

پھر اس نے لاکٹ لے کر اسے کھولنا چاہا۔

"لاؤ' مجھے دو۔" گاؤں کا سنار پکارا اور اس نے منتر پڑھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ آخر تھک ہار کر کہنے لگا: "یہ یقیناً" ناقص قسم کا سونا ہے' اسے تو زنگ لگ چکا ہے۔ اسے کھولنے کے لئے تو اوزار چاہئیں۔"

"ہاں' اب مجھے یاد آگیا۔" آسی بچپنے کے ٹھہرے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

دھیرے دھیرے' چوگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو تا گیا اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں میں شفاف' سرخ افریقی سونا دمکتا رہا۔

سنار نے لاکٹ آسی کو لوٹاتے ہوئے اونچی سرگوشی میں کہا: "بتاؤ' اس نے کیسے کھولا تھا اسے؟"

"یوں۔" آسی بولی' اور اس نے ایک خفیہ کڑی دبا دی۔ لاکٹ کھٹ سے کھل گیا' اور اس نے دکھ بھرے لہجے میں پڑھا "۔۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی آسی"۔

سکوت طاری رہا۔

"ہائے بیچارے کی گردن۔" بولا نیم وحشت میں پکار اٹھی: "اس لئے تو اتنے لذیذ کھانے نہیں کھا سکا' جو میں نے اس کے لئے پکائے تھے۔"

ادائی صاحب نے اعلان کیا کہ شام کی عبادت کے بعد مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی جائے گی۔ ہجوم خاموشی سے منتشر ہو تا گیا۔

موسیٰ جادوگر' آخر میں جانے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ اب بہت بوڑھا تھا اور خم کھا گیا تھا۔ سب جانتے

تھے کہ جب بھی کوئی آفت پڑتی تو موئی سے مشورہ کرنے پر اوائی صاحب بھی معترض نہ ہوتے تھے۔

موئی مزید جھکا اور بولا کے کان میں بدبدایا: "تمہیں' اکتیس سال پہلے ہی' جب وہ چھٹی بار گیا تھا تو اس کی ہڈیاں توڑ مروڑ دینا چاہیے تھیں تاکہ وہ اس تمام عرصے میں خود کو زندہ ظاہر کر کے تمہارا مذاق نہ اڑاتا۔ کیا میں نے کہا نہیں تھا۔ ہر عورت ذات بہت خود سر اور ضدی ہوتی ہے۔"

بولا اپنے سیاہی مائل چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی' اس کی آنکھوں میں ممتا کا غصہ اور غرور جھلک رہا تھا۔

"میں خوش ہوں کہ میں نے یہ سب نہیں کیا۔" وہ بولی ----- "اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے سے پہلے خاص طور پر میرا شکریہ ادا کرنے آیا۔"

اس نے آسی کو اپنے ساتھ چمٹا کر بھینچ لیا اور کہا: "مجھے فخر ہے کہ میں نے اسے دنیا میں پلٹنے کا ایک موقع دیا' اس لئے کہ زندگی بہت حسین ہے۔ مجھے پتا ہے' تم میری اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ آخر کار' تم ایک مرد ہی تو ہو۔"

عبدالسلام / خالد محمود ترمذی

خواب

محمد اویس نے جب خواب میں اپنے تئیں نماز پڑھتے دیکھا تو بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ وہ فرض نمازوں کے علاوہ دن بھر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا تھا' لیکن حیران کن امر یہ تھا کہ دوران خواب پہلے سجدے میں اس نے سورۃ نصر با آواز بلند پڑھی تھی اور جوں ہی اس نے سورۃ ختم کی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ "کلام الٰہی حق ہے" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

اس نے بقیہ تمام رات جاگ کر گزار دی۔ وہ اس الجھن میں گرفتار رہا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے اور وہ اس بات پر متعجب بھی تھا کہ لیکن اس نے زندگی میں کئی خواب دیکھے ہیں آخر یہ خواب اس کے ذہن پر کیوں مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ شیخ سعید کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس کا شمار گاؤں کے بزرگوں میں ہوتا تھا۔ دوپہر کو کہیں جا کر شیخ سعید اس کے ہاتھ آیا تو اس نے وہیں پکڑ کر اسے بٹھا لیا اور اپنا خواب اسے سنایا۔ شیخ سر جھکائے کافی دیر کچھ سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے خواب میں سورۃ "نصر" پڑھی ہے۔؟"

"یقیناً۔" اویس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"کلام الٰہی کے حق ہونے میں کوئی کلام نہیں۔" شیخ سعید گویا ہوا۔ "اویس! تم اپنے مولا کی تسبیح و تحمید بیان کرو اور اپنے گناہوں کی اس سے معافی چاہو۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

"اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میرے لیے نیک شگون ہے' لیکن تمہارے خیال میں اس کی تعبیر کیا ہے؟"

شیخ سعید نے اپنی گھنی اور پھیلی ہوئی داڑھی کو اپنی مٹھی میں لیا اور اس میں خلال کرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے بے بہا علم کو محض تعبیر رؤیا پر صرف کرنا نہیں چاہتا۔ "اویس" آخر اس نے کہنا شروع کیا۔ "اپنے خالق و مالک سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگو بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ کسی شخص کے سورۃ "نصر" کو خواب میں پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا انجام قریب ہے۔"

یہ سننا تھا کہ اس کے تن بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں اسکے منہ سے نکلا "شیخ! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"مجھے بڑا دکھ ہے کہ میں نے تمہیں ایسی تلخ تعبیر سے کیوں آگاہ کیا۔ بہرحال تم اطمینان رکھو کہ رحمت ایزدی عنقریب تمہیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لے گی اور اس حقیقت سے کسے مجال انکار ہے کہ موت ہم سب کو آنی ہے۔ اویس! جو شخص بھی اس قسم کا خواب دیکھتا ہے جیسا کہ تم نے دیکھا ہے' وہ چالیس دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔"

یہ کہہ کر شیخ سعید وضو خانے کی طرف دوڑا' کیونکہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا اور اویس کی یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں وہ یہ خبر وحشت اثر سن کر جہاں تھا وہیں ساکت و صامت بیٹھا رہ گیا تھا اس کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت تک باقی نہ رہی تھی۔

"چالیس روز!" وہ بڑبڑایا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے۔ "خدایا مجھے طاقت بخش۔"

گاؤں کی آبادی ہی کتنی ہوتی ہے۔ شام تک تمام گاؤں میں اویس کے خواب اور شیخ سعید کی تعبیر کی خبر جنگل کی آگ کی طرف پھیل گئی۔ گاؤں کے لوگ اوہام پرست ہوتے ہی اور ایسی باتوں پر جلد ہی ایمان لے آتے ہیں لہٰذا انہیں یہ پختہ یقین تھا کہ اویس چالیس دن کے اندر اندر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے گا۔ گاؤں والے فرداً" فرداً" اور گروہ در گروہ اویس کے گھر کی طرف آنے لگے اور اویس انہیں خوش آمدید کہنے پر مجبور تھا جو اس کی زندگی میں ہی اس کی پیشگی تعزیت کے لیے حاضر ہو رہے تھے۔ اس کے خاندان کی عورتیں بھی اس خبر کی صداقت معلوم کرنے کی غرض سے آنے لگیں اور جب وہ متجسس نگاہوں سے اسے دیکھتیں تو بظاہر اسے بھلا چنگا پاتیں لیکن خیالوں میں مستغرق تو وہ گریہ زاری کرتے ہوئے دل ہی دل میں التجا کرتیں کہ خدا ملک الموت کو اویس کی جان لینے سے باز رکھے کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اس نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ اگرچہ اویس ذاتی طور پر کوئی دکھ یا تکلیف محسوس نہیں کرتا تھا' لیکن اہل خانہ کے اقدامات حفظ ماتقدم اور لوگوں کے ہمدردانہ مشوروں نے لاشعوری طور پر اس کے اندر غیر محسوس دکھ اور تکلیف کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ پہلا عشرہ تو وہ ان تکلیف دہ خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکتا رہا اور متواتر مویشیوں کی منڈی جاتا رہا اور اپنا کاروبار جاری رکھا لیکن تابکے' جلد ہی اس نے ہمت ہار دی اس کے اعصاب جواب دینے لگے اور لوگ بانگ دن کے وقت بھی اس کی تیمارداری کو آنے لگے' جبکہ اس سے قبل شام سے پہلے اس کا گھر پر ملنا محال ہوا کرتا تھا۔ دوسرا عشرہ گزرا تو وہ چارپائی سے لگ گیا اور اہل خانہ کے لیے اسے اٹھا کر اس کے لیے نیا بستر لگانا مشکل ہو گیا' اور ابھی تیس دن نہیں گزرے تھے کہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس کے مرغوب کھانوں کی پلیٹیں جو اہل خانہ اس کے لیے بڑے شوق سے تیار کرتے تھے' اس کے سرہانے اسی طرح پڑی رہتیں اور وہ انہیں چکھتا تک نہیں تھا۔ سفید لبادہ اور داڑھی بڑھائے وہ تمام وقت عبادت اور توبہ تلا میں گزارتا۔ جب دیکھو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ وہ اس خوف سے نہیں روتا تھا کہ موت قریب ہے یا زندگی کے جانے کا اسے غم تھا بلکہ وہ قبر کے متوقع دردناک عذاب سے سہا ہوا تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے معاف نہ کرے کیونکہ وہ مویشی بیچتے وقت اس کے نام کی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر گرد و نواح کے سادہ لوح دیہاتیوں کو دھوکہ دیا کرتا تھا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے اور چالیسواں دن قریب آ رہا تھا' توں توں اویس کے بدن کی چربی پگھل رہی تھی اور وہ دن بدن سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا تھا۔ ایک تو پیٹ میں کچھ جاتا نہیں تھا اور ماضی کے گناہوں پر تاسف اور احساس ندامت اس کے علاوہ۔ اس کے اپنے اور گرد و نواح کے گاؤں والوں میں اس نور کا جو اس کے چہرے سے پھوٹا پڑتا تھا اور ان پراسرار اور عارفانہ جملوں کا جو اس کے منہ سے بوقت سجدہ نکلتے تھے چرچا ہونے لگا تھا جب پورے ۳۹ دن گزرے تو شام کو میں گاؤں میں وارد ہوا' اور میں کون ہوں' یہ بھی آپ کو بتاتا جاؤں۔

میں اس گاؤں کا سکول ماسٹر ہوں جہاں اویس مویشیوں کی منڈی میں آڑھت کا کام کرتا تھا اور شیخ سعید مسجد کا پیش امام تھا۔ میں موسم گرما کی تعطیلات دمشق میں گزارا کرتا تھا اور اتفاق ایسا ہوا کہ میں جب تعطیلات

گزار کر آیا تو اویس کو خواب دیکھے ہوئے انتالیس روز ہو گئے تھے اور جب سکول کے بوڑھے چوکیدار محمد عطاء اللہ نے مجھے سارا قصہ سنایا تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اویس کی حماقت پر ہنسوں یا اس کی کم عقلی کا ماتم کروں' بہرحال میں عطاء اللہ کو لے کر اویس کو تسلی دینے یا یوں کہئے کہ اس کی تعزیت کرنے گیا۔ گھر کا صحن جو کبھی مویشیوں سے پر ہوتا تھا آج لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جو اس کی روح میں دھیرے دھیرے سرایت کرتی ہوئی موت پر تعزیت کرنے آئے تھے۔ ایک کونے میں عورتیں تھیں اور دوسرے میں مرد اور تیسرے گوشے میں بھیڑ بکریاں تھیں جو اس کے اعزہ و اقربا اس کی موت واقع ہونے کی صورت میں صدقہ کرنے کے لیے لائے تھے۔ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ اویس ایک کونے میں اپنے بستر پر بیٹھا عبادت میں مصروف ہے اور شیخ سعید دوسرے کونے میں اپنے مخصوص لہجے میں قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ میں اویس کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس کا گول مٹول سرخ انار سا چہرہ لبوترا ہو گیا تھا اور اس پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ داڑھی نے چہرے کی لمبائی میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا اور ڈھیلے لباس کی وجہ سے زردی بھی نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ سجدے میں جاتا تو سر اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ شاید اس کی خواہش یہ تھی کہ اسے سجدہ میں موت آئے۔ اس اویس میں جس کے چہرے پر نور برس رہا تھا اور اس اویس میں زمین آسمان کا فرق تھا جسے میں نے اسکول کی کھڑکی کے نیچے قسمیں کھاتے بارہا سنا تھا۔ "واللہ میری بیوی کو طلاق ہو جائے اگر میں نے اس بھیڑ پر تین لیرے نقصان نہ اٹھایا ہو۔" جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا ان توہمات پر ایمان نہیں تھا اور میں تو حقیقت حال معلوم کرنے کی غرض سے اویس سے ملنے آیا تھا' لیکن جب میں نے اس کی یہ کایا پلٹ دیکھی تو مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ ضرور کل تک رحلت کر جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے شیخ سعید پر بہت غصہ آیا جو باآواز بلند تلاوت کر رہا تھا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھتا بھی جاتا تھا۔

میں ازل سے شیخ سعید کا دشمن تھا جس کی فطرت میں سادگی حماقت اور عیاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں اس لپاڑیے کی چالبازی کی ہمیشہ مخالفت کیا کرتا تھا جس کی مدد سے وہ جاہل گاؤں والوں پر چھایا ہوا تھا اور اس نے بھی گاؤں والوں کو میرے خلاف اکسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ مجھ پر الزام لگاتا تھا کہ میں اپنے شاگردوں کو الحاد کا سبق دیتا ہوں اور انہیں اللہ و رسول سے نافرمانی سکھاتا ہوں اور جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کے بیٹے امام زین العابدینؓ کی اولاد سے ہوں تو اس کی مخالفت کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ کہتا تھا دیکھو! یہ زین العابدینؓ کی اولاد ہوتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تم میں سے کسی نے کبھی بھی یہ دیکھا ہے کہ اس کے گھر کا دروازہ جو مشرق کے رخ ہو' اچانک مغرب کی طرف ہو گیا ہو۔

شیخ سعید کو دیکھتے ہی میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے چلا چلا کر کہنا شروع کیا کہ وہ قاتل ہے اس نے اویس کے ذہن میں ایسا زہر گھولا ہے جس نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ راسخ کر کے وہ چالیس روز کے اندر اندر مر جائے گا اسے ذہنی مریض بنا دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ میں اس کا پہلے بھی کبھی کچھ نہ بگاڑ سکا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ میرے غصے کا جواب ایسے مسکت دلائل سے دیتا تھا جیسا کہ زمین کے نہ گھومنے کے سلسلے میں دیا کرتا تھا اور گاؤں والے اس کی باتوں میں آ جایا کرتے تھے۔ کیونکہ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کے دروازے جو مشرق کی طرف تھے مغرب کی سمت ہو گئے ہوں۔ اس لیے ثابت ہوا کہ زمین نہیں گھومتی تھی بلکہ ساکت تھی۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جسے مجھ سے خدا واسطے

کا بیر تھا اور اویس پر بھی جو اس کے سحر سے مسحور ہو گیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں بوجھل قدموں سے دل گرفتہ سا اپنے سکول واپس لوٹ آیا۔

اگلے روز میری ہدایت کے مطابق عطاء اللہ چوکیدار نے مجھے صبح صادق کے وقت ہی اٹھا دیا۔ دمشق سے میں تین خاردار ناشپاتیاں ساتھ لایا تھا جنہیں میں نے رات کو پانی میں ڈال کر کھلی ہوا میں رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے ان میں سے ایک ناشپاتی اٹھائی اور اویس کی طرف چل دیا۔ صحن میں سوائے بھیڑ بکریوں کے جو اپنے آقا کی موت کے صدقے اپنی موت کا انتظار کر رہی تھیں کوئی فرد بشر نہیں تھا۔ زنان خانے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور آہ و زاری کی آواز آ رہی تھی۔ اویس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو وہ تمام رات کی عبادت سے تھک ہار کر سو گیا تھا۔ میں نے دروازے پر کئی مرتبہ زور سے دستک دی لیکن بے سود۔ آخر میں نے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور چیختے ہوئے کہا۔

"اویس اٹھو اپنے خدا کی تسبیح بیان کرو۔"

"کون ہے؟" وہ گھبرا کر اٹھتے ہوئے چلایا۔

"اویس گھبراؤ مت' میں ناجی ہوں سکول ماسٹر اور دیکھو' میری بات غور سے سنو۔"

"میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے ابھی ابھی امام زین العابدینؒ نے جگا کر یہ حکم دیا ہے کہ اویس کے پاس جاؤ اور اسے یہ خوشخبری دو کہ وہ اس آزمائش میں پورا اترا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اسے مبتلا کیا تھا اللہ نے اسے اپنے گناہوں پر نادم اور اپنا فرمانبردار بندہ پایا۔ اسے جنت کے میووں میں سے یہ میوہ دو اور اسے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے دو نفل ادا کرے جس کی پہلی رکعت میں وہ سورۃ "نصر" پڑھے اور خدا اس کی عمر اتنی دراز کرے گا کہ وہ نواسوں اور پوتوں والا ہو جائے گا۔"

اویس نے بمشکل اپنا تھوک نگلتے ہوئے ایسی بھونچکا نظروں سے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اس خاردار ناشپاتی (جو مجھے یقین ہے کہ کسی دیہاتی نے زندگی بھر نہیں دیکھی ہوگی) کو دیکھا جیسے اس کے ذہن میں میری تمام تقریر نہ بیٹھی ہو' میں نے ناشپاتی چھیلی اور اس کے منہ میں ٹھونس دی اور اسے بیجوں سمیت نگل جانے کو کہا۔ پھر میں اسے کمرے کے ایک کونے کی طرف گھسیٹ کر لے گیا اور کہا۔

"اویس نماز کے لیے تیار ہو جاؤ مبادا کہ سورج نکل آئے۔"

"لیکن ناجی میں نے وضو نہیں کیا۔"

مجھے یاد آیا کہ وضو تو میں نے بھی نہیں کیا تھا لیکن اس خوف سے کہ کہیں اس سارے ڈرامے کا اثر زائل نہ ہو جائے اسے تیمم کرنے کو کہا۔

"اویس تیمم کر لو خدا نے اس کی اجازت دی ہے۔ چلو جلدی کرو۔ اپنے ہاتھ دیوار پر مار اپنے منہ اور بازوؤں پر پھیر لو۔" جب وہ تیمم کر چکا تو اویس کو آگے کھڑا کر کے ہم نے دو رکعت نفل پڑھے جس کی پہلی رکعت میں اس نے پوری سورۃ "نصر" تلاوت کی۔ پھر میں اس سے رخصت لے کر اپنے سکول آ گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ تمام گاؤں میں اس واقعے کی دھوم مچ گئی وہ تمام دیہاتی جو کل اس کے گھر ہجوم کرتے رہے تھے آج سکول کی طرف امڈے پڑ رہے تھے۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھے کہ کیسے امام زین العابدینؒ اویس کے لیے اللہ کی طرف سے معافی کا پیغام لے کر میرے پاس آئے تھے۔ اس لیے مجھے

ایسا محسوس ہوا کہ آج میں شیخ سعید سے بازی لے گیا ہوں کیونکہ نہ تو ادیس کو موت آئی تھی اور نہ ہی وہ بھیڑبکریاں ذبح ہوئی تھیں جو اس کے عزیز و اقارب صدقہ کی غرض سے لائے تھے بلکہ وہ سب کی سب میری خدمت میں ہدیتہ" پیش کر دی گئیں۔ سکول ماسٹر ناجی کی خدمت میں جو امام زین العابدینؓ کی اولاد تھا۔

لیکن کیا واقعی میں بازی جیت گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے اس شبہے کو اس بات سے مزید تقویت پہنچی تھی کہ اس کے باوجود کہ شیخ سعید کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں سے ایک نمازی تک کم کرنے میں ناکام رہا تھا بلکہ اس کے برعکس میں نے اس کے مقتدیوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا تھا۔ گاؤں کے سکول ماسٹر کا۔ میں اپنے خودساختہ اعزاز کی لاج رکھنے کے لیے جو میں نے من گھڑت خواب کی بدولت حاصل کیا تھا' اب تمام نمازیں بہ نفس نفیس شیخ سعید کی اقتداء میں ادا کرنے پر مجبور تھا اور وہ بھی محض تیمم کر کے نہیں بلکہ باقاعدہ وضو کے ساتھ۔

موپساں/ ستار طاہر

طوطا

نی کیمپ کے علاقے میں رہنے والا ہر شخص ڈیزائری پینسن کی کہانی سے واقف ہے بے چاری بد قسمت عورت' جب تک اس کا شوہر زندہ رہا' اس کے ہاتھوں اس طرح پٹتی رہی جیسے گندم کو کھلیان میں کوٹا جاتا ہے اس کا شوہر مچھلیاں پکڑنے والی ایک کشتی کا مالک تھا۔ اس نے اس سے شادی کرلی' کیونکہ وہ اگرچہ غریب تھی لیکن بلا کی خوبصورت تھی!

پینسن ایک مشاق اور تجربہ کار ملاح تھا مگر وحشی انسان تھا۔ وہ عموماً" ابا آبان کی سرائے میں شراب نوشی کے لیے آیا کرتا تھا۔ عام طور پر وہ برانڈی کے چار پانچ گلاس ضرور پیتا تھا اور اگر موڈ اچھا ہوتا تو آٹھ دس گلاس چڑھا لیتا۔ گاہکوں کو برانڈی پیش کرنے کی خدمت ابا آبان کی بٹی انجام دیا کرتی جو کالے بالوں والی خوبصورت لڑکی تھی۔ لوگوں کے لیے اس کے خوبصورت چہرے میں بڑی کشش تھی اور یہ دلچسپی صرف اسی حد تک تھی کیونکہ ابھی تک اس کے بارے میں نہ تو کوئی افواہ پھیلی تھی نہ لوگ گپ شپ ہی لگاتے تھے۔

پینسن جب سرائے میں داخل ہوتا تو اسے دیکھ کر بڑا اطمینان سا محسوس کرتا' وہ نرمی اور احترام سے اس کو سلام بھی کر دیتا۔ جب وہ برانڈی کا پہلا گلاس چڑھا چکا ہوتا تو وہ اسے اور بھی اچھی لگتی۔ دوسرے گلاس پر وہ آنکھوں سے اشارے کرنے لگتا۔ تیسرا گلاس پینے کے بعد وہ کہتا ڈیزائری۔۔۔ کاش تم رضامند ہوتی تو۔۔۔ وہ ہمیشہ اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیتا۔ چوتھے گلاس پر وہ اس کی سکرٹ کو پکڑ کر پیچھے سے تھام کر بوسہ دینے کی کوشش کرتا اور جب وہ دسویں گلاس تک پہنچ جاتا تو پھر ابا آبان اس کے لیے باقی ماندہ شراب لے کر آتا۔

بوڑھا سرائے والا کاروبار کی ساری نزاکتوں اور حربوں کو سمجھتا تھا۔ وہ اپنی بڑی بٹی ڈیزائری کو شراب کی فروخت بڑھانے کے لیے گاہکوں کی میزوں کے درمیان بار بار بھیجتا رہتا تھا۔ ڈیزائری اپنے ابا جان کی سچی بٹی تھی وہ اپنے باپ کے مقصد کو سمجھتے ہوئے میزوں کے گرد گھومتی اور گاہکوں سے مذاق کرتی رہتی اس کے ہونٹ مسکراتے رہتے اور آنکھیں چمکتی رہتی تھیں۔

پینسن کے ذہن میں ڈیزائری کا چہرہ اتنا رچ بس گیا تھا کہ وہ سمندر پر بھی ہوتا تو سمندر میں جال پھینکتے' بپھری اور پرسکون خاموش لہروں کے درمیان چاندنی راتوں اور تاریک شاموں میں بھی یہ چہرہ اس کو یاد آتا رہتا جب وہ کشتی کے چپوار کی ہتھی تھامے ہوتا جب اس کے چاروں ساتھی ملاح اپنے بازوؤں پر سر رکھے سو رہے ہوتے وہ ڈیزائری کے متعلق بے اختیار ہو کر سوچنے لگتا وہ جب بھی خیال میں اسے دیکھتا' ڈیزائری کو مسکراتے ہوئے پاتا۔ زرد رنگ کی برانڈی کو گلاس میں انڈیلتے وقت وہ کندھے عجیب انداز میں حرکت دیتی۔۔۔ اور پھر اس سے پوچھتی۔ "یہ رہی برانڈی' کیوں اب تم مطمئن ہو؟"

وہ اس کو چشم تصور سے اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ اس کے دل کو یہ خواہش مغلوب کرنے لگی کہ وہ اس سے

شادی کرلے گا۔ اپنی اس خواہش کے آگے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا تو اس نے ڈیزائری کا رشتہ مانگ لیا۔
پینسن دولت مند تھا اس کی اپنی کشتی' جال اور پہاڑی کے دامن میں مکان تھا۔ اس کے برعکس ابا آبان کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس لیے شادی جلد ہی طے پا گئی۔ دونوں فریقین یہی چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے شادی کا انتظام کر دیا جائے۔ اسی لیے چند دنوں میں ہی شادی کی تقریب منعقد ہوئی اور پینسن۔ ڈیزائری کو بیاہ کر لے آیا۔
شادی کے تین دن بعد ہی پینسن کے خیالوں کا سارا طلسم ٹوٹ گیا وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ کون چیز تھی جس کی وجہ سے ڈیزائری اس کو دوسری عورتوں سے مختلف اور انوکھی لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں بھی کتنا بے وقوف اور احمق ہوں کہ ایک ایسی لڑکی کے جال میں پھنس گیا جو نادار اور مفلس ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی برانڈی میں کوئی نشہ آور چیز ملا کر اسے پلاتی رہی تھی۔
وہ سارا دن اپنے آپ پر لعنت بھیجتا رہتا۔ اپنے پائپ کو دانتوں یں چباتا اور توڑتا رہتا۔ اپنی کشتی کے ملاحوں کو پیٹنے لگتا وہ اپنا باقی غصہ ہر اس چیز پر اتارتا جو اس کے سامنے آ جاتی۔ گندی گالیاں بکتے اور لعنتیں بھیجتے ہوئے وہ مچھلیوں سے ٹوکریوں کو بھرتا رہتا۔ جب وہ گھر لوٹتا تو وہ اپنی بیوی' ابا آبان کی بیٹی کو دیکھتا جو اس کے منہ اور ہاتھوں کی رسائی سے دور نہ ہوئی تھی وہ اس کے ساتھ حقیر ترین جانوروں کا سا سلوک کرنے لگا تھا۔ بے چاری ڈیزائری اپنے والدین کے لڑائی جھگڑوں کو بھی دیکھ چکی تھی' اس لیے بڑی خاموشی سے وہ سنتی رہتی۔ پینسن اس کی خاموشی سے مشتعل ہو جاتا اور پھر ایک شام وہ اس کو پیٹنے لگا اور ڈیزائری کے لیے اس گھر میں زندگی جہنم بن گئی۔
ایتنبو کے قصبے میں دس برس تک لوگ ایک ہی موضوع پر گفتگو کرتے رہے تھے ڈیزائری کی پٹائی' پینسن کا وحشیانہ پن۔ وہ معمولی اور حقیر سی بات پر اپنی بیوی پر لعنت بھیجنے لگتا۔ اس کو کوستا اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ اس علاقے کے عام لوگوں کا ذخیرہ الفاظ محدود تھا۔ پینسن اپنی بیوی کو گالیاں دیتے اور کوستے ہوئے نئے نئے الفاظ استعمال کرتا' نئی نئی ترکیبیں تراشتا۔ جونہی اس کی کشتی ساحل کی طرف بڑھتی اس کی آنکھیں اپنی بیوی کو تلاش کرنے لگتی تھیں اور جونہی وہ اس کو دیکھتا اس کے روز گالیوں کوسنوں اور لعنتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ ساحل پر اتر کر اپنی بیوی کے قریب پہنچتے ہی وہ گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا لوگ ہنسنے لگتے۔ اگرچہ ان کو ڈیزائری سے دلی ہمدردی تھی جب وہ مچھلیاں اتار کر دوسری جگہ منتقل کر رہا ہوتا تو قصبے کے سارے لوگ اس کی باتوں کا مزہ لینے کے لیے اسکے اردگرد جمع ہو جاتے۔ الفاظ پینسن کے منہ سے یوں نکلتے جیسے توپ کے منہ سے گولے نکل رہے ہوں۔ الفاظ گرجتے' پھٹتے اور دھماکہ پیدا کرتے۔ ایک آندھی سی چل نکلتی جو اس کے مضبوط پھیپھڑوں سے جنم لیتی تھی کیونکہ وہ بے تکان اونچی آواز میں بولتا چلا جاتا۔
کشتی کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنی بیوی کے سامنے جاتا تو گالیوں اور سخت سست لفظوں سے بھری ہوئی ایک کشتی اس پر انڈیل دیتا۔ پھر وہ آگے آگے چل نکلتی وہ اس کے پیچھے دھاڑتا اور بکتا ہوا چلتا رہتا۔ اس رعونت پر بے چاری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ بالاخر وہ بند دروازوں کے پیچھے اپنے گھر میں اکیلے رہ جاتے' تب وہ کسی معمولی سی بات پر اسکو مارنے پیٹنے لگتا' کسی حقیر سی بات پر اس کا ہاتھ اٹھ جاتا اور پھر نہ رکتا۔ ہر بار اس پر وار کرتے ہوئے وہ چیختا۔۔۔ بھوکی' فقیرنی' بھتنی' کمینی۔۔۔۔ پھر وہ اپنے آپ کو کوستا جس نے اس سے شادی کی تھی۔ اس کے باپ کو گالیاں دیتا جس نے شادی کی فوراً حامی بھر لی تھی۔

بے چاری عورت ۔۔۔۔ ایک دائمی اور ہمیشہ زندہ رہنے والے خوف کے سائے میں زندہ تھی۔ اس کا جسم اس خوف سے ہمیشہ کانپتا رہتا۔ اس کی روح لرزتی رہتی۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتی کہ اس کو پیٹا جائے گا اس کی بے عزتی کی جائے گی۔

یوں کافی سال گزر گئے وہ اتنی ڈرپوک ہو چکی تھی کہ کسی سے کوئی بات بھی کرتی تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ وہ ہر وقت ایک ہی خیال میں گم رہتی کہ اسکا شوہر اس کو پیٹے گا۔ اپنے شوہر کی دھمکیوں کی عملی صورت سے وہ خائف رہتی وہ دبلی ہوتی گئی اس کی رنگت پیلی پڑتی گئی وہ سوکھ گئی تھی!!

ایک رات وہ اچانک ہڑبڑا کر جاگ گئی۔ طوفانی ہوا دھاڑ رہی تھی۔ اس کا شوہر سمندر پر گیا ہوا تھا وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھ کر کانپنے لگی جب اس نے پھر کوئی آواز نہ سنی تو پھر بستر میں لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوا چمنی میں دھاڑنے لگی اور سارا گھر ہلنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا' آسمان سے خوفناک اور کریہہ جانور نیچے اتر کر ہواؤں میں دھاڑ اور چیخ رہے ہیں وہ تیزی سے اٹھی اور بندگاہ کی طرف بھاگنے لگی۔ چاروں طرف سے عورتیں ہاتھوں میں لالٹینیں لئے بندگارہ کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھیں مرد بھی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سمندر کی لہریں جھاگ اڑا رہی تھیں۔ مرد بھی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سمندر کی لہریں جھاگ اڑا رہی تھیں۔

یہ طوفان پندرہ گھنٹوں تک چلتا رہا۔ گیارہ ملاح سمندر سے کبھی واپس نہ آ سکے ان میں۔۔۔۔۔ پینسن بھی تھا۔

ڈیپی کے قرب و جوار میں پینسن کی تباہ حال کشتی کے کچھ ٹکڑے مل گئے سال والیری کے نزدیک ملاحوں کی نعشیں بھی مل گئیں مگر پینسن کی لاش تلاش کے باوجود کبھی نہ مل سکی۔ طوفان میں اس کی کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اس لیے پینسن کی بیوی کو خیال آتا کہ وہ کسی تختے پر سوار ہو کر کہیں دور نکل گیا ہو گا اور ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا' مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ یہ سمجھنے لگی کہ اس کو پینسن سے نجات مل گئی ہے اس کے باوجود وہ کسی ہمسائے' بھکاری اور پھیری والے کی اچانک آمد پر یوں چونک اٹھتی جیسے پینسن آ گیا ہو۔

اس کے شوہر کی گمشدگی کو چار برس ہو چکے تھے کہ ایک شام جب وہ ٹہل رہی تھی تو ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ یہ مکان ایک بوڑھے سمندری کپتان کا تھا جو تھوڑا عرصہ پہلے مرگیا تھا اور اب اس کا فرنیچر نیلام کیا جا رہا تھا۔ جب وہ رکی تو اس وقت ایک طوطے کی بولی دی جا رہی تھی۔ طوطے کے پر سبز اور سرنیلا تھا وہ لوگوں کو غصے سے گھور رہا تھا۔

تیس فرانک" نیلام کرنے والے نے آواز سنائی۔ تیس فرانک ایک ایسے طوطے کے۔۔۔ جو ایک وکیل کی طرح باتیں کر سکتا ہے۔"

اس کی ایک سہیلی نے اسے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "تم دولت مند ہو یہ طوطا تمہیں خرید لینا چاہئے۔ تم تنہا ہو یہ اچھا ساتھی ثابت ہو گا ویسے بھی اس کی قیمت تیس فرانک سے زیادہ ہے اور جب بھی تمہارا دل اس سے بھر جائے تو اسے بیس پچیس فرانک کے بدلے بیچ بھی سکتی ہو۔

پینسن کی بیوہ نے بولی میں پندرہ پیسو کا اضافہ کیا تو پرندہ اس کو دے دیا گیا جو ایک چھوٹے سے پنجرے میں بند تھا وہ پنجرہ اٹھا کر گھر لے آئی۔ جب اس کے پانی پلانے کے لیے اس کا پنجرہ کھولا تو طوطے نے اس کی انگلی کاٹ کھائی اور خون بہنے لگا۔

اوہ-------- یہ کتنا شریر ہے وہ کہنے لگی۔
اگلی صبح جب دن طلوع ہو رہا تھا پینسن کی بیوہ نے ایک اونچی گہری اور دھاڑتی ہوئی غیر معمولی آواز سنی۔

مردار کیا تم اٹھو گی نہیں----

یہ آواز سن کر خوفزدہ ہو گئی اس نے اپنا سر چادر کے نیچے چھپا لیا کیونکہ جن دنوں پینسن گھر میں ہوتا تھا تو جونہی اس کی آنکھ کھلتی تھی وہ اس کو اسی طرح مخاطب کر کے یہ جملہ کہا کرتا تھا۔

کانپتے اور لرزتے ہوئے وہ گیند کی طرح سمٹ گئی اس نے اپنا چہرہ تکیوں کے نیچے چھپا لیا۔ اسے توقع تھی کہ ابھی اس کی پٹائی شروع ہو جائے گی وہ بڑبڑانے لگی--- اوہ میرے خدا--- وہ یہاں آگیا--- اچھے خدا--- وہ لوٹ آیا----- وہ واپس آگیا--- کئی لمحے گزر گئے کسی آواز نے کمرے کی خاموشی کو نہ توڑا کانپتے ہوئے اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا وہ ضرور کہیں چھپ گیا ہے۔

کافی دیر تک وہ انتظار کرتی رہی پھر اسنے اپنے اندر حوصلے کو پیدا کیا اور اپنے آپ سے کہنے لگی--- یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے خواب دیکھا ہو گا---" جب اسے اپنی بات پر کچھ یقین آگیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی اس نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اسے اپنے قریب سے ایک خوفناک' گرجتی اور دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی یہ آواز ڈوبے ہوئے آدمی کی چیخ کی طرح تھی۔

تم جس کسی چیز پر بھی ایمان رکھتی ہو اس کی قسم کھا کر کہو کہ کب اٹھ رہی ہو--- کتیا! وہ چھلانگ لگا کر ایک تابع' کمزور اور مارپیٹ کی عادی عورت کی طرح اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ یہ آواز کبھی نہ بھولی تھی اور نہ ہی کبھی بھول سکتی تھی۔ پینسن میں اٹھ گئی ہوں حکم کرو' تمہیں کیا چاہیے۔

پینسن نے کوئی جواب نہ دیا۔

حیران و ششدر وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگی۔ اس نے چمنی میں بھی جھانک لیا بستر کے نیچے بھی دیکھا۔ پھر ہر طرف سے ناکام ہو کر کرسی پر گر پڑی' پریشان اور فکرمند۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پینسن کی روح واپس آگئی ہے صرف اس کو اذیت پہنچانے کے لیے---

اچانک اس کو بالاخانے کا خیال آیا۔ وہ سیڑھی کی طرف لپکی یقیناً وہ اسے حیران اور پریشان کرنے کے لیے بالاخانے میں چھپا ہوا ہو گا۔

اسے یقیناً وحشیوں اور سمندری ڈاکوؤں نے قید کر لیا ہو گا اور اب وہ ان سے جان بچا کر بھاگ آیا ہے۔ یقیناً یہ اسی کی آواز تھی۔ اس نے سر اوپر اٹھا کر آواز دی "پینسن کیا تم ادھر ہو۔"

پینسن نے کوئی جواب نہ دیا۔

لرزہ خیز خوف سے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی کے ساتھ سیڑھی پر چڑھ گئی۔ بالاخانہ کا دروازہ کھولا مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سوکھے گھاس پر بیٹھ کر وہ چیخنے اور رونے لگی جس وقت وہ رو رہی تھی اور ایک ماورائی غیر فطری اور شدید خوف سے مغلوب ہو چکی تھی اس نے پیسنن کے باتیں کرنے کی آواز نچلے کمرے سے آتی ہوئی سنی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بھوک لگی ہو وہ کہہ رہا تھا۔

کتنا ناخوشگوار موسم ہے اوہ یہ خوفناک ہوا' گندہ موسم' لعنت ہو میں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔

وہ چھت پر سے ہی جلد اتر آئی۔ بینسن میں یہاں ہوں۔ تم ناراض کیوں ہوتے ہو میں ابھی تمہارا کھانا تیار کرتی ہوں وہ بھاگ کر نیچے پہنچی' وہاں کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو لاغر اور نحیف محسوس کرنے لگی جیسے موت اس کو مجبور کر رہی ہو۔ وہ بھاگ کر کسی ہمسائے کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے قریب ہی ایک آواز سنی۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ میرے خدا۔۔۔۔ میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

طوطا اپنے پنجرہ میں سے اپنی گول' شیطنت سے بھری ہوئی سب کچھ جاننے والی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود اس کو وحشت سے دیکھ رہی تھی پھر بڑبڑانے لگی "اچھا۔۔۔ تو یہ تم تھے۔"

طوطے نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "بس تم ذرا انتظار کرو پھر میں تمہیں بے کار بیٹھنے کا مزہ چکھاؤں گا۔"

اس کے اندر جانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی' محسوس کر چکی تھی کہ وہ مردہ شخص واپس آچکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اس پرندے کے پروں میں چھپا لیا ہے تاکہ وہ اس کو اذیت پہنچاتا رہے' پہلے کی طرح سارا دن اس کو کاٹتا رہے' اس کو کوستا رہے' اس پر لعنتیں بھیجتا رہے تاکہ ہمسائے اس کی باتیں سن کر ایک بار پھر اس پر ہنسنے لگیں۔ وہ تیزی سے پنجرے پر جھپٹی اور پرندے کو پکڑ لیا جو اپنی چونچ اور پنجوں سے اس کا گوشت ادھیڑتا رہا لیکن اس نے طوطے کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔ اس نے طوطے کو زمین پر پھینکا اور ہذیانی جوش کے ساتھ اس کو کچلنے لگی۔ اس نے اس کو کچل کر رکھ دیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا سبز رنگ کا مڑا تڑا تودا سا تھا جو نہ حرکت کر سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ اس نے اس کو ایک کپڑے میں یوں لپیٹ دیا جیسے وہ کفن ہو پھر وہ رات کا لباس ہی پہنے ہوئے ننگے پاؤں چلتی ہوئی گودی کی طرف بڑھتی چلی گئی جس کے ساتھ سمندر کی لہریں ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے کپڑے کو جھٹکا دیا اور وہ چھوٹی سی مردہ چیز جو گھاس کی طرح نظر آرہی تھی پانی میں گر گئی۔ گھر واپس پہنچ کر وہ خالی پنجرے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ وہ جو کچھ کر کے آئی تھی اس واقعے نے اس کو مغلوب کر رکھا تھا جھک کر وہ معافی مانگنے لگی جیسے اس نے کوئی قابل نفرت جرم کیا ہو۔

ژاں پال سارتر / صغیر ملال

دوام

سڑک پر چلتے آدمیوں کو بلندی سے دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں بتی بجھا کر کھڑکی سے جھانکتا ہوں۔ نیچے سے گزرتے راہ گیروں کو شک ہی نہیں ہوتا کہ کوئی انہیں یوں اوپر سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ عام طور پر ہر شخص اپنے بدن کا سامنے کا حصہ سجاتا ہے یا تھوڑا بہت کمر کا خیال کر لیتا ہے۔ بہرحال اس کی تمام آرائش ان آنکھوں کے لیے ہوتی ہے جو تقریباً پانچ فٹ آٹھ انچ کی بلندی پر واقع ہوتی ہیں۔ کوئی بھی اپنی ٹوپی کا اوپر والا حصہ یا اپنے کندھوں کی سجاوٹ کا خیال نہیں رکھتا۔ لوگوں کو ابھی تک احساس ہی نہیں ہوا کہ اوپر سے دیکھنے والی آنکھ انسانیت کی کتنی بڑی دشمن ہے۔ میں کھڑکی سے جھک کر سب پر ہنستا ہوں۔ اب ان کی اکڑی ہوئی چال کی کیا حیثیت رہ گئی ہے؟ اس لمحے ان کی شخصیت فقط دو جھولتے کندھوں اور نیچے سے بے ڈھنگے پن سے نکلی ہوئی دو ٹانگوں پر مشتمل ہے۔

میں ساتویں منزل کی بالکونی پر تمام زندگی گزار سکتا ہوں۔ مجھے عام لوگوں پر یہی تو فوقیت حاصل ہے میں ان کے مقابلے میں بلند تر مقام کا حامل ہوں۔ کبھی کبھی مجھے نیچے بھی جانا پڑتا ہے۔ وہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ لوگوں کی سطح پر کھڑے ہو کر انہیں کیڑے مکوڑوں کی شکل میں دیکھنا بہت دشوار ہے۔ وہاں تو وہ میری برابری کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی مجھے چھو بھی لیتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سڑک پر ایک مردہ شخص بھی دیکھا تھا۔ وہ چلتے چلتے منہ کے بل گر کر مر گیا تھا۔ اسے سیدھا کیا گیا تو اس کا خون آلود چہرہ دیکھ کر سب افسوس کرنے لگے۔ مجھے اس منظر نے کوئی ایسا خاص متاثر نہیں کیا تھا۔

"اگر کسی کا خوف سے پتلون میں پیشاب نکل جائے۔" مجھے خیال آیا تھا۔ "تو آدمی زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہے۔" لیکن اس خیال کے بعد میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں، اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ چند لوگ مجھے دواؤں کی دکان پر لے گئے تھے اور میرے گالوں پر طمانچے مار کر مجھے ہوش میں لائے تھے۔ اگر میرا بس چلتا تو اس لمحے، میں ان سب کو ہلاک کر سکتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے دشمن ہیں مگر یہ بات ان کے علم میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپس میں وہ سب دوست تھے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تھے۔ احوالیہ جملوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے تھے۔ وہ مجھے بھی اپنے جیسا سمجھ کر میری مدد کر رہے تھے۔ اگر انہیں حقیقت معلوم ہو جاتی تو وہ مار مار کر مجھے توڑ ڈالتے۔ کچھ عرصے بعد جب انہیں علم ہو گیا کہ دراصل میں کون ہوں تو انہوں نے مجھے مارا بھی تھا۔ وہ دو گھنٹے تک مجھے سربازار زد و کوب کرتے رہے تھے۔ جب ان کے تھپڑوں اور مکوں سے نڈھال ہو کر میں گر گیا تھا تو انہوں نے مجھے ٹھوکریں ماریں تھیں۔ اور ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا۔ میرے کپڑے پھاڑ دیے تھے اور میری عینک اتار کر دور پھینک دی تھی جب میں گھٹنوں کے بل چلتا اپنی عینک تلاش کر رہا تھا۔ اس وقت کسی نے میرے

منہ پر ایسی ضرب لگائی تھی کہ میرے دانت ٹوٹ کر حلق کے اندر چلے گئے تھے۔ مجھے شروع سے علم تھا کہ بالآخر ایک دن انہوں نے مجھے بہت مارنا ہے۔ چند لمبے چوڑے لوگ عرصے سے مجھے مارنے کا موقع تلاش کر رہے تھے۔ سڑک پر وہ میرے کندھے سے کندھا ٹکراتے تھے تاکہ میں جواب میں انہیں کچھ کہوں جسے بہانہ بنا کر وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں لیکن میں یوں چلتا رہتا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ مگر آخرکار انہیں موقع مل ہی گیا۔ مجھے اول روز سے اندیشہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی کوئی بہانہ ڈھونڈ لیں گے۔ اسی لیے میں ابتداء سے ان سے نفرت کرتا تھا۔

صورتحال اتنی گمبھیر ہو گئی کہ مجبوراً" میں نے ایک دن پستول خریدنے کا فیصلہ کیا۔ پستول حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک عجیب سی طاقت کا احساس ہوا۔ جسم کے ساتھ مستقل ایک ایسی چیز لگی رہے جو وقت پڑنے پر زوردار آواز سے چیزوں میں سوراخ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو تو آدمی دلیر ہو جاتا ہے۔ میں چھٹی کے دن جیب میں پستول ڈالتا اور تمام وقت شہر کی سڑکوں پر گھومتا۔ پتلون کی جیب میں پڑا پستول ٹانگ سے چھوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کیڑا بدن پر رینگ رہا ہے۔ ابتداء میں فولاد کی ٹھنڈک عجیب سی سنسنی پیدا کرتی لیکن کچھ وقت کے بعد وہ بدن جتنا ہی گرم ہو جاتا۔ چہل قدمی کے دوران میں جب بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہتھیار کو محسوس کرتا' میرا سر خود اعتمادی سے بلند ہو جاتا۔ جہاں کوئی ایسی دیوار نظر آتی جس کے ساتھ کھڑے ہو کر لوگ پیشاب کرتے ہیں' تو میں بھی دیوار کی جانب منہ کر کے رک جاتا اور اپنا پستول نکال کر ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھتا۔ ایسے موقعوں پر مجھے بہت احتیاط کرنی پڑتی تھی کیونکہ کبھی کبھی کوئی دوسرا شخص بہت نزدیک کھڑا' اجابت میں مصروف ہوتا۔ اس کے باوجود میں چند لمحوں کے لیے پستول کا آہنی دستہ اور ادھ کھلی آنکھ جیسی لمبی دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ یہی سمجھتے کہ میں دیوار کی جانب منہ کئے فراغت حاصل کر رہا ہوں' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں گزرگاہوں پر پیشاب کرنے کو بہت برا سمجھتا ہوں۔

ایک رات مجھے لوگوں پر گولیاں برسانے کا خیال آیا۔ یہ ہفتے کی رات تھی اور میں گھر سے اس بھورے بالوں والی لڑکی کو لینے نکلا تھا جو شہر کی مرکزی شاہراہ پر واقع ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ میں عورتوں سے مباشرت کرنے کو پسند نہیں کرتا ہو کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ہم بستری کے دوران چاہے مرد ہی زیادہ فاعل نظر آئے مگر اس عمل میں بالآخر عورت ہی کی جیت ہوتی ہے۔۔۔ بستر سے لڑکی ہی کچھ لے کر اٹھتی ہے میں کسی سے کچھ مانگتا نہیں ہوں' مگر میں کسی کو کچھ دینا بھی نہیں چاہتا۔ اسی لیے میری جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہی عورت موزوں رہتی ہے جو بنیادی طور پر سرد مزاج کی ہو اور میری خواہشات پر عمل کرنے سے اسے کراہت آئے۔ ہر مہینے کی پہلی چھٹی کو میں لی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رات گزارتا ہوں۔ وہ میرے کہنے پر کپڑے اتارتی ہے اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس رات لی طبیعت کی خرابی کے باعث اپنے کام کی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ غالباً" اسے زکام وغیرہ ہو گیا تھا۔ باہر جنوری کے مہینے کی سرد اداسی پھیلی تھی اور میں بہت زیادہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اس شام میں گھر سے بہت امنگ کے ساتھ نکلا تھا اور یہ مایوسی نہایت غیر متوقع تھی۔ خیالی دنیا میں رہنے کے سبب مجھے کبھی کبھی عورت کی شدید طلب ہوتی ہے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور لڑکی کا خیال آیا۔ وہ تھوڑی موٹی ضرور تھی مگر اس کا جسم ڈھیلا نہیں تھا۔ میں یوں بھی موٹے بدن والی عورتوں کو پسند کرتا ہوں۔ موٹی عورت کپڑے اتارنے پر دبلی عورت سے زیادہ ننگی نظر آتی ہے۔ لیکن اس روز جس فربہ لڑکی کا مجھے خیال آیا تھا وہ میری خواہشات سے آشنا نہیں تھی۔ میں بھی اسے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ بعض اوقات پیشہ ور عورتیں بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دلال کو الماری کے پیچھے چھپا دیتی ہیں جو عین وصال کی حالت میں آپ کو پکڑ لیتا

ہے اور ذرا دھمکا کر سارے پیسے چھیننے کے بعد آپ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ مگر اس رات میں ہر قیمت پر عورت کی صحبت چاہتا تھا' اس لیے میں نے کمرے میں واپس جا کر پستول اٹھایا اور قسمت آزمانے نکل کھڑا ہوا۔

رات گئے جب میں اس فربہ اندام لڑکی کے پاس پہنچا تو میری جیب میں پستول تھا اور میری چال میں خود اعتمادی۔۔۔ نزدیک سے دیکھنے پر وہ لڑکی مجھے اپنے پڑوسی سارجنٹ کی بیوی جیسی دکھائی دی۔ میں اس بات سے بہت خوش ہوا' کیونکہ مجھے عرصے سے اپنے پڑو- کی بیوی کو عریاں دیکھنے کی حسرت تھی۔

ہمیں جس کمرے کی چابی دی گئی وہ ہوٹل کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا مگر لڑکی اپنے بھاری بدن کے باعث سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تھک گئی اور گہرے سانس لینے لگی۔ پانچویں منزل تک پہنچ کر وہ بے حال ہو گئی اور دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر جھک گئی۔ کمرے کی چابی اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔

"اتنی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تو کوئی بھی تھک جائے گا۔" خفت مٹانے کے لیے اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور جب تک کمرے کی تمام بتیاں روشن نہیں کر لیں ایک ہاتھ سے اپنا پستول تھامے رکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں صابن کا ایک چھوٹا سا چوکور ٹکڑا رکھا تھا یہ مختصر سا صابن ایک وقت کے استعمال کے لیے کافی تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے لیے اس طرح کی چیزیں بے معنی تھیں۔ میں نے گھوم کر موٹی لڑکی کو دیکھا۔ اس کا سانس ہموار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ فحش انداز میں دبا کر میری جانب بڑھی۔ میں نے فوراً اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"کپڑے اتارو!" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور کپڑے اتارنے لگی۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اس نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ معلوم نہیں کیوں ایسے موقعوں پر میرا تمباکو نوشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اوپر کے کپڑے اتار کر وہ ساکت کھڑی ہو گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"رینی۔"

"ٹھیک ہے۔ رینی جلدی کرو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"تم کپڑے نہیں اتارو گے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میری فکر مت کرو۔" میرے لہجے میں تندی آ گئی۔ "ننگی ہو جاؤ' فوراً" چند لمحوں میں وہ مکمل برہنہ ہو گئی۔

"تو تم کامل عاشق ہو۔" اس نے اپنے لہجے میں مصنوعی پیار بھر کر کہا۔

"تم چاہتے ہو کہ تمہاری محبوبہ ہی سب کچھ کرے۔" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر مجھ پر جھکنے لگی۔

"پرے ہٹو۔" میں نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ میں کیا کروں؟" وہ چیخ پڑی۔

"کچھ نہیں۔ چلو۔ چل کر دکھاؤ۔"

وہ خاموشی سے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلنے لگی۔

عریاں حالت میں چل کر دکھانا عورت کی بے عزتی ہے۔ اس سے اسے اذیت پہنچتی ہے۔ مجھے بہت لطف آ رہا تھا۔ موٹی لڑکی میرے حکم پر ننگی ہو کر سر جھکائے آگے پیچھے چل رہی تھی' اور اپنی ہتک کے خیال سے سرخ ہو رہی تھی۔ بالآخر اس نے میری طرف دیکھا اور کچھ کہنے کی خاطر کہا "اچھی لگ رہی ہوں؟ تمہیں میرا جسم پسند ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ چلتی رہو۔"

"بات سنو۔" اب اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ "میں جانور نہیں ہوں۔ میں تھک گئی ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر بال تھے۔ اچانک میں نے اس سے ایک بات کہی جس سے وہ شرما گئی۔ "خبیث آدمی۔" اس نے جھینپ کر جواب دیا اور میں بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ لیکن جب اس نے بستر سے اپنے کپڑے اٹھائے تو میں چونک گیا۔

"سنو۔" میں نے یکلخت سنجیدہ ہو کر کہا۔ "میں تمہیں معاوضہ ادا کروں گا مگر میری رقم کے بدلے مجھے کچھ ملنا بھی چاہئے۔"

"بہت ہو گیا۔ سمجھے۔" اسے غصہ آ گیا۔ "مجھے نہیں معلوم تم کیا چاہتے ہو میں یہاں تماشہ بننے نہیں آئی تھی۔ تمہارے دماغ میں۔۔۔"

میں نے پستول نکال لیا اور اس کی آواز دم توڑ گئی۔ خوف سے زرد ہو کر اس نے کپڑے واپس بستر پر رکھ دیئے۔

"چلو۔" میں نے پستول لہرا کر کہا۔ "چلتی رہو۔ حرامزادی۔"

اس مرتبہ وہ دیر تک چپ چاپ چلتی رہی۔ وہ سہم گئی تھی۔ بعد میں' میں نے اس سے مضحکہ خیز ورزشیں بھی کروائیں۔ اور پھر اسے معاوضہ ادا کر دیا۔ "میں نے تم سے رقم کے برابر ہی مزدوری کروائی ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے کمرے ہی میں عریاں حالت میں چھوڑ آیا۔ مجھے پیسے خرچ کرنے کا قطعی افسوس نہیں تھا۔ وہ مجھ سے مل کر حیرت زدہ رہ گئی تھی اور کسی طوائف کو حیران کرنا معمولی بات نہیں ہے۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچا۔ "کہ پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دوں۔"

اس رات میں بچوں کی طرح خوش تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں رکھی صابن کی چھوٹی سی چوکور ٹکیا جیب میں ڈال لایا تھا۔ گھر آ کر میں اسے دیر تک نلکے کی دھار میں ہاتھوں پر رگڑتا رہا حتیٰ کہ وہ اس ٹافی جیسی ہو گئی جسے آخری حد تک چوس لیا گیا ہو۔

لیکن اس رات میں سوتے میں اچانک جاگ اٹھا' اور میری نظروں کے سامنے موٹی لڑکی کا چہرہ گھومنے لگا' اور وہ لمحہ جب اس کی آنکھیں میرا پستول دیکھ کر حیرت سے پھیلی تھیں' اور اس کا جھریوں بھرا موٹا پیٹ جو ہر قدم پر اچھلتا جاتا تھا۔ اچانک مجھے پچھتاوا ہوا اسے گولی نہ مارنا میری نادانی تھی مجھے اسی لمحے اسے ہلاک کر دینا چاہئے تھا جب میں اس پر حاوی ہو چکا تھا۔۔۔ اور پھر صبح کی روشنی تک میں سو نہیں سکا۔ مجھے اس کی ناف کے گرد چھ سوراخ نظر آ رہے تھے۔

اس دن کے بعد میں پستول کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں بازار میں چلتے ہوئے لوگوں کو پیچھے سے دیکھتا تھا اور ان کی چال سے اندازہ لگاتا تھا کہ گولی لگنے کے بعد وہ کس طرح زمین پر گریں گے۔ رات کے نو بجے میں تھیٹر کے باہر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ڈرامہ ختم ہوتا تو لوگ قطار در قطار باہر نکلتے۔ ان کی آنکھیں رومانی منظروں سے بھری ہوتیں۔ ان کے دل میں اب تک ہمدردی کے جذبات موجزن ہوتے۔ ان میں سے کئی ایسے ہوتے جو باہر نکل کر دائیں بائیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ انہیں چکاچوند کرتی روشنیاں عجیب لگتی تھیں۔ پھر وہ مخصوص انداز سے زیرِلب مسکراتے تھے۔ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں آ رہے تھے۔ میں دوسری دنیا میں ان کا منتظر تھا۔ اس موقع پر میں جیب میں ہاتھ ڈالتا اور اپنے پستول کو پوری قوت سے تھام لیتا۔ چند لمحوں بعد میں خود کو ان پر گولیاں برساتے دیکھتا۔ جنہیں گولی لگتی وہ مٹی کے برتنوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اچھل جاتے' باقی ماندہ چیخیں مارتے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے۔ پیچھے رہ جانے والے شیشے کے دروازوں کو توڑتے واپس تھیٹر میں پناہ لیتے۔ میں اس ہیجان انگیز تصور سے پلٹتا تو میرے ہاتھ پسینے سے تر ہوتے اور مجھے اپنی سانس درست کرنے میں وقت لگتا تھا۔

میں عورتوں کو جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں ان کے گردوں کو چھلنی کرنا چاہتا تھا۔ یا ان کی پنڈلیوں میں گولی مارنا چاہتا تھا تاکہ وہ گرنے سے پہلے رقص کریں۔

ہر چند کہ میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں کب اور کہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے ایک نشانہ بازی کے کلب میں داخلہ لے لیا تھا جہاں میں روزانہ شام کو مشق کرنے جاتا تھا۔ میں بہت اچھا نشانہ باز ثابت نہیں ہوا تھا' لیکن کلب میں دیئے گئے نشان کے مقابلے میں زندہ انسانوں کے بدن کہیں بڑے ہدف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر جب انہیں نزدیک سے گولی ماری جائے تو نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ اگر میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کو گولی سے اڑانا شروع کردوں تو میری کامیابی کے امکانات سو فیصد ہو سکتے ہیں۔ چھٹی کے وقفے کے بعد صبح کے وقت دفتر میں ماحول بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ سب دستانے اتار کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ عادت بری لگتی ہے۔ وہ دستانے اتارتے ہوئے ایسی بے شرمی سے ایک ایک کر کے انگلیاں ننگی کرتے ہیں کہ کراہت محسوس ہوتی ہے۔ میں ہاتھ ملاتے ہوئے دستانے نہیں اتارتا۔ میرے خیال میں انہیں گولیاں مار کر ڈھیر کرنے کا سب سے مناسب وقت یہی ہے' جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے دستانے اتارنے میں مصروف ہوں۔

گذشتہ سوموار کو ہماری گفتگو کا موضوع فلمی اداکارئیں اور ان کا عالمگیر حسن تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے مرد ہیرو پسند ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ فلموں کے اداکار ہوں۔

"کس طرح کے ہیرو؟" میسے نے پوچھا۔

"جنہیں ان کے سیاہ کارناموں پر دوام حاصل ہوا۔" میں نے جواب دیا۔

"سیاہ سے کیا مراد ہے؟"

"سیاہ یعنی کالا' جیسے کالا جادو۔ کالا ہیرو' جو بربادی پھیلا دے۔"

"لاقانونیت کا حامی؟"

"نہیں۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "لاقانونیت کے حامی کالے ہیرو نہیں ہو سکتے۔ انہیں اپنے انداز میں انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔"

"تب تو تمہارا مثالی کردار کوئی پاگل آدمی ہو گا۔" لیمی شر نے کہا۔
"میں سمجھ گیا۔" میسے جو تاریخ کا طالب علم تھا میرے جواب دینے سے پہلے بول پڑا۔ "تمہارا ہیرو "اریوسٹریٹس" کی طرح کا کوئی آدمی ہو گا
"اریوسٹریٹس تاریخ میں دوام حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کوئی ایسا کام نہیں کر پاتا تھا جو اس کی شہرت کا سبب بنے۔ بالاخر اس نے "افی سس" کی عبادت گاہ کو جو دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک تھی جلا کر راکھ کر دیا۔"
"اور اس آدمی کا نام کیا تھا جس نے وہ عبادت گاہ تعمیر کروائی تھی؟"
"میں نہیں جانتا۔" میسے نے اعتراف کیا۔ "غالباً" کوئی بھی نہیں جانتا۔"
"لیکن تم "اریوسٹریٹس" کا نام جانتے ہو جس نے اسے آگ لگائی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تو ظاہر ہے کالا ہیرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔"
اس مکالمے پر گفتگو ختم ہو گئی۔ میں اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا' اور دل میں یہ سوچ کر لطف اندوز ہوتا رہا کہ جب وقت آئے گا تو انہیں میری بات کا مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ میں نے پہلے کبھی "اریسٹریٹس" کا نام نہیں سنا تھا۔ مگر اس کی کہانی نے میری ہمت بڑھائی۔ اس کو دنیا سے رخصت ہوئے دو ہزار سال گزر گئے تھے مگر اس کا نام سیاہ ہیرے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرا نام بہرحال اتنے عرصے پر محیط نہیں ہو سکے گا۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کم عرصے کے لیے بہت مشہور ہونا بھی اپنا ایک مزہ رکھتا ہے۔ یہ شہاب ثاقب جیسا مقدر ہے کہ چند لمحوں کے لیے چمک کر آدمی اس قدر تاثر چھوڑ جائے کہ دیکھنے والوں کو وحشت ہونے لگے۔ اس روز میں سڑک پر آیا تو مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی قوت کا احساس ہوا۔ میرے پاس میرا پستول تھا۔ اور پستول کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔۔۔ یہ زوردار آواز سے چیزوں میں سوراخ کر دیتا ہے۔ لیکن اس روز میرا اعتماد فقط پستول کے سبب سے نہیں تھا۔ مجھے خود اپنا وجود دور تک تباہی پھیلانے والا ہتھیار معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں لاقانونیت کو انتہا تک پہنچا دینے والا شخص ہوں۔ میں اپنے بارودی وجود کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں' اور مقررہ وقت پر سلگتا ہوا فلیتہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ایک فلک شگاف دھماکہ ہو گا اور میں اور بادشاہ اور اس کے حفاظتی دستے کے سپاہی ہوا میں اچھل کر عضو عضو بکھرتے دکھائی دیں گے۔
اس دن کے بعد میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ میں تمام دن سڑکوں پر ان لوگوں کو دیکھتا رہتا جنہیں میں نے گولیوں سے چھلنی کرنا تھا۔ پھر ایک صبح میں نے یہ خط لکھا اور اس کی ایک سو دو نقول بنا کر ایک سو دو لفافوں میں ڈالیں۔ اس خط میں' میں نے ملک کے ادیبوں کو خطاب کیا تھا۔

جناب عالی

آپ ایک مشہور ادیب ہیں۔ آپ کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ خوش قسمت ہیں' کیونکہ جو انسانوں سے محبت کرتا ہے وہ دوسرے انسانوں میں شامل ہو کر اپنے وجود کو وسعت عطا کرتا ہے۔ دوسرے کے اعضا کی ساخت دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگوں اور بازوؤں سے ہمدردی محسوس کرتا ہے' اور یہ دیکھ کر اسے دلی مسرت ہوتی ہے کہ وہ اس کے اپنے اعضا کی طرح ہی حرکت کرتے ہیں اور پھیلتے اور سکڑتے اور بند ہوتے ہیں اور اس کے ہاتھ

تو آپ کے لیے بطور خاص تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ انگلیاں ہیں' اور جب وہ چائے کی پیالی اٹھاتا ہے تو اس کے ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا ایک مخصوص شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ شکل انسانی ہاتھ سے وابستہ ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں میں اسے بیان کیا ہے۔ کوئی جانور' چاہے وہ کتنا ہی ذہین ہو' اس طرح چیزوں کو گرفت میں نہیں لے سکتا۔ اس گرفت میں ذہانت کے علاوہ تخیل بھی ہے' گہرائی اور دوراندیشی ہے۔ آپ کو انسان اچھے لگتے ہیں' اسی لیے آپ ان سے خطاب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اسی لیے انسان قطار در قطار آپ کی کتابیں خریدتے ہیں۔ وہ انہیں گھر لے جا کر آرام کرسیوں پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں' اور آپ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس دوران وہ اپنی بدنصیبی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اپنی بدصورتی کو بھول جاتے ہیں' محرومیوں اور معذوریوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ ان کے گھر والے ان سے نفرت کرتے ہیں اور یکم جنوری کو ان کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔

ممکن ہے آپ کو خیال آئے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے جسے انسانوں سے محبت نہ ہو۔ میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ مجھے انسانوں سے اتنی کم محبت ہے کہ میں بہت جلد چھ آدمیوں کو ہلاک کر کے منہ کے بل گرانے والا ہوں۔ فقط چھ کیوں؟ اس لیے کہ میرے پستول میں اتنی ہی گولیاں ہیں۔ بہرحال چاہے میں صرف چھ آدمیوں کو قتل کروں' لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے تمام انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ مگر میں کیا کروں کہ آپ کو انسانوں کی جو چیزیں پسند آتی ہیں' مجھے انہی سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آدمیوں کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اب یہ میرا قصور ہے کہ مجھے چارہ کھاتے مویشی کم مکروہ معلوم ہوتے ہیں؟ اور جب کوئی تمیز کا مظاہرہ کرتے ہوئے منہ بند کر کے نوالہ چباتا ہے تو اس کے دونوں گالوں کے نیچے جبڑے کی ہڈیاں یوں لرزش کرتی ہیں جیسے کوئی سکون کی حالت سے اچانک دھاڑیں مار کر رونے والا ہو۔ آپ کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے مگر مجھے تو متلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ مجھے کیا معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے! میں اسی طبیعت کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ باقی تمام چیزوں کے بارے میں لوگوں کو ذاتی رائے رکھنے کا حق ہے مگر انسان سے محبت سب پر فرض کر دی گئی ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی دیکھا ہے کہ جسے انسان سے محبت نہ ہو اس کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے بھی مجبور کیا گیا کہ میں اسے پسند کروں جسے میں پیدائشی طور پر ناپسند کرتا ہوں' مگر انسان کے بارے میں جو کچھ میرے ذہن میں آیا میں اس کا اظہار کرتا رہا۔ اگر میں اپنی سوچوں کو اپنے تک محدود رکھتا تو بہت جلد وہ خیالات چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی شکل اختیار کر کے میرے دماغ کو اپنی غذا بنا لیتے۔ خاموشی اختیار کرنے پر مجھے کئی بار اپنے سر میں ہزاروں سوئیاں چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔۔ انسانوں کے وجود سے مجھے اذیت پہنچی ہے۔ اس لیے جب میں اپنا پستول اٹھا کر نیچے جاؤں گا تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میرا عمل حق بجانب نہیں تھا۔

بس اس بات کا خیال رکھئے گا کہ اخبارات بازاری زبان استعمال کرتے ہیں مثلاً" وہ لکھیں گے کہ "ایک جنونی شخص نے غصے کے عالم میں چھ آدمیوں کو سربازار ہلاک کر دیا۔" اب کم از کم آپ تو یہ جانتے ہیں کہ میں جنونی نہیں ہوں' اور نہ ہی مجھے غصہ آتا ہے۔

مخلص

پال ہل برٹ

خط مکمل کرنے کے بعد میں کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اپنے ارادے کو حتمی شکل دینے کے لیے مجھے یکسوئی درکار تھی۔ آئینے میں اپنی بدلتی ہوئی شکل دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ میری آنکھیں بڑی ہو رہی تھیں' یوں لگتا تھا جیسے کچھ عرصے بعد میرے چہرے پر صرف آنکھیں رہ جائیں گی۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے میری آنکھیں سیاروں کی طرح گردش کرتی نظر آتیں۔ مجھے یقین تھا کہ چھ آدمیوں کو منہ کے بل گرانے کے بعد میرا چہرہ مزید تیزی سے بدلے گا۔ میں نے ان دو لڑکیوں کی تصویریں دیکھی تھیں جنہوں نے اپنی مالکہ کو ہلاک کر کے اس کا گھر لوٹ لیا تھا۔ جرم کا ارتکاب کرنے سے پہلے ان کے چہرے حفظان صحت اور ایمانداری کے اصولوں پر عمل کرنے والوں کے چہروں کی طرح چمک رہے تھے۔ دیکھنے والوں کو فوراً" معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ بہنیں ہیں اور گھر سے خاص طور پر فوٹو کھنچوانے کے لیے تیار ہو کر فوٹوگرافر کی دکان پر آئی ہیں۔ جرم کے بعد کی تصویر میں ان کے چہرے پر خوف کی جھریاں اور آنے والے وقت کے سائے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے خون آلود پنجوں والا کوئی درندہ ان کے چہروں پر فراغت سے گھومتا رہا ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں کی آنکھوں کا تاثر ایک دوسرے سے جدا تھا۔ ایک ہی جرم میں ملوث دو مجرموں پر ان کے یکساں عمل نے مختلف اثرات مرتب کیے تھے۔

"اگر ایک اتفاقیہ جرم ان دونوں پر اس قدر اثرانداز ہوا ہے۔" میں نے خوشی سے سرشار ہو کر سوچا۔ "تو میرا جرم جو اتنی گہری سوچ بچار کا حامل ہے میری شباہت میں کیا کیا تبدیلیاں لائے گا۔ ممکن ہے یہ میری تمام بدصورتی کو خوش شکلی میں بدل دے۔ میری زندگی بھی دو واضح حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ جرم سے پہلے اور جرم کے بعد۔۔۔" میں نے اپنے سامنے ایک سیاہ ہیرا جگمگ کرتے دیکھا۔ اس ہیرے سے نکلنے والی نور کی شعاعوں نے مجھے ایک عجیب کیف سے آشنا کیا۔

بالآخر میں نے اوڈیسا کے چوک پر قتل عام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سڑک پر بھگدڑ مچنے سے میں شاہراہ ایڈگر کی سمت نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب تک ہجوم اپنے مردے اٹھاتا میں ایڈگر سے ملحقہ آبادی میں پہنچ جاؤں گا۔ اس کے فوراً" بعد ڈیلمبر کی پرپیچ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' اور وہاں سے میرے گھر تک کا فاصلہ چند لمحوں کی بات ہے۔ میرا تعاقب کرنے والے شاہراہ ایڈگر پر بھٹک جائیں گے اور ڈیلمبر کی گلیوں میں انہیں صبح ہو جائے گی۔ میں اپنے کمرے میں ان کا انتظار کروں گا' اور جب آخرکار وہ میرے دروازے تک پہنچ جائیں گے تو میں اپنا پستول دوبارہ بھروں گا اور اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ میری گردن تک پہنچیں میں پستول کی نالی اپنے منہ میں رکھ کر گولی چلا دوں گا۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے اپنی جمع پونجی دل کھول کر خرچ کرنی شروع کر دی۔ کھانے پینے کا معیار بڑھا دیا' اور مستقبل کی فکر سے آزاد ہو گیا۔

اکتوبر کی ۲۷ تاریخ کو شام چھ بجے میرے پاس فقط دو وقت کے کھانے کی رقم باقی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا پستول اٹھایا اور ایک سو دو خطوط کا پلندہ بھی ساتھ لیا جو مجھے ملک کے مختلف ادیبوں کو روانہ کرنے تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا تاکہ واپسی پر مجھے اندر داخل ہونے میں قطعی تاخیر نہ ہو۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور سر کی جانب خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں پسینے میں بھیگ رہے ہیں۔

شاہراہ پر حسب معمول لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کچھ میری راہ کی رکاوٹ بنے' کچھ نے مجھے

آگے کی سمت دھکیلا اور کچھ کی کہنیاں میرے پہلوؤں کو چھیلنے لگیں۔ میں نے خود کو ان کے حوالے کر دیا اور ان کی زد میں آکر دائیں بائیں لہراتا ہوا چلنے لگا۔ اچانک انسانوں کے اس سمندر میں مجھے اپنا وجود خوفناک حد تک بے بس اور تنہا محسوس ہوا۔ "یہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔" مجھے خیال آیا۔ "اگر انہیں میرا ارادہ معلوم ہو گیا تو یہ چند لمحوں میں مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا ہتھیار استعمال کروں یہ مجھ پر قابو پالیں گے اور اس کے بعد میں ان کی ٹھوکروں پر اچھلتا جاؤں گا۔ ہر اچھال کے بعد میں زیادہ چھلنی اور نڈھال ہو کر ان کے پھیلے ہوئے پنجوں پر واپس گروں گا اور ہر بار یہ زیادہ شدت سے مجھے واپس ہوا میں پھینک دیں گے۔ میں بوٹی بوٹی بکھرتا رہوں گا اور یہ قہقہے لگائیں گے۔ "دیکھو یہ ہمیں ہلاک کرنے نکلا تھا۔ اس کی وقعت کیا ہے۔۔۔ کیا حیثیت ہے اس کی؟ اس کی آنکھیں نوچ لو۔" میں نے اپنے ارادے کو دوسرے دن کے لئے ملتوی کیا اور اپنی سانسوں کو درست کرتا ایک ریستوران میں داخل ہوا' اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ باہر آکر نہ جانے کیوں میں نے اپنی باقی ماندہ رقم ایک نالی میں پھینک دی۔

اس کے بعد میں پورے تین دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا' اور اس دوران میں نے پلک نہیں جھپکی۔ کھڑکی کے پردے نہیں ہٹائے۔ نیچے نہیں جھانکا۔ آخر میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت باہر دن کی روشنی پھیلی ہے یا رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تیسرے دن کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے سانس روک لی۔ میرا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ دوبارہ دستک پر میں ایڑیوں کے بل چلتا گیا اور دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ لیکن کالے کپڑے پر ایک سفید بٹن کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہیں آیا تیسری دستک پر مجھے محسوس ہوا جیسے میں فرش پر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ مگر پھر اچانک ہی وہ چلا گیا۔۔۔ یا چلے گئے۔ اس رات میں نے خوش کن خواب دیکھے۔ سرسبز و شاداب وادی۔ شفاف بہتا پانی۔ تنہا عبادت گاہ اور اس پر پھیلا ہوا بے داغ نیلا آسمان۔ تمام رات میں وقفے وقفے سے اٹھ کر پانی پیتا رہا۔ صبح کے قریب میں نے موئی طوائف کو دیکھا۔ وہ اس فلک بوس محل میں قید تھی جو میں نے شہر کے مضافات میں خاص طور پر اس کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک عریاں تھی۔ میں نے اپنا پستول نکال کر اسے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنے کا حکم دیا اور پھر اسے گھوڑے کی طرح دوڑنے پر مجبور کیا۔ آخر میں اسے میں نے محل کے مرکزی ستون سے باندھ دیا اور اس کے سامنے اپنا موقف تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اس کے چربیلے بدن پر اپنا پستول خالی کر دیا۔۔ ان خیالات نے میرے پورے بدن پر ارتعاش طاری کر دیا' اور بالآخر میں نے مشت زنی کے ذریعے خود کو تسکین پہنچائی۔ اس کے بعد میں خالی الذہن ہو کر دیر تک اندھیرے میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ میں نے فرنیچر کے چٹخنے کی آوازیں سنیں۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا اور ہر قیمت پر کمرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا' مگر مجھے سڑک پر چلنے والے لوگوں کے تصور سے خوف آرہا تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میری بھوک ختم ہو گئی مگر مجھے بے تحاشا پسینہ آنے لگا۔ میری قمیض بھیگ کر بدن سے چپک گئی۔ شاید باہر دھوپ پھیل چکی تھی جب میں نے خود کو دوسرا شخص تصور کیا۔۔۔ "۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں تاریکی اوڑھے پڑا ہے۔" میں نے سوچا۔ "تین دن سے اس نے نہ کچھ کھایا ہے نہ ہی وہ ایک پل کو سویا ہے۔ انہوں نے اس کے دروازے پر دستک بھی دی لیکن وہ ان کا سامنا نہیں کر سکا۔ مگر بہت جلد وہ سڑک پر جائے گا اور چاروں سمت بربادی پھیلا دے گا۔ ہلاکت برپا کر دے گا۔"

غالباً" شام کا وقت تھا جب مجھے دوبارہ شدید بھوک کا احساس ہوا۔ اس مرتبہ بھوک کے ساتھ غصہ کا

جذبہ بھی ابھرا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے جلد از جلد عملی طور پر کچھ نہ کیا تو غصے سے پاگل ہو جاؤں گا۔ میں فرنیچر سے ٹھوکریں کھاتا ادھر ادھر بھاگا۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن کیں اور وجود کی تمام بچی کھچی طاقت سمیٹ کر بلند آواز سے گنگنانے لگا۔ بدن کی لرزش کم ہوئی تو میں نے ہاتھ دھوئے اور ایک نئے عزم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ڈاک کے بکس میں ایک سو دو خط ڈالنے میں مجھے تقریباً دو منٹ لگے۔ میں نے دس دس لفافے ایک ساتھ ڈالے اور ان کے گرنے کی آوازیں سنیں۔ جلد بازی کے باعث چند لفافے یقیناً شکن آلود ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میں مرکزی شاہراہ پر اوڈیسا کے چوک تک چلا گیا۔ چوک کی ایک دکان پر لگے شیشے میں مجھے اپنا چہرہ نظر آیا تو میں نے خود کو یقین دلانے کے لیے کہا۔ "آج کی رات!"

چوک پر نصب جلتی بجھتی روشنیوں کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے مناسب موقع کا انتظار شروع کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا بدن بالکل سرد ہونے کے باوجود پسینے میں ڈوب رہا تھا۔ دو عورتیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گزریں۔ میں نے انہیں جانے دیا۔ مجھے ایک ساتھ چھ آدمیوں کی تلاش تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے تین آدمی دیکھے۔ یہ بھی میرے لیے بے کار تھے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب دو ٹولیاں بہت کم فاصلے پر چہل قدمی کرتی دکھائی دیں۔ آگے چلنے والے مرد اور عورت کے ساتھ دو بچے تھے اور ان کے پیچھے تین بوڑھی عورتیں آ رہی تھیں۔ میں نے ایک قدم بڑھایا۔ عورت غصے سے بچے کا بازو جھنک رہی تھی۔ مرد بھی کسی بات پر بچے سے خفا تھا۔

"اس حرام زادے کو عقل کب آئے گی۔" اس نے بپھر کر کہا۔

میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا کہ میرے بازوؤں میں درد شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے پستول پر گرفت سخت کر دی اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آگے سے تو ہٹو۔" مرد نے مجھے ایک طرف دھکیلتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

مجھے یاد آیا کہ میں آتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ غلطی سے بند کر آیا ہوں' اور اب واپسی پر میرے چند نہایت قیمتی لمحے دروازہ کھولنے میں ضائع ہو جائیں گے۔ میں جھنجلا گیا۔ دروازے کے خیال سے چونکا تو دونوں ٹولیاں آگے جا چکی تھیں۔ میں ان کے پیچھے گیا مگر اب میرا ارادہ کمزور ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ آٹھ بجے کے بعد نو بجے کا وقت بھی آ گیا۔ "میں ان لوگوں کو کیوں ماروں جو پہلے سے مرے ہوئے ہیں؟" مجھے خیال اور میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے ہنسوں۔ اک آوارہ کتا اندھیری گلی سے نکل کر میرے پاؤں سونگھنے لگا۔

ایک لمبا چوڑا آدمی میرے سامنے سے گزرا' اور میں چھلانگ مار کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ وہ بلند آواز سے سانس لیتا اچھل اچھل کر چل رہا تھا۔ میں اس کی گدی پر پڑنے والا بل دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا پستول نکالا۔ رات کی سردی بڑھ چکی تھی' اور مجھے ہلکی ہلکی متلاہٹ ہو رہی تھی۔ مجھے واضح طور پر یاد ہی نہیں رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کبھی میں پستول کو دیکھتا اور کبھی میری نظر سامنے چلنے والے موٹے آدمی کی گردن کے بل پر پڑتی۔ اس بل کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی تلخی سے مسکرا رہا ہو۔ مجھے محسوس ہوا جیسے موٹا آدمی پشت کی جانب سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنا پستول کسی نالے میں پھینک کر گھر چلے جانا چاہیے کہ اچانک موٹے آدمی نے گھوم کر مجھے دیکھا۔

"---میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ---" میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس سے کہا۔ اے

کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ۔۔۔ کہ شاہراہ گاندی تک پہنچنے کے لیے کون سا۔۔۔ کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔" میں نے زندگی میں کبھی کوئی جملہ ادا کرنے کے لیے اتنی طاقت استعمال نہیں کی تھی۔

اس نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کی جانب بڑھایا۔ میں نے ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر کہا۔ "اصل میں مجھے معلوم کرنا تھا کہ۔۔۔"

اچانک مجھے یقین ہو گیا کہ میں خوف سے چیخنے والا ہوں۔ میں نے چیخ دبانے کے لیے سختی سے منہ بند کیا اور گولی چلا دی۔ میں نے اس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے تین گولیاں پیوست ہوتے دیکھیں' وہ زمین پر گرنے سے قبل گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور چند لمحوں تک عجیب احمقانہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔

"حرامزادے۔۔۔" میں نے اپنا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ "کمینے! ذلیل!"

اس کی خرخراہٹ سن کر میں ہوش میں آ گیا اور یکلخت پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔ ساتھ ہی قدموں اور چیخوں کا طوفان بلند ہوا۔ "کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔ "لڑائی ہو گئی؟" پھر فوراً" کوئی چیخا۔ "قتل۔۔۔ قتل ہو گیا۔" مجھے محسوس ہوا جیسے ان چیخوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس طرح بچپن میں آگ بجھانے کے لیے جانے والی گاڑیوں کی آوازیں۔۔۔ وہ خوفناک آوازیں ہوتی ہیں مگر گھر کے آنگن میں کھیلتے بچے سے ان آوازوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔۔۔ میں پوری طاقت سے بھاگتا رہا اور اس دوران مجھ سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ میں ایک غلط گلی میں داخل ہو گیا اور پھر مرحلہ وار مزید بھٹکتا گیا۔ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا' اس وقت تک میں ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں سے گھر کی جانب سعی کرنا ناممکن تھا میں ہجوم میں پھنس چکا تھا۔

ہر موڑ پر حیرت زدہ آنکھوں والے سینکڑوں چہرے میری سمت گھوم رہے تھے (ایک عورت کا چہرہ مجھے یاد ہے۔ اس کے گالوں پر غازے کی دبیز تہہ تھی اور سر پر زیبائشی ہیٹ تھا اور میرے عقب میں وہ تھے جو پہلے چوک سے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ قتل! گولی! قاتل!" ان کی چیخیں نئے لوگوں کو فوراً" اصل صورتحال سے آگاہ کر دیتی تھیں۔ اچانک میں تھکنے لگا۔ اسی لمحے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے اندر کا وحشی بپھر گیا۔ میں نے پلٹ کر دو فائر کیے۔ چاروں سمت خوف زدہ آوازوں کا طوفان اٹھا اور لوگ بکھرنے لگے۔ میں بھاگ کر ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میرے راستے میں آنے والی کرسیاں اور کھانے پینے کی اشیاء سے لدے میز الٹتے چلے گئے۔ ہوٹل کی دوسری سمت کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹوائلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ صورتحال قابو میں تھی۔ میں مجمع کے ہاتھوں ٹکڑے نہیں ہونا چاہتا تھا' اور میرے پستول میں ایک گولی باقی تھی۔

ایک لمحہ گزر گیا۔ میری سانس بری طرح اکھڑی ہوئی تھی اور میرے ہانپنے کی آواز دروازے کے باہر سنی جا سکتی تھی۔ ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا' جیسے تمام لوگوں نے کسی سازش کے تحت خاموشی اختیار کر لی ہو۔ میں پستول آنکھوں کے قریب لا کر اس کی نالی کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے چھوٹے سے سیاہ سوراخ میں جھانکا۔

"۔۔۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے گولی نکلے گی اور میرے سر کے پچھلے حصے میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار میں جا لگے گی۔ میں ان بازاری لوگوں کے ہاتھوں خود کو اذیت نہیں پہنچنے دوں گا۔" یہ سوچ کر میں نے اطمینان سے بازو سیدھا کیا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بے پناہ شور بلند ہوا۔ فرش پر جوتوں کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت بڑا ہجوم ہے۔ انہوں نے میرے بے قابو سانس کی آواز ضرور سن لی ہو گی۔ کسی نے دروازے کے تالے کو

گھما کر کھولنا چاہا۔ میں چاہتا تو اسے بھی گولی مار کر منہ کے بل پھینک سکتا تھا' مگر پھر پستول میں میرے لیے کچھ نہ بچتا اور میں کسی قیمت پر خود کو ان ناپاک ہاتھوں کے سپرد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کس چیز کا انتظار کر رہے تھے؟ اگر سب مل کر دروازے کو دھکا دیتے تو ایک لمحے میں مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ اس صورت میں شاید مجھے خود کو ہلاک کرنے کا بھی موقع نہ ملتا۔ مگر وہ بالکل جلدی میں نہیں تھے۔ وہ مجھے اطمینان سے مرنے کا موقع دے رہے تھے۔ ان کی کمینگی واضح تھی۔

چند لمحوں بعد ایک آواز بلند ہوئی۔ "دروازہ کھول دو۔ ضد مت کرو۔ کیا فائدہ؟" کچھ دیر سکوت طاری رہا' پھر وہی شخص بولا۔ "اب تم کہیں نہیں جا سکتے۔ کیا فائدہ؟؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری سانس اب تک ناہموار تھی۔

"بالآخر مجھے خود کو گولی مارنی ہے۔" میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا۔ "اگر میں ان کے ہاتھوں میں چلا گیا تو یہ مجھ سے خوفناک سلوک کریں گے۔ میرے دانت توڑ ڈالیں گے۔ میری آنکھیں نوچ کر فرش پر پھینک دیں گے۔ میں ان کی ٹھوکروں پر اچھلتا ہوا دور سے نظر آؤں گا۔"

شاید اب وہ دروازہ توڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ فرش پر کسی بھاری چیز کے گھسیٹے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں فوراً پستول کی نالی منہ میں رکھ کر خود کو گولی مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے پستول پر دانت گاڑ دیئے لیکن تمام تر کوشش کے باوجود گولی نہ چلا سکا۔ میں نے پورا زور لگایا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا' مگر میری انگلیاں کام کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ میں ڈر گیا تھا۔

میں نے پستول پرے پھینکا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

الفانسو دودے / فوزیہ طاہرہ

آخری سبق

اس دن سکول جاتے دیر ہو گئی تھی۔ میں سزا سے بڑا خائف تھا کیونکہ موسیو ہمیل نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ وہ ہمارا فعل جاری کا امتحان لیں گے جبکہ مجھے تو اس کے بارے میں قطعاً" کچھ علم نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ میں سکول ہی نہ جاؤں اور یہیں کہیں کھیتوں میں پھرتا رہوں دن بڑا ہی گرم اور خوشگوار تھا۔ درختوں پر بیٹھی چڑیوں کے بولنے کی بڑی سریلی آوازیں آرہی تھیں اور کارخانے کے پیچھے کھیتوں سے پرے فوجی اپنی مشقیں کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ میرے لئے فعل جاری کے اصولوں سے کہیں زیادہ کشش رکھتا تھا پر اس کے باوجود بھی میں نے سکول نہ جانے کی خواہش پر قابو پالیا اور جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا سکول کی جانب دوڑنے لگا۔

جب میں میئر کے دفتر کے قریب سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کتنے ہی لوگ اس بورڈ کے گرد اکٹھے تھے جس پر عموماً" نوٹس لگائے جاتے تھے۔ پچھلے دو سالوں سے ہماری سب تکلیف دہ خبریں اسی بورڈ کے ذریعے ہم تک پہنچتی تھیں ، جنگ میں کھوئے ہوئے لوگ ، جبری بھرتی ، ہیڈ کوارٹر کے حکمنامے وغیرہ وغیرہ ، میں نے وہاں رکے بغیر سوچا
یہاں بھلا کیا' ہو سکتا ہے؟۔
پھر میں دوڑتا ہوا چوک بھی پار کر گیا۔ واچر لوہار جو اپنے ملازم کے ساتھ وہاں کھڑا اشتہار پڑھ رہا تھا مجھ سے کہنے لگا۔

"اتنی جلدی نہ کر بیٹا۔ تو اپنے سکول وقت پر پہنچ جائے گا۔"
میں سمجھا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ آخر پھولی سانس کے ساتھ میں موسیو ہمیل کے چھوٹے سے صحن میں جا پہنچا۔ سکول لگتے ہوئے عام طور پر خاصا شور ہوا کرتا تھا' جو گلی تک سنائی دیا کرتا تھا ڈیسک کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں۔۔۔۔۔ سبق جلدی یاد کرنے کے چاؤ میں اونچی اونچی آواز میں سبق دہرانے کی آوازیں اور ساتھ ہی ساتھ استادوں کا ڈیسکوں کو ڈنڈے سے پیٹنے کا شور۔ اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پر یہ حقیقت تھی۔ ہر طرف اس طرح چپ تھی جیسے اتوار کی صبح ہو۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے میں نے اپنے ہم جماعتوں کو اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا' موسیو ہمیل ہاتھ میں لوہے کا ڈنڈا پکڑے کھڑے تھے۔
اس مکمل خاموشی میں میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پر نہیں ...... موسیو ہمیل نے میری طرف بغیر کسی خفگی کے دیکھا اور بڑے تحمل سے کہنے لگے۔

"برخوردار فرانننر! فوراً" اپنی سیٹ پر جا بیٹھو ہم تمہارے بغیر ہی اپنا کام شروع کرنے لگے تھے"
میں بینچ کو پھلانگتے ہوئے ڈیسک پر آبیٹھا۔ جب میں نے اپنے ڈر پر قابو پالیا تو میں نے دیکھا کہ آج ہمارے استاد

نے بڑا ہی پیارا چنٹوں والا نیلا کوٹ اور سیاہ ریشمی پتلون پہن رکھی تھی۔ یہ کپڑے وہ عام طور پر انسپکشن یا تقسیم انعامات کی تقریب کے موقع پر پہنا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور باتیں بھی خلاف معمول دکھائی دے رہی تھیں۔ ساری کلاس پر انتہائی سنجیدگی طاری تھی ' پر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ کمرے کے پچھلے حصے میں پڑے ہوئے بینچ تھے۔ جو عام طور پر خالی پڑے رہتے تھے' لیکن آج ان پر گاؤں کے کچھ لوگ ہماری طرح چپ سادھے بیٹھے تھے۔ بابا ہاسر اپنے تکونی ہیٹ سمیت ' سابقہ میئر' سابقہ ڈاکیا اور دوسرے سارے ہی غمگین دکھائی دے رہے تھے۔

بابا ہاسر کے ہاتھ میں بھربھری جلد والی ایک پرانی ہجوں کی کتاب تھی جو اس نے کھول کر اپنے گھٹنوں پر دھری ہوئی تھی۔ جب میں یہ سب کچھ بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا' موسیو ہمیل اسی تحمل کے ساتھ اپنے چبوترے تک آئے اور جس سنجیدہ آواز سے انہوں نے مجھے بلایا تھا اسی طرح ہم سب سے مخاطب ہوئے۔

میرے بچو! آج تمہیں پڑھانے کا میرا آخری دن ہے' برلن سے حکم آیا ہے کہ ایلیسس اور لورین کے سکولوں میں جرمن کے علاوہ کوئی اور زبان نہ پڑھائی جائے کل نیا استاد آجائے گا۔

یہ فرانسیسی کی آخری کلاس ہے اور میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ میری بات پوری توجہ سے سنے۔

اس قسم کے لفظوں نے مجھے چونکا دیا

آہ! یہ تھا وہ سب کچھ جو کم بختوں نے میئر کے دفتر کے نوٹس بورڈ پر لگایا تھا۔

"فرانسیسی میں میری آخری کلاس" یہ زبان تو میں بمشکل لکھنا جان سکا تھا پر اب کبھی بھی نہیں جان پاؤں گا! جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ جاؤں گا۔"

میں اپنا وقت ضائع کرنے پر اپنے آپ سے انتہائی ناراض ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے کتنے ہی سبق گھونسلے ڈھونڈنے اور سلائیڈوں پر پھسلنے میں مس کئے تھے۔ میری کتابیں جو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے بڑا بوجھ محسوس ہو رہی تھیں کہ اٹھانا ناگوار گزر رہا تھا' میری گرائمر...... میری معصوم تواریخ مجھے ان پرانی قبروں کی طرح سے لگنے لگیں جن سے بہت پیار ہو' کچھ ایسی ہی کیفیت موسیو ہمیل کی بھی تھی یہ سوچ کر ہی .... کہ میں آئندہ انہیں کبھی بھی نہیں دیکھ پاؤں گا ان کا ڈنڈا لہرانا اور سب سزائیں مجھے بھول گئیں۔

بیچارے! یہ آخری سبق کا احترام تھا جبھی تو انہوں نے اتوار والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اب مجھے سمجھ آگئی تھی کہ وہ بزرگ افراد کمرے کے پچھلے حصے میں کیوں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ سکول باقاعدگی سے نہ آنے کی وجہ سے پچھتا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے استاد کے بارے میں وہ یہ اچھی سوچ اور دل میں احترام بھی رکھتے تھے کہ انہوں نے اپنے مادر وطن کی چالیس سال تک انتہائی وفاداری سے خدمت کی اور اب انہوں نے نظروں سے اوجھل ہو جانا تھا۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ میرا نام بلایا گیا۔ اب پڑھنے کی میری باری تھی۔ شروع سے آخر تک میں فعل جاری کا اصول بنا کے بتانا چاہتا تھا لیکن شروع میں ہی غلطی ہو گئی میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا' میرے کانوں میں موسیو ہمیل کی آواز پڑی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "برخوردار فرانسز! میں تمہیں نہیں ڈانٹوں گا اصول کے مطابق تو تمہیں کافی سزا ملنی چاہئے' ہر روز ہم لوگ اپنے آپ سے کہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی کافی وقت ہے ہم کل یاد کرلیں گے' اس طرح وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ افسوس ہمارے دیس کے لوگوں کے لئے یہ بڑی بدقسمتی کی

بات ہے کہ ہم اپنی پڑھائی کل پر ٹالتے رہے ہیں۔ اب لوگ ہمیں ہی کہا کریں گے .... کیا تم بھی اپنے آپ کو فرانسیسی سمجھتے ہو؟ اور فرانسیسی ہو کر نہ اپنی زبان لکھ سکتے ہو اور نہ پڑھ سکتے ہو۔"

اس ساری کوتاہی میں فرانسز اکیلا ہی قصور وار نہیں بلکہ ہم سب برابر کے قصور وار ہیں تمہارے والدین نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی آیا تمہیں تعلیم دی جارہی ہے؟ وہ تو بس اس بات کو ترجیح دیتے رہے کہ تمہیں کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا کریں تاکہ چار پیسے کما کے لاسکو' لیکن اس کوتاہی میں کیا مجھے بھی اپنے آپ سے شکایت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ تم لوگوں کو میں بھی تو باغ سے پانی لانے کے لئے بھیجا کرتا تھا؟ اور جب کبھی مجھے مچھلیاں پکڑنے جانا ہوتا تھا تو کیا میں تمہیں چھٹی نہیں دے دیا کرتا تھا۔"

پھر اسی طرح سے ایک سے دوسری بات چھیڑتے ہوئے موسیو ہمیل نے ہمیں فرانسیسی زبان کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ بھرپور اور مکمل زبان' ہمیں آپس میں بات چیت کرتے ہوئے یہی زبان بولنی چاہئے اس کو ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کیونکہ جو لوگ اپنی زبان سے منسلک رہیں وہ کبھی بھی غلام بن کے نہیں رہ سکتے۔

پھر انہوں نے گرامر کی کتاب لی اور ہمیں سبق پڑھانے لگے۔ میں حیران ہی رہ گیا کہ مجھے کس قدر جلدی سبق سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی پڑھ رہے تھے مجھے بڑا ہی آسان لگ رہا تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی بھی اتنی دلچسپی سے سبق نہیں سنا تھا۔ اور نہ ہی کبھی انہوں نے اتنی وضاحت سے ہمیں سمجھایا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ بیچارے استاد صاحب چاہتے ہیں کہ جانے سے پہلے پہلے اپنا سارا علم ہمارے ذہنوں میں بھر دیں' سبق پڑھنے کے بعد ہم لکھنے بیٹھ گئے اس دن کے لئے موسیو ہمیل نے کچھ خصوصی مثالیں تیار کی ہوئی تھیں جو انہوں نے بڑی خوشخط کر کے لکھیں۔

"فرانس زندہ باد"

یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ساری کلاس کے اوپر چھوٹے چھوٹے جھنڈے لہرا رہے ہوں۔ ایک خاموشی کا عالم تھا' سوائے کاغذ قلم چلنے کی آوازوں کے اور کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک بار تو کچھ چڑیاں اندر اڑتی ہوئی آگئیں پر کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔ سکول کی عمارت کی چھت پر کبوتر آہستہ آواز میں غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"اگر ان پرندوں کو بھی جرمن زبان میں گانے پر مجبور کیا گیا تو یہ بڑی حیران کن بات ہو گی۔

کچھ دیر بعد جب میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا کہ موسیو ہمیل اپنی کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھے ہیں ان کی نظریں یوں جمی ہوئی تھیں جیسے سکول کی عمارت اپنی آنکھ میں بھر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔ ہے بھی تو یہ سوچنے کی بات۔ انہوں نے چالیس سال اس جگہ پر گذارے تھے جہاں سامنے یہ صحن تھا اور ویسی ہی کلاس تھی بس بینچ اور ڈیسک استعمال کئے جانے کے باعث کچھ گھس گئے تھے' صحن میں اخروٹ کے درخت اگائے گئے تھے۔ اور Hoprine کا درخت بھی جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا اب وہ کمرے کی چھت سے بھی اونچا ہو چکا تھا۔ کس قدر دکھ کی بات تھی کہ بیچارے ماسٹر صاحب کو یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔ انہیں چھت پر اپنی بہن کے چلنے پھرنے کی آواز آرہی تھی۔ جو صندوقوں میں سامان چیک کر رہی تھی کیونکہ اگلے دن انہوں نے یہ صوبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانا تھا۔ پھر بھی انہوں نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا کہ کلاس ختم ہونے تک خود پر قابو پائے رہیں۔ سبق لکھنے کے بعد ہم نے تواریخ کا سبق پڑھا۔ پھر چھوٹے بچوں نے ایک زبان ہو کر با بے بی بو یو

والا گیت گایا۔ کمرے سے دور پچھلی طرف بابا ہاسر عینک لگائے دونوں ہاتھوں میں ہجوں کی کتاب سنبھالے ہوئے تھے اور لفظوں کے ہجے یاد کر رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی آواز جذبات سے مفلوج ہو کر لڑکھڑا رہی تھی' انہیں اس وقت سبق سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مجھے اپنی یہ آخری کلاس ہمیشہ یاد رہے گی۔ یکدم چرچ کے گھنٹے نے بارہ بجائے اور اسی وقت سکول کی گھنٹی بجی اور ساتھ ہی ڈرل سے واپس آتے ہوئے فوجیوں کے بگل کی آواز کھڑکیوں کے راستے اندر آئی موسیو ہمیل اپنی کرسی سے اٹھے ان کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے پہلے کبھی بھی اتنے دراز قد نہیں لگے تھے۔

"میرے دوستو" انہوں نے پھر کہا۔ میرے دوستو میں ۔ میں ۔ پھر وہ بلیک بورڈ کی طرف گئے چاک کا ٹکڑا لیا' اپنی ساری قوت یکجا کر کے جس قدر بڑا لکھ سکتے تھے انہوں نے لکھا۔

"فرانس زندہ رہے"

کچھ دیر وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بغیر کچھ کہے کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے ہماری طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ جاؤ!"

توفیق زیاد / ستار طاہر

خطاب یافتگان

بادشاہ سلامت نے اپنے درباریوں کو جمع کیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا "کیا تم میں سے کوئی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں "پاشا" اور "بے" کے خطاب رکھنے والے کتنے افراد ہیں۔"

بادشاہ عالی مقام کا یہ سوال غیر متوقع تھا درباری اور وزیر سوچ میں پڑ گئے اور ایک دوسرے کو حیران اور پریشان نگاہوں سے دیکھنے لگے کہ کیا جواب دیں؟ بادشاہ سلامت پھر لب کشا ہوئے۔ "اچھا تو یہ معلوم ہوا کہ تم میں سے کوئی بھی میرے سوال کا جواب نہیں جانتا اور نہ تم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو جو میرے سوال کا صحیح جواب دے سکتا ہو۔"

بادشاہ سلامت کے دل میں یہ سوال پھانس کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اس نے اپنے درباریوں سے یہی سوال کیا۔ کسی درباری اور وزیر کے پاس جواب نہ تھا۔

بادشاہ سلامت نے لمبا سانس لیا۔ اپنی مہندی لگی سرخ ڈاڑھی ہاتھ سے سہلائی اور بڑے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے کہ اس مسئلے نے ہمیں ایک مدت سے الجھا رکھا ہے' ہم ایک عرصے سے حیران ہیں۔ مابدولت جہاں بھی جاتے ہیں' اپنے محلوں میں' وزارت کے دفاتر میں' ملک کے دور افتادہ حصوں میں ہماری ایسے لاتعداد افراد سے ملاقات ہوئی جن کے بارے میں ہمیں مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ صاحب "پاشا ہیں" اور یہ "بے" ہیں۔ ہم جب استفسار کرتے ہیں کہ انہیں "پاشا" اور "بے" کا خطاب کیسے ملا تو ہماری خدمت میں عرض کی جاتی ہے کہ ان صاحب نے فلاں کارنامہ سرانجام دیا' ان حضرت نے فلاں خدمت کی تھی یہ اس لئے پاشا ہیں' اور وہ اس لئے "بے" ہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں پاشا اور "بے" کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہ صاحب اس لئے پاشا ہیں کہ انہوں نے اس دیہات کا محصول ہماری خدمت میں نذر کیا تھا اور کوئی اس لئے پاشا کا خطاب حاصل کر چکا ہے کہ ہم نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔"

وزیر اعظم نے ذرا جراتمندی سے کام لیتے ہوئے عرض کیا۔

"میرے آقا یہ سب آپ کی نوازشات ہیں۔"

"یہ تو درست ہے یہ سب ہماری نوازشات اور انعامات ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں' ہم تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایسے خطاب یافتہ حضرات کی تعداد کیا ہے۔ ہاں ہم صرف تعداد جاننا چاہتے ہیں۔ ہم جو خطابات دیتے ہیں' ہمارے ہاں ان کا اندراج تو ضرور کیا جاتا ہو گا۔"

"کیا جاتا ہے حضور والا۔"

"تو بس پھر محرروں کو ہدایت کی جائے کہ اندراجات دیکھ کر ہمیں مطلع کریں کہ خطاب یافتگان کی تعداد

کتنی ہے۔ ان کی فہرست ہماری خدمت میں پیش کی جائے۔"

دربار برخاست کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد دربار دوبارہ منعقد ہوا۔

وزیر اعظم نے معروضات پیش کیں۔

"شاہ معظم! ہم نے سب اندراجات کا معائنہ کیا ہے لیکن جن خطاب یافتہ حضرات کا نام رجسٹروں میں درج ہے ان کی تعداد تو کم ہے۔ اس ضمن میں معلوم ہوا کہ یہ اندراجات دس برس کے ہیں۔ درمیانی عرصے میں حضور عالی مقام نے جن لوگوں کو "پاشا" اور "بے" کے خطابات و القابات سے نواز ہے ان کے نام رجسٹروں میں درج نہیں کئے جا سکے۔"

"ایسا کیوں ہوا۔ یہ تغافل" بادشاہ سلامت نے بھنویں تان کر حیرت سے پوچھا۔

"بادشاہ معظم! اس کی وجہ محرروں نے یہ بتائی ہے کہ اس عرصے میں حضور عالی مقام نے اتنی کثرت سے اپنی خیر خواہ اور وفادار رعایا کو خطابات سے نوازا ہے کہ ان محرروں کو اتنا وقت ہی نہ مل سکا کہ وہ ساتھ ساتھ اندراجات کر سکتے۔" بادشاہ سلامت یہ سن کر بڑبڑانے لگے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسند شاہی پر کسمسا رہے ہیں۔ وزیر اعظم خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے عرض کی۔

"ان حالات کے پیش نظر محرروں نے حضور کے بے پایاں انعامات کا ریکارڈ رکھنا موقوف کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اندراج ممکن ہی نہیں رہا۔"

دربار پر خاموشی چھا گئی بالاخر وزیر اعظم ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "حضور معظم یہ ہماری استعداد اور استطاعت سے بھی بعید ہے کہ ہم سارا ریکارڈ اپنے حافظے سے مہیا کریں۔" ایک بار پھر دربار پر خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں بادشاہ معظم کی بڑبڑاہٹ سنی جا سکتی تھی۔

"حضور والا! ہم ارشاد عالی کے منتظر ہیں اب جو حکم صادر ہو گا اس پر عمل کیا جائے گا۔"

وزیر اعظم اپنی نشست سے اٹھ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بادشاہ سلامت کے ہونٹوں پر گڑی تھیں کہ نجانے بادشاہ سلامت کیا حکم صادر فرمائیں۔

بادشاہ سلامت نے لب کشائی نہ کی اور دربار برخاست کر دیا۔ اس روز بادشاہ سلامت اور اس کے ذہین وزیر ایسا کوئی طریقہ نہ سوچ سکے جس پر عمل کر کے سلطنت عالیہ میں "پاشا" اور "بے" کا خطاب پانے والوں کی صحیح تعداد کا تعین کیا جا سکے۔

پورا ہفتہ سلطان عالی مقام سر کھپاتے اور سوچتے رہے۔ بالاخر بادشاہ سلامت کو ایک نادر ترکیب سوجھ ہی گئی جس کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے درباریوں کو طلب فرمایا۔ جب دربار لگ چکا تو اعلان کیا۔

"مابدولت نے بالاخر وہ طریقہ تلاش کر لیا ہے جس کی بدولت ہم پوری صحت کے ساتھ اپنے ملک کے تمام "پاشا" اور "بے" شمار کر سکیں گے۔"

وزراء اور درباریوں نے بادشاہ سلامت کی فراست پر نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ سب سے اونچی آواز وزیر اعظم کی تھی۔ "خداوند تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے! ارشاد ہو کہ وہ کیا طریقہ ہے؟"

"وہ طریقہ یوں ہے کہ ہم ایک خاص دن طے کر کے سلطنت عالی کے سب "پاشا" اور "بے" کا خطاب حاصل کرنے والوں کو دعوت دیں گے کہ وہ اس روز دارالخلافہ میں جمع ہوں۔ ہم اپنے محل کے بالاخانے پر جلوس

فرمائیں گے۔ "پاشا" اور "بے" حضرات کا قافلہ ہمارے سامنے سے گزرے گا۔ اس طرح ہم ان کی گنتی کروا لیں گے۔"

یہ سن کر بادشاہ سلامت نے خوشی سے اپنے ہاتھ ملے اور اپنی نادر تحریک پر داد پانے کے لئے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ سلامت کے فرق مبارک کے سوا یہ ترکیب کسی اور کے دماغ میں آہی نہیں سکتی تھی۔ بادشاہ سلامت کی بے مثل ذہانت اور فراست کا سکہ حاضرین دربار کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ وہ بادشاہ معظم کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔

سلطان معظم نے ایک بار پھر اپنی ہتھیلیوں کو رگڑتے ہوئے ارشاد کیا۔ "پھر یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ وہ حضرات جنہیں "پاشا" کا خطاب ملا ہے وہ خچروں پر سوار ہوں اور "بے" کا خطاب پانے والے سب افراد گدھوں پر سوار ہو کر آئیں۔ پہلے مابدولت کے سامنے سے "پاشاؤں" کا جلوس گزرے گا اور ہم ان کی بھی گنتی کرا سکیں گے۔ اس طرح ہم یہ بڑا مسئلہ حل کر لیں گے جس کی وجہ سے ہم مدتوں سے پریشان چلے آ رہے ہیں۔"

وزیر اعظم کو مخاطب کر کے بادشاہ سلامت نے حکم دیا "ضروری ہدایات جاری کر دی جائیں۔"

اور پھر یوں ہوا۔

طے شدہ دن صبح سویرے ہی ریاست کے "پاشا" اور "بے" افراد جمع ہوئے۔ ہر "پاشا" اپنا خچر تھامے اور ہر "بے" اپنے گدھے کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ عالی مقام اپنے وزراء اور درباریوں کی معیت میں محل کے بالانشین پر تشریف لائے۔ اس عظیم جلوس کا افتتاح فرمایا۔ پہلے "پاشا" کا خطاب پانے والوں کے کارواں گزرنے لگے۔ خچروں کی ایک قطار کے پیچھے خچروں کی دوسری قطار تھی۔ گنتی کی سہولت کے لئے ہر قطار میں پچاس سوار تھے۔ قطار اندر قطار لمحہ بہ لمحہ یہ جلوس گزرتا رہا۔ محرر حضرات گنتی کرتے اور لکھتے جا رہے تھے۔ جمع کرنے کے بعد رجسٹر ایک طرف پھینک دیتے یہاں تک کہ "پاشا" کا خطاب پانے والوں کا کارواں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد ان کی باری آئی جنہیں "بے" کا خطاب ملا تھا۔ گدھوں کی ایک قطار کے پیچھے دوسری قطار اور ہر قطار میں سو سواروں کا کارواں مسلسل حرکت میں رہا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے لگا۔ جب آخری قطار بھی گزر گئی تو بادشاہ سلامت اور اس کے وزیروں اور درباریوں نے چین کا سانس لیا۔ محرروں کا یہ حال تھا کہ لکھتے لکھتے پسینے میں شرابور تھے۔ قلم گھس گئے تھے۔ اور کاغذوں کا ذخیرہ ختم ہونے والا تھا۔ شام کا جھٹپٹا ہو رہا تھا اور ہر شخص تھک گیا تھا۔ اچانک ایک شور بپا ہوا۔ دوسرے لمحہ پیادہ لوگوں کا ایک جم غفیر قطار اندر قطار شاہی بالاخانے کے سامنے سے گزرنے لگا۔ یہ جم غفیر دیکھ کر بادشاہ سلامت کا منہ کھلا رہ گیا۔ بوکھلاہٹ اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نئے پیادہ کارواں کا آخری سرا کہیں بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ محرر حضرات جنہوں نے ابھی سکھ کا سانس لیا تھا ششدر رہ گئے جیسے کوئی بلائے ناگہانی اچانک نازل ہو گئی ہو۔

شام کا جھٹپٹا رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ بادشاہ معظم نے اپنے وزیروں اور درباریوں کی طرف دیکھا۔ وزیر اعظم کے چہرے پر ان کی نظریں گڑ گئیں۔

"یہ سب کیا ہے؟" حضور عالی مقام گرجے

"حضور والا!" وزیر اعظم نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ سلامت پھر گرجے۔ "ہم نے صرف "پاشا" اور "بے" کا خطاب پانے والوں کو یہاں جمع ہونے کا حکم صادر فرمایا تھا۔"

"حضور عالی مقام!" وزیر اعظم نے پھر زبان کو حرکت دی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں جو چلے آ رہے ہیں۔" بادشاہ سلامت نے کڑک کر پوچھا۔
وزیر اعظم بالآخر اپنی جھجک پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔
"حضور عالی مقام! یہ سب خطاب یافتگان ہیں۔ ماجرا یوں ہے کہ ملک میں تمام گدھے ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے ان سب کو گدھے مہیا نہ ہو سکے اور وہ پیدل چلے آ رہے ہیں۔"
بادشاہ عالی مقام کو اپنے وزیر اعظم کی بات سمجھنے میں تھوڑا وقت تو لگا لیکن وہ حقیقت کو پہنچ گئے اور پھر یکایک بادشاہ سلامت پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ وہ قہقہے پر قہقہے لگاتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ لوٹ پوٹ ہو کر مسند شاہی پر گر پڑے۔ اور ان کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے....
یہ دیکھ کر درباریوں اور وزیروں نے بھی اپنے بادشاہ سلامت کی تقلید میں ہنسنا شروع کر دیا۔

غسان کنعانی / ستار طاہر

سعد کی ماں

ام سعد نے اپنی زندگی کے ان گنت برس میرے خاندان کے ساتھ الغبابیہ میں بسر کئے۔ اس کے بعد کئی انتہائی بوجھل برس فلسطینی مہاجرین کے تکلیف دہ کیمپوں میں گزارے۔ اب بھی وہ ہر منگل کو ہمارے گھر آتی ہے اور ہمارے ہاں آ کر چیزوں کو دیکھتی ہے۔ اپنی کمزور ہڈیوں والے نحیف جسم کو حرکت میں رکھتے ہوئے بیتے دنوں کی یادوں کو دہراتی ہے۔ وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے' اس لیے میرے کانوں میں اپنی حالت زار' اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتیں اور پریشانیاں انڈیلتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی زمانے کی شکایت نہیں کی۔

اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اس میں چٹانوں سے زیادہ قوت اور صبر و تحمل ہے۔ وہ اپنا ایک ایک دن معروفیت اور حرکت میں بسر کرتی ہے۔ ایک روز میں وہ دس دنوں کا کام کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے رزق حلال کماتی ہے۔

میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا حصہ بن چکی ہے جس کے بغیر میرا وجود مکمل نہیں رہتا۔ جب وہ دروازہ کھٹکھٹا کے اندر داخل ہو کر اپنی معمولی اور غریبانہ اشیاء کمرے کے فرش پر رکھتی ہے تو میں بہت سی یادوں کی ردا میں لپٹ جاتا ہوں۔ مجھے فلسطینی مہاجروں کی خستہ حالت' غربت و ناداری اور بے وطنی کے ایام گزارنے والے لوگوں کی امیدیں یاد آ جاتی ہیں۔ میرے منہ کا ذائقہ ایک ایسی تلخی سے بھر جاتا ہے جس سے میں فلسطینی مہاجر کیمپوں میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ وہ ذائقہ اب تک موجود ہے۔

پچھلے منگل وار وہ حسب سابق ہمارے ہاں آئی۔ معمولی اشیاء کی گٹھڑی فرش پر رکھتے ہوئے وہ مجھے کہنے لگی۔

"میرے عزیز! میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ سعد چلا گیا ہے۔"

"کہاں؟"

"ان کے پاس۔"

"کس کے پاس؟"

"فدائین کے پاس۔"

ہمارے درمیان ایک بوجھل سی خاموشی حائل ہو جاتی ہے۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے میں اس کی زندگی کے مختلف مراحل دیکھتا ہوں۔ وہ کتنی کمزور اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ نامہرباں زندگی کی مشقتوں نے اسے گھلا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے اپنی گود میں اپنے ہاتھ تہہ کر کے رکھے ہوئے ہیں۔ میں ان کی ہتھیلیاں دیکھ سکتا ہوں جو کسی درخت کے ٹکڑوں کی طرح خشک اور سخت ہو چکی ہیں لیکن کسی درخت کے تنے کی طرح ان ہتھیلیوں میں بھی دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ اس کا وہ المناک اور صعوبتوں سے پر سفر مجھے یاد آ جاتا ہے جو زندگی اور ماں بیٹے کا سفر ہے۔

سعد بچہ تھا جب اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ ان مضبوط ہاتھوں نے سعد کو کھانا کھلایا اور پالا پوسا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے زمین کسی نرم و نازک پودے کو پالتی ہے۔ سعد اب جوان ہو چکا تھا' گویا وہ پودا ایک درخت بن گیا تھا اور اس میں گھونسلہ بنا کر رہنے والا پرندہ بیس برس کے بعد اڑ گیا تھا۔

"وہ فدائین میں شامل ہو گیا ہے۔"

میں اب بھی اس کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ ہاتھوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اب یہ ہاتھ مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے انداز میں ام سعد کے دل کا سارا کرب شامل ہو گیا تھا۔ یہ ہاتھ اس بیٹے کو تلاش کر رہے تھے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نامعلوم خطرات کا سامنا کرنے چلا گیا تھا۔ اوہ میرے خدا! آخر مائیں کب تک اس طرح اپنے بیٹے کھوتی رہیں گی؟ یہ المیہ ڈرامہ کب تک جاری رہے گا؟ کب تک؟ میں نے ام سعد سے پوچھا۔

سعد نے تمہیں کیا بتایا تھا؟"

"اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ بس وہ چلا گیا۔ صبح اس کے دوست نے مجھے اطلاع دی کہ وہ فدائین میں شامل ہونے جا چکا ہے۔"

"کیا اس سے پہلے اس نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی دن چلا جائے گا؟"

"اوہ! ہاں! اس نے بتایا تھا۔ مجھے اس کا علم تھا۔ میں سعد کی ماں ہوں۔ اسے جانتی ہوں۔ مجھے خبر تھی کہ وہ ایک دن چلا جائے گا۔"

"پھر تم اتنی حیرت زدہ کیوں ہو؟"

"میں --- بھلا میں کیوں حیران ہوتی! میں تو تمہیں بتا رہی ہوں کہ سعد جا چکا ہے۔"

"اچھا' تو اب تمہیں یہ جاننے میں تو دلچسپی ہو گی کہ سعد کیا کر رہا ہے؟"

اس نے گود میں رکھے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ اب وہ مضبوط اور خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو ہمیشہ کسی نہ کسی کام کاج میں لگے رہتے تھے۔

"نہیں۔ آج صبح میں نے اپنی پڑوسن سے کہا تھا' کاش! سعد جیسے میرے دس بیٹے ہوتے۔ میرے عزیز! میں بہت تھک چکی ہوں۔ مہاجر کیمپ میں میری زندگی بہت دشوار اور تھکا دینے والی ہے۔ ہر صبح میں خدا سے کہا کرتی تھی۔ میرے خدا! بیس برس گزر گئے اگر سعد فدائین کے ساتھ نہیں جائے گا تو پھر کون جائے گا؟ سعد کی ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سارا کمرہ اس کی شخصیت کی سادگی سے بھر گیا۔ مجھے فلسطین میں اپنے وہ گھر یاد آنے لگے جنہیں ہم سب چھوڑنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ ام سعد باورچی خانے کی طرف گئی تو میں اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"بس میں جو عورت میرے ساتھ بیٹھی تھی' میں نے اسے بتایا کہ میرا بیٹا مجاہد بن گیا ہے۔ میں نے اسے کہا مجھے اپنے بیٹے سے محبت ہے اور میں اس کی جدائی محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن وہ اپنی ماں کا سچا بیٹا ہے۔ ہاں کیا وہ اسے ایک مشین گن دیں گے؟"

"ہاں! وہ اپنے مجاہدین کو مشین گن ضرور دیتے ہیں۔"

"اور کھانا؟"

"ان کے پاس کھانے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ سگریٹ بھی دیتے ہیں۔"

"سعد سگریٹ نہیں پیتا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں وہ سگریٹ پینا سیکھ جائے گا۔ وہ میری آنکھوں کا نور

ہے۔ وہ قریب ہوتا تو میں ہر روز اس کے لیے اپنا ہاتھ کا پکا ہوا کھانا لے جاتی۔"

"اسے وہاں اپنے ساتھیوں جیسا کھانا ملے گا۔"

"خدا ان سب پر اپنا فضل کرے!" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "کہو تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر میں اسے وہاں ملنے جاؤں تو کیا وہ مجھے مل کر خوش ہو گا؟ میں سفر خرچ کے لیے پیسے جمع کر سکتی ہوں۔ دو دنوں میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔" کچھ سوچنے کے لیے وہ رکی پھر کہنے لگی "تم جانتے ہو کہ بچے والدین کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اگر میرے دوسرے دو بچے نہ ہوتے تو میں بھی سعد کے ساتھ چلی جاتی۔ میں وہاں اس کے پاس رہتی۔ کسی خیمے میں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ گوریلا کیمپ کے خیموں کی حالت مہاجر کیمپوں کے خیموں جیسی بری نہ ہو گی۔ میں وہاں ان سب کے ساتھ رہتی ان کے لیے کھانا پکاتی۔ میں ان کے لیے سب کام کرتی لیکن کیا کروں یہ دو بچے۔۔۔ انہوں نے مجھے غلامی کی زنجیریں پہنا دی ہیں۔"

"میں نے جواب دیا۔

"وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے حالات کا اکیلے ہی مقابلہ کرنے دو۔ ایک مرد جو فدائین میں شامل ہو جاتا ہے' اسے اپنی ماں کی ضرورت نہیں رہتی۔"

اس نے اپنے ہاتھ ایپرن سے صاف کئے۔ اس کی نگاہوں میں میں نے مایوسی دیکھی۔ وہ میرے قریب آ کر کہنے لگی۔

"کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟ کیا تمہارے خیال میں مجھے وہاں جا کر کمانڈر سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ سعد کا خیال رکھے۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میرے خیال میں مجھے سعد کے کمانڈر سے کہنا چاہیے کہ وہ میرے بیٹے کا خیال رکھے۔ میں اسے دعا دوں گی کہ خدا اس کے بچوں کو لمبی عمر دے!"

"نہیں! تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کسی گوریلے مجاہد کا خیال رکھے۔"

"مگر کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کے کمانڈر سے یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ تمہارے بیٹے کو خطرات سے محفوظ رکھے' جبکہ خود سعد اور فدائین بہتر طور پر جانتے ہیں کہ خطروں سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ جب تک اس کی تربیت مکمل نہیں ہوتی وہ انہیں محاذ پر نہیں بھیجتے۔"

سعد کی ماں بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ مجھے اتنی توانا اور مضبوط دکھائی دی کہ میں اس کا کبھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک ماں کے دل میں جو ہلچل مچی ہوئی تھی' میں اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کی بے چین آنکھیں اور مضطرب ہاتھ اس کے قلبی جذبات کی کشمکش کا اظہار کر رہے تھے۔

پھر اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں اس کے ہاتھ پرسکون دکھائی دینے لگے اور بولی۔

"میں بتاتی ہوں کہ سعد کے کمانڈر سے کیا کہنا چاہیے۔ اس کے کمانڈر کو معلوم ہونا چاہیے کہ سعد کی ماں کیا چاہتی ہے۔ سعد ایک اچھا لڑکا ہے۔ اس کی ماں درخواست کرتی ہے کہ اس کا بیٹا جو کرنا چاہتا ہے اس کی اجازت دے دی جائے۔ وہ میرے بیٹے کو مایوس نہ کرے۔ ہاں سعد جو کرنا چاہتا ہے اس کی اسے اجازت ملنی چاہیے۔ اگر وہ محاذ جنگ پر جانا چاہتا ہے تو پھر کمانڈر کو چاہیے کہ وہ اسے دشمنوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیج دے۔ یہی اس کی ماں۔۔۔۔۔ سعد کی ماں چاہتی ہے۔"

یحییٰ خلیف / ستار طاہر

خوددار لوگ

صالح ابو علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر اذیت ناک مشقت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا اور اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر پھونکیں ماریں تاکہ انگلیاں کچھ گرم ہو جائیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑا اور پھر اپنے چھکڑے میں جت گیا جس میں تولیوں کی بوریاں بھری ہوئی تھیں اور پھر سر اٹھا کر قدموں کو مضبوطی سے زمین پر جماتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ چھکڑے کو دھکیلتا ہوا چل پڑا اس کی رفتار ست تھی اور اس کی ٹانگیں یوں چل رہی تھیں جیسے کوئی سائیکل سوار ٹانگیں چلاتا ہے۔

اس کی شکل پر نقاہت صاف نظر آرہی تھی۔ سر کے چھدرے بال چھوٹی گول ٹوپی سے نظر آرہے تھے۔ سبزی منڈی سے گزرتے ہوئے اپنے چھکڑے کے لئے راستہ بنانے کے لئے وہ چلا رہا تھا۔ ہٹو راستہ دے دو۔ راستہ دے دو بھائیو نہیں تو چھکڑے کے نیچے آجاؤ گے۔

جب وہ شہر کے پر ہجوم بازاروں سے نکل آیا تو ایک تنگ گلی میں جا پہنچا۔ اس گلی کے ایک طرف قبرستان تھا اور ڈھلوانی راستہ فلسطینی مہاجروں کے کیمپ کی طرف جاتا تھا۔ جب تک وہ اپنے ہی پسینے میں نہا چکا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ہر عضو اور اعصاب شل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے قدم میکانکی انداز میں خود بخود اٹھ رہے تھے۔

یوں تھکا ماندہ نقاہت زدہ وہ چھکڑے کو گھسیٹے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک دھندلا سا ہیولا آیا۔ اس کے بیٹے کا ہیولا تھا۔ اکلوتا بیٹا..... جو دو ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ بیٹا چار بیٹیوں کے بعد دنیا میں آیا تھا۔ صالح ابو علی کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ اس کا یہ بچہ بہت صحت مند اور تر و تازہ تھا' اچانک بیمار پڑ گیا تھا اور اس نے اس کے علاج کے لئے جو دوائی خیراتی ہسپتال سے لی تھی وہ کارگر ثابت نہ ہوئی تھی۔ آج صبح جب وہ گھر سے نکلا تو اپنے پیچھے اپنے اس بیمار اور لاغر جسم والے بچے کو بخار میں پھنکتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔

صالح ابو علی نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اس وقت اس کا چہرہ کرب اور اندرونی دکھ سے مسخ ہو رہا تھا۔

سامنے موڑ تھا اور اونچائی بھی تھی۔ اس لئے اسے چھکڑے کو کھینچنے کے لئے زیادہ قوت صرف کرنا پڑی اور پھر وہ اونچائی پر پہنچ کر ڈھلوانی راستے پر اترنے لگا تو اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا تھوڑی دور فلسطینی مہاجروں کا کیمپ تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس وقت تمام بچے سکول جا چکے ہوں گے اور اب وہ کسی بچے کی نہ آواز سن سکے گا نہ یہ اصرار کہ چچا صالح..... ہمیں چھکڑے پر سوار کر لو۔

اس علاقے کے تمام بچے اسے چچا صالح کہتے تھے۔ وہ انہیں چھکڑے پر سوار کر لیا کرتا تھا' وہ سیب جو بوریوں سے نکل کر چھکڑے میں گر پڑتے تھے ان میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ جب کبھی اس کے پاس زیادہ پیسے آجاتے تھے تو وہ

ان میں پیسے اور ٹافیاں بھی بانٹا کرتا تھا۔ ان بچوں کا خیال آتے ہی اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا۔ غم اور خوف نے بیک وقت اس کے دل پر حملہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگا۔

کیمپ کی کچی گلیاں اور مٹی کے جھونپڑے سہ پہر کے وقت خاموش تھے۔ حتیٰ کہ اس کا دوست احمد حجام بھی دکان کے سامنے بنچ پر سویا ہوا تھا۔ محمد الصابی سبزی فروش بھی اپنی دکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ابو شکری کی بیکری بند تھی اور کچھ مرغیاں عین گلی کے درمیان میں کھڑی تھیں۔

اچانک صالح نے محسوس کیا کہ چھکڑا بے قابو ہو رہا ہے۔ اور اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور زمین پر گر پڑا۔

وہ اچانک زمین سے اٹھا اور ایک لمحے میں وہ جان گیا کہ چمڑے کا وہ جوا جسے وہ گلے میں ڈال کر چھکڑے کو کھینچتا ہے وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چھکڑا ایک طرف لڑھک چکا ہے اور دو مرغیاں گلی کے درمیان تڑپ رہی ہیں۔

جب وہ ان مرغیوں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ان میں سے ایک مرغی کا بھیجا زمین پر بکھرا پڑا ہے اور دوسری مرغی بھی گر چکی ہے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا کیونکہ دو مرغیاں اس کے چھکڑے کے نیچے آکر ہلاک ہو چکی تھیں۔

بوکھلاتے ہوئے صالح ابو علی نے ادھر ادھر دیکھا آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے چھکڑے کو سیدھا کیا مولیوں کی بوریوں کو اٹھا کر چھکڑے میں رکھا۔ چمڑے کے جوئے کو گانٹھ دیکر گلے میں ڈالا اور تیزی سے چھکڑا کھینچ کر آگے بڑھ گیا۔ بالاخر وہ ابو الحسنات کی دکان تک جا پہنچا جہاں اس نے مولیاں پہنچانی تھیں۔ اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ابو الحسنات نے اس سے پوچھا۔

تمہارا چہرہ مسمیوں کی طرح زرد ہے؟

صالح سے کوئی جواب نہ بن پڑا ابوالحسنات نے کہا۔

آؤ ..... چائے کی ایک پیالی پی کر جانا۔

صالح ابو علی کی آنکھوں کے سامنے مردہ مرغیاں آرہی تھیں۔

جب وہ واپس آرہا تھا تو اپنے آپ کو ایک چور محسوس کر رہا تھا۔ اب چھکڑا خالی تھا اس کے باوجود اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جانے یہ مرغیاں کس کی ہیں اور اگر مالک کو پتہ چل گیا کہ اس کی دو مرغیاں میرے چھکڑے کے نیچے آکر مری ہیں تو میں ان کی قیمت کس طرح ادا کروں گا؟

وہ جائے حادثہ سے بھی کافی دور تھا۔ اس نے وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ایک کار کو گھیرے ہوئے تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے اپنے دوست احمد حجام کی آواز سنی جو کار کے ڈرائیور پر غصہ جھاڑ رہا تھا۔ کار ڈرائیور ہجوم میں کھڑا بوکھلایا ہوا تھا۔ لوگ مختلف باتیں کر رہے تھے۔

تمہیں مرغیوں پر کار چڑھاتے ہوئے شرم نہ آئی۔

کار کا ڈرائیور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

اللہ کی قسم ..... میں نے ان مرغیوں کو ہلاک نہیں کیا۔

اگر تم نے انہیں ہلاک نہیں کیا تو یہ کیسے مرگئیں۔ جھوٹ بولتے ہو ہم تمہیں پولیس کے پاس لے جائیں گے۔ وہیں فیصلہ ہو گا۔

صالح سمجھ گیا' کیا معاملہ ہے۔ مرغیوں کی ہلاکت کا ذمہ دار اس کار کے ڈرائیور کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔

مرغیوں کی مالکن پر رحم کرو۔ وہ یتیم بچوں کی ماں ہے بیچاری بیوہ زلیخا کی گزر اوقات تو مرغیوں کے انڈوں پر ہوتی ہے۔

صالح ابو علی نے زلیخا کا نام سنتے ہی اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ زلیخا نادار بے آسرا اور بیوہ عورت تھی۔

ڈرائیور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

میں قسم کھاتا ہوں یہ مرغیاں میری کار کے نیچے آکر نہیں مریں۔

یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ کار میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے کار کو وہاں سے بھگا لے گیا۔

صالح وہاں ندامت اور خجالت سے کھڑا رہا اور پھر چھکڑا کھینچتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ اس کے بعد سارا دن کام کرتے چلتے کھاتے' سگریٹ پیتے اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کے سینے کو نوچ رہا ہے۔

جب شام گہری ہوئی تو وہ گھر لوٹا اس نے دیکھا کہ اسکی بیوی بیمار بچے کی چارپائی کے پاس بیٹھی مکھیاں اڑا رہی ہے۔

"اب بچے کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس کی بیوی نے پریشان نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا!

"اسے خیراتی ہسپتال کی دوائیوں سے آرام نہیں آئے گا۔ ہمیں اسے فوراً" شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔"

صالح ابو علی تنکوں کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک وہ اپنی بیوی کو دیکھتا رہا' وہ تھکی ہوئی' کمزور اور نحیف دکھائی دے رہی تھی' بچے کی علالت کی وجہ سے وہ پچھلی تین راتوں سے مطلق سو نہ سکی تھی' صالح نے سوچا اگر میں مرجاؤں تو اس کا کیا بنے گا' یہ بیوہ ہو کر بچوں کو کس طرح پالے گی؟ اس کے ساتھ ہی اسے بیوہ زلیخا کا خیال آگیا۔

"کیا سوچ رہے ہو اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بچے کو شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر اپنی فیس لے گا۔ دوائی مفت نہیں ملے گی۔ لیکن بچے کو تو آرام آجائے گا".... اسکی بیوی کہہ رہی تھی۔

صالح ابو علی چند منٹوں تک کچھ سوچتا رہا پھر کھڑا ہو گیا اور کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا۔

کیمپ کی گلیاں مدھم روشنی سے تاریکی دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس مدھم روشنی میں چلتے ہوئے وہ ان سکوں کی گنتی کرنے لگا جو اس نے آج کمائے تھے۔ آج کی مشقت کی کمائی چالیس سیاستر تھی اور تیس سیاستر اس کے پاس پہلے سے موجود تھے' اور اس کے پاس اس وقت کل ستر سیاستر تھے جو دو مرغیوں کی قیمت ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن کو کچھ قرار سا آگیا۔ وہ اپنے دوست احمد حجام کی دکان کے قریب پہنچا جو لیمپ جلا رہا تھا۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر زلیخا چلی آرہی ہے۔ اس نے سر پر پانی کا برتن اٹھا رکھا ہے' اس کی آنکھیں مندھی ہوئی ہیں' چہرہ اداس ہے۔ صالح کے دل میں پھر درد کی ٹیس اٹھی اور وہ سوچنے لگا سارا دن یہ عورت کتنی مشقت کرتی ہے کپڑوں کی سلائی کرتی ہے۔ مرغیاں سنبھالتی ہے اور یوں بمشکل یتیم بچوں کے پیٹ بھرنے کے قابل ہوتی ہے ایک بچہ اس کے ساتھ چلا آرہا تھا جو صالح کو دیکھ کر چلایا۔

"چچا صالح.... مجھے ایک سیب دے دو۔"

بھوک لگی ہے۔
صالح کا چہرہ تن گیا وہ تیزی سے اپنے دوست حجام کی دکان میں گھس گیا۔
ابو علی کیسے ہو؟ احمد حجام نے پوچھا۔
صالح ابو علی نے اداس لہجے میں کہا:
میں ایک اہم بات کرنے آیا ہوں۔
کیا بات ہے؟ احمد نے سنجیدگی سے پوچھا۔
صالح ابو علی یوں تیز تیز بولنے لگا جیسے وہ بھاری بوجھ اپنے کندھوں سے اتار کر پھینکنا چاہتا ہو۔
وہ کار کا ڈرائیور نہیں .... میں تھا۔ جس کے چھکڑے کے نیچے آکر زلیخا کی مرغیاں ہلاک ہوئیں۔ احمد حیرت اور دلچسپی سے صالح ابو علی کی باتیں سن رہا تھا۔
میں زلیخا کو قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں تم ابھی میرے ساتھ چلو۔
احمد خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ زلیخا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے صالح کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" پھر کسی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا اور پھر پورا دروازہ کھول دیا گیا کیونکہ زلیخا انہیں پہچان گئی تھی۔ وہ سر جھکائے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ زلیخا نے پوچھا "بھائیو ..... کیا بات ہے؟"
"بہن سب ٹھیک ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں غلطی سے بھائی صالح کے چھکڑے کے نیچے تمہاری مرغیاں آگئیں اب بھائی صالح ان کی قیمت چکانے آیا ہے۔"
صالح نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا.... "اللہ جانتا ہے اس میں میری کوئی غلطی نہ تھی اچانک یہ حادثہ ہو گیا تھا۔"
"بہن صالح ابو علی ..... مرغیوں کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہے۔" احمد حجام نے ایک بار پھر کہا۔
چند منٹوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر زلیخا نے کہا۔
"ہماری خودداری اجازت نہیں دیتی کہ حادثہ میں مرنے والی مرغیوں کے نقصان کی قیمت وصول کریں۔ اللہ تمہیں اس دنیا اور عاقبت میں معاف کر دے میرے بچوں کی زندگی کی دعا کرنا میں تمہارے بیمار بچے کی صحت کے لئے دعا کرتی ہوں۔ ہم سب ایک سے ہیں۔ خدا حافظ۔"

ٹوودیا کالا / اسد ملک

دروغ گو؟

حینا اور للی بڑے جوش میں تھیں۔ کل ان کی کزن اولگا انہیں اپنا نیا اوور کوٹ دکھانے آئی اور یہ بھی بتایا کہ جب وہ اپنی ماں کے ایک کام سے شہر کے وسطی بازار گئی تھی تو کیسے سب لوگ، خاص طور پر اونچے طبقے کے لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے کیونکہ اس نے یہ نیا اسپرنگ کوٹ پہن رکھا تھا جو صرف اونچے طبقے یا امیر کبیر لوگوں کے بچے پہنتے ہیں۔ اس کی اپنی رائے میں اولگا خود بھی کچھ کچھ اسی طبقے کے بچے کی طرح لگتی تھی اور اس کے دیگر تمام کزن بھی ایسا ہی سوچتے تھے۔

جوش میں، لیکن وہ اولگا کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لئے باہر گیٹ تک گئیں۔ "اولگا کے لباس پر لگی جھالر کتنی خوبصورتی سے جھول رہی تھی۔"

"کاش ان دونوں کے پاس بھی اسپرنگ کوٹ ہوتے!" لیکن چونکہ ان کے پاس صرف لمبی جیکٹیں تھیں اس لئے ان کے لباسوں کی جھالریں جھولنا تو درکنار نظر بھی نہ آتی تھیں۔

"خدا کرے کسی سڑک پر ہمیں پچھتر پینس پڑے ہوئے مل جائیں پھر ہم بھی اسپرنگ کوٹ خریدیں گی!" للی نے کہا لیکن حینا نے اسے سمجھایا کہ اتنی کم رقم سے کوٹ نہیں خریدا جا سکتا، تمہارے پاس پورے ایک مارک سے بھی زیادہ رقم ہونی چاہیے۔

"کاش خدا اتنا کر دے کہ ہمیں ڈیڑھ سو مارک مل جائیں!" للی نے فوراً" خواہش کی۔ گھر واپس جاتے ہوئے وہ زمین پر جھکی ہوئی تھی جیسے کسی کھوئی ہوئی سوئی کی تلاش میں ہو۔ اس رات جب وہ سونے لگی اس نے دعا کی کہ خدا ان کے گیٹ کے سامنے رقم پھینک دے۔ جہاں سے وہ رقم صبح سویرے اسے مل جائے گی۔ صبح جاگنے کے فوراً" بعد وہ باہر دیکھنے گئی، مٹی کو ٹٹولا، گڑھے کھود کھود کر ڈھونڈا اور جب اسے وہاں کچھ نہ ملا تو بہت غصے میں آگئی۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا کہ کسی چیز کے لئے چاہے اس نے کتنی ہی دعا کیوں نہ کی ہو اسے نہ ملی لیکن اتنے خلوص سے اس نے کبھی کچھ نہ چاہا تھا جتنا کہ ایک اسپرنگ کوٹ۔ وہ تقریباً" رو ہی پڑی۔

بعد میں دن کے وقت جب ماں کہیں کسی کام سے گئی ہوئی تھی اور وہ دونوں گھر میں اکیلی تھیں، حینا نے ماں کا سرخ رنگ کا سویٹر لیا اور یہ اندازہ لگایا کہ کیا وہ اسپرنگ کوٹ کی جگہ کام دے سکتا ہے یا نہیں۔ اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنے جسم کو اس طرح بل دیا کہ اس کے لباس کی جھالر لہرانے لگی۔ للی یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی اور اداس ہونے لگی کہ اس کے پاس ایسا سویٹر بھی نہیں تھا۔

حینا نے بالائی کمرے سے ماں کا عمدہ چمکیلے سیاہ رنگ کا سویٹر نکالا اور سرخ سویٹر للی کو دے دیا۔ پھر وہ اکٹھے مٹک مٹک کر چلنے لگیں حتیٰ کہ للی بھی اپنے اسکرٹ کو خوبصورتی سے لہرا سکتی تھی جب حینا نے اسے دکھایا کہ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے وہ دونوں خاص طور پر للی بہت لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ یہ اصلی اسپرنگ کوٹ ہیں' کیوں؟" حینا نے پوچھا۔ للی نے پر زور اتفاق کیا کیونکہ اس کے نزدیک وہ اصلی ہی تھے۔ للی کے ذہن میں سویٹروں کی آستینیں بھی اصلی اور خوبصورت تھیں جو اتنی لمبی تھیں کہ جب انہوں نے اپنے بازو نیچے کی جانب سیدھے کئے تو وہ گھٹنوں تک جھول گئیں اور جب انہوں نے اپنے بازوؤں کو کہنیوں سے حرکت دی تو وہ خالی جرابوں کی طرح لٹک گئیں۔ گویا یہی وہ وضع قطع تھی جو اسپرنگ کوٹ پہن کے ہوتی ہے۔ ان کے پاس اولگا کے اسپرنگ کوٹ سے زیادہ خوبصورت کوٹ تھے۔ اب یہی بات تھی جس کے متعلق وہ بہت پرجوش تھیں۔ وہ شہر کے وسطی بازار میں گھومنے پھرنے نکل گئیں۔

انہوں نے یہ جاننے کے لئے کہ کیا کوئی انہیں غور سے دیکھتا ہے یا نہیں سب لوگوں کی طرف دیکھا۔ اور جب کسی نے دیکھ ہی لیا تو انہوں نے اپنے اسکرٹوں کو اور بھی زیادہ لہرانا شروع کر دیا۔ جب بھی اونچے طبقے کی عورتیں گزرتیں تو وہ دونوں لڑکیوں کو بڑے غور سے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی تھیں۔ وہ جب گزر جاتیں تو لڑکیوں نے یہ جان لیا کہ یقیناً" خواتین نے انہیں امیر کبیر ہی سمجھا ہو گا۔ کچھ کسانوں سے ملاقات کے دوران وہ بڑے وقار سے قدم اٹھا رہی تھیں اس پختہ یقین کے ساتھ کہ وہ واقعی امیر طبقے کی ارکان ہوں۔

ایک گلی میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی آنٹی ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اس سے ملنے گلی کی دوسری جانب گئیں اور للی نے سوچا "اب پتہ چلے گا کہ آنٹی ہمیں پہچان سکتی ہے یا نہیں" جونہی وہ آنٹی کے قریب پہنچیں حینا مسکرائی لیکن للی کے چہرے پر متانت اور وقار نظر آیا۔

"تم کہاں سے آ رہی ہو؟" آنٹی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ماں کے ایک کام سے!" للی پر اعتمادی سے اسے ایک مناسب جواب سمجھ کر جھٹ سے بولی جبکہ اولگا بھی "ماں کے ہی کام پر تھی۔"

"اور یہ کیا چیتھڑے پہن رکھے ہیں تم نے؟"

"یہ ہمارے لئے اسپرنگ کوٹ ہیں!" للی نے آنٹی کے انہیں' چیتھڑے کہنے پر برا مناتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا۔ اس نے وضاحت کرنا شروع کر دی' "ہم نے یہ کوٹ آج ہی لئے ہیں۔ ان کے لئے کپڑا ماں نے سنیلا کے اسٹور سے خریدا اور جوزفینا یوسن نے انہیں تیار کیا ہے۔ آجکل جوزفینا بہت مصروف رہی ہے کیونکہ وہ اونچے طبقے کے تمام بچوں کے لئے اسپرنگ کوٹ تیار کرتی رہی ہے۔ اور چونکہ جوزفینا ہماری گاڈ مدر ہے اس لئے اس نے ہمارے کوٹ کرنل کے بچوں سے بھی پہلے تیار کر دیئے ہیں۔"

آنٹی نے اتنی حیرانی سے سب کچھ سنا۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا سوچے۔ اگر وہ پتھر کی طرح اندھی ہوتی اور اس نے یہ نہ دیکھ لیا ہوتا کہ لڑکیوں نے اپنی ماں کے سویٹر پہن رکھے ہیں تو اسے ہر بات کے سچ ہونے کا یقین آ جاتا۔ للی بغیر کسی ہچکچاہٹ اور اتنے وثوق سے اس کے منہ پر اس سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس پر غضب یہ کہ جوزفینا نے ان کے کوٹ دوسروں کے کوٹوں سے پہلے بنائے تھے کیونکہ وہ ان کی گاڈ مدر تھی۔

"لیکن جوزفینا تو تمہاری گاڈ مدر نہیں ہے!"

"لیکن وہ اولگا کی گاڈ مدر تو ہے۔"

"ہاں ہاں! مگر تمہاری تو نہیں!"

"ہاں! لیکن جوزفینا! ہمیں پسند تو اتنا ہی کرتی ہے ناں جیسے ہماری گاڈ مدر ہو۔" للی نے بغیر کسی شرمندگی کے وضاحت کی۔

"یہ اسپرنگ کوٹ نہیں ہیں تم نے اپنی ماں کے سویٹر پہن رکھے ہیں۔"

"نہیں!" للی نے یقین دلایا۔ "ان کی آستینیں لمبی ہیں کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ سارے مرد اور عورتیں ہمارے کوٹوں کو دیکھتے رہے ہیں اور ایک خاتون نے تو یہ بھی پوچھا ہے کہ ان پر کتنا خرچہ آیا۔ ان پر پورے پچاس مارک سو' خرچہ آیا ہے۔"

آنٹی اس بات پر کھل کر قہقہہ لگاتی اگر یہ بات اتنی سنگین نہ ہوتی کہ اتنی چھوٹی سی ملاحتی لڑکی کس تیاری کے ساتھ جھوٹ بول رہی ہے۔ حتی کہ جب اس کے جھوٹ کے کوئی معنی بھی نہ بنتے تھے۔ اس نے سختی سے لڑکیوں کو گھر جانے کا حکم دیا اور بتایا کہ وہ خود بھی وہاں آنے کا ارادہ رکھتی ہے اور وہاں وہ ان کی ماں کے سامنے ان کی یہ سنگین بدتمیزی بیان کرے گی۔

حینا نے بلند آواز میں للی سے حیرانی کا اظہار کیا کہ آنٹی کتنی شکی مزاج ہے کہ اس نے ان کی بات کا یقین نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے آنٹی اور اس کے احکامات کے متعلق بالکل پرواہ نہیں کی اور اولگا کو اپنے نئے اسپرنگ کوٹ دکھانے اس کے گھر چلی گئیں۔

راستے میں حینا نے تجویز پیش کی کہ اولگا جو ان دونوں سے طویل قد کی تھی ماں بن سکتی ہے اور وہ دونوں اس کی بیٹیاں۔ اور پھر وہ تینوں کہیں سیر سپاٹے کو جائیں۔

اولگا نے فوراً" ان کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔ اس نے اپنے بھائی کے تنکوں والے ہیٹ لئے جس پر انہوں نے خوبصورت ربن' کپڑے کے ٹکڑے' کاغذی پھول' اور جو کچھ بھی سجاوٹی لگا ٹانک دیا۔ وہ حینا اور للی کے لئے ہیٹوں کی طرح کے اسکارف بن گئے۔ اور وہ ایک دفعہ پھر وسطی بازار چلی گئیں۔

لوگوں نے انہیں دیکھا اور ان پر مسکرائے جس سے انہیں خوشی محسوس ہوئی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ لوگ یقیناً" یہی سوچ رہے ہوں گے اور تصور کر رہے ہوں گے کہ "پتہ نہیں یہ کون ہیں؟ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ واہ! وہ کتنی حسین و چنچل ہیں؟ پتہ نہیں کس نے وہ نئے اسٹائلش اسپرنگ کوٹ بنائے ہیں؟"

وہ خوشی اور مسرت سے بھرپور گھر واپس آئیں۔ اولگا ابھی گھر نہیں جانا چاہتی تھی اس لئے وہ اپنی کزنوں کے ساتھ آگئی کیونکہ وہ ابھی اپنے متعلق اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ ان تینوں میں سے بہترین تھی کہ اس نے تو واقعی ایک سچ مچ کا اسپرنگ کوٹ پہنا ہوا تھا بالکل جیسے وہ کسی اصلی اونچے گھر کی خاتون ہو۔

حینا اور للی کی آنٹی پہلے ہی ان کے گھر پہنچ چکی تھی اور ان کے ماں اور باپ جو کہ دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آیا ہوا تھا' سے ہر بات بیان کر چکی تھی کہ کیسے وہ گلی میں ان سے ملی اور کیسے للی نے جھوٹ بولا تھا۔ ماں' کے لئے یہ بات تقریباً" ناقابل یقین تھی لیکن آنٹی نے انہیں یقین دلایا کہ اگر اس نے للی کو اسپرنگ کوٹوں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے خود اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو وہ بھی اس بات پر یقین نہ کرتی کہ وہ جھوٹ بول رہی تھیں۔ آنٹی نے نتیجہ نکالا تھا کہ ضرور حینا نے جھوٹ گھڑے ہوں گے اور للی کو سکھائے ہوں گے۔ ہر طرح سے یہ بات بہت اذیت ناک تھی اور ماں نے انہیں سختی سے سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن جب لڑکیاں اندر آئیں تو ماں کے لئے غصے میں نظر آنا مشکل ہو گیا اور ہر بات ایک بڑے سے قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اتنی مضحکہ خیز چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اولگا نے نہایت سنجیدگی سے جیسے یہ کوئی بہت ہی خاص واقعہ ہو' صورتحال کی وضاحت شروع کی۔ "انہوں نے پورے قصبے کا چکر لگایا اور ہر کسی نے یہی سمجھا کہ وہ اونچے طبقے کی کوئی خاتون تھی اور حینا اور للی

اس کی بیٹیاں تھیں۔"

"کیا واقعی انہوں نے یہی سوچا ہو گا" آنٹی نے لقمہ دیا۔ "ضرور ہر کسی نے پرندے ڈرانے والے بدوضع پتلوں پر قہقہے لگائے ہوں گے جو تم بنی ہوئی ہو۔"

"لیکن کوئی بھی نہیں ہنسا تھا۔ ہر کوئی بہت ہی دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا۔" للی نے پھر وضاحت شروع کی۔ "ایک مرد اور ایک خاتون ہمیں ملے اور انہوں نے تو ایک دوسرے کے ساتھ ہمارے متعلق بات بھی کی تھی، وہ کتنی خوبصورت خاتون ہو گی جس کی ایسی پیاری بیٹیاں ہیں۔"

اتنے میں اولگا کے ذہن میں اپنی ساتھیوں کے متعلق شکوک ابھر چکے تھے اور اس نے اپنا دفاع شروع کیا۔ اس کے پاس واقعی جو زفینا یوسن کا بنایا ہوا ایک اصلی اسپرنگ کوٹ تھا جو تمام اشرافیہ بچوں کے کوٹ تیار کرتی ہے۔

"چلو، ٹھیک ہے، لیکن یہ کیا ہیں؟" ماں نے حینا اور للی کے سویٹروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اور کسی خالص ترین سچ کی طرح للی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا، "نئے اسپرنگ کوٹ! یہ اسی طرح کے کپڑے کے ہیں جس طرح کا ماں کے سویٹروں کا ہے۔ اسی وجہ سے آنٹی بھی یہی سمجھیں کہ وہ ماں کے سویٹر ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یقیناً" اگر ماں چاہیے تو پہننے کے لئے انہیں کسی بھی وقت عارتیا" لے سکتی ہے۔"

کچھ بولنے یا کرنے میں ماں کا اپنا ہی نقصان تھا۔ لیکن باپ نے اسے اور آنٹی کو سمجھایا کہ بچے دروغ گویا جھوٹے نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اپنے "پختہ ایمان پر ڈٹے ہوئے ہیں۔"

چنگیز آئتماتوف / سراب اسلم

ننھا سپاہی

اس نے پہلی بار اپنے باپ کو سینما کے پردے پر دیکھا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ پانچ برس کا تھا۔

یہ واقعہ اس جگہ ہوا جہاں ہر برس بھیڑوں کو مونڈا جاتا تھا۔ سفید رنگ کا یہ شیڈ shed اپنی ہموار چھت کے ساتھ اب بھی ریاستی فارم کے پاس ایک پہاڑ کے نیچے موجود ہے اور سڑک اس کے پاس سے گزرتی ہے۔

وہ وہاں اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ جس کا نام جین گل تھا۔ اس کی والدہ پیشے کے اعتبار سے ایک ٹیلی فونسٹ تھی اور ریاستی فارم کے ڈاکخانے میں تعینات تھی۔

لیکن بھیڑوں کی منڈائی کا سیزن شروع ہونے سے پہلے اسے یہ اضافی کام ملتا تھا جس کے لیے اسے دفتر سے چھٹی لینا پڑتی تھی اور یہ چھٹیاں اس کی سالانہ چھٹیوں میں سے منہا کر دی جاتی تھیں۔ اس کے کام کی نوعیت ایک مددگار کی تھی اور وہ اس کام کے لیے ایک جزوقتی کا معاوضہ پاتی تھی۔ اس طرح کچھ فاضل آمدنی ہو جاتی--- ایک فوجی کی بیوہ ہونے کے باعث اسے تو ایک ایک پیسے کی ضرورت رہتی تھی تاکہ سردیوں کے لیے فالتو ایندھن، آٹا اور دیگر اشیائے ضرورت خرید سکے۔

گھر میں کوئی اور تو تھا نہیں کہ جس کے پاس جین گل اپنے بیٹے کو چھوڑ سکے۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے پر مجبور تھی۔ جب وہ کام میں معروف ہو جاتی تو لڑکا کالے ہاتھ نیلے پاؤں ادھر ادھر کدکڑے مارتا پھرتا اور اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ یہاں بھیڑیں منڈوانے کے لیے آنے والے چرواہے بھی پھر رہے ہوتے اور ان کی بھیڑیں اور کتے بھی----

وہ پہلا لڑکا تھا جس نے فلم دکھانے والے کو آتے دیکھا اور اسے فلم دکھانے کی پروجیکٹر سے لدا پھندا دیکھ کر وہ اچھلنے لگا اور شور مچا مچا کر اپنے ساتھی لڑکوں کو بتانے لگا کہ فلم دکھانے والا آ گیا ہے۔

مصیبت یہ تھی کہ فلم چلانے والے کے آنے کے باوجود فلم چل نہیں سکتی تھی۔ سورج غروب ہونے اور کام بند ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا---- اور اس دوران سہانے خواب ہی دیکھے جا سکتے تھے---!

فلم جنگ کے بارے میں تھی۔ دو لکڑیوں کے درمیان سفید رنگ کا پردہ تانا گیا تھا اور جنگ شروع ہو گئی تھی، توپوں کے دہانے کھل گئے، راکٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور زمین ان کی روشنی سے بقعہ نور بن گئی اور لڑنے والے سپاہی زمین سے چپک گئے۔ جب راکٹ اپنا کام دکھا چکے تو یہ سپاہی آگے بڑھنے لگے۔ اب مشین گنوں کی تڑ تڑ سنائی دینے لگی اور اس کا دل پھٹنے کے قریب پہنچ گیا آخر یہ جنگ تھی بچوں کا کھیل نہیں تھا---!

وہ اور اس کی ماں اون کے بوروں پر چڑھ کر فلم دیکھ رہے تھے۔ دوسرے لوگ ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہاں سے فلم بہتر نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پہلی قطار میں بیٹھ کر فلم دیکھی جاتی تو زیادہ اچھا

تھا' قریبی فارم کے بچے وہیں تو بیٹھے تھے۔۔۔!

اس نے بھاگ کر آگے جانا چاہا مگر اس کی ماں نے اسے پکڑ لیا اور یوں وہ اپنی خواہش پوری نہ کر سکا۔

ماں بولی "بیٹا تم صبح سے شام تک مجھ سے جدا رہتے ہو اور ادھر ادھر اچھلتے کودتے پھرتے ہو۔ اب تو کچھ دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔۔۔!" اور اسے اس کی ماں نے اپنے دامن میں بٹھا لیا۔

پروجیکٹر کی آواز آتی رہی اور فلم چلتی رہی۔ لوگ جنگ کے مناظر میں الجھ کر اپنا اتا پتہ بھول چکے تھے۔۔۔ دل ہلا دینے والے مناظر تھے۔

اس کی ماں نے آہ بھرنے کے بعد اور خوفزدہ ہو کر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ دراصل پردے پر ایک ٹینک تھا جو سیدھا ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی عورت نے عین اسی لمحے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے خدا۔۔۔۔؟"

لیکن وہ ہرگز خوف زدہ نہیں تھا۔ اس پر ردعمل بالکل الٹ ہو رہا تھا۔ بلکہ جب فاشسٹوں پر حملہ ہوتا تو وہ خوش ہوتا لیکن جب کوئی اپنا سپاہی گرتا تو وہ توقع کرتا کہ وہ جلد ہی اٹھ کھڑا ہو گا۔

تاہم جس طرح سے یہ سپاہی گر رہے تھے' تھا خوب منظر۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ وہ جب اپنے ہمجولیوں کے ساتھ جنگ جنگ کھیلتا ہے تو اس کے ساتھی بھی تو اسی طرح گرتے ہیں۔۔۔!

"اس طرح تو میں بھی گر کر دکھا سکتا ہوں۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے۔" اپنے آپ سے اس نے کہا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ پردہ سکرین پر لڑنے والے سپاہی اتنی جلدی نہیں اٹھ رہے جتنی جلدی وہ اور اس کے ساتھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ تو بالکل مٹی کے ڈھیر بن کر پڑے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر اس کی جگہ وہ خود ہوتا تو بالکل مختلف انداز اختیار کرتا' سیدھا زمین پر آ رہنے میں کیا تک ہے۔۔۔؟

چاہئے تو یہ تھا کہ پیٹ کی گولی والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر دوڑا جاتا اور گھاس میں گر کر اپنی بندوق پھینک دی جاتی اور کچھ دیر بعد اعلان کیا جاتا کہ میں تو ابھی زندہ ہوں مرا ہرگز نہیں۔۔۔ مگر یہ کس قسم کے سپاہی ہیں جو گولی لگتے ہی ڈھیر ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا۔

جنگ ہوتی رہی اور پروجیکٹر کی آواز بھی سنائی دیتی رہی اب توپ خانے کے آدمی سکرین پر نظر آنے لگے۔ یہ لوگ گولوں کی بارش میں اور دھوئیں کے بادل میں اپنے اینٹی ٹینک ہتھیاروں کو لیے ہوئے ٹینکوں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی ہلکی توپوں کو ایک ندی سے گزار رہے تھے ان کے سامنے ایک ٹیلا تھا جس نے تقریباً آدھے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ٹیلے پر بارود کی بارش ہو رہی تھی مگر یہ جانباز سپاہی مردانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا اور آگے چل کر اسے توقع تھی کہ اس سے بھی عجیب و غریب منظر دیکھنے کو ملیں گے جو خوفناک بھی ہوں گے اور یادگار بھی۔۔۔۔

وہ تعداد میں سات افراد تھے ان کی وردیاں پھٹی ہوئی تھیں اور دھوئیں سے اٹی ہوئی تھیں توپ خانے کے ان جوانوں میں ایک غیر روسی نظر آ رہا تھا شاید وہ اس کا نوٹس نہ لیتا اگر اس کی ماں اسے یہ کہہ کر متوجہ نہ کرتی

"وہ ہیں تمہارے والد۔۔۔۔۔ ننھے میاں۔۔۔۔!"

بس اس مرحلے ہی سے وہ غیر روسی سپاہی اس کا باپ تھا اور یوں باقی فلم اس کے باپ ہی کے بارے میں تھی۔ اس کا باپ تو بہت ہی نوجوان نظر آ رہا تھا۔ بالکل ان کھلنڈرے لڑکوں کی مانند جو ریاستی فارم پر کام کرتے تھے۔۔۔۔

اس کا باپ کوئی بہت لمبا تڑنگا نوجوان نہیں تھا۔ اس کا چہرہ گول مٹول تھا جس پر تیز طرار سی چمکدار آنکھیں تھیں اور اس وقت اس کی آنکھوں میں وحشت جھلک رہی تھی اس کا چہرہ دھوئیں اور دھول سے اٹا ہوا تھا۔ وہ ایک پھرتیلی بلی کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر چھوٹی توپ کا پہیہ تھا اور وہ گھوم کر اپنے کسی ساتھی کو کہہ کر رہا تھا۔

"گولے چلاؤ۔۔۔۔ گولے۔۔۔۔ جلدی سے!"

اس کی آواز ایک نئے بارودی دھماکے میں دب گئی۔

"امی۔۔۔ وہ میرا باپ ہے ناں؟" لڑکے ایول بیک نے اپنی ماں سے پوچھا لیکن اس کی ماں اس کی بات کو نہ سمجھ سکی اور بولی۔

"کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور دیکھو۔۔۔۔!"

لڑکے نے جواب دیا۔

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ وہ میرا باپ ہے۔۔۔۔؟"

اس کی ماں نے جواب میں کہا۔

"بے شک وہ تمہارا باپ ہے مگر چپ رہو اور دیکھنے والوں کو تنگ نہ کرو۔۔۔!"

اب لڑکا سوچنے لگا کہ اس کی ماں نے ایسا کیوں کہا تھا؟ شاید ویسے ہی اس کی منہ سے نکل گیا ہو' ممکن ہے ماضی کی یادوں کے زیر اثر وہ اپنے شوہر کو یاد کر رہی ہو۔۔۔۔!

پھر وہ خیالات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر آگے نکل گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو معاملہ صاف ہوا۔ وہ لڑکے جو اس کے باپ کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ اپنی آنکھوں سے اس کے باپ کو پردہ سکرین پر دیکھ رہے ہیں اور ان دیکھنے والوں میں پالی بھی شامل ہیں۔۔۔!

بھیڑوں کے پالی۔۔۔ پہاڑوں پر گھومنے والے آوارہ گرد' جن کی بھیڑوں کو ہانکنے میں وہ مدد کیا کرتا تھا۔ جب یہ بھیڑیں مونڈھنے کے لیے لائی جاتی تھیں۔ وہ ان بھیڑوں کو گھیر گھیر کر منڈائی گھر میں لایا کرتا تھا اور کبھی کبھار ان کے لڑتے ہوئے کتوں کو بھی چھڑا دیا کرتا تھا۔ جب پالیوں کے پاس وقت ہوتا تو وہ اس سے بات بھی کر لیا کرتے تھے مثلاً۔

"لڑکے تمہارا کیا نام ہے؟"

"ایول بیک۔۔۔۔!"

"تم کس کے بیٹے ہو!"

"میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں۔۔۔!

"عجیب سا نام ہے۔ توکتوسن؟"

اس پر لڑکا اپنی بات دہراتا اور زور دے کر کہتا۔

"ہاں میں توکتوسن کا بیٹا ہوں۔۔۔!"

یہ نام اس کی ماں نے بتایا تھا اور اس کی بوڑھی نابینا دادی نے بھی یہی حکم دیا تھا کہ وہ یہی جواب دے۔ بلکہ کئی بار اس کے کان بھی کھینچے گئے مگر بھیڑوں کے پالیوں میں سے کوئی کہتا۔

"اچھا ذرا ایک منٹ کے لیے رکو۔۔۔ کیا تم اس ٹیلی فون والی کے بیٹے نہیں ہو؟"

مگر لڑکا جواب دیتا۔ "نہیں۔۔۔۔ میں تو کتوسن کا بیٹا ہوں!"

تب بھیڑوں کا پالی خلا میں گھورنے لگتا اور کچھ سوچ کر کہتا۔

"اصل بات یہ ہے کہ ہم سارا سال تو پہاڑوں میں گزار دیتے ہیں اور تم لڑکے جنگلی گھاس کی طرح بڑھتے ہو' پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے سال بعد۔۔۔ اچھا تو تم تو کتوسن کے بیٹے ہو۔ ٹھیک ہی ہے۔۔۔۔؟"

بھیڑوں کے پالی تھوڑی دیر اور اس کے باپ کے بارے میں باتیں کرتے اور کہتے کہ وہ جوان ہی تھا جب محاذ پر چلا گیا تھا۔ وہ سرگوشیوں میں کہتے اب ان میں سے کسی کسی کو ہی اس کا چہرہ یاد رہ گیا ہے۔ پھر وہ کہتے یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنی یادگار کے طور پر ایک بیٹا چھوڑ گیا۔ بہت سے جوان تو کنوارپن میں ہی محاذ پر چلے گئے تھے اور اب ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں۔۔۔۔!

اس وقت سے جب اس کی ماں نے اسے کہا تھا کہ وہ سپاہی تمہارا باپ ہے' وہ اس سپاہی کو اپنا باپ ہی سمجھ رہا تھا۔ اس کی شکل اس فوٹو سے مشابہ تھی جو اس کے گھر والوں نے فریم کرا کر گھر میں لٹکا رکھی تھی۔

ایول یبک اپنے باپ کو ایک بیٹے کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں اپنے باپ کے لیے محبت کا جذبہ ابھرنے لگا تھا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے باپ کو اپنے بیٹے کے جذبات کا علم ہو گیا ہے اور وہ اب جنگ میں اس طریقے سے حصہ لینے لگا تھا کہ یہ منظر سدا اس کے بیٹے کو یاد رہے اور وہ پچھلی جنگ میں حصہ لینے والے ایک سپاہی کو ہمیشہ یاد رکھے۔

اور اب وہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ جنگ بچوں کا کھیل نہیں ہے جیسا کہ وہ پہلے سمجھتا رہا تھا۔ اب وہ سنجیدگی سے جنگی مناظر کو دیکھ رہا تھا اور قدرے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پہلی بار خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور یہ خوف اس لیے وارد ہوا تھا کہ اس جنگ میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس کا اپنا تھا۔۔۔!

پروجیکٹر اپنا راگ الاپتا رہا۔ جنگ بڑھتی رہی۔

سکرین پر چند ٹینک مستانہ وار آگے بڑھتے دکھائی دینے لگے۔ وہ زمین کو ہاتھیوں کی طرح روند رہے تھے۔ اور بارود برسا رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں اپنے توپ خانے کے آدمی اپنی ہلکی توپوں کو بڑی مشکل سے آگے لے جانے میں کامیاب ہو رہے تھے اور اپنی باقی ماندہ قوت کا آخری حصہ بھی صرف کر رہے تھے۔ وہ اپنی توپوں کو پہاڑی تک لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

"ابو جلدی کرو۔۔۔۔" وہ چیخ اٹھا۔ "ٹینک آ رہے ہیں۔۔۔ جلدی!"

بالآخر وہ توپوں کو پہاڑی پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے اور جھاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔

اب ٹینکوں پر جوابی فائر شروع ہوا۔ ٹینکوں نے بھی گولہ باری تیز کر دی۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ خود جنگ میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں کی گود میں اونچا نیچا ہونے لگا۔ ٹینکوں سے شعلے بلند ہونے لگے اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ ٹینک الٹ پلٹ گئے ان کی آہنی زنجیریں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور پہیئے بے ترتیب ہو گئے اور اب وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا کیونکہ اس کی اپنی طرف کے سپاہی بھی زمین پر گرنے لگے تھے اور اب ان میں سے چند ہی رہ گئے تھے جو متحرک نظر آ رہے تھے۔ اس کی ماں سسکیاں لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چہرہ جل رہا تھا۔

پروجیکٹر ریں ریں کرتا رہا۔ جنگ آگے بڑھتی رہی۔

لڑائی میں اب مزید تیزی آتی چلی گئی۔ ٹینک اور قریب آتے چلے گئے۔ اس کے باپ نے چھلانگ لگائی

اور اپنی توپ سے نیچے آ رہا پھر اس نے اپنی جنگی وائرلیس پر اپنے ساتھی سے کچھ کہا جو سنائی نہ دے سکا۔ اب ایک سپاہی اور گرا اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ زمین سے چپک سا گیا تھا۔ اور زمین اس کے خون سے سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ اب صرف دو آدمی باقی رہ گئے تھے اور ان میں سے ایک اس کا باپ تھا۔۔۔!

ان دونوں نے اپنے ہتھیاروں سے گولے برسائے لیکن ٹینک آگے بڑھتے رہے پھر ایک خوفناک دھماکہ ان کے ہتھیاروں کے عین اوپر ہوا۔ وہ دونوں زمین پر گر گئے پھر ان میں سے ایک ہی اٹھ سکا جو اس کا باپ تھا اس نے اپنے ہتھیار کو پھر لوڈ کیا اور داغ دیا یہ اس کا آخری فائر تھا۔ جواب میں ایک زور دار دھماکہ ہوا اور اس کی ہلکی توپ بے کار ہو کر ایک طرف کو لڑھک گئی مگر اس کا باپ ابھی زندہ تھا اگرچہ اس کے کپڑے چیتھڑوں میں بدل چکے تھے اور اب اس کا باپ ہاتھ میں گرنیڈ پکڑے ٹیک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی بقایا قوت کو جمع کر کے آخری حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"رک جاؤ ابو۔۔۔۔۔۔ اب تم اس کے قریب نہ پہنچ سکو گے!" لڑکا یکدم چلایا۔

سپاہی نے اپنا گرنیڈ والا ہاتھ فضا میں لہرایا اور اس کے چہرے پر نفرت کے آثار اور گہرے ہو گئے۔ اس مرحلے پر اس کی ماں نے اس کا ہاتھ زور سے کھینچا اور وہ بے دم سا ہو گیا کیونکہ ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے کھینچا گیا تھا اور اب اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر اپنے باپ کے پاس چلا جائے۔ عین اسی لمحے ٹینک کا ایک گولہ آیا اور اس باپ ایک ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرا۔ اور اس کی ذاتی حفاظت کے ہتھیار ایک طرف کو لڑھک گئے۔

پروجیکٹر رک گیا۔ جنگ رک گئی۔

پروجیکٹر آپریٹر نے بلب روشن کر دیا تاکہ اس کی روشنی میں ریل کو لپیٹ سکے جونہی بلب روشن ہوا لوگ فلم کی دنیا سے حقیقی دنیا میں آ گئے۔ روشنی کی وجہ سے وہ پلکیں جھپک رہے تھے اور اسی اثناء میں وہ اون کے بوروں سے نیچے آ چکا تھا۔ اب وہ چلا رہا تھا۔

"لوگو تم نے دیکھا۔۔۔۔ وہ میرا باپ تھا۔۔۔۔ انہوں نے میرے باپ کو مار ڈالا!!!" لیکن لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی بات کو سمجھ نہ پایا۔ وہ سکرین کی طرف فاتحانہ انداز میں بھاگ اٹھا جہاں اس کے ہم عمر دوست لڑکے بیٹھے ہوئے تھے اور جن کی رائے کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

کچھ دیر کے لیے وہاں ایک عجیب خامشی سی طاری رہی۔ لوگ اس ننھے منے لڑکے کی خوشی کو سمجھ نہ پا رہے تھے جس نے اپنا باپ پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے اور اپنے کندھوں کو اس طرح جنبش دے رہے تھے جیسے حیران ہو رہے ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

پروجیکٹر والے نے اپنا کام جاری رکھا مگر ننھے سپاہی نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور وہ کہتا چلا گیا۔

"تم نے دیکھا نہیں۔۔۔؟ انہوں نے اس کو مار ڈالا۔ وہ میرا باپ تھا۔۔۔!"

اس کے جذبات کی شدت دیدنی تھی۔ کیونکہ لوگ ابھی تک بے حس بیٹھے ہوئے تھے اور کوئی ردعمل ظاہر نہ کر رہے تھے اور ننھا سپاہی حیران ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اس کی خوشی میں شامل کیوں نہیں ہو رہے۔ وہ اس کے باپ پر فخر کا اظہار کیوں نہیں کر رہے؟"

اس بار اس کے شور مچانے کا ردعمل ظاہر ہوا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی نے بے زاری سے کہا۔

"اس طرح کی باتیں نہیں کیا کرتے برخوردار۔۔۔۔۔!"
لیکن حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا۔
"لیکن اس نے کہا کیا ہے جس پر اعتراض ہو رہا ہے بڑے میاں۔۔۔۔! اس کا باپ جنگ میں مارا گیا۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"
اسی دوران ایول بیک کے ایک پڑوسی لڑکے نے اس ہر پیچ کے انکشاف کا فیصلہ کر لیا اور بولا۔
"وہ تمہارا باپ نہیں تھا۔۔ بلکہ وہ تو ایک ایکٹر تھا۔ تم پروجیکٹر آپریٹر سے پوچھ لو۔۔۔!"
عمر رسیدہ لوگ لڑکے کو اس کی عارضی خوشی سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ امید کر رہے تھے کہ پروجیکٹر آپریٹر لڑکے کا خواب نہیں بکھیرے گا لیکن آپریٹر اپنے کام میں مصروف رہا اور کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔
لیکن وہ چلایا۔
"نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔ وہ میرا باپ ہی تھا۔۔۔!"
پڑوسی لڑکا آگے بڑھا اور بولا۔
"کون تھا تمہارا باپ۔۔۔۔ بتاؤ تو سہی؟"
"وہ جو ہاتھ میں گرنیڈ لئے ٹینک کی طرف بڑھ رہا تھا۔" اس نے جواب دیا اور قدرے رک کر وہ پھر بولا۔
"اور وہ اس طرح زمین پر گر گیا تھا۔۔۔۔۔!" اس نے زمین پر گر کر دکھایا۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔
موجود لوگوں کے درمیان ایک قہقہہ گونجا۔ لیکن وہ ایک مردہ سپاہی کی طرح زمین پر پڑا رہا وہ قہقہے میں شامل نہ ہوا۔ ایک بار خاموشی طاری ہو گئی۔
"جین گل یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔؟" ایک بھیڑیں پالنے والی عورت نے اس کی ماں سے سوال کیا اور اس کی ماں نے کوئی جواب دینا مناسب خیال نہ کیا بلکہ وہ قدرے خفگی کے عالم میں اپنی جگہ چھوڑ کر اپنے بیٹے کی طرف چل پڑی۔
اس وقت اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔۔۔!
آگے بڑھ کر اس کی ماں نے اسے زمین سے اٹھایا اور کہا۔
"آؤ بیٹا چلتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہارا باپ ہی تھا!"
آخری الفاظ اس کی ماں نے آہستگی سے ادا کئے اور اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔
آسمان پر چاند بلند ہو چکا تھا اور رات کی پہنائیوں میں پہاڑوں کی بلندیاں نیلاہٹ لئے دمک رہی تھیں۔
اور اب پہلی بار اس لڑکے کو احساس ہوا کہ یتیم ہو جانے کا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔! اس کے سینے میں درد اور دکھ کے طوفان اٹھ رہے تھے اور اسے جنگ میں مارے جانے کا مفہوم سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو اپنے بازوؤں میں لپٹا لے اور اٹھا کر اپنے ساتھ لے کر چلے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اور خاموش رہا۔ اس کی ماں بھی پر سکون رہی۔۔۔ اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنے کے لیے۔۔۔۔!
شاید اس لڑکے کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کا وہ باپ جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ اب اس کے اندر زندہ رہے گا۔۔۔۔!!!

گیبریل گارسیا مارکیز/ اجمل کمال

خواب دیکھنے والی

صبح کے نو بجے' جب ہم ہوانا کے ہوٹل ریویئرا کے ٹیرس میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے' یک لخت سمندر میں ایک دہشت ناک لہر اٹھی۔۔۔ حالانکہ دن دھوپ بھرا اور پرسکون تھا۔۔ اور ایک بڑے شور کے ساتھ ہم پر آ پڑی۔ اتنی زبردست لہر تھی کہ اس نے ساحل پر سے گزرتی ہوئی کاروں کو' اور نزدیک پارک کی ہوئی کچھ کاروں کو بھی' اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا اور ہمارے ہوٹل کے پہلو میں دے مارا۔ ڈائنامائٹ کا سا دھماکا تھا جس نے ہمارے ہوٹل کی عمارت کی بیس منزلوں میں سراسیمگی پھیلا دی اور لابی کو ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ ہوٹل میں مقیم بہت سے مسافر جو وہاں بیٹھے تھے' فرنیچر کی طرح زیر و زبر ہو گئے اور کئی ایک کو ٹوٹے ہوئے شیشوں کی بوچھاڑ نے زخمی کر دیا۔ وہ یقیناً نہایت غیر معمولی قامت کی طوفانی لہر رہی ہو گی' گو ہوٹل کی عمارت کو سمندر کی جانب ایک دیوار اور اس سے آگے ایک چوڑی دو طرفہ سڑک نے حفاظت میں لے رکھا تھا' مگر لہراتی قوت سے حملہ آور ہوئی کہ شیشے کی دیواروں والی لابی کو نیست ونابود کر دیا۔

کیوبن رضاکار' مقامی فائر بریگیڈ کی مدد سے فوراً ملبے کو سمیٹنے میں لگ گئے اور چھ گھنٹے سے کم وقت میں' ہوٹل کے سمندر کی جانب کھلنے والے پھاٹک کو بند کر کے اور ایک متبادل راستا کھول کر' انہوں نے ہر چیز کو معمول کے مطابق کر دیا۔ اس پورے وقت میں کسی کی توجہ اس کار کی طرف نہ گئی جو ہوٹل کی دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی تھی' اور سب اسے ان گاڑیوں میں شمار کرتے رہے جو سڑک کے کنارے پارک کی ہوئی تھیں۔ جس وقت اسے کرین کی مدد سے ہٹایا جانے لگا تو اندر ایک عورت کی لاش کی موجودگی کا انکشاف ہوا جسے سیٹ بیلٹ نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ اس کے جسم کی کوئی ایک ہڈی بھی ٹوٹنے سے نہ بچی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ اور ناقابل شناخت تھا' پنڈلیوں تک لمبے بوٹ سلائی پر سے ادھڑ گئے تھے اور لباس دھجی دھجی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی جو سلامت رہ گئی تھی۔ انگوٹھی سانپ کی شکل میں بنی ہوئی تھی اور سانپ کی آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے۔ پولیس نے پتا لگایا کہ وہ عورت نئے پرتگالی سفیر اور اس کی بیوی کی گھریلو ملازمہ تھی۔ درحقیقت وہ ان کے ساتھ پندرہ روز پہلے ہی وہاں پہنچی تھی اور اس صبح ان کی نئی کار میں بازار جانے کے لیے نکلی تھی۔ جب میں نے اخباروں میں اس واقعے کے بارے میں پڑھا تو اس عورت کے نام نے مجھ میں ردعمل پیدا نہ کیا لیکن اس انگوٹھی کے ذکر نے مجھے متجسس کر دیا جو سانپ کی شکل کی تھی اور جس میں آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے۔ مگر بدقسمتی سے میں یہ نہ جان سکتا تھا کہ انگوٹھی کون سی انگلی میں تھی۔

یہ ایک بے حد اہم تفصیل تھی' مجھے اندیشہ تھا کہ یہ عورت وہ ہے جس سے میں واقف رہا ہوں اور جسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا' اگرچہ مجھے اس کا نام کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ وہ بھی سانپ کی شکل کی انگوٹھی

پہنتی تھی جس میں آنکھوں کی جگہ زمرد جڑے ہوئے تھے، لیکن وہ اسے ہمیشہ اپنی پہلی انگلی میں پہنا کرتی تھی جو اس زمانے میں بھی ایک غیر از معمول بات تھی۔ میں اس سے چھیالیس سال پہلے ویانا میں ملا تھا جب وہ ایک مے خانے میں، جہاں لاطینی امریکی طلبا بہت آیا کرتے تھے، ساج اور ابلے ہوئے آلو کھانے اور پیپے سے براہ راست بیئر پینے میں مشغول تھی۔ میں اسی صبح روم سے وہاں پہنچا تھا اور مجھے آج تک وہ تاثر یاد ہے جو اس کے اوپیرا کی مغنیہ کے سے بھرے بھرے سینے، اس کے کوٹ کے کالر کے گرد جمع جھولتی ہوئی پشموں اور سانپ کی شکل کی اس مصری انگوٹھی نے مجھ پر طاری کیا تھا۔ وہ کسی ہانپتے ہوئے دکان دار کے سے انداز میں بہت ابتدائی قسم کی ہسپانوی بول رہی تھی اور میں نے اسے آسٹریائی۔۔ اس طویل میز کے گرد بیٹھے ہوئے تمام لوگوں میں واحد آسٹریائی۔۔۔ فرض کر لیا۔ میرا خیال غلط نکلا وہ کولوبیا میں پیدا ہوئی تھی اور اس نے دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں موسیقی اور گائیگی سیکھنے کی غرض سے آسٹریا کا سفر اختیار کیا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ رہی ہو گی اور وہ اپنے وقت سے پہلے ہی ڈھلنے لگی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا اور علاوہ ازیں، وہ میری جان پہچان کے سب سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والے افراد میں سے تھی۔

اس زمانے میں۔۔ یعنی سن چالیس کی دہائی کے اواخر میں۔۔ ویانا کی حیثیت ایک قدیم دارالسلطنت سے زیادہ کی نہ رہ گئی تھی جسے تاریخ نے دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں رونما ہونے والی دو باہم منحرف دنیاؤں کے درمیان واقع ایک دور افتادہ علاقائی صدر مقام میں بدل ڈالا تھا اور جو بلیک مارکیٹ اور بین الاقوامی جاسوسی کی جنت کی طرح تھا۔ میں اس سے زیادہ موزوں گرد و پیش کا اپنی اس سرگرداں ہم وطن کے لیے تصور نہیں کر سکتا تھا جو نکڑ کے اس مے خانے میں محض اپنی اصل سے دور ہونے کی بے قراری میں آیا کرتی تھی، حالانکہ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے اس میں آنے جانے والوں سمیت، خرید سکتی تھی۔ اس نے ہمیں اپنا اصل نام کبھی نہیں بتایا، ہم سب اسے ہمیشہ زبان کو بل دینے والے اس جرمن نام سے یاد کیا کرتے تھے جو لاطینی امریکی طلباء نے اس کے لیے وضع کیا تھا، فراؤ فریڈا، جوں ہی میرا اس سے تعارف ہوا، میں اس سے یہ سوال کرنے کی اتفاقیہ جسارت کر بیٹھا کہ وہ کولوبیا کے خطے کی نیدو کے، تیز ہوا کے جھکڑوں کی زد میں واقع پہاڑی مقام سے دنیا کے اس حصے میں کیوں کر آ پہنچی۔ اس نے حقیقت گویانہ انداز میں جواب دیا "میں معاوضے پر لوگوں کے لیے خواب دیکھتی ہوں۔"

یہ اس کی معاش تھی۔ وہ کالداس کے قدیمی علاقے کے ایک خوشحال دکاندار کے گیارہ بچوں میں تیسری تھی، اور بولنے کی عمر کو پہنچنے تک یہ عادت اختیار کر چکی تھی کہ ناشتے سے پہلے۔۔۔۔ جب اس کے بیان کے مطابق، اس کی پیش گوئی کی قوت اپنی خالص ترین صورت میں ہوتی تھی۔۔۔ اپنے تمام خواب گھر والوں کو سنایا کرتی تھی۔ سات برس کی عمر میں اس نے خواب دیکھا کہ ایک طوفانی ریلا اس کے ایک بھائی کو بہا لے گیا ہے۔ اس کی ماں نے محض اعصابی وہم زدگی کے زیر اثر، اپنے بیٹے کو اس کے سب سے پر لطف شغل، یعنی پہاڑی تالاب میں تیرنے کی ممانعت کر دی۔ لیکن فراؤ فریڈا اپنی پیش گوئیوں کی تعبیر کرنے کا اپنا نجی نظام اس وقت تک وضع کر چکی تھی۔

"خواب کا مطلب یہ نہیں ہے۔" اس نے وضاحت کی "کہ وہ ڈوب کر مرے گا، بلکہ یہ ہے کہ اسے مٹھائیاں نہیں کھانی چاہئیں۔"

یہ تعبیر ایک سخت سزا سے کم نہ تھی، خصوصاً پانچ سالہ لڑکے کے لیے جو اتوار کے دن کی ان شیرینیوں کے بغیر زندگی کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ماں نے جسے اپنی بیٹی کی غیبی صلاحیت پر مکمل اعتقاد تھا، اس کے فرمان کو پوری طرح نافذ کیا۔ بدقسمتی سے بس ایک لمحے کی چوک ہو گئی۔ لڑکے کے حلق میں ایک لڈو پھنس گیا اور اس کی جان نہ بچ سکی۔

فراؤ فریڈا نے اس وقت تک کبھی گمان نہ کیا تھا کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو روزی کمانے کے لیے استعمال کر سکتی ہے جب زندگی نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس نے ویانا کے شدید جاڑوں میں، اس پہلے مکان کی گھنٹی پر انگلی رکھی جس میں رہنے کو اس کا جی چاہا۔ جب پوچھا گیا کہ وہ کیا کام کر سکتی ہے، تو اس نے یہ سادہ جواب دیا "میں خواب دیکھتی ہوں۔" ایک مختصر سی وضاحتی گفتگو کے بعد خاتون خانہ نے اسے ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ اگرچہ معمولی جیب خرچ سے زیادہ نہ تھی، لیکن رہنے کو ایک عمدہ کمرہ اور تین وقت کا کھانا اس کے علاوہ تھا۔ ان کھانوں میں سب سے بڑھ کر ناشتہ تھا، جب گھر کے سب لوگ اپنی اپنی فوری تقدیر سننے بیٹھتے۔ باپ، جو ایک نفیس شخصیت والا سرمایہ کار تھا، ماں، جو رومانی چیمبر موسیقی کی دل دادہ ایک خوش طبع عورت تھی اور دو بچے جو بالترتیب گیارہ اور نو برس کی عمر کے تھے۔ وہ سب مذہبی خیال کے تھے، اور اس باعث قدیم توہمات کے زیر اثر آنے کی حس رکھتے تھے۔ فراؤ فریڈا کی گھر میں آمد سب کے لیے خوشی کی بات تھی۔ بشرطیکہ وہ ہر روز اپنے خوابوں کے ذریعے ان کی تقدیر کا انکشاف کیا کرے۔

اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، خصوصاً فوری بعد آنے والے جنگ کے برسوں میں، جب حقیقت کسی بھی بھیانک خواب سے زیادہ سنگین تھی۔ ہر صبح ناشتے کی میز پر یہ فیصلہ بلاشرکت غیرے اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس روز کیا کرے گا اور کس طرح کرے گا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی پیش گو آواز نے گھر کی واحد حاکمانہ آواز کی حیثیت اختیار کر لی۔ گھرانے پر اس کی حاکمیت مطلق تھی، خفیف سے خفیف جنبش بھی اس کے حکم کی محتاج تھی۔ باپ کا انتقال میرے ویانا آنے سے ذرا ہی پہلے ہوا تھا اور اس نے موزوں شائستگی سے کام لیتے ہوئے اپنی دولت کا ایک حصہ فراؤ فریڈا کے نام چھوڑا تھا۔ شرط وہی تھی کہ جب تک اس کی یہ صلاحیت اسکا ساتھ نہ چھوڑ دے وہ گھر والوں کی تقدیر کے انکشاف کے لیے خواب دیکھنا جاری رکھے گی۔

ویانا میں میں نے ایک مہینہ ایک ایسے طالب علم کے طور پر گزارا جسے کبھی نہ آنے والی رقم کا انتظار تھا۔ ے خانے میں فراؤ فریڈا کی غیر متوقع اور کشادہ دست آمد ہماری تنگ مایہ اقلیم میں ایک جشن کی طرح ہوتی تھی۔ ایک رات، جب ہمارے اردگرد بیئر کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی، اس نے آکر مجھ سے اتنے تیقن کے ساتھ سرگوشی کی کہ میرے لیے اس کی بات پر توجہ نہ دینا ناممکن ہو گیا۔

"میں خاص طور پر تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں نے کل رات تمہیں خواب میں دیکھا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم اسی وقت ویانا سے چلے جاؤ اور پانچ سال تک یہاں واپس نہ آنا۔"

اس کا لہجہ اتنا محکم تھا کہ اس نے مجھے اسی رات روم جانے والی آخری ٹرین میں سوار کرا دیا۔ میں اتنا دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کے بعد سے رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسے سانحے سے بچ نکلا ہوں جو مجھے پیش نہیں آیا۔ میں نے آج تک ویانا میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔

ہوانا والے حادثے سے پہلے فراؤ فریڈا سے میری ایک بار اور ملاقات ہوئی تھی۔ بارسلونا میں اس سے مڈبھیڑ اتنی غیر متوقع تھی کہ مجھے خاص طور پر پراسرار معلوم ہوئی۔ یہ وہ دن تھا جب پابلو نیرودا نے، چلے کی شہر

والپریزو کی جانب اپنے طویل بحری سفر میں ایک وقفے کے دوران' خانہ جنگی کے بعد سے پہلی بار ہسپانوی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اس نے صبح کا وقت ہمارے ساتھ قدیم کتابوں کی دکانوں میں' گویا کسی کم یاب شکار کی تلاش میں گزارا۔ اس نے بالا خر اڑتی ہوئی روشنائی اور پھٹی ہوئی جلد والی ایک کتاب خریدی اور اس کے لیے جو رقم ادا کی وہ رنگون میں چیلے کے قونصل خانے کی دو مہینے کی تنخواہ کے برابر تو ضرور رہی ہو گی۔ وہ کسی گٹھیا کے مریض ہاتھی کی طرح رک رک کر پرشور انداز میں چلتا رہا اور اپنی نگاہ کے سامنے آنے والی ہر شے کے اندرونی کل پرزوں اور کام کرنے کے طریقوں سے بچوں کی سی دلچسپی ظاہر کرتا رہا۔ دنیا اسے ہمیشہ چابی سے چلنے والا ایک بڑا سا مشینی کھلونا دکھائی دی۔

میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں جانا جو نشاۃ الثانیہ کے زمانے کے پوپ کی اکتسابی شکل و صورت سے --- یعنی پرخوری اور تہذیب نفس کے آمیزے سے -- اس قدر قریبی مشابہت رکھتا ہو جتنا یہ شخص جو کسی بھی میز پر بیٹھتا' نہ چاہتے ہوئے بھی صدر نشیں اور حاکم کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ اس کی بیوی ماتیلدا نے اس کے گلے کے گرد ایک بب سی باندھ دی جو کسی ریستوران کے نیپکن سے زیادہ حجام کی دکان کا ایپرن دکھائی دیتی تھی' لیکن یہ اسے شوربے اور چٹنی میں نہا جانے سے روکنے کا واحد طریقہ تھا۔ اس روز نیرودا نے تین سالم لوبسٹر کسی سرجن کی سی باریک بین توجہ کے ساتھ قطع کر کے' کھائے اور اس دوران ہر شخص کی ڈش کو حرص آمیز نگاہوں ہی نگاہوں میں نگلتا رہا' یہاں تک کہ ہر پلیٹ میں سے کچھ نہ کچھ لینے کی ترغیب نے اسے مغلوب کر لیا۔ گالیسیا کے گھونگے' کنتابریا کی۔ بطخیں' الی کانتے کے جھینگے' کوستابراوا کی سور ڈش --- اور یہ سب اس نے ایسی اشتہا کے ساتھ کیا جسے ہر شخص نے متعدی پایا۔ تمام وقت وہ فرانسیسیوں کی طرح' دوسرے خوش مزہ کھانوں کی' خصوصاً چیلے کی ماقبل تاریخ شیل فش کی باتیں کرتا رہا جو اسے سب کھانوں سے زیادہ مرغوب تھی۔ کھاتے کھاتے اچانک وہ رک گیا' اس کے کان لوبسٹر کے انٹینوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور اس نے مجھ سے سرگوشی کی۔

"میرے پیچھے کوئی شاعر بیٹھا ہے جو مجھے متواتر گھور رہا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے نظر ڈالی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے' تین میزیں چھوڑ کر' ایک عورت پرانے فیشن کا کینوس کا ہیٹ اور جامنی سکارف پہنے سکون سے بیٹھی آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی اور اس کی نگاہ نیرودا پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ بوڑھی اور فربہ ہو گئی تھی لیکن وہ وہی تھی' اپنی پہلی انگلی میں سانپ کی شکل کی انگوٹھی سمیت۔

وہ نیپلز سے اسی کشتی پر چلی آ رہی تھی جس پر نیرودا اپنے کنبے کے ساتھ سفر کر رہا تھا' لیکن سفر کے دوران ان کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ کافی پینے کے لیے اپنی میز پر بلا لیا اور میں نے اسے دعوت دی کہ وہ شاعر کو محظوظ کرنے کی خاطر ہی سہی' اپنے خوابوں کے بارے میں گفتگو کرے۔ لیکن شاعر اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا' اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اسے خوابوں کے الوہی ہونے پر قطعاً" اعتقاد نہیں۔

"صرف شاعری پیش آگہی کی صلاحیت رکھتی ہے۔" اس نے کہا۔

دوپہر کے کھانے اور رمبلاس کے کنارے کی ناگزیر سیر کے بعد میں جان بوجھ کر فراؤ فریڈا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ذرا پیچھے رہ گیا تاکہ ہم دوسروں کی سماعت سے باہر اپنی شناسائی کی تجدید کر سکیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آسٹریا میں اپنی جائیداد بیچ کر پرتگال کے شہر پورتو منتقل ہو گئی ہے اور وہاں ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہے جو

اس کے الفاظ میں ایک نقلی قلعہ ہے جو ایک اونچی چٹان پر بنا ہوا ہے جہاں سے وہ پورے بحرِاوقیانوس کو' امریکا تک' دیکھ سکتی ہے۔ یہ واضح تھا' اگرچہ اس نے کھل کر کہا تھا' کہ خوابوں کے ذریعے سے رفتہ رفتہ اس نے اپنے سابقہ ویانیز مالکوں کی تمام جائیداد کی ملکیت حاصل کرلی ہے۔ اس کے باوجود میں متاثر نہ ہوا' صرف اس وجہ سے کہ میں نے ہمیشہ اس کے خوابوں کو پیسہ کمانے کی شعوری کوشش خیال کیا تھا۔ میں نے یہ بات اسے بتا بھی دی۔

وہ اپنے مخصوص' مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسی۔ تم ہمیشہ کی طرح ڈھیٹ ہو۔" اس نے کہا۔ ہمارے بقیہ ساتھی اب نیرودا کے انتظار میں ٹھہر گئے تھے جو پرندوں کی دکان میں طوطوں سے چیلیے کی بول چال کی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ جب ہم نے اپنی بات چیت دوبارہ شروع کی تو فراؤ فریڈا نے موضوع بدل دیا۔

"ویسے" وہ بولی' "تم چاہو تو اب ویانا واپس جاسکتے ہو۔"

اس پر مجھے احساس ہوا کہ ہماری پہلی ملاقات کو تیرہ برس ہو چکے ہیں۔

"حالانکہ تمہارے خواب غلط ہیں' مگر میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔" میں نے اسے بتایا۔ "کیا پتا!"

تین بجے میں اس سے جدا ہو کر نیرودا کے ساتھ چلا تاکہ وہ ہمارے گھر میں اپنا متبرک قیلولہ کر سکے' جسے اس نے کئی بے حد سنجیدہ ابتدائی رسومات کے بعد شروع کیا جن سے مجھے کسی وجہ سے جاپانیوں کی چائے کی تقریب کا خیال آیا۔ بعض کھڑکیاں کھلی جاتی تھیں' بعض بند کیجاتی تھیں۔ ایک مخصوص درجہ حرارت بہت ضروری تھا۔۔ اور صرف ایک مخصوص زاویے سے آنے والی مخصوص قسم کی روشنی قابل برداشت تھی۔ اور اس کے بعد انتہائی مکمل خاموشی۔ نیرودا فوراً ہی سو گیا اور جیسے بچے کرتے ہیں' دس منٹ بعد' جب ہمیں اس کی ذرا بھی توقع نہ تھی' اٹھ بیٹھا۔ جب وہ لونگ روم میں داخل ہوا تو تازہ دم تھا اور تکیے کے غلاف کا مونوگرام اس کے رخسار پر چھپا ہوا تھا۔

"میں نے خواب دیکھنے والی عورت کو خواب میں دیکھا۔" وہ بولا۔

ماتیلدا نے اس سے ہمیں اپنا خواب سنانے کو کہا۔

"میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہی ہے۔" وہ بولا۔

"یہ تو بورخیس کی طرح لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے اترے ہوئے منہ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "کیا اس نے لکھ دیا ہے؟"

"اگر نہیں لکھا ہے تو ایک نہ ایک دن ضرور لکھے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ اسی کی بھول بھلیوں میں سے ایک ہوگی۔"

اس سہ پہر چھ بجے نیرودا جوں ہی جہاز پر سوار ہوا' اس نے ہم سے الوداعی کلمات کہے' دور کی ایک میز پر جا بیٹھا اور سبز روشنائی والے اسی قلم سے شعر لکھنے لگا جسے وہ اپنی کتابوں پر دستخط کرتے وقت پھول' مچھلیاں اور پرندے بنانے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ روانگی کا پہلا اعلان ہوتے ہی ہم نے جہاز میں فراؤ فریڈا کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے سیاحوں کے عرشے پر اس وقت پایا جب ہم مایوس ہو کر تلاش کو خیرباد کہنے کو تھے۔ وہ بھی ابھی ابھی قیلولے سے بیدار ہوئی تھی۔

"میں نے خواب میں تمہارے شاعر کو دیکھا۔" اس نے ہمیں بتایا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے خواب سنانے کو کہا۔

"میں نے دیکھا کہ وہ خواب میں مجھے دیکھ رہا ہے۔" اس نے کہا اور میرے چہرے پر بے یقینی کا تاثر دیکھ

کر گزبڑا سی گئی۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟ کبھی کبھی تمام خوابوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کے بعد نہ کبھی اسے دیکھا نہ اس کے بارے میں سوچا۔ پھر میں نے سانپ کی شکل کی اس انگوٹھی کا ذکر پڑھا جو سمندری حادثے میں ہوٹل ریویرا کے قریب ہلاک ہونے والی عورت کی انگلی میں پائی گئی۔ جب چند ماہ بعد ایک سفارتی استقبالیے میں میری ملاقات پرتگالی سفیر سے ہوئی تو میں اس سے اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

سفیر نے اس عورت کا ذکر جذبے اور بے پناہ ستائش کے ساتھ کیا۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ وہ عورت کتنی غیر معمولی تھی۔" وہ بولا۔ "تم اس پر کہانی لکھنے کی ترغیب کی مزاحمت نہ کرپاتے۔" وہ اسی رو میں بولتا رہا۔ کبھی کبھار درمیان میں کوئی حیران کن تفصیل آتی لیکن اس گفتگو کے ختم ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔

"اچھا، مجھے یہ بتاؤ۔" میں نے بالآخر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کہ وہ کام کیا کرتی تھی۔"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے تسلیم و رضا کے انداز میں کندھے جھٹک کر جواب دیا۔ "وہ بس خواب دیکھتی تھی۔"

گیبریل گارسیا مارکیز / وجاہت مسعود

مونتیل کی بیوہ

جوزے مونتیل کے مرنے پر اس کی بیوہ کے سوا ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا۔ گو ان سب کو یہ یقین کرنے میں کئی گھنٹے لگے کہ مونتیل واقعی مرچکا ہے۔ بہت سوں کو تو تنور کی طرح تپتے کمرے میں چادروں اور تکیوں کے درمیان اس کی تربوز ایسی گول مول لاش کو پیلے تابوت میں ٹھنسا ہوا دیکھ کر بھی اس کی موت کا یقین نہیں آیا۔ اس کی شیو بالکل تازہ معلوم ہوتی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، مصنوعی چمڑے کے جوتے پہنے مونتیل ایسا تندرست تو کبھی زندگی میں بھی نہ لگا تھا۔ یہ وہی مونتیل تھا جو ہر اتوار کو آٹھ بجے صبح عبادت کے لئے گرجا میں موجود ہوتا تھا البتہ آج اس نے ہاتھ میں گھڑسواری کی چھڑی کی بجائے صلیب تھام رکھی تھی۔ خیر جب تابوت پر تختہ جما کر اسے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تو قصبے والوں کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ مرنے کا ڈھونگ نہیں رچا رہا تھا بلکہ واقعی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ تدفین کے بعد اس کی بیوہ کے علاوہ ہر شخص کے لئے تعجب کی بات صرف یہ رہ گئی کہ وہ طبعی موت کیسے مرگیا۔ ہر شخص کے دل میں یہی توقع تھی کہ مونتیل گھات میں بیٹھے کسی شخص کی گولی لگنے سے مرے گا جبکہ اس کی بیوہ کو امید تھی کہ اس کو بڑھاپے میں بستر مرگ پر پادری کے سامنے اعترافات کے بعد کسی برگزیدہ شخص کی طرح پرسکون موت آئے گی۔ اس کا یہ اندازہ صرف چند تفصیلات میں غلط ہوا۔ مونتیل اپنے جھولے دار بستر میں دو اگست ۱۹۵۱ء کو سہ پہر کے دو بجے مرا۔ موت کا باعث برہمی اور غصہ کا دورہ تھا۔ ڈاکٹر پہلے ہی ایسے دوروں کے خطرناک نتائج سے خبردار کر چکا تھا۔ خیر اس کی بیوی کا تو یہ بھی خیال تھا کہ جنازے کو کندھا دینے کے لئے پورا قصبہ امڈ آئے گا اور پھولوں کی تعزیتی چادروں کے لئے گھر کا صحن چھوٹا پڑ جائے گا اور ہوا یہ کہ صرف اس کی اپنی سیاسی جماعت کے کارکنوں اور اسکے مذہبی فرقے کے ارکان نے جنازے میں شرکت کی۔ قبر پر ڈالنے کے لئے پھولوں کی چادریں صرف وہی تھیں جو میونسپل کمیٹی والوں نے بھجوائی تھیں۔ مونتیل کے بیٹے نے جو جرمنی میں کونسل کے عہدے پر فائز تھا اور پیرس میں مقیم دو بیٹیوں نے تین تین صفحے کے تار بھجوائے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان سب نے تار گھر کی روشنائی کو فراخدلی سے استعمال کر کے وہ تار تحریر کئے تھے اور یہ کہ تاروں کی آخری عبارت ترتیب دینے سے قبل انہوں نے کتنے ہی فارم پھاڑ کر پھینکے ہوں گے اور یوں ہر تار میں بیس ڈالر کا مواد اکٹھا کیا گیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی واپس آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس رات باسٹھ برس کی عمر میں مونتیل کی بیوہ نے آزردگی کا مزا چکھا۔ وہ اس تکئے پر سر رکھ کر رو دی جس پر وہ خوشیوں سے ہمکنار کرنے والا آرام کیا کرتا تھا۔ "میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے گھر میں قید کر لوں گی۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "میں ان سب کے لئے مونتیل کے ساتھ ہی مرچکی۔ میں اب اس دنیا کے بارے میں مزید نہیں جاننا چاہتی۔"

اپنی توہم پرستی کے ہاتھوں لاچار یہ کمزور سی عورت دل کی بری نہیں تھی۔ مونتیل وہ پہلا شخص تھا جسے تیس

فٹ سے کم فاصلے سے دیکھنے کی اسے اجازت ملی تھی اور پھر اس کے باپ نے صرف بیس سال کی عمر میں مونتیل ہی سے اس کی شادی کر دی۔ اسے کبھی دنیا کے حقائق سے تعلق پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مونتیل کے چلے جانے کے تین دن بعد آنسو بہاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اسے اپنے آپ کو سمیٹنا ہو گا لیکن وہ اس نئی زندگی کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر رہی۔ اسے از سر نو جینا شروع کرنا تھا۔ مونتیل اپنے ساتھ قبر میں جو ان گنت راز لے گیا تھا ان میں تجوری کے نمبروں کی ترتیب بھی تھی۔ قصبے کے میئر نے تجوری کھلوانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اس نے حکم دیا کہ تجوری کو صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے اور دو سپاہی تالے پر فائر کریں۔

پوری صبح مونتیل کی بیوہ اپنے سونے کے کمرے میں لیفٹی میئر کے احکام پر گولیوں کی دبی دبی آواز سنتی رہی۔

"حد ہو گئی" اس نے سوچا "میں پانچ سال خدا سے دعائیں کرتی رہی کہ قصبے میں گولیاں چلنی بند ہوں اور آج میرے ہی گھر میں گولیاں چل رہی ہیں اور مجھے اس کے لئے لوگوں کا شکر گزار ہونا پڑے گا۔"

اس روز مونتیل کی بیوہ نے بڑے خلوص سے موت کی دعا مانگی مگر موت اس پر مہربان نہ ہوئی جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی تو آنگن میں ہونے والے ایک زور دار دھماکے نے سارے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ تجوری کے تالے کو دھماکے سے اڑانا پڑا تھا۔

مونتیل کی بیوہ نے ایک آہ بھری' اکتوبر اپنی بارشوں اور کیچڑ کے ساتھ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ مونتیل کی لامحدود مگر افراتفری کی شکار جائیداد کی لہروں پر بغیر کسی سمت کا تعین کئے بہتی چلی جا رہی تھی۔ خاندان کے ایک پرانے اور محنتی دوست کارمائیکل نے جائیداد کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ جب اس نے مونتیل کی موت کو ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تو وہ گھر کی دیکھ بھال کے لئے سونے کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ گھر میں موجود سب آرائشی چیزوں کو اس نے نکال باہر کیا۔ دیواروں پر آویزاں مرحوم کی تمام تصویروں کے گرد تعزیتی ربن باندھ دیئے۔ مرحوم کی تدفین کے دو مہینے کے اندر اندر اس نے دانتوں سے ناخن کاٹنے کی نئی عادت ڈال لی تھی۔ ایک دن جب دیر تک روتے رہنے سے اس کی متورم آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے دیکھا کہ کارمائیکل کھلی چھتری لئے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

"کارمائیکل' چھتری بند کرو۔ پہلے اس گھر میں کم نحوست ہے جو تم کھلی چھتری لئے اندر چلے آ رہے ہو"

کارمائیکل نے چھتری ایک کونے میں رکھ دی۔ مسٹر کارمائیکل عمر رسیدہ نیگرو تھا۔ چمکتی ہوئی سیاہ جلد پر وہ ہمیشہ سفید لباس زیب تن کرتا۔ اس نے جوتوں کے چمڑے پر چاقو سے گھاؤ کر رکھے تھے تاکہ اس کی انگلیوں کی سوجن کو چمڑے کی رگڑ سے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

"صرف سکھانے کی خاطر چھاتا کھلا رکھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

مونتیل کی موت کے بعد آج پہلی بار اس کی بیوہ نے کھڑکی کھولی تھی۔

"پہلے ہی ایسی بدقسمتی کا سامنا ہے اوپر سے یہ سردی کا موسم" اس نے دانتوں سے ناخن کاٹتے ہوئے کہا "لگتا ہے بارش کبھی بند نہیں ہو گی"

"آج یا کل تو آسمان صاف ہونے سے رہا" جائیداد کے منتظم نے جواب دیا "کل رات میرے پیروں کی سوجن نے مجھے بالکل سونے نہیں دیا"

موسم کے بارے میں کارمائیکل کے پاؤں کی سوجن کی پیش گوئیوں کی وہ مکمل طور پر قائل تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے سنسان چوک کو دیکھا اور ان بے صدا گھروں کو جن کے دروازے جوزے مونتیل کا جنازہ دیکھنے

کے لئے بھی وا نہیں ہوئے تھے۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ وہ اپنی ناخن کاٹنے کی عادت سے' لمبی چوڑی زمینوں سے اور ان لامحدود فرائض سے جو اسے ورثے میں ملے تھے اور جنہیں سمجھنے سے وہ قطعی طور پر قاصر نہیں' بالکل مایوس ہو رہی تھی۔

"دنیا کا سارا نظام ہی غلط ہے" سسکی بھر کر اس نے کہا۔

ان دنوں اس کے گھر آنے والے اسے پاگل سمجھنے لگے تھے مگر اس کا ذہن کبھی ایسا شفاف اور واضح نہیں ہوا تھا۔ سیاسی قتل و غارت سے قبل کبھی کبھار وہ اکتوبر کی صبحیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بیٹھے مرنے والوں کی روحوں کے لئے دعا کرنے اور یہ سوچنے میں گزارا کرتی تھی کہ اگر خدا نے اتوار والے دن آرام نہ کیا ہوتا تو شاید اس نے دنیا کی زیادہ بہتر تشکیل کی ہوتی۔ "اسے چاہیے تھا کہ اتوار کا دن دنیا کی چھوٹی موٹی غلطیاں اور بے ترتیبیاں درست کرنے میں صرف کرتا" وہ کہا کرتی "کیا مضائقہ تھا۔ بعد میں خدا کے پاس ابد تک آرام کرنے کا وقت تھا" خاوند کی موت کے بعد تو اس کی ناامیدی اور قنوطیت اور بھی جڑ پکڑ گئی تھی۔

ادھر ناامیدی مونتیل کی بیوہ کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھی ادھر کارمائیکل ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔ کاروبار اور جائیداد کا انتظام ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا' مونتیل نے دھونس اور دہشت گردی سے قصبے کی تمام تجارت پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ اس کے خوف سے نجات پا کر سارا قصبہ انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ کئی ہفتے گزر جاتے مگر کوئی گاہک دکان کا رخ نہ کرتا۔ صحن میں رکھے بڑے بڑے برتنوں میں دودھ پھٹ جاتا' شہد کے چھتوں میں پڑا پڑا شہد خراب ہو جاتا اور پنیر میں کیڑے رینگنے لگتے۔ جوزے مونتیل بجلی کے قمقموں سے روشن جعلی سنگ مرمر کی قبر میں فرشتوں کے پروں کے سائے میں پڑا پچھلے چھ برسوں کے جبر و تشدد کا حساب چکا رہا تھا۔ ملک کی تاریخ میں کوئی شخص اتنے کم عرصے میں امیر نہ بنا تھا۔ جس زمانے میں آمر کا نامزد کیا ہوا میئر قصبے میں وارد ہوا' جوزے مونتیل اپنی آدھی عمر انڈر ویئر پہنے چاولوں کی مل کے سامنے بیٹھے گزار چکا تھا۔ اسے ہر طرح کی حکومت کا محتاط مداح اور حامی سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اسے قسمت کا دھنی سمجھتے تھے۔ وہ قول کا پکا شخص کہلاتا تھا۔ مثلاً" ایک بار اس نے اعلان کیا کہ اگر اس کی لاٹری نکل آئی تو وہ گرجا میں سینٹ جوزف کا قد آدم مجسمہ نصب کروائے گا۔ اس اعلان کے دو ہفتے بعد جب اسے بہت سی رقم وصول ہوئی تو اس نے اپنا وعدہ مکمل طور پر نبھایا۔ جس روز ایک وحشی اور بدطینت پولیس سارجنٹ قصبے کے نئے میئر کے روپ میں شہر میں داخل ہوا لوگوں نے دیکھا کہ مونتیل نے زندگی میں پہلی بار جوتے پہن رکھے تھے۔ نئے میئر کا پہلا کام ہر طرح کی حکومت مخالف سرگرمیوں کا خاتمہ تھا۔ جوزے مونتیل نے اس کام میں خفیہ مخبر کے طور پر میئر کا ساتھ دیا اور میئر کے آنکھ کان کا روپ دھار کر اپنی زندگی کا رخ بدل ڈالا۔ وہ اس وقت تک ایک سیدھا سادھا دوہرے جسم کا دکاندار تھا جو مزاح کی بے ضرر سی حس رکھتا تھا۔ مخبر بننے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام دشمنوں کو امیروں اور غریبوں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا۔ غریبوں کو تو قصبے کے چوک میں گولی مار دی گئی اور امیروں کو قصبے سے نکل جانے کے لئے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا گیا۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مونتیل دن بھر میئر کے ساتھ اپنے چھوٹے سے حبس زدہ کمرے میں مقید رہتا اور اس کی بیوی مرنے والوں کے لئے دعائے خیر میں مصروف رہتی۔ جب میئر گھر سے نکل کر جاتا تو وہ اپنے خاوند کو سمجھاتی "یہ شخص قاتل ہے۔ حکومت میں اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر اس آدمی سے قصبے کی جان چھڑاؤ۔ یہ یہاں کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔" اپنے کام میں مشغول جوزے مونتیل بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہتا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو" اصل میں مونتیل کا بنیادی

مقصد غریبوں کا قلع قمع کرنا نہ تھا بلکہ وہ قصبہ کو امیروں سے پاک کرنے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ جب میئر کی پولیس نے امراء کے دروازے گولیوں سے چھلنی کر دیئے اور انہیں چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا تو جوزے مونتیل نے ان کی جائیداد، مویشی اور مال اسباب اونی پونی قیمتوں پر ان سے خرید لئے۔ اس کی بیوی نے کہا "یہ کیا حماقت کر رہے ہو۔ تم ان لوگوں پر احسان کرتے تاکہ وہ کسی اور جگہ جا کر بھوکے نہ مریں، خود فاقوں مرنے لگو گے اور کوئی پھوٹے منہ سے تمہارا شکریہ تک ادا نہیں کرے گا" جوزے مونتیل کے پاس تو ان دنوں مسکرانے تک کا وقت نہ تھا۔ ڈانٹ کر بولا "باورچی خانے میں جا کر اپنا کام کرو اور میرا مغز نہ چاٹو" یوں ایک سال کے اندر اندر قصبے میں کوئی بھی سر اٹھانے والا باقی نہ بچا۔ جوزے مونتیل شہر کا امیر ترین اور طاقتور ترین شخص بن گیا اس نے اپنی بیٹیوں کو پیرس بھجوایا اور لڑکے کے لئے جرمنی میں کونسل کی نوکری حاصل کر لی۔ اب وہ اپنا وقت جائیداد کو مزید مستحکم کرنے میں گزارنے لگا، لیکن اسے اپنی بے پناہ دولت سے لطف اندوز ہونے کے لئے چھ سال کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

مونتیل کی پہلی برسی کے بعد اس کے گھر کی سیڑھیاں صرف اسی وقت چرچراتیں جب کوئی بری خبر لے کر آتا۔ عام طور پر جھٹپٹے کے وقت کوئی آکر بتاتا "ایک بار پھر ڈاکہ پڑ گیا۔ کل وہ پچاس بچھیائیں لے اڑے" اپنی جھولنے والی کرسی میں ہلے بغیر مونتیل کی بیوہ دانتوں سے ناخن کاٹتی اور کڑھتی رہتی۔

"جوزے مونتیل میں نے تم سے کہا تھا نا؟" وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی "اس قصبے میں ہر شخص ناشکرا ہے۔ ابھی قبر میں تمہارا جسم بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور ان لوگوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔"

کوئی بھی اس سے ملنے نہ آتا صرف کارمائیکل تھا جو لگاتار بارش میں بھی باقاعدگی سے اس کے گھر آتا رہتا۔ وہ ہمیشہ کھلی چھتری لئے اندر داخل ہوتا۔ کاروبار کے بگاڑ میں بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کارمائیکل نے مونتیل کے بیٹے کو کتنے ہی خط لکھے تھے کہ اگر وہ واپس آکر کاروبار کا انتظام سنبھال لے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی خرابی صحت کے بارے میں بھی لکھ بھیجا۔ مگر اسے ہمیشہ ٹال مٹول والے جوابات موصول ہوئے۔ آخر کار مونتیل کے بیٹے نے کہہ دیا کہ اسے قصبے میں واپس آنے سے خوف آتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے گولی سے اڑا دے گا۔ یوں کارمائیکل کو بیوہ کے سامنے جا کر اعتراف کرنا پڑا کہ ان کی مالی حالت جواب دے چکی ہے۔

"چلو اچھا ہوا" اس نے جواب دیا "میں تو مکھیوں اور پنیر سے تنگ آچکی ہوں تمہارا جو جی چاہے یہاں سے لے لو اور مجھے چین کی موت مرنے دو۔"

اس کے بعد مونتیل کی بیوہ کا دنیا سے بس یہی تعلق باقی رہا کہ وہ ہر ماہ کے اختتام پر اپنی بیٹیوں کو خط لکھا کرتی تھی "یہ نہایت منحوس، جہنمی اور پالے مارا قصبہ ہے" وہ انہیں لکھتی "تم ہمیشہ وہیں رہو۔ میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ جان کر مطمئن ہوں کہ تم پیرس میں خوش ہو" اس کی بیٹیاں باری باری اسے خط لکھا کرتیں، گرم اور روشن جگہوں میں بیٹھ کر لکھے گئے ان خطوط سے مسرت ٹپکتی تھی۔ ان کے خطوط کی عبارت دیکھ کر یوں لگتا جیسے دونوں لڑکیاں جب سوچنے بیٹھتی ہوں گی تو انہیں مختلف آئینوں میں اپنے عکس نظر آتے ہوں گے۔ ان کو بھی وطن واپس آنے کی کوئی آرزو نہیں تھی۔ "تہذیب کا وجود صرف یہیں پایا جاتا ہے وہاں تمہارے ملک میں ماحول ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔ کسی ایسے وحشی ملک میں رہنا قطعی ناممکن ہے جہاں سیاسی وجوہات کی بنا پر لوگ قتل کر دیئے جاتے ہوں۔" ان خطوط کو پڑھ کر مونتیل کی بیوہ کو خوشی اور بہتری کا

احساس ہوتا اور وہ ہر جملے کے ساتھ رضامندی میں اپنا سر ہلاتی رہتی۔

ایک موقع پر اس کی بیٹیوں نے اسے پیرس کے قصابوں کے بارے میں لکھا کہ گلابی رنگ کے سالم سور لٹکا کر پھولوں کے ہاروں سے سجائے جاتے ہیں۔ خط کے آخر میں کسی اور نے جس کے لکھنے کا انداز اس کی بیٹیوں کے انداز سے مختلف تھا' اس جملے کا اضافہ کیا ہوا تھا' ذرا غور کرو کہ کارنیشن کا سب سے بڑا اور خوبصورت ترین پھول سور کے چوتڑوں میں انکا ہوتا ہے۔

یہ جملہ پڑھ کر مونتیل کی بیوہ دو سال کے عرصے میں پہلی بار مسکرا دی۔ گھر کی بتیاں جلائے بغیر وہ اپنے سونے کے کمرے میں گئی۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے اس نے بجلی کے پنکھے کا رخ موڑ کر دیوار کی طرف کر دیا پھر چھوٹی میز کی دراز میں سے قینچی' پٹی اور تسبیح نکالی اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جہاں ناخن کاٹنے سے سوزش ہو رہی تھی' پٹی باندھ کر تسبیح پھیرنے لگی لیکن دوسرے ہی منتر پر اس نے تسبیح کو بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا کیونکہ دائیں انگوٹھے پر پٹی کے باعث اسے تسبیح کے دانوں کے وجود کا احساس ہی نہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس نے دور کہیں طوفان کی گرج سنی لیکن جلد ہی اس کا سر سینے پر جھک گیا اور وہ سو گئی اس کا تسبیح والا ہاتھ ایک طرف گر گیا اور خواب میں اس نے "بڑی ماما" کو دیکھا جو سفید چادر میں ملبوس اس کے گھر کے صحن میں بیٹھی تھی۔ اس کی کنگھی اس کی آغوش میں پڑی تھی اور وہ اپنے ناخنوں سے جوئیں مارنے میں مشغول تھی۔

اس نے "بڑی ماما" سے پوچھا "مجھے موت کب آئے گی"

"بڑی ماما" نے سر اٹھایا اور جواب دیا "جب تھکن تمہارے بازوؤں میں اتر آئے گی۔"

گریس اے۔ اوہوٹ / زاہد نوید

بارش

قبیلے کا سردار ابھی صدر دروازے سے بہت دور تھا کہ اسکی بیٹی اوگینڈا نے اسے دیکھ لیا' وہ بھاگی بھاگی باپ کے پاس گئی اور ہانپتے ہوئے پوچھنے لگی "کیا خبر ہے عظیم سردار! گاؤں میں ہر کوئی یہ جاننے کے لئے بے قرار ہے کہ بارش کب ہو گی؟" لے بانگ او' نے اپنی بیٹی کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ باپ کے اس ردعمل سے گھبرا کر وہ گاؤں کی طرف بھاگنے لگی تاکہ لوگوں کو بتا سکے کہ سردار واپس آگیا ہے۔ پورے گاؤں کی فضا مکدر تھی' ہر کوئی یونہی ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ سب کام کر رہے تھے لیکن کسی کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ ایک نوجوان عورت نے دوسری کے کان میں سرگوشی کی۔

"اگر انہوں نے بارش والا مسئلہ حل نہ کیا تو سردار کی خیر نہیں۔"

"کھیتوں میں ہمارے مویشی مر رہے ہیں۔ جلد ہی ہمارے بچے مرنے لگیں گے' اور پھر۔۔۔ ہماری باری ہو گی۔ اے عظیم سردار! اپنی زندگی بچانے کے لئے' ہم کیا کریں۔" اسی لئے عظیم سردار کو روزانہ ہی اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کے وسیلے سے قادر مطلق کے سامنے بارش کے لئے گوگڑانا پڑ رہا تھا۔

لے بانگ اپنے اہل خانہ سے ملے بغیر سیدھا اپنی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ پردہ گرا کے وہ استغراق میں کھو گیا۔ اس کے لئے پریشانی کی بات صرف یہی نہیں تھی کہ وہ بھوک سے مرتے ہوئے ایک قبیلے کا سربراہ تھا وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی کے لئے بھی فکر مند تھا۔۔۔ جب اوگینڈا اسے ملنے آئی تھی تو اس نے اسکی کمر کے گرد ایک چمکتی ہوئی زنجیر دیکھی تھی۔۔۔ پیشین گوئی مکمل ہو گئی۔۔۔ "موت کے منہ میں جانے والی پہلی دوشیزہ' میری اپنی بیٹی اوگینڈا..... اوگینڈا ہو گی" وہ یہ جملہ پورا نہ کر سکا.... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔ لیکن سردار تو کبھی نہیں روتا۔ سوسائٹی اسے سب سے بہادر مرد قرار دے چکی تھی۔ مگر اب اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔۔۔ اب وہ صرف ایک باپ تھا اور بیٹی کے لئے زار و قطار رو رہا تھا۔۔۔ اسے اپنے قبیلے کے لوگوں سے محبت تھی مگر اوگینڈا کے بغیر وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں تھے۔

اوگینڈا کی ولادت سے لے بانگ کی دنیا میں رونق آگئی تھی۔ اب وہ پہلے سے بہتر حکومت کرنے لگا تھا۔ بہت سے والدین ہیں گاؤں میں اور ان کی بہت سی بیٹیاں ہیں تو پھر اس نے میری ہی بیٹی کو کیوں چنا ہے۔۔۔ لے بانگ یوں بول رہا تھا جیسے اس کے آباء کی ارواح اس کی جھونپڑی میں موجود اس کی بات سن رہی ہیں۔ شائد وہ وہاں تھیں۔۔۔ اور اسے انکا وعدہ یاد دلا رہی تھیں جو اس نے تخت نشینی کے وقت کیا تھا۔۔۔ اپنے بڑوں کے سامنے۔۔۔ اگر ضرورت پڑی تو اس قبیلے کو دشمن سے بچانے کے لئے میں اپنی اور اہل خانہ کی جانوں کو داؤ پر لگا دوں گا۔۔۔ پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے آباء کی روحیں اس پر طنز کر رہی ہوں" تم اپنے وعدے سے پھر گئے

ہو..... پھر گئے ہو تم۔"

لے بانگ جب سردار بنا تو نوجوان تھا۔ اپنے باپ کے برعکس' وہ کافی عرصے تک ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارا کرتا رہا۔ لیکن لوگ چپکے چپکے اس کی ہنسی اڑاتے تھے کیونکہ اس کی اکلوتی بیوی اس کے لئے کوئی بیٹی پیدا نہ کر سکی تھی۔ اس لئے اس نے دوسری' تیسری اور پھر چوتھی شادی بھی کی لیکن ان سب کے ہاں لڑکے ہی پیدا ہوئے' جب لے بانگ نے پانچویں عورت سے شادی کی تو اسکے ہاں بیٹی نے جنم لیا۔ اس کا نام اوگینڈا رکھا گیا جس کا مطلب ہے "مٹر"۔۔۔۔ کیونکہ اس کی جلد مٹر کی طرح ملائم تھی۔۔۔۔ لے بانگ کے بیس بچوں میں وہ واحد لڑکی تھی۔۔۔۔ اسکی سوتیلی مائیں بھی اپنا روائیتی حسد بھول کر اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔۔۔۔ انہیں یہ بھی خیال تھا کہ شاہی خاندان میں اوگینڈا زیادہ دیر تک نہ رہ سکے گی۔ ایک دن تو اسے پیا گھر جانا ہی ہو گا پھر تو اسکی جگہ کوئی اور ہی لے گا۔

لے بانگ۔۔۔ کو زندگی میں کبھی اسے ایسی کڑی آزمائش سے گزرنا نہ پڑا تھا۔ بارش بھیجنے والے دیوتا کی فرمائش کو نظر انداز کرنے کا مطلب تھا۔ آبا و اجداد کی نافرمانی۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ لیو قبیلہ ہی صفحہ ہستی سے مٹ جائے لیکن دوسری طرف اوگینڈا تھی۔ جس کا مرجانا اس کے اپنے ہی وجود کی موت تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اوگینڈا کے مرنے کے بعد وہ کبھی ویسا نہیں رہے گا جیسا ہے۔ شاہی طبیب این ڈتی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"پودھو' لیو قبیلے کا جد امجد' میرے خواب میں آیا کل شب' پھر اس نے مجھے کہا کہ سردار اور قبیلے والوں سے کہو۔

بارش تو ہو گی لیکن اس کے لئے قبیلے کی ایک ایسی نوجوان لڑکی کو قربان کرنا ہو گا جس نے ابھی تک کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ ابھی پودھو مجھ سے بات کر ہی رہا تھا کہ میں نے ایک دوشیزہ کو جھیل کے کنارے کھڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ اسکے سر سے اوپر اٹھے ہوئے تھے اسکی جلد کسی ہرن کی جلد جیسی نرم اور ملائم تھی۔ اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ اس کے بائیں کان میں سونے کا بندہ تھا اور چمکتی ہوئی زنجیر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ میں اس دوشیزہ کی خوبصورتی میں ابھی کھویا ہوا تھا کہ پودھو کی آواز سنائی دی۔

"ہم نے' اس قبیلے کی تمام عورتوں میں سے صرف اسی کو چنا ہے اس دوشیزہ کو جھیل کے دیوتا کی بھینٹ چڑھنا ہو گا۔ پھر اسی دن موسلادھار بارش ہو گی۔ اس روز ہر کوئی اپنے گھر میں ہی رہے۔ ایسا نہ ہو کہ منہ زور سیلاب میں بہہ جائے۔۔۔"

باہر فضا میں ایک معنی خیز سکوت تھا۔ بس چند پیاسے پرندے تھے جو مرتے ہوئے درختوں پر بیٹھے آخری گیت گا رہے تھے۔ دوپہر کی شدید گرمی نے سب کو جھونپڑیوں کے اندر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سردار کی جھونپڑی سے ذرا دور دو محافظ خراٹے بھر رہے تھے۔ لے بانگ نے سر سے تاج اتارا۔ جھونپڑی سے باہر آیا اور خود ہی نوبت بجانے لگا۔ چشم زدن میں سارے لوگ درخت کے نیچے جمع ہو گئے۔ کہنے لگا "اوگینڈا تم ذرا اپنی دادی اماں کی جھونپڑی میں چلی جاؤ اور وہیں بیٹھو۔" اس کے بعد لے بونگ اپنے قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہوا۔۔۔ آنسوؤں سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ لفظوں نے اسکے ہونٹوں پر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بیویوں اور بیٹوں نے سمجھا شائد دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔۔۔ لے بانگ کی آنکھیں سرخ تھیں اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

"وہ جسے ہم سب محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو ہمارے دلوں کا سرمایہ ہے اسے ہم سے چھین لیا جائے گا۔

اوگینڈا کو مرنا ہو گا....."
اس کا لہجہ اتنا کمزور تھا کہ اس کی آواز خود اپنے تک بھی نہ پہنچی---- اس نے کلام جاری رکھا---
لمحے بھر کو ماحول پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گئے۔ اوگینڈا کی ماں بے ہوش ہو کر گر گئی---- لیکن دوسرے لوگ مسرت کا اظہار کرنے لگے۔ وہ ناچنے لگے اور گانے لگے "ارگینڈا کتنی خوش قسمت ہے کہ اپنی قوم کی خاطر قربانی دے گی۔ قوم کو بچانے کے لئے' ارگینڈا کو جانا ہو گا----"
دادی اماں کے حجرے میں بیٹھی اوگینڈا حیران تھی کہ اس کے گھر والے اس کے بارے میں ایسی کون سی بات کر رہے ہیں جسے وہ سن نہیں سکتی---- "ہو سکتا ہے میری شادی کی بات ہو" اس نے سوچا کیونکہ یہ روائت تھی کہ لڑکیوں کی شادی کی بات ان کی غیر موجودگی میں کی جاتی تھی۔ کئی نوجوانوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی--- اسے پڑوس قبیلے کے نوجوان کیچ کا خیال آیا۔ وہ خوبصورت ہے۔ اسکی آنکھیں بڑی دلکش ہیں اور ہنستا بہت زور سے ہے۔ لیکن پھر بھی وہ میرا خاوند نہیں بن سکتا.... پھر اسے ڈیمو کا خیال آیا۔ وہ لمبا تڑنگا نوجوان بڑا بہادر سپاہی ہے ڈیمو بھی اوگینڈا کو چاہتا تھا۔ مگر اسے خیال تھا کہ وہ بڑا ظالم شوہر ثابت ہو گا۔ لیکن اوسینڈا کا خیال آتے ہی ارگینڈا کی انگلیاں کمر کے گرد لپٹی ہوئی گگری کے ساتھ کھیلنے لگیں---
اتنے میں اس کی دادی اندر آئی---- اوگینڈا چونک اٹھی' جیسے اسکی چوری پکڑی گئی ہو۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا دادی اماں" اوگینڈا ہنس کر بولی پھر خوشامد بھرے لہجے میں دادی سے کہنے لگی "سچ سچ بتاؤ اماں تم لوگ میری شادی کی بات کر رہے تھے نا---- صاف صاف سن لو' ان میں سے کسی سے شادی نہیں کروں گی ہاں! وہ اپنی دادی اماں کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا محبوب تو اوسنیڈا ہے----
باہر کھلے میدان میں لوگ مستی میں رقص کر رہے تھے اور اونچے سروں میں گا رہے تھے۔ اب وہ ہاتھوں میں تحائف لئے ارگینڈا کی جھونپڑی کی طرف ہی آ رہے تھے۔ ارگینڈا سن رہی تھی جو کچھ وہ کہہ رہے تھے۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی "اوسینڈا! میرے محبوب! ہو سکتا ہے وہ تمہیں ہو' جس کے بارے میں یہ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ اب تم آہی جاؤ اور مجھے لے جاؤ۔"
لوگ بہت قریب آچکے تھے۔ اور ان کی آواز بھی واضح تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔
"جانا ہو گا--- اوگینڈا کو اپنے لوگوں اور اپنے اجداد کی روحوں کو خوش کرنے کے لئے مرنا ہو گا۔" اس نے دیکھا کہ اس کی دادی کا نزار وجود دروازے پر جھکا ہوا ہے۔ وہ باہر نہ جا سکتی تھی--- اسکی دادی کی آنکھوں سے اس نے محسوس کیا کہ باہر اس کے لئے خطرہ ہے۔
"ماں! اس کا مطلب ہے میری شادی کی بات نہیں تھی" وہ اداس ہو کر بولی۔ اوگینڈا جانتی تھی کہ جھونپڑی میں صرف ایک دروازہ ہے۔ مگر وہ بدحواس ہو کر فرار کی کوئی دوسری راہ ڈھونڈنے لگی۔ اس کو اپنی زندگی کی خاطر لڑنا چاہیے۔ مگر کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کسی جنگلی شیرنی کی طرح وہ دادی ماں پر جھپٹی اور اسے گرا کر دروازے سے باہر نکل گئی--- باہر ماتمی لباس میں لے بانگ اس کا باپ' بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی بیٹی کو بازو سے پکڑا اور ہجوم سے دور ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی جھونپڑی میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی زبان سے ارگینڈا کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔
کافی دیر تک وہ دونوں اس تاریک جھونپڑی میں خاموش بیٹھے رہے۔ بول کر کیا کرتے۔ اگر بولنا چاہتے بھی تو لفظ ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ یہ خبر کہ بارش کی خاطر سردار کی بیٹی جان کی قربانی دے گی' جنگل کی آگ کی

طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ غروب آفتاب کے بعد سردار کی جھونپڑی رشتہ داروں اور دوسرے عزیزوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یہ سب ارگینڈا کو مبارکباد کہنے آئے تھے۔ اب وہ ساری رات اس کے گرد رقص کریں گے اور سب کو وہ اس کے اعزاز میں ضیافت دیں گے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ دیوتا کی طرف سے ارگینڈا کا چنا جانا یقیناً" ایک بڑے اعزاز کی بات ہے۔۔۔ "اوگینڈا کا نام ایک زندہ وجود کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا"۔ وہ پکار پکار کر کہتے۔

یقیناً" قوم کی خاطر ایک عورت کی بیٹی کا مرجانا اعزاز کی ہی بات تھی۔۔۔ لیکن اس عورت' اس ماں کو کیا ملے گا جس کی بیٹی کو ہوائیں چھین کر لے جائیں گی۔۔۔ بستی میں اور بھی بہت سی عورتیں تھیں لیکن اسی کی بیٹی کو کیوں چنا گیا۔ اس کی تو ایک ہی بیٹی تھی۔ پھر؟ دوسری عورتوں کے گھر بچوں سے بھرے پڑے تھے مگر ارگینڈا کی ماں کو تو اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی محروم ہونا پڑا۔۔۔

بادلوں سے خالی آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور بہت سے ستارے بھی روشن تھے۔ ہر عمر کے لوگ ارگینڈا کے اردگرد رقص کر رہے تھے۔ مگر وہ ماں کے کندھے کے ساتھ سر لگائے سسکیاں لے رہی تھی۔ یہ سب لوگ جن کے ساتھ اس نے بہت سا وقت گزارا' جن کو وہ اچھی طرح جانتی تھی آج یہ سب اس کے لئے اجنبی تھے۔ اگر یہ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں تو آج ان کی محبت کہاں چلی گئی" وہ سوچنے لگی۔۔۔ وہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کو بالکل احساس نہیں کہ جوانی میں مرنا کیسا ہوتا ہے؟ جب اس کی ہم عمر لڑکیاں رقص کرتی ہوئیں اس کے پاس آئیں تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ نوجوان اور خوبصورت تھیں۔ جلد ہی ان کی شادیاں ہو جائیں گی پھر ان کے بچے ہوں گے۔ محبت کرنے والے شوہر ہوں گے اور رہنے کے لئے اپنے گھر۔۔۔ ایسے میں اسے ارسینڈا کا خیال آیا اور بے ساختہ اس کا ہاتھ کمر کے گرد لپٹی ہوئی گگری کو چھونے لگا۔ ارسینڈا اب تک کیوں نہیں آیا۔ شاید وہ بیمار ہے۔۔۔ اس نے سوچا۔

کمر کے گرد لپٹی ہوئی زنجیر کو چھو کر وہ مطمئن سی ہو گئی۔۔۔ یہ اسکے محبوب کی نشانی تھی اب وہ زیر زمین دنیا میں جا کر پہنے گی۔ صبح کو ارگینڈا کے لئے طرح طرح کے کھانے پکائے گئے۔ تاکہ وہ ان میں سے اپنی مرضی کا کھانا کھا سکے۔ وہ کہنے لگے "موت کے بعد تو کوئی کچھ نہیں کھا سکتا" اسی خیال سے وہ اتنے کھانے بنا کر لائے تھے۔ مگر ارگینڈا نے کسی کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ان خوش باش لوگوں کو مزے اڑانے دو۔ اس نے تو اپنی چھوٹی سی صراحی سے چند قطرے پانی لیا اور چپ ہو گئی۔ اب س کی روانگی کا وقت قریب آرہا تھا۔ جھیل تک پہنچنے میں پورا دن لگے گا۔ بڑے بڑے جنگلوں میں سے گزرتے ہوئے وہ رات بھر چلتی رہے گی۔ اسے جنگلوں کا کوئی خوف نہ ہوگا۔ کوئی جانور یا کیڑا اسکو چھو نہ سکے گا کیونکہ اس کے جسم پر مقدس تیل کی مالش کر دی گئی ہے۔

جانے کیوں اسے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اس کی روانگی سے پہلے کسی بھی لمحے ارسینڈا آجائے گا۔۔۔ امید کا تار تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ لیکن.... وہ نہ آیا۔ کسی نے اسے بتایا کہ ارسینڈا کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ تب اسے یقین ہوا کہ اب وہ ارسینڈا کو کبھی نہ مل سکے گی۔۔۔

دوپہر ہو گئی پورا گاؤں بڑے دروازے پر جمع ہو گیا۔۔۔ اسے آخری بار دیکھنے کے لئے۔ اس کی ماں اس کی گردن پر منہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ عظیم سردار ننگے پاؤں آیا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔ اس وقت وہ صرف ایک باپ تھا۔ ایک غمزدہ باپ' ایک عام آدمی... کہنے لگا بیٹی! تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو گی ہمارے اجداد کی روح تمہارے ساتھ ہے۔"

اوگینڈا چپ چاپ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کے پاس تو کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ بس ایک بار اس نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے گھر پر ڈالی۔ اور اپنے دل میں ٹیس سی اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ اس کے بچپن کے دیکھے ہوئے سارے خواب آج مسمار ہو رہے تھے۔ جیسے وہ ایک کلی تھی جس کی قسمت میں صبح کی شبنم کو چھو کر کھِلنا نہیں لکھا تھا۔

اب اوگینڈا نے جھیل کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ اسکے عزیز' رشتہ دار' اپنے بیگانے سب ہی اسے الوداع کہنے کے لئے صدر دروازے پر جمع تھے۔ وہ اپنے پتلے دبلے وجود کے ساتھ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ درختوں میں غائب ہو گئی۔ اوگینڈا جنگل کے پرپیچ اور خم دار راستوں پر چلتی رہی اور یہ گیت راہ میں اس کا ہمسفر تھا۔

"اجداد نے کہا ہے کہ اوگینڈا کو مرنا ہو گا
سردار کی بیٹی قربان ہو گی
جب جھیل کا دیوتا میرے جسم کے گوشت سے اپنا
پیٹ بھرے گا۔ تو بارش آئے گی۔
ہاں' پھر تو موسلا دھار بارش ہو گی
ہوا چلے گی' بجلی کڑکے گی
اور ریتیلے ساحلوں کو سیل آب بہا لے جائے گا
جب سردار کی بیٹی' ---- جھیل میں جان دے گی
میرے ہمجولیاں بھی اس پر راضی ہیں
میرے ماں باپ بھی اس پر راضی ہیں
کہ ارگینڈا کو مر ہی جانا چاہیے
میری ہمجولیاں جوانی کی عمر کو پہنچ گئیں
وہ عورت اور ماں بننے کے قابل ہو گئیں
ارگینڈا جوان ہوئی تو اسے صرف مرنا ہے
ارگینڈا اجداد کی روحوں کے ساتھ سوئے گی
پھر بارش آئے گی۔ ---- موسلا دھار"

سورج کی واپس مڑتی ہوئی سرخ کرنوں نے ارگینڈا کے بدن کو چھوا۔۔۔ تو ایسے لگا جیسے وہ جنگل میں روشنی کی کوئی مشعل ہے۔ ایک بڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی صراحی سے کچھ پانی پیا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔۔۔۔ جب وہ صبح کو اٹھی تو دن چڑھ آیا تھا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں سے آبادی والا علاقہ مقدس مقام سے الگ ہو جاتا تھا۔ کوئی آدمی یہاں قدم رکھنے کے بعد زندہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ مگر وہ جو روحوں سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔۔۔۔ اور جنہیں دیوتا نے داخلے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن ارگینڈا کو تو اس جھیل تک پہنچنے کے لئے یہاں سے گزرنا تھا۔ اور وہاں غروب آفتاب سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا۔

اس مقام پر آکر لوگوں کا ایک ہجوم اسکی آخری جھلک دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ اب اوگینڈا کی آواز بھرا

گئی تھی۔ ہجوم نے غیر واضح لفظوں میں ایک بار اوگینڈا سے اظہار ہمدردی کیا لیکن کسی نے بھی اسکی جان بچانے کی کوشش نہ کی۔۔۔ جونہی ارگینڈا نے قربان گاہ کا دروازہ کھولا' ہجوم سے ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ اپنے کان کا بالا ارگینڈا کو دیتے ہوئے وہ بولا۔ جب تم روحوں کی دنیا میں پہنچو تو یہ بالا میری بہن کو دے دینا۔ ارگینڈا نے جواب میں اپنا پانی اور کھانا بچے کو دے دیا۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا کہ اس موقع پر وہ روئے یا ہنسے۔۔ مقدس مقام پر قدم رکھتے ہوئے ارگینڈا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے ایک بار پھر ہجوم کی طرف دیکھا لیکن وہاں کسی کی آنکھوں میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔۔۔۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ بارش جس کے وہ تمنائی تھے ان کے لئے پیغام شفا تھی۔ وہ تو یہ چاہ رہے تھے کہ ارگینڈا جتنی جلد اپنی منزل پر پہنچے اتنا ہی بہتر ہے۔۔۔۔ ارگینڈا نے اپنے وجود میں خوف کی سرسراہٹ محسوس کی۔ وہ جھیل کے دیوتا کو تصور میں لانا چاہتی تھی لیکن خوف نے اسے باز رکھا۔ لوگ اس کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ بچے انکا نام تک لینے سے ڈرتے تھے۔ سورج خاصا بلند ہو چکا تھا لیکن ابھی گرمی زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ کافی دیر تک ارگینڈا ٹخنوں تک گہری ریت میں چلتی رہی۔ وہ تھک گئی اور ہانپنے لگی۔ اسے اپنی پانی کی صراحی بہت یاد آئی۔ چلتے چلتے اسے عجیب سا احساس ہونے لگا۔۔۔ جیسے .... جیسے کوئی اسکا تعاقب کر رہا ہے۔۔۔ اسکے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔۔۔ کیا وہ جھیل دیوتا ہے؟ خوف سے سردی کی ایک لہر اسکی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ۔۔۔۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ماسوائے ریت کے بگولوں کے ۔۔۔۔ ارگینڈا نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کئے۔ لیکن پیچھا کرنے والے کے خوف سے وہ آزاد نہ ہو سکی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ارگینڈا دوڑنے لگی۔ غروب آفتاب سے پہلے اسے جھیل کنارے ہونا چاہیے پھر اچانک اسے ایک آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اس نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی جھاڑی دوڑی چلی آرہی ہے۔ اور اسے پکڑنا چاہتی ہے۔ ارگینڈا پوری طاقت اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ وہ خود کو سورج ڈھلنے سے پہلے جھیل کے حوالے کر دینے کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ اب اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا مگر وہ جو تعاقب میں تھا اسکے سر پر پہنچ چکا تھا۔

اس نے چلانا چاہا۔۔۔ جیسے کے خواب میں ڈر گئی ہو۔۔۔ لیکن اسے تو اپنی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔۔۔ پھر۔۔۔ ایک مضبوط ہاتھ نے اسکی کلائی کو جکڑ لیا۔ وہ ریت پر گر کے ہانپنے لگی۔ اسے غش آگیا۔ مگر جب جھیل کے پانی سے چھو کر آنے والی ٹھنڈی ہوا نے اسے چھوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ اس نے دیکھا کہ ایک مرد اس پر جھکا ہوا تھا۔

ارگینڈا نے بولنا چاہا۔ مگر وہ اپنی آواز کھو چکی تھی۔ اجنبی نے اسکے منہ میں پانی کے چند قطرے ڈالے۔ پھر وہ اسے پہچان گئی۔

"ارسینڈا! ارسینڈا! مجھے مرنے دو۔ مجھے جانے دو' سورج غروب ہونے والا ہے اور مجھے پہنچنا ہے۔ تاکہ بارش ہو"۔۔ ارسینڈا نے ارگینڈا کی کمر سے لپٹی ہوئی زنجیر کو چھوا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اسکے چہرے پر پھیلے ہوئے آنسو صاف کئے۔

"آؤ ہم کسی نامعلوم دنیا کی طرف بھاگ جائیں۔ چلو جلدی کرو۔" ارسینڈا نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ اجداد کی روحیں اور جھیل دیوتا ہم پر غضبناک ہو جائے" ارگینڈا کو فرار کے خیال سے خوف آیا' مگر ارسینڈا بضد تھا اور پوری طرح تیار۔ ارگینڈا نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ارسینڈا کے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔۔۔ "میری

بات سنو ارگینڈا۔۔۔ میرے پاس دو کوٹ ہیں۔ اس نے بوواجی کی شاخوں سے بنے ہوئے لباس میں اسے پورے طرح یوں لپیٹ دیا کہ بس اسکی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ یہ لباس ہمیں اجداد کی روحوں اور جھیل دیوتا کے غیض و غضب سے بچالے گا۔ "آؤ اب بھاگ چلیں۔" اور وہ مقدس جگہ سے بھاگ نکلے۔

راستے میں جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور گھاس بہت اونچی۔ آدھا راستہ طے کر کے انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی سطح کو چھو رہی تھیں۔۔۔ وہ خوف زدہ سے ہو گئے۔۔۔ مگر وہ بھاگتے رہے۔ وہ ڈوبتے ہوئے سورج سے بچنا چاہتے تھے۔

"یقین رکھو ارگینڈا۔۔۔ یہ سورج ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔"

جب انہوں نے آخری رکاوٹ کو بھی عبور کر لیا اور کانپتی نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی کی سطح پر سورج کی کرنیں بہت مدھم پڑ چکی تھیں۔ "وہ جا چکا۔۔۔ ختم ہو گیا ہو۔۔۔ وہ جا چکا۔۔۔" ارگینڈا اپنی باہوں میں سر چھپا کے رونے لگی۔۔۔

"او سردار کی بیٹی۔۔۔۔ مت رو۔ میرے ساتھ دوڑو۔۔۔۔

ہمیں یہاں سے دور جانا ہے۔۔۔۔ اور ہمارا سفر بھی کافی ہے

دور کہیں بجلی چمکتی ہوئی نظر آئی ۔۔۔۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ خوف کی ایک لہران کے وجود میں ملول کر گئی۔

اس رات بارش بہت زور سے آئی۔ ایسی موسلا دھار بارش تو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔۔۔

ایلسمو ڈیکو / محمود احمد قاضی

نیا مالک

پچھلے بیس سال سے بے آباد اس گاؤں کا یہ محل نزدیک ہی واقع ایک اونچی چٹان پر موجود تھا جہاں اس کے اردگرد تند و تیز ہوائیں چلتی تھیں اور یہیں سمندر کی غصیلی لہریں اپنا سر پٹختی تھیں۔

کارکنوں نے ایک ماہ قبل ہی اسے رہائش کے قابل بنا دیا تھا اور اس۔ کر فورا" بعد یہاں کے بیس کمروں کے لئے بیس ٹرکوں پر لدا فرنیچر پہنچ گیا۔

پورٹیکو کی دیوار سے لگے وہ سب یعنی چوکیدار' باورچن' مالی اور نوکرانی جن کو نئے مالک نے پہلے سے ملازمت پر رکھ لیا تھا ان کو آتے ہوئے دیکھتے رہے۔ باورچن نے آہ بھرتے ہوئے کہا "یہ تو ایک فوج لگتی ہے" اس کی بات سن کر دوسروں نے بھی اپنے سر ہلائے۔

لیکن ٹرکوں کے جلوس کے پیچھے صرف ایک کار تھی اور اس میں کوئی اور نہیں بس ان کا نیا مالک تھا۔

مالی بولا "یہ تو بیمار لگتا ہے"

نوکرانی نے فورا" اس کی ہاں میں ہاں ملائی "ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے"

نوکرانی نے نعمت خانے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اپنے بال سنوارتے ہوئے اور اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ تو لڑکا سا ہے' محض ایک بچہ"

مالی نے اپنی فوجیوں جیسی ٹوپی کو کچن کی میز پر ڈالا اور گہرے سرخ اور پیلے رنگ کے رومال سے اپنے ماتھے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک ایسا بچہ جس کا چہرہ بوڑھوں جیسا ہے کسی کے خیال میں ہو گا کہ ....." اور پھر وہ بتانے لگا کہ کس طرح نئے مالک نے گلاب کے گملوں کو پام کے پتوں کے پیچھے چھپانے پر اصرار کیا تھا۔

مالی نے نوکرانی کو ایک خاص انداز سے دیکھتے ہوئے کہا' "اس کے علاوہ یہ کہ وہ نہایت سادگی سے اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ بے شک بے چارہ اپنی کمر کے درد کو بھی تو بھگت رہا ہے۔"

"وہ خدا کا ایک نہایت سادہ بندہ ہے" چوکیدار نے جو نئے مالک کا خاص خدمتگار تھا اعلان کیا "وہ اپنی کتابوں میں مگن رہتا ہے۔ اور اس کے کپڑے ایسے ہوتے ہیں جیسے کہ پادری پہنتے ہیں۔ آپ اس کے منہ سے ہمیشہ اس قسم کے جملے سنیں گے "کیا آپ میری مدد کرنا پسند کریں گے" "مہربانی کر کے آپ......" یا یہ کہے گا "آپ کا بہت بہت شکریہ" حتیٰ کہ جب میں نے اس کے اوپر کافی گرا دی تھی تو تب بھی جوابا" اس نے مجھ سے معافی مانگی تھی۔

باورچن نے ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھتے ہوئے کہا "پادری جیسے کپڑے ---- یہ تو کوئی ایسی بات نہیں --- جب وہ گھڑ سواری سے واپس آیا تھا تو تم اسے دیکھتے---- اس کے جوتے تک گندگی سے لتھڑے ہوئے تھے۔

میں تو یہ کہوں گی کہ وہ ایک تاتاری ہے ---- وحشی' اور جب اس نے مجھے رم (شراب) لانے کو کہا تھا تو بغیر کسی وجہ کے اس نے بہت گندی زبان استعمال کی تھی ---- افسوس ایسی زبان تو کبھی میرے مرحوم شوہر نے بھی استعمال نہیں کی تھی۔"

"آؤ ---- آؤ" چوکیدار نے غیر حاضر دماغی کی حالت میں سکوں کی گنتی کرتے ہوئے کہا "برا وقت تو کسی پر بھی آسکتا ہے"

"ایک بوڑھا آدمی" مالی نے میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا "میں کہتا ہوں کہ وہ ایک بوڑھا شخص ہے ---- حالانکہ کسی کی پیٹھ پیچھے بات کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی"

"لو اور سنو" نوکرانی نے چیخنے کے انداز میں کہا "یہ اس کو بوڑھا شخص کہہ رہا ہے چیزوں کو دیکھتے ہی اگر تم ان کے بارے میں ایسی ہی رائے قائم کر لیتے ہو تو اور بات ہے ورنہ ....."

"اچھا بس اب چھوڑو اس بات کو" چوکیدار نے مداخلت کرتے ہوئے ان کے درمیان صلح کراتے ہوئے کہا "بس وہ تھوڑا سا گنجا ہے اور اپنے ہی انداز کا آدمی ہے لیکن یقیناً" وہ بوڑھا نہیں ہے کیونکہ اس کے بال سنہرے ...."

نوکرانی نے خدا کی قسم کھاتے ہوئے کہا "کیا کہتے ہو یعنی گنجا بھی اور سنہرے بالوں والا بھی ---- جبکہ وہ کالا ہے ایک انڈین کی طرح۔" اور پھر ان کے درمیان ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی' کیونکہ چوکیدار نے جس نے ابھی ابھی مطالعہ ختم کیا تھا اور جو کہ چھوٹا موٹا دانشور بھی تھا' باورچن کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ لیا تھا اور ان سے خاموش رہنے کی استدعا کی تھی۔

اس نے کہا "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بظاہر چار مختلف اشخاص اس کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم ایک لمحے کے لئے سوچیں' تو ہم سب نے اکٹھے ہو کر ایک ہی بار اسے دیکھا ہے۔ یعنی اس کی آمد کے وقت ---- اس وقت وہ اپنی پوستین میں ایک ریچھ کی طرح لگ رہا تھا۔-- میں حیران ہوں کہ یہاں اس گھر میں تین ایسے اشخاص ہیں جو جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ہم فوراً" اسی وقت اسے چل کر دیکھیں۔ وہ اس وقت مطالعے کے کمرے میں ہے میں اسے وہیں چھوڑ کر آیا ہوں"

لیکن باورچن نے مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنے بہنوئی کو جو کہ اس گاؤں کا پولیس والا ہے' بلائے گی اور پھر وہ پانچوں مل کر اسٹڈی کی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھیں گے۔

نیا مالک اپنے ڈیسک کے قریب بیٹھا تھا' لیکن وہ کچھ کر نہیں رہا تھا۔ وہ کمرے کے نیم روشن ماحول میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔

ششدر رہ جانے والے مالی نے کہا "ہاں یہ نیا مالک ہے ---- بالکل ایک لڑکا سا"

نوکرانی نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے کہا "تم نے صحیح کہا تھا --- یہ تو ایک خوفناک بوڑھا شخص ہے۔"

چوکیدار ایک قدم پیچھے ہٹا اس نے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور سرگوشی کے انداز میں کہا "یہ تو بالکل شیطان ہے"

باورچن 'جس نے ہاتھ اپنے ایپرن پر باندھ رکھے تھے' نے مالک کو بڑے رومانوی انداز سے دیکھا۔ پولیس والے نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت بے ہودہ انداز میں باورچن کو آستین سے پکڑ لیا' "میں حیران ہوں کہ تم لوگ وہاں کس چیز کو دیکھ رہے ہو؟ وہاں تو کچھ بھی نہیں سوائے خالی کرسی کے ---!!"

نار بر توفیونتس / محمود احمد قاضی

معذرت نامہ

بوڑھے کارکن نے اسے کچھ کہنے کی یوں جرات کی:-

" اب دیر ہو چکی ہے۔ گھونسلوں میں آرام کرتے پرندوں کو سنو۔ وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دیر ہو چکی ہے۔ تم اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے اور وہاں جا کر کچھ دیر کے لئے آرام کیوں نہیں کر لیتے ؟ جھگڑا نمٹایا جا سکتا ہے۔ ایک بوڑھے آدمی کی نصیحت پر عمل کرو۔ تم گھر کیوں نہیں جاتے؟

"کوئی بات نہیں" ملیشیا مین اس میز کے قریب رکھے گئے سٹول پر بیٹھا ہوا چلایا جس پر اس نے اپنی چھوٹی مشین گن بمعہ اپنے آٹھ میگزینوں کے ڈبے اور پیٹی کے رکھ چھوڑی تھی۔ اس نے سٹول دیوار کے ساتھ ٹکا رکھا تھا۔ اس کی شکن آلود قمیض اس کی پتلون سے باہر لٹک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔

میں نے کہا ہے کہ "کوئی بات نہیں مگر اس گھر کا کوئی فرد اس وقت تک نہیں سوئے گا جب تک کہ میری عزت نفس بحال نہیں ہو جاتی۔ جب تک کہ میری عزت پر لگا دھبہ بالکل دھل نہیں جاتا۔"

بوڑھے آدمی نے وہی کچھ پھر دہرایا جو وہ دوپہر سے کہتا چلا آ رہا تھا۔

"لیکن عزت نفس کیسے بحال ہو سکتی ہے ؟ اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔"

" بوڑھے تم خاصے چالاک آدمی ہو۔۔ اب یہ بکواس بند کرو۔۔۔ تم پوچھتے ہو کہ میری عزت نفس کیسے بحال ہو سکتی ہے؟"

"میں نے ابھی اس کا اندازہ تو نہیں لگایا۔ لیکن بہر حال کوئی چیز میرے اندر سے کہہ رہی ہے کہ میرا انتقام کافی لمبے عرصے پر محیط ہو گا اور خاصا خوفناک ہو گا۔ یہ کسی دوسری طرز کا بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات واضح ہے کہ تم آج ان بیرکوں میں موجود نہیں تھے۔ تم کہتے ہو کہ کل جھگڑا نمٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں سوال عزت کا آن پڑے وہاں انتظار نہیں کیا جا سکتا" اس نے پختہ یقین کے ساتھ کہا اور پھر اپنی کنپٹیوں کو دبانے لگا جیسے کہ وہ کسی برے خیال کو اپنے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا ہو۔ "دیکھو۔۔۔ میں ایسی کسی بات کے متعلق نہیں سوچ سکتا جو کہ انتقام سے متعلق ہو۔"

فلورنیٹا اپنے ماں باپ کے درمیان اپنے کسی قصور کی سزا پانے والے سکول کے بچے کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی تمام جسمانی خوبصورتی ماند پڑ چکی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال بے ترتیبی سے اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اس کی جلد کی رنگت پگھل کر اس کے کپڑوں کے ایک ٹکڑے کی رنگت میں تبدیل ہو چکی تھی۔۔۔ اور یہ ٹکڑا ایک مسلا ہوا نم آلود رومال تھا۔

"اور تم۔۔۔ دوغلی کتیا۔۔۔ تم اب یہ رونا دھونا بند کرو" ملیشیا مین نے حکم دیا۔

ماں نے جیسے کہ وہ ابھی ابھی نیند سے جاگی ہو چلاتے ہوئے کہا "میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی"

ملیشیامین نے اپنی مشین گن میز پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ تم کیسے مجھے اس بات کی اجازت نہیں دو گی۔"

"خدا کے لئے ایسے مت کرو" ماں نے کہا

اور وہ بولتا رہا

"تم اجازت نہیں دو گی؟ ہوں --- کس نے کہا تھا کہ تم ایسی دوغلی کتیا کو جنم دو؟"

فورنٹینا نے ایک لمبی سسکی لی۔

اب ملیشیامین نے بھی رونا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی نکال لیا تھا۔ یہ سکول کی کاپی سے پھاڑا گیا ایک لائنوں والا کاغذ تھا جس پر فلورنٹینا کی بڑے بڑے ٹیڑھے میڑھے لفظوں کی ایک تحریر تھی۔

"بوڑھے -- کیا تم نے اسے دیکھا ہے --- کیا تم نے اس کو بغور دیکھا ہے؟"

"ہاں میرے بچے --- دوپہر کے وقت سے جب سے تم یہاں آئے ہو میں نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا۔"

"لیکن کیا تم نے اس پر غور کیا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ دیکھو --- یہاں لکھا ہے "جو ٹافیاں تم نے بھیجی ہیں وہ بہت مزیدار ہیں" کیا تم نے اسے نہیں پڑھا؟ اور یہاں --- یہاں --- دیکھو اسے۔ وہ لکھتی ہے" اگر تمہارے کپڑے گندے ہو گئے ہوں تو تم انہیں میرے پاس بھیج دو تاکہ میں انہیں دھو دوں" پڑھ لیا تم نے؟"

اب وہ زیادہ شدت سے رونے لگا تھا البتہ اس نے اس وقت کی جذباتی کیفیت پر قابو پا لیا تھا جب اسے اس کے کمپنی انسٹرکٹر نے بلا کر کہا تھا۔

"ارے رامن پلومو --- سنو! کیا تم اس فلورنٹینا لوپیز کو جانتے ہو جو تمہارے بھائی کے گھر کے قریب رہتی ہے؟"

"کامریڈ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میری گرل فرینڈ ہے -- پھر وہ میری منگیتر ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ اس کے ماں باپ سے مانگ لیا تھا"۔

انسٹرکٹر نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے مگر ایسی لڑکیوں کے بارے میں محتاط رہنا چاہئے جو رہزنوں کو خط لکھتی ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے کاپی سے پھاڑا گیا ایک کاغذ نیچے پھینک دیا جس پر ایک صاف ستھری تحریر درج تھی اور جسے بڑی کاوش کے ساتھ تہہ کیا گیا تھا۔

خط وہیں لکڑی کے فرش پر پڑا رہا جس کی تہہ کس قدر کھل گئی تھی۔ بیرکوں میں اس وقت ایسی ہی خاموشی تھی جیسے کہ اس وقت تھی جبکہ ابھی خدا نے یہ زمین و آسمان نہیں بنائے تھے۔

"خط کدھر سے ملا ہے؟" رامن پلومو کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اسی روز الوولڈس سے جو کل کی لڑائی میں ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"اب مشق پر جانے کے لئے تیار ہو جاؤ" یہ کہتے ہوئے انسٹرکٹر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

رامن پلومو نے تسمے کھولے اور اپنے بوٹ اتار دیئے۔ بیرک میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رامن پلومو اپنی چارپائی پر پڑا رہا۔ ملیشیا کے آدمی بیرکوں سے نکلنے لگے اور وہ فرش پر پڑے خط سے پرے ہو کر

گزرتے رہے۔

وہ سب چلے گئے۔

تب رامن پلوموDروازے کے قریب آیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے فلورنیتا کا باپ اپنے گھر سے اپنے یوکا (ایک قسم کا پھول) کے کھیت کی طرف چل پڑا۔ جب وہ سہ پہر کے قریب واپس لوٹا تو رامن پلومو ابھی تک میز پر سر رکھے سو رہا تھا اور مشین گن اس کے زانو پر پڑی تھی۔ بوڑھا اپنا تکیہ لے آیا۔۔ ایک نرم تکیہ ۔۔۔ اور اس نے وہ تکیہ رامن پلومو کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ رامن پلومو بیدار نہیں ہوا۔ فلورنیتا کی ماں نے مشین گن اٹھا کر الماری میں رکھ دی۔۔ کہیں وہ حادثاتی طور پر نہ چل جائے۔

رات کے نو بجے رامن پلومو نے آنکھیں کھولیں اور دلیے کی ایک پلیٹ سے جو اسے انہوں نے دی اپنا پیٹ بھرا۔ اس نے اپنا ہتھیار ان سے واپس لیا اور انہیں خدا حافظ کہے بغیر وہاں سے لوٹ آیا۔

فلورنیتا جس نے صبح سے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلی۔

جب بہت سا وقت گزر گیا۔ یعنی تقریباً ایک سال بعد بھی جب وہ گھر سے باہر نکلی تو لوگ تب بھی اس کے متعلق عجیب سی باتیں کرتے تھے۔

معذرت

(وہ دستاویز جو کہ ایک رہزن کے جھولے سے برآمد ہوئی تھی جو ۱۱ مئی ۱۹۶۳ء کی جنگ میں مارا گیا تھا)

مسٹر روز الو والڈس!

میری دعا ہے کہ جب یہ خط آپ کو ملے تو آپ خدا اور کنواری مریم کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک ہوں۔ جناب آپ کے قابل قدر خط کے جواب میں عرض ہے کہ آپ میرے متعلق اور زیادہ نہ سوچیں کہ میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن آپ کو یہ احساس بھی ہونا چاہئے کہ میری منگنی ہو چکی ہے اور میں آپ کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی حالانکہ آپ بہت اچھے ہیں اور محبت کے لائق ہیں۔ میں کسی دوسرے شخص کے لئے اپنی منگنی کیسے توڑ سکتی ہوں اور پھر یہ سوچیں کہ یہ بات میرے لئے کتنی مشکل ہے۔ میں نے آپ کو پسند کیا اور بس۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں خواہش نہیں کی جا سکتی۔ میں دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں کہ آپ کو میری وجہ سے یہ تکلیف اٹھانی پڑی' لیکن میں کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اگر میری منگنی نہ ہوئی ہوتی تو پھر شاید حالات اس سے مختلف ہوتے۔ آپ کے لئے میرے احساسات ہمیشہ اچھے رہیں گے لیکن میں آپ کی خواہش نہ کر سکوں گی۔ آپ مجھے دوبارہ خط نہ لکھیں۔ اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن اس کے سوا میرے پاس کوئی حل موجود نہیں۔ میں آپ کی تحریروں کو پسند کرتی ہوں۔ آپ مجھے ایک دوست کی طرح تو لکھ سکتے ہیں لیکن مجھ سے محبت نہیں کر سکتے۔ میں اس کے بعد آپ کو کوئی خط نہیں لکھوں گی کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح میں پکڑی جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ہی اس دعا کے ساتھ کہ خدا ہمیشہ آپ کا حامی و ناصر رہے میں آپ کو خدا حافظ کہتی ہوں۔

میرا محبت بھرا سلام قبول کیجئے۔

آپ کی فلورنٹینا لوپیز

نوٹ :۔ وہ مزیدار نانفیاں جو آپ نے میرے لئے بھیجی تھیں ان کے لئے بہت بہت شکریہ ! آپ اپنے گندے کپڑے کسی کے ہاتھ بھجوا دیں میں انہیں دھو کر واپس بھیج دوں گی!

فقط

فلورنٹینا لوپیز

لینو نواس کالود / محمود احمد قاضی

جیسی میں ہوں۔۔۔ جیسی میں تھی

جیسے کہ مجھے یاد پڑتا ہے۔ ستمبر کے آخر میں اس قصے کا آغاز ہوا۔ میرا جنم دن قریب تھا اور میری ماں میرے لئے ایک نئی قمیض تیار کر رہی تھی۔ جب وہ قمیض سی رہی تھی تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ کھانسنے لگی اس کی آنکھیں زیادہ کھل گئی تھیں اور وہ اپنا سینہ پکڑے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر کو نہیں بلایا گیا۔ جب اس کی حالت مزید بگڑ گئی اور اس کا بخار بری طرح بڑھنے لگا تو میری خالہ سول کچھ نئی قسم کی خبروں کے ساتھ ہمارے ہاں آئی۔ وہ اپنے چہرے پر ایک طرح کے راز کا تاثر لئے ہوئے دروازے میں کھڑے ہو کر اس کمرے کی طرف دیکھتی رہی جہاں میری ماں لیٹی ہوئی تھی۔ میری ماں نے خالہ کو دیکھا تو اس کا چہرہ چمکنے لگا۔۔۔ پھر وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

خالہ سول جلدی ہی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے بہترین لباس پہنا۔ اس نے اپنے بال سنوارے اور میک اپ کیا۔ لیکن شام کے وقت خالہ سول واپس آئی تو اچانک میری ماں کے چہرے کا سارا جوش و جذبہ سرد پڑ گیا۔ وہ چند لمحوں تک نیچی آواز میں آپس میں باتیں کرتی رہیں' خالہ سول اب تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔۔۔ اس نے بند پلکوں کے ساتھ کہا "شاید تاریخ کے بارے میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے جہاز پر آ رہا ہو۔"

خالہ آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ میری ماں اپنے ہاتھ سینے پر باندھے کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔

"بہر حال۔۔۔۔ سول تمہارا شکریہ!" وہ کمزور آواز بولی۔

یہ آغاز تھا۔۔ کئی مہینوں تک مجھے یہ تبدیلیاں دیکھنی پڑیں۔ اور مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا یا مجھے یوں کہنا چاہئے کہ ان کو میں اس طرح سمجھا کہ میں انہیں اپنے اوپر پورے طور پر واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہر مہینے کوئی ایسا شخص ہے جسے کہ جہاز کے ذریعے آنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ نہیں آپا رہا۔ اسی دوران میری ماں بیمار پڑ جاتی ور پھر اچانک ہی ٹھیک ہو جاتی۔ یا کہ ایسا بس صرف محسوس ہی ہوتا تھا۔ ایک نئی امید کے ساتھ پہنچنے کی ایک نئی تاریخ سر پر آن پہنچے گی۔ خالہ سول پھر نمودار ہو گی مایوسی کے جلو میں۔۔ اور میری ماں ایک بار پھر بیمار پڑ جائے گی۔

لیکن وہ اپنے بیمار ہونے کا ذکر نہیں کرتی تھی بعض اوقات بس تھک جانے کی شکایت کرتی تھی۔ اس نے سینا پرونا کبھی نہ چھوڑا۔ ایک دن جب خالہ سول چلی گئیں تو اس نے کہا۔ "یہ سب کیا دھرا شیطان کا ہے۔ اور اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔"

میں اب بھی اسے کمرے کے کونے میں چھوٹے دروازے سے زیادہ لمبی پتلی دبلی اور زرد سی محسوس کر سکتا ہوں۔ میرے تصور میں وہ اب بھی سر جھکائے ہوئے ایک چھوٹی سی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آجا رہی ہے' جیسے کہ وہ کسی تہہ خانے سے برآمد ہوئی ہو۔ اس وقت ہم دونوں ایل کیرو میں اکیلے رہ رہے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ "میں ایک کرایے دار تلاش کر رہی ہوں۔ وہ بیٹھک میں رہے گی۔ وہ درزن بھی ہے۔ ہمارے پاس کافی جگہ ہے اور میں اپنا کام اپنے کمرے میں کر سکتی ہوں۔"

اس کمرے کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا جہاں میں ہمسائے کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ درزن جو اس بیٹھک میں رہنے کے لئے آئی ایک مضبوط کاٹھی کی عورت تھی جس کی جلد کالی اور چمکدار تھی۔ میری ماں نے دونوں کمروں کے درمیان کھلنے والے دروازے کو بند کر دیا اور ہم پچھلی گلی میں باغ کے راستے سے اندر باہر آتے جاتے تھے۔

"ہمیں بیٹھک کی ضرورت نہیں ہے" ۔۔۔۔۔ وہ کہتی! " اور مکان کے سامنے والی جو گلی ہے اس میں بہت سارے گڑھے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو وہاں چھوٹے چھوٹے جوہڑ سے بن جاتے ہیں۔ پچھلی طرف سے تم ارد گرد دیکھ سکتے ہو۔۔۔ تم سورج کو غروب ہوتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہو!"

میں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ وہ مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ اپنی کپڑے سینے کی مشین اندر لے آئی تھی اور اسے کمرے میں رکھ دیا تھا اور نامکمل کام کا ڈھیر غسلخانے میں رکھ دیا گیا۔ وہ عورت جو دکان چلاتی تھی اب گھر میں نہیں آتی تھی۔ بعض اوقات ماں مکمل شدہ کام باہر پہنچانے کے لئے جلدی نکل جاتی اور نیا کام لے آتی۔ یہ کوئی زیادہ نہیں ہوتا تھا۔۔ وہ اب آہستہ آہستہ کام کرتی تھی۔ بعض اوقات میں کھڑکی میں سے باغ کی طرف دیکھتا تو مجھے اس کی پیٹھ نظر آتی۔ وہ کام روک کر یعنی مشین چلانا بند کر کے ساکت ہو کر بیٹھی محض دیوار کو تکتی رہتی۔۔۔ جب وہ دوبارہ پیڈل چلانا شروع کرتی تو وہ اپنی پشت کو بالکل سیدھا رکھتی' اس شخص کی طرح جسے کہ مفلوج کر دینے والے درد نے آجکڑا ہو۔

ایک دن اسی نے مجھے بتایا۔ "میں چند ہفتوں کے لئے تمہیں تمہاری خالہ سول کے ہاں بھیج رہی ہوں۔ یا ہو سکتا ہے تمہیں تمہارے ماموں مارٹن کے پاس بھیج دوں۔ میں وہاں دیہات میں جانا چاہتی ہوں اور وہاں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں مجھے کئی ہفتے لگ جائیں گے۔"

میں کبھی دیہات میں نہیں گیا تھا۔ میں نے اس بات کو اس پر ظاہر نہیں کیا تھا سوائے ایک بار بہت پہلے سپین میں۔ پھر جہاز پر واپس پہنچ کر' اور آخری بار یہاں ایل کیرو میں جو میرے ساتھ کمبل کی طرح چمٹا ہوا ہے۔

میں نے پوچھا: "اور میرے دوسرے ماموں!"

"وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔۔۔ وہ یہاں ارد گرد ہی رہتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ مجھے ایک بری عورت سمجھتے ہیں۔ یہ شیطان تھا جس نے کہ انہیں ورغلایا۔۔!"

اسی شام ماموں مارٹن آگیا۔ اس سے پہلے بھی وہ یہاں سے گزرتے ہوئے ہمارے پاس آیا تھا۔ وہ ایک ست سا آدمی تھا جس کا غمگین اور گہری رنگت والا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے ایک چوڑی پٹی باندھے ہوئے دیکھا جس میں ریتی ' پلاس اور ہتھوڑیاں اڑسی ہوتی تھیں' جب وہ جانے کو تھا تو اس نے میری ماں سے کہا: "تم اچھی طرح سوچ لو۔۔۔ اور اگر تم چاہو تو لڑکے کو میرے پاس جب بھیج دو۔

اس نے میری بھلائی میں فوری طور پر اپنے بھائی سے کہا "دیکھو بھائی ۔۔۔ میں جلدی ہی واپس آجاؤں گی۔ یہ تھوڑا سا کام ہے جو مجھے آرٹ میسا میں کرنا ہے۔ لیکن شاید اس کے لئے بہتر ہو گا کہ یہ اپنی خالہ سول کے پاس رہے۔ وہ دیہاتی علاقے میں ہے اور وہاں پھول ہیں۔"

مارٹن نے ہم دونوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ پھر اس نے قدرے حیرانی سے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ "جیسی تمہاری مرضی"۔ اس نے کہا ۔۔۔ "یہ تمہیں ہی پتہ ہے کہ کیا تمہارے لئے اچھا ہے"۔ وہ کسی قدر جھکا ہوا چھوٹے باغ کے راستے سے آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ماں نے روشنی گل کر دی۔ مجھے بستر میں لٹا دیا اور خود کو اس نے جھولنے والی کرسی میں گرا دیا۔

"تمہارے ماموں بہت اچھے ہیں ۔۔۔" ماں نے ایک بار بتایا تھا ۔۔۔ "شاید میں ہی ایک ایسی تھی جو بری تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے لئے کچھ کریں ۔۔۔ نہ ہی وہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ میں تمہیں یہاں لے آئی تاکہ تم آدم کی صحبت سے بچ سکو' وہی ایک سب سے برا ہے۔ خدا اسے معاف کرے۔ خدا ہم سب کو معاف کرے۔ یہ سب شیطان کا کیا دھرا تھا۔" میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بھی آدم کا ذکر سنا تھا اگرچہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرا باپ تھا۔

وہ کہتی چلی گئی۔

"وہ تمارا باپ ہے۔ لیکن جب کبھی بھی تم اس سے ملو تو ایک بات کو ذہن میں رکھنا۔ وہ تمہیں نہیں پہچانتا۔ اس کے علاوہ تم اس جیسے لگتے بھی نہیں ۔۔۔ تم رومنوں کی طرح ہو۔"

وہ خاموش ہو گئی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی آواز قدرے بلند کرتے ہوئے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا "اپنے بستر پر جاؤ ۔۔۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ میں تمہیں کیوں بتا رہی ہوں۔"

اس سے اگلے دن ایک بار پھر وہ احساس تفاخر سے پر لئے دیئے رہنے والی ایک معزز خاتون لگ رہی تھی۔ اب جو میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ 'ایسی شخصیت کی مالک جیسی کہ وہ عورت تھی اسے تو ایک دیہاتی عورت ہونا چاہئے تھا۔ لیکن کوئی بھی اس کے دیہاتی ہونے کے بارے میں نہیں سوچ رکھتا تھا۔ پھر مزید یہ کہ وہ جس دباؤ کی حالت میں رہتی تھی' کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کیا ہے بلکہ محض یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ وہ ارد گرد کے لوگوں کو حیرانی میں مبتلا کئے رکھتی تھی۔ ایک دن اس نے حبشی عورت سے کہا "تم حیران ہوتی ہو گی کہ میں نے بول چال اور اچھا لباس پہننے کے آداب کس طرح سیکھ لئے۔ تمہارے نزدیک تو مجھے ایک نوکرانی کی طرح کا ہونا چاہئے تھا" اس عورت نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے کندھے اچکائے اور بڑبڑانے لگی۔ میری ماں ایک گاہک کی طرف متوجہ ہو گئی جو کہ وہاں موجود تھا اور وہ اس سے دھیمے لہجے میں بات کرنے لگی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں غصے میں آجاتا ہوں۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا جب میں ایسے حالات سے گزرا۔ کوئی میری مدد کرنے والا سمجھانے والا نہ تھا۔ میرے سارے بھائی کیوبا میں تھے۔

وہ صبح سویرے اٹھ کھڑی ہوتی اور اپنا لباس تبدیل کر لیتی۔ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق محسوس ہوتی' لیکن وہ اپنے ہلکے رنگ کے ہموار لباس میں اپنی سبز بے حرکت آنکھوں اور ایک نورانی ہالے کی طرح سر کے گرد پھیلے کالے بالوں کے ساتھ بہت خوبصورت لگتی۔ وہ مجھے بہت زیادہ لمبے قد کی لگتی۔ مارٹن حتیٰ کہ اس حبشی عورت سے

بھی زیادہ لمبی محسوس ہوتی' شاید اس لئے کہ وہ تیزی کے ساتھ موت کی طرف جا رہی تھی۔
"ایک خدمت کرنے والی نوکرانی"--- ایک اور موقع پر اس نے دہرایا--- "میرے خاندان میں آج تک کوئی ایک بھی نوکر نہیں بنا---- خدا کی پناہ!"
اگلی رات مارٹن لوٹا--- میری ماں زندگی سے بھرپور لگتی تھی۔ اس صبح خالہ سول نے ایک ہمسائی رومیکیا کے ذریعے ایک پیغام بھجوایا تھا۔ ایک بار پھر ایک جہاز آنے والا تھا۔
میں نے آرٹ میسا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے--- ماں نے میرے ماموں کو بتایا۔- "آج ہفتے کا دن ہے میں اتوار یہیں گزاروں گی اور میں یہاں مزید ایک ہفتہ تک ٹھہر سکتی ہوں۔ لیکن لڑکا سول کے ہاں جا رہا ہے۔ اس کے پاس جہاں وہ رہتی ہے کافی جگہ ہے۔ میں اسے اس طرح یہاں تمہارے پاس اس ڈربے میں بند چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ وہ تو ایک قبر کی طرح ہے۔"
وہ دونوں خاموش تھے۔ مارٹن نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں میچیں اور سر کو آگے کی طرف جھکائے ہوئے باہر چلا گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف اداسی کے ساتھ دیکھا لیکن میری ماں کی طرف اس نے نظر نہیں اٹھائی۔- اور اس کے بعد اس نے میری ماں کو دوبارہ زندہ حالت میں نہیں دیکھا۔
صبح کے وقت اس حبشی عورت سینا نے ڈرتے ڈرتے ملحقہ دروازے سے پر آواز دی۔--- "ٹریسا--- کیا تم ٹھیک ٹھاک ہو؟"
اس رات میں ایک مدہوش آدمی کی طرح سویا تھا۔ شاید حقیقت میں بھی یہ صحیح تھا۔ جب میں بستر پر سونے کے لئے گیا تو ماں نے مجھے اپنا بنایا ہوا جڑی بوٹی کا مشروب دیا تھا۔ نیند کی حالت میں ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ کھانس رہی ہے لیکن مجھے اس بات کا پورا یقین نہ تھا۔ میری نیند میں بھاری پن کا عنصر تھا۔ بعض اوقات میں خوابوں کی دنیا میں چلا گیا جہاں میں نے محسوس کیا کہ میں نے اس کی آہیں سنی ہیں' لیکن اس بات کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ یہ آہیں حقیقی تھیں یا تصوراتی۔- صبح جب ماں اٹھی تو اس کے بال سنورے ہوئے تھے اور اس نے گھریلو قسم کا پھولوں کے ڈیزائن والا صاف ستھرا کلف لگا لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے چھوٹا دروازہ تھوڑا سا کھولا اور خود اعتمادی کے ساتھ حبشی عورت کی طرف دیکھا۔
"ہاں - شکریہ سینا--- میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے رات ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔- اور بس -" اور ایک بار پھر دہرایا "شکریہ سینا"
میں نے کبھی اسے یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ وہ بیمار ہے۔ اور نہ ہی کبھی ڈاکٹر گھر میں آیا تھا۔ بعض اوقات وہ ایک پوری صبح یا سہ پہر کو غائب ہو جاتی۔ بہرحال اس کے متعلق اس نے مجھ سے یوں وضاحت کی کہ اپنے گھر کے ساتھ ساتھ وہ کبھی کبھی دوسرے لوگوں کے گھروں پر بھی کپڑے سینے چلی جاتی تھی۔
"میں نے اگلے ہفتے ایک دیہات میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ یہاں میرے پاس کچھ کپڑے ہیں جن کو مجھے پہلے نپٹانا ہے"۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی وہ بہت احتیاط سے حرکت کر رہی تھی جیسے کہ اسے خدشہ ہو کہ کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ جائے گی۔ کپڑے سینے والی مشین کے قریب بیٹھ کر اس نے کپڑے کے ایک ٹکڑے پر سنجاف لگانی شروع کر دی۔ کبھی کبھار وہ کام کرتے ہوئے رک جاتی اور باہر کی طرف سے گھر کو آنے والے راستے پر نظریں مرکوز کئے رہتی۔ ایک بار اس نے مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے پکڑ لیا اور سخت لہجے میں بولی! "ادھر آؤ--- اپنا دودھ پیو اور جا کر کھیلو--- بلکہ بہتر ہے کہ تم اپنا سبق پڑھنے چلے جاؤ!"

میں سکول کبھی نہیں گیا--- یہ ہمارے گھر سے بہت زیادہ فاصلے پر تھا جبکہ وہ عورت جو مجھے پڑھاتی تھی وہ گلی کے پار رہتی تھی--- وہ ناشتے کے بعد مجھے پڑھاتی تھی اور پھر دوپہر کے کھانے کے بعد بھی۔

"محتاط رہو" --- ماں کہتی چلی گئی--- "ہم نہیں چاہتے کہ وہ دوبارہ تم پر پتھر پھینکیں"

میں باہر چلا گیا لیکن کھیلنے کے لئے نہیں --- میں نے اپنے آپ کو گھاس پر گرادیا اور ایک کتے کی طرح فضا میں سونگھنا شروع کردیا۔ میری قوت شامہ بہت تیز تھی اور کچھ ہمسائے جو میری اس حس سے آگاہ تھے اس کا حوالہ دیتے تھے۔ ایک بار میں نے دعویٰ کیا کہ ایک کمرے سے ایک مردہ جسم کی بو آرہی ہے اور تین دن بعد ایک بوڑھی عورت جو اس میں رہتی تھی مردہ پائی گئی۔ میری ماں اس کے بارے میں جانتی تھی۔

جب میں دوپہر کے وقت واپس آیا تو سینا اس کے پاس تھی۔ وہ سلے ہوئے کپڑے چھانٹ رہی تھیں۔ رومیلیا بھی ان کے قریب موجود تھی۔ وہ ایک غمزدہ 'ہڈیالی بے دانتوں کی عورت تھی جس کا پیٹ تھوڑا بڑھا ہوا تھا اور آگے کو نکلا ہوا نظر آتا تھا۔

میری ماں نے اسے ایک پیکٹ تھماتے ہوئے کہا "یہ میری بہن سول کے پاس لے جاؤ۔ اسے کہنا کہ وہ کل یہاں آجائے"۔

اس نے سینا کی طرف مڑ کر وضاحت کی "یہ میری سوتیلی بہن ہے-- میرا ایک ہی بھائی ہے۔ اینٹنن اور وہ اس کے لئے باغ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ میرے سوتیلے بھائی ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ مارٹن 'وہاں ٹاٹ بنانے والی فیکٹری میں ہے' جیوئیر اپنی خچر گاڑی چلاتا ہے اور میری سوتیلی بہن Jesus del Monte میں ہے۔ چاروں طرف رومن ہی رومن پھیلے ہوئے ہیں۔"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اب اس کی مسکراہٹ رونے والی شکل میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ خوفناک حد تک زرد ہو گئی اور جو میک اپ اس نے کر رکھا تھا وہ بھی اس زردپن کو مزید بڑھا رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے جسم کو بالکل سیدھا رکھنے کی کوشش کی جیسے کہ ایک صحت مند آدمی کرتا ہے۔ مجھے دروازے میں موجود پا کر اس نے کہا "اور یہ جو سامنے کھڑا ہے--- اسے بھی رومن ہی کہا جاتا ہے--- اس کا کوئی اور خاندانی نام نہیں ہے۔ اور کسی اور نام کی اسے ضرورت بھی نہیں!"

اور پھر اس نے غصے بھری گہری آواز میں اپنے آپ سے کہا "ریڑھ کی ہڈی کے بغیر ایک جیلی فش!"

دونوں عورتیں سینا اور رومیلیا خاموشی سے اسے سن رہی تھیں-- وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھیں-- اسے محسوس کرائے بغیر ان کی نظریں اس سے ہٹ کر مجھ پر آ لگی تھیں۔

"میری ماں نے دہرایا "ایک جیلی فش! میں نہیں جانتی کہ کیسے ...... لیکن خدا مجھے معاف کرے!" اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے نیچے کی طرف دیکھا۔

"اور خدا اسے بھی معاف کرے!"

آہستہ سے اس کی آواز نرم پڑتی گئی--- اس کا جسم تھوڑا سا جھک گیا۔ جب وہ اس بات سے آگاہ ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو سیدھا کر لیا اور بوجھل مگر تحکمانہ لہجے میں بولی: رومیلیا اب جاؤ۔ بنڈل اپنے ساتھ لے جاؤ--- سول سے کہو کہ وہ کل آئے--- شاید انہی دنوں میں دیہات کی طرف چلی جاؤں گی"

رومیلیا نے ہماری طرف مسلسل دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ تیاری پکڑی۔ وہ سینا کے کمرے میں سے ہوتے ہوئے باہر چلی گئی سینا کپڑے سینے کی مشین کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھی رہی۔ کبھی وہ ایک طرف کو جھک

جاتی اور کبھی دوسری طرف تاکہ وہ ہمیں واضح طور پر دیکھ سکے۔ تب میری ماں نے مجھ سے کہا " سوچ رہی ہوں۔ میں کچھ دیر کے لئے آرٹ جیسا میں رک جاؤں۔۔ مجھے وہاں ایک بہتر کام کی دعوت ملی ہے۔ اس عرصہ میں تم کہاں ٹھہرنا پسند کرو گے؟ اپنی خالہ سول کے ہاں یا ماموں مارٹن کے پاس! سول دیہی علاقے میں ہے وہاں پھول ہیں۔"

اب اندھیرا ہونے کو تھا.... وہ دروازے کی طرف گئی اور کچھ کہے بغیر بہت دیر تک وہاں خلا میں گھورتی رہی۔ جب وہ مڑی تو مجھے لگا کہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن مجھے اس نے دیکھنے نہیں دیا۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک گئی اور وہ کھانا جو گلی کی ایک دکان سے منگوایا گیا تھا اسے ڈوئی سے نکالنے لگی۔۔ اور پھر اس نے گنگنانا شروع کر دیا۔

اگلی صبح خالہ سول آ گئی۔ وہ کسی طرح بھی میری ماں جیسی نہ تھی۔۔ وہ زیادہ عمر کی' کسی قدر گوری' چوڑے جسم والی اور ایک دیہاتی عورت والی کھردری آواز کی مالک تھی۔ اس نے میری ماں کی طرف حیرانی اور ترس کی اسی کیفیت کے ساتھ دیکھا جیسے کہ میں نے پڑوسیوں کے چہروں پر دیکھی تھی۔

"میں مزید ایک ہفتہ انتظار کروں گی۔۔۔" میری ماں نے کہا۔۔ "آج میں تاریخ ہے ستائیس کو الفانسو ۱۲ گودی میں پہنچ رہا ہے۔ ایسا ہی ہے ناں!"

اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے موضوع بدل دیا۔۔۔ "اگر میں وہاں ٹھہر جاؤں۔۔۔ تو اسے سکول بھیج دینا۔۔ اسے پڑھائی کرنا ہوگی۔۔۔ یہ کبھی بھی کام کرنے کے لئے فارم پر نہیں جائے گا۔"

تب ایک دم اعتماد بھرے انداز میں اس نے کہا' "آج ۔۔ میں اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ حقیقتاً" میں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں الفانسو......"

پہلی بار' چاہے بہم انداز ہی میں سمجھا' مجھے پتہ چلا کہ اس کے کیف اور افسردگی کی کیفیات تبدیل ہونے کی کیا وجوہات تھیں۔ ایک اور جہاز پہنچنے والا تھا۔

سول نے کہا "تم لڑکے کی فکر مت کرو۔۔۔ ہم اسے سنبھال لیں گے!"

اور میری ماں نے بھولتے ہوئے کہ میں بھی وہاں اس کے قریب تھا اپنے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کہا "اور شاید تم نہیں جانتیں کہ پچھلے دنوں میں سارا وقت دعائیں مانگتی رہی ہوں۔"

پھر ایک اور خیال نے اسے آگھیرا اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا "یہ ٹھیک ہے کہ چاہے میرے متعلق یہ بات سچ نہیں ہے لیکن ان کے نزدیک میں ایک بری عورت ہوں!"

اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک گمبھیرتا کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ وہ ہر روز لباس بدلتی رہی تھی اور اس دن اس نے خوبصورت ترین لباس پہن رکھا تھا۔ لیکن ایک اور نیا لباس بنانے میں مصروف تھی اور اس نے پرفیوم کی ایک شیشی بھی خریدی تھی۔ اس سینٹ نے مجھے ایک اور طرح کی بو سے روشناس کرایا جو کہ کمزور سی تھی مگر یقینی طور پر اب اس نے گھر میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی وہ کئی مہینوں سے ناکامی کا منہ دیکھ رہی تھی۔ جس لمحے وہ زندگی سے بھرپور دکھائی دیتی تھی' تو وہ نوجوان لگتی تھی لیکن وہ اس روشنی کی طرح تھی جو متواتر جل بجھ رہی ہو۔ اس کے جسم پر گوشت نہیں رہا تھا وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی تھی۔

جب سول نے خدا حافظ کہا تو یوں لگا کہ آج اس کے چلے جانے میں اس کی اپنی مرضی شامل نہ تھی۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تم کیا محسوس کر رہی ہو۔ کیا تم اب بھی چاہتی ہو کہ میں اسے اپنے ساتھ نہ لے

جاؤں!"

جب میری ماں بولی تو محسوس ہوا کہ وہ ہذیانی کیفیت میں تھی وہ بات کرتے ہوئے دوسروں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ اس شخص سے مخاطب ہے جو کہ وہاں موجود نہیں تھا۔

" میں سینا سے کہہ رہی تھی کہ دنیا میں بڑے خوفناک لوگ رہتے ہیں۔ وہ تمہیں اپنے پاؤں تلے کچل دیتے ہیں' پھر تمہیں تکلیف پہنچاتے ہیں اور تمہاری بے عزتی کرتے ہیں۔۔ اور کوئی ان سے ایسی باتوں کا جواب طلب نہیں کرتا۔۔۔ یہاں انصاف نہیں ہے!"

اس نے اپنے سر کو جھٹکا' اپنے سینے کو زور سے پکڑ لیا اور نڈھال سی آواز میں بولی "خدا مجھے معاف کرے" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "نہیں۔۔۔ ابھی تم اسے مت لے جاؤ! ہم ایک ہفتہ اور انتظار کریں گے۔۔ کیا تم ایک بار پھر میرے لئے یہ تکلیف کرو گی۔۔۔ گودی تک جاؤ......"

سول اپنا چھوٹا سا سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔۔۔۔ میں نے اپنی ماں کو مٹھیاں بھینچتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔

"بے چاری بہن۔۔۔ یہ اچھی بات نہیں کہ اسے اس طرح کی تکلیف دی جائے"

میری ماں اسے چھوڑنے دروازے تک نہیں آئی۔ جب دروازہ بند ہوا تو وہ اس کے قریب کھڑے ہو کر چھوٹے بیرونی راستے کو تکنے لگی۔ پردے کے دوسری طرف سینا کی کپڑے سینے والی مشین خاموش تھی۔ میری ماں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "یہ کرسی پر جو بنڈل پڑا ہے۔۔ بارہ نمبر میں رہنے والی خاتون کا لباس ہے۔ یہ تم اسے دے آؤ!"

میں باہر چلا آیا لیکن میں کچھ سننے کے لئے دروازے کی دوسری طرف رکا رہا۔۔۔ میں نے سینا کے اندر جانے کی آواز سنی۔

" آج تم پہلے سے بہت اچھی لگ رہی ہو"۔۔ حبشی عورت نے کہا۔۔۔۔ "لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں نے ہسپتال جانے کو مزید نہ ٹالا ہوتا۔۔۔۔ تمہاری وہاں پر بہتر دیکھ بھال ہو سکتی ہے"

وہاں خاموشی رہی پھر میری ماں نے کہا" میں جہاں تک ہو سکے وقت کو رواں رکھنا چاہتی ہوں۔ میں لڑکے کے پاس رہنا چاہتی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے بدصورت اور تھکا ہوا پائے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اس طرح یاد رکھے جیسی کہ میں ہوں..... جیسی کہ میں تھی! جب میں واپس آؤں گی تو میں ایک بار پھر نوجوان ہوں گی۔ میں ایک نوخیز لڑکی کی طرح ہوں گی۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔۔۔ پھر بولی "لیکن یہ ابھی تک یقینی بات نہیں کہ میں جاؤں گی۔۔۔ تم جانتی ہو کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے!"

جب میں واپس گھر پہنچا تو اسے میز کے کنارے کو پکڑے ہوئے جھکا ہوا پایا۔ تب وہ پردے کے پیچھے چلی گئی اور میں بہت دیر تک اس کی بھاری سانسوں کی آواز سنتا رہا۔ لیکن اگلی صبح جب وہ اٹھی تو وہ پرسکون لگ رہی تھی۔ اس نے وہ لباس پہن لیا جو اس نے ابھی ابھی بنایا تھا۔ خالہ سول سویرے سویرے ہی آگئی۔ وہ بہت پرامید لگ رہی تھی' ان دونوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں باتیں کیں۔ جلدی ہی سول تیزی سے باہر نکل گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری ماں اس کی واپسی کی منتظر ہے۔ اس کی آنکھیں پھر سے زندہ ہو اٹھی تھیں اور وہ ایسے اطمینان سے حرکت کر رہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے مہینوں سے نہیں کیا تھا۔ وہ نہائی اور اپنا وہی نیا لباس دوبارہ پہنا اور اپنے چہرے پر میک اپ کیا۔ تب وہ دوبارہ کپڑے سینے کی مشین کے قریب بیٹھ گئی اور بہت نرمی

سے گیت گانے لگی۔ ساری صبح پھر اس نے کمرے میں میری موجودگی کو نظرانداز کئے رکھا۔ سینا نے ہولے سے دروازہ کھولا اور میری ماں کی طرف فکر مندی کے ساتھ دیکھا۔

"سینا۔۔ آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ! تمہیں پتہ ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ آج ہمارے ہاں ایک مہمان آنے والا ہے۔"

اس نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ میں کئی گھنٹوں تک اندر باہر آتا جاتا رہا لیکن اس نے میری موجودگی کو محسوس نہ کیا۔

"تم کو معلوم ہے سینا۔ کوئی کسی کو سمجھ نہیں سکتا۔۔ ہم سب کی اپنی اپنی دنیا ہے۔۔ اور بعض اوقات وہ۔۔۔ وہ کچھ نہیں ہوتا جیسے کہ دوسرے سوچتے ہیں۔ اگر مہمان آگیا تو ہم تمہیں پارٹی پر مدعو کریں گے۔ تم ایک اچھی دوست ہو۔۔۔ سینا!"

اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی اور یہ اس لئے تھا کہ وہ خوش تھی۔ حبشی عورت نے اپنی آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں جیسے اسے کوئی بھوت نظر آگیا ہو۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میری بہن سول کی اطلاع کے مطابق ایک معزز ہستی الفانسو ۱۲ پر آرہی ہے اور اگر یہ سچ ہے تو....."

پھر اس نے ایک لمحے کے لئے اسی حالت میں ساکت رہتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا اور کسی قدر شک کے ساتھ نیچی آواز میں بولی "میں زیادہ پر جوش نہیں ہوں" میں چینیوں کی طرح ہوں۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے اور انتظار کرنا چاہئے' کیا تمہیں اس بچے کا نام معلوم ہے؟ اس کا دوسرا نام رومن ہے! میرے باپ کا نام ۔۔۔۔ لیکن اس کا ایک اور نام بھی ہونا چاہئے۔۔۔ ہر آدمی کے دو خاندانی نام ہوتے ہیں۔ اسے کیوں کوئی چیز دوسروں سے کم ملے؟ اس کا دوسرا نام پیریز ہے۔ میری بہن کہتی ہے ایک بہت اہم شخص الفانسو پر آرہا ہے۔ اور اگر وہ آرہا ہے تو میں جانتی ہوں کہ کیوں! تم دیکھو گی سینا کہ کس طرح سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا!"

میں پردے کے پیچھے فرش پر لیٹا ہوا کچھ سونگھنے میں لگا تھا۔ میرے خیال میں اس بات کو میری ماں نے بالکل محسوس نہیں کیا۔

"تم دیکھو گی سینا۔۔۔ تم دیکھو گی"۔۔۔! میری ماں بولی

حبشی عورت نے آہستہ سے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا جیسے کہ لوگ بیمار لوگوں کی وجہ سے کرتے ہیں۔ لیکن وہ ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ میں گھر سے باہر دوڑ کر گیا اور گلی میں کھلنے والے سینا کے کھلے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کپڑوں کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اپنے آپ سے کہے جا رہی تھی "ایک اہم شخص۔۔۔ ایک معزز شخصیت۔۔۔ بے چاری کا دماغ چل گیا ہے"

اس نے مجھے دیکھ لیا اور اس نے اپنے آپ سے بات کرنا بند کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگ گیا۔ کوئی چیز میرے اندر کلبلا رہی تھی۔ شاید یہ نئی قسم کی بو تھی۔ جب میں کمرے میں واپس گیا تو میری ماں نے تمام بتیاں جلا دی تھیں۔ اس نے مجھے نہانے کے لئے کہا اور پھر اس نے مجھے بہترین کپڑے پہنا دیئے۔

"بس انہیں صرف آج کے لئے پہن لو" اس نے مجھے کہا۔۔ "آج اتوار ہے۔۔ اور تم اب بڑے ہو رہے ہو! تمہارے کپڑے محفوظ رکھنے کا کیا فائدہ؟ اس کے علاوہ ۔۔۔ ہمارے ہاں مہمان بھی تو متوقع ہے! تم اس سے ملو گے۔۔ تم اسے دیکھو گے!"

وہ شگفتہ سی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے لئے تھوڑا تھوڑا کر کے کوشش کرتی رہی تھی۔ جلد ہی وہ جوش میں ڈوبی ہوئی لگنے لگی۔ پھر ایک دم وہ ساکن ہو گئی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی نہ آیا۔۔۔! اب اتنی خاموشی تھی کہ میں اپنے قریب ہوا میں تیرتی ہوئی مکھی کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ لیکن کسی نوعیت کا پیغام اس تک غیر محسوس طریقے سے پہنچ چکا تھا۔۔۔ اور جب کافی دیر بعد خالہ سول کسی خبر کے ساتھ (یا کہ خبر کے بغیر) واپس آئی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ماں نے اسے سننے کے لئے پہلے ہی سے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہوا تھا۔

میری خالہ نے کہا "زیسا۔۔۔ اچھی خبر نہیں ہے۔ حالات پہلے جیسے ہی ہیں! اب بہانہ سازی کا کوئی فائدہ نہیں! شاید ادھر کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ یہاں نہیں آرہا۔۔۔ وہ بیونس آئرز چلا گیا ہے!"

میری ماں کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔۔۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے اظہار سے خالی تھا۔ پچھلے کچھ لمحوں سے اس کا چہرہ بالکل بے جان ہو گیا تھا جیسے کوئی آگ جل کر اپنے انجام کو پہنچ چکی ہو۔۔۔ یہ اب اس کی پرچھائیں رہ گئی تھی یہ چہرہ نہ تھا بلکہ ایک ماسک تھا۔ لیکن اس کی آواز اب بھی ویسی ہی مضبوط تھی اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ تم لڑکے کو اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔۔۔ میں سوچتی ہوں میں وہاں چلی ہی جاؤں گی جہاں کہ مجھے جانا ہے"

اس وقت (اور ایک عرصے کے بعد بھی) یہ میری ماں کی یاد تھی جو کہ میرے ذہن میں ٹھہر گئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ ذہن سے محو ہونے لگی اور اس کے بجائے میں ایک دوسری صورت حال کے ساتھ تنہا رہ گیا۔۔۔ وہی جس کے ساتھ وہ مجھے اس دن چھوڑنا چاہتی تھی جب اس نے کہا تھا: "میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے ایک بدصورت اور تھکے ہوئے چہرے والی عورت کے طور پر یاد رکھے۔۔۔ میں چاہتی ہوں۔ وہ مجھے اس طرح یاد رکھے جیسی کہ میں ہوں۔۔۔ جیسی کہ میں تھی!!

مائیکل اینجل آسٹریاس / محمود احمد قاضی

نیتسوانا کی کہانی

فادر آمنڈ (بادام کا درخت) جس کی داڑھی ہلکی گلابی تھی ان پادریوں میں سے ایک تھا جنھوں نے اتنی عمدگی سے لباس پہنا ہوتا کہ گورے لوگ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں یہ سونے سے بنا ہوا تو نہیں اسے چھو کر محسوس کرتے تھے۔ وہ طبی خواص کے حامل پودوں کے راز جانتا تھا۔ وہ ان دیوتاؤں کی زبان جانتا تھا جو ایک مخصوص نیم شفاف شیشے کے ذریعے گفتگو کرتے تھے اور وہ ستاروں کے خط تصویری کو پڑھ سکتا تھا۔

ایک دن وہ غیر نباتی حالت میں جنگل میں یوں ظاہر ہوا جیسے کہ وہ عالم ارواح سے بھیجا گیا ہو۔ اس کا قد اتنا طویل تھا کہ وہ بادلوں کو چھو رہا تھا وہ سالوں کی گنتی ان چاندوں کے حوالے سے کرتا تھا جو اس نے دیکھ رکھے تھے وہ اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا۔ جب اس نے باغ تولان سے قدم باہر رکھا۔

بوم مچھلی کے پودے چاند کے سے (چار سو دنوں کے سال کے بیس مہینوں میں سے ایک) فادر آلمنڈ نے اپنی روح چار راستوں میں تقسیم کر دی۔ یہ راستے آسمان کے چار حصوں میں منقسم تھے۔ سیاہ حصہ: جادوگری کی رات' سبز حصہ: بہار کا طوفان' سرخ حصہ: منطقہ حارہ کا کیف' سفید حصہ: سرزمینوں کا وعدہ۔

ایک فاختہ نے سفید راستے سے کہا۔ اے راستے ننھے منے راستے۔۔۔ لیکن سفید راستے نے اس کی بات نہ سنی فاختہ کو فادر آلمنڈ کی روح کی ضرورت تھی کیونکہ اسے اپنے خوابوں کا علاج کروانا تھا۔ فاختائیں اور بچے خوابوں ہی کی بیماری میں مبتلا ہوتے تھے۔

اے راستے' اے چھوٹے راستے! سرخ راستے سے ایک دل نے کہا' لیکن سرخ راستے نے نہیں سنا۔ دل سرخ راستے کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا تاکہ وہ فادر آلمنڈ کی روح کو بھول جائے۔ دل چوروں کی طرح وہ کچھ واپس نہیں کرتے جو دوسرے اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

انگور کی بیل نے سبز راستے سے کہا۔ اے راستے' اے چھوٹے راستے' مگر سبز راستے نے نہیں سنا۔ انگور کی بیل فادر آلمنڈ کی روح کے ذریعے اپنا سایہ اور چند پتے واپس لینا چاہتی تھی جو اس نے گنوائے تھے۔

کتنے چاندوں (زمانوں) سے یہ راستے سفر کر رہے ہیں؟

تیز ترین سیاہ راستہ جس سے سارے سفر کے دوران کسی نے کلام نہیں کیا شہر میں داخل ہوا اس نے پلازہ عبور کیا اور سوداگر کے محل میں جا پہنچا جہاں اس نے ایک معمولی سے آرام کی خاطر فادر آلمنڈ کی روح انمول ہیروں کے سوداگر کے ہاتھ بیچ دی۔

یہ سفید بلیوں کا وقت تھا۔ وہ گلیوں میں دبے پاؤں آگے پیچھے گھوم پھر رہی تھیں۔ گلاب کی جھاڑیوں کا عجوبہ! بادل آسمان کے پیالے میں دھوبی کے دھلے کپڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

عین اسی لمحے فادر آلمنڈ نے وہ سب کچھ جان لیا جو سیاہ راستے نے کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر انسانی

شکل یوں اختیار کی کہ قرمزی چاند کی روشنی میں ایک پر بہار بادام کے درخت جیسا اس کا سایہ ایک چھوٹی ندی میں منعکس ہو رہا تھا۔ تب وہ شہر کی طرف چل پڑا۔

جب ڈھور ڈنگر شام کے وقت گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں وہ اس وقت ایک دن کی مسافت کے بعد وادی میں پہنچا۔ گڈریئے اس سبز لبادے اور ہلکی گلابی داڑھی والے شخص کو دیکھ کر مبہوت ہوئے جاتے تھے۔ انہوں نے اسے کوئی بھوت سمجھا اور اس کے سوالات کا غیر واضح جواب دیتے رہے۔

شہر میں پھرتے پھرتے وہ اس کے مغربی حصے کی طرف چلا آیا۔ مرد اور عورتیں عوامی فواروں کے گرد کھڑے تھے۔ ان فواروں کے پانی سے ایسی دل لبھا لینے والی آواز آرہی تھی جیسے صراحی بھرتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ سوداگر کے محل کی طرف جاتے سایوں کا پیچھا کرتے ہوئے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے اپنی روح کے اس ٹکڑے کو پالیا جو سیاہ راستے نے سوداگر کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ انمول ہیروں کے سوداگر نے اسے ایسے کرسٹل باکس میں رکھ چھوڑا تھا جس پر سونے کے تالے لگے ہوئے تھے۔ وہ سوداگر کے قریب جا بیٹھا جو ایک کونے میں تمباکو پی رہا تھا اس نے اس کو روح کے ٹکڑے کے عوض دو ہزار پونڈ وزن کے موتیوں کی پیش کش کی۔

سوداگر فادر کی اس لایعنی تجویز پر مسکرا دیا۔ دو ہزار پونڈ وزن کے موتی ----؟ نہیں میرے ہیرے تو انمول ہیں! فادر آلمنڈ نے اپنی پیش کش میں مزید اضافہ کیا۔ میں تمہیں مکئی کے دانوں کے سائز کے پچاس ایکڑ کے علاقے میں سما جانے والے زمردوں گا جن سے ان کی ایک جھیل بخوبی بن سکتی ہے۔

سوداگر دوبارہ مسکرایا۔ زمردوں کی جھیل ؟--- نہیں---- میرے ہیرے انمول ہیں۔!

میں تمہیں تعویز گنڈے دوں گا--- ہرن کی آنکھیں بھی جو بارش برساتی ہیں۔ وہ پردوں گا جو طوفانوں کا راستہ روکتے ہیں اور تمہارے تمباکو میں ملانے کے لئے میری جوانا!

سوداگر نے انکار کر دیا۔

میں تمہیں زمرد کی جھیل کے وسط میں ایک پریوں کی کہانیوں جیسا محل بنانے کے لئے بہت زیادہ قیمتی پتھر دوں گا!

سوداگر نے اب بھی انکار کیا۔ میرے ہیرے تو انمول ہیں اس لئے ایسی گفتگو کا کیا فائدہ! اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ وہ روح کے اس ٹکڑے کے بدلے میں غلاموں کی منڈی میں موجود سب سے زیادہ خوبصورت غلام عورت کو حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

فادر آلمنڈ اپنی روح کو حاصل کرنے کے لئے کہاں تک اپنی پیش کش کو بڑھاتا جاتا اب مزید بات کرنا بے کار تھا۔ سوداگروں کے دل نہیں ہوتے!

تمباکو کے ہلکے سے مرغولے نے خواب کو حقیقت سے کالی بلیوں کو سفید چوہوں سے اور سوداگر کو اپنے اس اجنبی گاہک سے جدا کر دیا۔ جب وہ واپسی کے لئے مڑا تو فادر آلمنڈ نے اس گھر کی لعنتی گرد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے باہر جانے والے راستے پر اپنے پاؤں کو زور سے پٹخا--!

چار سو دنوں والے ایک سال کے بعد' سوداگر اس غلام عورت کے ساتھ جس کو اس نے فادر آلمنڈ کی روح کے بدلے میں حاصل کیا تھا پہاڑوں میں سے گذرتا ہوا واپسی کا سفر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ایسا پرندہ تھا جو شہد کو بہار یہ پھولوں میں بدل دیتا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑوں پہ سوار ستر خدام کی فوج ظفر موج تھی۔

غلام عورت برہنہ تھی۔ اس کے کالے سیاہ لمبے بال سانپ کی مانند ایک چوٹی میں گندھے ہوئے اس کی

چھاتیوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے اس کی ٹانگوں تک چلے گئے تھے۔ سوداگر نے سونے سے بنا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے کندھے بکری کے بالوں سے بنی قبا سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار اس کے تیس ملازمین اس کے پیچھے خواب میں نظر آنے والے پھولوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

سوداگر نے اپنے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار سفر کرتی ہوئی غلام عورت کو مخاطب کر کے کہا "تم اس کا تصور نہیں کر سکتیں کہ شہر میں تمہاری زندگی کیسی ہو گی۔ تمہارا گھر ایک محل ہو گا۔ اور میرے تمام نوکر تمہارے اشارے کے منتظر رہا کریں گے اور حتیٰ کہ میں بھی اگر تم چاہو تو۔۔۔۔۔" اس کا چہرہ سورج کی روشنی سے تقریباً" سرخ ہو رہا تھا۔ "وہاں" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا "سب کچھ تمہارا ہو گا کیا تم جانتی ہو کہ میں نے اس روح کے بدلے میں محض تمہارے لئے زمردوں کی ایک پوری جھیل لینے سے انکار کر دیا تھا؟ ہم سارا دن جھولنے میں پڑے رہا کریں گے اور کوئی کام نہیں کریں گے۔ بس صرف اس بوڑھی عقلمند عورت سے کہانیاں سنا کریں گے۔ اسے میری قسمت کا حال معلوم ہے اور وہ جانتی ہے کہ میرا مقدر ایک جناتی ہاتھ میں ہے۔۔۔ اگر تم اس سے پوچھو گی تو وہ تمہاری قسمت کا حال بھی بتائے گی"

غلام عورت نے مڑ کر اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھا۔ یہ سارا پیش منظر گونگی روحوں کا مسکن معلوم ہوتا تھا جو دور بہت دور جا کر دھندلاہٹ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ دو رویہ ایستادہ درخت اتنا خوبصورت انداز اختیار کئے ہوئے تھے کہ جیسے کسی عورت کی شال پر بنا ایک نہایت خوبصورت ڈیزائن ہو۔ آسمان خاموش تھا۔ پرندے بغیر کوئی آواز پیدا کئے یوں اڑ رہے تھے جیسے ان کے پر نہ ہوں اور وہ سوئے ہوئے ہوں۔ اس پتھریلی خاموشی میں چڑھائی چڑھتے ہوئے گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز انسانی آواز معلوم ہوتی تھی۔

اچانک بارش کے چند موٹے موٹے قطرے راستے پر پھیلنے لگے۔ نیچے ڈھلانوں پر اپنے ڈرے ہوئے جانوروں کو اکٹھا کرتے ہوئے گڈریوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ گھوڑوں نے پناہ حاصل کرنے کے لئے اپنے قدم تیز کر دیئے لیکن اس کے لئے اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ تیز ہوا بادلوں پر اپنی تندی کا کوڑا برساتے ہوئے ایک شور پیدا کرتی ہوئی وادی میں پہنچ گئی جو دھند کی چادر میں چھپ چکی تھی جبکہ آسمانی بجلی کے پہلے چمکارے نے اردگرد کے ماحول کو ایک پاگل فوٹو گرافر کے فلیشز کی مانند روشن کر دیا تھا۔

گھوڑے خوفزدہ ہو کر بڑبڑاتے ہوئے اپنی باگیں تڑوا بیٹھے' ان کی ٹانگیں ہوا میں معلق ہو گئیں۔ ان کے کان پیچھے کی طرف گردن سے چپک گئے تھے اور ان کی ایالیں ہوا سے الجھ رہی تھیں۔ سوداگر کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور اپنے سوار کو ایک ایسے درخت کی جڑوں کے قریب لا پھینکا جو اس وقت آسمانی بجلی کے لشکارے کی لپیٹ میں تھا۔ اس درخت کی جڑوں نے اس ہاتھ کی طرح جس میں کہ کوئی پتھر پکڑا گیا ہوا اس شخص کو پکڑ کر نیچے گہری کھائی میں پھینک دیا۔

اسی دوران فادر آلمنڈ جواب تک شہر ہی میں موجود تھا۔ گلیوں میں آوارہ گھوم پھر رہا تھا بچے اس سے ڈر رہے تھے وہ کچرے کے ڈھیروں میں سے ہوتا ہوا گدھوں بیلوں اور آوارہ کتوں سے باتیں کرتا پھر رہا تھا جو انسان کی طرح سارے کے سارے غمگین آنکھوں والے جانور ہیں۔

کتنے زمانوں سے یہ راستے سفر میں ہیں؟ وہ ہر دروازے پر دستک دیتا اپنا یہ سوال دہرائے جا رہا تھا۔ مگر لوگ گونگے بنے اس سبز قبا میں ملبوس ہلکی گلابی داڑھی والے عجیب سے حلیئے کے شخص کو دیکھتے اور اپنے دروازے بند کر لیتے جیسے انہوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

آخر کار فادر آلمنڈ انمول ہیروں کے سوداگر کی چوکھٹ پر آپہنچا اور اس غلام عورت سے مخاطب ہوا جو اکیلی اس طوفان سے زندہ سلامت بچ نکلی تھی۔

کتنے زمانوں سے یہ راستے سفر کر رہے ہیں؟

جواب اس عورت کے ہونٹوں پر آیا مگر پھر جم کر رہ گیا۔ فادر آلمنڈ خاموش تھا۔ یہ بوم مچھلی کے پورے چاند کی رات تھی۔ دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کے چہرے کو یوں چوما جیسے کہ دو محبت کرنے والے ایک لمبی جدائی کے بعد ملے ہوں۔

کچھ کرخت آوازوں نے انہیں چونکا دیا۔ خدا اور بادشاہ کے نام پر ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا' اسے جادو گر کے طور پر اور عورت کو اس کی شریک جرم کے طور پر صلیبوں اور تلواروں کے گھیرے میں ان دونوں کو جیل لے جایا گیا۔ فادر آلمنڈ اسی حلیئے میں تھا یعنی سبز قبا اور ہلکی گلابی داڑھی کے ساتھ ----- اور غلام عورت کا مضبوط بدن یوں عیاں تھا' جیسے کہ وہ سونے کا بنا ہوا ہو۔

سات ماہ بعد انہیں پلازہ میئر میں زندہ جلا دیئے جانے کی سزا کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ عین سزائے موت کے موقعہ پر فادر آلمنڈ نے غلام عورت کے بازو پر اپنی انگلی کے ناخن سے ایک چھوٹی سی کشتی کا نقش ابھارا۔

فادر آمنڈ نے اس نقش (گودنے) کے حوالے سے اسے کہا "تیتسوانا تم جب بھی اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرو تو آزاد ہو سکتی ہو۔ میں تمہیں اپنی روح کی طرح آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس چھوٹی کشتی کی تصویر' دیوار پر زمین پر ہوا میں جہاں تم چاہو بناؤ۔ پھر اپنی آنکھوں کو بند کر کے اس پر سوار ہو جاؤ اور پھر روانہ ہو جاؤ۔

"جاؤ میری روح کسی چکنی مٹی کے بت سے زیادہ طاقت ور ہے"

"میری روح خوشبوؤں سے کشید کردہ شہد سے زیادہ میٹھی ہے"

"میری روح کی طرح تم غیر مرئی ہو جاؤ گی"

تیتسوانا نے فوراً" وہی کیا جیسا کہ فادر آلمنڈ نے کہا تھا۔ اس نے کشتی کا خاکہ بنایا اپنی آنکھیں بند کیں اور اس پر سوار ہو گئی کشتی روانہ ہو گئی۔ تو یوں وہ موت اور قید دونوں سے رہائی پا گئی۔

اگلی صبح ' سزائے موت کے دن ' گارڈز کو جیل کی کوٹھری میں صرف ایک مرجھایا ہوا درخت ملا جس کے چند باداموں کے شگوفے ابھی تک ہلکا گلابی رنگ برقرار رکھے ہوئے تھے۔!!

خلیل جبران / حبیب اشعر

طلسمِ خیال

"ابھی میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ نیند اور بیداری کے خوابوں میں ایک انوکھی شکل اور نرالی وضع کی عورت کی پرچھائیاں مجھے نظر آنے لگیں۔ میں اسے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر کے قریب کھڑے دیکھتا اور فضا کی خاموشیوں میں اس کی آواز سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا' تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی انگلیاں میری پیشانی کو مس کر رہی ہیں' میں گھبرا کر ایک دم اٹھ بیٹھتا اور اپنی سماعت پر تمام تر قوتوں کے ساتھ "لاشے" کی سرگوشیوں پر کان لگا دیتا..... میں اکثر اپنے دل سے پوچھا کرتا۔

"کیا میری آوارگی خیال مجھے کھر میں گم کر کے ہی دم لے گی؟ کیا میں نے اپنے خوابوں کے بخارات سے ایک خوبصورت' خوش آواز اور نرم و نازک عورت بنائی ہے کہ وہ اس عالم مادی سے تعلق رکھنے والی جیتی جاگتی عورت کی جگہ لے لے؟ کیا میرا دماغ چل گیا ہے کہ میں نے عقل کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ کی تخلیق کی ہے جسے میں چاہتا ہوں' جس سے مجھے انس ہے' جس پر میں بھروسہ کرتا ہوں' جس سے قریب ہونے کے لئے میں لوگوں سے دور ہو رہا ہوں' جس کی صورت دیکھنے کے لئے اور آواز سننے کے لئے دنیا کی ہر صورت اور ہر آواز کی طرف سے اپنی آنکھ اور کان بند کر رہا ہوں؟ ..... تو کیا میں دیوانہ ہوں؟ سودائی ہوں؟ جس نے عزلت پسندی پر ہی اکتفا نہیں کی' بلکہ تنہائی کی پرچھائیوں سے اپنے لئے ایک رفیقہ .... ایک شریکہ حیات بھی پیدا کر لی؟

میں نے "شریکہ حیات" کہا ہے اور تم لوگ اس لفظ پر تعجب کر رہے ہو' لیکن اس عالم ہستی سے ماورا' کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن سے ہم صرف متعجب ہی نہیں ہوتے بلکہ انکار بھی کرتے ہیں' اس لئے کہ وہ ہمیں ناممکنات میں سے نظر آتی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ تعجب اور انکار انکی حقیقت کو محو نہیں کر سکتا' جو ہمارے نفس میں ایک مستحکم عمارت کی طرح قائم ہیں۔ یہ خیالی عورت میری شریکہ حیات تھی' جو زندگی کی ہر خواہش' ہر کوشش' ہر خوشی اور ہر رغبت میں میرا ساتھ دیتی۔ میں صبح اٹھتا' تو دیکھتا کہ وہ میرے بستر کے تکیوں سے ٹیک لگائے' مجھے ان نگاہوں سے تک رہی ہے' جو بچپن کی پاکیزگی اور ماں کی ممتا سے لبریز ہیں۔ کوئی کام کرنا چاہتا' تو وہ میرا ہاتھ بٹاتی' کھانے کے لئے دستر خوان پر بیٹھتا وہ میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کرتی اور جب شام ہوتی تو میرے قریب آتی اور کہتی۔

"اب ہمیں یہاں بہت دیر ہو گئی۔ آؤ! ٹیلوں اور وادیوں کی سیر کریں!!"

میں فوراً" کام چھوڑ دیتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیر کے لئے چل کھڑا ہوتا۔ یہاں تک کہ ہم جنگل میں جا پہنچتے جس پر طلسم سکوت کے تاروں سے بنی ہوئی شام کی نقاب پڑی ہوتی اور ہم ایک بلند چٹان پر پہلو بہ پہلو بیٹھ کر دور افق پر نگاہیں جما دیتے۔ وہاں کبھی وہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے سنہری بادلوں کی طرف اشارہ کرتی اور کبھی اس پرندے کی چہکار کی طرف توجہ دلاتی جو شب گذاری کے لئے شاخوں میں پناہ لینے سے پہلے خدا کی حمد و

تسبیح میں مشغول ہوتا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے کمرے میں بے قرار و مضطرب بیٹھا ہوں کہ وہ آگئی اور جونہی میری نگاہ اس پر پڑی' بے قراری سکون سے بدل گئی اور اضطراب سکون اور یگانگی سے۔

بار ہا میں لوگوں سے دو چار ہوا ہوں اور میری روح باغیانہ انداز میں ان کی فطرت کے برے پہلوؤں کے خلاف صف آراء ہوئی ہے' لیکن جہاں ان کے چہروں میں مجھے اس کا چہرہ نظر آیا' میرے باطن کا تمام طوفان' سمادی نغمتوں میں تبدیل ہوگیا۔ بسا اوقات یہ واقعہ پیش آیا کہ میں تنہا بیٹھا ہوں اور گردن میں ہستی کی مشکلوں اور دشواریوں کی زنجیر ہے لیکن مڑ کر جو دیکھتا ہوں' تو وہ میرے سامنے کھڑی' مجھے ان نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ جن سے رنگ و نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں' اسے دیکھتے ہی غم کے سارے بادل چھٹ گئے' دل خوشی کے راگ الاپنے لگا اور زندگی' چشم بصیرت کے سامنے عشرتوں اور مسرتوں کی جنت بن کر جلوہ گر ہو گئی۔ تم مجھ سے سوال کرو گے' میرے دوستو! کہ میں اس انوکھی حالت پر کیسے قانع رہا؟ پوچھو گے کہ انسان عنفوان شباب میں اس چیز پر کیسے اکتفا کر سکتا ہے' جسے وہم اور خیال و خواب بلکہ نفسی روگ سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اپنی عمر کے چند سال' جو میں نے اس حالت میں گزارے' اس حسن' سعادت' لذت اور اطمینان کا نچوڑ تھے جن سے میں اپنی زندگی سے آشنا ہوا۔ کہوں گا کہ میں اور میری یہ ایتھری رفیقہ ایک آزاد اور مجرد فکر تھے' جو سورج کی روشنی میں طواف کرتی ہے' سمندر کی سطح پر تیرتی ہے۔ چاندنی راتوں میں دوڑتی ہے اور وہ نغمے گنگناتی ہے' جنہیں کسی کان نے نہیں سنا۔ اس منظر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے' جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔

زندگی ..... تمام و کمال زندگی ..... ہم روحانی تجربات میں رہے اور ہستی .... تمام تر ہستی .... وجود کے عرفان و تحقیق میں گذاری۔ جس سے ہم خوش ہوتے ہیں یا اس کی وجہ سے دردناک! اور مجھے ایک روحانی تجربہ ہو گیا تھا۔ شب و روز ہوتا رہتا تھا' یہاں تک کہ میں تیس برس کا ہو گیا۔

کاش! میں تیس برس کا نہ ہوتا! کاش! اس عمر کو پہنچنے سے پہلے مجھے ایک ہزار بار موت آجاتی' جس نے میرا جوہر حیات سلب کر لیا اور میرے دل کا سارا خون نچوڑ کر مجھے شب و روز کے سامنے ایک تنہا' خشک اور بے برگ و بار درخت کی طرح کھڑا کر دیا' جس کی شاخیں ہوا کے نغموں پر رقص کرتی ہیں' نہ پرندے اس کے پتوں اور پھولوں کے درمیان اپنے آشیانے بناتے ہیں۔" وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں اس کی دونوں کلائیاں ڈھیلی پڑ کر کرسی کی ہتھیوں پر لٹک گئیں اور وہ یاس و ناامیدی کا مجسمہ معلوم ہونے لگا۔ ہم سب خاموش بیٹھے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں' جو مجروح ہستی کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی کہا۔

"بیس برس کا ذکر ہے' میرے دوستو! لبنان کے حاکم نے ایک علمی مہم کے سلسلہ میں مجھے وینس بھیجا اور وہاں کے محافظ کے نام ایک خط میرے ساتھ کر دیا' جس سے اس کی ملاقات قسطنطنیہ میں ہوئی تھی۔

میں لبنان کو خیرباد کہہ کر اطالوی جہاز میں سوا ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ روح بہار ہوا کی تہوں میں سرسرا رہی تھی۔ سمندر کی موجوں کے ساتھ اٹھلا رہی تھی اور آسمان پر سفید بادلوں کے ہجوم میں قلابازیاں کھانے والی دلفریب صورتوں کے پیکر میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ان شب و روز کی تعریف' جو میں نے جہاز میں گزارے' تم سے کس طرح بیان کروں؟ جو کلام انسان سمجھتا ہے وہ اس کے ادراک و احساس کی حدوں سے متجاوز نہیں ہو سکتا' اور روح میں ایک ایسی بات ہے جو ادراک سے کہیں زیادہ بعید اور شعور سے کہیں زیادہ رقیق ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی تصویر الفاظ میں کیسے کھینچ سکتا ہوں؟

وہ چند سال جو میں نے اپنی اس ایتھری رفیقہ کی معیت میں بسر کئے' انس و الفت سے ہمکنار تھے' اور مسرت و سکون سے لبریز' چنانچہ کبھی خواب میں بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میری مسرتوں کے پردوں میں غم چھپا بیٹھا ہے اور میرے ساغر کی گہرائیوں میں تلخی کے گھاؤ ہیں۔ میں اس پھول کے مرجھانے سے کبھی نہیں ڈرا' جو بادلوں سے ماوراء اگا تھا اور اس نغمہ سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا' جو صبح کی پریوں نے گایا تھا۔ جب میں ان ٹیلوں اور وادیوں سے رخصت ہوا' تو میری رفیقہ اس گاڑی میں میرے پہلو سے لگی بیٹھی تھی' جو مجھے ساحل پر چھوڑنے گئی تھی۔

وینس جانے سے پہلے میں تین روز بیروت میں مقیم رہا' اس دوران میری شریک حیات مجھ سے ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوئی' جہاں میں جاتا' وہ میرے ساتھ جاتی اور جب ٹھہرتا' وہ بھی ٹھہر جاتی۔ میں اپنے کسی دوست سے ہاتھ ملاتا تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں محسوس کرتا اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر شہر کی آوازوں پر توجہ صرف کرتا' تو فکر و تامل میں میرا ساتھ دیتی' لیکن جب کشتی نے مجھے بیروت کی بندرگاہ سے جدا کیا اور میں نے جہاز پر قدم رکھا۔ اسی لمحہ اپنی فضائے روح میں ایک تغیر اور ایک طاقت ور مگر مخفی ہاتھ کو اپنا بازو پکڑتے محسوس کیا۔ میں نے ایک گہری آواز سنی' جو سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "واپس ہو جا! جہاں سے آیا ہے' وہیں واپس ہو جا!!! کشتی میں بیٹھ اور جہاز چلنے سے پہلے اپنے ملک کے ساحل کی طرف لوٹ جا!!!"

آخر کار جہاز روانہ ہوا' اس کی پشت پر میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے فضائے بسیط میں اڑتے ہوئے باز کے چنگل میں چڑیا۔ شام ہونے پر جب لبنان کی چوٹیاں سمندر کی کہر کے پیچھے روپوش ہو گئیں تو میں نے خود کو جہاز کے اگلے حصہ پر تنہا کھڑے پایا۔ میرے خوابوں کی پری وہ عورت جسے میں پیار کرتا تھا' ..... وہ عورت جو میری رفیقہ شباب تھی' میرے ساتھ نہ تھی وہ نوخیز حسینہ' وہ شیریں کلام محبوبہ' جس کا چہرہ جب بھی میں فضا میں نگاہیں جماتا تھا' مجھے نظر آتا تھا' جس کی آواز' جب بھی میں خاموشی پر کان لگاتا تھا' مجھے سنائی دیتی تھی اور جس کا ہاتھ' جب میں بھی آگے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا' میرے ہاتھ سے مس ہوتا تھا' جہاز میں نہ تھی' اور پہلی مرتبہ ..... ہاں! بالکل پہلی مرتبہ میں نے خود کو رات' سمندر اور فضا کے سامنے یکہ و تنہا محسوس کیا۔ جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا اور میں اپنی رفیقہ کو دل ہی دل میں پکارتا رہا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی موجوں کو تکتا رہا کہ شاید کف سمندر ہی میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دے جائے۔

جب رات بھیگی' تو جہاز کے مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے' لیکن میں جہاں کھڑا تھا' سرگشتہ و تنہا حیران و مضطرب وہیں کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے گردن موڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کہر میں کھڑی ہے مجھے جھرجھری سی آگئی' اور میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بلند آواز میں کہا۔

"مجھے نہ چھوڑ خدا را! مجھے اکیلا نہ چھوڑ!!! تو کہاں چلی گئی تھی؟ تو کہاں تھی؟ میری محبوبہ میرے پاس آ! آ' میری جان میرے پہلو میں آ' اور مجھے کبھی نہ چھوڑ!!!" لیکن وہ میرے پاس نہ آئی' بلکہ بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی' اس کا چہرہ رنج و الم کی شدت سے اتنا بھیانک ہو گیا کہ اس سے زیادہ خوفناک منظر میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ گھٹی ہوئی پست آواز میں اس نے کہا۔ میں تجھے ایک نظر..... ہاں! صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے سمندر کی گہرائیوں سے آئی ہوں اور اب پھر وہیں واپس جا رہی ہوں۔ تو بھی جا اور اپنی خواب گاہ میں آرام سے سو! یہ کہہ کر وہ کہر میں تحلیل ہو گئی۔ میں اسے بھوکے بچہ کی طرح لجاجت سے پکارتا اور اس کو پکڑنے کے لئے بازو پھیلاتا رہ گیا لیکن شبنم شب سے گراں بار ہوا کے سوا اور کچھ میرے ہاتھ نہ آیا' مجبور و مایوس ہو کر میں اپنے کمرہ میں واپس آیا' عناصر میری روح میں برسرپیکار تھے' کبھی گرتے تھے' کبھی اٹھتے تھے۔ بالالفاظ دیگر میں اس

جہاز میں ایک دوسرا جہاز تھا۔ جو شک و شبہ اور یاس و ناامیدی کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ جونہی میں نے تکیہ پر سر رکھا' پلکوں پر ایک بوجھ اور جسم میں ایک کسل محسوس کی' چنانچہ فوراً" ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں صبح تک گہری نیند سوتا رہا۔ اس دوران' میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری رفیقہ سیب کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت میں پھانسی پر لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے تلوؤں اور ہتھیلیوں سے خون کے قطرے بہہ بہہ کر درخت کی شاخوں اور پتوں پر ٹپک رہے ہیں اور وہاں سے گھاس پر گر کے زمین پر بکھرے پھولوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔

جہاز شب و روز کی مسافتیں طے کرتا رہا۔ میں اس میں سوار تھا لیکن اس سے بے خبر کہ میں وہ انسان ہوں جو ایک انسانی مہم کے سلسلہ میں اتنے طول طویل سفر پر جا رہا ہے' یا ایک پرچھائیں' جو کہر کے سوا ہر چیز سے خالی فضا میں ماری ماری پھر رہی ہے' چنانچہ نہ میں نے اپنی رفیقہ کی قربت محسوس کی' نہ بیداری یا خواب میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں بے سود مخفی قوتوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ مجھے اس کے منہ کی کوئی بات سنوا دیں' یا اس کی ایک جھلک دکھوا دیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو' توکم از کم مجھے اس قابل کر دیں کہ میں اپنی پیشانی پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر سکوں۔ چودہ دن تک میری یہ حالت رہی' بالآخر پندرھویں دن دوپہر کو دور سے اطالیہ کا ساحل نظر آیا اور اسی دن شام ہوتے جہاز وینس کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ لوگ مسافروں اور ان کے سامان کو جہاز سے اتار کر شہر میں پہنچانے کے لئے بہت سی کشتیاں لے کر آگئے' جو مختلف رنگوں اور طرح طرح کی تصویروں سے مزین تھیں۔

تم جانتے ہو! میرے دوستو! وینس بہت سے چھوٹے چھوٹے قریبی جزیروں پر قائم ہے۔ اس کے مکانوں اور عمارتوں کی بنیاد پانی میں رکھی گئی ہے۔ وہاں سڑکوں کی بجائے نہریں ہیں اور گھوڑے گاڑیوں کا کام کشتیوں سے لیا جاتا ہے۔ جب میں جہاز سے اتر کر کشتی میں آیا تو ملاح نے مجھ سے پوچھا:

"کہاں جائیں گے حضور؟"

میں نے شہر کے محافظ کا نام لیا' تو اس نے نہایت اہتمام اور احترام کے ساتھ مجھے دیکھا اور کشتی کھینے لگا۔

کشتی مجھے لے کر روانہ ہوئی۔ اس وقت رات ہو گئی تھی اور اس نے سارے شہر کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ عظیم الشان عمارتوں' عبادت گاہوں اور عشرت کدوں کی کھڑکیاں بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں اور اس روشنی کا عکس متحرک پانی پر پڑ کر ایک ایسا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا کہ وینس شاعر کا خواب معلوم ہونے لگا تھا۔ کشتی ابھی پہلی ہی نہر کے موڑ پر پہنچی تھی کہ میں نے بے شمار گھنٹوں کی جھنکار سنی جو فضا کو غمناک اور ڈراؤنی آوازوں سے لبریز کر رہے تھے۔ گو اس وقت میری ذہنی بے خبری نے مجھے تمام خارجی مظاہر سے بے تعلق کر رکھا تھا' لیکن گھنٹوں کا وہ شور میخوں کی طرح میرے سینے کو چھیدے ڈال رہا تھا۔ کشتی ایک سنگین زینہ کے پاس جا کر رک گئی' جس کی سیڑھیاں سطح آب سے شروع ہو کر ایک پختہ راستہ پر تمام ہوتی تھیں۔ ملاح نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ایک شاندار مکان کی طرف اشارہ کر کے جو باغ کے وسط میں تھا' کہنے لگا۔ "یہی ہے وہ جگہ۔"

میں کشتی سے اترا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ملاح اپنے کندھے پر میرا سوٹ کیس رکھے' پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب میں مکان کے دروازے پر پہنچا' تو ملاح کو اس کی اجرت دے کر رخصت کیا اور اس کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تو خمیدہ سر خادموں کا ایک گروہ میرے سامنے تھا' جو رو رہا تھا۔ نالہ ماتم کر رہا تھا' گھٹی گھٹی آہیں بھر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا خادم میری طرف بڑھا اور

مجھے مجروح نگاہوں سے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"فرمایئے کیا ارشاد ہے؟"

میں نے کہا کیا وینس کے محافظ صاحب کا دولت خانہ یہی ہے؟ اس نے ایجابی طور پر اپنا سر جھکا دیا۔

میں نے حاکم لبنان کا خط نکال کر اسے دیا' پہلے تو اس نے خاموشی سے اس کا پتہ دیکھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دروازہ کی طرف چلا' جو ڈیوڑھی کے آخری سرے پر تھا' یہ سب کچھ ہوا' لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے' میں بالکل خالی الذہن تھا۔ اس کے بعد ایک نوجوان خادمہ کے قریب گیا اور لوگوں کے نوحہ و ماتم کا سبب معلوم کیا۔ دردناک لہجہ میں اس نے جواب دیا۔ "تعجب ہے! آپ نے نہیں سنا کہ آج محافظ صاحب کی بیٹی کا انتقال ہو گیا!"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

میرے دوستو! اس شخص کی حالت پر غور کرو جس نے ایک مبہم فکر کی مثال سمندر کا سفر طے کیا اور اس فکر کو فضا کی ایک قہرمانی قوت نے کف آگیں موجوں اور خاکستری کہر میں تلف کر دیا۔ اس نوجوان کی کسمپرسی و بے چارگی کا اندازہ کرو جو یاس و ناامیدی کی آہ و زاری اور سمندر کی چیخ و پکار کے درمیان دو ہفتہ تک مصروف سفر رہا اور جب منزل مقصود پر پہنچا تو خود کو ایک ایسے مکان کے دروازہ پر دیکھا جس کے گوشوں میں درد و الم کی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں اور جس کی فضا رنج و غم کی آہ و کراہ سے لبریز تھی۔ اس غریب الوطن انسان کا تصور کیا کرو! میرے دوستو! جو ایک ایسے محل میں مہمان ہونے کے لئے پہنچا' جس پر موت کے سیاہ بازو سایہ فگن تھے۔

وہ نوکر جو میرا خط لے کر اپنے آقا کے پاس گیا تھا واپس آیا اور سر جھکا کر کہنے لگا "تشریف لایئے! سرکار آپ کا انتظار فرما رہے ہیں ...." یہ کہہ کر وہ میرے آگے ہو لیا۔ جب ہم اس دروازہ پر پہنچے' جہاں راستہ ختم ہوتا تھا تو اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا' اور میں ایک وسیع کمرہ میں داخل ہو گیا' جس کی چھت کی اونچی فضا شمعوں سے روشن تھی۔ وہاں کچھ پادری اور معزز و مقتدر حضرات بیٹھے تھے جن پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میں بمشکل دو چار قدم ہی چلنے پایا تھا کہ ایک سفید ریش بوڑھا' جس کی کمر وفور غم سے جھک گئی تھی۔ اور جس کا چہرہ شدت الم سے بے رونق ہو گیا تھا' اٹھا اور میری طرف بڑھ کر یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

مجھے سخت اذیت ہے کہ آپ اتنا طویل سفر کر کے یہاں تشریف لائے اور ہمیں اپنی عزیز ترین متاع کے غم میں مبتلا پایا' لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری یہ ابتلا اس غرض کی تکمیل میں حائل نہ ہو گی' جس کے لئے آپ نے اتنی زحمت گوارا فرمائی ہے' لہٰذا آپ کو بالکل پریشان نہ ہونا چاہیے۔" میں نے چند بے ربط الفاظ میں اس مصیبت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس مہربان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک کرسی کی طرف لے گیا۔ جو دیوان کے قریب رکھی تھی اور میں بھی حاضرین کی طرح ساکت و صامت بیٹھ گیا۔ نگاہیں بچا کر کبھی تو میں ان کے غمگین چہروں کو دیکھتا اور کبھی ان کی سرد آہیں سنتا تھا۔ جو میرے دل کے پرخچے اڑائے دیتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے لوگ وہاں سے چلے گئے اور اس خاموش کمرہ میں میرے اور غمزدہ باپ کے سوا اور کوئی نہ رہا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا اور اسکی طرف بڑھ کر کہا "آپ مجھے اجازت دیجئے۔" التجائی لہجے میں اس نے جواب دیا'

"نہیں! اتنی جلدی نہ تشریف لے جایئے! اگر آپ ہمارے رنج و غم کو دیکھنے اور ہماری آہ و فریاد سننے کی تاب رکھتے ہیں' تو ابھی ہمارے مہمان رہیے۔" اس کے ان الفاظ نے مجھے شرمندہ کر دیا اور میں نے رضامندی کے

طور پر سر جھکا دیا۔ اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا.... "اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان نوازی میں اہل لبنان دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم سے ممتاز ہیں' تاہم میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں قیام فرمائیں تاکہ ہم بھی.... گو پورے طور نہ سہی لیکن آپ کے لئے وہ آسائش بہم پہنچانے کی کوشش کریں جو ایک پردیسی کو آپ کے ملک میں ملتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد غمزدہ بوڑھے نے نقرئی گھنٹی بجائی اور ایک غلام زرکار لبادہ پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ بوڑھے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے معزز مہمان کو مشرقی کمرہ میں پہنچا دو اور آپ کے اکل و شرب کا خیال رکھو۔ دیکھو آج سے تمہارا کام بس یہی ہے کہ آپ کے راحت و آرام میں رتی برابر خلل نہ آئے۔"

ملازم مجھے ایک کشادہ اور خوش وضع کمرے میں لے گیا جس میں قیمتی فرش بچھا تھا۔ اور جس کی دیواریں قوم اور ریشمی پردوں سے مزین تھیں۔ وسط میں ایک نفیس مسہری تھی اور مسہری پر ایک قیمتی کمبل اور کڑھے ہوئے خوشنما تکیے رکھے تھے۔ دو گھنٹے اسی بے قراری کے عالم میں گزر گئے کہ میں کبھی تو کمرے میں ٹہلنے لگتا اور کبھی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر فضا کو تکنے لگتا یا ملاحوں کی آوازوں اور پانی میں چپوؤں کی جنبشوں پر کان لگا دیتا۔ یہاں تک کہ بیداری نے مجھے تھکا دیا اور میری فکر مظاہر و اسرار میں گم ہو گئی۔ میں مسہری پر گر پڑا اور خود کو ایک نیم شعوری کیفیت کے حوالے کر دیا جو نیند کی مدہوشی اور بیداری کی ہوشیاری سے مرکب تھی۔ جس میں یاد اور فراموشی اسی طرح کروٹیں لے رہی تھیں' جیسے ساحل سمندر کا مدوجزر! اس وقت میں ایک خاموش میدان کار زار کی مثال تھا' جس میں فوجیں خاموشی کے ساتھ مصروف پیکار تھیں۔ موت کا دیو سپاہیوں کو برابر زمین پر دے دے مار رہا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر رہے تھے۔

میرے دوستو! مجھے معلوم ہے کہ میں نے اس حالت میں کتنے گھنٹے گزارے۔ زندگی میں بہت سے میدان ہیں جنہیں ہماری روحیں طے کرتی ہیں۔ لیکن ہم انہیں مادی پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔ جن کی ایجاد انسانی فکر و نظر کی مرہون منت ہے۔

نہیں! میں نہیں جانتا کہ میری یہ حالت کب تک رہی؟ مجھے تو اس وقت بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا اور آج بھی صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نیم شعوری کیفیت کے دوران' میں نے اپنے بستر کے قریب ایک زندہ ہستی محسوس کی' جو کمرے کی فضا میں مرتعش تھی.... ایک اثیری وجود محسوس کیا' جو بغیر کوئی آواز نکالے مجھے پکار رہا تھا اور بغیر کسی اشارے کے مجھ میں جوش و ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک ہمہ گیر و قوی اثر کے تحت کمرہ سے باہر نکل آیا۔ میرے قدم غیر ارادی طور پر اٹھ رہے تھے میں اس شخص کی طرح چل رہا تھا' جو سوتے میں چلتا پھرتا ہے اور اس عالم میں چل رہا تھا' جو وقت اور فاصلہ کی قیدوں سے یکسر آزاد تھا۔ یہاں تک کہ میں نے ساری ڈیوڑھی طے کر لی اور ایک بہت بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے کے وسط میں ایک لاش رکھی تھی۔ جس کے دائیں بائیں دو لیمپ روشن تھے۔ اور چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے قدم بڑھایا اور جھک کر دیکھا۔ اف! وہ میری محبوبہ کا چہرہ تھا.... میرے خوابوں کی پری کا چہرہ تھا۔ جس پر موت نے اپنی باریک نقاب ڈال رکھی تھی۔ آہ میری آنکھوں کے سامنے وہ عورت تھی۔ جس سے میں محبت سے بڑھ کر محبت کرتا تھا۔ سفید پھولوں کے درمیان' سفید کفن کے درمیان' وہ سفید و بے جان جسم تھا۔ جس پر زمانے کی خاموشی اور ازل کی دہشت طاری تھی۔

اے خدا! اے محبت کی زندگی اور موت کے مالک! تو ہی ہے جس نے ہماری روحوں کو پیدا کیا اور نور و ظلمت کے اس ہجوم میں پھینک دیا .... تو ہی ہے' جس نے ہمارے دلوں کی تخلیق کی اور انھیں امید و الم کی دھڑکنیں عطا کیں .... ہاں! تو ہی ہے جس نے میری رفیقہ کو مجھ سے ملایا' لیکن اس وقت جب اس کا تابناک جسم سرد و بے جان ہو چکا تھا.... تو ہی ہے جس نے مجھ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ موت زندگی سے کیا چاہتی ہے اور غم خوشی سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ مجھے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا دیا.... تو ہی ہے جس نے میری وحدت و تنہائی کے جنگل کو ایک سفید چنبیلی کے پھول سے زینت بخشی اور اس کے بعد مجھے دور ایک وادی میں پھینک دیا' تاکہ میں وہاں اس پھول کو مرجھایا ہوا دیکھوں..... ہاں میرے دوستو! میری غربت اور تنہائی کے رفیقو! اللہ نے چاہا اور اپنی مشیت کے لئے مجھے اندرائن کا تلخ جام پلا دیا۔

ہم انسان' ہم لامحدود فضا کے مرتعش ذرے' اطاعت و فرمانبرداری کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم محبت کرتے ہیں' تو وہ محبت ہماری طرف سے ہوتی ہے' نہ ہمارے لئے ہوتی ہے۔ ہم اگر خوش ہوتے ہیں' تو وہ خوشی ہماری ذات میں نہیں ہوتی بلکہ نفس حیات میں ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم دردناک ہوتے ہیں' تو وہ درد ہمارے زخموں سے نہیں پھوٹتا' بلکہ افشائے فطرت سے پھوٹتا ہے۔

دوستو! میں نے تمھیں کہانی شکایتاً" نہیں سنائی۔ اس لئے کہ جو کوئی شکایت کرتا ہے' وہ زندگی پر شک کرتا ہے اور میں صاحب ایمان ہوں' اس تلخی کی صلاحیت پر ایمان رکھتا ہوں' جس کا حاصل ہر وہ گھونٹ ہے' جو میں ساغر شب کے ذریعہ پیتا ہوں' ان میخوں کے حسن و دل کشی پر ایمان رکھتا ہوں جو میرے سینے کو چھیدے ڈالتی ہے۔ ان فولادی انگلیوں کی نرمی و ملائمت پر ایمان رکھتا ہوں جو میرے دل کے پردہ کو جھرجھر کئے دیتی ہیں۔

دوستو! یہ ہے میری کہانی! میں اس کہانی کا انجام کیا بیان کروں۔ جبکہ اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ میں اس نوخیز حسینہ کی میت کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا رہا' جسے میرا دل خواب و خیال کی دنیا میں چاہتا تھا اور میری نگاہ ایک لحہ کے لئے اس کے چہرہ سے نہ ہٹی۔ یہاں تک صبح نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے شیشوں پر رکھ دیا۔ اب میں اٹھا اور اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ اس عالم میں میری کمر ابدیت کی گرانیوں سے دہری ہوئی جا رہی تھی اور میرے ہاتھ میں انسانیت کے درد و غم کا عصا تھا۔

تین ہفتہ تک وینس میں ٹھہر کر میں لبنان واپس آگیا۔ اس شخص کی طرح جو زمانے کی گہرائیوں میں ایک ہزار صدیاں گزار کر واپس ہوا ہو اور ہر اس لبنانی کی طرح' جو دیس سے پردیس لوٹتا ہے۔

مجھے معاف کرنا میرے دوستو! کہ میری داستان بہت طویل ہو گئی۔

انور رضوان / حبیب فخری

ٹک۔ ٹک۔ ٹک

عروس البلاد کے مرکزی حصے میں جو پارک ہے وہاں ہر وقت بالخصوص شام کو اور اتوار کے دن سیر و تفریح کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کارپوریشن کے افسر اس پارک کی خصوصی دیکھ بھال کرتے ہیں جو شہر کے کنکریٹ جنگلوں کے بیچ میں واقع ہے۔ دراصل اس پارک کے ایک گوشے میں ایک اوپن سٹیج بنا ہوا ہے جہاں ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اسے پہلے سے تیار کردہ یا اپنے فی البدیہہ ڈرامے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

اتوار کا دن تھا اور شام کا وقت ہو چلا تھا اور سورج مغرب میں غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا لیکن سٹیج ابھی تک خالی تھا۔ ابھی تک کوئی بھی شخص اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے وہاں نہیں آیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ پارک میں لوگ نہیں تھے۔ نہیں وہاں تو سٹیج کے پاس لوگوں کی ایک بھیڑ لگی تھی جو سٹیج پر ڈرامہ دیکھنے کے منتظر تھے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ شاید ان میں سے کوئی اداکاری کا مظاہرہ کرنے آئے۔

اچانک مجمع سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجائیں۔ وہ عورت تیزی سے سٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی تاکہ جلد سے جلد وہاں پہنچ کر اور جلد سے جلد اسے جو کہنا ہو کہے' کوئی مکالمہ ادا کرے اور گھر کا راستہ لے۔ وہاں اداکاری کے لئے ضروری نہیں تھا کہ کوئی لمبا چوڑا ڈرامہ ہی ہو۔ بعض اوقات لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے مختصر اداکاری ہی کافی تھی۔

عورت سٹیج پر کھڑی ہوتی ہے۔ تالیاں بجنی بند ہو جاتی ہیں اور ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ عورت اپنی سانس درست کرتی ہے اور مجمع پر ایک نظر ڈالتی ہے۔ نہ جانے اس نے اداکاری کا فن کہاں سے سیکھا تھا۔ بہر حال دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔

"لوگو! میرا تعلق ہیروشیما سے ہے۔" خالص اداکاری کے انداز میں عورت بولی۔

ٹھیک اس وقت جب عورت سٹیج سے اترنا چاہتی تھی اچانک بھیڑ میں سے ایک شخص نکلا اور لپک کر سٹیج پر چڑھا۔

"سنو' سنو! میں Nevada سے آیا ہوں۔ سمجھے؟۔"

عورت اور مرد دونوں سٹیج پر منڈلانے اور بے ساختہ بولنے لگے۔ ان کی اس بے ساختہ اداکاری کے اختتام پر لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی اور اکیلے وہی دونوں وہاں رہ گئے۔ پھر وہ دونوں بھی سٹیج سے اتر کر چلے گئے۔ لیکن اس سے پہلے وہ پوری رات ایک دوسرے کی باہوں میں بسر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

صبح ہونے پر جب عورت کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ سورج طلوع ہو چکا ہے اور شہر کے مشرقی حصے پر اپنی تیز جھلسانے والی کرنیں برسا رہا ہے اور Nevada والا آدمی وہاں سے رفو چکر ہو چکا ہے۔ اس رات کے بعد

یہ شخص عورت کو زندگی بھر پھر کہیں نہیں ملا۔
ہر روز شام کو اور اتوار کو دن بھر لوگوں کا جم غفیر پارک میں آتا رہتا ہے۔ ہاں اس میں وہ عورت نظر نہیں آتی جس نے Nevada والے شخص کے ساتھ مل کر کبھی بیساختہ اداکاری کی تھی۔ اس رات کے کئی ہفتے بعد جو عورت نے اس شخص کے ساتھ بسر کی تھی ---- اور جس کا کچھ پتہ نہیں کہ کدھر گیا عورت کو محسوس ہوا کہ وہ حمل سے ہے۔ کوئی جان اس کے رحم میں اپنے لئے جگہ کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اسے خیال آیا کہ اسکے ہمسائے بھی اس کے پھولے پھولے سے پیٹ کو دیکھتے ہوں گے۔ پھر اس کے پیدا ہونے والا بچہ ہی اس لحاظ سے نرالا نہیں تھا کہ اسے اپنے باپ کا علم نہیں ہوگا خود اس عورت کی حماقت بھی تو دیکھئے کہ اسے بھی پتہ نہیں کہ Nevada کا یہ شخص واقعتاً" کون تھا۔
ایک اتوار کو جب شہر کے اکثر لوگ پارک جا رہے تھے وہ عورت کسی اور جگہ جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ دور اندرون ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو اسکے آبا و اجداد کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے بچپن کے اس گاؤں تک پہنچنے کے لئے اسے ٹیکسی لے کر ہوائی اڈے جانا ہوگا اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں میں سے گزرنا ہوگا۔ پھر ٹرین سے وہ ایک چھوٹے قصبے میں جائے گی اور وہاں سے پھر اپنے گاؤں۔
آخر کار عورت اپنے گاؤں پہنچی اور وہاں پہنچ کر کئی روز تک وہ اپنے آبائی گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔ خوش قسمتی سے گھر ابھی تک ٹھیک ٹھاک حالت میں تھا۔ اس نے اپنی زرخیز زمین میں ہل چلایا۔ ایسا لگتا تھا کہ دھرتی اس پر مہربان تھی کیونکہ جو کچھ بھی اس نے اس میں بویا اسے اس کا پھل ملا۔
ٹک ۔ ٹک ۔ ٹک ۔ ٹک ۔ ٹک ۔ ٹک
عورت نے پہلی بار "ٹک ۔ ٹک" کی آواز سنی جو اس کے پیٹ میں سے آرہی تھی۔
سوتے جاگتے ٹک ۔ ٹک کی یہ آواز ہر لمحے اسے سنائی دیتی۔ دوسرے دن وہ صبح تڑکے اٹھی اور قصباتی ریلوے سٹیشن کو جانے والی پہلی بس پکڑ لی۔ ٹرین میں بیٹھ کر وہ ہوائی اڈے آئی اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے اس بڑے شہر پہنچی جہاں سے وہ آئی تھی۔ شہر میں اس نے ڈاکٹر سے رجوع کیا جو ایک بار پہلے بھی اس کا علاج کر چکا تھا۔
"اوہ! تمہارے رحم میں تو ایک بم ہے۔" ڈاکٹر نے خوف اور دہشت سے تقریباً" چیختے ہوئے کہا۔
"بم"؟
"ہاں ہاں بم۔" اس نے جلدی سے عورت کو بٹھایا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں مریضہ گر نہ جائے اور بم اسکے مشورے والے کمرے میں ہی نہ پھٹ جائے۔
"میری بات غور سے سنو" ڈاکٹر نے عورت سے کہا۔ "اس کمرے کے برابر میں میرا پرائیویٹ کمرہ ہے۔ تم وہاں جاؤ اور آرام سے بیٹھو۔ میرا مطلب ہے کہ وہاں جا کر لیٹ جاؤ یا چاہو تو سو جاؤ۔ اس وقت تک آرام کرو جب تک یہ مسئلہ جو میں بطور ایک ڈاکٹر کے زندگی میں پہلی دفعہ بھگتانے چلا ہوں ---- اور لاحول ولا تم جیسے مریض کو میرے ہی پاس آنا تھا۔ ہاں تو جب تک یہ مسئلہ بالکل ٹھیک حل نہیں ہو جاتا تم مکمل آرام کرو۔ ہاں تو چلو اٹھو اور برابر والے کمرے میں فوراً" چلی جاؤ" ڈاکٹر نے حکم کے انداز میں کہا۔
ڈاکٹر نے فوراً" ملک کے وزیر اعظم سے رابطہ قائم کیا جو اتفاق سے اس کا دوست تھا۔ وزیر اعظم نے یہ خبر

ملتے ہی اپنے تمام مشیروں کو طلب کیا۔ اس نے مذہب' اخلاقیات' اقتصادیات' ادب' دفاع' سیاسیات' سائنس' ثقافت' تعلیم' فلسفہ' انجینئرنگ اور بم کو ناکارہ بنانے والے شعبے کے تمام ماہرین کو بلوایا۔ وہ سب ڈاکٹر کی کلینک گئے۔ ساتھ ساتھ وزیر اعظم بھی تھا۔ مریضہ کی پھر سے جانچ کی گئی۔

"یہ غیر معمولی قسم کا بم ہے۔ اگر یہ پھٹا تو دو سو کلو میٹر قطر کے اندر سارے جاندار ہلاک ہو جائیں گے۔"

"تم اسے' میرا مطلب ہے بم کو ختم کیوں نہیں کر دیتے"

اگر بم نظر آسکے تو میں شاید ایسا کر سکوں۔ لیکن وہ نظر نہیں آتا' صرف اسکی ٹک۔ ٹک کی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"اوہ! تو پھر ایسا کیوں نہ کریں کہ ایک گڑھا کھود کر عورت کو اس میں پھینک دیں۔

"لیکن اسکا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ایک جان کو ختم کر ڈالیں گے۔ بالکل غیر قدرتی انداز میں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ اگر عام لوگ یہ خبر سن پائیں ---- اور وہ کون سی خبر ہے جو ان سے ڈھکی چھپی رہتی ہو --- تو پھر خطرہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت ہی ختم ہو جائے۔"

"اچھا تو اسے کسی الگ تھلگ جگہ منتقل کر دیا جائے۔" اس شہر میں کوئی بھی الگ تھلگ جگہ کسی بھی رہائشی علاقے سے دو سو کلو میٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں اگر ہم بالفرض اسے کسی ایسی جگہ لے بھی جائیں تو اگر اسے اغواء کر کے شہر کے بیچ میں لے آیا جائے مثلاً" ٹھیک یہاں شہر میں تو کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا ہو گا؟"

"کیا وہ نو ماہ دس دن بعد بچہ دے گی"

"یہ غیر معمولی قسم کا حمل ہے۔ ہو سکتا ہے نو سال لگ جائیں یا نوے سال"

"اسے اس کے اپنے گھر بھجوا دو۔ کم از کم وہ جگہ اس بڑے شہر کے بیچ میں تو نہیں۔"

"اب یہ ممکن نہیں رہا۔" ڈاکٹر نے سخن سازی کی۔ عورت نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے اپنے گھر جانے کے لئے ٹیکسی' ہوائی جہاز' ٹرین اور بس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیں ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی معمولی سا جھٹکا لگے اور بم پھٹ جائے۔ پھر کیا عجب کہ جس ٹرین سے وہ سفر کر رہی ہو وہ پٹڑی سے اتر جائے۔ یا ہوائی جہاز کو حادثہ پیش آجائے۔ غرضیکہ یہ حقیقت ہے کہ اسے منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مستقل طور پر اس کمرے میں ٹھہرنا ہو گا۔ اور ڈاکٹروں کو باری باری اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔

"اگر یہ بات ہے" وزیر اعظم بولا "تو بہتر ہو گا کہ عام لوگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ خصوصاً" اس شہر کے باشندوں کو۔۔ اس شہر کے لاکھوں افراد کی زندگیاں بچانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ان سب کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ حکومت اس نئے شہر کے بسانے کے لئے رقم کا بندوبست کرے گی۔ وہ لوگوں کو اس وقت تک کھانا اور کپڑا مہیا کرتی رہے گی جب تک اس شہر سے اندازاً" دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر دوسرا شہر تمام بنیادی سہولتوں سمیت تعمیر نہیں ہو جاتا۔

اس اعلان کے ہوتے ہی وہ شہر جو کبھی عروس البلاد ہوا کرتا تھا اسکی صورت ہی بدل گئی۔ وہ بھوتوں کا شہر بن گیا۔ ہزاروں لاکھوں گھر' کارخانے' دفاتر کی عمارتیں خالی ہو گئیں اور وہاں الو بولنے لگے۔ شہر کے بیچ میں پارک پر بھی مکمل سناٹا چھا گیا۔ پارلیمنٹ کے اندر' سڑکوں اور بازاروں میں ہونے والا شور شہر سے دو سو کلو میٹر دور سفر کر گیا۔ رات کے وقت جب سڑکوں پر روشنیاں اور نیون سائن بجھے ہوتے اس وقت ماحول اور بھی پر خوف ہوتا۔ رات ایسی سیاہ ہوتی جیسا سیاہ ہونے کا حق تھا۔ ہاں کبھی کسی طرف بلی کی میاؤں میاؤں یا کتے کے بھونکنے کی آواز

اس سناٹے میں خلل ڈالتی۔ ان کے مالک شہر خالی کر گئے اور انہیں اکیلا چھوڑ گئے۔ شہر میں صرف ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے روشنی کی پتلی سی لکیر باہر آرہی تھی اور یہ جگہ وہ کلینک تھا جہاں عورت کو رکھا ہوا تھا۔ وہاں ڈاکٹر اپنی جانیں داؤ پر لگائے ہوئے باری باری عورت کی خبر گیری کرنے کی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ کلینک کے اردگرد کئی کمانڈوز پہرہ دے رہے تھے۔ کلینک کے ڈیننگ روم اور دوسرے تمام کمروں میں غذا کا ذخیرہ کیا ہوا تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک

عورت کے کمرے کے ایک کونے میں جو ٹی وی سیٹ پڑا ہوا تھا اس پر کوئی شکل نہ ابھرتی تھی کیونکہ مدت سے ٹی وی سٹیشن بند پڑا ہوا تھا۔ اسکے تمام کارکنوں کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ ٹی وی سیٹ کے اوپر ایک ٹرانسسٹر ریڈیو تھا لیکن وہ بھی کافی عرصے سے خاموش تھا۔ ریڈیو سٹیشن کا بھی سارا عملہ دوسری جگہ بھیج دیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نئے گیجٹ نصب کر رہے ہوں اور دو سو کلو میٹر کے فاصلے سے پروگرام ترسیل کرنے کی کوشش میں لگے ہوں۔

وہ کلینک ایک پنجرا بن گیا تھا اور تمام ڈاکٹر اور خود وہ عورت اس پنجرے کے اندر بند تھے۔

جس ڈاکٹر کا یہ کلینک تھا اس نے کبھی خواب میں بھی یہ بات نہیں سوچی ہو گی کہ اس کا کلینک ایک پنجرا بن جائے گا۔ اسکے نزدیک پنجرا ایک علامت تھا۔ پنجرا ایک تمثال بھی تو ہے۔ ایک پنجرا' خواہ اسکے اندر کوئی پرندہ ہو یا نہ ہو' قید خانے پر دلالت کرتا ہے۔ ایک پنجرا چاہے وہ خالی ہی کیوں نہ ہو خوف و دہشت کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ خالی اس لئے ہوتا ہے کہ شاید اس کا باسی ختم ہو گیا ہے۔ یا پھر وہ اس لئے خالی ہو کہ اسے وہاں نئے آنے والے کا انتظار ہو جسے وہاں بھیڑ دیا جائے گا۔ اور کیا یہ تمام دنیا بھی حقیقت میں ایک بہت بڑا پنجرا نہیں یا یہ محض اس کا خیال ہی ہو۔ انسان اپنے مقدر کا اسیر ہے۔ ہر چیز اپنی آزادی کی حدود کے اندر اس دنیوی تقدیر کے اندر محدود ہے۔

ڈاکٹر انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اسکے ڈاکٹر دوستوں نے کمرے کے واحد ٹرانسسٹر ریڈیو کے پرزوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ کلینک کے مالک ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس تمام کا سرچشمہ تنہائی اور ذہنی کھچاؤ اور تناؤ ہے۔ اسکے ڈاکٹر دوستوں نے ریڈیو کے اندر کے تاروں کی جانچ پڑتال شروع کر دی جو طاقت کے مختلف سرچشموں کی علامت تھے۔ انہوں نے ریڈیو سیٹ کو خوب اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔۔۔۔ اس توقع میں کہ شاید ریڈیو پھر سے کام کرنا شروع کر دے۔

"تھوڑی دیر میں عارضی شہر کے ریڈیو سٹیشن سے خبریں نشر کی جائیں گی.... "دور سے ایک باریک آواز سنائی دی۔

"اوہ' ریڈیو کو اس کی آواز پھر سے مل گئی ہے" اس کے دوست خوشی سے چیخ اٹھے۔ ڈاکٹر ریڈیو کی طرف بڑھا اور اس نے اس کی طرف بڑے انہماک سے اپنے کان لگا دیئے۔

"نئی جگہ جا کر بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔" ریڈیو سے آنے والی آواز نے کہا۔ "شہر سے دو سو کلو میٹر دور جا کر بھی اعداد و شمار کے مطابق جو کچھ حاصل ہوا یہ تھا کہ اس سفر میں چالیس افراد جاں بحق ہو گئے۔ تشدد کے مختلف واقعات میں' لوگوں کے درمیان گھروں کے لئے باہمی جنگ کے نتیجے میں سو اشخاص ہلاک اور کئی سو بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ نئی جگہ ہسپتال وغیرہ نہیں ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اسی دوران آج صبح سے لے کر اس وقت تک متعدد لوگ ہیضے سے مر چکے ہیں۔ پورے

علاقے میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ جو لوگ یہ خبریں سن رہے ہوں ان کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں اور ....." اور اگرچہ سارے لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے تھے لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ ریڈیو سے مزید کچھ اور سننے میں ناکام رہے مایوسی سے ان کے منہ لٹک گئے۔ سفید پینٹ کئے ہوئے کمرے میں ان کی سفید یونیفارم فضا کے سکوت کو گہرا کر رہی تھی۔ کلینک کے باہر کمانڈوز کی ایک پوری فوج اپنے فرائض کی انجام دہی اور علاقے کی حفاظت کرنے میں مصروف تھی۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک

یحییٰ طاہر عبداللہ / ستار طاہر

نذرانہ

جابر دل و جان سے اپنی کزن فاطمہ پر مرتا تھا۔ لیکن اس کے پاس کوئی اونٹ نہ تھا کہ وہ اپنے چچا کی نذر کر کے فاطمہ سے شادی کر سکتا۔

فاطمہ ایک خوبصورت خوش باش جوان لڑکی تھی۔ دبلی نہ موٹی، لانبی نہ چھوٹی وہ اپے لانبے لانبے بالوں میں خوشبو دار تیل لگایا کرتی تھی۔

جابر نے سنا کہ فاطمہ اس کے بارے میں کہہ رہی تھی "یتیم لڑکا دودھ اور گندم کی روٹی کھا پی کر ہی پام کے درخت کی طرح مضبوط اور توانا ہو گیا ہے۔"

جابر نے اپنے دل میں بڑے فخر و امتنان سے کہا تھا۔

یہ تو اچھا شگون ہے کہ ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا خیال تو گردش میں رہتا ہے۔

جوان لڑکی فاطمہ کو اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کا بڑا شوق اور خبط تھا۔ آنکھوں کے پپوٹوں پر سارے قصبے کی عورتیں اور لڑکیاں کالا سرمہ لگایا کرتی تھیں لیکن فاطمہ نے اپنے لئے سبز رنگ پسند کیا تھا وہ کسی مداری کی طرح اپنے بالوں سے کھیلتی اور تماشا کرتی رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ ان لمبے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کمر پر ڈال لیتی اور بعض اوقات انہیں کھلا چھوڑ دیتی جیسے بالوں کی ندی بہہ رہی ہو۔ بعض اوقات وہ اپنے ماتھے پر سبز منکوں کا ہار سجا لیتی اور بعض اوقات وہ اپنے بالوں کو ایسے ترتیب دیتی جیسے وہ کالا سمندر ہو اور بعض اوقات وہ سیدھی سادی مینڈھیاں گوندھ لیتی۔

وہ سینے پرونے میں بھی بہت ماہر اور طاق تھی۔ سوئی اور دھاگے سے وہ ایسے ایسے لباس تیار کرتی اور پھر ان پر کوئی بڑا سا پھول کاڑھتی جس پر بیٹھا پرندہ نغمہ سرا ہوتا۔ وہ اپنے لئے جو لباس تیار کرتی وہ بہت چست ہوتا نہ بہت ڈھیلا ڈھالا۔

جب جابر فاطمہ کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ کنویں سے پانی لاتے دیکھتا تو اپنے آپ سے کہتا۔ اس کی صراحی اٹھا کر گھر تک پہنچا دوں گا۔

شرم اور ہچکچاہٹ دامنگیر ہوتی اور وہ اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکتا۔ ویسے یہ سب جانتے تھے کہ وہ فاطمہ سے محبت کرتا ہے۔ لیکن رسم کے مطابق اس کے پاس اونٹ نہ تھا کہ وہ اپنے چچا عبدالرسول کو دیکر فاطمہ کا رشتہ حاصل کر سکتا۔ اب تو جابر فاطمہ کی لمبی خوبصورت گردن اور ننگے پاؤں ہی دیکھ کر اپنے جی کی تسلی کر لیتا تھا۔

جابر بد قسمت تھا۔ اس کا باپ اس وقت مرا جب وہ کم سن تھا اور اسکی ماں نے ایک دوسرے قبیلے کے مرد کے ساتھ دوسری شادی کر لی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جابر کے والد کے رشتہ داروں نے اسکی ماں سے تمام تعلقات منقطع کر لئے۔ جابر بے چارے کو بہت رنج و الم سہنے پڑے۔ اس کے چچا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے تھے جابر کو حسرت ہی رہی کہ وہ بھی دوسرے لڑکوں کی طرح اپنے لڑکپن کا زمانہ بے فکری سے گزار سکتا۔

اب وہ تحمل اور برداشت کی حدوں سے باہر جا چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے قبیلے اور رشتہ داروں کے لئے اس وقت تک کوئی کام نہ کرے گا جب تک وہ فاطمہ کو پانے کے لئے ایک اونٹ حاصل نہیں کر لیتا۔

ایک بزرگ اور مرد دانا نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرے اور تحمل اور بردباری سے کام

لے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک نہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جب وہ اونٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسے اپنے چچا عبدالرسول کی نذر کر کے فاطمہ سے شادی کر سکے گا۔

جابر نے جذبات سے کانپتے ہوئے کہا....

"لیکن کب ..... ایک سال...... دو سال .... یا عمر بھر میں ....."

مرد دانا نے اسے سمجھایا۔

"جلد بازی سے کام نہ لو۔ جلدی شیطان کا کام ہوتا ہے اس طرح اپنے عزیزوں اور قبیلے والوں سے کیوں بگاڑتے ہو۔ فاطمہ ابھی جوان ہے تم بھی توانا اور جوان ہو۔ پانچ یا سات برسوں میں اونٹ مل ہی جائے گیا۔" جابر نے پوچھا:

"کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک میں اونٹ حاصل کر نہیں سکتا۔ فاطمہ شادی نہیں کرے گی؟"

دانا مشیر نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر فاطمہ کو دلہن بنے اپنے تصور میں دیکھا اور بولا۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتا۔ لڑکی خوبصورت ہے۔ اسکی جلد گندمی اور مخملیں ہے۔ قبیلے کے مرد آنکھوں والے ہیں اور محبت کرنے والا دل بھی رکھتے ہیں اور پھر قبیلے میں سینکڑوں اونٹ اونٹنیاں ہیں' میں تمہیں کوئی یقین نہیں دلا سکتا۔"

جابر مشتعل ہو گیا۔ اس نے اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا ارادہ پختہ کر لیا۔ قبیلے کا سردار پہلے ہنسا' پھر کھانسا اور تھوک کر بولا۔

"اچھا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ جابر کہاں سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ پیٹ کو اس طرح روٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح پام کے درختوں کو لمبی اور گہری جڑوں کی' تاکہ وہ زمین سے پانی چوس سکیں۔"

○

موسم گرما کا سورج مغرب کی سمت افق میں ڈوب گیا پھر بھی آسمان پر شعلے لپک رہے تھے اور پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی اور یکدم رات یوں سر پر چھا گئی جیسے کوئی سیاہ خیمہ نصب کر دیا جائے۔ ابتدائی دنوں کا چاند اور کچھ بجھے بجھے سے ستارے آسمان پر دکھائی دینے لگے۔ اور پھر کہیں دور سے ایک پرندے کی دلخراش آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی ماں گمشدہ بچے کو پکار رہی ہو۔

جابر نے اچانک محسوس کیا کہ اس کے جسم کو کسی چیز نے چھوا ہے۔ اس کا جسم کپکپا اٹھا اور اسے موسم گرما میں بھی یخ سردی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے پانی سے باہر نکل کر ایک خشک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم سے پانی نچڑ کر زمین پر گر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی لباس پہنا۔ پھر جانگیہ اتار کر اسے اچھی طرح نچوڑا اور ایک درخت کی ٹہنی پر خشک ہونے کے لئے لٹکا دیا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

جابر: "کہیں ایسا تو نہیں کہ اس پانی پر آسیب کا سائیہ ہو۔ اس میں ڈوبنے والوں کی روحیں بے چینی سے گھوم رہی ہوں۔"

کچھ وقت گزر گیا۔ حتیٰ کہ جابر اپنے خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پھر ایک بار لباس اتارا۔ اسے تہہ کر کے اس پر ایک بھاری پتھر رکھا اور پانی میں اتر گیا۔ وہ پانی کے اندر آئی ہوئی جھاڑیوں میں ادھر ادھر حرکت کرتے' ہاتھ پاؤں مارتے مچھلیاں تلاش کرنے لگا۔ اس نے دل میں کہا' میں مچھلیاں بھون کر کھاؤں گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کیا وہ اپنے قبیلے والوں سے آگ مانگ سکے گا۔ سنگدل قبیلہ جن کی خدمت بچپن سے کرتا چلا آرہا تھا لیکن وہ فاطمہ کی شادی اس وقت تک اس کے ساتھ کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا جب تک وہ ایک اونٹ رسم کے مطابق فاطمہ کے والد کو نذر نہ کرے۔

پھر وہ ایک خواب دیکھنے لگا۔ جاگتے میں خواب .... اس نے دیکھا کہ فاطمہ آرہی ہے۔ اس نے ایک میلی قمیض کو اٹھایا ہے اور اسے سونگھا ہے اور پھر اسے دھونے لگی ہے وہ فاطمہ کی چوڑیوں کی کھنکناہٹ تک سن رہا

تھا۔

یہ خواب بہت مختصر ثابت ہوا۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ پانی میں ٹھہرنے سے اس کو سردی لگنے لگی تھی لیکن ابھی تک کوئی مچھلی اس کے ہاتھ نہ لگی تھی اس نے دل میں قسم کھا کر کہا "میں ایک مچھلی سے ہی گزارہ کر لوں گا۔" لیکن اسکی تلاش ناکام اور بے سود رہی وہ ایک بھی مچھلی نہ پکڑ سکا۔ اس نے پانی سے نکل کر لباس پہنا اور ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دل میں نت نئے منصوبے بنانے لگا۔ میں سرکاری اصطبل سے ایک گدھا چوری کر سکتا ہوں۔ گدھا قبیلے کے کام آسکتا ہے یوں میری کچھ آمدنی ہو سکتی ہے اور میں اس سے اونٹ خرید سکتا ہوں' لیکن پھر اسے سرکاری محافظوں اور پہریداروں کا خیال آگیا۔ وہ دل کو تسلی دینے لگا "یہ محافظ تو کاہل اور اندھے ہوتے ہیں میں ہوشیاری سے کام لوں گا تو وہ مجھے کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ چلو اگر انہوں نے چوری کا سراغ لگا بھی لیا' وہ مجھ تک پہنچ بھی گئے تو بھی وہ جب فاطمہ کو دیکھیں گے تو اس کے حسن سے اتنا متاثر ہوں گے کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔ نہ ہتھکڑی لگائیں گے نہ سردار کے پاس لے جا سکیں گے" پھر اسے قبیلے کے سردار کا خیال آیا۔

بوڑھا' حریف' لالچی اس نے سوچا "اگر میں قبیلے کا سردار اور سو اونٹوں کا مالک ہوتا تو اب تک فاطمہ سے شادی کر چکا ہوتا" پھر اس کے خیالوں کی رو بدلی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہے۔ وہ اسے پکڑ کر زندان میں پھینک چکے ہیں۔ وہ سوچنے لگا' اچھا تو پھر مجھے اس مرطوب اور سیلی ہوئی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنی جوانی کے کئی سال گزارنے ہوں گے اور پھر اس کے بعد کیا ہو گا ..... جب وہ رہا ہو کر واپس آئے گا تو فاطمہ بیاہی جا چکی ہو گی۔ تب وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے کہ فاطمہ کو آتے جاتے دیکھ سکے گا اور پھر ہمت کر کے اس سے پانی کی صراحی پکڑ کر اٹھا لے اور اس کے گھر تک چھوڑ آئے۔"

ان خوفزدہ کر دینے والے خیالوں کی دنیا سے وہ چونک کر باہر نکلا۔ وہ حقائق اور سچائی کا سامنا کرنے لگا۔ گھر کیسا بھی ہو گھر ہے اور جیل کی کوٹھری محافظ' صعوبتیں اور ذلتیں۔ واقعی قبیلے کا سردار سچ کہتا تھا کہ جابر کہاں سے پیٹ بھر سکے گا؟ گندم کی روٹی مجھے کہاں سے حاصل ہو گی۔ اگر میں نے قبیلے کے لئے کام نہ کیا۔ ہاں اس میں کیا شک ہے کہ فاطمہ بے حد حسین ہے لیکن ..... آنکھوں کا کیا ہے وہ تو ہر چیز پسند کر لیتی ہیں۔ دیکھنا تو ہاتھوں کو ہوتا ہے کہ ان میں چیز خریدنے کے لئے سکے ہیں یا نہیں؟

مچھلی ملنے کی ہر امید دم توڑ چکی تھی اور قبیلے کی طرف واپسی بھی ناممکن تھی تو پھر بھوک .... صبح ہونے تک کیا ہو گا اور پھر جب تاریکی دم توڑے گی اور ہزاروں روشن آنکھوں کے ساتھ صبح ہو گی تو وہ کیا کرے گا؟ وہ خود ایک ایسا اونٹ بن جائے گا جس کا سر انسان کا ہو اور وہ خانہ بدوشوں کے ہاں بوجھ اٹھا رہا ہو گا.....

توفیق الحکیم / سید خالد محمود ترمذی

کرامات

پیر صاحب کا معمول تھا کہ فجر کی نماز اور ذکر اذکار سے فارغ ہو کر علاقے کی مشہور خانقاہ کے انتظامات میں مصروف ہو جاتے۔ وہاں کے علما میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا اور عوام پر تو ان کی روحانیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے گھر کے دروازے پر کھجور کا ایک چھوٹا سا درخت تھا جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے خود ہی اسے پانی دیا کرتے تھے۔

حسب معمول آج جب وہ پانی دے کر اندر جانے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں جب وہ نزدیک پہنچے تو وہ بڑے مظلوم اور مصیبت زدہ سے نظر آرہے تھے۔ نزدیک پہنچ کر انہوں نے پیر صاحب کو سلام کیا۔ پیر صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے صبح سویرے آنے کی وجہ دریافت کی۔ اس پر ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور پیر صاحب کے پاؤں پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں گویا ہوا۔

"اے اللہ کے ولی ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں اور آپ کی ذات بابرکات کے علاوہ ہمیں کوئی اس سے نجات نہیں دلا سکتا۔ میری بیوی سخت بیمارے ہے بلکہ قریب الرگ ہے۔ آپ کے دم کرنے سے وہ ضرور اچھی ہو جائے گی۔"

"اور وہ ہے کہاں" پیر صاحب نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

"یہ قریب ہی ایک گاؤں میں' سواری تیار ہے" اس نے ہجوم کے پیچھے کھڑے ہوئے دو گدھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن میں ذرا گھر میں اور مریدین کو خبر کر دوں"

"وقت بہت نازک ہے۔ سب نے بیک آواز کہا۔" عورت نزع کے عالم میں ہے۔ شاید ہمارے جاتے جاتے وہ ختم بھی ہو جائے۔ براہ کرم آپ اسی وقت ہمارے ساتھ چلیں۔ جگہ کوئی دور نہیں ہے دوپہر تک ہم واپس آجائیں گے"

"اچھا تو چلو پھر ہمیں دیر نہیں کرنا چاہئے۔" پیر صاحب نے ہجوم کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر کہا اور گدھوں کی طرف چلے۔ ایک گدھے پر خود اور دوسرے پر عورت کا خاوند سوار ہو گئے۔ باقی لوگ پیدل پیچھے پیچھے چلنے لگے کئی گھنٹے انہیں اسی طرح چلتے ہوئے گزر گئے۔ پیر صاحب کے استفسار پر کہ جگہ کتنی دور ہے دوسرا سوار کہتا "بس ہم پہنچے ہی سمجھو" اسی طرح کرتے کرتے دوپہر کے قریب جا کر کہیں گاؤں دکھائی دیا۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو گاؤں والوں نے انکا پرجوش استقبال کیا اور انہیں ایک گھر کے بڑے کمرے میں لے گئے۔ جہاں ایک بستر پر ایک عورت دراز تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پیر صاحب نے اسے بلایا لیکن جواب ندارد۔ وہ تو خود موت کے دروازے کو دستک دے رہی تھی۔ پیر صاحب نے دم درود پڑھنا شروع

کیا اور وہ بمشکل اپنا عمل ختم کر پائے تھے کہ عورت نے ایک لمبی آہ کھینچی اور پھر اس طرح سسکیاں بھرنے لگیں کہ پیر صاحب کو یہ گمان گزرا کہ اس کی روح نکلنے ہی والی ہے۔

عورت نے آنکھیں کھولیں اور حیرانگی سے ماحول کا جائزہ لینے لگی "میں کہاں ہوں؟" وہ بڑبڑائی

"تم اپنے گھر میں ہو" پیر صاحب نے حیرانی کے عالم میں کہا۔

"مجھے پانی پلاؤ"

"پانی کا گھڑا لاؤ" اس کے عزیز و اقارب چلائے۔ کوئی دوڑ کر پانی کا جگ بھر لایا جس سے عورت نے خوب سیر ہو کر پانی پیا' پھر اس نے ایک لمبی ڈکار لی اور کہنے لگی "کھانے کو کچھ ہے مجھے بھوک لگ رہی ہے" اس کا یہ کہنا تھا کہ اہل خانہ میں سے کوئی روٹی لا رہا ہے تو کوئی سالن اور کوئی اچار تو کوئی چٹنی اور وہ سب کے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ہضم کر گئی۔ پھر وہ اپنے بستر سے اتری اور اس طرح چلنے پھرنے لگی جیسے وہ بالکل بھلی چنگی ہو' کبھی بیمار ہی نہ ہوئی ہو۔ اس پر اہل خانہ پیر صاحب کے حضور فرط ادب سے جھک گئے۔ کوئی اس کے ہاتھوں پر بوسوں کی بھر مار کر رہا ہے اور کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے۔ پھر ان میں سے ایک بڑا بوڑھا اس سے مخاطب ہوا۔

"اے اللہ کے ولی! آپ کی دعا کی برکت سے عورت کی جان بچ گئی ہے اس کے لئے ہم آپ کے تہ دل سے ممنون ہیں ہم آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کریں' اور آپ خود بتائیں اس نیکی کے صلے میں ہم آپ کی کیا خدمت بجا لائیں۔ ہم زندگی بھر اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔"

"میں نے تو اب کوئی کام نہیں کیا جو کسی صلے یا شکریے کا مستحق ہو' پیر صاحب خود اس غیر معمولی واقعے پر حیران و پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معجزہ ہو کیسے گیا۔" یہ سب کچھ تو اللہ کی قدرت سے ہوا ہے "ان اللہ علی کل شی قدیر" آپ اسے جو کچھ بھی کہیں "صاحب خانہ بولا" اے اللہ کے سچے ولی! بہر حال یہ کسی معجزے سے کم نہیں اور اللہ نے اسے آپ کے مبارک ہاتھوں سرانجام دیا ہے آپ جیسی مقدس ہستی کا ہمارے گھر تشریف لانا ہمارے لئے باعث عزت و افتخار ہے اور ہمیں اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے حالات اور اس علاقے کے رواج کے مطابق آپ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کریں" اس نے ایک علیحدہ کمرہ خاص پیر صاحب کے لئے خالی کرنے کا حکم دیا اور اس میں انہیں ٹھہرایا۔ جب بھی وہ اس سے رخصت چاہتے تو وہ اللہ رسول کی قسمیں کھا کر کہتا "اس معزز ہستی کو جس نے میری بیوی کی جان بچائی ہے تین دن سے پہلے کیسے جانے دے سکتا ہوں تین دن آپ جیسے عظیم محسن کو مہمان رکھنا بہت ہی قلیل مدت ہے"۔

اس سارے عرصے میں وہ ان کے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا اور کوئی دقیقہ خدمت کا فرد گذاشت نہیں کیا۔ جب تین روز گزر گئے تو اس نے ایک گدھے پر تحفے تحائف' اناج دالیں اور انڈے مرغیاں وغیرہ لادیں اور پانچ پونڈ کا ایک نوٹ بطور نذرانہ پیش کیا اور ان کی پذیرائی کے لئے دروازے تک ان کے ہمراہ گیا۔ وہ بمشکل انہیں گدھے پر سوار کرا پایا تھا۔ ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا اور پیر صاحب کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا۔

"آپ کی کرامت کی شہرت آس پاس کے تمام دیہاتوں میں پھیل گئی ہے۔ میں بھی اس کا چرچا سن کر حاضر ہوا ہوں۔ میرا ایک چچا ہے جو میرے لئے بجائے والد کے ہے وہ بستر مرگ پر ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کرے خدا کے لئے مرنے سے پہلے اس کی یہ آرزو پوری کر دیں"

"لیکن میرے بچے دیکھو تو سہی میں تو پہلے ہی اپنے گھر جانے کو تیار ہوا ہوں" پیر صاحب نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔

"جب تک آپ میرے چچا کو دیکھ نہیں لیں گے میں آپ کو ہرگز جانے نہیں دوں گا۔ ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے" یہ کہہ کر نوجوان نے گدھے کی رسی پکڑی اور ایک طرف کو چل دیا۔

"تمہارا چچا ہے کہاں؟" پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"بالکل قریب بس چند منٹ کا فاصلہ ہے"

پیر صاحب کے لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ چلنے کے بعد وہ دوسرے گاؤں پہنچے جہاں پہلے جیسے ایک گھر میں اس نے ایک آدمی کو بستر مرگ پر دراز پایا۔ اس کے گھر والے اس کی چارپائی کے گرد امید و بیم کی حالت میں چہرے لٹکائے تھے۔

پیر صاحب نے جوں ہی دم درود پڑھنا شروع کیا وہ مرد اٹھ بیٹھا اور کھانے پینے کو مانگنے لگا۔ اس معجزے پر لوگ مسخرہ گئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ پیر صاحب کے اس احسان کا بدلہ ضرور چکائیں گے۔ انہیں کم از کم تین دن اپنا مہمان رکھیں گے۔

یہ تین دن بڑے مزے میں گزرے۔ ان کی بڑی خاطر و مدارت کی گئی پھر جب وہ تحفوں سے لدے پھندے گاؤں والوں کی معیت میں جلوس کی صورت میں گاؤں کے دروازے پر پہنچے تو تیسرے گاؤں سے ایک آدمی آیا اور اس نے پیر صاحب کو اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دی۔

"خواہ چند لمحوں کے لئے ہی سہی اپنے بابرکت وجود سے ہمارے گاؤں کو بھی عزت بخشئے"

پیر صاحب کے لئے اس اجنبی نے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا جس نے گدھے کی رسی تھام کر اسے ایک سمت ہانکنا شروع کر دیا اور بالآخر اسے ایک گھر کے سامنے لے جا کھڑا کیا۔ وہاں پیر صاحب کے حضور میں ایک لنگڑا لڑکا پیش کیا گیا جسے پیر صاحب کے چھونے کی دیر تھی کہ وہ اچھا بھلا چلنے پھرنے لگا۔ تمام جوان و پیر خوشی کے مارے تالیاں پیٹنے لگے اور انہوں نے بھی تہیہ کیا کہ وہ تین روز تک ان کی مہمان نوازی کریں گے کہ وہ صاحب کرامات بزرگ تھے۔ جب تین راتیں گذر گئیں تو گاؤں والوں نے مزید تحائف ان کی نذر کئے یہاں تک کہ گدھا اس کے بوجھ تلے بیٹھا جاتا تھا مزید برآں کچھ رقم بھی ان کی نذر کی کہ کل ۲۰ پونڈ ہو گئے جو پیر صاحب نے تہبند میں اڑس لئے۔ وہ گدھے پر سوار ہو گئے اور گاؤں والوں سے کہا کہ وہ انہیں ان کے گاؤں تک چھوڑ آئیں۔ وہ سب یہ کہتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لئے۔

"ہماری جانیں بھی آپ پر نثار ہیں ہم آپ کو آپ کے گھر والوں کے حوالے کر کے ہی لوٹیں گے۔ ہمیں آپ کی جان زر و جواہر سے بھی زیادہ پیاری ہے"

"میں آپ کو تکلیف تو دے رہا ہوں" پیر صاحب نے وجہ بیان کی "اس لئے کہ آپ کو تو معلوم ہی ہے راستے غیر محفوظ ہیں اور آج کل راہزنوں کا زور ہے"

"آپ سچ فرماتے ہیں یہاں تو دن دہاڑے آدمی اغوا ہو جاتے ہیں"

"خود حکومت اس وبا کو دور کرنے میں بے بس ہو گئی ہے" پیر صاحب فرمانے لگے "مجھے پتہ چلا ہے کہ ان راہوں میں ڈاکوؤں کے گروہ بسوں، لاریوں کو روک لیتے ہیں اور کھاتے پیتے خوشحال مسافروں کو اغوا کر لیتے ہیں پھر ان کے عزیز و اقارب سے بھاری رقمیں طلب کرتے ہیں۔ بعض اوقات محافظوں کی موجودگی میں ایسا ہوتا

ہے ایک دفعہ ایک بس میں دو پولیس والے سفر کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے بس روک لی اور ایک مالدار آسامی کو نیچے اترنے کو کہا۔ اس بس میں کچھ پولیس والے بھی سوار تھے۔ جب اس نے پولیس والوں سے مدد کی درخواست کی تو پتہ ہے انہوں نے کیا جواب دیا۔ "دفع ہو جاؤ اور ہمیں بھی جانے دو"

مجمع ہنسنے لگا اور پیر صاحب کی ڈھارس بندھانے لگا۔ "آپ فکر نہ کریں جب تک آپ ہمارے ساتھ ہیں آپ جب ہی زمین پر اپنے قدم مبارک رکھیں گے جب آپ کا گاؤں آجائے گا"۔

"مجھے علم ہے آپ لوگ بڑے بہادر ہیں۔ آپ لوگوں نے میری بڑی قدرو منزلت فرمائی ہے اور میرے ساتھ بڑی فیاضی اور سخاوت سے پیش آئے ہیں"۔

"ایسا نہ کہیں جی۔ آپ ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ اور نہ جانے کیا کیا ان کی شان میں قصیدے کہتے گئے اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے گئے۔ اس کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی کرامات کو سراہتے گئے۔ پیر صاحب یہ سب سنتے رہے اور گذرتے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگے آخر گویا ہوئے۔

"بے شک پچھلے دنوں میں جو کچھ مجھ سے صادر ہوا وہ غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ محض میری بدولت ہوا ہو۔"

"آپ کو اس میں شک ہے کیا؟"

"میں کوئی پیغمبر تو ہوں نہیں کہ ہفتے کے اندر اندر اتنے کمال کو پہنچ جاؤں۔ یہ آپ لوگوں کی برکت ہے کہ مجھ سے ان کرامتوں کا ظہور ہوا ہے۔"

"اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ سب بیک آواز بولے۔

"جی ہاں! آپ لوگ ان کا واحد سبب ہیں"

"آپ کو یہ کس نے بتایا" وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔

"یہ آپ کے اعتقاد کی وجہ سے ہوا"۔ پیر صاحب نے بڑے اعتماد سے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

"اعتقاد کی بدولت آپ یہ سب کچھ حاصل کر پائے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ ایک مومن کے سینے میں کتنی بڑی طاقت چھپی ہوئی ہے عقیدہ ایک طاقت ہے۔ میرے عزیز و عقیدہ ایک عظیم طاقت ہے۔ کرامات تو تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ جیسے پانی پہاڑوں میں۔ اور صرف عقیدے ہی کی طاقت سے وہ چشمے کی صورت میں ابل سکتا ہے" اس نے اپنی پرامن تقریر جاری رکھی اور سامعین سردھنتے رہے۔ وہ زور خطابت میں جذباتی ہوتا گیا اور اس نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ اس کے ہمراہی ابھی ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑتے جارہے ہیں۔ اسے تو جب ہی علم ہوا جب وہ خانقاہ کی حدود میں داخل ہوا اور سواری سے اتر کر زمین پر قدم رکھے۔ جوں ہی وہ اپنے شرکاء جلوس کا شکریہ ادا کرنے کو مڑا تو وہ کسی کو نہ پاکر ہکا بکا رہ گیا۔

اس کی حیرت اس وقت ختم ہوئی جب اس نے اپنے آپ کو گھر والوں اور مریدین کے گھیرے میں پایا۔ مریدین اسکے ہاتھ چومنے لگے ان کی آنکھوں میں تشکر و اطمینان کے آنسو جھلک رہے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ صورت نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے آپ بخیریت واپس آگئے ہیں۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ انہوں نے آپ کے بدلے میں جو رقم لی ہے اس پر مٹی ڈالو آپ ہمارے لئے ہر مال و دولت سے زیادہ انمول ہیں"

رقم کے لفظ پر چوکنا ہو کر پیر صاحب نے استفسار فرمایا۔ "کیسی رقم؟"

"جو ہم نے ڈاکوؤں کو دی ہے"

"کون سے ڈاکو؟"

جنہوں نے آپ کو اغوا کیا تھا پہلے تو وہ ایک لاکھ روپے سے کم لینے پر کسی صورت رضا مندہی نہیں ہوتے تھے کہتے تھے آپ تو سونے میں تلنے کے لائق ہیں بالاخر ہماری منت سماجت سے بمشکل آدمی رقم لینے پر رضا مند ہوئے اور ہم نے پچاس ہزار روپے نقد آپ کے عوض ادا کئے"۔

"پچاس ہزار روپے" "پیر صاحب حیران ہو کر چلائے اور وہ بھی میرے عوض؟ انہوں نے تمہیں یہ بتایا کہ میں اغوا کیا گیا ہوں؟"

"جی ہاں۔ آپ کے غائب ہونے کے تین روز بعد کچھ لوگ آئے اور کہا کہ ایک گروہ نے آپ کو اغوا کر لیا ہے' انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے معاوضہ ادا نہ کیا تو وہ آپ کو جان سے مار دیں گے اور ادائیگی کی صورت میں آپ کو صحیح سلامت ہمیں واپس لوٹا دیں گے"۔

پیر صاحب نے ان الفاظ پر غور کیا اور وہ سب محیر العقول واقعات فلم کی طرح ان کی چشم تصور کے سامنے گھوم گئے "ہاں یہ سب واقعات اس کی گواہی دیتے ہیں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں" وہ قریب المرگ مرد اور عورت اور وہ لنگڑا جو میرے عمل سے ایک دم ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ بڑے چالاک تھے وہ لوگ"

اس کے اہل خانہ نے اس کا جسم اور کپڑے ٹٹولنا شروع کر دیئے اور کہنے لگے۔ اللہ کا شکر ہے آپ بخیریت واپس آگئے ہیں۔ آپ کو انہوں نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟ انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا؟"

"نہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی۔ انہوں نے مجھ سے کرامات سرزد کرائیں کرامات جو مجھے بہت مہنگی پڑی ہیں"۔

نجیب محفوظ / سہیل احمد صدیقی

مداری رکاب لے اڑا

"اب تم کام کرنے کے قابل ہو گئے ہو" میری والدہ نے مجھ سے کہا اور پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بولیں: "یہ پیاسٹر (سکہ) لو اور جا کے کچھ لوبیا کے دانے خرید لاؤ۔ راستے میں کھیل میں نہ لگ جانا اور گاڑیوں سے بچ کر چلنا۔"

میں نے رکاب لی، کھڑاویں پہنیں اور ایک دھن گنگناتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ لوبیا فروش کی دکان کے سامنے ہجوم دیکھ کر میں انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ مجھے مرمریں کاؤنٹر تک رسائی حاصل ہو گئی۔

"جناب، ایک پیاسٹر کا لوبیا دیجئے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "صرف لوبیا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا، "تیل کے ساتھ؟ گھی کے ساتھ؟" میں نے جواب نہیں دیا اور اس نے رکھائی سے کہا: "دوسروں کے لئے راستہ چھوڑ دو"

میں قطار سے نکلا اور اپنی کوفت پر قابو پاتے ہوئے دل شکستہ گھر کو چل دیا۔

"خالی رکاب تھامے واپس آرہے ہو؟" میری ماں مجھ پر چلائی۔

"کیا کیا تم نے؟.... لوبیے گرا دیئے یا پیاسٹر گم کر دیا، شریر لڑکے؟"

"صرف لوبیا؟ تیل کے ساتھ؟ گھی کے ساتھ؟.... یہ تو آپ نے مجھے بتایا نہیں تھا" میں نے احتجاج کیا۔

"بے وقوف لڑکے! تم روزانہ صبح کو کیا کھاتے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"تم نرے الو ہو، اس سے کہو لوبیے کی پھلیاں تیل کے ساتھ چاہئیں"

میں اس آدمی (دکاندار) کے پاس گیا اور بولا: "جناب، ایک پیاسٹر کا لوبیا، تیل کے ساتھ دے دیں۔"

اس نے نہایت خفگی اور اضطراب سے کہا: "روغن السی، روغن سبزی یا روغن زیتون" میں پریشان ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"کسی اور کے لئے جگہ چھوڑ دو" اس نے چلا کر کہا۔

میں غصے سے ماں کی طرف لوٹ گیا، جس نے حیرت سے کہا: "تم خالی ہاتھ آئے ہو؟... نہ لوبیا اور نہ تیل!"

"السی کا تیل، سبزی کا تیل، زیتون کا تیل؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

میں نے غصے سے کہا۔

"لوبیے کے ساتھ تیل کا مطلب ہے السی کا تیل"

"مجھے کیسے پتہ چلتا؟"

"تم تو نرے بے وقوف ہو اور وہ بھی عجیب بیزار آدمی ہے.... اس سے کہو لوبیا' السی کے تیل کے ساتھ"
میں پھرتی سے گیا اور دکان سے کچھ پرے ہی سے دکاندار کو مخاطب کیا:
"جناب' لوبیا السی کے تیل کے ساتھ"
"پیاستر' کاؤنٹر پر رکھو" اس نے ڈوئی برتن میں ڈالتے ہوئے کہا۔
میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پیاستر نہ نکلا۔ میں نے بے تابی سے اس کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے اپنی جیب الٹ دی مگر پھر بھی اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ دکاندار نے خالی ڈوئی اٹھائی اور غصے سے بولا: "تم نے پیاستر گم کر دیا... تم ناقابل اعتبار لڑکے ہو"
"میں نے گم نہیں کیا" میں اپنے قدموں تلے اور اردگرد دیکھتے ہوئے بولا۔
"وہ تو تمام وقت میری جیب میں تھا۔"
"دوسروں کے لئے راستہ بناؤ اور مجھے مت پریشان کرو" میں خالی رکاب لئے ماں کی طرف پلٹا۔
"اوہ خدایا' کیا تم بالکل بے وقوف ہو؟"
"پیاستر......"
"کیا ہوا اس کا؟"
"وہ میری جیب میں نہیں ہے"
"کیا تم نے اس سے مٹھائیاں خرید لیں؟"
"نہیں قسم سے میں نے نہیں خریدیں"
"پھر کیسے گم ہوا؟"
"مجھے نہیں پتا"
"مجھے نہیں پتا"
"کیا تم قرآن کی قسم کھاتے ہو کہ تم نے اس سے کچھ نہیں خریدا؟"
"میں قسم کھاتا ہوں"
"کیا تمہاری جیب میں سوراخ ہے؟"
"نہیں تو ایسا بھی نہیں ہے"
"ہو سکتا ہے تم نے پہلی یا دوسری مرتبہ ہی دکان دار کو دے دیا ہو۔"
"شاید"
"کیا تمہیں اس بات کا یقین نہیں؟"
"مجھے بھوک لگی ہے"
انہوں نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا' گویا میری بات مان لی ہو۔
"کوئی بات نہیں" وہ بولیں: "میں تمہیں ایک اور پیاستر دوں گی' مگر یہ تمہارے گولک سے نکالوں گی اور اگر تم رکاب خالی لے کر لوٹے تو تمہارا سر توڑ دوں گی۔"
میں مزے دار ناشتے کے تصور میں کھویا دوڑتا ہوا چلا گیا۔ گلیارے کے نکڑ پر جہاں لوبیا فروش تھا' میں نے بچوں کا ایک ہجوم دیکھا اور مسرت و انبساط سے بھرپور آوازیں سنیں۔ میرے قدم رک گئے اور میرا دل ان کی

طرف کھینچنے لگا۔ "بھئی کم از کم مجھ کو ایک طائرانہ نظر تو ڈالنے دو!" میں ان کے درمیان گھسا تو پتہ چلا مداری سیدھا میری طرف دیکھ رہا تھا' عجیب حماقت آمیز شادمانی مجھ پر چھا گئی' میں بالکل خود سے بے گانہ ہو گیا۔ میں پوری طرح خرگوشوں اور انڈوں' اور سانپوں اور رسیوں کے تماشے میں محو ہو چکا تھا۔ جب مداری پیسے جمع کرنے آیا تو میں بدبداتا ہوا پیچھے ہٹا۔

"..... میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں"

وہ سفاکی سے میری طرف جھپٹا اور بڑی مشکل سے میں جان چھڑا کر بھاگا تو دوڑتا چلا گیا' میری کمر اس کی چوٹ سے ٹوٹ سی گئی تھی' مگر پھر بھی میں بے پناہ خوش تھا کیوں کہ میں لوبیا فروش کی طرف جا رہا تھا۔

"ایک پیاسٹر کا لوبیا' السی کے تیل کے ساتھ دے دیں" میں نے کہا وہ مجھے ساکت و جامد دیکھنے لگا' چنانچہ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے رکاب دو" اس نے غصے سے کہا۔

رکاب! رکاب کہاں گئی؟ کیا میں نے دوڑتے ہوئے گرا دی؟ کیا مداری نے ہتھیا لی؟

"لڑکے' تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟"

میں الٹے قدموں لوٹا اور گمشدہ رکاب راستے میں تلاش کرنے لگا۔ مداری کے تماشے کی جگہ خالی تھی' مگر بچوں کی آوازوں کی مدد سے میں نے اسے قریبی گلی میں تلاش کر لیا' میں مجمع کے گرد گھوما' جب مداری نے مجھے دیکھا تو دھمکی آمیز انداز میں چلایا: "پیسے دو ورنہ بھاگو یہاں سے"

"رکاب!" میں بے صبری سے چلایا۔

"کون سی رکاب ننھے شیطان؟"

"مجھے رکاب واپس کرو"

"بھاگ جاؤ ورنہ تمہیں سانپوں کی غذا بنا دوں گا۔"

اس نے رکاب چرا لی تھی' میں خوفزدہ ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور صدمے کے مارے رونے لگا۔ جب کوئی راہ گیر میرے رونے کی وجہ پوچھتا' میں جواب دیتا: "مداری نے رکاب ہتھیالی۔"

اس پریشانی میں مجھے ایک آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی: "آؤ اور دیکھو!" میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو وہاں ایک سیربین کا اہتمام تھا۔ میں نے درجنوں بچوں کو اس طرف دوڑتے اور اس کے مخصوص سوراخوں کے سامنے قطار بناتے دیکھا' جب کہ سیربین کے منتظم نے تصاویر پر "ترغیبی" تبصرہ شروع کر دیا۔

"یہ دیکھو یہ بہادر سورما اور یہ حسین ترین عورت زینت البنات" میرے آنسو خشک ہو گئے اور میں نے سیربین پر تخیل میں گم' نظریں جما دیں اور مداری و رکاب کو یکسر بھول گیا۔ اپنے لالچ پر قابو نہ پا کر میں نے پیاسٹر وہاں دے دیا اور سیربین کے مخصوص سوراخ کے سامنے ایک لڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا' جو کسی اور کے آگے کھڑی تھی اور دل فریب تصاویر ہماری بصارت کے سامنے گزرنے لگیں۔ جب میں اپنی دنیا میں لوٹا تو احساس ہوا کہ میں اپنے پیاسٹر اور رکاب دونوں سے محروم ہو چکا ہوں اور وہاں مداری کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بہر حال میں نے نقصان کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور میں گھڑسواروں کی تصاویر' عشق اور جرات کے کارناموں میں کھویا ہوا تھا۔ میں اپنی بھوک بھول گیا۔ مجھے وہ خوف بھی یاد نہ رہا جو گھر میں محسوس کرتا تھا۔ میں نے کچھ قدم پیچھے لئے تاکہ اس دیوار کے سامنے جھک جاؤں جو کبھی ایک خزانہ اور سردار اکادمی کا صدر مقام تھا اور خود کو پوری طرح اپنے

سپنوں میں گم کر دیا۔ کافی دیر تک میں گھڑ سوار' "زینت البنات" اور غول (چڑیل) کے تصور میں گم رہا۔ میں اپنے سپنے میں اونچی آواز سے بولتا' اپنے الفاظ کو اشاروں کے ساتھ معانی کا جامہ پہناتا رہا۔ اپنے خیالی نیزے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے میں گویا ہوا: "یہ لو' اے چڑیل' سیدھا دل میں!" اور اس (گھڑ سوار) نے نے زینت البنات کو اٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھایا "ایک محترم آواز آئی۔

میں نے اپنی دائیں طرف نظر دوڑائی اور ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جو تماشے میں میرے ساتھ تھی۔ وہ گندہ لباس اور رنگین کھڑاویں پہنی ہوئی تھی اور وہ اپنی طویل زلف سے کھیل رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں "عورت کے پسو (Lady's Flees) نامی سرخ و سفید مٹھائیاں تھیں جنہیں وہ اطمینان سے چوس رہی تھی' ہماری نظروں کا تبادلہ ہوا اور میں اسے دل دے بیٹھا۔ "بیٹھو اور آرام کرو" میں نے اس سے کہا۔

وہ میری تجویز پر عمل کرنے کو آمادہ نظر آئی تو میں نے اسے بازو سے تھام لیا اور ہم قدیم دیوار کے دروازے سے نکل گئے اور اس کے زینے کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے' جو نامعلوم جگہ جاتا تھا' وہ زینہ بلندی پر ایک پلیٹ فارم میں ختم ہوتا تھا جس کے پیچھے نیلا آسمان اور مینارے دیکھے جا سکتے تھے' ہم خاموش بیٹھ گئے' ساتھ ساتھ میں نے اس کا ہاتھ دبایا اور ہم خاموش بیٹھے رہے' یہ جانے بغیر کہ کیا کہنا ہے۔ مجھے ان احساسات کا تجربہ ہوا جو نئے' حیران کن اور دھندلے تھے۔ اس کا چہرہ اپنے چہرے سے قریب لا کر میں نے اس کے مٹی میں گندھے بالوں کی قدرتی مہک سونگھی اور سانس کی مہک مٹھائیوں کی خوشبو سے مل گئی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو بوسہ لیا۔

اس کے ہونٹ ساکن ہو گئے اور پھر مٹھائیوں کو چوسنے میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار اس نے اٹھنے کا فیصلہ کیا' میں نے بے تابی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"بیٹھ جاؤ" میں نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں" اس نے سیدھا سا جواب دیا۔

"کہاں؟" میں نے افسردگی سے پوچھا۔

"دایہ ام علی کی طرف" اور اس نے ایک مکان کی سمت اشارہ کیا جس کی نچلی منزل پر آہن گری کی ایک چھوٹی سے دکان تھی۔

"کیوں؟"

"اسے جلدی آنے کا کہنے کے لئے"

"کیوں؟"

"میری ماں گھر پر درد سے کراہ رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ دایہ ام علی کے پاس جاؤ اور اسے اپنے ساتھ جلدی آنے کو کہو۔"

"اور تم اس کے بعد آؤ گی؟"

"اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔ اس کے ماں کا ذکر کرنے سے مجھے اپنی ماں یاد آ گئی اور میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ قدیم زینے سے اٹھ کر میں اپنے گھر کے راستے پر ہو لیا۔ میں اونچی آواز سے رویا۔ جو میرے لئے کارگر نسخہ تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میری طرف آئے گی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں باورچی خانے سے خواب گاہ تک گیا مگر ماں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میری ماں کہاں گئی؟ وہ کب واپس آئے گی؟ میں تنہا گھر میں بیزار ہو گیا تھا۔ پھر مجھے ایک عمدہ خیال سوجھا' میں نے باورچی خانے سے ایک رکاب لی اور اپنی بچت سے ایک پیاسٹر لیا اور پھرتی

سے لوبیا فروش کے پاس گیا۔ میں نے اسے دکان کے باہر بنچ پر سوتا ہوا پایا' اس کا چہرہ اس کے بازو سے چھپا ہوا تھا۔ لوبیے کے ظروف غائب ہو گئے تھے اور تیل کی لمبی گردن والی بوتلیں خانوں میں واپس رکھی جا چکی تھیں اور مرمریں کاؤنٹر صاف ہو چکا تھا۔

"جناب" میں نے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ اس کے خراٹوں کے سوا کچھ نہ سن کر میں نے اس کا کندھا چھوا۔ اس نے ہیبت سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"جناب"

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہوئے اور مجھے پہچانتے ہوئے درشتی سے کہا۔

"ایک پیاسٹر کا لوبیا' السی کے تیل کے ساتھ دیجئے"

"ایں؟"

"مجھے پیاسٹر مل گیا ہے اور رکاب بھی مل گئی ہے۔"

"تم دیوانے ہو' لڑکے" وہ مجھ پر چیخا۔ "دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

جب میں نہ ٹلا تو اس نے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں اوندھا جا گرا میں درد کی حالت میں' اپنے ہونٹوں پر لرزنے والی کراہوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس پر غصے سے بھرپور ایک نظر ڈالی میں نے سوچا کہ یونہی ناامید گھر لوٹ جاؤں' مگر ہیرو بننے کے خواب اور جرات نے میرا ارادہ بدل دیا۔ میں نے ارادہ باندھ کر ایک فوری فیصلہ کیا اور اپنی قوت مجتمع کر کے رکاب اس پر دے ماری وہ ہوا میں اڑتی ہوئی گئی اور اس کے سر پر لگی' میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا' نتائج سے بے پروا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اسے ہلاک کر دیا ہے' بالکل اسی طرح جیسے نائٹ نے غول (چڑیل) کو (قتل) کیا تھا۔ میں نے دوڑنا جاری رکھا تاوقتیکہ میں قدیم دیوار تک نہ جا پہنچا' ہانپتے ہانپتے میں نے اپنے پیچھے دیکھا مگر کسی تعاقب کے آثار نہ تھے۔ میں سانس بحال کرنے کے لئے رکا' پھر خود سے سوال کیا' اب مجھے کیا کرنا چاہیے جب کہ دوسری رکاب بھی گم ہو گئی؟ میری پٹائی تو ہونی تھی' نہ کم نہ زیادہ' اس بات نے مجھے کچھ وقت کے لئے' واپس جانے کے ارادے سے باز رکھا۔

پیاسٹر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اس سے بہر طور پر محظوظ ہو سکتا تھا' سزا پانے سے پہلے پہلے۔ میں نے یہ تصور کرنے کی ٹھانی کہ میں اپنا ہر غلط کام بھول چکا ہوں۔ مگر مداری کہاں کا تھا' میربین کہاں گیا؟ میں نے ان کے لئے ہر طرف نظر ڈالی مگر لاحاصل!

اس بے کار تلاش سے اکتا کر میں اپنا وعدہ نبھانے قدیم زینے کی طرف چل پڑا۔ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا' خود کو ملاقات میں مشغول تصور کرنے لگا۔ مجھے مٹھائیوں کی خوشبو سے رچے لبے ایک اور بوسے کی شدت سے طلب ہوئی۔ میں نے اپنے تئیں اعتراف کیا کہ چھوٹی سی لڑکی نے مجھے محبت کی سب سے پیاری حس سے آشنا کیا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا اور تصور میں کھویا ہوا تھا کہ ایسے میں پیچھے سے ایک سرگوشی سنائی دی۔ میں احتیاط سے سیڑھیاں چڑھنے لگا اور آخری قدم پر میں آگے دیکھنے کی کوشش میں منہ کے بل گر پڑا' جب کہ وہاں کوئی مجھے دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ میں نے ایک بلند دیوار سے گھرے کھنڈر دیکھے جن میں آخری سردار کادی کا خزانہ اور صدر دفتر تھا۔ زینے کے نیچے ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے اور سرگوشی کی آواز انہیں کی طرف سے آئی تھی۔ مرد آوارہ منش تھا اور عورت بھیڑیں پالنے والے جپسیوں جیسی تھی۔ مجھے میرے دل کے نہاں خانے کی متجسس آواز نے بتایا کہ ان کی ملاقات' میری ملاقات جیسی تھی۔ ان کے ہونٹ اور ان کی نگاہوں کا تبادلہ یہی کہہ رہا تھا' مگر

انہوں نے اپنے ناقابل تصور افعال کے انجام دینے میں حیران کن مہارت دکھائی۔ میری نگاہیں تجسس، حیرت، مسرت اور کسی قدر اضطراب کے ساتھ ان پر جم گئیں۔ آخرش وہ پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے، گویا کوئی دوسرے کی موجودگی محسوس نہ کر رہا ہو، کچھ توقف کے بعد مرد بولا:

"پیسہ!"

"تم کبھی مطمئن نہیں ہوتے" اس نے چڑچڑاہٹ میں کہا۔

"زمین پر تھوکتے ہوئے وہ بولا: "تم تو ننگی ہو"

"تم چور ہو۔"

اس مرد نے اس کی کمر پر زور دار ہاتھ جڑ دیا اور اس (عورت) نے مٹھی بھر خاک اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماری۔ پھر اس (مرد) کا چہرہ خاک آلود ہو گیا اور وہ اس (عورت) پر جھپٹا اور اس کے حلقوم کے گرد انگلیوں سے دائرہ تنگ کر دیا اور یوں ایک سخت لڑائی شروع ہو گئی۔

عورت نے اپنے آشنا "سابق" کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کے لئے پوری قوت مجتمع کی۔ اس کی آواز دم توڑ گئی، اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں جب کہ اس کے پاؤں اکڑ کر ہوا میں بلند ہو گئے۔ میں دہشت کے مارے گونگا بنا تمام تماشا دیکھتا رہا حتی کہ میں نے عورت کی ناک سے خون کی لکیر بہتی دیکھی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مرد کے سر اٹھانے سے پہلے میں پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ سیڑھیوں میں بھاگا۔ میں نے بھاگنا جاری رکھا تا آں کہ میرا سانس اکھڑ گیا۔ ہانپتے ہوئے میں اپنے اردگرد سے بالکل ناواقف تھا، مگر جب میں اپنے حواس میں آیا تو معلوم ہوا کہ میں ایک چوراہے کے وسط میں واقع ایک بلند محراب (VAULT) کے نیچے تھا۔ میں نے اس سے قبل اس جگہ کبھی قدم نہ رکھے تھے اور مجھے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ جگہ میرے گھر سے کس سمت میں واقع ہے۔ اس کے دونوں جانب بھکاری بیٹھے تھے اور تمام اطراف سے لوگ امڈ رہے تھے جو کسی کی طرف متوجہ نہ تھے۔

خوف و دہشت کے عالم میں مجھے احساس ہوا کہ میں اپنا رستہ بھول چکا ہوں اور میرے گھر تلاش کرنے سے پہلے بے شمار مشکلات میری منتظر ہیں۔ کیا مجھے کسی راہ گیر سے راستے کی تلاش کے لئے مدد طلب کرنی چاہیے؟ کیا ہو گا اگر اتفاق سے میں لوبیا فروش قسم کے آدمی یا اس کھنڈر کے آوارہ گرد جیسے شخص سے جا ٹکرایا؟ کیا کوئی کرشمہ ظہور پذیر ہو گا کہ میری ماں آپہنچے اور پھرتی سے اس کی طرف لپک سکوں؟ کیا مجھے اپنا راستہ چننا چاہیے، بھٹکتے بھٹکتے حتی کہ مجھے کوئی ایسی مانوس علامت مل جائے جس سے مجھے اپنا صحیح راستہ مل جائے؟

میں نے خود سے کہا کہ مجھے مستقل مزاج ہونا چاہیے اور فوری فیصلہ کر لینا چاہیے۔ دن گزر رہا تھا اور جلد پراسرار تاریکی چھا گئی۔

سنگین اردین / سراب اسلم

نغمۂ شانز

یہ گرمیوں کا ایک دن تھا۔ سفید رنگ کے گھروندوں کو بوگہ پہاڑ نے اپنی وادی کے بازوؤں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ سفید رنگ کے گھریوں لگ رہے تھے جیسے بہت سے راج ہنس جھیل کی چمکدار سطح پر اڑنے سے پہلے جمع ہو گئے ہوں۔

دوپہر کی نرم گرم دھوپ ہر ذی روح کے لیے آسودگی اور امن کا پیغام لے کر اتری اور اس پرامن فضا میں ایسے ہی ایک گھر کے دروازے سے نغمہ شانز کی مدھر آواز ابھرنے لگی۔ اس کومل آواز نے فضا میں ایک معطر خنکی کو بکھیر دیا۔ اس نغمگی سے متاثر ہو کر چلنے والے (جو کبھی کبھار اس گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے) رک جاتے۔ ایک دو لمحہ کے لیے نغمگی کو اپنی روح میں بساتے اور پھر حیرانی کے عالم میں آگے بڑھ جاتے۔ اس لمحے اگر کوئی شخص ہمت کر کے اس گھر میں داخل ہو جاتا تو اسے نیلی سلک کا پردہ اٹھانے پر ایک خوش جمال دوشیزہ کے درشن ملتے جو کمرے کے اگلے حصے میں رنگا رنگ کے کپڑوں میں ملبوس شانز بجا رہی تھی۔

وقفے وقفے سے اس لڑکی کے چہرے سے ایک گلابی کرن نمودار ہوتی جو اس کے بے داغ سفید چہرے سے نکلتی اور یہ کرن اور نمایاں ہو جاتی اگر اس لڑکی کا رنگ سانولا ہوتا۔۔۔!

وہ آہستگی سے اپنے ہونٹوں کو جنبش دے رہی تھی۔ وہ ہونٹ جن پر سیبوں جیسی سرخی تھی' (اور ان ہونٹوں کی لرزش نغمے سے ہم آہنگ تھی۔۔۔" اس کی براؤن رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں تیزی سے پلک جھپکنے میں مصروف تھیں اور کبھی کبھار جذبات کا جوار بھاٹا اس تواتر کو منتشر کر رہا تھا اور اس کی بچوں جیسی نرم گوری گوری انگلیاں تتلی کی مانند ادھر سے ادھر اڑ رہی تھیں۔ اس عالم میں جو کوئی بھی اسے دیکھتا ضرور حیران ہوتا کہ قدرت نے کس طرح ایک فرد واحد کو اپنے حسن بے پناہ سے نوازا ہے۔۔۔!

اسی اثنا میں ایک قریبی گھر سے ایک بد شکل شخص نمودار ہوا اور پھر ساز بجانے والی کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ کچھ جھکا اور پھر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا۔ اس آدمی کا چھوٹا سا سر تھا جس پر بے ترتیب سے بال تھے جو ایک سخت قسم کے برش کی طرح اکڑے ہوئے تھے۔ اس کے بے ڈھب جبڑے اور سیدھے کان اس کی بدصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ جو کوئی بھی اسے دیکھتا' یقیناً اس بات پر غور کرتا کہ قدرت نے کس طرح اس انسان کو اپنے حسن کے خزانے سے محروم رکھا ہے تاہم وہ بد شکل آدمی نغمے کی دھن میں گم تھا۔ اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں اس کی ٹھوڑی پر عالمِ حیرت میں گڑی ہوئی تھیں۔

اس وقت مرغابیاں کیا کریں گی۔

جب جھیل کا پانی جم جائے گا۔۔۔؟

لوک گیت کے یہ بول جو ساز بجانے والی اس وقت ادا کر رہی تھی' اس شخص کے دل میں احساس تنہائی

پیدا کر رہے تھے۔

اسی لمحے نیلے رنگ کا ریشمی پردہ پھڑپھڑا رہا تھا اور ساز بجانے والی کی نرم و نازک انگلیاں اس شخص کو نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت، جس نے ایک طرف بے پناہ حسن برسایا تھا اس کی بدصورتی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ جبکہ اس خوش جمالی کی نغمہ ریزی اس کے دل میں خواہش کا طوفان برپا کر رہی تھی۔ تب اس شخص کی آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلکا اور اس کے گالوں کو گیلا کرتا ہوا رزقِ خاک ہوا۔

عین اسی لمحے موسیقی تھم گئی، جیسے کسی نے شانز نامی ساز کے تار توڑ ڈالے ہوں۔۔۔!

الفانسو ریز/ محمود احمد قاضی

ہاتھ

میجر آرنیڈ ایک لڑائی میں اپنا ہاتھ گنوا بیٹھا تھا اور بدقسمتی سے یہ اس کا دایاں ہاتھ تھا۔ کچھ لوگ اپنے پاس کانسی، ہاتھی کے دانت، شیشے اور لکڑی کے بنے ہوئے ہاتھوں کا ذخیرہ کرلیتے ہیں اور ان میں سے بعض تو مذہبی مجسموں یا ان کی نقل کے ہاتھ ہوتے ہیں اور بعض کا تعلق آثار قدیمہ سے ہوتا ہے۔ اور سرجن ڈاکٹروں نے بھی اپنے پاس الکحل سے بھرے مرتبانوں میں ایسی بری چیزیں رکھ چھوڑی ہوتی ہیں۔ تو پھر ایک شاندار کارنامے کی یاد دلانے والے اس کٹے ہوئے ہاتھ کو کیوں نہ محفوظ کیا جائے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ایک ہاتھ کی قدر و قیمت ایک دماغ یا دل سے کم ہوتی ہے؟

ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے۔ آرنیڈا نے اس کے بارے میں سوچا تو نہیں تھا لیکن وہ اپنے جبلی تقاضے کی بناء پر مجبور تھا۔ مذہبی نقطہ نگاہ کے مطابق آدمی کو خدا نے چکنی مٹی سے انسانی شکل میں ڈھالا تھا۔ حیاتیاتی نقطہ نظر کا حامل شخص اپنے ہاتھ کا شکرگزار رہتا ہے کہ اسی ہاتھ کے بدولت اس نے اس دنیا کو ایک ایسی فطری سلطنت میں تبدیل کیا جو کہ آرٹ اور ہنر کی سلطنت ہے۔ اگر تھیبس کی مضبوط دیواریں المیفن کے بربط کی موسیقی کی لہروں پر اٹھائی گئی تھیں تو یہ اس کا معمار بھائی زیتھس تھا جس نے پتھر اپنے ہاتھوں سے اوپر اٹھائے تھے۔ فرسودہ اساطیر میں ہاتھ سے کام کرنے والے کارکن ایک جادوئی ہیولے میں لپٹے نظر آتے ہیں۔ وہ حیران کر دینے والے کارکن ہیں۔ یہ "آگ جلانے والے ہاتھ" میں جیسے کہ "آروزکو" نے انہیں پینٹ کیا ہے۔ ڈیگو ریورا کی دیواری تصویر میں کائناتی گلوب کو ایک ہاتھ کی گرفت میں دکھایا گیا ہے جو تخلیق اور تباہی دونوں کی قدرت رکھتا ہے اور شیپنگو میں یہ تاثر ابھرتا ہے جیسے پرولتاری ہاتھ زمین کی وراثت کا مطالبہ دہرا رہے ہوں۔

دوسری حسیات تو بے عملی کا ثبوت دیتی ہیں لیکن ہاتھوں کو استعمال میں لانے کا ذوق نت نئے تجربات کرتا ہے یہ تخریب کے ذریعے تعمیر کرتا ہے، یعنی زمین پر موجود بدصورتیوں کو ایک ترتیب حسن میں تبدیل کرتا ہے اور یوں زمین کا بیٹا "انسان" جنم لیتا ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے مرتبان کا نمونہ بھی پیش کرتا ہے اور ایک سیارے یعنی زمین کو بھی زندگی بخشتا ہے۔ یہ کمہار کے چاک کو بھی گھماتا ہے اور نہر سویز جیسا عجوبہ بھی پیش کرتا ہے۔

یہ یعنی ہاتھ ایک نازک مگر طاقتور ہتھیار ہے، خوش قسمتی سے اس کے پاس قبضہ، سنسی، چمٹا، آنکڑا، زنجیر، عضلات، بند شیں، مریں، کشن، وادیاں اور ٹیلے وغیرہ جیسے مادی وسائل دستیاب ہیں۔ یہ نرم بھی ہے اور سخت بھی ۔۔۔ اس کا انداز جارحانہ بھی ہے اور محبت کرنے والا بھی۔

یہ پانچ پتیوں والا ایک ایسا عجیب و غریب پھول ہے جو ایک حساس پودے کی طرح معمولی سی تحریک پر کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ کیا آفاقی ہم آہنگی میں پانچ کا عدد ایک لازمی عنصر ہے؟ کیا اس کا تعلق ڈاگ روز، فارگیٹ می ناٹ یا دوسری قسم کے یونانی سرخ پھولوں سے ہے؟ گو کہ نجومی لوگ اپنی وضاحتوں میں تو صحیح نہیں لیکن شاید وہ اپنے

اختصارات میں صحیح ہیں۔ پرانے وقتوں کے قیافہ شناسوں نے اگر اپنی مبہم توجیہات مکمل کرلی ہوتیں تو وہ یقیناً" اس نتیجے پر پہنچتے کہ چہرہ ایک آئینہ ہوتا ہے اور یہ محض جذبات کی عکاسی کرتا ہے مگر ہاتھ تو عمل کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہاتھ غیر معمولی قدر و منزلت کا حق دار تھا اور یہ یقیناً" میجر آرنیڈا کے گھریلو نوادر میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہو سکتا تھا۔ ہاتھ کو نہایت احتیاط کے ساتھ ایک قیمتی ڈبے کی نرم گدیلی سطح پر رکھا گیا تھا۔ سفید ساٹن کی چنٹیں ایک ننھے منے کوہ الپس کا لینڈا سکیپ لگتی تھیں۔ قریبی دوستوں کو کبھی کبھار چند لمحوں کے لئے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کا موقعہ فراہم کیا جاتا تھا۔ یہ خوش منظر' ہوش مند اور ذہین ہاتھ تھا' حالانکہ اسے دیکھنے پر یہ تاثر بھی ابھرتا تھا کہ جیسے اس نے کسی تلوار کے قبضے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو۔ اسے بالکل مناسب انداز میں محفوظ کیا گیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ پر اسرار چیز' یہ چھپا ہوا تعویذ ایک مانوس شے میں تبدیل ہوتا گیا۔ اور پھر اسے پوشیدہ مقام سے نکال کر گھر کے بڑے کمرے میں عظیم الشان فوجی تمغوں اور فتوحات کے نشانات کے درمیان ایک شوکیس میں رکھ دیا گیا۔

اس کے ناخن بڑھنے لگے۔ نہایت خاموشی اور آہستہ روی کے ساتھ اس میں خفیہ زندگی بیدار ہونے لگی۔ بعض اوقات یوں لگتا کہ اس کی بڑھوتی کا عمل نہایت ست ہے اور کبھی یہ عمل فطری میلان کے عین مطابق محسوس ہوتا۔ پہلے پہل کسی قدر نفرت کے ساتھ گھر کے افراد کے ناخنوں کو تراشنے والے ملازم نے ہر ہفتے اس کے ناخنوں کی دیکھ بھال کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ ہاتھ ہمیشہ سجا سجایا اور صاف ستھرا رکھا جاتا تھا۔

گھر کے لوگوں کو نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوا (شاید اس طرح جیسے انسان پہلے خود ہی خدا کا بت بناتا ہے اور پھر اسے چھوٹے سے آرٹ کے نمونے میں تبدیل کر دیتا ہے) لیکن ہاتھ کا رتبہ کم ہو گیا یہ بے وقعتی کا شکار ہو گیا۔ اب یہ کوئی یادگار چیز نہیں تھا اور گھریلو استعمال کی ایک چیز بن گیا تھا۔ چھ ماہ بعد اس سے پیپر ویٹ کا کام لیا جانے لگا یا پھر میجر اپنے مسودے کے کاغذات کو ادھر ادھر اڑنے سے بچانے کے لئے اسے استعمال کرنے لگا۔ ان دنوں وہ اپنی یادداشتوں پر مبنی ایک کتاب لکھ رہا تھا اور چونکہ کٹا ہوا ہاتھ بہت نرم اور لچک دار تھا' اور اس کی انگلیوں کی پوزیشن وہی رہتی تھی جس میں کہ اسے رکھا جاتا تھا اس لئے وہ لکھنے کے لئے اپنا بایاں ہاتھ استعمال میں لا رہا تھا۔

ہاتھ کی کراہت آمیز ٹھنڈک کی بناء پر بچوں نے اس کا احترام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک سال گزرنے کے بعد وہ اس سے ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچنے کا کام لینے لگے۔ یا پھر وہ اس کی انگلیوں کو خاص انداز میں بند کر کے ساری دنیا میں رائج عوامی قسم کے فحش اشارے جیسے اشارے کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

تب ہاتھ نے ان چیزوں کو یاد کرنا شروع کیا جن کو کہ وہ مکمل طور پر بھلا بیٹھا تھا۔ اب اس کی شخصیت کا نوٹس لیا جانے لگا۔ اس نے خود ہی اپنے کردار کا شعور حاصل کر لیا تھا۔ اس نے لایعنی حرکتیں شروع کر دیں۔ اس نے ترن تلا (مکڑی) کی طرح چلنا شروع کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر میں ہر وقت ایک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور پھر ایک دن جب اس نے اپنے آپ ایک دستانہ پہن لیا اور کٹی ہوئی کلائی پر ایک کنگن سجا لیا تو اس کی اس حرکت نے کسی کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کی۔

یہ اب عفریت نما کتے یا پھر ایک کیکڑے کی طرح گھر میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا۔ پھر اس نے خرگوشوں کی طرح پھدکنا بھی سیکھ لیا اور وہ انگلیوں کے سہارے حیرت انگیز طریقے سے اچھل بھی سکتا تھا۔ ایک دن اس کو ہوا کی لہروں پر سوار دیکھا گیا اس نے اڑنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو کس طرح اس انداز میں ڈھالا؟ وہ دیکھ کس طرح سکتا تھا؟ سیانوں کا کہنا ہے کہ اگر آنکھوں میں روشنی نہ بھی ہو تو مخصوص مشق اور تربیت کی وجہ سے دوسرے اعضا ایسی مدہم سی روشنی حاصل کر لیتے ہیں جس کے ذریعے وہ دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔۔۔ تو پھر ایسے میں ایک ہاتھ بینا کیوں نہیں ہو سکتا؟ بے شک یہ اپنی چھونے کی صلاحیت کی بناء پر بینائی حاصل کر سکتا ہے اس کی آنکھیں تقریباً" اس کی انگلیوں میں ہوتی ہیں اس کی ہتھیلی ہوا کی لہروں کی بدولت اپنے اردگرد کو محسوس کر سکتی ہے جیسے ایک چمگادڑ کو اپنے آس پاس موجود اشیا کا ادارک ہو جاتا ہے۔ سائبیریا کے ابر آلود خطے کا باشندہ ایک اسکیمو بھی اپنی ایسی ہی صلاحیت کی وجہ سے وہاں کے موسمی حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔ ایک ہاتھ ہزاروں پھرتیلی چیزوں کو پکڑ سکتا ہے۔ وہ ایسی نیم شفاف لہروں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں اور یہ لہریں غیر مرئی ہوتی ہیں اور کوئی مدافعت بھی نہیں کرتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جونہی ہاتھ نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھال لیا تو وہ کسی قدر غصہ ور ہو گیا۔ اور شتر بے مہار بھی ہو گیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ "ہاتھ" اصل میں ہاتھ سے ہی نکل گیا۔ یہ اب اپنی مرضی کا مالک تھا۔ جب جی چاہتا غائب ہو جاتا اور جب اس کی مرضی ہوتی واپس آجاتا۔ اس نے شراب کے گلاسوں اور برتنوں کے بعید از قیاس توازن رکھنے والے قلعے تعمیر کر لئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نشے کی حالت میں رہنے لگا اور اسی حالت میں ساری رات پڑا رہتا تھا۔

یہ کسی کا حکم نہیں مانتا تھا۔ یہ شوخ اور شرارتی ہو گیا۔ اپنی طرف بلانے والوں کی یہ ناک مروڑ دیتا اور دروازے پر جمع ہونے والوں کو یہ تھپڑ رسید کر دیتا۔ یہ بے حرکت بھی پڑا رہتا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ جن سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی تھی ملتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا پایا جاتا' مگر پھر اچانک شرانگیزی پر اتر آتا اور فحش حرکات کرنے لگتا۔ اس کی واحد خوشی اپنے سابقہ مالک کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتی تھی۔ اسے اپنے مالک کے قریب آنے والی مکھیوں کو اڑانے کی عادت پڑ گئی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے رویے میں نرمی ہوتی تھی' اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھی چمکنے لگتے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے اپنا ایسا بیٹا تصور کرتا ہو جو کہ ناخلف نکلا ہو۔

اس نے ہر چیز درہم برہم کر دی تھی۔ بعض اوقات وہ گھر کی صفائی ستھرائی کا ذمہ لے لیتا اور بعض موقعوں پر گھر کے افراد کے جوتوں کے جوڑے اور سائز آپس میں بدل دیتا۔ وہ پتھر پھینک کر کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیتا یا پھر وہ گلی میں کھیلتے بچوں کا گیند چھپا لیتا۔

میجر یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور خاموشی سے کڑھتا رہتا تھا میجر کی بیوی کو اس ہاتھ سے نفرت تھی اور اس کی نفرت بجا تھی کہ وہی اس کے ستم کا سب سے زیادہ شکار رہتی تھی۔ یہ ہاتھ اپنی دوسری سرگرمیوں کے علاوہ میجر کی بیوی کی بے عزتی کرتا اور اسے سلائی کڑھائی اور ریند ھنے پکانے کے سلسلے میں لیکچر جھاڑتا رہتا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ پورے گھرانے کی ہمت پست ہو گئی تھی۔ ایک ہاتھ والا شخص جو کبھی نہایت خوش باش شخص ہوا کرتا تھا اب بہت غم زدہ اور رنجیدہ تھا۔ اس کی بیوی اب اس پر اعتماد نہیں کرتی تھی اور کسی قدر ڈری سہمی سی رہتی تھی۔ بچے بھی بے توجہی کا شکار تھے۔ وہ اپنی تعلیم ترک کر بیٹھے تھے اور بداخلاق بھی ہو گئے تھے۔ گھر میں بے سکونی' خوف اور بے جا شور کا دور دورہ تھا جیسے گھر میں کوئی بدروح داخل ہو گئی ہو۔ اب کھانا بھی بے وقت ہی کھایا جاتا اور وہ بھی کبھی بیٹھک اور کبھی بیڈ روم میں۔۔۔ کیونکہ میجر کی سراسیمگی اس کی بیوی کے

بدحواسی پر مبنی احتجاج اور بچوں کی شرارتوں کی وجہ سے ہاتھ نے اپنی بے ہنگم سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ڈرائنگ روم پر قبضہ جما لیا تھا' اس نے اسی میں اپنے آپ کو بند کر لیا تھا اور جو اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ اس کے سر کو پلیٹوں سے نشانہ بناتا۔

پرانے ملازمین میں سے حتیٰ کہ نرس بھی جو کہ خاتون خانہ کی دیکھ بھال کرتی تھی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ نئے ملازمین ایک دن کے لئے بھی اس آسیب زدہ گھر کو برداشت نہ کر سکے۔ دوستوں اور رشتے داروں نے گھر کے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ پڑوسیوں کی طرف سے پولیس کو بھی کئی بار شکایتیں ملیں۔ چاندی کا بنا ایک نایاب کدوکش جو کہ نیشنل پیلس میں موجود تھا اچانک جادوئی طریقے سے غائب ہو گیا۔ اچانک چوریوں کی وبا سی پھوٹ پڑی جن کے لئے اس ہاتھ کو مورد الزام ٹھہرایا گیا حالانکہ زیادہ تر وہ بے گناہ تھا۔

ظلم کی بات یہ تھی کہ لوگ ہاتھ کو الزام نہیں دیتے تھے اور نہ ہی وہ اس بات پر یقین کرتے تھے کہ یہ ایک زندہ ہاتھ تھا بلکہ وہ ہر قسم کی خرابیوں کا ذمہ دار اس بے چارے ٹنڈے کو ٹھہراتے تھے جس کا کٹا ہوا ہاتھ اب ان سے سانتا آنیا کی ٹانگ جتنی قیمت وصول کرنے پر تل گیا تھا۔ ان کے نزدیک بلاشبہ آرنیڈا ایک ایسا ساحر تھا جس نے شیطان سے ساز باز کر رکھی تھی۔ لوگ اسے دیکھتے ہی اپنے سینے پر کراس کا نشان بناتے تھے۔

اسی اثناء میں ہاتھ نے دوسروں کو پہنچنے والے نقصان سے لاتعلق رہتے ہوئے اپنے آپ کو ایک اتھلیٹ جیسا تنومند اور طاقتور بنا لیا تھا اور اس نے مزید بہت کچھ سرانجام دینا سیکھ لیا تھا۔ شاید اس نے میجر کی یادداشتوں کے ضمن میں بھی اس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہو؟ اس رات جب اس نے تازہ ہوا حاصل کرنے کے لئے کار میں سوار ہونے کا فیصلہ کیا تو آرنیڈا کے گھر والے جو اسے اس فیصلے سے نہیں روک سکتے تھے سمجھ بیٹھے تھے کہ اب سب کچھ تباہ ہونے والا تھا' لیکن کوئی ایکسیڈنٹ تک نہ ہوا' نہ ہی انہیں کوئی جرمانہ ہوا اور نہ ہی پولیس کو انہیں رشوت دینا پڑی۔ اب میجر کا خیال تھا کہ اگر وہ ہمارا ہم سفر رہے تو کار جو ڈرائیور کے بھاگ جانے کی وجہ سے بہت بری حالت میں تھی بہتر حالت میں رہ سکتی تھی۔

اپنی فطرت کے عین مطابق عمل کرتے ہوئے ہاتھ کو چیزوں پر قبضہ کرنے اور ان پر کنٹرول حاصل کرنے کا افلاطونی خیال سوجھا۔ جب مرغیوں کی گردنیں مروڑی جانے لگیں اور دوسرے لوگوں کے آرٹ کے نمونے گھر میں پائے جانے لگے جن کو واپس کرتے ہوئے میجر کو کئی بار ہکلانا پڑا اور معافیاں مانگنی پڑیں تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہاتھ ایک شکار کرنے والا جانور تھا اور چور بھی تھا۔

اب لوگ میجر آرنیڈا کی شرافت کو شبے کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اب وہ فریب نظر' دروازے پر دی جانے والی دستکوں' روحوں کی آوازوں اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ وہ بیس تیس کے لگ بھگ لوگ جنہوں نے ہاتھ کو دیکھا تھا ان کی بات کا یقین اس لئے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت آسانی سے توہمات کا شکار ہو سکتے تھے۔ اور جن کا تعلق ماڈرن طبقے سے تھا تو وہ خاموش رہتے تھے اور اگر جواب دیتے بھی تھے تو ادھر ادھر کی ہانک دیتے تھے تاکہ ان پر حالات سے سمجھوتہ کرنے کا الزام نہ لگے' اور نہ ہی وہ مضحکہ خیزی کا شکار ہوں۔ ادھر یونیورسٹی کے فلاسفی اور ادب کے ڈیپارٹمنٹ نے ایک گول میز کانفرنس میں اساطیر کے حوالے سے علم بشریات کے تھیسس پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

بہر حال اس کہانی کا ایک بہت نازک اور خوفناک پہلو بھی ہے۔ ایک رات کو آرنیڈا آدھی رات کے وقت چیخیں مارتا ہوا جاگ پڑا کیونکہ اس کا دائیاں کٹا ہوا ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے اپنے پرانے

دنوں کے ساتھی سے ملنے کو بے قرار ہو اٹھا ہو۔ اسے علیحدہ کرنا ناممکن تھا۔ اس نے بقیہ رات اسی حالت میں گزار دی اور بعد میں آنے والی راتوں کو بھی وہ یہی عمل دہرانے لگا۔ جس طرح آہستہ آہستہ انسان حالات کو قبول کر لیتا ہے اسی طرح میجر نے بھی اب ہاتھ کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اب وہ اپنے ہاتھ کے کٹ جانے کے حادثے کو بہتر طور پر برداشت کرنے لگا تھا اور اس کا واحد ہاتھ اب اس کے لئے کسی قدر تسلی کا باعث بن گیا تھا۔

بے چارے بائیں (مونث) ہاتھ کو دائیں (مذکر) ہاتھ کے لمس اور بوسے کی شدید ضرورت تھی۔ ہمیں اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے ست رویے سے ماقبل تاریخ کے اوصاف کی قدر و قیمت کو استقلال سے برقرار رکھنے کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ صدیوں پر محیط آہستہ روی کا وہ تسلسل تھا جس کی بنا پر نوع انسانی نے ترقی کی تھی۔ آہستہ روی کا یہ عمل دائیں ہاتھ کی خواہشات اور اس کے گستاخانہ رویے کی درستگی کرتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے دو دائیں ہاتھ نہیں کیونکہ اس طرح ہم مہلک پیچیدگیوں اور نکتہ چینیوں میں کھو گئے ہوتے --- ہم حقیقی معنوں میں انسان نہ ہوتے بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھانے والے اداکار ہوتے۔ مصور گاگن بہتر طور پر جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے وہ اپنی حساسیت پر قابو پاتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کو سکھاتا تھا کہ اسے کیسے پینٹ کرنا ہے اور کس طرح اس کام سے بائیں ہاتھ کو الگ رکھنا ہے۔

بہر حال ایک رات ہاتھ نے لائبریری کا دروازہ کھولا اور اس میں گھس کر وہ مطالعے میں مستغرق ہو گیا۔ وہ موپساں کی وہ کہانی پڑھنے لگا جس کے آخر میں ایک کٹا ہوا ہاتھ اپنے دشمن کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس نے Narvel کی وہ خوبصورت فنیسیی بھی پڑھی جس میں ایک جادوئی ہاتھ دنیا کا سفر کرتے ہوئے خوبصورتی تخلیق کرتا ہے اور بدی کا سحر پھیلاتا ہے۔ اس نے ہاتھ کے مظاہر سے متعلق فلاسفر گاؤس (Gaos) کے نوٹس کا مطالعہ بھی کیا۔-- خدا کی پناہ ---- حرفوں کی اس دل دہلانے والی یلغار کا اس پر کیا اثر ہوا ہو گا؟

اس مطالعے کا نتیجہ خاصا غم انگیز تھا جس نے اسے پرسکون بھی کر دیا تھا۔ اس شیخی بھگارنے والے آزاد منش ہاتھ نے جس نے اپنے آپ کو مطلق العنان تشخص کا حامل ایک شخص سمجھ لیا تھا اب باور کر لیا تھا کہ یہ سب کچھ تو محض ایک افسانوی تصور تھا' جس کے متعلق پہلے ہی لکھاریوں نے صفحے کے صفحے کالے کر رکھے تھے۔ نہایت غم زدہ ہوتے ہوئے بڑی مشکل سے (اور یوں کہنا چاہیے کہ آنسو بہاتے ہوئے) اس نے اپنے آپ کو گھسیٹا اور وہ بڑے کمرے میں فوجی اعزازات اور نشانات کے درمیان پڑے قیمتی شوکیس میں اپنی جگہ پر واپس چلا گیا --- مایوسی اور غم کے بوجھ تلے دب کر اس نے اپنے انداز میں خودکشی کر لی۔- اس نے اپنے آپ کو مرنے دیا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا اور میجر آرنیڈا کئی راتوں کا جگراتا اپنی آنکھوں میں لئے ہاتھ کی دیرینہ غیر حاضری کی پریشانی کے ساتھ بیدار ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ وہاں ڈبے میں پڑا تھا اور گلا گھونٹنے جیسے نشانات کی وجہ سے کسی قدر سیاہ پڑ گیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ جب اس نے صورت حال کو سمجھ لیا تو اس نے نہایت مضطرب انداز میں وہ کاغذ مروڑ کر پرے پھینک دیا جس پر اس نے اپنی ملازمت سے استعفے کا مضمون لکھ رکھا تھا۔ وہ اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو گیا اس کا فوجی تفاخر پھر سے لوٹ آیا وہ اپنے گھر والوں کو پریشان کر دینے والی اونچی آواز میں چلا اٹھا:

اٹینشن ---- فال ان --- سب اپنی جگہوں پر مستعد ہو جاؤ --- بگلچی --- فتح کا بگل بجاؤ!!

جوآن جوز آریولا / محمود احمد قاضی

کانٹا بدلنے والا

اس دور افتادہ ریلوے سٹیشن پر جب وہ مسافر پہنچا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ بھاری سوٹ کیس نے جسے اٹھانے میں کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی تھی اسے تھکا دیا تھا۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ سے چھجا سا بنایا اور ریل کی پٹڑی کو دور افق میں گم ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے سانس بحال کرتے ہوئے نہایت مضطرب انداز میں اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ یہ ٹرین کے آنے کا وقت تھا۔

کسی شخص نے (جو نجانے کدھر سے چلا آیا تھا) اسے ہلکی سی تھپکی دی۔ اجنبی نے مڑ کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک منحنی سے بوڑھے شخص کو پایا جو کہ اس کے خیال میں ریلوے کا کوئی ملازم ہو سکتا تھا۔ اس بوڑھے شخص نے اپنے ہاتھ میں ایک کھلونے کی مانند چھوٹی سی سرخ روشنی والی لالٹین پکڑ رکھی تھی۔ وہ مسافر کو دیکھتے ہوئے مسکرایا اور مسافر نے اس سے نہایت بے تابی کے ساتھ سوال کیا۔

"معاف کیجئے ---- کہیں ٹرین چلی تو نہیں گئی؟"

"کیا آپ یہاں اس علاقے میں کافی عرصے کے بعد آئے ہیں؟"

"مجھے یہاں جلدی میں آنا پڑا ---- میرا علی الصبح "T" پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"ہر کوئی یہ جان سکتا ہے کہ آپ نے صورت حال کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ فوری طور پر آپ کو مسافروں والے ہوٹل میں پہنچنا چاہیے۔"

اس نے عام راستے سے ہٹ کر واقع ایک سیب رنگ عمارت کی طرف اشارہ کیا جو شاید کبھی ایک بیرک کا کام دیتی ہو گی۔

"میں کمرہ کرائے پر نہیں لینا چاہتا ---- میں تو ٹرین پکڑنا چاہتا ہوں۔"

"جناب آپ جلدی سے کمرہ حاصل کرنے کی کوشش کریں --- شاید کوئی خالی کمرہ مل ہی جائے۔ اور اگر آپ کو کمرہ مل جائے تو اسے ایک ماہ کے لئے حاصل کر لیں۔ اس طرح یہ سستا پڑے گا اور سروس بھی اچھی ملے گی۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ---- ؟ میرا علی الصبح "T" پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"اگر میں آپ سے سچی بات کہوں تو یہ آپ کے لئے بہتر رہے گا اس طرح آپ چیزوں کا صحیح اندازہ کر سکیں گے ---- البتہ میں آپ کو ایک نصیحت کروں گا" میری بات غور سے سنیں۔

"جیسے کہ آپ جانتے ہیں یہ جگہ اپنی ریل کی پٹڑیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ابھی تک ہم تفصیلات طے کرنے میں تو ناکام رہے ہیں۔ لیکن ہم نے ٹکٹوں کی بڑھوتی اور ٹائم ٹیبلوں کی اشاعت کے سلسلے میں حیران کن کام کئے ہیں۔ ریلوے کی گائیڈ بکس میں ملک کے ہر گنجان علاقے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ عام راستوں سے ہٹ کر واقع

نہایت غیر اہم سٹیشنوں کے لئے بھی ٹکٹیں بیچی جا رہی ہیں۔

اب ہمیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ کسی طرح ٹرینیں اپنے شیڈول کے مطابق چلنے لگیں اور پھر اپنی منزل مقصود تک بھی پہنچیں۔ اور یہاں کے رہنے والے لوگ اسی بات کی امید بھی کر رہے ہیں اور پھر ہم اپنی حب الوطنی کے تقاضے کے تحت لوگوں کی ناراضگی بھی مول نہیں لے سکتے۔"

"لیکن کیا کوئی ایسی ٹرین ہے جو اس شہر سے گزرتی ہے؟"

"سیدھی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک غلط بیانی ہو گی۔ جیسے کہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں ریل کی پٹڑی تو موجود ہے لیکن بس تھوڑی سی بھدی بھی ہے۔ بعض جگہوں پر تو اسے زمین پر یوں ہی رکھ دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں کوئی ٹرین رکی نہیں لیکن اگر کوئی ٹرین اس طرف آنا چاہے تو اس کے لئے کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی گاڑیاں دیکھی ہیں اور بہت سے ایسے مسافر بھی دیکھے ہیں جو ٹرین پر سوار بھی ہوئے۔ اگر آپ مناسب وقت کا انتظار کریں تو ہو سکتا ہے مجھے ہی آپ کو کسی ایسی گاڑی میں سوار کرانے کا شرف حاصل ہو جائے جس کے کسی شاندار ڈبے میں آپ آرام کے ساتھ سفر کر سکیں۔"

"لیکن کیا ٹرین مجھے "T" تک پہنچا دے گی؟"

ہاں اسے آپ کو سوائے "T" کے کہیں اور نہیں پہنچانا چاہئے --- اگر آپ اس پر سوار ہو سکیں تو آپ کو خود اپنے آپ کو مبارک باد دینی چاہیے۔ جب آپ ٹرین پر سوار ہو جائیں گے تو آپ کی زندگی خود بخود اس خاص سمت میں رواں دواں ہو جائے گی۔ اور اگر آپ "T" نہیں بھی پہنچ جاتے تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"فرق پڑے گا کیونکہ میری ٹکٹ "T" کے لئے بنی ہے --- اور اس کے پیچھے ایک معقول وجہ ہے ---- کیا نہیں ہے؟ اور یہ کہ کیا مجھے اپنی منزل پر پہنچانا ٹرین کی ذمہ داری نہ ہو گی؟"

"بہت سارے لوگ آپ کی اس بات سے متفق ہوں گے۔ ہوٹل میں آپکو ایسے لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملے گا جنہوں نے احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ہر طرف کی ٹکٹیں خرید رکھی ہوں گی۔ عام طور پر دور اندیش لوگ اس لائن پر واقعہ ہر سٹیشن کے لئے اپنی بکنگ کروا لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے انہی ٹکٹوں سے اپنی امیدیں باندھ رکھی ہوتی ہیں.....

"میرا یہ خیال تھا کہ مجھے ٹی تک پہنچنے کے لئے صرف ایک ہی ٹکٹ کافی ہو ا۔"

"قومی ٹرینوں کا اگلا منصوبہ اس واحد شخص کے خرچ پر تیار کیا جائے گا جس نے موجودہ وقت کے اس ریلوے نظام کی ترقی کے لئے واپسی کے ٹرپ کی ٹکٹوں کی امید میں اپنا سرمایہ لگایا ہو گا اور جس کی تجاویز کو بمعہ پلوں اور سرنگوں کے ابھی تک کارپوریشن کے انجینئروں نے منظور نہیں کیا۔"

"لیکن کیا "T" تک براہ راست جانے والی ٹرین ابھی تک چل رہی ہے؟"

"ہاں یہ بھی اور اس کے علاوہ بھی بہت سی ہیں ---- سچی بات تو یہ ہے کہ ملک میں ٹرینوں کا کوئی انت نہیں --- اور مسافر حضرات یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ سروس میں کوئی باقاعدگی نہیں پائی جاتی انہیں بے تحاشا اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی ٹرین پر سوار ہوتا ہے تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ وہیں جا پہنچے جہاں کہ وہ جانا چاہتا ہے۔"

"پھر --- کیا ہو سکتا ہے؟"

"عوام کو خوش کرنے کے چکر میں انتظامیہ نے کچھ معاملات میں عجیب و غریب اقدامات کئے ہیں۔ کچھ گاڑیاں

ایسی ہیں جو ناقابل گزر راستوں پر چل رہی ہیں۔ یہ مہماتی گاڑیاں بعض اوقات سالوں بعد اپنا سفر مکمل کرتی ہیں اور مسافروں کی زندگی اس عبوری دور میں کئی قسم کے کایا کلپ سے گزرتی ہیں۔ ایسے سفر میں چونکہ خطرات بھی عام ہوتے ہیں اس لئے ممکنہ ایمرجنسی کو مد نظر رکھتے ہوئے انتظامیہ نے ایک ماتمی ڈبے اور تجہیز و تکفین والی ویگن کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ کنڈکٹر حضرات کسی مسافر کی بڑے مہنگے طریقے سے محفوظ شدہ لاش کو کسی پلیٹ فارم پر اتارنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ ٹرینیں ریل کی پٹڑی کی کمی کی بنا پر سڑکوں پر بھی چلنے لگتی ہیں۔ جب ٹرین کے پہیئے کانٹا بدلنے کی جگہ پر اچھلتے ہیں تو ڈبے خوفناک انداز میں کھڑکھڑ کرتے ہیں۔ انتظامیہ کی احتیاطی تدابیر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فرسٹ کلاس کے مسافر تو ریل کی پٹڑی پر سفر کرتے ہیں جبکہ سیکنڈ کلاس کے مسافر کے لئے ہچکولے کھانے والا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ البتہ کچھ ایسے راستے بھی ہیں جہاں ریل کی پٹڑی بالکل ناپید ہے۔ یہاں تمام مسافر ایک جیسی تکلیف ہی جھیلتے ہیں' حتیٰ کہ ٹرین آخر میں کھڑکھڑاتی ہوئی ٹکڑوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"خدا کی پناہ!"

"میں ابھی آپ کو مزید بتاتا ہوں۔" "F" نام کا چھوٹا سا گاؤں ایسے ہی حادثات کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ ٹرین ایک ناقابل گزر راستے کی طرف نکل گئی تھی۔ ریت میں دھنس کر پہیوں کے ایکسل ٹوٹ گئے تھے۔ مسافر حضرات وہاں اتنی مدت تک پڑے رہے تھے کہ ان کے لئے آپس میں گپ شپ کرنا اور دوستیاں کرنا ناگزیر ہو گیا ان کی دوستی جلد ہی دیسی گیتوں میں ڈھل گئی تھی اور اس کا نتیجہ وہ ترقی پذیر گاؤں "F" تھا جہاں بہت ساری چھوٹی چھوٹی نازک سی بچیاں ٹرین کی زنگ آلود باقیات سے کھیلتی تھیں۔

"میں کہہ نہیں سکتا کہ میں ایسی چیزوں کی کوئی پرواہ کرتا ہوں یا نہیں"

"آپ کو اپنے کردار کو مضبوط رکھنا چاہیے ---- اس طرح شاید آپ ایک ہیرو بن کر ابھریں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں مسافروں کے لئے بہادری کا مظاہرہ کرنے اور قربانی پیش کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ ایک بار کوئی دو سو کے لگ بھگ مسافروں نے جو کہ بے نام ہوں گے ہماری ریلویز کی سالانہ رپورٹ کے سنہری صفحات کو تصنیف کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک آزمائشی سفر میں انجینئروں نے ہمارے سڑک کے عملے کی غفلت کی وجہ سے عین وقت پر ایک قبر دریافت کی تھی۔ ایک پل جس کو ایک تنگ گھاٹی پر موجود ہونا چاہیے غائب تھا۔ تو جناب سمت بدلنے کے بجائے انجینئروں نے مسافروں کو ایک چھوٹی سی تقریر سے نوازا اور اسی روٹ پر سفر جاری رکھنے کے لئے حوصلہ افزائی کی تھپکی دی۔ اس حوصلہ افزا فضا میں' ٹرین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کیا گیا اور جب مسافر حضرات ساری ٹرین کو اپنے کندھوں پر لاد کر تنگ گھاٹی کی مخالف سمت میں پہنچے تو وہاں ایک طغیانی میں آیا ہوا دریا ان کی حیرانی میں مزید اضافہ کرنے کے لئے ان کا منتظر تھا۔۔ اس واقعے کا نہایت عمدہ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن کے بعد سے انتظامیہ نے پلوں کی تعمیر کے منصوبے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیئے اور ایسے مسافر حضرات جو اس قسم کی اضافی مصیبتیں جھیلنے کا حوصلہ رکھتے تھے ان کے لئے کرایے میں خصوصی رعایت دی جانے لگی۔

"لیکن مجھے علی الصبح ہر حال میں ٹی پہنچنا ہے۔"

"خدا آپ کو مزید ہمت عطا کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے ارادے کے پکے نکلے۔ آپ ایک پختہ یقین رکھنے والے شخص ہیں۔ فوری طور پر ہوٹل میں کمرہ حاصل کر لیں اور جو بھی پہلی ٹرین آتی ہے اس پر سوار ہو جائیں۔ آپ کے راستے میں ہزاروں لوگ آئیں گے اس لئے اپنی سی بھرپور کوشش کیجئے۔ جونہی کوئی ٹرین سٹیشن

پر آکر رکتی ہے تو ایک عرصے سے یہاں رکے ہوئے مسافر چیختے چلاتے ایک بے ہنگم ہجوم کی صورت میں پلیٹ فارم پر ٹوٹ پڑتے ہیں عموماً" ان کی یہ بد نظمی اور بد تمیزی کئی حادثات کو جنم دیتی ہے۔
بجائے اس کے وہ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں اور باری باری ٹرین پر سوار ہوں وہ ٹولیوں کی صورت میں ایک دوسرے کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں ادھر وہ بد نظمی اور دھکم پیل میں یوں مصروف ہوتے ہیں کہ ٹرین نکل جاتی ہے اور وہ وہیں ہاتھ ملتے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ جہالت کی لعنت میں لتھڑے یہ مسافر عموماً" اپنا وقت ایک دوسرے کو زدو کوب کرنے اور گالیاں دینے میں گزارتے ہیں۔
ایک سٹیشنوں کی ملیشیا کو ہر جگہ آزمایا گیا مگر غیر یقینی شیڈول کی وجہ سے بے فائدہ اور مالی لحاظ سے مہنگی ثابت ہوئی۔ مزید یہ کہ اس سٹاف نے بجائے خود ضمیر فروشی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے صرف ان کھاتے پیتے لوگوں کی مدد کی جو ٹرین پر سوار ہونے کے عوض انہیں سب کچھ دینے کے لئے تیار تھے۔ ایک خصوصی سکول قائم کیا گیا جہاں متوقع مسافروں کو ٹرین میں اپنی زندگیاں گزارنے کی بنیادی تربیت دی جاتی تھی' اور شائستگی کے سبق پڑھائے جاتے تھے۔ انہیں چلتی ٹرین پر سوار ہونے حتیٰ کہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہونے کا صحیح طریقہ بتایا جاتا تھا۔ پھر انہیں زرہ بکتر قسم کے اسلحے سے لیس کیا جاتا کہ مسافروں کی پسلیاں ٹوٹنے سے بچی رہیں۔
"جب مسافر ٹرین پر سوار ہو جاتے تھے تو کیا ان کی مصیبتیں ختم ہو جاتی تھیں؟"
"نسبتاً" کم ہو جاتی ہیں --- میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ سٹیشنوں کے لئے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں" مثال کے طور پر آپ سمجھ بیٹھیں گے کہ آپ "T" سٹیشن پر پہنچ گئے مگر پھر آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ تو سراب تھا۔ ان پر ہجوم ٹرینوں پر تمام حالات اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انتظامیہ خصوصی انتظامات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری سمجھتی ہے۔ کچھ سٹیشن ایسے بنا دیئے جاتے ہیں جو محض نظر آتے ہیں اور حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا ایسے سٹیشن ویرانوں میں مشہور شہروں کے نام اپنے ماتھے پر سجائے ہوتے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی تحقیق سے اس فراڈ کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ یہ کسی تھیٹر کے سٹیج سیٹ کی طرح ہوتے ہیں وہاں موجود بھوسہ بھرے لوگ اصلی لوگوں کی ہو بہو نقل ہوتے ہیں۔ ان ڈمیوں پر موسم کے تغیر و تبدل کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں لیکن بعض اوقات یہ زندگی سے بھرپور دکھائی دیتے ہیں --- ان کے چہروں پر ہمیشہ قائم رہنے والی تازگی پائی جاتی ہے۔"
"خدا کا شکر ہے کہ ٹی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔"
"لیکن سردست ٹی کو براہ راست کوئی ٹرین نہیں جاتی۔ البتہ جیسے کہ آپ چاہتے ہیں صبح سویرے جانے والی ٹرین شاید آپ کو "T" پہنچا دے۔ ریلوے انتظامیہ پتہ نہیں اپنی کن مجبوریوں کے تحت ٹرین کے بغیر رکے سفر پر روانہ رہنے کے امکان کو رد نہیں کرتی۔ کیا آپ اس بات کا یقین کریں گے کہ کچھ لوگوں کو اپنی منزل پر پہنچنے کے سلسلے میں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا؟ وہ سٹیشن "T" کے لئے ٹکٹ خریدتے ہیں' ایک ٹرین آتی ہے وہ اس پر سوار ہو جاتے ہیں اور اگلے دن وہ کنڈیکٹر کا اعلان سنتے ہیں۔ "گاڑی "T" سٹیشن پر پہنچ گئی ہے" مسافر ٹرین سے اترتے ہیں اور اپنے آپ کو واقعی ٹی سٹیشن پر پاتے ہیں ---"
"کیا کوئی ایسی ترکیب ہے جس پر عمل کر کے میں بھی یہی نتائج حاصل کر لوں؟"
"میرا خیال ہے ایسا ہو سکتا ہے --- لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی ترکیب اس سلسلے میں کارگر بھی ثابت ہو گی یا نہیں --- بس آپ ہر طریقہ آزمائیں -- آپ مسافروں کی پرواہ کئے بغیر "T" پہنچنے کے پکے ارادے کے ساتھ ٹرین پر سوار ہو جائیں۔ وہ آپ کو مسافروں کی مشکلات کی کہانیاں سنا کر بدل کرنے کی کوشش کریں گے

اور آپ کو سر عام برا بھلا کہتے ہوئے خود موقع کی تلاش میں رہیں گے۔

"اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"حقیقت یہ ہے کہ ٹرینیں جاسوسوں سے بھری ہوتی ہیں یہ رضاکار جاسوس انتظامیہ کی تعمیری روح کو اجاگر کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں خود نہیں پتہ ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' بس وہ محض بولنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ ہر کہے گئے جملے کے تمام ممکنہ معانی بیان کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ وہ نہایت سادہ بیانات کو خطرناک معانی پہنچانے کے فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ آپ کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کو راستے میں پڑنے والے کسی ناموجود سٹیشن پر گرا دیا جاتا ہے تو آپ اپنی باقی ماندہ زندگی وہیں ہچکولے کھاتے ہوئے گزاریں گے۔ سفر کرتے ہوئے آپ کو حوصلے سے کام لینا ہو گا۔ جہاں تک ممکن ہو کم کھایئے۔ اور اس وقت تک سٹیشن پر قدم مت رکھیں جب تک کہ ٹی سٹیشن پر آپ کو کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آجائے۔"

"لیکن میں تو "T" میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"اگر ایسا ہے تو آپ کو بے حد محتاط رہنا چاہیے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رستے میں آپ کو کئی قسم کے دھوکے دیئے جائیں گے۔ اگر آپ ٹرین سے باہر جھانک کر دیکھیں گے تو آپ فریب نظر کا شکار ہو جائیں گے۔ کھڑکیوں کو ایسے آلات سے مزین کیا گیا ہے جو مسافر کے ذہن کو کئی قسم کے واہموں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ آپ کو نہایت آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ انجن کے ذریعے ایک ایسا نظام بروئے کار لایا جاتا ہے جو حرکت اور شور کا ایسا تاثر پیدا کرتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے ٹرین چل رہی ہے۔ حقیقت میں ٹرین کافی عرصے سے رکی کھڑی ہوتی ہے مگر مسافر کھڑکی کے شیشوں سے بدستور لینڈ سکیپ کا نظارہ کر رہے ہوتے ہیں۔

"آخر ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہے؟"

"انتظامیہ نے نہایت مہارت کے ساتھ مسافروں کو ان کی منزل کے کھو جانے کے احساس اور پریشانی کو کم کرنے کے لئے ایسا انتظام کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ اس امید میں ہیں کہ ایک دن مسافر اپنا سب کچھ تقدیر اور ایک طاقتور کارپوریشن کے ہاتھوں میں سونپ دیں گے اور وہ یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں رہیں گے کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں اور انہیں جانا کہاں ہے۔"

"اور تم ---- کیا تم نے اس لائن پر بہت زیادہ سفر کیا ہے؟"

"میں --- میں تو جناب ایک معمولی کانٹا بدلنے والا ہوں ---- سچی بات کہوں ---- میں تو ایک ریٹائرڈ کانٹا بدلنے والا ہوں اور کبھی کبھار گزرے دنوں کو ---- اچھے دنوں کو یاد کرنے آتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کوئی سفر نہیں کیا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے مسافروں سے بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جس ماحول کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے لئے لوگوں میں دلچسپی پیدا کرنے میں ٹرینوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بعض ٹرینوں کا عملہ بڑے پراسرار کمالات دکھاتا ہے۔ وہ کسی جگہ کی خوبصورتی کے نظارے کے بہانے لوگوں کو ٹرین سے اترنے کے لئے کہتے ہیں۔ وہ غاروں' آبشاروں اور آثار قدیمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

"جناب اس کھوہ کی تعریف کے لئے آپ کو پندرہ منٹ دیئے جاتے ہیں" کنڈیکٹر یہ جملہ خوشگوار لہجے میں ادا کرتا ہے۔

اور جب مسافر کافی فاصلے پر چلے جاتے ہیں تو ٹرین ایک دم پوری رفتار سے روانہ ہو جاتی ہے۔"

"اور مسافر۔۔۔؟"

"مسافر کچھ عرصہ کے لئے تو الجھن میں مبتلا ہو کر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔۔ لیکن بالآخر باہم مل کر کالونیاں بسا لیتے ہیں۔ یہ عارضی بستیاں ایسے علاقوں میں معرض وجود میں آتی ہیں جو تہذیب یافتہ علاقوں سے بہت دور ہوتی ہیں مگر قدرتی وسائل سے مالا مال ہوتی ہیں۔ یہاں نوجوانوں کا ایک خاص گروہ ہر قسم کے لہو و لعب میں جس میں خاص طور پر عورتیں شامل ہوں ڈوب جاتا ہے۔ یہ کتنی عمدہ بات ہو گی کہ آپ ایسی خوبصورت پوشیدہ جگہ پر خوبصورت عورتوں کے ساتھ اپنے دن گزاریں؟"

بوڑھے شخص نے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور مسافر کو مسکراتے ہوئے رحمدلی کے ساتھ دیکھا۔ اسی لمحے دور سے وسل سنائی دی۔ بوڑھا ایک دم اچھلا اور بے چینی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو گیا وہ اپنی لالٹین سے بڑے مضحکہ خیز سے سگنل دینے لگا۔

"کیا یہی گاڑی ہے؟" اجنبی نے پوچھا۔

بوڑھا شخص نہایت عجلت اور افراتفری میں ریلوے سٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا۔ جب وہ کافی دور چلا گیا تو اس نے مڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"اگر خوش قسمتی نے تمہارا دامن تھام لیا تو تم صبح تک وہاں پہنچ جاؤ گے" تمہارے اس ریلوے سٹیشن کا کیا نام تھا؟

"ایکس" اجنبی نے جواب دیا۔

اور اگلے ہی لمحے وہ آدمی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ لیکن اس کی لالٹین کا سرخ نقطہ ریلوے لائنوں کے درمیان آنے والی ٹرین کی سمت میں ادھر ادھر حرکت کرتا رہا۔

مسافروں کی گزرگاہ کے دوسری طرف انجن اپنی کھڑکھڑاہٹ اور شور کے ہمراہ تیزی سے چلا آرہا تھا۔

بجوان سٹرن بجورنسن / اعجاز احمد فاروقی

فادر

جس آدمی کی سرگشت آگے بیان ہونے والی ہے وہ نہ صرف اپنے علاقے کے بڑے زمین داروں میں سے تھا بلکہ ایک ذی اثر اور ذی شان شخصیت بھی تھا اس کا نام' تھارڈ او برائین تھا۔
ایک دن وہ اپنے علاقے کے پادری کے پاس آیا اور اس سے کہا
"میرے ہاں بیٹا ہوا ہے اور میں اس کے بپتمسے کے لئے آیا ہوں"
"اس کا نام کیا ہو گا؟"
"فن۔ میرے والد کی نسبت سے"
"اور اس کے سرپرست لوگ کون ہوں گے؟"
ان کے نام بھی بتائے گئے وہ تھارڈ کے رشتہ داروں کے علاوہ اپنے علاقے کے سرکردہ اور مشہور افراد تھے ان میں خواتین اور مرد' دونوں ہی شامل تھے۔
"اس کے علاوہ اور کچھ؟"۔ پادری نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا
یہ سن کر زمین دار پل بھر کے لئے تو متذبذب ہوا تاہم اس نے کہا
"میری ایک خاص تمنا یہ ہے کہ اس کو آپ خود ہی اپنے ہاتھوں سے پتسمہ دیں"
"یہ تو ہفتے کے دن ہی ممکن ہے"
"چلئے ٹھیک ہے' آئندہ سینچر کو' دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے"
"علاوہ ازیں اور کچھ؟"
"نہیں علاوہ ازیں کچھ نہیں"
یہ کہتے ہوئے زمین دار نے اپنا ٹوپ اٹھاتے ہوئے اس کو کچھ ایسے انداز میں گھمایا جیسے وہ رخصت ہونے کے لئے اجازت طلب کر رہا ہو۔ پادری بھی کھڑا ہو گیا اور تھارڈ کے قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔
"تھارڈ ایک بات اور بھی ہے۔ خدا اسے نیک بنائے اور تمہارے لئے باعث برکت ثابت کرے"
پھر سولہ برس گزر گئے۔
تھارڈ ایک بار پھر پادری سے ملنے کے لئے اس کے دار المطالعہ میں آیا۔
"اوہ! تھارڈ تم نے اپنی صحت کو قابل رشک انداز میں برقرار رکھا ہے"
پادری نے حیران ہو کر کہا جو اتنے برسوں کے بعد بھی تھارڈ کی صحت میں کوئی رخنہ نہیں دیکھ سکا تھا۔
"ہاں۔ اس لئے کہ میں جملہ پریشانیوں سے آزاد ہوں"

پادری نے اس بات کو نظر انداز کر دیا اور اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ تاہم گھڑی بھر کے سکوت کے بعد اس نے پوچھا۔

"اچھا تو تھارڈ آج کیسے آنا ہوا؟"

"میں یوں آیا ہوں کہ کل میرے بیٹے کے عیسائی ہونے کی رسم توثیق ہے"

"ہاں۔ وہ بہت نیک بخت لڑکا ہے"

"میں پادری کو کچھ نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں تاہم یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کل سویرے گرجا میں میرے بیٹے کا نمبر کیا ہو گا؟"

"سب سے پہلے وہی ہو گا اور اول نمبر پر ہو گا"

"بہت خوب۔ یہ دس ڈالر قبول کر لیں"

"علاوہ ازیں کوئی اور کار لائقہ؟"۔ پادری نے تھارڈ کو تک کر دیکھتے ہوئے کہا

"بس۔ علاوہ ازیں اور کچھ نہیں"۔ تھارڈ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

ایک آٹھ برس اور گزر گئے

ایک دن جب پادری اپنے دارالمطالعہ میں تھا کہ اس نے باہر کچھ شوروغل سنا اور دیکھا کہ بہت سارے لوگ چلے آرہے ہیں ان کا سرخیل وہی جانا پہچانا تھارڈ ہے

"تھارڈ آج تو تم بڑے طنطنے کے ساتھ آرہے ہو۔ خیر تو ہے؟" پادری نے اس کہا۔

"ہاں خیر ہی ہے۔ عنقریب میرے بیٹے کی شادی' میرے ساتھ ایستادہ گوڈ منڈ کی بیٹی سٹوالائیڈن کے ساتھ ہو رہی ہے آپ اس مجوزہ شادی کا اعلان نشر کر دیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے وہ تو اپنے علاقے کی امیر ترین لڑکی ہے"

"وہ تو ہے اور یہ شادی بھی ہو رہی ہے"۔ تھارڈ نے اپنے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر پادری خاموش ہو گیا اور اپنے رجسٹر میں کچھ ناموں کا اندراج کیا تاہم کوئی تبصرہ نہیں کیا لوگوں نے اپنے ناموں کے نیچے اپنے دستخط کئے۔ تھارڈ نے میز پر تین ڈالر رکھے۔

"میرا حق تو صرف ایک ڈالر ہے"

"مجھے معلوم ہے لیکن چونکہ میرا بیٹا' میرا اکلوتا بیٹا ہے اس لئے میں سب کچھ بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں"

"تھارڈ' آج تم اپنے بیٹے کے لئے میرے پاس تیسری بار آئے ہو"

جی ہاں۔ بس سمجھ لیں کہ اب آخری بار ہی آیا ہوں اور بس' یہ سلسلہ اب ختم ہے"

تھارڈ نے اپنی ڈائری بند کی' الوداعی کلمات کہے اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

اس کے دو کوئی ہفتے کے بعد ایک روشن اور پرسکون دن میں دونوں باپ بیٹا شادی کے انتظامات کے سلسلے میں کیرن کے ہاں جانے کے لئے کشتی میں بیٹھے جھیل کا سفر کر رہے تھے۔

"یہ تختہ کچھ ٹھیک نہیں ہے یہ ڈھیلا کمزور اور غیر محفوظ ہے"۔

ڈھیلے اور کمزور تختے پر بیٹھے ہوئے بیٹے نے یہ بات اپنے باپ سے کہی اور اس کو ٹھیک کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور جیسے ہی اٹھا وہ بے ڈول تختہ کچھ جھول کھا کر اس کے پاؤں تلے سے سرک گیا اور اس کے سرکنے

سے اس کا توازن بگڑ گیا اس نے اپنے توازن کو ٹھیک کرنے کے لئے بازو پھیلائے لیکن توازن قائم کرنے میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی اس نے دہشت زدہ ہو کر ایک بھیانک چیخ ماری اور پھر جھیل میں گر گیا۔

یہ دیکھ کر باپ اپنی نشست سے یکبارگی اچھلا پتوار کو بیٹے کی طرف بڑھایا اور چلا کر کہا

"بیٹا اس پتوار کو پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ پکڑو"

بیٹے نے جھیل میں اپنی ڈانواں ڈول ڈوبتی ابھرتی حالت میں پتوار کو پکڑنے کی کوشش رائیگاں کی پھر بے دم ہو گیا۔

"ایک منٹ میرے بیٹے 'ایک منٹ"

باپ نے بیتابانہ وار بیٹے سے کہا اور کشتی کو تیزی کے ساتھ بیٹے کی جانب کھینے لگا' اس کارروائی سے بیٹے کی ہمت بڑھی اب اس نے دو تین بار پانی سے لڑنے کی کوشش کی اور باپ کو آخری بار اک حسرت ناتمام کے ساتھ دیکھا اور پھر ڈوب گیا۔

یہ دیکھ کر باپ تو حواس باختہ ہو گیا' جو کچھ وہ اپنی چشم بینا سے دیکھ رہا تھا اس پر وہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اس کو ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا اس کے باوجود وہ مسلسل ایک ہی دائرے میں کشتی کھیتا چلا جا رہا تھا اور اس جگہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا جہاں ابھی ابھی اس کا اکلوتا بیٹا زیر آب چلا گیا تھا۔

تھارڈ اس جگہ کو کچھ اس گمان کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ جیسے اس کا ڈوبا ہوا بیٹا ابھی آیا کہ ابھی آیا لیکن وہ نہیں آیا۔ بلبلے بنتے رہے اور پھٹتے رہے پھر اور بلبلے بنے اور پھٹے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا تا آں کہ ایک بہت بڑا بلبلہ بنا اور پھٹا پھر جھیل کی سطح ہموار ہو گئی اور حسب سابق آئینے جیسی صاف اور شفاف ہو گئی۔

اس علاقے کے لوگوں نے دیکھا کہ تھارڈ مسلسل تین دن اور تین رات ' بغیر کچھ کھائے پئے اور بغیر پلک جھپکائے اسی دائرے میں کشتی کھیتا رہا اور آخر کہیں تیسرے دن صبح کے وقت اس کو اپنے اکلوتے بیٹے کا مردہ جسم ملا۔ تھارڈ اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اپنی شاہانہ کوہستانی حویلی میں لے آیا۔

ایک برس اور گزر گیا۔

خزاں کی ایک شام تھی خاموش ' افسردہ ' دھواں دھواں سی شام۔

ایسے میں پادری اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے کچھ آوازوں سے اندازہ لگایا کہ باہر برآمدے میں کوئی ہے اور بڑی تھکی ہاری موئی ماری چال چل رہا ہے اور دروازے کی کنڈی کو کھٹکھٹانے کے لئے اس کو تلاش کر رہا ہے۔ پادری نے اٹھ کر خود ہی دروازہ کھول دیا اور یوں برآمدے میں چلنے والا آدمی اندر آ گیا۔

آنے والے ' ایک دبلا پتلا ' ناتواں اور کمزور ' سفید ریش ' خمیدہ کمر ' دکھیارا سا ' بجھا بجھا سا آدمی تھا اس کا وجود مرتعش تھا۔

وہ اندر آ کر چپ چاپ سر جھکائے ایک رونکھی حالت میں بیٹھ گیا۔ پادری اس کو دیکھ کر اپنی یادداشت کی غلام گردشوں میں کہیں کھو گیا پھر اس نے بڑی نرم آواز میں پوچھا

"کون؟"

"تھارڈ۔ تھارڈ۔ روبرائین"

" اف! خدایا! تھارڈ یہ تم ہو .... تھارڈ یہ تم ہو" ۔ پادری نے بے اختیار کہا۔

"ہاں"

"تم ایک لمبی مدت کے بعد گھر سے نکلے ہو"

"ہاں - میں بڑی مدت کے بعد ہی گھر سے نکلا ہوں"۔ تھارڈ نے بڑی خستہ آواز میں کہا۔ پھر پادری سنبھل کر بیٹھ گیا اس نے اندازہ لگایا کہ تھارڈ کچھ کہنے کے لئے آیا ہے۔ تھارڈ نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا۔

"میرے پاس کچھ رقم ہے وہ میں غربا اور مستحقین میں تقسیم کرنے کے لئے آپ کو دینے کے لئے آیا ہوں میری آرزو ہے کہ یہ صدقہ میرے بیٹے کے نام سے جاری کیا جائے"

یہ کہتے ہوئے اس نے رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔ پادری نے رقم گنی اور کہا

"تھارڈ یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے یہ تو زر کثیر ہے"

"ہاں - یہ میری جائیداد کی آدھی قیمت ہے جسے میں نے آج ہی فروخت کیا ہے"

یہ سن کر پادری چپ ہو گیا پھر اس نے بڑے انکسار کے ساتھ پوچھا۔

"تھارڈ ' اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کوئی کار خیر ' کوئی کار ثواب"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ تھارڈ زمین کو اور پادری تھارڈ کو دیکھتا رہا اور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے لئے خود کو آمادہ کیا اور بڑی ملائم اور متین آواز میں کہا۔

"تھارڈ میرا تو خیال ہے کہ تمہارا بیٹا تمہارے لئے بڑا ہی بھاگوان ثابت ہوا ہے۔ اور تمہارے لئے حقیقی نیک بختی لایا ہے

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمہاری دعا قبول ہوئی ہے"

تھارڈ نے پادری کو دیکھتے ہوئے کہا ' پھر اس کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا۔

گبریل اوکارا / زاہد نوید

چالباز

گرد سے ان کے بال اٹے ہوئے تھے۔۔۔۔ کپڑے گندے اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے۔۔۔ ان کے پاؤں بھی ان کے سر کے بالوں کی طرح گندے اور گدلے تھے۔ وہ ایک پل کے ساتھ ساتھ ادھوتا کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوری طرح بھری ہوئی ایک تھیلی کاندھے پر اٹھائی ہوئی تھی۔۔۔ یہ دو آدمی اپنے گاؤں سے بظاہر ابھی ابھی یہاں پہنچے تھے اور یہ سفر انہوں نے بس کے ذریعے کیا تھا۔ لاگوس میں اس طرح کے میلے کچیلے بیوپاریوں کا نظر آنا کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ لیکن وہ خود ہی کچھ ایسا تاثر دے رہے تھے جیسے وہ یہاں اجنبی ہیں وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے یوں چل رہے تھے جیسے جنگل میں سے گزر رہے ہوں' لوگوں کی بھیڑ میں سے وہ سب سے بچ کر نکلنا چاہتے تھے یوں کہ کوئی ان سے چھو کر نہ گزر سکے۔ وہ کاروں کے ہارن سن کر بار بار چونک اٹھتے۔۔۔۔ کاروں' موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں کی لمبی لمبی قطاریں اس دیو ہیکل پل کے دونوں اطراف دندناتی ہوئی جا رہی تھیں اور وہ ان کے درمیان چلتے ہوئے ہانپ رہے تھے۔

پل کے دوسرے کنارے یعنی ادھوتا سے ایک شخص نئی نویلی سائیکل پر بڑے مزے سے چلا آرہا تھا۔ اس کی قمیض اور ٹراؤزر میں بلا کی سفیدی تھی۔ اس کے بلیک این وائٹ جوتوں پر بھی گرد کا ذرہ تک نہ تھا۔ اسکا سر سفید ہلمٹ میں محفوظ تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس نے سائیکل کو بریک لگائی۔ بار بار رک رک کر اس نے اردگرد کے لوگوں کو گزرنے کا موقع دیا لیکن اس کی نظریں برابر ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔۔۔

ایک پرانی سی کار قریب سے گزری۔۔۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک اور کار بھی نزدیک ہی پہنچ گئی تھی۔ لیکن وہ موت کو چھو کر سڑک عبور کر گیا۔۔۔ دوسری جانب پہنچ کر وہ ان دونوں کے قریب پہنچا۔

"ہیلو۔۔۔" مسکرا کر اس نے کہا۔ وہ دونوں گھبرا گئے' اور زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ لیکن سائیکل سوار ان کے سامنے آکر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

"میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔۔۔ شائد انیوگو میں۔۔۔۔ میرا ایک دوست ہے وہاں اور تمہاری شکل اس سے ملتی ہے۔" تھیلی والا آدمی پل کے جنگلے کی طرف مڑ گیا اور دوسرا سائیکل سوار کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں ہم انیوگو سے آئے ہیں۔"

"اچھا...." سائیکل سوار بولا۔ "کافی عرصہ تک میں انیوگو میں رہا ہوں۔۔۔" اس نے کہا۔

"کون ہو میرا اچھا دوست تھا' اور تم اس سے ملتے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہاری صورت۔"

"آہ... وہ..... ہم بڑے اچھے دوست تھے۔"

"خیر تم بڑے خوش قسمت ہو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔"

"اکون کو وو"

"اور تمہارا دوست۔۔۔"

"اوکی کی۔۔"

"اچھا آؤ میرے ساتھ چلو۔ ظاہر ہے تمہیں ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ چاہیے ہو گی۔" سائیکل سوار نے کہا، مگر انہیں اس دعوت کو قبول کرنے میں تامل تھا۔

"جس شخص سے تم ملنے آئے ہو، میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے لیکن ہم سب مل کر ڈھونڈ لیں گے۔ وہ بھی میرا دوست ہے اور اگر اسے یہ معلوم ہوا کہ میں نے تمہیں اپنے گھر نہیں ٹھہرایا تو وہ مجھ سے ناراض ہو گا۔" سائیکل سوار کی اس مہمانی کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم کہتے ہو، ہمارا میزبان تمہارا دوست ہے لیکن مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ تمہارا خوف بجا ہے، لیکن یہ درست ہے کہ تمہارا میزبان اور میں اچھے دوست ہیں۔ بالکل اس نے تو مجھے رقعہ بھیجا تھا تمہارے بارے میں کہ تم آ رہے ہو۔ مجھے افسوس ہے یہ بات مجھے تمہیں بہت پہلے بتا دینی چاہیے تھی۔۔۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔"

"اچھا میں اوکی کی سے بات کر لوں۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ اوکی سے مخاطب ہوا۔ اس نے بڑی سختی سے سر ہلایا اور بلند لہجے میں بولا یہ سب ہماری دولت ہتھیانے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔" لیکن کافی ترغیب و تکرار کے بعد وہ بھی راضی ہو گیا اور دونوں سائیکل سوار کے ساتھ چل پڑے۔

شام ہو رہی تھی۔ اکون کودو اور اوکی کی ' اپنے تھیلے کے ساتھ اپنے میزبان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ میزبان گھر سے باہر تھا اچانک ہی وہ چند اور لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نوواردوں نے انتہائی بھڑکیلے ملبوسات پہن رکھے تھے۔

"یہ میرے دوست ہیں۔۔۔" میزبان بولا۔ "یہ تم سے ملنے آئے ہیں میں نے تمہارے بارے میں ان کو بتایا ہے۔ یہ بہت بڑے لوگ ہیں۔" جب نووارد ان دونوں سے ہاتھ ملانے لگے تو دونوں خوفزدہ سے ہو گئے۔۔۔۔ ملاقات و تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے نوواردوں میں سے ایک کو آنکھ کے اشارے سے دوسرے کمرے میں بلایا اور سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"بڑی موٹی مچھلی ہے۔ مگر شکار بھی اتنا آسان نہیں۔ کافی داؤ پیچ لگانے پڑیں گے اور پلے سے بھی کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔"

"سنو ہم ایک چال چلتے ہیں۔۔۔۔ ہم انہیں سو پونڈ جیتنے کا لالچ دیتے ہیں۔ دیکھو نا بھئی بڑی مچھلی پکڑنے کے لئے جال بھی تو بڑا ہونا چاہیے۔ بس کل تک انتظار کرو۔۔۔۔ کل ہم سب امیر ہو جائیں گے۔ ان کے پاس بڑی دولت ہے۔۔۔۔" پھر اس نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوق کھولا اور اس میں سے تاش کے تین پتے نکالے۔

"یہ رہے پتے" اس کے ساتھی نے پتے لے کر جیب میں رکھ لئے۔ پھر یہ دونوں واپس بیٹھک میں آ گئے۔ سب سے پہلے سب نے مل کر پرانی شراب کے جام چڑھائے اور اپنی دولت کی شیخی بگھارنے لگے، ساتھ ہی تاش کے پتے منگوائے گئے۔ انہوں نے اکون کودو اور اکی کی کو بھی کھیلنے کی دعوت دی لیکن یہ کہہ کر کہ ہمیں تاش کھیلنی نہیں آتی انہوں نے کھیلنے سے انکار کر دیا۔

"بہت آسان ہے" ایک نے کہا۔ "دیکھو جب میں پتے پھینکوں ۔۔۔۔ تم ایک پتہ کھینچ لینا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ترپ کا پتہ اسے دکھایا "اگر تم نے یہ پتہ نکال لیا تو تم جیت گئے۔ کتنا آسان ہے جیتنا۔ ہے نا"

سانپ نے سر اٹھایا اور اتنی جلد رقم بٹورنے کے خیال سے وہ دونوں مغلوب ہو گئے۔
"اچھا اب ایک ایک پونڈ کی شرط لگاتے ہیں۔ اپنی رقم دکھاؤ۔ اگر تم نے یہ نکالا تو جیتے یہ نکالا تو ہارے۔۔۔" تھوڑا سوچ کر اکون کودو نے پتہ کھینچا۔ یہ ترپ کا پتہ تھا اور وہ جیت گیا۔ یوں جلد ہی وہ ایک سو پونڈ جیت گئے۔
میزبان بولا "میں نے بولا تھا نا تم دونوں بہت خوش قسمت لوگ ہو۔" محفل ختم ہوئی اور اب مہمانوں کو ان کی آرام گاہ دکھائی گئی۔۔۔ جب اس نے سوچا کہ مہمان سو چکے ہوں گے تو میزبان نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔۔۔ اس نے دیکھا کہ تھیلی زنجیر کے ساتھ کرسی سے بندھی ہوئی ہے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ مگر تھیلی کے نظارے نے اسے بے چین کر دیا تھا وہ پھر واپس آیا۔ "کوئی بات نہیں کل یہ ساری دولت اسی کے پاس ہو گی۔۔۔۔" وہ مطمئن سا ہو گیا۔
مہمان خراٹے بھر رہے تھے۔ تھیلی میں ساڑھے سات سو پونڈ تھے۔ جن کا تصور ہی اسے بدمست کئے دے رہا تھا۔ صبح جب وہ اپنے مہمانوں کو جگانے کے لئے ان کے کمرے میں گیا تو خالی کمرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔
"اپ لمنڈ" ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں اکون کودو اور اکی کی خوش بیٹھے تھے۔ "مفت خوراک' مفت رہائش اور سو پونڈ کا تحفہ' ویسے جب وہ بار بار ہمارے کمرے میں جھانک رہا تھا تو اسی وقت ہی مجھے شک ہو گیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔"
"بڑے سادہ لوح تھے وہ سارے کے سارے۔ یعنی دروازہ بھی کھلا چھوڑ گئے تھے۔"
اس کے بعد ان میں سے ایک نے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کھول کر تھیلی کا منہ کھول دیا اور تھیلی میں بھرے ہوئے وہ سارے پتھر پھینک دیئے جنھوں نے ان دونوں کو سو پاؤنڈ کا مالک بنا دیا تھا۔

شیل اسکلسن / سعید انجم

تصادم

تھوڑی دیر تک وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے دیکھتا رہا۔ فٹ پاتھ خالی تھا۔ اتوار کے دن دوپہر کے فوراً بعد کا وقت تھا۔ اسے اپنا اندر بھی خالی سا لگا جیسے فٹ پاتھ کا خالی پن اس کے اندر چلا آیا ہو۔ کمرے کے اندرونی طرف کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی نے کچھ پوچھا تو وہ چپ ہی رہا حالانکہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک مکمل طور پر خالی فٹ پاتھ تھا۔ بغیر اس کی طرف دیکھے وہ کمرے سے باہر چل دیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔ انطون انطون تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ داخلے کے ہال میں سے گزرتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر گیا۔ اڑتالیس تھکن بھرے قدموں کے باوجود اس فضول اتوار میں باہر نکل آیا اس نے سوچا۔ سورج کی تیز روشنی میں اسے گرمی کا احساس ہوا۔ سڑک پار کر کے وہ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر سائے میں چلا گیا۔ وہاں رک کر اس نے اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا وہ اسے نظر نہیں آئی چار منزلہ عمارت کے سائے میں وہ چل پڑا۔ چند سو میٹر کے بعد وہ چوک کے پاس ایک سفید کار کے گزر جانے کے انتظار میں رک گیا۔ مخالف سمت سے ایک سلیٹی رنگ کی کار آ گئی۔ اس کے علاوہ وہاں پر کوئی دوسرا ٹریفک نہیں تھا۔ دونوں کاریں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اس کی وجہ اتوار کا دن ہو گا اور یہ شدید گرمی۔ اس نے سوچا۔ دونوں کاریں جب چوک میں پہنچیں تو وہ ٹکرا گئیں۔ سلیٹی رنگ کی کار دائیں طرف کو مڑ گئی اور سفید کار بائیں طرف۔ سفید کار دوسری کار کے الٹے ہاتھ والے پچھلے دروازے سے جا کر ٹکرائی تھی۔ اس مضحکہ خیز منظر میں سلیٹی رنگ کی کار کے ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے جو منہ میں آیا وہ کہنا شروع کیا۔

"لعنت ہے تم پر۔ جہنمی آدمی۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟"

"میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔"

"مجھے نہیں دیکھا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مجھے ..... مجھے تم کیسے نہیں دیکھ سکے۔؟"

"معلوم نہیں۔ میں نے بس آپ کو نوٹس نہیں کیا۔ کیا آپ دروازہ نہیں کھول سکتے۔"

"نہیں! ..... تمہاری میں ..... یہ مڑ چکا ہے۔"

"دوسرا دروازہ ٹرائی کریں۔"

"او خدایا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں احمق ہوں۔ تمہارے خیال میں یہاں پر دو احمق اکٹھے ہو گئے ہیں؟"

"میں کہہ رہا ہوں جناب کہ آپ کو میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے تو بریک تک نہیں لگائے۔ آئیں اور خود دیکھ لیں۔ بریکوں کے نشان تک نہیں ہیں صاف ظاہر ہے کہ غلطی میری ہے۔ لیکن میں کچھ کر نہیں سکا۔"

"کچھ کر نہیں سکا، کچھ کر نہیں سکا۔ لعنت۔ کچھ کر بھی سکتے ہو؟"

پھلانگتے ہوئے وہ بغلی سیٹ پر پہنچا' پھر کار سے باہر آگیا گھوم کر اس نے کار کے نقصانات کا جائزہ لیا۔ دانت بھینچتے ہوئے اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ دوسری گاڑی کا ڈرائیور اس کے پاس آگیا۔ مزید انہوں نے کیا کہا' یہ انطون کو پتہ نہیں چلا جس راستے سے وہ آیا تھا۔ اسی پر وہ واپس چل دیا۔ اسے پسینہ آگیا تھا۔ اسے اپنا چہرہ گرد آلود محسوس ہوا۔ اس کا نہانے کو جی چاہا۔ اسے اپنی بیوی کھڑکی میں آگے جھکی دکھائی دی اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے دیکھا نہ ہو۔ اس کا کیا قصور؟ اس نے سوچا اب کہیں پکارنے نہ لگ جائے۔ اپنی نظریں اس نے فٹ پاتھ پر جما دیں۔ وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔ بس میرے نہانے سے پہلے کچھ بولے نہیں۔ اس نے سڑک پار کی اور دوسری طرف آگیا۔ پہلے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور پھر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ داخلے کے ہال میں کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے انطون؟"

"کوئی بات نہیں"

"کچھ تو ہے انطون۔ میں نے بات کی تم نے جواب نہیں دیا۔ الٹا تم اٹھ کر باہر چلے گئے بتاؤ کیا ہے؟ پلیز!"

"کچھ بھی نہیں۔ میں ذرا نہالوں۔"

"بھلے آدمی بنو انطون۔ تم مجھ سے اس طرح لاپرواہ ہو جاتے ہو کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں۔"

"تم کچھ بھی مت سمجھو۔ میں چل کے نہاتا ہوں۔"

وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے کپڑے اتارے کہنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ اس نے سوچا وہ نہیں سمجھے گی۔ اس میں اتنی سمجھ کہاں۔ اس نے پانی کھولا۔ ٹونٹیوں کو اس طرح گھمایا پھرایا کہ ٹھنڈا یخ پانی آنے لگا وہ دھار کے نیچے اس طرح جم گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن میں کچھ دیر اور غسل کر لینے کے علاوہ کوئی خیال نہیں آیا۔ پھر اس نے زیادہ دیر تک ایسے نہیں کیا پانی بند کیا اور کموڈ کے ڈھکن پر بیٹھ گیا۔ شاید سب قصور اتوار کے دن کا ہے۔ اس نے سوچا۔ کئی منٹ تک وہ سکون کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر بالوں کو خشک کرنے کے بعد اس نے کپڑے پہن لئے۔ کافی بنا کر وہ بالوں یں کنگھی لگائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اداسی سے مسکرائی اس نے ہمت سمیٹی۔

"مزہ آگیا۔" کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔

وہ کافی انڈیلتے ہوئے بولی "کیا مجھ سے جی بھر چکا ہے؟"

"ویرا۔ تم ہر بات کو اپنی طرف لے جاتی ہو۔ اس کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیا تم کسی اور کے ساتھ....."

"نہیں اگر ایسا ہوتا تو بات کا تعلق تمہارے ساتھ بھی ہوتا۔"

"تعلق میرے ساتھ تو ہے۔ تم نے میری بات کا دو دفعہ جواب نہیں دیا اور یہ میں تھی جس کے پاس سے تم اٹھ کر چلے گئے۔ بغیر کچھ کہے۔"

"اس بات کا تعلق صرف میرے ساتھ ہے۔ میں اور یہ لعنتی اتوار۔"

"لعن طعن نہ کرو پلیز۔"

"تم تو جانتی ہو کہ اتوار کے دن مجھے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو ایک دن ہے جو صرف ہمارے لئے ہوتا ہے۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ ہاں اس کی طرف دیکھا ضرور وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" وہ بولی۔

"کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ کافی کے لئے شکریہ۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"تم نے تو یہ پی ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

"پی ہے۔" وہ بولا

"انطون بچے نہ بنو۔ تم نے نہیں پی۔"

"پی ہے۔ میں نے پی لی ہے۔"

دھرپ چندر گوتم / طاہرہ نیر

وہ کہاں کا تھا؟

وہ آدمی مر گیا تھا۔ اس کی موت کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ لوگوں کو بھوک سے مرتے تو سنا گیا ہے۔ مگر اس کی موت پیٹ بھر کر کھانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اس لئے شہر کے کافی لوگ اس کی لاش کے اردگرد جمع تھے' تاہم کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس کا انتقال کھانے کی وجہ سے ہوا ہے۔

حقیقتاً" وہ ایک عام سا شخص تھا۔ یہ شہر بھی اس کا اپنا شہر نہ تھا اس کا کوئی بھی شہر' اس ملک میں تو کیا' اس وسیع کائنات میں بھی کہیں نہ تھا۔ وہ گاؤں کا آدمی تھا۔ ایک سادہ سا دیہاتی۔ اس شہر میں وہ صرف کام ملنے کی امید میں آیا تھا۔ اس نے بہت سال پہلے میٹرک پاس کیا تھا۔ اس لئے گاؤں کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اور وہ خود اپنی قابلیت پر بھروسہ کر کے شہر آیا تھا۔ اس کے پاس تھوڑا سا نقد اور ایک پرانا کمرہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے پاس کا نقد ختم ہونے سے پہلے ہی اسے کوئی کام ضرور مل جائے گا۔

اور اس کے یقین کے مطابق نقد تو سچ مچ ہی ختم ہوتا نظر آیا مگر کام؟ وہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ صرف پیسے کمانے کی چاہ تھی۔ مگر صرف چاہنے سے ہی نوکری نہیں مل جاتی۔ لہٰذا اس کو بھی نوکری نہیں مل سکی۔

دراصل اس کے کام ڈھونڈنے یا نوکری مانگنے کا طریقہ بھی کچھ دلچسپ سا ہی ہوتا ہو گا۔ جب ہی تو کچھ افسروں کو اس کی صورت میں دل بہلانے کا اچھا خاصہ ذریعہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ کسی بھی افسر کی ٹیبل کے آگے جا کھڑا ہوتا اور ہاتھ جوڑ کے کہتا۔ "حضور مجھے کام کی ضرورت ہے۔ میں میٹرک پاس ہوں۔"

لوگ ہنستے نہ تو کیا کرتے۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ شہر اس معاملے میں بہت آگے بڑھ چکا ہے اور پھر نوکری کے بارے میں تو خاص طور پر اصول و قواعد کا بہت ہی پابند ہے۔

کبھی کوئی افسر اچھے موڈ میں ہوتا اور دفتری کاموں سے بھی اسے کچھ فرصت ہوتی تو وہ تمسخرانہ انداز میں پوچھتا۔

"کتنا پڑھا ہے؟"

"میٹرک"

"میٹرک پاس یا فیل"؟

"پاس' سیکنڈ ڈویژن میں!"

"شادی کی ہے یا نہیں؟"

"نہیں حضور!"

"کیوں؟"

"نوکری نہ ملنے کی وجہ سے۔"
وہ سوچتا تھا کہ ایسے عقلمندانہ اور حقیقت پسندانہ جواب دینے سے اس کی قابلیت کا اظہار بھی ہو گا اور نوکری بھی مل جائے گی۔ لیکن افسر اگر کچھ زیادہ ہی موڈ میں ہوتا تو آگے پوچھتا۔
"عشق کیا ہے کیا؟"
"نہیں حضور!" وہ کہتا۔
"گھر میں کون کون لوگ ہیں"؟
"ماں باپ، بہنیں....." وہ تھوڑا ہچکچاتا۔
"بہن کتنے سال کی ہے؟"
"سب سے چھوٹی سات سال کی...."
"تم مذاق کر رہے ہو! یہاں سات سال کی بہن کو پوچھنے کون آیا ہے۔ بڑی بہن کی عمر بتاؤ!"
"اٹھارہ سال۔ حضور!" وہ سادگی سے جواب دیتا۔
"ایسا کرو! اگر نوکری کی ضرورت ہے تو بہن کو بھی ساتھ لے کر آؤ۔ اس کو اور تمہیں دونوں کو کام دے دوں گا۔ ٹھیک ہے!" افسر کہتا تھا۔
اس کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ آیا یہ باتیں سنجیدگی سے بھی کہی گئی ہیں؟؟ اس کے ذہن میں بڑا سا سوالیہ نشان ابھرتا۔ ورنہ بہن کو لے آنے میں کون سی مشکل ہے۔ پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لئے وہ کہتا تھا۔ "مگر حضور بہن تو میٹرک پاس نہیں ہے؟"
"اٹھارہ سال کی تو ہے نا! تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا بھی آتا ہی ہو گا۔ یہاں بیٹھ کر، کچھ ٹائپ وائپ بھی سیکھ لے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" افسر جواب دیتا۔
وہ عجیب سے شش و پنج میں واپس لوٹتا نیز گفتگو کے دوران افسر اور اس کے آس پاس کے لوگوں کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ کی جو لہر ابھرتی تھی وہ اسے اور بھی پریشان کر دیتی تھی۔
دوسری جانب نوبت یہ آچکی تھی کہ اب دن میں ایک وقت کا کھانا بھی مشکل ہی سے مل پاتا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک دو دن میں یہ ایک وقت کا کھانا بھی اس طرح غائب ہونے والا تھا کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر اشتہار دینے کے بعد بھی ملنے والا نہیں تھا...... اور ہوا بھی یہی۔ دو تین دن ہو گئے تھے اسے کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں مل سکا تھا۔ بیچ میں کچھ بھنے ہوئے چنے وغیرہ کھا کر اور پانی پی کر کام چلایا تھا۔ ادھر پانی پینے کا کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ اتنا کہ ایک دن پانی پیتے وقت جس طرح پیا تھا، اسی طرح سارے کا سارا منہ کے راستے سے باہر نکل آیا تھا۔
اب تو اس کے پاس کام مانگنے کے لئے کسی جگہ جانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ بس بے مقصد ہی ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس کو وہ شہر، شہر نہیں بلکہ سازش اور موت کا اکھاڑہ لگ رہا تھا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کس طرح اب اس شہر سے پیچھا چھڑائے؟ لیکن چھٹکارا پانا بھی تو اب ایک طرح سے ناممکن سا ہوتا جا رہا تھا۔ کیا شہر میں وہ صرف مر سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا؟۔ اس نے بے حد مایوس ہو کر سوچا تھا۔
بھوک سے نڈھال لڑکھڑاتے قدموں سے بے مقصد گھومتے پھرتے وہ شہر کے اہم مرکزی علاقہ تک آپہنچا تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے خیال سے وہ ایک پیڑ کے نیچے بنے چبوترے پر چڑھ گیا اور وہاں بیٹھ کر اپنی تھکن

اتارنے لگا۔ پاس ہی بیٹھے کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جو شاید اسمگلروں کے بارے میں تھیں۔
"خود پکڑے گئے تو کیا ہوا! اس سے بچوں کی زندگی تو بن گئی!" ایک نے کہا۔
"ہاں بھئی! یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے!" دوسرے نے لمبی آہ بھر کر کہا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ ان لوگوں کی باتیں، ہنسی، ٹریفک کا شور، یہ سب آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا تو رہی تھیں، مگر دماغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہوا میں کہیں بکھر جاتی تھیں۔
اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور چہرے پر غصہ طاری کرتے ہوئے غضبناک آواز میں بولنا شروع کر دیا۔
"بھائیو اور بہنو! میں گورکھا ضلع کا ہوں۔ ہمارے ضلع میں سیلاب نے کتنے گاؤں اجاڑ دیئے ہیں۔ کتنے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں کچھ دن پہلے تک میرا گھر بار تھا، سب کچھ تھا مگر آج کچھ بھی نہیں ہے۔ حکومت، ریڈیو کے ذریعہ برابر امدادی کاموں کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔ لیکن بھائیو! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے امداد کے نام پر آج تک کسی کو ایک تنکا بھی نہیں دیا ہے۔ اس ناکارہ حکومت کو یا تو فوراً" مستعفی ہو جانا چاہیے یا پھر ہمارے سیلاب زدہ ضلع کو فوری حسب ضرورت وافر امدادی سامان بہم پہنچانا چاہیے۔ بھائیو! مطلوبہ امدادی سامان متاثرہ ضلع تک پہنچنے یا اس بارے میں حکومت کی مناسب یقین دہانی ملنے تک میں آج اور اسی وقت سے، اسی جگہ تادم مرگ بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ رہا ہوں۔"
دیکھتے ہی دیکھتے ماحول میں ایسی زبردست تبدیلی آنے لگی، جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہو۔ کچھ دیر پہلے تک دنیا بھر کا ٹھکرایا ہوا وہ شخص، جسے کسی نے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی، یکایک ایک اہم شخصیت دکھائی دینے لگا۔ وہ تو جس طرح مشکل سے پہلے کھڑا ہوا تھا اسی طرح جیسے تیسے کر کے بیٹھ گیا۔ مگر اس کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی اور رواج کے مطابق کچھ دیر بعد ہی پولیس والے بھی پہنچ گئے۔
دن بھر اس کے اردگرد میلا سا لگا رہا۔ پھر جیسے جیسے شام ہوتی گئی۔ میلا بھی کم ہونے لگا۔ اور رات ہوتے ہوتے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی ہمت دیکھنے کے لئے کوئی بھی نہ رہا۔ یہاں تک کہ اس کی دیکھ بھال پر مامور پولیس والوں کو بھی نیند کے جھونکے آنے لگے۔ لیکن بھوک کی وجہ سے اس کی نیند بار بار ٹوٹ جاتی تھی۔
تقریباً" آدھی رات کے بعد وہاں ایک گاڑی آکر رکی جس سے کچھ لوگ اتر کر اس کے قریب آئے۔ وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ نوواردوں میں سے کسی ایک نے اس سے کہا۔
"آپ اس طرح بھوک ہڑتال نہ کریں۔ ہم آپ کے ضلع میں کل ہی نقد اور جنس بھجوانے والے ہیں۔"
وہ بہت خوش ہوا پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟ حقیقتاً" بھیج رہے ہیں؟"
"آپ بے فکر رہیں۔" جواب ملا۔
"اگر ایسا ہے تو میں یہ بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے اطمینان بخش لہجہ میں کہا وہاں آئے ہوئے لوگ بھی خوش ہو گئے۔ انہیں بھوک ہڑتال کروانے کے لئے کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔ بس ایک زبانی یقین دہانی سے ہی کام چل گیا۔
"آپ اپنا فاقہ اورینج جوس سے توڑیں گے یا لائم واٹر سے؟" پوچھا گیا۔
"دیکھیں سر! میں غریب کا بیٹا ہوں۔ جب فاقہ توڑنا ہی ہے تو ان چیزوں سے نہیں۔ بھر پیٹ بھات (چاول)

کھا کر ہی توڑوں گا۔" اس نے جواب دیا۔
وہ لوگ اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔ فوراً ہی انتظام کیا گیا اور اس کے لئے بہت کچھ آنا شروع ہو گیا۔ پلاؤ' چکن روسٹ' سبزیاں.... سب کچھ اس کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ اس نے مزے لے لے کر کھایا۔ پیٹ بھر کر کھایا' پھر تشکر آمیز انداز میں کہا۔ "مجھے کچھ نقد کی بھی ضرورت تھی!"
اس کا بھی فوراً انتظام ہو گیا۔ اس نے گن کر دیکھا' بہت کچھ خرچ کرنے کے باوجود گھر پہنچتے پہنچتے جو کچھ باقی بچ جاتا' وہ بھی اس رقم سے تین گناہ زیادہ تھا جو وہ شروع میں گھر سے لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب لوگ بھی ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ پولیس والے بھی لوٹ گئے۔ کیونکہ ان کی ڈیوٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بھی خوش تھا' ہنس رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کل سے وہ پھر ایک عام نیپالی شہری کی طرح زندگی بسر کرے گا۔
اس نے سوچا' آج کی رات یہیں کاٹ لوں' صبح دیکھا جائے گا' اور وہیں چبوترے پر لیٹ گیا۔ دوسرے دن سب نے دیکھا' وہ نہیں جاگا۔ وہ مر چکا تھا لوگ مختلف انداز میں رائے زنی کر رہے تھے۔
"سانپ نے تو نہیں کاٹ لیا؟".... "مگر کھٹمنڈو کے سانپوں میں تو زہر ہی نہیں ہوتا۔"
"کیا کھانے پینے کی چیزوں میں زہر تھا؟"..... "مگر یہ تو بھوک ہڑتال پر بیٹھا تھا!"
اسی وقت بھیڑ میں سے ایک آواز آئی۔ "یہ گورکھا ضلع کا نہیں ہے۔"
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" کسی نے سوال کیا۔
"کیونکہ میں خود گورکھا ضلع کا ہوں۔"
"اگر ایسا ہے تو آپ بھی بھوک ہڑتال کریں۔" مذاق اڑانے والے انداز میں کسی نے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔ مگر وہ جو مر گیا تھا' اب جی نہیں سکتا تھا۔
تاہم ایک بات تو یقینی ہے کہ وہ کھا کر ہی مرا تھا۔ شہر نے اسے بھوکا اور مفلس بنا کر نہیں مارا تھا۔ بھر پیٹ کھانا کھلا کر اور کچھ نقد بھی دے کر ہی اس کی زندگی لی تھی۔
بعد میں لاش کو اٹھا کر ٹھکانے لگایا گیا۔
لیکن دو باتیں تب بھی نہیں کھلیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاس جو نقد تھا' وہ کس کے پاس گیا؟ اور دوسری یہ بات کہ اگر وہ گورکھا ضلع کا نہیں تھا' تو پھر کہاں کا تھا؟؟؟

پہان دو / محمود احمد قاضی

پھول اور انسان

اس لیے بھی اور جب کبھی بھی میں گملوں میں اگے پھولوں کو دیکھتا ہوں یا جب پھولوں کے آرٹ سے لطف اندوز ہونے کی بات ہوتی ہے تو مجھے اس بوڑھے شریف آدمی سکالر نگوین کا خیال ضرور آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے میں اس وقت صحیح معنوں میں آشنا ہوا تھا' جب میں نے ذہنی پختگی حاصل کر لی تھی اور میں چیزوں کو زیادہ گہرائی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا اور اب اس وقت میں پھولوں کے ساتھ دوستی کے معاملے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔

البتہ آج کل مجھے اس بوڑھے سکالر جیسا اہم آدمی نظر نہیں آتا جو ہمارے گھر میں میرے والد کا اکثر مہمان بنتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی ہمارے گھر میں آتا تھا۔

مگر ایک چیز مجھے بہت متاثر کرتی تھی کہ میرے گھر والے اس بوڑھے سکالر کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے تھے۔ حالانکہ دعوت عموماً" بہت سادہ سی ہوتی تھی اور دوسرے آنے والے اعلیٰ پائے کے مہمانوں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اس سادگی میں بھی ایک خاص اہتمام پنہاں ہوتا تھا جس کے ذریعے بڑے اور منفرد لوگوں کے لئے ایک گہری عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔

جب بھی یہ بوڑھا سکالر ہمارے گھر آتا تھا تو میرے والد خود اس کے لئے چائے بناتے تھے' اس کے لئے خود شطرنج کے مہرے سجاتے تھے اور اس کے لئے دوسری ضروری چیزوں اور ضرورتوں کا خود خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے موقع کے لئے میرے والد خاص خوشبو والی چائے کی پتی بچا کر رکھتے تھے۔ تب وہ دونوں بزرگ اکٹھے بیٹھ کر شطرنج کھیلتے تھے' رائس برانڈی سے شغل کرتے تھے' ایک دوسرے کو شاعری سناتے تھے اور اردگرد پھیلی صندل کی خوشبو میں گھرے وہ حالات حاضرہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ شطرنج کی بازیاں بعض اوقات بہت طول پکڑ جاتیں اور سارا سارا دن تک چلتیں بہر حال دونوں کھلاڑیوں کے درمیان کوئی بھی فتح مند نہیں ہوتا تھا بازی برابر ہی رہتی تھی۔

میرے والد دو تین ماہ بعد ہی اپنے دوست کے گھر جاتے تھے۔ جب بھی میرے والد کے پاس اچھی چائے کی پتی موجود ہوتی یا کوئی اور اعلیٰ پائے کی چیز ہوتی تو وہ مجھے اور میرے بھائی کو یہ چیزیں اپنے دوست کو دینے کے لئے اس کے گھر بھیجتے تھے۔ کبھی بھی ایسی چیزیں میرے والد نے نوکر کے ہاتھ نہیں بھیجیں۔

اس طرح مجھے کئی بار اس بوڑھے سکالر کے گھر جانے کا موقع ملا۔ انہی مواقع کی نسبت سے میں نے بے انتہا غربت کے فلسفے اور اس بوڑھے شخص کی ذاتی نیک زندگی کے بارے میں غور و فکر کرنا سیکھا تھا۔

اس کا گھر غریبوں کی بستی میں ایک چھوٹے سے باغ کے درمیان بنایا گیا تھا اور یہ گھاس پھوس کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس باغ کے ساتھ ساتھ اس گھر نے میری روح میں بڑی خوبصورت اور شاعرانہ یادیں اتار دی تھیں۔

بوڑھے سکالر کا باغ ایک پھول باغ لگا۔ جب میں دروازے سے اندر داخل ہوتا تھا تو میں محسوس کرتا تھا جیسے میں کسی درختوں سے بھرے جوبن پر آئے ہوئے جنگل میں حیران کھڑا ہوں۔ سارا باغ سورج کی روشنی میں جھلمل کرتی پھولوں کی رنگا رنگ پتیوں سے دمک رہا ہوتا تھا۔ یہ باہر کی پر شور دنیا سے بہت مختلف ایک پر سکون جگہ تھی۔

میں بوڑھے سکالر سے اس کے گھر سے زیادہ اس کے باغ میں اس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ اس بوڑھے شخص کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ اس کا ماتھا بہت خوبصورت تھا اور چاندی کے فریم والے اس کے چشمے کے پیچھے اس کی مہربان آنکھیں ہوتی تھیں وہ تقریباً" ہر موسم میں اپنے دبلے پتلے لمبے جسم کو براؤن رنگ کے کپڑوں میں لپٹائے رکھتا تھا۔ وہ باغ کے درمیان کھڑا اپنی پوتی کے ساتھ مجھے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملتا تھا۔۔۔ میں اس بوڑھے شخص کی مسحور کن شخصیت کو شاید کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔

میرے لئے اب بھی اس کی شخصیت کا پرتو ایک پاکیزہ' نیک اور مشاہدۂ نفس کرنے والی زندگی کی علامت تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر اس وقت ابھرتا تھا جب انسانی خواہشات کی بے لگام لہریں ایک بامقصد زندگی کے یقین کو میرے اندر سے بہالے جانے پر تل جاتی تھیں۔

وہ بوڑھا سکالر اس پرامن جگہ پر اپنے نوکر اور پوتی کے ساتھ رہتا تھا۔ بلکہ اصل میں تو وہ اپنے پھولوں کے ہمراہ رہتا تھا۔ اسے پھولوں کو اگانے' ان کی دیکھ بھال کرنے اور ان کی نشوونما کے سلسلے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنے میں بے پناہ خوشی حاصل ہوتی تھی اور اس طرح وہ دوسری مصروفیتوں میں الجھنے سے بچا رہتا تھا۔

پہلے پہل میں نے اس مسرت بھری دنیا کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھا تھا۔ کیونکہ پھولوں کو بڑے بڑے مٹی کے گملوں میں اگانا اس مقدس شہر کی ایک عام روایت تھی۔ اس وقت صرف سولہ سال کی عمر میں میں نے اس خوشی اور مسرت کو محض ایک طرح کی پیچیدگی اور بوریت کے حوالے سے دیکھا تھا۔ مزید یہ کہ اس شریف بوڑھے آدمی کا روایتی انداز میرے لئے کوئی غیر معمولی چیز نہ تھا۔ اور اس طرح آغاز میں میرا اس کے گھر جانا رسمی سا تھا اور مجھے اس میں کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ میں نے اس شخص کو ایک نوجوان روح کا مالک پایا۔ وہ نہایت سادہ اور خوش باش دل رکھتا تھا۔ جوں جوں میں اس کے گھر جاتا رہا' میرے دل میں اس کے لئے محبت اور عزت بڑھتی ہی رہی' اور یوں میرے اندر چھپے پرانے خدشات ہوا ہو گئے۔ بوڑھا سکالر مجھے اپنی پوتی بوئی لان کی طرح اپنے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتا تھا۔

اس کا پھول باغ مجھے دوسری چیزوں سے زیادہ اپنی طرف کھینچتا تھا۔ باغ میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے' پھولوں کو پانی دینے میں اس کی مدد کرتے ہوئے' پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوئے اور ادھر ادھر کے کئی دوسرے کام کرتے ہوئے مجھے ایک سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ ایسے کام سرانجام دیتے ہوئے بوڑھا سکالر مجھے اور بوئی لان کو بہت سمجھدار لوگ سمجھتے ہوئے گپ شپ کرتا تھا۔ وہ پھولوں اور ان کی مختلف قسموں اور ان کے مخصوص امتیازی اوصاف کے متعلق باتیں کرتا تھا اور ان کے متعلق بڑے خوش کن ریمارکس دیتا تھا۔ ان پھولوں کی چھاؤں میں کی جانے والی ان باتوں کے ذریعے جن کو میں اس وقت پوری طرح سمجھ بھی نہیں پاتا تھا' میں نے یہ جانا تھا کہ بوڑھے کو پھول اگانے میں جو خوشی حاصل ہوتی تھی' اس کی نوعیت بہت غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہ خود غرضانہ خوشی بالکل نہ تھی ۔۔۔۔ اس کے باغ کے نہایت قیمتی پھولوں کے چند گملوں کی قسمت سے وابستہ ایک حادثے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ ان دنوں میں بوڑھے سکالر کا ماضی اس کے لئے ایک مذہب کا درجہ رکھتا

تھا۔۔۔ پھولوں کے مذہب کا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب میں گل داؤدی کے پودے ایک دوسری جگہ پر منتقل کر رہا تھا تو بوڑھے سکالر نے مجھے بتایا تھا:

"ہاں مجھے اب ان کی جگہ بدل دینی چاہیے نہیں تو ان کی زندگی پرانی غاروں والی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی"

"جناب۔۔۔ غاروں والی زندگی میں تبدیل ہونے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

پھولوں کی دیکھ بھال کرنے کے فن سے آشنا شخص سے کئے گئے میرے اس نہایت معصومانہ سوال نے خوبصورت بوئی لان کو کھی کھی کر کے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

بوڑھے شخص نے جواب دیا۔

"پودوں کے لئے غاروں والی زندگی میں واپسی کا مطلب اس کے پتوں کا بالکل غائب ہو جانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی پودا پھولوں سے لدا پھندا بھی ہو اور وہ غاروں والی زندگی میں واپس چلا جائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ گل داؤدی کی اگائی میں یہی ایک سب سے بڑا ستم ہے۔ لیکن اسے محض دوسرے گملے میں لگا دینا یا اس کی مٹی کو تبدیل کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کا سب سے زیادہ انحصار مٹی کی خصوصیت اور اسے کھاد دینے کے طور طریقے پر ہوتا ہے۔

بوئی لان جو کہ جھکی ہوئی گملے میں مٹی ڈال رہی تھی بڑی آہستگی سے بوڑھے سے بولی۔

"اصل چیز یہ ہے کہ یہاں بے شمار پھول ہیں اور اگر کوئی پودا اس غاروں والی حالت میں پہنچ بھی جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔۔۔۔ دادا۔ آپ کو ان کی کچھ زیادہ ہی فکر لگتی رہتی ہے۔۔۔ اسی لئے پھولوں کا کوئی گملا آپ کے لئے بیچنا بہت ہی مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

بوڑھے سکالر نے مسکراتے ہوئے اپنی پوتی سے کہا۔

"ہاں اور اس کے علاوہ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی بھی پھول خریدتا نہیں کیونکہ میں ان پھولوں کو کبھی بیچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خوشی اور مسرت حاصل کرنے کے لئے جو پھول اگائے جاتے ہیں وہ انمول ہوتے ہیں۔ امیر لوگ جو پھول خریدتے ہیں ان میں ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ خوشی ان کے رنگوں اور خوشبوؤں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان کو پروان چڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں ہوتی ہے۔ ایک نوخیز کونپل جو پھوٹ نکلتی ہے ایک پتہ جو نمودار ہوتا ہے یہ چیزیں آنکھوں کے اطمینان کے لئے کافی ہوتی ہیں' اور یہ پھولوں کو محض دیکھتے رہنے سے زیادہ بہتر خوشی حاصل کرنے کی چیزیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ نہایت نازک اور قابل فخر مخلوق ہیں۔ یہ ہماری دولت کی متمنی نہیں ہوتیں انہیں صرف ہماری نگہداشت درکار ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو دل و جان سے پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہی ان کی خوبصورتی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ظاہری خوبصورتی سے زیادہ ان کی اندرونی خوبصورتی زیادہ قابل قدر ہوتی ہے' کیونکہ پھولوں کی روح ہوتی ہے اور کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جو لوگ ان کے لئے محض پیسے خرچ کرتے ہیں' وہ ان چیزوں کو محسوس نہیں کر سکتے۔

اور جو توجہ بوڑھا سکالر ان کو دے سکتا تھا ایسا شاید کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ پھولوں میں اسے آرکڈ بہت

پسند تھے اور آرکڈ کی قسم میں سے "بے داغ دل" کی قسم زیادہ بھاتی تھی۔ بوئی لان نے مجھے اس کی اس پسند کے بارے میں بتایا تھا۔ اور اس نے بوڑھے سکالر کے پسندیدہ آرکڈ پھولوں کے بارے میں مجھے بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

"میرے دادا تھوڑے سے وہی قسم کے انسان ہیں۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اپنے آرکڈ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ مجھے چھوٹے بچوں سے بھی زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کے لئے کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو پانی دینے کے لئے وہی پانی استعمال کیا جائے جو میں اپنا منہ دھونے کے لئے استعمال کرتی ہوں۔ یہ روز صبح کے وقت مجھے ان کا ایک ایک پتہ دھونا ہوتا ہے تاکہ آرکڈ اپنی پوری خوبصورتی اور جوبن کے ساتھ دکھائی دیں"

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ "جس پانی سے تم اپنا منہ دھوتی ہو بھلا وہی پانی ان کے لئے کیوں ضروری ہوتا ہے؟"

"دادا کہتے ہیں --- آرکڈ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی طرح سے ہوتے ہیں --- وہ عموماً" یہ کہتے ہیں کہ آرکڈ ایک خوبصورت مخلوق ہیں --- خاموش اور خوبصورت! تم بتاؤ --- خوبصورت مخلوق سے ان کی کیا مراد ہے؟"

میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔ خوبصورت مخلوق --- ایک خوبصورت عورت ہوتی ہے --- مثال کے طور پر تمہارے جیسی اچھی نوجوان لڑکی! اور خاموشی سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ باتونی نہیں ہوتے --- میرا خیال ہے اس طرح وہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ ...."

بوئی لان قہقہہ لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ الفاظ بغیر کسی خاص مقصد کے محض نوجوانی کے بھولپن میں کہہ دیئے تھے۔

اور اسی لمحے مجھے خیال آیا تھا کہ بوئی لان تو واقعی باغ میں کھلے پھولوں کی طرح پیاری اور خوبصورت تھی۔ جب مجھے اس کی رفاقت میسر ہوتی تھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں اپنے سب سے زیادہ بہترین دوستوں میں ہوں۔ لیکن یہ باتیں مجھے اس وقت سمجھ میں آئیں جب میں ذہنی طور پر کافی پختہ ہو گیا تھا اور گزرے دنوں کی غمگین اور خوش کن یادوں کے پیچھے موجود احساسات کو جاننے اور ان کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور اس وقت سے میں نے آرکڈ کے پھولوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ میں نے ان کے متعلق زیادہ معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دیں جب مجھے معلوم ہوا کہ بوئی لان خود ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اور خاص طور سے اس وقت سے ان میں میری دلچسپی زیادہ بڑھ گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کو اس پانی سے دھویا جاتا تھا جو خود بوئی لان اپنا منہ دھونے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ پھر مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا جب مجھے بولائی لان نے اس واقع کے متعلق بتایا جو بوڑھے سکالر کو پھول خریدنے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آیا تھا۔

"اس نے 'بے داغ دل والے" آرکڈ پھولوں کے دو گملوں کے لئے پیاسٹروں (ویتنامی روپے) کی کئی گڈیاں پیش کی تھیں۔ لیکن میرے دادا انہیں بیچنے پر رضامند نہ ہوئے۔ میرے دادا نے کئی اور عذر پیش کئے اور یوں اس پھولوں کے خریدار سے چھٹکارا حاصل کیا۔"

آرکڈ کے پھولوں کے صرف دو گملوں کے لئے پیاسٹروں کی کئی گڈیاں --- مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ان وقتوں میں محض ایک پیاسٹر کے عوض کوئی شخص ڈھیروں چاول خرید سکتا تھا۔ اور یہاں وہ صرف آرکڈ کے دو گملوں کے لئے کئی بنڈل پیاسٹروں کے دے رہا تھا۔ اصل میں وہ خریدار صحیح معنوں میں پھولوں کا عاشق ہی ہو سکتا

تھا۔ میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے قریب ہی موجود باغ کے پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے ملازم نے اپنے کام کو بیچ میں روکتے ہوئے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پاسٹروں کی ایک گڈی ---- ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ----! اگر اسے آرکڈ مل جانے کی اُمید ہوتی تو شاید وہ اس سے زیادہ کی پیش کش کرتا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ آرکڈ خریدنا چاہتا تھا دراصل اسے ایسا شخص کہلانے کا شوق تھا جو اس باغ کے تمام آرکڈ پھولوں کا مالک کہلوانا چاہتا تھا اور اپنے بھیجنے والے کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بیٹا شاید اس علاقے کا سب سے زیادہ خود پسند شخص تھا۔ لیکن اس بوڑھے سکالر کو ان پھولوں کو خریدنے کی پیش کش کرنا اس کی حماقت تھی۔ اگر اس نے ان پھولوں کو ویسے ہی مانگ لیا ہوتا تو شاید وہ ان میں سے کچھ لینے میں کامیاب ہو جاتا اور اس طرح اسے کوئی معاوضہ بھی نہ دینا پڑتا۔ بوڑھے سکالر کے ساتھ روپے پیسے کی اہمیت کی بات کرنا بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ اس طرح تو اس نے اس سے انکار ہی سننا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت اس نے یہ بات کی تو بوڑھا سکالر پیئے ہوئے نہیں تھا ورنہ چھڑی سے اسے اتنی مار پڑتی کہ اس سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔"

اس واقعے کو سننے کے بعد بوڑھے سکالر کی عزت میرے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ میرے والد اس شخص کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تھے اور اس کے لئے وہ اچھی سے اچھی دعوت بھی کیوں ٹھکرا دیتے تھے۔ اور یہ دعوت کسی چینی عامل جیسے اہم شخص کی بھی ہو سکتی تھی۔ بوڑھا سکالر کئی چینی عاملوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والد کسی اور شخص کے ساتھ وقت گزارنے سے زیادہ بوڑھے سکالر کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بات کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔

بوڑھے سکالر کے لئے جوں جوں میرے دل میں عزت بڑھتی جا رہی تھی ایسے ہی آرکڈ کے گملوں میں بھی میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ بوئی لان اور میں ہم دونوں آرکڈ کے پودوں کو پانی دینے' ان کے پتوں کو دھونے اور انہیں گملوں میں جمانے میں زیادہ انہماک سے لگے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں آرکڈ کے پودوں کے گیلے پتوں کی چمک سے کتنا لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان ہی نازک اور معصوم پھولوں کے درمیان ایک چہرہ جس کے گرد سیاہ بالوں کا ایک ہار سا ہوتا تھا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ صبح کے سورج کی روشنی میں ان پتوں پر چمکنے والی شبنم کے قطروں کی طرح اس چہرے پر موجود فاختہ جیسی دو خوبصورت آنکھیں جھل مل جھل مل کرتی تھیں۔ میرے ذہن میں اب بھی وہ ایسے دو نازک پتلے سے ہونٹ محفوظ ہیں جو کسی وجہ سے اپنی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش میں بھینچے ہوئے دکھائی دیتے تھے' اور آرکڈ کے پتوں میں چھپے ان ہونٹوں نے ایک صبح مجھ سے کہا تھا۔

— "دادا" بے داغ دل والے" ان آرکڈ پھولوں کے دو گملوں کو اس لئے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ یہ عین نیٹ تہوار کے موقع پر کھلنے والے ہیں۔ اس موقع کے لئے تب وہ ساری رات ان پھولوں سے کشید کی ہوئی مٹھاس بھری خوشبو میں بسی رائس برانڈی تیار کریں گے۔ اور تب دادا اس میں سے کچھ ہمیں بھی ان پھولوں کی دیکھ بھال کے عوض عطا کریں گے۔ ایک مہینہ اور گزر جانے دو پھر تم دیکھنا کہ یہ آرکڈ کی قسم "سفید موتی" سے بھی زیادہ خوبصورت انداز میں ظاہر ہوں گے!"

اس وقت یہ فاختہ جیسی آنکھیں آرکڈ کے پتوں کو اتنی ہی محبت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کہ باغ کے پچھلے حصے میں پودوں کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ کر خوشبو دار چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بوڑھے سکالر کی آنکھیں دیکھتی تھیں اور نئے شگوفوں کے پھوٹنے کی مسرت محسوس کرتی تھیں۔

ایک سہ پہر کو میں بوڑھے سکالر کے گھر گیا۔ میں آرکڈ کے پھولوں کے ان دو گملوں کو دیکھنے آیا تھا جن کی دیکھ بھال میں اور بوئی لان کافی دنوں سے کر رہے تھے۔ کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں ہوئی اگر کوئی معمولی سی تبدیلی تھی بھی تو وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ اگر کبھی میں ایک دن نہ آتا تو اگلے دن بوئی لان مجھے ان پودوں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں اور باریکیوں کو تفصیل سے بتاتی تھی۔ قریب موجود بوڑھا سکالر اس کی باتیں سن کر خاموشی سے مسکرائے جاتا تھا جیسے ایک دادا اپنی پوتی کے فخریہ کارناموں کی داد دے رہا ہو۔ اب چونکہ میں دو دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تھا تو مجھے توقع تھی کہ بوئی لان مجھے یقیناً" نئی کونپلوں کے پھوٹنے' ایک پتے کے برآمد ہونے یا مرجھا جانے کے متعلق یا پھولوں پر منڈلانے والی تتلیوں کی حرکات و سکنات اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری بہت سی' چھوٹی چھوٹی حقیقی مگر شاعرانہ قسم کی جزیات سے ضرور آگاہ کرے گی۔ میں بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میرا دل نیٹ کے تہوار کے نزدیک آجانے اور جو تفصیلات مجھے بوئی لان سے ملنے والی تھیں ان کی وجہ سے سینے میں تیزی سے اچھل رہا تھا۔

لیکن جونہی میں کورٹ یارڈ میں داخل ہوا دنگ رہ گیا۔۔۔ میں رک کر دیکھنے لگا ۔۔۔ بوئی لان داخلی دروازے کے قریب ہی ایک ستون کے ساتھ لگی خلاء میں گھورے جا رہی تھی۔ میں نے کبھی اس کا اتنا زرد چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے دوپہر کے سورج میں جھلسے ہوئے ہائی بسکس پھول کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے سانس لی۔

"بوئی لان! کیا بات ہے ۔۔۔ کیا ہوا ہے؟"

بوئی لان سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور سیب کے ایک پودے کے ساتھ لگ کر نہایت غم زدہ لہجے میں اس نے کہا۔

"دادا نے بیچ دیئے ۔۔۔!"

"بیچ دیئے ۔۔۔ کیا ۔۔۔؟"

وہ تیزی سے پلکیں جھپکا رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو پڑے گی۔

میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

"بھئی بتاؤ بھی کہ دادا نے کیا بیچ دیا ہے؟"

"آرکڈ کے دونوں گملے"

حیران ہوتے ہوئے میں نے کہا "یہ ناممکن ہے ۔۔۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو یا دادا نے تمہارے ساتھ کوئی مذاق کیا ہے۔ وہ ان پھولوں کو کبھی بھی نہیں بیچ سکتے۔ اگر انہیں ان کو بیچنا ہی ہوتا تو اسی دن وہ انہیں بیچ دیتے ۔۔۔ لیکن اب انہوں نے ان کو کیوں بیچ دیا؟"

بوئی لان نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ دادا نے انہیں اس آدمی کے ہاتھ بیچ دیا جو چند دن پیشتر انہیں خریدنے کے لئے آیا تھا۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تو باغ کی پچھلی طرف جا کر خود دیکھ لو۔"

میں تیزی سے اس طرف گیا۔ گو کہ بوئی لان نے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ میں بوڑھے سکالر کی ان پھولوں کے ساتھ بے پناہ محبت کو جانتا تھا ۔۔۔ اس جیسا شخص تو خواہ وہ روپے پیسے کی بہت زیادہ کمی کا شکار ہو جاتا تو تب بھی وہ ان پھولوں کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس

جیسا شخص مادی ضرورتوں سے مرعوب نہیں ہو سکتا تھا اور وہ زندگی کی داخلی قدر و قیمت اور فخر کو یوں نہیں کھو سکتا تھا۔

بوڑھے سکالر کے لئے پھول بیچنا بہت شرمناک بات تھی کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ایک شخص تھا جن کے لئے پھول اگانا ایک مذہب کا درجہ رکھتا تھا۔ اور اس کے باغ میں جو پھول تھے وہ بہت ہی خوبصورت تھے۔ اس نے اور اس کی پوتی نے نمائش کے لئے اپنے پھولوں کی بہت زور شور سے تیاری کی ہوئی تھی۔ وہ اس کام کو اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ کرتا تھا اور وہ پھولوں سے ایسی ہی محبت کرتا تھا جیسی کہ کوئی ماں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے ضمن میں کرتی ہے۔

حالانکہ وہ کوئی امیر کبیر شخص نہیں تھا بس غریب جیسا ہی تھا لیکن اس نے اپنی گھرداری کے حوالے سے اور دوسرے اخراجات کے سلسلے میں ایسا متوازن رویہ اپنا رکھا تھا کہ سوائے کسی شدید اور اہم ضرورت کے شاید اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔ اور پچھلے کچھ عرصے سے تو واقعی اس کو کسی ایسی مالی پریشانی نے نہیں گھیرا تھا۔ میرا خیال تھا بوئی لان کو کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی یا پھر یہ کہ اس کا دادا اس سے کسی قسم کا کوئی مذاق کر رہا تھا۔

لیکن گھر کے پچھواڑے پہنچنے پر میری پریشانی اس وقت بڑھ گئی جب میں نے اسے ایک اجنبی کے ساتھ محو گفتگو پایا۔ وہ اجنبی شخص پچاس سال کا ایک فضول سے چہرے والا شخص تھا جس کا منہ اندر سے کسی سور جیسا تھا۔ اس نے ایک ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا جو اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ یہ لباس اس کے جسم پر اتنا تنگ تھا کہ لگتا تھا ابھی اس کے بخیئے ادھڑ جائیں گے۔ اس کی توند بڑھی ہوئی تھی اس کا چہرہ بھی خاصا چربیلا تھا اور آنکھوں کے پپوٹے بھی خاصے بھاری تھے۔

"جناب اگر آپ نے انہیں پچھلی دفعہ میرے ہاتھ بیچ دیا ہوتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ آپ کو اچھے دام مل جاتے اور مجھے .... یعنی سودا پکا ہو جاتا۔ لیکن جناب --- اب تو سچی بات یہ ہے کہ ..... میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں کہ اب میں آپ کو اس دن والی قیمت تو نہیں دے سکتا"

بوڑھا سکالر بڑبڑایا

"اچھا تو اب تم مجھے ان کی کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟"

"ہاں جناب --- ٹھیک ہے --- دیکھیں ناں اب تو خود آپ نے مجھے بلایا ہے۔ اور اصل میں مجھے اب پھولوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ پچھلی دفعہ آپ نے انہیں بیچنے سے انکار کر دیا تھا--- اور مجھے کہیں اور سے خریدنے پڑے تھے --- جی ہاں......"

اس نے اپنے سانس کو بحال کیا اور کہنے لگا۔

"تو اب جناب --- سیدھی سی بات تو ہے کہ اگر آپ انہیں سستے میں بیچیں گے تو میں مجبوراً انہیں خرید لوں گا--- اور اگر آپ اسی پرانی قیمت پر اڑیں رہیں گے تو پھر تو میں معذرت ہی چاہوں گا۔"

یہ سب کچھ کہنے کے بعد اجنبی ہنسنے لگا اور یوں اس کے بے ترتیب دانت جن پر سونے کے خول چڑھے تھے نظر آنے لگے۔ اس کے دیکھنے کا انداز' اور جس طرح وہ گفتگو کر رہا تھا قابل نفرت تھا--- میں جانتا تھا کہ جب وہ "جی جناب" "یا جناب عالی" کے الفاظ ادا کرتا تھا تو وہ محض عادتاً" کرتا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جو اپنی مقصد براری کے لئے ہمیشہ چور دروازہ استعمال کرتے ہیں اور حقیقتاً" اس کے نزدیک اس بوڑھے سکالر کی کوئی

عزت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر میں نے اطمینان کی ایک لہر دیکھی حالانکہ میں نوجوان تھا اور زندگی کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا لیکن پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ بوڑھے سکالر کو ایسی تجاویز بھی پیش کر رہا تھا کہ جن کی بنا پر کل کلاں کو وہ اپنا مکان تک اس کے ہاتھ بیچنے کو تیار ہو جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ بوڑھا سکالر اس کے ساتھ بہت بری طرح سے پیش آئے گا--- لیکن بوڑھے کو غصہ تک نہ آیا اس نے اپنے آپ پر قابو پائے رکھا--- میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے چبا رہا تھا--- تب وہ آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہے تم قیمت لگاؤ---- اگر میرے لئے ممکن ہوا تو میں انہیں تمہارے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

اس آدمی نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور عجیب انداز سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھئے جناب ---- جناب عالی بہتر یہ ہو گا کہ آپ خود ہی ان کی قیمت لگائیں۔ میرے لئے کچھ کہنا ذرا مشکل ہو گا۔"

بوڑھے سکالر نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور آرکڈ کے پھولوں کے دونوں گملوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں پانچ پیاسٹر تک ان کی قیمت کو کم کر سکتا ہوں---- اور یہ بہت زیادہ رعایت ہو گی--- لیکن چونکہ میرے کام کی نوعیت بہت اہم ہے اور مجھے .... ہاں البتہ...."

خریدار ایک بار پھر دانت نکالتے ہوئے ہنس پڑا۔

"جی بالکل جناب --- یہ تو ہے--- آپ جیسے لوگ جو پھولوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں وہ تو پھولوں کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ دیکھیں ناں جناب--- میرے لئے تو یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو کوئی شدید ضرورت آن پڑی ہے ---- اور جناب یہی تو وجہ ہے کہ آپ نے مجھے بلا بھیجا ہے ---- لیکن جناب --- اصل میں بات یہ ہے کہ قیمت تو اب بھی بہت زیادہ ہے اور اگر میں آپ کے ساتھ سودا بازی کروں گا تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہو گی--- تو اس لئے جناب ---- بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت ہی دیں تو بہتر ہے۔"

بوڑھا سکالر حیران و ششدر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اور وہ اور زیادہ شدت سے نچلا ہونٹ چبانے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ اس شخص سے مزید کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن جب اس شخص نے اس کے سامنے جھکتے ہوئے جانے کی اجازت مانگی تو اس نے اپنی آواز کو واضح کرنے کے لئے خواہ مخواہ کھانستے ہوئے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں دس پیاسٹر تک قیمت کو کم کر دیتا ہوں"

وہ آدمی رک گیا اور اس نے جواب دیا "ٹھیک ہے جناب--- اگر آپ رضامند ہیں تو میں ان کے تیس پیاسٹر دے دوں گا"

بوڑھے سکالر کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے میں نے اس کی آنکھوں میں بے توقیری کی جھلک دیکھی--- ساتھ ہی میں نے اس کے بوڑھے دل میں تھوڑا سا لالچ اور رنج بھی محسوس کیا۔ اس کے مخاطب کے نامہذب اور ناقابل برداشت رویے نے اس کی عزت نفس کو بہت زیادہ ٹھیس پہنچائی تھی۔ جب اپنے قریب پڑی ماچس کو پکڑنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔

ایک لمبی سانس لیتے ہوئے میں نے اسے کہتے سنا:

"ٹھیک ہے--- تم پھول لے جا سکتے ہو"

میرے نزدیک کھڑے ملازم نے بے صبری کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کتنا اعلیٰ قسم کا چور ہے یہ شخص ---- اسے ان پھولوں کی اب بھی شدید ضرورت ہے ---- پچھلی مرتبہ وہ ان کو حاصل کرنے کے لئے پاؤں تک کو ہاتھ لگانے کو تیار تھا۔ اب چونکہ اس کا پتہ بھاری تھا اس لئے وہ اکڑ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بوڑھا سکالر اسے اس سے کم قیمت پر پھول نہیں بیچے گا اس لئے اب اس نے قیمت اور کم کرنے پر اصرار نہیں کیا"

جب خریدار دونوں گملے لے کر چلا گیا تو بوڑھا سکالر ایک تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا ایک مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس نے لکڑی کی ٹرے میں پڑے چند نوٹوں کی طرف دیکھا پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

بوئی لان ایک طرف سے بوڑھے سکالر کی طرف دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا پھر نوٹوں کو دیکھا اور آخر میں ادھر نگاہ کی جہاں آرکڈ کے پھولوں کے گملے ہوا کرتے تھے۔

"نیٹ کا تہوار برباد ہو جائے گا ---- نیٹ کے لئے اب آپ کے پاس کوئی آرکڈ نہیں ہو گا۔ لیکن کیوں ---- آپ نے انہیں کیوں بیچ دیا؟"

بوڑھے سکالر کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ "آگ نے سارے گاؤں میں قیامت برپا کر دی ہے ---- کسی کا باپ نہیں رہا ---- اور کسی نے اپنا خاوند کھو دیا ہے"

مکان جل کر راکھ ہو گئے ہیں ---- اس صورت حال میں پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی کسے فرصت ہو گی! ہمارے ہمسایوں پہ جو یہ افتاد آن پڑی ہے ---- تو کوئی کس طرح پھولوں میں مگن رہ سکتا ہے؟"

جب اس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا تو یہ تم ہو مسٹر نجاک! ٹھیک ہے تم میرے ساتھ آؤ! بوئی لان۔ مجھے میری چھڑی دے دو ---- اور دیکھو روؤ مت!

بوڑھے سکالر نے نوٹوں کو ایک رومال میں باندھا اور چھڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے گھر سے باہر نکل پڑا۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ سردیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ بارش تو نہیں ہو رہی تھی لیکن اس وقت بہت تند و تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ اس وقت میں سمجھا کہ کیوں اس نے پھول بیچ دیئے تھے۔ تین دن پہلے' آگ نے اس گاؤں کا کچھ حصہ تباہ کر دیا تھا۔ اس آگ میں دو آدمی جل مرے تھے اور چار یا پانچ خاندان اپنا گھربار اور تمام اثاثہ کھو بیٹھے تھے۔

ادھر جاتے ہوئے مجھے بوڑھے سکالر نے بتایا۔

"بے چاری بوئی لان ---- اس کا رونا بجا ہے ---- لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ---- پھول یقیناً" خوشی دیتے ہیں' ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں' ان کی خوشبو روح کو سیراب کرتی ہے لیکن کسی کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھولوں کا مذہب رکھنے والے لوگ اپنے ہمسایوں سے محبت کرنے پر اپنا ایمان رکھتے ہیں۔ پھول کبھی خود غرض نہیں ہوئے ---- وہ مرجھانے سے پیشتر اپنا رنگ اور خوشبو اس دنیا کو دے جاتے ہیں۔ خالق نے زندگی کے اصل مفہوم کو ان پھولوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ بندوں سے محبت کئے بغیر پھولوں سے محبت کرنا بکواس ہے۔"

بوڑھا آدمی راستے میں پڑی کانٹوں بھری ایک شاخ کو اٹھانے کے لئے جھکا۔ اس نے اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔

"آگ کا شکار ہونے والے ان بدنصیبوں کی وجہ سے میں آجکل صحیح طرح سے سو نہیں سکا ہوں۔ ان پر ٹوٹنے والی قیامت نے مجھے دکھی کر دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو آج کل میرا ہاتھ تنگ تھا۔۔۔ اگر میں آرکڈ کے پھولوں کے یہ دو گملے نہ بیچتا تو پھر میں وقت پر رقم کا بندوبست کہاں سے کر سکتا تھا؟

پھولوں کو بیچنا ایک شرمناک بات ہے ۔۔۔۔ اور وہ لوگ جو دوسروں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں یہ اس سے بھی زیادہ شرمناک بات ہے ۔۔۔۔ لیکن بعض اوقات ہمیں اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھولوں کو بھی بیچنا پڑ جاتا ہے۔ مصیبت میں مبتلا لوگوں سے بے توجہی برتنا بہت آسان کام ہے لیکن اس طرح ایک بیوہ اور ایک یتیم کا پیٹ تو خالی رہے گا۔ ان پھولوں کو بیچ دینے سے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچی ہے' یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کوئی بہت ہی عزیز اور پیاری چیز کھو دی ہے۔ بوئی لان کا رونا بجا ہے ۔۔۔۔ لیکن جب ہمارے آل دوالے میں لوگ مصیبت میں گھرے ہوں تو ہم کس طرح پھولوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں؟"

دس سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ بوڑھا سکالر نگوین دوسرے جہان کو سدھار گیا۔ اور بوئی لان وہ بھی ۔۔۔۔ وہ اپنی بہار کے اٹھارویں سال میں تھی کہ اس کی زندگی کی خوشبو بھری ٹہنی ٹوٹ گئی۔ فوراً" بعد ہی ان لوگوں کا ملازم بھی ان ہی کے پیچھے چلا گیا۔

ایک لمبی غیر حاضری کے بعد میں نے جب ان پرانی جگہوں کو دوبارہ دیکھا تو ان پرانے دنوں کے ساتھیوں کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ وہ ایک دم سے غائب ہو گئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے انہوں نے ایک ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گھاس پھونس کی بنی وہ پرانی کاٹیج اب ویسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ باغ جو کہ اب ویرانے میں تبدیل ہو چکا تھا پہچاننے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ان تبدیلیوں کے بیچ' ان چیزوں کے درمیان کھڑے ہوئے جو کہ اب ماضی کا حصہ بن چکی تھیں اور ہمیشہ کے لئے منظر سے ہٹ گئی تھیں میں اپنے اندر کسی ایسی چیز کو ضرور محسوس کرتا ہوں جو ہمیشہ رہے گی اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور یہی ہمیشہ موجود رہنے والی چیز جو میرے اندر دھڑکتی رہتی ہے مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں دیکھتا رہوں ۔۔۔۔ ساری رات یہیں رکا رہوں اور ماضی کے باغ میں موجود آرکڈ کے پھولوں کے ان دو گملوں کے بارے میں کہانی لکھتا رہوں۔۔۔۔!!

جیف گنٹوانڈس / ستار طاہر

پانی کی دیوار

سفید فام مرد کمرے میں واپس آیا۔

کچھ بھی نہیں ... اس نے کہا "پانی کا ایک قطرہ بھی وہاں نہیں نکل رہا۔ میں اسے کھلا چھوڑ آیا ہوں۔"

وہ اس کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے گھٹنے اسکے سینے کو چھو رہے تھے۔ سیاہ فام عورت چپ تھی۔ اس نے اپنی پشت راشن کے بڑے بڑے صندوقوں کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ وہ یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی بندر دبک کر بیٹھا ہو۔ اس نے اپنی گود میں پان دیوتا کی چمکدار مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک رخ پر خراشیں آئی ہوئی تھیں۔ آنکھ سوجی ہوئی بند پڑی تھی۔ اس کا زرد رنگ کا سارونگ جو اس کے شانوں پر لٹکا ہوا تھا۔ گندا' میلا اور پھٹا ہوا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھی اور اس سے پسینے کی مہک آ رہی تھی۔

انہوں نے نلکوں کو تباہ کر دیا ہے۔ سفید فام مرد نے خلاء میں بلاوجہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور دیکھو تو ہم کتنے خستہ حال نظر آ رہے ہیں۔

سفید فام مرد کے پاؤں ننگے تھے اور اسکی ٹانگوں پر کیچڑ کے دھبے تھے۔ اس نے جو قمیض پہن رکھی تھی وہ خون اور پسینے میں نچڑی ہوئی تھی اور اسکی نیکر گندی اور میلی تھی۔ اس کے ماتھے پر زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد وہ خون کے دھبوں والے رومال سے اس زخم کو دباتا جس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر درد کی لہر دوڑ جاتی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اسکی ڈاڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے لمبے بال الجھے ہوئے تھے۔

میز پر خالی تھیلے' لوہے کے بنے ہوئے اسلحے کے خالی ڈبے' اقوام متحدہ کے سپاہیوں کے بیلچے اور اسی طرح کی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف راشن کے بڑے بڑے صندوق رکھے تھے جن کے ڈھکنے کھلے ہوئے تھے۔

اور باہر دھوپ سے جگمگاتے ہوئے صحن میں انسانوں کا ہجوم خاموش کھڑا تھا۔ یہ ہجوم وہاں کئی گھنٹوں سے موجود تھا۔ سخت گرمی تھی اور ہوا بالکل بند اور دور آسمان پر گدھ چکر کاٹ رہے تھے۔

سفید فام مرد نے اپنی نیکر کی جیب سے ایک مڑی تڑی سگریٹ کی ڈبیا نکالی جس میں صرف ایک مڑا تڑا سگریٹ تھا۔ اس نے دیا سلائی کو میز کی پشت پر رگڑا۔ چھوٹا سا شعلہ نمودار ہوا جس سے اس نے سگریٹ سلگائی ایک لمبا کش کھینچا اور پھر سیاہ فام عورت کی طرف دیکھے بغیر سگریٹ اسکی طرف بڑھا دیا۔ مرد کے ہاتھ کانپ رہے تھے وہ سگریٹ جیتی رہی۔ سفید فام مرد اپنے انگوٹھے کے ناخن کو دیکھتا رہا۔ جو ٹوٹا پھوٹا اور سیاہ تھا۔

"یہ لو:" سیاہ فارم عورت نے اسکی طرف سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ سیاہ فام عورت کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ نفرت' شک' بے یقینی!

مرد نے سوچا۔ "نفرت کا سیاہ رنگ پھر میرے سامنے آگیا ہے۔ دو سال سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کامیابی

ہوئی مگر اب پھر سیاہ رنگ کی دیوار کھڑی ہوتی جا رہی ہے۔"

باہر اچانک کسی عورت کی تیز چیخ نے فضا کو تھرتھرا دیا۔ کچھ مردوں کی تیز تیز بولنے کی آوازیں۔ ہجوم میں ابتری پیدا ہوئی' کسی نے کسی کو آواز دی اور پھر یک لخت خاموشی چھا گئی۔

سفید فام مرد خوفزدہ ہو کر کھڑکی کے قریب پہنچا اور اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔

مچھر دانی کا پردہ پھٹا ہوا تھا اور کھڑکی کا ایک پٹ بھی ہلا ہوا تھا۔

برآمدے کے آگے دوسرے دروازے کے اندر سے مسلسل کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چھ.... آہ.... "چھ.... ہاں.... یہ ہے ایک چھ... اور..... " اور پھر پردوں کی تھرتھراہٹ'

"جب رات ہو جائے گی تو یہ لوگ تھک کر چلے جائیں گے" سفید فام مرد نے کہا اور سوچنے لگا۔ اب یہ لوگ ٹرانسمیٹر کے ذریعہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' مگر کمانڈو کے ساتھ ان کا تعلق قائم نہ ہو سکے گا۔

"تم۔" سیاہ فام عورت نے اپنی پلکیں اٹھا کر کہا..... "یقیناً" یہ لوگ بور ہو کر چلے جائیں گے۔ مم... وہ یہاں کب تک انتظار کرتے رہیں گے کب تک؟"

سفید فام مرد نے کہا اور پھر اپنی زبان سے اپنے ہونٹوں کو تر کرنے لگا۔

مچھر دانی کا پردہ ہل رہا تھا۔ سفید فام مرد نے سوچا شام کی ہوا دریا کو چھو کر آ رہی ہے۔ دریا جو جنگلوں کے اندر بہتا ہے.... دریا.... پانی جھیلیں... پانی..... پانی.....!

"اگر ہم لوگ بوکاپو میں ٹھہرے رہتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔" سیاہ فام عورت نے آہ بھر کر کہا۔

"بوکاپو میں یہ فساد ہونا ہی تھا۔ جلد یا بدیر سب جگہ یہ ہونے والا تھا۔ ہم اس سے بچ نہیں سکتے تھے یہ ہونی تھی۔ فادی غنڈے' اگر میں عین وقت پر تمہاری بندوق اٹھا کر باہر نہ پھینک دیتی اور یہ بندوق انہیں تمہارے سامان میں نظر آجاتی تو وہ تمہیں اسی وقت ہلاک کر دیتے۔"

"ہاں یہ تم نے اچھا کیا۔" سفید فام مرد نے جواب دیا۔ "کاش وہاں راستے میں اتنی اونچی اونچی اگی ہوئی جنگلی گھاس نہ ہوتی تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ راستے کے موڑ کو کاٹتے ہی ہمیں کن لوگوں سے واسطہ پڑے گا مگر لمبی گھاس نے کچھ دیکھنے کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ اب سوچیں تو کیا فائدہ؟ اب ہم گھر چکے ہیں" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور پھر اسے میز کے نیچے پھینک دیا۔ چند لمحوں تک جلتے ہوئے سگریٹ کا سرا نظر آتا رہا اور پھر اندھیروں میں گم ہو گیا۔

برآمدے میں رکھا ہوا ریسیور ابھی تک خاموش تھا۔ دور دور تک کسی امدادی دستے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

"وہ اب بھی کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔" سیاہ فام عورت نے کہا۔

"جب تک میں انہیں اپنا چہرہ نہیں دکھاتا وہ انتظار کرتے رہیں گے۔" یہ کہہ کر مرد نے خون آلود رومال سے اپنے ماتھے کا زخم صاف کیا ایک ٹانگ فرش پر پھیلا دی وہ تھک چکا تھا۔ سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر کمرے میں آ رہی تھیں۔ شام کی ہوا سے مچھر دانی کا پردہ ہل رہا تھا۔ سفید فام مرد کو نیلے پہاڑ اور ان کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں یاد آنے لگیں۔ اپنے گھر کی یاد سے وہ اداس ہو گیا۔ سیاہ فام عورت اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔ ان بے حد خوبصورت آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی پلکوں کو اٹھا کر اس نے کہا۔

جان.... ہاں. جان مجھے بے حد پیاس لگی ہے کل سے پانی نہیں پیا۔

"مرد خاموش رہا۔ پھر بڑے بیزار لہجے میں بولا... یہاں پانی نہیں ہے۔ ٹونٹی سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں

نکل رہا۔ میں نے سب ٹونٹیاں کھلی چھوڑ دی ہیں"۔

"تم پانی حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے' پان دیوتا کی مورتی پر خون کے دھبے جم گئے ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔" تم جانتے ہو کہ مجھے صاف ستھرا رہنے کا کس قدر خبط ہے اور اب میں کتنی گندی اور میلی ہو چکی ہوں۔"

"چپ رہو" سفید فام مرد نے کہا۔ "موقع کی نزاکت کو سمجھو۔ میں حیران ہوں کہ اقوام متحدہ کے یہ بزدل سپاہی باہر کھڑے ہجوم پر گولی کیوں نہیں چلاتے۔ میں تم سے' ساری دنیا سے تنگ آ چکا ہوں۔ خدا کے لئے چپ رہو۔ اپنا منہ بند رکھو میں بیزار ہوں سب سے"

سیاہ فام عورت فرش کو گھورتی رہی اور پھر اس کے ذہن میں شک کا سانپ سر اٹھانے لگا۔ شائد اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ یہ خوفزدہ ہے جھوٹا ہے۔ دھوکے باز ہے۔ یہ اب مجھ سے پہلے جیسی محبت نہیں کرتا اور اب میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے بغیر میں آہستہ آہستہ گھل کے مر جاؤں گی۔

سفید فام مرد یک لخت اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سامنے صحن میں بوگن ولیا کے سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک جھاڑی کے پیچھے مشین گن پوسٹ بنی ہوئی تھی حبشہ کے دو سپاہی پیٹ کے بل مشین گن کے پیچھے لیٹے ہوئے تھے اور گھر کے باہر پام کے درختوں کے قریب حبشیوں کا ہجوم خاموشی سے ڈٹا کھڑا تھا۔ سورج کی کرنیں سفید فام مرد کے چہرے کو چھو رہی تھیں اور پسینہ تیزی سے بہنے لگا۔ بہتے ہوئے پسینے سے اس کی پیشانی جلنے لگی کم از کم دو سو حبشی ہجوم کی صورت میں کھڑے تھے۔ ساکت اور گم سم۔ پام کے درختوں کے تنے سرخ مٹی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہوا ایک بار پھر رک گئی تھی اور پتے لٹکے ہوئے تھے۔ چھوٹے قد کے بچوں جیسے میرے والے کیپٹن نے چیختے ہوئے کہا تھا۔ اگر ہجوم حرکت کرے تو ہم اس پر گولی چلا دیں گے وہ کیپٹن اب ٹرانسیٹر کے پاس کھڑا کمانڈر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ سنتری جو گھر کے عقب میں پہرہ دیتا تھا وہ اندر آیا اس نے اپنی خود کار رائفل ایک طرف رکھ دی۔ آہنی خول سر سے اتار کر اپنے سر کے چھوٹے چھوٹے گھنگریالے بالوں کو سہلانے لگا۔ اور پھر سفید فام مرد اور سیاہ فام عورت کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ تلطف سے مسکرایا۔ سنتری کی ٹانگیں لمبی' کمر پتلی اور شانے چوڑے تھے۔ اس کا خمدار ناک بہت خوبصورت تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہمدردی تھی۔

"ہیلو!" سفید فام مرد نے مسکرا کر کہا....

حبشہ کے سپاہی نے مسکرا کر جواب دیا۔ اپنی پیٹی سے پانی کی بوتل کھولی ڈھکنا نکالا پانی کا ایک گھونٹ لیا منہ گیلا کیا اور منہ کے اندر سے بچا کھچا پانی نکال کر فرش پر پھینک دیا۔

"کیا تم انگریزی جانتے ہو؟" سفید فام مرد نے پوچھا۔

"تھوڑی سی".... "کیپٹن کہاں ہے؟"

کیپٹن؟ سنتری نے کہا اور پانی کا ایک اور گھونٹ بھر لیا۔ ہاں.... ہاں.... لیکن.... گھر.... گھر.... سنتری نے مبہم سا جواب دیا۔ پانی کی بوتل میں ڈھکن لگایا اور اسے پھر پیٹی سے باندھ لیا پھر اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ایک ڈبیہ نکالی ایک سگریٹ سفید فام مرد کو پیش کیا اور پھر تیزی سے دونوں سگریٹ دیا سلائی سے سلگا دیئے۔

سفید فام مرد نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچا یہ لوگ صدیوں پرانی تہذیب کے وارث ہیں۔ یہ ایک معزز انسانی نسل حکمران نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ "کیا اس کے پاس تھوڑا سا پانی نہیں ہے؟" سیاہ فام

عورت نے پوچھا۔ "او جان خدا کے لئے اس سے پانی کے بارے میں پوچھو..."

میں پوچھتا ہوں' سفید فام مرد نے سیاہ فام عورت کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر سنتری سے پوچھنے لگا۔

کیا لیفٹیننٹ نہیں ہے؟.... میں سمجھا نہیں سر"

"لیفٹیننٹ... دو ستارے..... کیپٹن .... تین ستارے..."

سنتری نے اسکی طرف نرمی سے دیکھا۔ سگریٹ کو فرش پر پھینکا پھر اسے اپنے جوتے سے مسل دیا۔ سر پر آہنی خول رکھا۔ اپنی خود کار رائفل اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

"کیا وہ پانی لینے گیا ہے" "ہاں میرا یہی خیال ہے" "کیا تم نے اسے پانی کے لئے پوچھا تھا"۔ "ہاں" "اس نے کہا کیا تھا؟"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"مجھے تم پر اعتبار ہے مگر اس نے کہا کیا تھا؟"

"یہی کہ وہ اپنے افسر کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے بعد پانی لائے گا"

"کیا واقعی وہ تمہاری باتیں سمجھ گیا تھا؟"

سفید فام مرد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھڑکی سے پام کے درختوں کے پاس کھڑے حبشیوں کے ہجوم کو گھور رہا تھا۔

"اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی۔ سیاہ فام عورت کہنے لگی۔ آغاز میں اور حتیٰ کہ پچھلے ہفتہ تک تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ پچھلے ہفتے تم خود ہی میرے لئے پانی لینے گئے تھے لیکن اب .... نہیں اب نہیں .... اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی'"

سفید فام مرد نے اب بھی جواب دینا گوارا نہ کیا۔ وہ بدستور ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ "اگر ہمیں مرنا ہی تھا تو کہیں بہتر ہوتا کہ ہم بوکاپو میں مرتے" "کاش ہم وہیں ٹھہرے رہتے اور وہیں مرجاتے۔"

"منہ بند رکھو' چپ رہو" سفید فام مرد نے بڑی درشتی سے کہا۔ "چپ رہو"۔ اس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا ہاتھ حرکت میں تھے اور وہ بڑے غور سے باہر دیکھ رہا تھا۔ جہاں نوجوانوں کی ایک ٹکڑی سیاہ قمیضوں میں ملبوس بلند آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھی۔ اشارے کر رہی تھی۔ گھر کی طرف جہاں وہ خود اور سیاہ فام عورت تھی۔ سفید فام مرد کی پوری توجہ ان سیاہ قمیضوں والوں پر مرکوز تھی اس کے گلے میں کچھ پھنس رہا تھا۔

سیاہ فام عورت نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا کیا ہے۔

"کیا بات ہے"؟ "دیکھو .... ادھر دیکھو" سفید فام مرد نے کہا اب بھی اس کے حلق میں کچھ اٹک رہا تھا وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سفید فام مرد کے پاس پہنچ کر اس نے باہر کی طرف دیکھا۔

"اگر وہ اس طرف بڑھے تو کیا سپاہی گولی چلائیں گے؟"

سیاہ فام عورت نے پوچھا۔ اور سفید فام مرد کے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ دونوں کے جسم ایک دوسرے کو چھونے لگے تھے۔ "مجھے یہی امید ہے" "اور آفیسر کیا وہ آچکا ہے نہیں" .... "اگر وہ نہ آیا کیا تب بھی سپاہی گولی چلائیں گے؟"

"میں نہیں جانتا میں کیسے جان سکتا ہوں تم مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

سیاہ فام عورت خاموش ہو گئی۔

سفید فام مرد بدستور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا کالی قمیضوں میں نوجوان شور مچانے لگے تھے۔ زمین پر پاؤں مار رہے تھے اور گھر کی طرف اشارے کر کے مکے لہرا رہے تھے۔ اور سفید فام مرد نے حبشہ کے ان دو سپاہیوں کی طرف دیکھا جو مشین گن کے قریب لیٹے تھے۔ وہ دونوں بے چین اور مضطرب نظر آرہے تھے۔ جیسے اپنے ہم رنگوں پر گولی چلانے سے ہچکچا رہے ہوں۔

"جان" سیاہ فام عورت نے سرگوشی میں کہا اور بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سفید فام مرد سوچنے لگا ایک نہ ایک دن یہ سب کچھ ہونا تھا۔ یہی انجام یہی خاتمہ' ہر چیز کے خاتمے کی طرح جس سے کوئی مفر نہیں مگر جس طریقے سے یہ ہو رہا ہے یہ ناقابل برداشت ہے' ناقابل قیاس۔ یہ لوگ طوفان کی طرح گھر کو اپنے نرغے میں لے لیں گے۔ مجھے پکڑ کر میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں کہ میں اپنا بچاؤ کر سکوں اور جب میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تو اس عورت کے ساتھ اپنی محبت کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ محبت بھی فانی ہے۔ جانے لوگ کیوں صرف محبت کو لافانی قرار دیتے ہیں۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا وہ اپنے آپ کو کمزور اور بیمار محسوس کرنے لگا اس کے باطن کا کھوکھلا پن خود اس پر ظاہر ہو گیا تھا۔

برآمدے کے آگے کمرے میں آپریٹر کے چہرے پر مسرت نظر آرہی تھی۔ جیسے رابطہ قائم ہو گیا ہو۔ ریسیور سے سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی بڑی عجلت سے آپریٹر نے بات سنی' کچھ جواب دیا اور پھر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید فام مرد اور سیاہ فام عورت کو دیکھا' سلام کیا اور پھر سفید فام مرد سے مخاطب ہو کر کہا!

کیپٹن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ابھی یہاں سے چلے جائیں صرف آپ .... سیاہ فام عورت نہیں۔

جہاز مضافاتی اڈے پر تیار کھڑا ہے آپ کو وہاں تک پہنچانے کا انتظام ہو چکا ہے آپ ابھی چلیں اسی وقت' کالی عورت نہیں صرف آپ آئیے چلیں ابھی یہ ایک آرڈر ہے۔"

سفید فام مرد کے حلق میں اب بھی کچھ پھنس رہا تھا' اس نے اسے نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ کوئی میرے ساتھ چلے۔"

سیاہ فام عورت نے امید بھری نظروں سے سفید فام مرد کی طرف دیکھا۔

سفید فام مرد نے کہا' "دو آدمی ... یا تین جن کے پاس اسلحہ ہو میری حفاظت کے لئے ان کا ساتھ جانا ضروری ہے۔" آپریٹر نے پھیکی سی "مسکراہٹ کے ساتھ کہا' ٹھیک ہے جناب آپ کے ساتھ دو اسلحہ بردار آدمی جائیں گے چلیں۔"

سیاہ فام عورت کچھ نہ سمجھ رہی تھی۔ اب بھی اس نے سفید فام مرد کا ہاتھ نرمی سے تھام رکھا تھا۔ اس نے پوچھا یہ "کیا کہہ رہا ہے؟"

"پانی۔ اس کے پاس پانی ہے اس نے پانی تلاش کر لیا ہے میں تمہارے لئے پانی لینے جا رہا ہوں دو سپاہی میرے ساتھ ہوں گے کیوں؟ مل گیا نا پانی؟ میں ابھی لایا"

سفید فام مرد کے لہجے میں اطمینان تھا۔ حیران کن اطمینان! "اوہ جان کتنا اچھا ہوا پانی مل گیا۔" سیاہ فام عورت نے کہا خوشی سے اسکی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "جان تم پانی لے آؤ گے پھر میں نہالوں گی کتنی میلی ہو گئی تھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ہر چیز ہے نا جان' جواب کیوں نہیں دیتے۔" سیاہ فام عورت کی وہ آواز جس میں پہلے خوشی کی کھنک تھی درد بھری چیخ بن گئی۔ "آیئے جناب" آپریٹر نے کہا۔ پھر اس نے اپنی مقامی زبان میں کچھ کہا جسے سن کر برآمدے میں لیٹے ہوئے دو حبشی سپاہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے کندھوں پر بندوقیں لٹکا لیں۔ سفید فام مرد نے اپنے گلے میں کسی اٹکی ہوئی چیز کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے جانا ہی پڑے گا"۔

کلمان مکراتھ / اعجاز احمد فاروقی

سبز مکھی

گاؤں کا امیر ترین آدمی اور بوڑھا کسان اب اتنا بیمار تھا کہ قریب المرگ ہو چلا تھا۔ قدرت بھی اس کے بارے میں اپنا فیصلہ کئے ہوئے تھی اور اس کو بنی نوع انسان کے لئے ایک مثال بنانے پر آمادہ تھی۔

"اس جان گال کو تو دیکھو۔ تم سب خاکی اور فانی اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تم لوگ تو کچھ بھی نہیں ہو۔ جان گال تو "حقیقتاً" کچھ اہمیت دار ہے۔ گاؤں کا جج بھی اس سے تو کبھی کبھار مصافحہ کرتا ہے۔ گاؤں کی سردار اور نوابن بھی اس سے ملنے ملانے کے لئے آتی ہے وہ تم سب میں سے امیر ترین ہے۔ اس کے باوجود میں اس کو ختم کر سکتی ہوں مجھے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ کسی بھوکے بھیڑیئے کو اذن دوں کہ وہ اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دے اور نہ ہی میں اس بات کی محتاج ہوں کہ شاہ بلوط کے کسی چھتنار درخت کو اس پر گرا کر اسے ہلاک کروں اس کام کے لئے تو ایک بہت ہی چھوٹی سی مکھی کافی ہے"

اور ہوا بھی یہی تھا کہ جان گال کے ہاتھ پر مکھی نے کاٹا اور وہ سوجنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ سے سیاہ تر اور سرخ سے سرخ تر ہوتا چلا گیا۔

گاؤں کے پادری اور قلعہ کی مالکن نے بھی اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ ڈاکٹر کو بلوائے۔

وہ تیار ہو گیا کہ کسی قاصد کو بھیج کر سرجن کو بلوائے، لیکن ان لوگوں نے اس کو آمادہ کیا کہ وہ بوڈاپسٹ کے کسی سپیشلسٹ کو تار بھجوائے۔ اس کے لئے پروفیسر برلی' کو چنا گیا۔ اس ایک بار آنے اور معائنہ کرنے کے اخراجات تین سو فلورین تھے تاہم اتنی رقم کا یہ صحیح مصرف تھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے"۔ بوڑھے کسان نے کہا "کہ ایک معمولی مکھی کے کاٹنے پر میرے تین سو فلورین خرچ ہو جائیں۔"

لیکن گاؤں کی کاؤنٹس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' یہ بھاری رقم وہ اپنی جیب سے دے گی۔ یہ چال کام کر گئی۔ جان گال بڑا مغرور اور طرم خان کسان تھا۔ تار بھیج دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اس گھوڑا بگھی میں آیا جو اس کو لینے کے لئے سٹیشن پر روانہ کی گئی تھی۔ ڈاکٹر ایک دبلا پتلا جوان تھا عینک لگاتا تھا اور کوئی بارعب آدمی نہیں تھا۔

بوڑھے جان گال کی جوان سال بیوی نے گیٹ پر ڈاکٹر کا استقبال کیا اور کہا۔

کیا آپ ہی بوڈاپسٹ کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ آیئے اور میرے شوہر کا معائنہ کریں۔ یوں تو اس کو مکھی نے کاٹا ہے لیکن وہ واویلا تو ایسے کر رہا ہے جیسے اس کو ہاتھی نے کاٹ لیا ہے۔"

لیکن یہ تو سپید جھوٹ تھا جان گال نے تو کوئی واویلا نہیں کیا تھا وہ تو بس پوچھنے پر ہی اپنی تکلیف کا ذکر کرتا تھا اور یوں بھی مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ بڑے سکون اور بے نیازی کے ساتھ بستر پر دراز' پائپ پی رہا تھا اور

بھیڑ کی کھال پر اپنا سر لٹکایا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے جناب"۔ "سنا ہے کہ آپ کو مکھی نے کاٹ لیا ہے؟"

"جی ہاں، یہی بات ہے ڈاکٹر"۔ اس نے جملہ چبا کر کہا

"اچھا! مکھی کیسی تھی"

"مکھی سبز رنگ کی تھی"

"اچھا ڈاکٹر آپ اس سے سوال جواب کریں"۔ عورت نے کہا۔ "میرے تمام کام ادھورے پڑے ہوئے ہیں اور ابھی اوون میں نو روٹیاں لگی ہوئی ہیں۔"

"اچھا، ممی، ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے غائب دماغی سے کہہ دیا۔

یہ سنتے ہی وہ تڑپ گئی جیسے کسی نے اس کو ڈس لیا ہو۔ اس نے کمر پر ہاتھ رکھے اور ڈاکٹر پر پل پڑی

"ابھی تو تیری عمر اتنی نہیں ہے کہ میرے ڈیڈی بن سکو۔"

اس نے نیم زخمی اور نیم رجھانے کے انداز میں کہا۔ اتنا کہتے ہوئے وہ واپس ہو گئی اور واپس ہوتے وقت تن کر چلی جیسے اپنی جوانی اور توانائی کا احساس کرانا چاہتی ہو۔

ڈاکٹر حیران ہو کر اس کو دیکھتا رہ گیا کہ وہ جتنی حسین و جمیل تھی اتنی ہی عشوہ طراز اور دلربا بھی تھی اور عمر میں بھی ڈاکٹر سے چھوٹی تھی اور اپنے شوہر سے تو خاصی چھوٹی تھی۔ ڈاکٹر کی معذرت سے قبل ہی وہ چلی گئی۔

"اچھا، آپ اپنا ہاتھ دکھائیں۔ کیا درد ہوتا ہے؟"۔

"جی ہاں، اچھا خاصا درد ہوتا ہے"

ڈاکٹر ہاتھ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اس کی حالت تو خاصی خراب اور تشویش ناک ہے۔ مکھی 'لازما' زہریلی تھی"

"ممکن ہے لیکن میرے خیال میں تو ایک عام سی مکھی تھی"

"نہیں، مکھی مردار خوری کے بعد آئی تھی"۔

اس خبر نے جان گال پر تو سکتہ طاری کر دیا۔

"گھبرائیے نہیں۔ میں بروقت آگیا ہوں۔ کل تک معاملہ بہت بگڑ سکتا تھا لیکن ابھی کچھ مداوا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ مر بھی جاتے"

"ڈاکٹر یہ تو عجیب بات کہی ہے، آپ نے"

"زہر خون کو بڑی تیزی کے ساتھ متاثر کرتا ہے اب ایک پل بھی ضائع کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ آپ ہمت کریں تو بازو تو کاٹنے جوگا ہو گیا ہے۔"

"ہائیں! ہائیں! کیا میرا بازو کاٹنے جوگا ہو گیا ہے؟"

جی ہاں۔ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر جان گال نے زبان تو نہیں ہلائی البتہ سر ہلاتا رہا اور پائپ پیتا رہا۔

"دیکھیے، جناب آپ کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہو گی میں آپ کو بے ہوش کر کے جراحی کروں گا اور جب آپ ہوش میں آئیں گے تو خطرے سے باہر ہوں گے ورنہ تو آپ کل چوہے کی مانند مر جائیں گے اور کوئی بھی آپ کو بچا نہیں پائے گا۔"

"بس کریں ڈاکٹر صاحب اور مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔"

جان نے یہ بات کچھ ایسے حتمی انداز میں کی جیسے وہ مزید گفتگو سے بیزار ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر کے منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ ڈاکٹر کے لئے یہ روش خطرناک اور غیر متوقع تھا۔ وہ اس کی بیوی کے پاس گیا تاکہ اس کے وسیلے اس کو رام کر سکے۔

"میرے شوہر کا کیا حال ہے؟"

"اس نے بے تمک انداز میں پوچھا اور اپنے کام میں مصروف بھی رہی۔ اس کا انداز مصروفیت اور انداز گفتگو تو ڈاکٹر کی توہین کا پہلو لئے ہوئے تھا۔

"خیال تو موصوف کا پتلا ہے۔ آپ چل کر اس کو راضی کریں کہ وہ اپنا بازو کٹوانے پر تیار ہو جائے"

"اف! خدایا! کیا یہ ناگزیر ہے کیا؟"۔ اس کا چہرہ سفید ایرن جیسا سفید پڑ گیا۔"

"جی ہاں' بالکل ناگزیر ہے ورنہ تو وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مر جائے گا۔"

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کو پکڑ کر بیمار کے کمرے میں آئی۔ بڑی تمکنت کے ساتھ کمر پر ہاتھ رکھا اور چلا کر کہا۔ "کیا میں ایسی عورت ہوں جو ایک معذور کی بیوی رہ کر خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے۔ میں تو مارے شرم کے ہی مر جاؤں گی۔ ذرا اس کا خیال تو کرو"

پھر اس نے اپنے شوہر سے کہا اور چیخ کر کہا!

"جان" اس کو ہرگز اپنا بازو مت کاٹنے دینا۔ اس کی بات نہ سنو اور نہ مانو۔"

بوڑھے زمیندار نے اس کو محبانہ انداز میں دیکھا اور کہا۔

"کریکا" گھبراؤ نہیں۔ یہاں کوئی چیر پھاڑ نہیں ہو گی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہیں مرنا چاہتا۔"

اب ڈاکٹر کے لئے یہ عبث تھا کہ وہ بوڑھے سے کچھ ظلمت مرگ اور حسین زندگی کے بارے میں کہے سنے۔ وہ مایوس و خاموش ہو گیا۔ اب اگر وہ قلعے سے کاؤنٹس کو اپنی وکالت کے لئے بلاتا یا گاؤں کے پادری اور گاؤں کے چرب زبان اور شریں بیان افراد کو بلاتا تو بھی نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات ہی رہتا ہے۔ جان گال کبھی بازو کٹوانے پر رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔ بوڑھا کسان جس طرح مرنا چاہتا تھا' بغیر تکلیف کے' بغیر تاسف کے' بغیر آنسوؤں کے' وہ اس کے چہرے اور لہجے سے عیاں ہو چکا تھا۔ موت اس کے لئے کوئی خوف اور دہشت نہیں تھی اگر اس کا وقت پورا ہو ہی گیا تھا' تو وہ جانے کے لئے ایسے ہی تیار تھا جیسے اس سے قبل اس کا باپ گیا تھا اور اس سے قبل اس کا دادا گیا تھا۔

ایک بات مطلق واضح تھی کہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے بوڑھا کسی دلیل کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹر کی باتیں' بالآخر خرانٹ بوڑھے پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اسے ڈاکٹر کے احتجاج پر رحم سا آگیا۔ اس کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر اس کے لئے غمگین اور افسردہ ہے اس نے ڈاکٹر کی دلداری کی۔

اچانک ڈاکٹر کو ایک نئی بات سوجھی کہ پیسے کسانوں کی جان ہوتے ہیں شاید اخراجات کا احساس کوئی کرامت دکھا دے۔

"دیکھئے آپ بازو کٹوائیں یا نہ کٹوائیں' تاہم آپ کو تین سو فلورین تو دینے ہی ہوں گے اور آپریشن نہ کروانا تو گویا پیسے ضائع کرنے ہوں گے۔ آپریشن تو منٹوں کا کام ہے"

"تم اپنی فیس کے لئے کوئی مرہم بھی تو تجویز کر سکتے ہو"

بوڑھے نے اس انداز سے کیا جیسے وہ ایک جوڑے جوتے کا سودا کر رہا ہو۔
ڈاکٹر دل برداشتہ ہو گیا اور کمرے سے باہر چلا گیا کہ اس معاملے پر مزید سوچ بچار کر سکے اور گاؤں کے سیانوں سے بھی مشورہ کر سکے تاہم اس کو کوئی صائب مشورہ نہیں ملا۔ اب تو گاؤں کے نوٹری یا جسٹس آف پیس کو بھی لانا بیکار ہی تھا۔ جان کی چہیتی اور چمکتی ہوئی جوان بیوی' ڈاکٹر کی ہر تجویز کو بے اثر کرنے کے لئے موجود ہی تھی اور اپنے الفاظ سے اپنے شوہر کی بازو نہ کٹوانے کی ضد کو دوبالا کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر نے تادیبی نظروں سے بھی کئی بار دیکھا اور ٹوکا
"جب لوگ باتیں کر رہے ہوں تو تم اپنی زبان بند رکھا کرو۔"
"مرغی کی یہ ہستی تو ہے کہ مرغ پر اپنا حق جتا سکے۔" اس نے اپنے بدن کو بل دیتے ہوئے پلٹ کر جواب دیا۔ جان گال نے بات بڑھ جانے کے اندیشے سے کہا۔
"کریکا' شور مت مچاؤ۔ جاؤ مہمانوں کے لئے شراب لے آؤ"
"کس پیسے سے لاؤں"
"جس پیسے سے چاہو' لے آؤ"
جان گال نے موت کے تصور کو قبول کر لیا تھا۔ اور تیار تھا اس کے پرسان حال ملاقاتی شراب پینے کے بعد رخصت ہو گئے۔
ڈاکٹر بری نے باہر صحن میں اس کوچوان کو دیکھا جو اسے بگھی میں لینے کے لئے سٹیشن پر آیا تھا۔ وہ بھاڑے کا ٹٹو' جوان تھا قوی ہیکل تھا اور ہر فن مولا تھا۔
"بگھی تیار کرو۔ میں نے آدھ گھنٹے کے بعد چل دینا ہے اور ہاں وہ لیڈی گال سے کہہ دینا کہ میں لنچ تک ٹھہر نہیں سکتا"۔ ڈاکٹر نے کوچوان سے کہا۔
دروازے کے باہر ڈاکٹر رکا اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے دروازے کی درز سے دیکھا کہ وہ جوان کوچوان' کریکا کے پاس گیا ہے۔ کریکا نے اس کو بڑے رسیلے اور مدھ بھرے انداز میں دیکھا ہے اس سے جوان کوچوان کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا ہے اس کا حوصلہ اور خود اعتمادی بڑھی ہے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ دونوں آگ سے کھیل رہے تھے' اور ان میں کوئی درپردہ مفاہمت موجود تھی۔ اب اس کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اس معاملے کی کچھ مزید تفصیلات جمع کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ شاید گاؤں میں کوئی ایسی کٹنی یا جادوگرنی ہو جسے لوگوں کے معاشقوں کا علم ہو اور وہ عشق اور عاشقی کے لئے کوئی طلسماتی مشروب دینے کا دھندہ بھی کرتی ہو' ہو سکتا ہے کہ گاؤں کے نوٹری کو اس کا علم ہو۔
اور ایسا ہی تھا۔
"ہاں' گاؤں میں ایک بوڑھی جادوگرنی ہے ایبک اس کا نام ہے۔ جان گال کے مکان سے آگے تیسرا مکان اس کا ہے"
نوٹری نے ڈاکٹر کو بتایا۔
ڈاکٹر نے بوڑھی ایبک کو دو نقرئی فلورین دیئے۔
"ممی میں ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہوں' خوار ہوں۔ میں کوئی ایسی چیز چاہتا ہوں جو اس کو میرے عشق میں گرفتار کر دے"

"اوہ! میرے لڑکے' یہ نہیں ہو سکتا۔ تم تو ایک مردہ کوا نظر آتے ہو اور عورتیں ایسے بندوں سے عشق نہیں کرتیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اسے اتنے ریشمی کپڑے دے سکتا ہوں جتنے کہ وہ چاہے اور اتنے پیسے دے سکتا ہوں کہ وہ جی بھر کر اڑائے۔"

"ایسی خاتون کون ہے؟"

"کریلکا۔ جان گال کی بیوی!"

"تم ہر گلاب توڑ سکتے ہو لیکن توڑے ہوئے گلاب نہیں توڑ سکتے"

ڈاکٹر بھی کچھ تو جاننے کے لئے بے چین تھا۔

"اور وہ دوسرا مرد کون ہے؟"

"پال ناگی کوچوان۔ لگتا ہے کہ کریلکا اس پر مرمٹی ہوئی ہے وہ میرے پاس اکثر طلسماتی مشروب کے لئے آتی ہے۔ گزشتہ برس میں نے اس کو ایک تین سالہ پرانی خاک بھی دی تھی کہ وہ اس کو مطلب براری کے لئے جان کی شراب میں ملا دے۔"

"اور کیا جان گال کو بھی کہیں کوئی شک ہے؟"

وہ کتنا ہی سمارٹ اور ہوشیار کیوں نہ ہو نسوانی چلتر اسے چت کر دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر پلٹ کر جان گال کی طرف گیا اور دیکھا کہ وہ جوڑا ابھی تک باتوں میں محو ہے۔ جب کوچوان نے گھوڑوں کی پیٹھ سہلائی اور تھپتھپائی کہ اب وہ ڈاکٹر کو سٹیشن پہنچانے کے لئے تیار ہی تھے تو کریلکا نے اپنے سینے میں ہاتھ ڈالا اور تین سو فلورین کے نوٹ نکال کر اس کو دیئے۔

"آپ کی تکلیف کا اعزازیہ"۔ کریلکا نے فیس دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ اس کا انحصار آپ کے ضمیر پر ہے۔ میں تو اے حسینہ' اس کا مستحق نہیں ہوں"

"میری روح اس کو برداشت کرے گی۔ آپ غم نہ کریں"۔

"ٹھیک ہے۔ میرا بیگ بگھی میں رکھوائیں۔ میں آپ کے شوہر کو الوداع کہہ کر آتا ہوں۔"

جان گال' وہیں کا وہیں اور ویسے کا ویسے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا پائپ بجھ گیا تھا اور آنکھیں مندی ہوئی تھیں وہ اونگھ رہا تھا جیسے ہی دروازہ کھلا تو اس نے مرغ کی طرح ایک آنکھ کھولی۔

"گال' میں الوداع کہنے کے لئے آیا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"تو کیا تم جا رہے ہو؟"

"اب میرا یہاں کوئی مصرف نہیں ہے"

"کیا اس عورت نے تمہاری فیس دے دی ہے؟"

"ہاں۔ گال تمہاری بیوی بڑی حسین ہے دلکش اور دلربا بھی ہے"

مریض نے اب اپنی دوسری آنکھ بھی کھولی' اور اپنے تندرست ہاتھ سے مصافحہ کیا اور اتنا ہی کہا۔

"ہاں وہ ایسی ہی ہے"

"اس کے ہونٹ تو شاہ دانوں جیسے رسیلے ہیں"

"ہاں' وہ ایسے ہی ہیں" جان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے کہنے دو کہ وہ لفنگا پال' اب خوب موج میلہ کرے گا' کریکا کے ساتھ۔"
یہ سننا تھا کہ جان کا سارا وجود لرزنے لگا اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔
"ڈاکٹر' ڈاکٹر' آپ نے یہ کیا کہا ہے؟"
ڈاکٹر خاموش ہو گیا وہ ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جو اس کو کہنی نہیں چاہیے تھی۔
"فضول باتیں! یہ میرا درد سر نہیں ہے لوگوں کی اپنی آنکھیں ہیں' دماغ ہیں وہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں' سمجھ سکتے ہیں' مجھے تو اس پر اسی گھڑی شک ہو گیا تھا جب اس نے مجھے بازو کاٹنے سے روک دیا تھا۔ کیا جان' آپ کو شک نہیں گزرا۔ لیکن اب تو ساری بات سمجھ گیا ہوں' سب کچھ ہی سمجھ گیا ہوں۔"
جان گال نے اپنی دونوں کلائیاں مروڑنی شروع کیں اور یہ بھول گیا کہ ان میں سے ایک تو سوجی ہوئی ہے وہ درد سے چلانے لگا۔
"اف! اف! میرا بازو! ہائے میں مرا' ہائے میرا بازو۔ ڈاکٹر اب ایک لفظ بھی مت کہنا۔"
"ایک لفظ بھی؟" ڈاکٹر نے کہا۔
مریض کے سینے میں شدید تلخی پھیل گی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے ڈاکٹر کا بازو تھام لیا۔
"ڈاکٹر' یہ پال کون ہے' آپ کا اشارہ کس پال کی طرف ہے؟" "وہ ہے کون؟"
"کیا آپ نہیں جانتے اور کچھ نہیں جانتے' وہ پال ناگی ہے' اجرت پر لیا ہوا کوچوان۔"
کسان کا چہرہ سفید پڑ گیا اس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور خون دل میں جمع ہونے لگا۔ اب اس کا ہاتھ اس کو تکلیف نہیں دے رہا تھا اس نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔
"اف میں کتنا مورکھ تھا --- کتنا بھوندو تھا۔ مجھے تو یہ بات بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اف! وہ کمینی عورت! ناگن! ایک ناگن نے عورت کا روپ دھار لیا ہے"
"گال' اس عورت کو لعن طعن کرنے کی کوئی تک نہیں ہے۔ وہ جوان ہے صحت اور زندگی سے سرشار ہے۔ ممکن ہے وہ ابھی تک پاک دامن ہی ہو لیکن جب تم زندہ نہیں ہو گے تو اس کو لامحالہ شادی تو کرنا پڑے گی اور آپ تو مرنے ہی والے ہیں۔"
بوڑھا کسان' بمشکل ہلا اور اپنا رخ ڈاکٹر کی جانب کیا۔
اور ڈاکٹر تھا کہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔
"اگر تمہاری موت کے بعد وہ کسی جوان سے بیاہ کر لیتی ہے تو اس سے تمہارا کیا بگڑتا ہے' موت کے بعد ان باتوں سے تمہارا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ تم تو زمین تلے ہو گے' علاوہ ازیں تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک خوبرو جوان اس کا شوہر ہو گا' خوبرو' پال ناگی۔" بوڑھا اپنے دانت کچکچا رہا تھا۔
"گال تمہیں حریص نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا حسین اور تنومند جسم تو جھیوں کے بغیر ضائع ہو جائے گا۔ پال ناگی احمق نہیں ہے وہ اس جیسی عورت کو چکھے بغیر نہیں جانے دے گا۔ علاوہ ازیں وہ تمہاری کل دولت اور زمین کی مالکن بھی ہو گی۔ وہ جوان عورت بھی جینا چاہے گی۔ تم تینوں میں الو کا پٹھا ایک ہی ہے اور وہ جان گال ہے۔"
بوڑھا کسان غرایا اس کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اس کے سینے میں جمع شدہ تلخی اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ وہ پھٹ کر بہنے پر آ گئی تھی۔
"گال اسے ایک ہاتھ سے قابو رکھنا تو اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ دونوں ہی بازو نہ ہوں"

بوڑھے کے لئے یہ بہت زیادہ تھا اس کی قوت برداشت جاتی رہی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنا سوجا ہوا ہاتھ ڈاکٹر کی جانب بڑھایا اور بے اختیار چلا کر کہا:

ڈاکٹر اٹھاؤ چاقو' چلاؤ چاقو۔"

آرمونیا سومرز / محمود احمد قاضی

پاگل پن

جب لورینزہ لمپینو کی گولیوں سے چھید چھید ہو کر گرا (جیسے کہ آپ کو پہلے سے معلوم ہے کہ لورینزو مرکادو کا جوؤں سے لتھڑا وہ آوارہ گرد تھا جو کہ ابھی ابھی ایک چھوٹے سے کتے لانوودو سے رے بیز کا شکار ہوا تھا جو اس کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ اور جو خود بھی ایک آوارہ گرد تھا) تو ایک ہی جیسے معمولات میں قید رہنے والی سہ پہر میں اپنی نوعیت کی پہلی تبدیلی واقع ہوئی۔

اول -- باردانے کے ڈبوں سے جہاں سے بھگوڑا لورینزو اپنے مارنے والوں کو اپنے ناخنوں ' اپنی رال اور دانتوں سے ڈراتا تھا اپنے مکین کو کھودیا تھا اور دوم --- لورینزو جو چند لمحے پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ایک پرجوش جنگ لڑ رہا تھا گولیوں کی قوت کی شدت سے مغلوب ہو کر میٹھے کی رسیا مکھیوں سے اٹے گلے سڑے کیلوں کے انبار پر الٹ کر گر پڑا تھا۔

لمپینو نے ٹرک میں واپس آکر اپنے باضابطہ ہتھیار کو ایک طرف رکھتے ہوئے ڈرائیور کی طرف دیکھا جو اس انہونے واقعے پر ابھی تک اپنی آنکھیں مل رہا تھا "یہ مزید کسی خطرے سے بچنے کے لئے بالکل صحیح طور پر ذاتی تحفظ کا معاملہ تھا۔ سب نے اسے چلا کر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ ' اگر میں نے اسے چھونے کی کوشش کی تو وہ مجھے کاٹ لے گا اور اس طرح قانون کے تحت مجھے اسے بغیر کسی تامل کے گولی مار دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تو اس طرح یہ ایک مشن کی تکمیل تھی وغیرہ وغیرہ۔"

"مشن کی تکمیل" .... ڈرائیو نے اپنے خوف کو پرے بھگاتے ہوئے ٹرک کو گندے بازار کی طرف دوڑایا۔ مشترکہ نوعیت کے کام میں ایک ساتھ شامل ان دونوں کے دل ایک مشترکہ جواز کے تحت دھڑک رہے تھے۔

"ہاں پاگل پن --' تمہیں اپنا بدلہ لینے کی خاطر دوسروں کے پاگل پن کو ختم کرنا ہوتا ہے' ایک بے مصرف زندگی اور کم اجرتوں کا پاگل پن"

"بہت سے بچوں اور معمولی سی محبت کا پاگل پن"

"کسی ایک بھی سمندری سفر کے بغیر بہت سے جہازوں کا پاگل پن"

"لیکن ہاں ' ایسا پاگل پن جیسا کہ مرکادو کے آوارہ گرد کا ہے"

"ایک ایسا پاگل پن جو فورا" ہی بھڑک اٹھتا ہے"

" ایسا پاگل پن نہیں جو چھوٹے چھوٹے شعلوں کی مانند فورا" ختم ہو جائے' بلکہ کافی دیر تک بھڑکتے رہنے والے ایک بڑے شعلے کی طرح کا پاگل پن"

لیکن خوش قسمتی سے ایسے تمام خیالات کا اظہار نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔۔۔ وہ راستے کے مناظر' بازار کے

موڑوں پر چیختی ہوئی بریکوں، اگلی بڑی فٹ بال گیم کی منادی کرتے دیواری اشتہاروں کے ذریعے، اپنی بدلتی سوچ کی آگاہی کے درمیان اپنے خیالات کے جال میں الجھے رہے۔ صرف لورنیزو ہی اپنے کیلوں اور مکھیوں کے ساتھ اس وقت کی واحد حقیقت تھا ایک واضح حقیقت! اور لانودو کی طرف سے لائی گئی آفت بھی ایک حقیقت تھی جو ہجوم کی طرف ایک ایسے پاگل ہرکارے کی مانند بھاگا تھا جس کے دانتوں میں ہلاکت خیز پیغام دبا ہو۔ اور وقوعے کی جگہ سے منتشر ہونے والا ہجوم! جس وقت وہ شخص اپنے انجام کو پہنچ گیا تو مرکادو کے چھابڑی فروش اور دوسرے وہ لوگ جو کسی ایسی چیز کو دیکھنے کے لیے رک گئے تھے جو تھوڑی دیر کے لئے فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیتی ہے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ وقت نہایت سنگدلی سے دبے پاؤں چلتا گیا اور وقت کے غلام اس کے پہیے کو آگے کی طرف دھکیلنے پر مجبور تھے۔

لورنیزو وہاں پڑا کسی مرے ہوئے کتے کی طرح وہاں سے اٹھائے جانے کا منتظر تھا۔ اس کے اردگرد کالانودو کی آنکھوں کی طرح کا نیلا ماحول ان کے خون کی طرح سرخ ہونے سے پہلے ہی منجمد ہونے لگا۔

"کیا تم جانتے ہو۔۔۔ میں آلیجو ہوں۔۔۔ لورنیزو کا دوست۔۔۔۔۔۔"

مرے ہوئے آدمی کے ساتھی نے لاش پر سے نظریں ہٹائیں اور اس چھوٹے سے ڈرے ہوئے سنہری بالوں والے لڑکے کی طرف دیکھا، اس کو نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت کی طرح تھا۔ وہ ایک مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ اس نے لاش کی حفاظت کرنے والے کو پریشان سا کر دیا۔ وہ شخص جو ایمبولینس کے آنے تک اس مرے ہوئے آدمی کی دیکھ بھال پر مامور کیا گیا تھا اس نے محسوس کیا کہ اس سات سالہ نیلی آنکھوں اور بھاری آواز والے لڑکے اور اس کے درمیان جس نے سوالات کرنے شروع کردیئے تھے اور جو خود اپنے ہی جوابات میں ہچکولے لے رہا تھا کوئی ذہنی ہم آہنگی موجود نہ تھی۔

"میں آلیجو ہوں" وہ بولا "لورنیزو کا دوست۔۔۔ میری ماں نہیں چاہتی تھی کہ میں......

"جوؤں کی وجہ سے۔۔۔ ہے نا؟"

"کیونکہ وہ سمندری ڈاکوؤں کے جہازوں پر سفر کرتا تھا۔۔۔"

"کیونکہ وہ ہروقت شراب کے نشے مین دھت رہتا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"وہ ماؤتھ آرگن بھی بجاتا تھا"

"اور کیونکہ اس حرامزادے ست الوجود نے کبھی کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا۔۔ ہے نا!"

"اردگرد کے سارے کتے اس سے محبت کرتے تھے...."

محبت کرنے کے حوصلے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کے اتنے مختلف خیالات کے درمیان اچانک ہی شاید ایک عجیب نقطہ اتصال کی وجہ سے یوں محسوس ہوا کہ زمین پر گرا ہوا شخص اپنے ناقابل یقین حد تک سفید دانتوں کو عیاں کرتا ہوا آخری بار مسکرایا ہو۔ تب لاش کی دیکھ بھال پر مامور شخص نے بغیر کسی معقول وجہ کے اپنے چہرے کے نہایت سنجیدہ تاثرات تبدیل کرتے ہوئے نفرت سے مردا جسم کو ٹھوکر مار دی۔ وہ شخص لورنیزو کے ساتھ اپنی نفرت کی وجہ نہیں بتا سکتا تھا وہ لورنیزو جس نے گمنام لانودو کی وجہ سے مرنے کے بعد کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ تب بے ہنگم خیالات کی دھند سے باہر آتے ہوئے اس نے آلیجو کی آواز سنی'

"اور اس کے دانت بہت خوبصورت تھے"

مائخلو اشار ٹسکی / ستار طاہر

تھانیدار

موہیلوف پوڈیسکی قصبے سے کچھ فاصلے پر کونستبکو یلنٹ نام کا ایک گاؤں آباد ہے۔ جیسے کہ ایک گاؤں کے لئے مناسب ہوتا ہے' وہاں ایک چھوٹی سی سرائے بھی موجود ہے۔ یہ سرائے ایک بخیل یہودی شمول کی ملکیت ہے اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ سرائے ہی نہیں چلاتا بلکہ غریب' دیہاتیوں کی معمولی معمولی اشیاء کو گروی بھی رکھتا ہے۔ غریب دیہاتی کپڑوں اور برتنوں کو گروی رکھ کر واڈکا خریدتے ہیں۔ ان کسانوں کے پاس اتنے نقد پیسے بھی نہیں ہوتے کہ وہ قرض یا گروی رکھے بغیر ہمیشہ واڈکا سے لطف اندوز ہو سکیں۔

فروری کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب ایک معمر مسافر اس سرائے میں آیا۔ اس نے آدھی بوتل شراب کا آرڈر دیا۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ ایک کسان دکھائی دیتا تھا۔ شراب لے کر وہ ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے روٹی اور سمندری مچھلی نکالی اور شام کے کھانے کا لطف اٹھانے لگا۔ اس وقت شمول اور اس مسافر کے علاوہ دو مقامی دیہاتی موجود تھے۔ شمول ان دیہاتیوں کو باہر کا دروازہ دکھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ شراب پر خرچ کر چکے تھے۔ اور اب ادھار شراب پر اصرار کر رہے تھے۔ ان کے پاس گروی رکھنے کے لئے بھی کچھ نہیں تھا۔ اس لئے شمول نے انہیں بڑی درشتی سے اطلاع دی کہ شراب ختم ہو چکی ہے۔ جونہی وہ دیہاتی مایوس ہو کر سرائے سے باہر جانے لگے ایک عجیب حادثہ ہوا۔ مسافر نے جانے شراب کا گھونٹ کیسے پیا کہ اسے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی شدت اختیار کر گئی اور وہ لڑھک کر فرش پر جا گرا۔ شمول چیخ اٹھا۔ چیخ سن کر اس کی بیوی سنورا بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ انہوں نے اس بدقسمت مسافر کو ہوش میں لانے کے لئے کئی جتن کئے۔ اس کے سر پر ٹھنڈا پانی پھینکا۔ لیکن بے کار' معمر مسافر مر چکا تھا۔ دہشت زدہ شمول نے بھاگ کر باہر جاتے ہوئے دیہاتیوں کو روکا کیونکہ وہی لوگ یہ گواہی دے سکتے تھے کہ مسافر کی موت میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ شمول بہت خوفزدہ تھا۔ گاؤں کا نمبردار ضلع کی پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میڈیکل آفیسر اور سب سے بڑھ کر تھانیدار' اس موت کی تفتیش کرتے ہوئے اسے برباد کر سکتے تھے۔ وہ اس تباہی کے تصور سے ہی لرز رہا تھا' تھانے دار کا خیال تو اس کی روح کو بھی خوفزدہ کر رہا تھا کہ کہیں یہ ثابت ہو گیا کہ مسافر زہر خورانی سے مرا ہے تو.... ہاں وہ اس پر الزام بھی لگا سکتے تھے کہ شمول نے اس کی نقدی اور قیمتی چیزیں چرانے کے لئے اسے زہر..... نہیں نہیں ....وہ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا' وہ پھر بھی مجھے برباد کر دیں گے۔ گاؤں کے لوگ جنہیں میں ادھار نہیں دیتا میرے خلاف گواہی دیں گے۔ میرا تو خاتمہ ہو جائے گا۔

وہ دیہاتی جو شراب نہ ملنے پر مایوس اٹھے تھے۔ انہیں سرائے میں واپس لا کر شمول نے اپنی بدقسمتی کی روداد بڑے سوز سے سنائی۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے حق میں گواہی دیں۔ اس نے انہیں لالچ دیا کہ وہ جتنی واڈکا پینا چاہیں گے وہ انہیں فراہم کرے گا۔ ادھار پر نہیں بلکہ مفت اس فیاضانہ اور حیران کن پیش کش کے

بعد دیہاتیوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ جس پر بھاری پتھر رکھتے ہوئے ان کے سامنے شراب رکھ کر شمول گاؤں کے پولیس کے سپاہی کو اس حادثے کی اطلاع دینے کے لئے بھاگا۔

صبح ہونے تک پورا گاؤں سرائے میں نامعلوم مسافر کی موت کے واقعہ سے باخبر ہو چکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار نے ضلع کے حکام کو اطلاع دی' سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میڈیکل آفیسر کے نام حکم جاری کیا۔ جب یہ ساری کارروائی مکمل ہو رہی تھی تو بدقسمت مرنے والے کی لاش سرائے کے ہال میں جیسی پڑی تھی پڑی رہی۔ بہت سے متجسس کون' کیا' کیوں اور کیسے کی تفصیلات جاننے کے لئے آجا رہے تھے۔ شمول ہر شخص کی تواضع شراب سے کر رہا تھا۔ سب کو بتا رہا تھا کہ کس طرح اجنبی مسافر کی اچانک موت ہوئی۔ شدید اذیت میں مبتلا شمول نے کہا۔

"جس طرح تیل پانی کی سطح پر نمودار ہو جاتا ہے اسی طرح سچائی بھی سامنے آجائے گی۔"

تاہم دیہاتیوں کی اکثریت کہتی تھی کہ کمینہ اور بخیل شمول مصیبت سے دوچار ہوا۔ بالآخر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور میڈیکل آفیسر تشریف لائے۔ اس وقت متوفی کی لاش خاصی مسخ ہو چکی تھی۔ ان حکام بالا نے سرسری تفتیش کی لاش کا معائنہ کیا اور فیصلہ سنا دیا کہ متوفی کی لاش کی باقاعدہ مذہبی رسوم کے ساتھ تکفین اور تدفین کی جائے۔ تمام امور کی نگرانی کی ذمہ داری علاقے کے تھانیدار کو تفویض کی گئی۔ ان احکامات کو صادر کرنے کے بعد حکام بالا عجلت میں اس گاؤں سے رخصت ہو گئے۔ اس ساری کارروائی کے درمیان شمول جیتا مرتا رہا۔ ابھی اسے سب سے بڑی مصیبت اور بدقسمتی تھانیدار کا سامنا کرنا تھا۔

رات کے وقت تھانیدار بھی آگیا۔ وہ ناخوش اور منغض دکھائی دے رہا تھا۔ منڈی سے اسے ایک آڑھتی عورت سے نذرانہ وصول کرنے جانا تھا کہ اسے فی الفور گاؤں پہنچنے کا حکم دے دیا گیا اب وہ اپنے اس نقصان کو مع منافع کے وصول کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ تھانیدار نے نئے سرے سے پوچھ گچھ اور تفتیش کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی تو شمول نے بڑی فدویانہ لجاجت سے اسے مطلع کیا کہ حکام بالا تفتیش کر چکے ہیں۔ میڈیکل افسر سرٹیفکیٹ جاری کر چکا ہے کہ موت اتفاقی اور طبعی تھی۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ تھانے دار نے گاؤں کے نمبردار کو بلوا کر اس دن کا آخری حکم یوں صادر کیا کہ "کل تکفین و تدفین کا ممکنہ انتظام کیا جائے۔ متوفی پرسوں دفن کیا جائے گا"۔ اس حکم کے بعد وہ سو گیا اور سونے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ کل اس شمول سے اچھی طرح نمٹے گا۔

صبح تھانیدار بیدار ہوا تو وہ ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا۔ شمول تھانیدار کی اس بشاشت سے کانپ گیا۔ تھانیدار نے اسے آواز دی....

"شمول لاش کے پاس جاؤ اسے سرائے سے باہر پہنچانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ وہ تمہاری سرائے میں مرا تھا۔"

شمول ہال کی طرف بڑھا۔ اچانک اس کے قدم رک گئے۔ لاش سے ناقابل برداشت بو آرہی تھی۔

"رک کیوں گئے۔ آگے بڑھو' لاش کے پاس جاؤ۔ جلدی" تھانیدار چیختا ہوا اٹھا اور کمرے کی دہلیز تک پہنچ گیا۔ سامنے ہال میں لاش پڑی تھی۔ شدید بو اور ناقابل برداشت عفونت کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ تھانیدار نے شمول کو دھکا دیا۔ لاش کو ایک چٹائی سے ڈھانپا ہوا تھا۔

"چٹائی اٹھاؤ" تھانیدار نے حکم دیا۔

شمول کے لئے وہاں ایک لمحہ کھڑا ہونا بھی ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے لاش سے

چٹائی ہٹانے کی کوشش کی' چٹائی کے سرکتے ہی بو کا ایک ایسا بھبکا آیا کہ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے ناک کو انگلیوں سے دبایا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا کر رہے ہو' چلو آگے بڑھو اور لاش کا بغور معائنہ کرو۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لاش کا کوئی عضو یا حصہ غائب تو نہیں کر دیا گیا۔"

"سرکار مجھے معاف کر دیجئے' میں لاش کے پاس نہیں جا سکتا!"

اب تک پولیس کے کچھ سپاہی وہاں جا پہنچے تھے۔

"کیا کہا' مجھ سے بحث کرتے ہو۔ جانتے نہیں حکام بالا نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ سپاہیو! اسے پکڑ کر لاش کے قریب لے جاؤ۔ ہمیں بغور معائنہ کرنا ہو گا کہ لاش صحیح سلامت ہے یا اس کا کوئی عضو غائب کر دیا گیا ہے۔"

"جناب' حضور سرکار جناب مجھ پر رحم فرمائیں میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ لاش سے بہت بو..."

"ادھر آؤ۔ میرے پاس۔"

شمول تھانیدار کے پاس آیا تو تھانیدار نے کہا۔

"لاش کی تدفین سے پہلے مجھے کارروائی مکمل کرنی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ سب کچھ ہاں پوسٹمارٹم کے بعد جو ٹانکے لگائے گئے تھے وہ تم کھولو گے میں معائنہ کروں گا۔ متوفی کے پیٹ سے آنتیں تو غائب نہیں کر دی گئیں۔ ہاں سمجھے موت تمہاری سرائے میں ہوئی۔ لاش یہیں پڑی رہی میں اپنا فرض پوری ذمہ داری سے ادا کروں گا.....

"سمجھے میں تم جیسے کمینے مخبروں کو خوب پہچانتا ہوں جو بعد میں حکام بالا سے شکایت لگاتے ہیں کہ افسر انچارج نے کوتاہی برتی تھی' سپاہیو اسے گھسیٹ کر لاش کے پاس لے جاؤ۔" شمول خوف سے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایسی ہی حالت میں اس نے ایک فیصلہ کیا اور بڑی لجاجت سے بولا۔

"حضور سرکار ذرا ایک طرف آیئے میں آپ کو بتاتا ہوں بڑی اہم بات"۔ "سپاہیو تم ذرا پرے ہٹ جاؤ میں بھی تو سنوں یہ مجھے کون سی اہم بات بتانا چاہتا ہے" تھانیدار نے حکم دیا۔

سپاہی کچھ دور ہٹ گئے۔

"سرکار مجھ پر رحم کریں۔ یہ ایک روبل نذر کرتا ہوں میرے پاس یہی ایک روبل ہے ساری شراب مفت خور دساتی پی گئے سرکار' جو کچھ بچا تھا وہ حکام بالا کی تواضع پر اٹھ گیا سرکار اسے قبول کریں۔"

"ایک روبل.... مذاق کر رہے ہو۔" تھانے دار نے جھاڑ پلائی۔

"حضور سرکار مجھے برباد نہ کریں میں غریب ..... آپ......"

"بکواس نہ کرو جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو۔ حکم عدولی کی تو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

شمول اس کے قدموں میں بیٹھ گیا' اس کا سارا وجود جھول رہا تھا۔

"حضور' سرکار تین روبل' تین روبل......"

تھانیدار نے تین روبل کا نذرانہ قبول کیا۔ پاؤں مار کر شمول کو گراتے ہوئے سپاہیوں کی طرف چل دیا' وہ دل میں کہہ رہا تھا "اگر تم سمجھتے ہو کہ تین روبل دے کر تم نے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے تو تم نرے احمق ہو۔"

تھانیدار چند منٹ سپاہیوں کے پاس کھڑا رہا۔ شمول بھی اس کے قریب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اچانک تھانیدار تیزی سے لاش کی طرف لپکا مگر لاش سے کچھ فاصلہ پر رک کر برسنے لگا۔ "کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ لاش کو چھیڑا اور ہلایا گیا ہے' لاش کی بے حرمتی سنگین جرم ہے۔ گاؤں کے نمبردار کو بلاؤ۔ یوں لگتا ہے جیسے لاش کے پیٹ سے آنتیں نکال لی گئیں ہیں۔ سنو سپاہی' لاش کسی صندوق میں بند کر کے مہر کر دو۔ لاش کا دوبارہ معائنہ کروایا جائے' اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ میں تمام قانونی تقاضے پورے کروں گا۔"

شمول جو زندہ تھا زیادہ مردہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جان گیا کہ اب اسے مزید نذرانہ پیش کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ پھر لڑکھڑانے لگا۔

"حضور سرکار آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں تو بہت نادار ہوں۔ میری بیوی بچے ہیں' میرے پاس اب کچھ نہیں جو پیش کر سکوں۔ ستورا میری بدنصیب بیوی رحم دل آقا کو بتاؤ کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ان سے درخواست کرو کہ ہم پر رحم فرمائیں۔"

ستورا۔ آواز سن کر جلدی سے آئی۔ شمول سسکیاں بھر رہا تھا۔ آنسوؤں کو اپنے کوٹ کی آستینوں سے پونچھتا رہا تھا۔ ستورا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح تھانیدار کا ہاتھ پکڑ کر اسے بوسہ دے سکے لیکن تھانیدار نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ آنسو پونچھتے ہوئے شمول یکدم چیخ اٹھا۔

"آقا..... میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ آپ میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ گاؤں میں اور مکان بھی تو ہیں ان میں سے کئی ایسے ہیں جو اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے ہیں حضور میں بہت غریب ہوں۔"

تھانیدار کو شمول کا مشورہ بہت اچھا لگا۔ ہاں یہ قابل عمل تھا... فائدہ بخش' "اچھا.... تین روبل اور دو..... اور تم جہنم میں جاؤ..... میں تم پر ترس کھا رہا ہوں تین روبل اور ...... مجھے"

شمول کو حکم کی تعمیل کرنی ہی پڑی..... ادھر تھانیدار نے دل میں ترکیب سوچ لی تھی ایک نادر خیال..... متوفی کی لاش کی میزبانی کا فریضہ تمام گاؤں کو ادا کرنا چاہیے۔

تھانیدار نے ریڑھی لانے کا حکم دیا۔ شمول اپنی بدقسمتی اور بربادی پر آنسو بہاتا ہوا خوش بھی ہو رہا تھا کہ بلا اس کے سر سے ٹل رہی ہے۔ لاش کو ریڑھی پر لاد کر چٹائی پھر اس کے اوپر ڈال دی گئی۔ تھانیدار نے دو سپاہیوں کو ریڑھی دھکیلنے کا حکم دیا یوں ایک انوکھا چھوٹا سا جلوس گلی میں نمودار ہوا۔ تھانیدار سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ریڑھی اور اسے کھینچنے والے دو سپاہی اور ان کے پیچھے کچھ اور سپاہی۔ گلی میں پہلا جو گھر سامنے آیا اس کے سامنے ریڑھی روکنے کا حکم دے کر تھانیدار گھر کے دروازے کے باہر بیٹھی آٹھ برس کی بچی کی طرف بڑھا۔ اس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا۔ لڑکی نے اپنی ماں کا پرانا بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہن رکھا تھا اور مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

"کیا تمہاری ماں یا باپ اندر ہیں؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"ابا کام سے گیا ہے۔ اماں بیمار ہے۔" لڑکی نے خوف سے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ تھانیدار نے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔

"ریڑھی سے متوفی کی لاش اٹھاؤ۔ دروازہ کھولو اور لاش اندر لے چلو۔"

خوف سے کانپتی بچی گود میں شیر خوار بچے کو اٹھاتی گھر کی طرف بھاگی۔ اندر بیمار عورت سنتے ہی بستر سے اٹھی۔ ایک پھٹا پرانا کوٹ کندھوں پر ڈالا اور کانپتی لرزتی' باہر کی طرف لپکی' پہلی نگاہ میں اس نے کچھ دیکھا اس

سے وہ حیران و ششدر ہو گئی۔ سپاہی دروازے کے پاس کھڑے چٹائی پر ایک مسخ' بدبو دار لاش لئے چیخ رہے تھے کہ وہ دروازے سے ہٹ جائے تاکہ لاش کو اندر لے جایا جا سکے۔

بیمار عورت بین کرنے لگی۔

"حضور آقا یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہو رہا ہے میں بیمار ہوں۔ اپنے بچوں کے ساتھ گھر میں اکیلی ہوں۔ رحم..... رحم۔"

"عورت" تھانیدار بولا "میں سب کی ذمہ داریاں ایک پر نہیں ڈال سکتا۔ اور ہاں یہ انسان ہے جانور نہیں..... یہ ایک مسیحی بھائی کی لاش ہے۔ کیا اس کی تدفین سے پہلے اس کی بے حرمتی کی جائے گی۔ کیا میں ایک عیسائی دیندار بھائی کی لاش جانوروں کے باڑے میں پھینک دوں۔ اس لاش کو پورے احترام کے ساتھ میز پر لٹانا ضروری ہے نا....."

"سرکار..... یہ لاش... بو..... سرکار ہمارا دوسرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مجھے اپنے بچوں کے ساتھ گھر میں رہنے دیں۔ خدا مجھے معاف کرے کیسی بو آ رہی ہے۔"

"احمق عورت میں مردے کی بے حرمتی کر کے گنہگار نہیں بن سکتا۔ میں جہنم میں کیوں جاؤں۔ ہٹو راستہ دو۔"

عورت تھانیدار کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"میرے آقا ایسا نہ کیجئے رحم..... گھر بو سے بھر جائے گا' ہم..... حضور میں بیمار ہوں پھر اتنی سردی..... میرے بچے ٹھٹھر رہے ہیں آپ اس لاش کو لے جائیں..... اس عنایت کے صلے میں..... جو کچھ میرے پاس ہے پیش کر دیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے تین روبل دو اور اپنا چھٹکارہ کر لو...... تین روبل سنا۔"

"حضور میں غریب تین روبل کہاں سے لاؤں' حضور ہمارے چہرے دیکھئے مفلسی نے انہیں ہمیشہ کے لئے داغدار کر ڈالا ہے۔ اس غریب گھر میں تین روبل کہاں؟"

"نہیں ہیں تو نہ سہی سپاہیو لاش اندر لے چلو..... آگے سے ہٹ جاؤ تدفین تک لاش اسی گھر میں رہے گی"

"سرکار' آپ بے شک میرے اور میرے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ میں تین روبل نہیں دے سکتی۔"

"ٹھیک ہے سپاہیو کیا دیکھ رہے ہو لاش اندر لاؤ۔"

"رک جاؤ" کہہ کر عورت تیزی سے ایک زنگ آلود ٹرنک کی طرف لپکی۔ کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا۔ ایک چھوٹی سی بدنما تھیلی نکال کر میز پر پھینک دی۔

"جو کچھ ہے یہی ہے۔ بے بسی اور لاچاری' بیماری اور تذلیل سے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی تھی۔

تھانیدار نے تھیلی میز پر الٹ دی۔ چھوٹے سکے۔ گنتی ہوئی کل کوپک تھے ایک لمحے کے لئے وہ ہچکچایا کہ ان سکوں کو لوٹا دے یا' دوسرے لمحے اس نے وہ سکے اپنی جیب میں ڈال کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

"لاش کو ریڑھی پر لٹا دو۔"

ایک عجیب سی خفت ندامت اور پریشانی تھانیدار کو ہو رہی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے عورت کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے ان پیسوں کی ضرورت ہے۔ نہیں ...... متوفی کو ان کی ضرورت ہے اسے کفن کون پہنائے گا کون اس کے لئے تابوت دے گا اور کون بغیر پیسوں کے اس کی قبر کو کھودے گا۔ سنا اسے ایک عیسائی کی طرح کفنایا اور دفنایا جانا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔"
ایسے جواز اور دلیلیں تراشنے کے باوجود خود اس کی اپنی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔
عورت مہر بہ لب کھڑی رہی۔ اس کے بچے اس کے ساتھ چمٹے سسک رہے تھے۔ ریڑھی پھر گلی میں دھکیلی جانے لگی۔ تھانے دار پھر آگے آگے چل رہا تھا۔ دوسرے گھر کے سامنے وہ رکا۔ ریڑھی روک دی گئی۔ تھانیدار گھر کے اندر داخل ہوا۔ کھڑکی کے پاس اسٹول پر بیٹھا ایک بڈھا ایک جوتے کو گانٹھ رہا تھا۔
"سلام بڑے میاں۔"
"سلام" بوڑھے نے جواب دیا۔ پھر اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھے جو ایسے لوگوں کی عادت اور مجبوری ہوتی ہے جن کی بینائی کمزور ہو۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کا مہمان کون ہے۔
"بڑے بھائی" تھانیدار نے القاب بدلا "اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ اپنی بڑی میز ادھر لے آؤ' میں اس پر ایک متوفی کی لاش لٹاؤں گا۔ جب اس کی تدفین کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے تو۔"
بوڑھے نے پریشان لہجے میں پوچھا۔
"آپ کس لاش کا ذکر کر رہے ہیں جناب...."
آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ تھانے دار کے قریب پہنچا' اپنی چھوٹی نیم وا آنکھوں سے بغور دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اپنے مہمان کو پہچان گیا تھا۔
"وہی شخص جو سرائے میں مر گیا تھا۔"
"حضور مجھ پر رحم فرمائیں لاش کو سرائے ہی میں رہنے دیں۔ سنا ہے اس سے اتنی بو آ رہی ہے کہ اس کے قریب جانا ممکن نہیں۔" "اسی لئے تو میں لاش تمہارے دروازے تک لے آیا ہوں" تھانیدار نے دلیل دی "تم اکیلے رہتے ہو۔ بال بچے والے گھر میں تو ایسی لاش رکھی نہیں جا سکتی۔ تم یہ زحمت آسانی سے برداشت کر سکتے ہو۔ مرنے والا عیسائی تھا اس کا تم پر حق بنتا ہے۔"
"حضور مجھے تو معاف کیجئے۔ یہ تو دھاندلی ہے صریحا" دھاندلی۔ میں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ کسی سے زیادتی نہیں کی پھر مجھ پر یہ ظلم کیوں؟"
"ظلم دھاندلی! کیا بک رہے ہو۔ بڑے میاں تم عیسائی ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میرا تو اس گاؤں میں گھر ہی نہیں ورنہ میں اپنے گھر لے جاتا۔ تم کہو میں لاش کہاں پھینک دوں۔"
"سرکار اب تک لاش دفنا دینی چاہیے تھی" بوڑھے نے کہا۔
"تم مشورہ دیتے ہو مجھے.... خوب سیاہیو لاش اندر لے آؤ۔"
"نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" بوڑھے نے کہا "میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس جاؤں گا۔ ہاں.... میں ....."
"بکواس بند کرو" تھانیدار گرجا "زیادہ بک بک کی تو میں لاش میز پر لٹانے کی بجائے تمہارے سر پر رکھ

دوں گا بڈھے۔"

"آپ..... آپ کون ہیں ایسا کرنے والے ..... یہ میرا گھر ہے۔ میں اس لاش کو کیوں رکھوں۔" تھانیدار نے لپک کو بوڑھے کو گلے سے پکڑ کے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم دین اور قانون کے باغی ہو۔ سپاہیو اس بے دین کو حراست میں لے لو۔"

بوڑھا آدمی چیختا رہا۔

"کرلو مجھے گرفتار خون پینے والو مجھے مارو۔"

تھانیدار نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ تشدد اور زدوکوب اس کارروائی میں اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اسکینڈل، سرکاری افسران۔ باز پرس، بوڑھا اسے اشتعال دلا رہا تھا۔

"مارو مجھے ..... گلہ دبا دو، قاتل یقیناً" اب تک تم اسی بہانے سے بہت سے لوگوں کی چمڑی اتار چکے ہو۔ تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ لالچی رشوت خور قاتل....."

تھانیدار کا دل چاہا کہ وہ اس بڈھے کی گردن دبا کر اس کی آواز کو خاموش کر دے۔ مستقبل کے خدشات اسے محتاط بنا رہے تھے۔ ویسے وہ خود بھی قدرے پریشان ہو رہا تھا کہ بڈھے کا ڈرامہ کس طرح ختم ہو گا۔

ایک خوبصورت جوان لڑکی بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بوڑھے کی پوتی تھی گھر سے ملحق ایک کمرے میں وہ اپنی بھیڑوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی کہ دادا کی چیخیں سن کر بھاگی چلی آئی تھی ایک نظر میں وہ سارا ماجرا سمجھ گئی۔

"سرکار، میرے دادا کو کچھ نہ کہیں۔ میرے دادا کو معاف کر دیں۔"

"میں اسے سائبیریا بھجواؤں گا۔ اسے یہ جرات کیسے ہوئی کہ سرکاری افسروں کے منہ لگے۔" "خدا کے لئے رحم دل سرکار میرے دادا کو معاف کر دیں۔ روتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے پرانا رومال نکالا جس کا ایک سرا بندھا ہوا تھا۔ گرہ کھول کر اس نے تھانیدار کو ایک روبل کا نوٹ دکھایا۔ تھانیدار نے فوراً" وہ نوٹ اچک لیا اور قدرے نرم لہجے میں بولا۔

"سنو بڈھے، میں نے تمہاری پوتی کی وجہ سے تمہاری جان بخش دی ہے۔ تم خبطی بڈھے ہو۔" بوڑھے کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور محاورے کے مطابق اس کی ایڑیاں گرم نہیں رہیں تھیں۔

"حضور والا، مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف کر دیں۔"

تھانے دار نے حقارت سے زمین پر تھوکا، دروازے کی طرف بڑھا، زور سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ریڑھی اگلے گھر کے سامنے رکی۔ گھر کی مالکن بہت ہوشیار تھی ایک روبل، فوم کا ایک بڑا ٹکڑا اور چار پونڈ شہد کا نذرانہ پیش کر کے کسی بحث میں الجھے بغیر اس نے بلا ٹال دی۔

یوں تھانیدار کی قیادت میں یہ ریڑھی آگے بڑھتی اور ہر گھر کے سامنے رکتی اور پھر آگے بڑھتی رہی۔ ہر گھر مجبور تھا کہ نذرانہ پیش کرے۔ کہیں سے کم، کہیں سے زیادہ، وہ لوگ جن کی چمڑی اتاری گئی تھی وہ سرائے میں جمع ہونے لگے۔ اور ایک دوسرے کو اپنی بپتا سنا رہے تھے۔

"ایسا عذاب نہ دیکھا نہ سنا تھا، وہ لاش کو ہر گھر میں لے جاتا ہے اور ہر گھر کو لوٹ رہا ہے۔ ہم کب تک خاموشی سے لٹتے رہیں گے۔"

"ہمیں گاؤں کے پادری کے پاس جانا چاہیے۔"

"وہ کیا کرے گا، صبر و شکر کی تلقین، بے نمک وعظ؟"

"اور ہمیں بھی کچھ تو کرنا ہو گا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو عرضی بھجوائیں۔"

شام گہری ہو گئی۔

تھانیدار رات گئے تک لاش کو ریڑھی پر رکھے گاؤں کے ہر گھر سے خراج وصول کرتا رہا۔ جب وہ ایک گلی کے وسط میں آرام کے لئے رکا تو ڈھیروں چیزیں جمع کر چکا تھا۔

پارچہ جات انڈے، پنیر، مکھن اور سینکڑوں روبل نقد۔

تھانیدار نے رات اسی گلی میں جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ دو سپاہیوں کو اس نے واڈکا لانے کے لئے سرائے بھیجا، خوب پی کر طرح طرح کی نعمتوں سے پیٹ بھر کر سونے سے پہلے تھانیدار نے اپنے آپ سے کہا۔ "کل صبح گاؤں کے جو آدھے گھر بچ گئے ہیں وہاں سے نذرانہ وصول کروں گا۔"

پھر یہ کہانی کیسے ختم ہوئی ہم کچھ نہیں جانتے!!!!

ہور سیو کیوروگا / ستار طاہر

پاؤں کا اشارہ

سر، میں یہ چند سطور آپکی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ اسے اپنے نام سے شائع کرا لیں گے۔ میں نے یہ درخواست آپ سے اس لئے کی ہے کہ میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے اپنے نام سے یہ تحریر بھیجی تو اسے کوئی شائع نہ کرے گا۔

پچھلے پانچ برسوں سے میں ٹرام پر ملازم ہوں اور اپنی اس ملازمت کی وجہ سے دن میں ایک ہی روٹ پر چلنے والی ٹرام پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ میری عمر بیس برس ہے' میں لمبے قد کی لڑکی ہوں اور دبلی بھی نہیں ہوں۔ میری جلد بھی زیادہ بھوری اور سیاہ نہیں ہے۔ میرا دہانہ چوڑا ہے لیکن بدنما نہیں اور آنکھیں بھی چھوٹی نہیں ہیں۔ آپ اچھی طرح مردوں کی عادت جانتے ہیں کہ وہ ٹرام پر سوار ہوتے وقت عورتوں کو ضرور گھورتے ہیں اور پھر سوار ہو کر ان کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ میں ان کے چہروں سے ان کے دل کی کتاب پڑھنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ پانچ برس کے مسلسل تجربہ نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ بھانت بھانت کا مرد آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے اور بھانت بھانت کے مردوں کی آنکھوں نے جس طرح سے مجھے گھور کر دیکھا ہے اس سے میں ہر چہرے اور نظر کو پہچان سکتی ہوں' اس لئے جب کوئی مرد ٹرام میں میرے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ارادے کو چھپانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو میں صاف صاف بھانپ جاتی ہوں کہ وہ کیا چاہتا ہے اور یہ کہ جو شخص میری قربت حاصل کرنے کے ارادے سے میرے قریب آرہا ہے وہ کون ہے؟ کوئی شرمیلا طالب علم یا کوئی جیب کترا؟

مرد بڑے چالاک اور حیلہ باز ہوتے ہیں۔ پہلے تو وہ یہ حرکت کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو لڑکھڑاتے ہوئے دکھاتے ہیں جیسے ٹرام میں ان سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھا جا رہا۔ یا پھر پھسلنے کا حیلہ بناتے ہیں کہ پاؤں پھسل گیا اور قریب آگرے۔ میں تو مردوں کے ایک ایک قدم اور ان کی اٹھان سے ان کی فطرت کا اندازہ لگا لیتی ہوں۔ کہ اب وہ قدم آگے بڑھا کر پاؤں سے پاؤں ملا کر ردعمل کا اندازہ کرنا چاہے گا۔ پھر ٹانگ سے ٹانگ کا ٹکراؤ اور پھر اس پر ردعمل کا انتظار۔ مردوں کے قدم تو اس طرح کی عیاری میں مصروف رہتے ہیں۔

اور چہرہ' جی ہاں' مجال ہے کہ وہ اپنے چہرے سے یہ ثابت ہونے دیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ارادی طور پر کر رہے ہیں بلکہ تاثرات سے عاری احمقانہ سا چہرہ بنائے کھڑے نظر آئیں گے' لیکن اگر لڑکی نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا تو وہ پھر فوراً" چوکنے ہو جائیں گے اور جیسی بھی صورت حال ہوگی اس سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ پہلے پہل تو میں مردوں کی ان حرکتوں سے بڑا لطف اٹھاتی رہی۔ بے چارے۔ رہتے تو ناکام ہی تھے کیونکہ میں نے انہیں کبھی گھاس نہ ڈالی تھی' لیکن پھر آہستہ آہستہ میں ان کی ان حرکتوں سے بیزار ہونے لگی۔ لیکن ان حرکتوں سے آنکھیں چرا بھی نہ سکتی تھی کہ ٹرام پر میں ملازم ہوں اور یہ بات میں آپ کو بتا چکی ہوں۔

اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے دوران روزانہ ہی میں مردوں کی فطرت کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں اور میرے ساتھ سترہ بار واقعات ایسے ہوئے ہیں جب مرد شہہ پا کر ذرا اور قریب آنے کی کوشش کرنے لگے تو میں نے انہیں بڑی صفائی سے غچہ دے دیا۔ کسی کے بڑھتے ہوئے قدم کو دیکھ کر میں ہلکے سے مسکراتی رہی... جب قدم نے چھوٹا سا فاصلہ اور بھی طے کر لیا تو میری مسکراہٹ تیز ہو گئی۔ اب مرد کیا کرتا ہے وہ بے نیاز ہو کر اوپر دیکھتے ہوئے آنکھیں جھپکتا ہے۔ پھر ٹرام کے فرش پر نظر ڈالتا ہے اس کے بعد عورت کی طرف دیکھتا ہے یا یوں کہئے کہ ان سترہ مردوں میں سے کسی ایک نے یہ تمام حرکتیں کر کے میری طرف دیکھا ہے میرے چہرے پر کسی قسم کی بیزاری یا ناراضی کو نہ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے وہ دل ہی دل میں یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ اس کے پاؤں اور میرے پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ اور پھر اپنا پاؤں اس حساب سے اٹھاتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے کہ اس کا پاؤں میرے پاؤں یا ٹانگ سے چھو بھی جائے اور میں یہ بھی سمجھوں کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ ایسے میں اس سے پہلے کہ جب مرد فاصلے کا اندازہ لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائے اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے تو میں اپنا پاؤں دور کھینچ چکی ہوتی ہوں اور نتیجہ۔ پھر اس مرد کے چہرے کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ وہ نظریں اٹھا کر مایوسی سے میری طرف دیکھتا ہے ادھر میری آنکھوں میں اس کے لئے انتباہ ہوتا ہے۔ ایک کھلی وارننگ' بعض مردوں کے چہرے اتر جاتے ہیں اور بعض کھسیا جاتے ہیں بعض فوراً" نظریں جھکا لیتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو شدید رد عمل کا اظہار کرتے غصہ اور ناراضی سے گھورنے بھی لگتے ہیں۔ اور بعض تو اس اہانت کا بھی برا مناتے ہیں اور بے دھڑک قدم آگے بڑھا دیتے ہیں میں یہ سطور آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ اسے اپنے نام سے بنا سنوار کر شائع کریں تاکہ مردوں کو کچھ عقل آسکے اور وہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں میں ٹرام کے محکمہ میں ملازم ہوں اور میرے پاس خاصی نقدی بھی ہوتی ہے اور نقدی کی حفاظت کے لئے محافظوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ آپ کی تحریر میں جان ہے آپ کا پرچہ کثیر الاشاعت ہے ان مردوں کو مطلع کر دیجئے کہ وہ محافظ جو نقدی کی حفاظت کرتے ہیں وہ عورتوں کی حفاظت پر بھی مامور ہیں وہ عورتیں جو میرے جیسی ہیں لمبے قد کی رنگ نہ زیادہ سیاہ نہ سفید' دہانہ چوڑا مگر بدنما.... آنکھیں بھی چھوٹی نہیں...

ایم۔ آر

ڈیئر میں آپ نے جو مراسلہ بھیجا ہے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ سترہ بار آپ نے مردوں کو غچہ دیا ہر روز آپ کا سابقہ نت نئے مردوں اور ان کی حرکتوں سے پڑتا ہے۔ آپ کا مراسلہ پڑھ کر میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا آپ اس کا جواب دینا پسند کریں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کا اپنا کبھی یہ جی نہیں چاہا کہ آپ کسی مرد کے پاؤں پر اپنا پاؤں بھڑا دیں۔ایچ کیو H.Q۔ ڈیئر بچی بات یہ ہے کہ میری زندگی میں ایک بار ایسا ہوا کہ میرے دل نے مجھے ترغیب دی کہ میں ایک شخص کے پاؤں سے پاؤں بھڑا دوں۔ میں نے اپنا پاؤں اٹھایا اور اس مرد کے پاؤں سے بھڑا دیا وہ مرد آپ تھے۔

لیکن آپ نے میرے پاؤں کے اشارے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

ایم۔ آر

شاعری

نظم

میرے اندر آباد دو جہاں' پہلو بہ پہلو
لیکن پھر بھی میرے قیام کے لئے جگہ تنگ
جنت دوزخ میرے اندر قید و بند
میں کیا ہوں یہ بیان کرنا دشوار
فطرت سے میں ماخوذ' اس کا حصہ'
جب تم میرے بارے میں باتیں کرتے ہو تو علیحدگی کا انحراف نہیں
اندازے گمراہ کر دیتے ہیں' قیاس و قیافہ کچھ بھی نہیں مگر غلطی
میرا زیادہ تر روپ' نقشہ اور سکون تم اپنی طرح کیوں نہیں سمجھتے
جبکہ میری ایک صورت ہے' حکم ماننے والا اور روح بھی
دنیا کے تمام خزانوں کی دولت ایسی نہیں جو میری ملکیت نہ ہو
موتی' لعل و گوہر' انتہائی قیمتی ریشمی نمونے سب میرے ہیں
بڑے' چمکدار' نایاب قیمتی پتھر میرے اندر پوشیدہ
دولت کی اس قدر بھاری فصل میرے اندر کہ شمار نہیں
آدمی میرا شریفانہ نام' میں سینائی پہاڑ ہوں
یہ زندگی اور آخرت' یہ دنیا اور لامحدود آسماں یہ سب میرے ہیں
میں ہی کرہ ارضی' میں ہی عالم ارواح اور میرا ہی یہ تصور
ندی نالوں کے کناروں سے بہنے والا پانی یہ سب میرے ہیں
یہ ستارے' یہ خاموش اجرام سماوی اور قسمت یہ سب میرے اعضاء میں
کوئی چپ' کوئی زبان پوری سچائی کے ساتھ میرے خیالوں کی تصویر کشی نہیں کر سکتی
میں وہ سنہرا سورج جس کی شان و شوکت کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی

میرا صرف لفظوں میں ذکر اذکار نہ کرو' میں یہ سب زنجیریں توڑ دوں گا
میں بہت بھاری آدمی ہوں جسکی عزت و توقیر تم پر لازم ہے
میں ایک ایسی سخت شیرینی ہوں جسے بچوں کے دانت بھی چبا نہیں سکتے
میں توڑے دار بندوق ہوں جو سپاٹ روشنی کا شعلہ ہے
میرے اس دعوے کو آگ کے یہ شعلے بھی بھسم نہیں کر سکتے
میں عشق کا فوارہ ہوں' جو مٹی اور زندگی کا باعث ہے
لیکن میں اس سے بھی کچھ اور ہوں' زندگی کے چار دنوں سے
دونوں شباب اور بڑھاپا میں خود اور ان کی تمام دولت سے مرصع ہوں
میرے خزانے اتنے بڑے اور وسیع ہیں کہ آئینے بھی چغلی نہیں کھاتے
اگرچہ نسیمی شہرت ہے' اور شریفانہ اس کا نام لیکن
پھر بھی اس کے اندر کا آدمی اس کی شہرت و دولت سے زیادہ معروف ہے

OO

ایک نظم

چھما چھم بارش
جس سے چند لمحوں میں
نشیبی علاقے بھر جاتے ہیں
اور
گڑھوں سے پانی باہر ابل کر کھیتوں، کھلیانوں اور گلی کوچوں کو جل تھل کر دیتا ہے

ہم ایک کھلی کھڑکی میں کھڑے
سوتے جاگتے، خالی الذھن اور خالی الشکم، بارش کی بے ہنگم آواز
کے ساتھ اندھیرے کی آڑی ترچھی تارو پود کے بارے میں سوچ رہے ہیں

ہمارے کان خاموش اندھیرے میں سننے کے لئے
اور ہمارے ناک گھپ اندھیرے میں ماحول کو سونگھنے کے لئے کوشاں ہیں
لیکن بارش ہے کہ
چھما چھم
آسمان سے زمین پر برس رہی ہے
اور زمین سے اٹھنے والی مٹی کی خوشبو نے ہمیں دوبارہ اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا ہے
کہ ہماری اس سے محبت بڑھتی چلی جا رہی ہے

تم بچپنے کی بھولی بھالی باتیں یاد کرو
جب ہم کاغذ کے ایک صفحہ کو بار بار بند کر کے کھولتے اور پھر بند کر دیتے
لیکن کتاب زیست
جو کہ بہت ہی مختصر اور ضخیم ہے
ورق ورق ہونے سے محفوظ ہے
اور باغ کی خوشبو نے ایک پر اثر طاقت کی طرح اوڑھ لیا ہے
اور ہم باغ حیات میں شبنم کے سیمیں قطروں کی عظمت اور حرمت
کی تازگی محسوس کرتے ہیں۔

پھر اچانک بارش کی ایک تیز بوچھاڑ زمین پر آتی ہے
اور زمین کی پرت در پرت تہوں سے موعود ہونے والی ان دیکھی خوشبو
میں ہم لوٹ پوٹ ہو کر سرشار ہو جاتے ہیں۔

سنا ہے

سنا ہے، ہم
۱۹۷۹ء کے تہذیب یافتہ برس میں
عہد جدید کے باسی
مگر دیکھتا ہوں میں
تا حد نگاہ، نئی اذیتیں، درد اور فریب کا موسم

اس جدید دور میں، مرجاتے ہیں ننھے منے بچے
کون آواز اٹھانے کی جرأت کرے گا
فاقوں سے مرجانے والے ان بچوں کی خاطر؟
اور نیپام سے جھلسی ہوئی برہنہ تن بچیاں
دوڑتی ہوئی چلا رہی ہیں، جلتی رات میں.....

جب کرسی پر جم کر بیٹھتے ہیں خونی آمر
تب چھوٹے بچے دفن کرتے ہیں، اپنے ماں باپ کی ہڈیاں
اور خفیہ والے،
شب مرگ میں
برہنہ عورتوں کو برقی کرسی میں کس کر

نچوڑ لیتے ہیں زندگی

بدرو میں پڑا سیاہ فام' زندگی سے محروم
اور بہتا ہے جہاں سیاہ ترین تیل
گلیاں سرخ تر ہیں وہاں
اور یہ ہے وہ' جو پیدا ہوا جینے کے لئے' سونے کے لئے
لیکن آزادی کے بغیر' جیا اور مر گیا

اور آج رات'
جب حکمران' دانشور' جیوتشی اور مملکتوں کے سربراہ اپنے چہروں پر چپکا رہے ہیں
اپنی خوشی بھری غلیظ اور بدبودار مسکراہٹیں'
تو اکیلے قیدی کی للکار گونجے گی قبروں کے گنبد میں
اور رحم مادر سے باہر روشن ہو گی' چار سو'
ایک حسین صبح........

زمین اور آسمان

یہ آسمان و زمین بیکران و لامحدود
کہاں دعائیں مری قسمت آزمائی کریں

چھپا لیا کبھی دو پتھروں کے بیچ میں سر
مگر اماں کی طلب سعئ رائیگاں نکلی

میں بھاگتا پھرا ویران سرزمینوں میں
ہزار گاؤں مرے راستے میں آئے، گئے

مرے لئے کہاں ممکن تھا، سانس لینا بھی
کہ توڑ سکتا تھا ہر سانس منظروں کا طلسم

شب سیاہ نے چرکے لگائے ہیں مجھ کو
سیاہ شب تو ہے آوارہ اور بے پروا

میں ایک کیڑا ہوں جس کے نہ پر نہ پاؤں ہیں
میں اک غذا ہوں سبھی نفرتوں کے سانپوں کی

کڑکتی دھوپ مرے سر پہ چھت بنائی گئی
سکڑ گیا ہے مرے فن کا تابدار ثمر

پڑی ہے پاؤں میں مسلی ہوئی وفا میری
میں اب دکھوں کی ردا کو اتار پھینکوں گا

مرا لباس بس اب سے ہے سر خوشی کا لباس
مگر یہ میری خوشی تو نئی ہے میرے لئے

بس اب کٹیں گے مرے دن تری رفاقت میں
مرا بدن تری باہوں کی قید میں ہو گا

مجھے ہوا کی طرح بے شعور کر دینا
جو سر پٹکتی ہے اور پائمال کرتی ہے

عطا نہ کرنا کبھی نفرتیں میرے دل کو
محبتیں مجھے دینا جو دائمی ہو جائیں

سورج دیوتا ہے

سورج دیوتا ہے
صبح دم
کائنات
اس کے دوار
کھڑی ہوتی ہے
اور شام کو
چاند اسے
نیلے تھال میں
موتیے کے
پھول پیش کرتا ہے

ꝏ

میں کہنا چاہتی تھی

(۱)

ایک دوسرے کو ڈھونڈتی ہیں ہماری آنکھیں
رات ہے اور سردی ہے
ہم کچھ ساتھی امریکہ ہاؤس کے باہر جمع ہو کر'
نعرے لگا رہے ہیں
اواس' اور غصے میں بھرے ہوئے
(میرے وطن میں انہوں نے چاکون' الوریز کور دوبار' فرانکو اور تین دوسرے ساتھی' جن کے نام میں نہیں جانتی' ہلاک کر دیئے ہیں)
میں کچھ کہنا چاہتی تھی
لیکن اپنی کمزور جرمن کے باعث' کچھ نہ کہہ سکی
میں کہنا چاہتی تھی:
ہماری جنگ جاری رہے گی
وہ ہمیں کبھی ختم نہیں کر سکتے
آخر میں ہماری نظریں ٹکرائیں
تیری نیلی آنکھیں
میرے اشکوں سے تر......
انقلاب آگے بڑھ رہا ہے'
محبت آگے بڑھ رہی ہے

(۲)

آخری لمحوں میں'
شاید تو مجھے یاد آئے گا
فرشتوں جیسا تیرا چہرہ'
ساگر جتنی گہری تیری آنکھیں
شاید تجھے وہ وقت یاد آئے گا
جب تو نے' مجھے اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھا تھا
بھید بھری نظروں کے سنگ
یا جب تو نے'
اس پیاری سی عورت کا ہاتھ دبایا تھا
جس کا نام میں نہیں جانتی

لگتا ہے مرنے سے پہلے
ایسی سوچیں گھیر لیتی ہیں من کو'
آخری لمحوں میں......

(۳)

اور کچھ نہیں' بس ایک خواب ہے یہ
میرے جنون کا'
میرے بیراگ کا'
اور میری تنہائی کا'
ہماری شکلیں دہشت پسندوں جیسی ہیں
لیکن تیرے چہرے سے دہشت پسندی نہیں جھلکتی
سکون سے بھرے بول کشید کر رہی ہیں
تیری آنکھیں
میں تیرے ساتھ تنہا نہیں ہونا چاہتی
کہیں میرے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے
یا شاید تیرے چہرے کی شانت وادی میں

کوئی بوسہ نہ بو دوں کہیں

اور کچھ نہیں، بس ایک خواب ہے یہ
لیکن کبھی کبھی لگتا ہے
کسی بھید بھری شکل کے پیچھے
پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے جیسے
خود اپنی حقیقت ڈھونڈھ رہے ہوں ہم

یہ کیسا کھیل ہے
کیا ہم ساتھی ہیں
یا سنگی ساتھی
یا تنہائی کی ماری روحیں
جنہیں کوئی مشترکہ گیت مل گیا ہے

پرندے بیگانے آسمانوں میں محوِ پرواز ہیں
چاند جیسے اداسی کا مجسمہ
اور میرے پیچھے پیچھے
کوئی چہرہ مجھے پکارتا ہے
مسکراتا ہے اور اوجھل ہو جاتا ہے
اور کچھ نہیں، بس ایک خواب ہے یہ
تمباکو دھواں
گوریلا اخبارات کا گمشدہ کوئی بھلاوا
آ! ہم اپنے مکھوٹے اتاریں
اور وقت کی باگ تھام لیں

آؤ ہم کھل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں

اے میری نسل کے لوگو!
آؤ ہم کھل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں
ہمیں اس عہد بربریت کے نقش قدم پہ چلنا چاہیے۔
ہم وہ جنت بھی دیکھیں
جو عصر کی دھندلی سرزمین کو
ابد کے بے در گنبدوں میں مقید کر کے
اس آواز سے بھرپور ہو جو موت کی آواز ہو اس چہرے کے رنگ لئے ہو، جو
مردہ چیزوں پر
بن کہے ہی جم جاتے ہیں۔

ہم بہت کچھ چاہتے تھے
ہم اک فراخ در اور بے پناہ چاہت کی خواہش میں
خاک بسر ہوئے
ہم نے دنوں کی خبث آمیز تاریکی کو بدلنے کی کوشش کی
لیکن،
اس سرزمین پر
اور اس سرزمین کے فرسودہ ذہنوں کی

بڑی بڑی قبروں پر

تاحد نظر پھیلے ہوئے دوزخ اور دھندلاہٹوں کے سوا

ہمیں کچھ نہ ملا۔

جے ایلفرڈ پروفروک کا محبت کا گیت

اس گھڑی آؤ ہم تم چلیں
(ہاتھ پاؤں پسارے ہوئے)
آسمانوں کی میزوں پہ بیمار سی شام
بے ہوش حالت میں جب چت پڑی ہو۔
چلیں نیم ویران گلیوں کو
اور غیر آسودہ راتوں کی ان شب پناہوں کو
ہم بڑبڑاتے ہوئے بھی
جنہیں' حد سے حد
رات بھر کے لئے ہی
فقط جھیل پائیں
بہت ہلکے درجے کے فرشی نشستوں کے ہوٹل۔
جہاں صرف کستورہ مچھلی ہی توفیق مہمانداری ہو
ان راستوں پر
جو مکروہ باطن سے ابھرے ہوئے
ٹیڑھے میڑھے دلائل کے مانند بڑھتے رہیں
اور پھر آپ کو
بے اماں' بے جہت سے بڑے مسئلے کی

حصے میں آیا
کہ لفظوں کا اسراف اک مضحکہ بن گیا
خود مجھے احمقانہ لگا

○

برف سر پر مرے اب اتر آئی ہے
اپنی چندیا پہ اب جس قدر بال باقی ہیں
ان کا تقاضا ہے اب مانگ سیدھی نکالا کروں
اب تو پتلون کے پائنچے "ٹرن" کروا ہی لوں
(نرم پھل بھی غذاؤں میں ہوں)
اشتہا آرزوؤں کی (جواں نرم گولائیوں کی بھی) ہے
(پچھلا دن ہے)
فلالین کے برف رنگت کا پاجامہ پہنوں
ٹہلنے بھی جایا کروں ساحلوں تک
یہ پانی کی پریاں
جو نغمے سناتی ہیں اک دوسرے کو
وہ سب سن چکا ہوں
مجھے تو گماں تک نہیں ہے کہ میرے لئے
بھی وہ گائیں گی
لہروں کے کاندھے پہ بہتے ہوئے
دور ہوتے ہوئے
میں انہیں دیکھتا ہوں
ہوا اک تھپیڑا لگاتے ہوئے جب سمندر
کا پانی بلوئے
تو پیچھے کو پھینکے گئے، لہر کے ملگجی رنگتوں

ابھی وقت ہے
(پالتو بلیوں کی طرح) پشت کو کھڑکیوں
سے رگڑتے ہوئے
کوچہ بازار کے بیچ مڑتے ہوئے
ایسے بھورے دھوئیں کے لئے
اور بھی وقت ہوں گے
ابھی اور اوقات ممکن ہیں
اس روپ کو اوڑھنے کے لئے
اوٹ میں جس کی ہم
روبرو ہونے والوں کا بھی سامنا کر سکیں
(وقت ہوں گے ابھی توڑنے جوڑنے کے لئے
وقت تعدیم کا
وقت تقویم کا
کام کے وقت آئیں گے
کام آزمانے کے وقت آئیں گے
وقت، جو آپ کے نام کے کچھ سوال
آپ کے سامنے کی رکابی میں
رکھتے اٹھاتے رہیں گے
(کبابوں میں ٹیڑھے سوالوں کی ہڈی)
ابھی وقت تو آپ کے اور مرے واسطے بھی ہے
خود گومگو کی صلیبوں پہ لٹکی ہوئی
سینکڑوں ساعتوں کا بھی ہے
ناشتے اور صبوحی سے بھی قبل آجائیں گے

سینکڑوں وقت
تشہید، تجدید کے
پھر سے تردید کے
خواتین کمرے میں آجا رہی ہیں
وہی "مائیکل اینجلو"

○

وقت اس سوچ کا بھی تو آئے گا
کیوں اب نہ جرات کے زینے پہ کوئی
قدم آزماؤں
کہ پل لوٹ آنے، اترنے کا آجائے گا
حرفِ جذبات کیسا لگے گا
(مری کھوپڑی پر چمکتی ہوئی) چاند کو
دیکھ لیں گے وہ جب
اور کہیں گے کہ
"لو، یہ تو سر سے گیا"
میرا باقاعدہ صبح کا وہ لباس اور ٹھوڑی
تک اٹھی ہوئی کالریں،
ان میں اک سادہ سے پن سے اڑسی ہوئی
قیمتی اور قرینے سے باندھی گئی
میری نیکٹائی کی بات ان کی نظر میں نہ ہوگی
وہ جب کہ رہے ہوں گے
"دیکھو ارے اس کے مریل سے بازو،
ذرا اس کی ٹانگیں تو دیکھو۔"
تو پھر کیا میں دنیا میں ہل چل مچانے کی جرأت کروں؟

جبکہ لہجے میں عزم مصمم بھی ہے
اس پر ترمیم بھی
جس کی تعدیم بھی
دوسرے پل میں ہے
مگر میں انہیں ان کے سب سلسلوں
ساتھ پہلے ہی سے جانتا ہوں
سحر شام کے عصر کو
عصر کے وقت کو
آپ اپنی حیات اور اوقات کو
میں نے کافی کے چمچے سے ناپا ہوا ہے
صدا گیت کی دور کمرے سے جو آ رہی ہے
میں اس کے تلے
یک قلم ختم ہوتی ہوئی سن رہا ہوں
جو آواز مرنے کو ہے
فرض اب کیا کریں؟
کیا کہیں؟

○

دیکھی بھالی ہیں آنکھیں
مری دیکھی بھالی ہیں آنکھیں
تمہاری جو تجرید اصولوں میں کر کے
اصولوں کو زنجیر کر لیں
سو جب پن کے ساتھ ایک دیوار میں
جڑ دیا جاؤں
آزاد ہونے کو تڑپوں

شب و روز اور اپنے جینے کے اسلوب
کے پن کا چبھتا ہوا کند سر
جسم و جاں میں سے کیسے اگل پاؤں گا
ابتداء کیا ہو؟
کیا فرض کیجئے؟

○

یہ نسوانی بازو — میں ان سب کو پہلے ہی
سے جانتا ہوں
یہ چوڑی چڑھی آستینیں، یہ بلور بازو یہ خالی سی باہیں
(دئے کی مگر روشنی میں رو پہلے چمکتے رووٗں بھری بانہیں)
آخر بہک کیوں رہا ہوں؟
مہکتے ہوئے دامنوں کے سبب سے؟
یہ بازو ہیں جو میز پر سو گئے ہیں
وہ بازو بھی جو شال اوڑھے ہوئے ہیں
(یہ حالات ہیں ان میں)
اب فرض کیا کیجئے
ابتداء کیا کریں؟

○

کیا مجھے صرف اتنا سا کہنے کا بھی حق ہے
جو کہہ سکوں
"تار سا کھڑکیوں میں سے باہر کی دلچسپیوں،
رونقوں میں
فقط اک نظر کی شراکت ہے جن کا کمال
ان اداسی کے مارے ہوئے"

جبرِ تنہائی دیدہ مکینوں کے سب تنگ
کوچوں ہی کو اک سحر کے سے دیکھ آیا تھا؟
جن کی سبھی حسرتوں کا غبار
ان کی چلموں میں
سینوں میں ہے
(ایسا ہوتا مری آدمی والی آنکھیں نہ ہوتیں)
کسی کیکڑے کا جنم لے کے آتا
کہ جو (سردیوں والے ویراں'
اداس اور۔) خاموش سے پانیوں پر
(عذابوں سے آلود سوچوں سے بچ کر)
یہاں سے وہاں تک تھرکتا' سرکتا' پھیلتا

○

وہ دن کے ڈھلے مطمئن نیند سوئی ہوئی
لمبی مخروط شکل انگلیوں سے سنورتی
ہوئی کوئی ہموار (معمول کی) شام
(اس شام میں)
ان نگاہوں کی پھر خوابگیں حالتیں
یا تھکاوٹ کا اظہار
یا کسلمندی کا کوئی تاثر
(تم ان سے تاثر نہ لوگے؟"
کبھی نیند دیوی کو دیکھا ہے؟
جو آپ کے اور مرے سامنے فرش پر
خواب میں کھو گئی ہے
وہی ہے

اب آئس کریم اور چائے کے سارے
لزومات
پھر
وقت کے عیش و نعمت سے بھرپور
مصرف کے بعد
ابتداء کیسے ممکن ہے اس کی
کہ لمحے کو لمحے کے بحران تک کھینچ کر
لے چلوں
اگرچہ میں تائب ہوا
اور (گناہوں پہ) رویا ادا بھی کئے فرض روزوں' نمازوں کے
لیکن
پلیٹیں (بہت روبرو) ہیں
اور ان میں (سبھی کی نگاہیں ہیں)
خود میرا سر ہے
مگر میں پیمبر نہیں ہوں (سلومی کے وقتوں کا
جو میرا سر آج اک تھال میں ہو'
عجب صورت حال ہے جو نگہ تو کجا
اپنا سر تھال میں ہے)
(بزرگی زدہ سر جو گنجا بھی ہے)
اب جو کہنا تھا
(اتنی پلیٹوں کے ماحول میں شاید)
اتنا اہم بھی نہیں۔
میز پر
(غیر ارادی سہی پھر بھی اک)

غیر محتاط سی میری حرکت پہ پھر
باادب سرزنش خان سامان کی
الاماں!
اپنی عظمت کے لمحے کو
(کھانے کی اس میز پر
ان گنہ گار آنکھوں سے)
دم توڑتے اس طرح دیکھ آیا
کہ المختصر ڈر گیا ہوں
یہ خود آپ کہیے
بھلا کیسا لگتا
اگر چائے، چٹنی، شراب اور دونوں کے
ان باہمی انفرادی مراسم
کی نازک سی باتوں کے اس شیشہ خانے کے اندر
جہاں ٹوٹنے والے برتن تھے
تن تازہ ہو کے
میں جب (روح اور جسم کے کرب کی)
بات کرتا
(جو موضوع و آداب محفل سے کوئی تعلق نہ رکھتی
خصوصی کرم اور رعایت یہ ہوتی کہ
سب کا پسندیدہ موضوع چننے کی خاطر)
کوئی مسکرا کر
اسے ٹال دیتا
یہ دنیا تو خود ایک عالم ہے
عالم کا تم کس طرح ایک گولہ بنا لوگے؟

تاکہ لڑھکنے میں بھی اس تمہارے بڑے
عالمی مسئلہ کی ڈھلانوں سے
اترے
اب ایسے جب (اس دوست لڑکی سے)
کہنا
کہ میں ہوں لزارس
وہی داستانوں کا بوڑھا بھکاری
جو عیسی کے "قم" تک فنا کے مراحل میں تھا
موت کے بعد کی زندگی جو ہے جیسی نہیں ہے
میں اس کا وحید زماں رازداں ہوں)
سو مجھ کو سنانی ہیں (کچھ تلخ سچائیاں....)
اس پہ نرمی سے تکیہ پہ سر ٹیک کر جو وہ کہہ دے
"یہ' خیر اپنا مطلب نہ تھا
میں تو قطعاً" یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی"

○

کہ پھر شام کے اس سہانے سمے
جب گلی صحن میں آبی چھڑکاؤ کے بعد
چائے کی چسکی کتابوں کی چسکے بھری
بحث سے ہمزباں ہو
گھسٹتے غراروں کے سب ریشمی مرحلے
سامنے ہوں
کوئی کس طرح کہہ سکے
کچھ جو کہنا ہے
فانوس جادو کے مانند کس طرح سے

نقش ڈھالے
کہ نقشہ رگوں تک کا پردے پہ آجائے
کہنے کی گنجائشیں کیا رہیں؟
شال کو پھینک کر جسم کو جب وہ آزاد
کرتی ہو
کھڑکی (بڑھانے) کو جاتے ہوئے
میری تقریر کے اس محل پر یہی کہہ دے
"میرا یہ مطلب نہ تھا"

○

کوئی شہزادہ ہیملٹ نہیں ہوں
مجھے ویسا بننا بھی لازم نہیں تھا
کہ میں تو فقط چھوٹے درجے کا ایسا ندیم
اور مصاحب ہوں'
جو آبرو مند اور وضع دار آدمی ہے'
جو اوروں کی خدمت میں جینے کو اک
فخر جانے'
وہ کردار جو داستان کو کہیں باب دو
باب آگے چلا دے'
جسے مشورہ نذر کرنا ہو شاید
وہ محتاط سادہ مزاج اور مودب معاون ہوں'
جسکی سیاست متانت کا کردار ہے۔
اپنا کردار غازی ہے گفتار کا
شستہ بحثیں مرا ذوق ہیں
بعض اوقات تو اس قدر بولنا میرے

حصے میں آیا
کہ لفظوں کا اسراف اک مضحکہ بن گیا
خود مجھے احمقانہ لگا

○

برف سر پر مرے اب اتر آئی ہے
اپنی چندیا پہ اب جس قدر بال باقی ہیں
ان کا تقاضا ہے اب مانگ سیدھی نکالا کروں
اب تو پتلون کے پائینچے "ٹرن" کروا ہی لوں
(نرم پھل بھی غذاؤں میں ہوں)
اشتہا آڑوؤں کی (جواں نرم گولائیوں کی بھی) ہے
(پچھلا دن ہے)
فلالین کے برف رنگت کا پاجامہ پہنوں
ٹہلنے بھی جایا کروں ساحلوں تک
یہ پانی کی پریاں
جو نغمے سناتی ہیں اک دوسرے کو
وہ سب سن چکا ہوں
مجھے تو گماں تک نہیں ہے کہ میرے لئے
بھی وہ گائیں گی
لہروں کے کاندھے پہ بہتے ہوئے
دور ہوتے ہوئے
میں انہیں دیکھتا ہوں
ہوا اک تھپیڑا لگاتے ہوئے جب سمندر
کا پانی بلوئے
تو پیچھے کو پھینکے گئے، لہر کے ملگجی رنگتوں

والے پتوں کی بھی مانگ سیدھی نکلتی ہے
(میری طرح)
ہم سمندر کے ایوان میں بے سبب دیر تک
رک گئے ہیں
سمندر کی ان بیٹیوں کے لئے
جو کہ نرسل میں گوندھی ہوئی' سرخ بھوری سی
مالائیں پہنے
ان ساعتوں تک' یہاں ہم رکیں گے
کہ پھر آدمی کی صدائیں
ہمیں آجگائیں
(جگائیں) کہ ہم ڈوب جائیں

جارج سفیرس / شاداب احمد

نظم

بیچ دوپہر کس نے سنی
سل پر چاقو تیز ہونے کی سسکاری؟
کون گھوڑے پر سوار آیا
مشعل اور آتش زنی کا سامان لئے؟
ہر کوئی ٹھنڈے کرنے کے لئے
اپنے ہاتھ دھو رہا ہے۔
اور کس نے عورت کا
بچے کا اور مکان کا شکم خالی کر دیا؟
مجرم کا کوئی سراغ نہیں: غائب
کون فرار ہو گیا،
پتھروں پر بجتے سموں کی
دھمک چھوڑ کر؟
انہوں نے اپنی آنکھیں منسوخ کر دیں
اب کون، کس سے، کس کی
گواہی مانگے!

ڈبلیو۔ ایس۔ مرون / شاداب احمد

جب جنگ تمام ہو جائے گی

جب جنگ تمام ہو جائے گی
ہم ظاہر ہے اترائیں گے
ہوا بالآخر سانس لینے کے قابل ہو جائے گی
پانی سنور چکا ہو گا
سلمن مچھلی اور
آسمان کی خاموشی
زیادہ مکمل طور پر ہجرت کرے گی
مردے سوچیں گے جینے والے اسی لائق ہیں
ہم جان لیں گے کہ ہم کون ہیں
اور پھر ہم سب دوبارہ بھرتی ہو جائیں گے

ہائیکو

بڑاوا
کھانستا ہے
تتلیاں

○

بغیر پیسوں کے
میں جاتا ہوں
برف کا نظارہ کرنے

○

فربہ خاتون
ٹماٹروں پر جھکتی ہے
ایک پورا چاند

○

کیا تم خیالوں میں منہمک پتے ہو

آشنا چہرے بمشکل ڈھونڈ پاتے ہیں
کہر آلودہ دریچوں کے شیشے
چاند کی گاڑھی ہوتی ہوئی دودھیا روشنی
روحوں کو بہائے لئے جاتی ہے
روشنی کی آخری لکیر کنارہ' افق سے کٹ گئی ہے
جس سے لحہ چیخ اٹھتا ہے
اپنے واضح پن کے ساتھ!

لازم ہے کہ میں اور تم چاند کی وساطت سے ترسیل ہوں؟
یہ حقیقت کا ایک پرتو ہے
تمہارا جام دور کی روشنی ہے جو درختوں کو مس کر کے گزرتی ہے
جھلملاتے ہوئے پانی کی طرح
آسماں اس منظر کر منعکس کر دیتا ہے

میرے ساتھی! میں حیران ہوں کہ کیا تم خیالوں میں منہمک پتے ہو
میں گہرے رنگوں کو پرندوں کی ہیئت میں تراشتی ہوں
اپنی کھڑکیاں پوری طرح کھولو
میرا تحفہ قبول کرو
اپنے تمام تر چھوٹے موٹے عقیدے کے ساتھ
میں تمہیں مشرق کی پہنائیاں پیش کرتی ہوں

ہائیکو

بہار کے اول دن ہی
برف باری
ایک شاخ سے دوسری شاخ تک

○

خموشی
چاندنی میں
پتھروں کی

○

کاغذ کے آدمی

ایک قطار میں
کاغذ کے آدمی -- ہاتھوں میں ہاتھ دیئے
نہایت صبر سے
اپنے گنے جانے کا انتظار کرتے ہیں
اور قینچی کے پہلے وار کا

ان میں سے ہر ایک
ایک بہت اہم کڑی ہے
اس پابہ زنجیر گروہ کی
جس میں انہیں کاٹا گیا ہے
انہوں نے نہ تو کوئی زرہ پہنی ہوئی ہے
نہ کوئی خود
انہیں کسی کارنامے کی تمنا نہیں ہے
نہ کسی شہر خواب میں فرار ہونے کی
ان کی سب سے اہم خوبی
ان کی لچکداری ہے
کاٹے جاتے وقت
ان کی سب سے بڑی خوشی یہی ہوتی ہے
کہ -- ان کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے!

اریکا ژونگ / سعید احمد

ریڑھ کی ہڈی کے زائیلوفون پر

دھن بجاتے ہیں کون و مکاں
میرے فقرات کے زائلوفون پر
سر بھرے، تار مہروں کے چھوتے ہوئے
مرتعش کر رہے ہیں مجھے درمیان کمر
خواہشِ جسم کی گونج سے
دھن پہ نغماتِ افلاک کی

گوشت جب ہڈیوں سے گرے گا تو سر
اور واضح ہوں گے
جلد مرجھائے گی
روح اپنے سفر پر نکل جائے گی
سر، ہوائے خزانی کی صورت کھلیں گے
شکستہ سے جھڑتے ہوئے پات ہوں جس طرح
یا ہماری زمیں پر چمکتے ہوئے پانیوں کی طرح
دور سے دیکھتی ہے جنہیں
ایک مخلوق ـــــ سنگیت سے جس کی تخلیق ہے
آنکھ پر جو عیاں تک نہیں
لمس بھی جس کا ناممکنات
کس کو یارا ہے اس سے ملاقات کا
ہاں مگر جب اترتی ہے دھرتی پہ وہ
ناتواں استخواں پر ہمارے
کوئی دھن بجائے

اس طرح سے تھم جائے
حرف جیسے دل والی

جس کا لیکن ایندھن بھی
ایک سانس ہی تو ہے
حرف جو قلم کے ہیں
وہ بھی ہیں رضا دل کی
اور ڈوب جاتی ہے
ظلمتوں میں سب دنیا
ہاں مگر ستاروں کے
پختہ عزم سے نیچے

موگن گینی

مری دھرتی وہ دھرتی ہے جہاں بارش نہیں ہوتی
پسینہ میری پیشانی کا ان فصلوں کا پانی ہے

اسی پھیلی ہوئی دھرتی پہ کچھ کافی کے پودے ہیں
مرا ہی خون انکی جگمگاتی سرخ رنگت ہے
نمو انکی ـــ مرے ہی خون کا رس ہے

بھنی جائے گی کافی
پھر پسے گی ـــ پھر گھلے گی پیالیوں میں
رنگ کالا اس کا ہو گا
یہ سیاہی رنگ ہے میری مشقت کا

مشقت میری قسمت کی سیاہی بن گئی گویا
کبھی پوچھو پرندوں سے جو گاتے ہیں
مچلتی ندیوں سے جو سدا آوارہ پھرتی ہیں
بہت اونچی ہواؤں سے جو کھلیانوں سے آتی ہیں
سحردم کون اٹھتا ہے!

مشقت کون کرتا ہے!

بہت لمبی مسافت میں
اٹھاتا کون ہے لکڑی کے بل ' دانوں کے بورے اپنے کاندھے پر
پکی فصلوں کے خوشے کاٹتے ہیں ہاتھ کس کے؟
اور کسے ملتی ہے مزدوری میں نفرت '
جو کا بھوسا ' باسی مچھلی ' چند پیسے اور پھٹے کپڑے
یہ میرے جسم پر جو نیل ہیں
سب میں نے مزدوری میں پائے ہیں

مگر یہ تو کہو وہ کون ہے؟
جو کھیت میں فصلیں اگاتا ہے
مگر یہ تو کہو وہ کون ہے؟
جو ٹہنیوں پر پھول لاتا ہے
ذرا یہ تو کہو ' صاحب کو پیسے کون دیتا ہے؟
وہ پیسے جو مشینوں ' موٹروں اور عورتوں پر صرف ہوتے ہیں
مگر سچ ہے کہ کالے حبشیوں کا سر کچل دینا ہی بہتر ہے

پرندے جو کہ گاتے ہیں
مچلتی ندیاں جو خاک پر آوارہ پھرتی ہیں
بہت اونچی ہوائیں جو کہ کھلیانوں سے آتی ہیں
جواب اس کا وہی دیں گی
موگن گینی ' موگن گینی
مجھے تم پام کے پیڑوں پہ چڑھنے دو

احمد شاملو / سعادت سعید

عمومی عشق

آنسو ایک راز ہے
ہنسی ایک راز ہے
عشق ایک راز ہے

اس رات آنسو میرے عشق پر ہنس رہا تھا

میں کوئی داستان نہیں کہ تو سنائے
میں کوئی نغمہ نہیں کہ تو گائے
میں کوئی آواز نہیں ہوں کہ تو سنے
یا کوئی ایسی شے کہ جسے تو دیکھے
یا کوئی ایسی شے کہ جسے تو جانے

میں دردِ مشترک ہوں
مجھے پکار

درخت جنگل سے کچھ کہتا ہے
سبزہ صحرا سے
ستارہ کہکشاں سے
اور میں تجھ سے کچھ کہتا ہوں

مجھے اپنا نام بتا
اپنا ہاتھ مجھے دے
اپنی بات مجھ بتا
اپنا دل مجھے دے
میں نے تیری حقیقت پہچانی ہے
میں نے تیرے ہونٹوں کے وسیلے سب ہونٹوں کے لیے بات کی ہے
تیرے ہاتھ میرے ہاتھوں کو پہچانتے ہیں

میں روشن تنہائی میں تیرے ساتھ رویا ہوں
زندوں کی خاطر
اور تاریک قبرستان میں تیرے ساتھ میں نے
انتہائی سریلے نغمے گائے ہیں
شاید اسی لیے امسال مردے
زندوں سے کہیں بڑے عاشق ہو گئے ہیں

اپنا ہاتھ مجھے دے
تیرے ہاتھ مجھے پہچانتے ہیں
اے دیر سے ملنے والے! میں تجھ سے کچھ کہہ رہا ہوں
ابر کی مانند کہ جو طوفان سے
سبزے کی مانند کہ جو صحرا سے
بارش کی مانند کہ جو سمندر سے
پرندے کی مانند کہ جو بہار سے
درخت کی مانند کہ جو جنگل سے کچھ کہتا ہے

اس لیے کہ میں نے
تیری حقیقت پہچانی ہے
اس لیے کہ میری آواز
تیری آواز سے آشنا ہے

احمد شاملو/ شعیب احمد

سزا

یہاں چار قید خانے ہیں
ہر قید خانے میں بہت سی سرنگیں ہیں' ہر سرنگ میں بہت سے کمرے اور ہر کمرے میں بہت سے
لوگ ہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے......
ان قیدیوں میں سے ایک نے بہتان کے تاریک جنون میں اپنی بیوی کو خنجر مار کر قتل کر دیا
ان لوگوں میں سے' ایک نے گرمیوں کی تپتی دوپہر میں خسیس نان فروش کے تنور پر اس کے خون
میں اپنے بچوں کی روٹی بھگو لی
ان میں سے چند ایک برستی بارش کی تنہائی میں ایک دن سود خوری کے راستے پر بیٹھے رہے
کچھ' گلی کی خاموشی میں چھوٹی سی دیوار پھاند کر کسی گھر میں کود گئے
کچھ' آدھی رات کو' تازہ قبروں سے مردوں کے سونے کے دانت توڑ توڑ کر نکالتے رہے
لیکن میں نے تو تاریک اور طوفانی رات میں کسی کو قتل نہیں کیا
لیکن میں نے تو سود خور کا راستہ نہیں روکا
لیکن میں تو کبھی آدھی رات کو کسی دیوار سے کسی گھر میں نہیں کودا!!
یہاں چار قید خانے ہیں
ہر قید خانے میں بہت سی سرنگیں ہیں اور ہر سرنگ میں بہت سے کمرے' ہر کمرے میں بہت سے
لوگ ہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے.....
ان قیدیوں میں ایسے مرد بھی ہیں جنہیں عورتوں کی لاشیں اچھی لگتی ہیں
ان قیدیوں میں ایسے مرد بھی ہیں جن کے خواب میں ہر رات ایک وحشت زدہ عورت کی جگر خراش

چیخ بلند ہوتی ہے
لیکن مجھے تو عورتوں میں کچھ نہیں ملتا
اگر کبھی وہ ہمزاد اچانک چپ چپ نظر نہ آئے!
لیکن مجھے تو اپنے خوابوں کے کہسار سے صحرا میں اگنے والی، گلنے سڑنے والی، سوکھ جانے والی گھاس
کے سرد ردعمل اور صابر آہنگ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا
مجھ پر اگر خود اپنی یہ قید نہ ہوتی
تو میں دور کی کسی ڈگمگاتی یاد کی طرح شاید اس پست سرد مٹی پر سے گزر جاتا....
جرم تو یہ ہے!
جرم تو یہ ہے!

حیرت

میرے دلائل سے متفق نہ ہونا
تفکر یعنی، تذبذب
اپنی مسکراہٹ کے بارے میں محتاط رہ
تذبذب، یعنی روشنی کی موت
کتابیں بھی نہ پڑھنا
حیرت کی فہم
فقط استدلال کی محتاج نہیں
مجھے مخاطب کر، لفظوں کے بغیر
حقیقت تیری مسکراہٹ میں ہے
فکر ماضی نہ کر،
آئینہ حال پر رکھ نظر
حقیقت تری مسکراہٹ میں ہے
روشنی بھی ہے لرزہ براندام
سطح آب پر،
مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو
آ
اور میرا ہدف بن کے رہ،
گمرہی میں

رسائی

بہترین چیز
پہنچنا اس نگاہ تک ہے
جو، حادثۂ عشق سے نم ہو

منصور

منصور
دار کے اوپر،
اوپر مجھ سے
اوپر تجھ سے
اوپر خاک سے
لیکن
نزدیک تر
خالق افلاک کے

آتش خاموش

رات اندھیری، طویل راستہ اور میں حیران،
وہ مرے راستے میں فانوس پکڑے کھڑا ہے
فانوس کے شعلۂ بے شکیب کو
میری نگاہ وحشت زدہ ہو کر دیکھتی ہے۔
ہم پہ کیا گزرتی ہے۔۔۔۔ کسی کو کیا معلوم
بھیگے ہوئے سبزے کا بستر کہتا ہے
میری گردن سے اپنے لب پیوستہ کر دو
ہزاروں جلتے ہوئے بوسے تمہارا استقبال کریں گے۔
ہم پہ کیا گزرتی ہے، کسی کو کیا معلوم
میں "وہ" بن جاؤں
وہ جو دریا کے خروش جیسا ہے۔
میں بگولے کی طرح وحشی ہوں
وہ صحرا میں ٹھنڈی ہوا جیسا ہے،
میں اس کے بازوؤں میں ہوں اور تشنہ ہوں
میرا شوق مجھے گھاس کی طرح روندتا رہے گا
جب تک کہ میں ان لرزتے ہوئے شگوفوں کا عرق
رات کے جام میں انڈیل کے پیاس بجھاؤں
بھیگے ہوئے سبزے کے بستر پر
بے دم، شعلوں میں لپٹی ہوئی پڑی ہوں
ڈرتی ہوں کہیں یہ بے پروا نسیم

سیاہ

لحاف کہنہ بوسیدہ فلک جو پھٹا
تو شہر و کوچہ سراسر ہوئے ہیں پنبہ سے پر
مگر ہے دشت ابھی بھی غریب و سرد و خموش
ارے! نہ جھاڑ در و بام پر ہمارے نہ جھاڑ
یہ اپنا پھٹا پرانا لحاف، گرچہ سدا
ہمارے پنبے پہ آفت کا راج ہی تو رہا
وہ دشت سوختہ تھی پنبہ سپید سے ہے
جہاں بھی حرف حریفاں پہ پنبہ ہے در گوش

ترانہ دیدار

تمہارے ساتھ رہنا اچھا ہے
اور تمہاری باتیں
اندھیرے میں خوشبو کی طرح ہیں

تمہارے لباس کی مہک
سمندر کی خوشبو کی طرح نمناک ہے
گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کی طرح!
اندھیرے کی طرح خوابناک!

تمہارے ساتھ گفتگو
انگیٹھی کی گرمی اور بھڑکتی ہوئی آگ کے سانسوں کی طرح
میرے تصور و خیال کی آنکھوں کو
یادوں کے دور دراز جنگلوں میں لے جاتی ہے
جہاں گندم کے خوشوں پر چڑیاں
رقص کرتی ہیں
جہاں پھول اور ستارے ایک دوسرے کے رازدار ہیں

طوفان نوح

میں نے مٹھی بھر شگوفے
پانی میں ڈالے
آسمان بھر ستارے نکل آئے!
پھر میں نے پتوں جیسے ایک نازک کاغذ سے
ایک ہتھیلی بھر کشتی بنائی
اور موم کا ایک ناخدا (خدا سے چھوٹا)
اس پر مقرر کیا
وہ میری کشتی کو
اپنے ساتھ دور لے گیا۔۔۔۔ بہت دور
ان شگوفوں تک
ان ستاروں تک
خوشبو اور روشنی سے لبریز ان جزیروں تک لے گیا
وہ ہر ایک کے پاس کچھ ٹھہرا
جیسے ایک ایک کا دوست ہو!
پھر مغرب کے افق سے ہوا چلی
کشتی کسی بلبلے کی طرح پانی پر نگوں سار ہو گئی
اور ناخدا نے چپو موجوں کے ہاتھ میں دے دیئے......
اب میری چھوٹی سی دنیا' خدا سے خالی ہے

جلاوطنی

جلاوطنی فاصلہ نہیں
تم، تمہارے آس پاس ہے
جلاوطنی کھلا میدان ہے
جہاں ہمارے خیال گھاس چرتے ہیں
ایک سانڈ زمین کو اجاڑتا ہے
جلاوطنی ایک تلخ دیوی ہے

میرا باپ بادشاہ تھا

وہ سب چلا کر مجھے بتائیں گے
کہ کیونکر وہ نہیں تھا، وہ کبھی نہیں تھا
اور وہ مجھ پر سنگ زنی کریں گے
میں جانتا ہوں وہ یہی کریں گے
یہی ہر چیز کا عظیم قانون ہے

لیکن میرا باپ بادشاہ تھا
اس لئے نہیں کہ اس کے سر پر
کوئی مضحکہ خیز سنہری تاج تھا
لیکن نقرئی چاندوں کے
عظیم قانون کے باوصف

ہاں، میرا باپ کبھی بادشاہ تھا
(بادشاہ تم ہو، بادشاہ میں ہوں)
ہم میں سے کون کبھی نا بادشاہ تھا
تیا گنے کے باعث؟
ہاں، میرا باپ کبھی بادشاہ تھا

سلیمان بادشاہ سے کہیں زیادہ
اس لئے کہ یہاں ہیرے' زمرد
ہاتھ میں عصائے شاہی
جیسا کچھ نہیں تھا
مگر فقط اس کے دستخط تھے
ایک تیاگ پر

تاش کے کھیل میں
حکم کا بادشاہ نہیں
مگر ایک مرتبہ سب کچھ رکھتے ہوئے
محرومی کا بادشاہ
ماسوائے ایک دل اور ایک پرندہ ہاتھ میں

ہاں' میرا باپ بھی بادشاہ تھا
مگر بادشاہ صرف اس لئے
کہ وہ کہہ سکتا تھا: اے خدا!
تیرے ستارے تیرے سفر کے
پسینے کی بوندیں ہیں
لیکن میں ستاروں کی بوندیں بہاتا ہوں
پتھر اٹھائے ہوئے
اپنے منظر نامے میں

بادشاہ' مگر سمندر کا نہیں
نہ لوٹنے والا بادشاہ سباسچین

مگر اس طرح چلانے کے باعث
سمندر!
تیرے جاہ و جلال سے
میں ماند نہیں پڑ سکتا
وہ آنسو جو میں نے آج بہائے ہیں'
اس تیاگ کی گھڑی میں'
زیادہ ہیں

بادشاہ' اس لئے کہ اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا:
سنو! اپنے جسم سے پھاڑ ڈالو
(کسی پھول سے سفید پتی کی طرح)
وہ تنہا عنایت جو کسی کے واسطے
تمہارے پاس ہے
جسے تم خوش رکھتے ہو
اسے کسی کے علم میں لائے بغیر
اور تم بادشاہ ہو گے
اور تم کہو گے: میں کبھی بادشاہ تھا
فقط تیاگتے ہوئے

ہاں' میرا باپ کبھی بادشاہ تھا
(بادشاہ تم ہو' بادشاہ میں ہوں)
ہم میں سے کون کبھی نا بادشاہ تھا
تیاگنے کے باعث؟

ہم میں سے کون کبھی نا بادشاہ تھا
(گمنام خود کشی میں)
اس سے دست برداری کے سبب
جو زندگی میں عزیز ترین تھا؟

وہ سب چلا کر مجھے بتائیں گے
کہ کیونکر وہ نہیں تھا' وہ کبھی نہیں تھا
اور وہ مجھ پر سنگ زنی کریں گے
میں جانتا ہوں وہ یہی کریں گے
یہی ہر چیز کا عظیم قانون ہے
اس کے باوجود کچھ فرق نہیں پڑتا
اس کے باوجود ایک تیاگ
ایک بادشاہت سے بہتر ہے

صرف

ٹپ ٹپ ٹپ
آنگن میں دیوار کے پاس
جہاں نرم گدیلی کائی تیزی سے اگ رہی ہے
اور پھولے پھولے فرن کے بوٹے
اپنا قد نکال رہے ہیں
صرف اک نل سے پانی بوند بوند ٹپکتا ہے
جب ہوا ملاقات کا فیصلہ کرتی ہے
صرف ایک جھلملی کھڑکھڑاتی ہے
جب رات بھیگنے لگتی ہے
صرف سائے رینگتے ہیں
کمرے کی تنہائی سے بوجھل فضا میں
صرف اک سرگوشی۔ بھولی بسری یادوں کی۔ سرسراتی ہے۔

راجر میک گف / عباس رضوی

تین زنگ آلود کیلیں

ماں ۔۔۔۔۔ کچھ جانی پہچانی سی صورت والا
اک عجیب آدمی
دروازے پر منتظر ہے
ایسا لگتا ہے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

وہ کہتا ہے اس کا نام عیسیٰ ہے
کیا ہمارے پاس اس کے لئے کچھ پیسے ہوں گے
وہ کہتا ہے اسے متروک بنا دیا گیا ہے
اور اب اسے کوئی کام نہیں مل سکتا

ویسے میرا خیال ہے وہ کوئی غیر ملکی ہے
مصری یا پھر یہودی
اور ہاں مجھے یاد آیا
وہ کچھ پانی بھی مانگتا ہے

تو کیا ہمیں اس کا مطالبہ پورا کرنا ہے؟
یا اس سے کہہ دوں کہ بابا آگے بڑھو؟
خیر میں اسے پانچ پنس دیئے دیتا ہوں
اور کہے دیتا ہوں کہ آج گھر میں بس یہی کچھ ہے

اور پانی والی بات نظر انداز کئے دیتے ہیں
ویسے میرے خیال میں یہ کچھ اچھی بات تو نہیں ہے
مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی گندا ہے
بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور الجھے ہوئے بال

ماں ۔۔۔۔ اس نے پانی کے لئے پوچھا تھا
میں نے اس سے کہہ دیا کہ پانی کی ٹنکی میں شگاف پڑ گیا ہے
البتہ سکے میں نے اسے دے دیئے
جن سے ایسا لگا کہ اس کی پیاس بجھ گئی

اس نے کہا کہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
جنہوں نے اسے زندہ رکھا ہے
تب اس نے مجھے اپنی دستخط شدہ تصویر دی
اور یہ تین زنگ آلود کیلیں ۔۔۔۔

گیرتھ اوون / عباس رضوی

شہر کا گیت

میرے دماغ کو
کنکریٹ نے بے لچک بنا دیا ہے
لوہے کی سلاخیں
میرے دست و پا ہیں
میرے پیٹ کو دولت سے بھر دیا گیا ہے
اور میری روح کو
ایک سودے میں خرید اگیا تھا

انہوں نے میری شریانوں کے ذریعے
مجھ میں دھات انڈیل دی ہے
اور میرے پھیپھڑوں کو سیسہ بھر کے بند کر دیا گیا ہے
میرے خون کو انہوں نے پلاسٹک میں تبدیل کر لیا ہے
اور قتل عمد کو میرے ذہن میں بٹھا دیا ہے

میرا چہرہ ایسا تھا
جیسے موسم کا نقشہ
گوشت جس نے ہڈیوں پر نشو و نما پائی تھی
مگر انہوں نے میری کہانی آنکھوں سے چھین لی
اور میرے دل کو پتھر کر دیا

مجھے دریا کی طرح لہرا کے
اپنے منبع سے نکلنے دو
مجھے اس طرح اگنے دو
جیسے دانے سے خوشہ گندم اگتا ہے
مجھے اپنے بازو پھیلانے دو
ایک چھتنار درخت کی طرح
میرے بچوں کو ایک بار پھر مجھ سے محبت کرنے دو

دستخط

دستخط -- سمجھوتے کے' بیاہ کے' مکان بیچنے کے' گواہی کے'
دستخط -- بنک کے' وارنٹ کے' ایڈیٹر کے' منی آرڈر کے'
دستخط -- رسیدی ٹکٹ کے' چیک کے' قرقی کے' اور .... اور .... اور ....
کچھ دستخط کیلوں جیسے ہوتے ہیں' کچھ پھولوں جیسے
کچھ تلوار کی دھار جیسے' کچھ بجلی کی لکیر جیسے
کچھ دستخط پھولے ہوئے اور موٹے لفظوں جیسے' کچھ پھیکے اور چھوٹے حرفوں جیسے
کچھ وحشی سے' کچھ ڈرے ڈرے بزدل سے
کچھ سیدھے اور سادہ' کچھ ٹیڑھے میڑھے سے'
کچھ آسان' کچھ گھمسان' کچھ نرم' کچھ گرم
کچھ الجھے ہوئے' چکر سے کھاتے ہوئے....
کچھ رعب داب والے' کچھ بجیلے اور بھڑکیلے سے
کیسے کیسے ہوتے ہیں ---- لوگوں کے دستخط
کچھ کا پڑھا جانا بھی مشکل' کچھ کا سمجھ میں آنا بھی مشکل' اور ان کے ساتھ چل سکنا بھی مشکل
لیکن دوست ! میری ماں کچھ بھی لکھنا نہیں جانتی
لیکن جب انگوٹھا لگاتی ہے
تو ماں کے انگوٹھے میں بنا سنکھ' کاغذ پر بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے.....

قوس قزح

جھیل کے کنارے
شام کے ہلکے دھندلکے میں
بارش کی پھوہار پڑ رہی ہے
قوس قزح
بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہی ہے
سورج بھی افق پہ منڈلا رہا ہے
ملاح اپنی کشتی کے چپو سے
لہریں کتر رہا ہے
لیکن اس کا دل
قوس قزح نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے

کبوتر

سب سے خوبصورت کبوتری
آج صبح صبح مرگئی۔
میں نے اس کے ٹھنڈے اور مردار جسم کو اٹھایا
اور یخ زمین میں دبا دیا
کبوتر تنہا ہو کر
بادلوں سے اوپر' دوسرے کبوتروں کے ساتھ اڑنے لگا
صبح کی روشنی میں اس کے پر گرتی پتیوں کی طرح کی آواز پیدا کر رہے تھے
اور پھر وہ سب سے الگ' سب سے جدا تھا
اس کا غم شدید اور بے پناہ تھا
اس کی غمناک آواز
آنے والی موت کا نوحہ بنی ہوئی تھی

ہماری زندگیاں بھی یونہی ختم ہو جاتی ہیں
ہم بھی یونہی تنہا رہ جاتے ہیں
مگر ہمارے پاس اڑنے کے لئے پر نہیں ہوتے ہیں
ہم درد کی شدت سے مضطرب زندہ رہنے پر مجبور ہیں

ایئر ریڈ

دنیا اچانک ۔ بہت بوڑھی ہو گئی
ہزار برس کا بھونچال اور طوفان
۔۔۔۔ اسی ایک منٹ میں آیا
کیا یہ کسی کو راکھ بنانا چاہتے ہیں؟
بانسوں کے پنگھوڑوں میں سوئے ہوئے بچوں کی صبح کو؟
یا صفوں پر جو تھکاوٹ بچھی ہے؟
اور چٹائی پر جو خواب پڑے ہیں؟
یا کنجوسی سے کھانے کے بعد بچے ہوئے مٹھی بھر چاولوں کو؟
یا اس دانشمند کو جو رت جگے کاٹتا ہے؟
یا زخمی سپاہی کی بچی ہوئی ایک ٹانگ کو؟
یا پھر ڈاکئے کو، اور اس کے خطوں کو؟
آج ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟
اس لئے کہ عمر بھر کی اذیتیں انہوں نے اپنے دل پر برداشت کی تھیں
اور ان کی یہ سوچ بھی انسانی سوچ تھی
اور سوچوں کے ساتھ لفظ بھی
اور لفظوں کے ساتھ عمل بھی
اور اب بھی دنیا یہ تسلیم نہیں کرتی
کہ یہ بھی انسان ہیں۔

سایہ

اگر ہمیں دنیا کو کچھ نہیں دینا
تو پھر ہم کیوں پیدا ہوئے تھے
ہمیں وہ عزت نہیں چاہیے
جو بڑے آدمیوں کے ناموں کو سجاتی ہے
ہمیں تو عورتوں کا وہ ذہن رسا چاہیے
جو دھاگے اور موتیوں کے ملاپ سے
ہماری زمین کا حسن نکھارتی ہیں
ہمیں تو ان ہاتھوں کا روپ چاہیے
جو لکڑی کے سخت اور بے جان ٹکڑوں کو زندگی دیتے ہیں
ہمیں وہ شان و شوکت نہیں چاہیے
جو بڑے آدمیوں کا حصہ تھی
ایک نسل کا تشکر ہمارے لئے کافی ہے
ہمیں کولیوفچی جیسے معمار کی ضرورت ہے
جس کے خاموش اور بے جان پتھر
ہمارے دلوں کو خوشی سے بھر دیتے تھے
ہمیں ماسٹر مینول کے ان پروں کی ضرورت ہے
جو آواز سے بھی تیز اڑنے کی سکت رکھتے تھے
اور جو بلقان پہ اڑنے والے
عقابوں سے بھی زیادہ حوصلہ مند ہوں
ایک نسل کا تشکر ہمارے لئے کافی ہے

اسی لئے ہم اپنے ایک عظیم خواب کو
تخلیق کا روپ دینا چاہتے ہیں
گندم کے کھیت پہ برستے پانی کی طرح بنو
تازہ اور لذیذ روٹی کے ٹکڑے کی طرح بنو
جو گرفتار بلا ہیں، انہیں ہم درد سے چھڑانا چاہتے ہیں
بنجر زمینوں کو قابل کاشت بناؤ
سب جراثیم کو مار ڈالو
اور ننھے سے ایٹم سے
لاکھوں کروڑوں روشنیاں منقش کر دو
آؤ عظیم خواب کو تخلیق کا روپ دیں
اور پھر جب ہم مریں
تو پھر ہمیں زمین میں بڑے آدمیوں
کے ساتھ، دفن ہونے کا حق حاصل ہو گا

شہزادی

کس بادشاہ کی تم شہزادی ہو
جس کے رنگین لبوں پر مسرتوں کی کلیاں کھل رہی ہیں
جس کے جام بلوریں کے سرخ بلبلے اٹھ رہے ہیں
اور جس کے پنکھ لہرا لہرا کے شیریں آہنگ سے نغمہ پھوٹ
رہا ہے
اور پانی کی لہروں سے خوش اندام چہرہ کشش آور
ہو رہا ہے
کیا عمر ہوئی ہے تمھاری اور تمھارے سروں کی؟

طرف داری

مجھے گھاس میں چھپا ہوا سانپ بھلا لگتا ہے
کیوں کہ وہ نقاب پوش دوست کی طرح ایذا رساں نہیں
مجھے وہ اندھا (درندہ صفت) بھوت پسند ہے
کیوں کہ وہ ایک خبطی نقاد سے زیادہ ہمدرد ہے
مجھے ایک عیار محبوبہ کے بوسوں کے اشتعال سے کہیں زیادہ
قہر آلود بچھو کے ڈنک کی چبھن لذت دیتی ہے
میرے لئے سیاہ جنگل کا خوبصورت چیتا کہیں بڑھ کر پسندیدہ ہے
کیوں کہ وہ کسی ایسے ڈکٹیٹر کو نہیں جانتا
جو سب کچھ ہڑپ کر جانے کی اسٹراٹیجی پر کاربند ہے

لفظ

آپ کے آنے سے پہلے
لفظ
ہر روز ہی
میرے پاس
چلے آتے تھے
ایک مہمان کی طرح
پر...... آج
آپ کے آنے سے
پتہ نہیں..... کیوں
اٹک سے گئے ہیں
میرے ہونٹوں پر
لفظ ہی نہیں مل رہے
کچھ بھی کہنے کے لئے
کیا! ایسے ہی نہیں چل سکتا
میرے کچھ کہے بغیر
جیسے تمہاری آنکھیں
پیار کی گہری کھائی
بغیر لفظوں کے
کہہ جاتے ہیں
لفظ

ڈاک ٹکٹ

شہیدوں کا خوں ڈاک ٹکٹ کی طرح گلی پر چسپاں ہے
انقلاب کے پختہ فرش پر ایک شاندار لفافہ پڑا ہے
جنگ کے معنی
زندگی سے کھیلنے والی دشمنی ہے
میرے لئے
تمہاری بے اعتباری ہے

کاغذ

میرے پاس تین ہزار پانچ سو چھ روپے ہیں
ان میں سے گیارہ، سو کے
ایک سو ایک، بیس کے
دس دس کے، دس
بقیہ پانچ کے
ان میں صرف ایک روپے کا کاغذ ہے
جس پر خوبصورت نیلا نقش ہے
کسی کے دستخط ہیں
داہنی طرف سفید چاندی کے روپے، کی تصویر
بائیں طرف سفید اجلی جگہ ہے
نیچے آٹھ ہندسوں والا نمبر
اوپر میرے دیش کا نام بھی ہے
پیچھے، درمیان میں تیرہ رسم الخط ہیں
جس میں تم بھی پڑھ سکو گے
ایسے دو لفظ ہیں۔

ایک روٹی ملے گی کیا؟

(مراٹھی)

چیت

سورج نے منہ موڑا
سارے تنکے باندھ کے
پھاگن نے باندھی گٹھڑی
تین سو اوپر پینسٹھ دن
یہ بھی گئیں گزار
چیت نے ڈالی آن کے
ایک اور برس کی گانٹھ
ساری رتوں کو جھاڑ کے
پھر آج جدائی کہتی ہے
ساری راتیں میری ہیں
ایک نہیں بانٹی ہے
میرے ساجن نے منہ موڑا
ساری یادیں سنبھال کے
آج عمر نے باندھی گٹھڑی

(پنجابی)

پانچواں چراغ

کوئی وضو اور نہ کوئی سجدہ
نہ ہی منت مانگنے آئی
چار چراغ ترے سدا جلیں
میں پانچواں جلانے آئی
دکھوں کی گھانی کا تیل نکلوایا
ماتھے کی تیوری' ایک روئی کی باتی
میں نے ماتھے میں ڈالی
چار چراغ ترے سدا جلیں
میں پانچواں جلانے آئی
سوچوں کے سرور سے ہاتھوں کو دھویا
ماتھے کے دیئے کو ہتھیلی پہ رکھا
پھر روح کی آگ دکھائی
چار چراغ ترے سدا جلیں
میں پانچواں جلانے آئی
تو نے تو دیا نہیں مٹی کا دیا
میں نے آگ کا شگن اسے ڈالا
اور امانت واپس لائی
چار چراغ ترے سدا جلیں
میں پانچواں جلانے آئی

(پنجابی)

نظم

سچ اگر پوچھو
کاغذوں پر
نظم کے پودے لگانا ہی غلط ہے
یہ شجر بن جائیں بھی تو
کوئی پنچھی ان کی شاخوں پر بسیرا تک نہیں کرتا
گیت اپنے واسطے۔۔
کوئی بھی گاتا نہیں
وہ ہوا بھی
سمساتی ہے جو ان پتوں کی خاطر
ان ہی پتوں سے
گزرنے سے مکر جاتی ہے آخر
اس لئے۔۔۔۔
ایسے سارے کاغزوں کی
جن پہ نظمیں تھیں لکھی
کشتیاں میں نے بنائیں
بہتے دھاروں کے حوالے کردیا
اس توقع پر کہ شاید

لفظ معنی کے سفیر
بن کے جائیں گے کہیں ساگر کے پار
اور پھر ان بادلوں کے ساتھ ساتھ
لوٹ آئیں میری جانب
نت نئے چولے بدل کر
اور میں چلتی رہی
ان کناروں پر ندی کے
ہر طرف جن پر اگی تھیں جھاڑیاں
آس اتنی سی لئے
لفظ کے امکاں کی بے قابو یہ لہریں ---
پھیل جائیں گی وہاں
جس جگہ سے رقص کر کے مور گزرے تھے ابھی
اور شاید مل سکیں
پھر انہیں پگڈنڈیوں پر
بارشوں کے راستے
زندگی کی آنکھ میں آباد چکوے
کیا خبر لے جا کے چھوڑیں گے کہاں
اسی لئے تو دور میں نے
بھیج دیئے ہیں
منہ بسورتے اپنے سارے بھولے بھالے لفظ
تاکہ کچھ اندر ہی اندر
پل سکے ادراک
اسی لئے تو
نالفظوں کے سانولے رنگوں کی رکھشا کا

چندر کانت پاٹل / صادق

چھیاسٹھ کے اواخر کی بمبئی

تین آدمی ماہم کی سڑک پر سے
جھومتے جھومتے چلے گئے ان میں سے ایک ہمیں اسی کے
سپنے میں مرے آدمی جیسا لگا یعنی کہ
اس کا سپنا ہم نے دیکھا جو اسی کا تھا' یا
یوں کہیے کہ اس' اتنے سپنے تک ہم وہ ہو گئے تھے

ان میں سے دوسرا آدمی جھنجھوڑ رہا تھا لفظوں کو
سڑک پر تمام وقت' کتنے ہی لاکھوں دنوں سے
جھنجھوڑتا ہے وہ ایسے ہی تو ہم ہی کیوں پھینکیں
اس کی طرف سوالوں کی گل پھانسی اس لئے
دھیان دیئے بغیر اپنے آگے نکل گئے کیوں کہ
اس سے بھی زیادہ اس کے نمائشی لفظ اور
دنیا کے بھی ڈھیر سارے لفظ اپنے لئے میوزم میں
بھس بھرے ہوئے خوفزدہ پنچھی جیسے لگتے ہیں

تین آدمی سڑک پر سے جھومتے چلے گئے

ان میں سے ایک ہم ہی تھے ایسا جسے
دوسرے دونوں نے بتایا یعنی کہ پھر
اپن بھی کیوں نہیں، کہیں اور ہو بھی کیوں نہیں سکتے

(مراٹھی)

غزل

مت کہو آکاش میں کہرا گھنا ہے
یہ کسی کی ویکتی گت (۱) آلو چنا (۲) ہے
سوریہ ہم نے بھی نہیں دیکھا صبح سے
کیا کرو گے سوریہ کا کیا دیکھنا ہے
اس سڑک پر اس قدر کیچڑ بچھی ہے
ہر کسی کا پاؤں گھٹنوں تک سنا ہے
پکش (۳) او پرتی پکش (۴) سنسد (۵) میں ملھر (۶) ہیں
بات اتنی ہے کہ کوئی پل بنا ہے
رکت (۷) ورشوں (۸) سے نسوں میں کھولتا ہے
آپ کہتے ہیں چھڑک (۹) اتیجنا (۱۰) ہے
ہو گئی ہر گھاٹ پر پوری ویوستھا (۱۱)
شوق سے ڈوبے جسے بھی ڈوبنا ہے
دوستو اب منچ (۱۲) پر سویدھا (۱۳) نہیں ہے
آجکل نے پتھھ (۱۴) میں سنبھاونا (۱۵) ہے

(ھندی)

حواشی
(۱) انفرادی (۲) تنقید (۳) برسر اقتدار (۴) حزب اختلاف (۵) پارلیامنٹ (۶) بحث مباحثہ (۷) خون (۸) برسو
(۹) وقتی (۱۰) اشتعال (۱۱) انتظام (۱۲) پلیٹ فارم (۱۳) آسانی (۱۴) پردہ کے پیچھے (۱۵) امکان

نیلا اور سرخ رنگ

میں نے نیلا رنگ دیکھا ہوا ہے
میں نے سادہ (خالص) نیلا رنگ دیکھا ہوا ہے
میں نے نیلا رنگ تمہارے شانے کی چمک دمک میں دیکھا ہے
میں نے سرخ رنگ دیکھا ہوا ہے۔
میں نے سادہ (خالص) سرخ رنگ دیکھا ہوا ہے
میں نے سرخ رنگ تمہاری چھاتیوں کے درمیان دیکھا ہے
جب تم رنگوں کو پہنتی ہو تو سب رنگ بے نام ہو جاتے ہیں
یعنی اپنا رنگ کھو بیٹھتے ہیں
جو حقیقت بچ رہتی ہے
وہ حقیقت تم خود ہوتی ہو
اور تمہارے اپنے جسم کا رنگ ہوتا ہے

(ہندی)

نئی سحر

جو یہ نہیں چاہتے کہ
رات کا اندھیارا ختم ہو
شبنم سے دھلا ہوا سویرا طلوع ہو
وہ سارے مرغ کھانے لگے ہیں
کیونکہ انھوں نے یہ شک ہو گیا ہے کہ
ہر صبح اس وقت ہوتی ہے جب مرغا اذان دیتا ہے

(پنجابی)

سریشور دیال سکسینہ / قائم نقوی

بگڑا آدمی

جب سب بولتے تھے
وہ چپ ہو جاتا تھا
جب سب چلتے تھے
وہ پیچھے رہ جاتا تھا
جب سب کھانے پر ٹوٹتے تھے
وہ الگ بیٹھا ٹونگتا رہتا تھا
جب سب نڈھال ہو جاتے
وہ ٹکٹکی لگائے بیٹھا رہتا تھا
لیکن جب گولی چلی
تب سب سے پہلے
وہی مارا گیا۔

(ھندی)

پھانسی

میرے گاؤں کے کسی شجر کو
میں نے سنا کہ جیل ہو گئی ہے
اس کے گناہ کئی تھے
اس کے پتے سبز ہونے کی بجائے
ہمیشہ سرخ اگتے تھے
بغیر ہوا کے اڑتے تھے
وہ گاؤں سے باہر نہیں بلکہ
گاؤں کے کنویں میں اگا ہوا تھا
اور وہ جب بھی جھومتا تو سدا چھاؤں بکھیرتا تھا
اور دھوپ کو ڈراتا تھا
اور سفر کرتے مسافروں کو
دھوپ سے بچاتا تھا
اور پانی بھرنے والی لڑکیوں کو
بیٹی کہہ کر بلاتا تھا
اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ
اس کے پیر بھی بہت سے تھے اور
وہ راتوں کو چلتا تھا
اور گاؤں کے سارے پیڑوں سے مل کر روزانہ
واپس آجاتا تھا
اور ہوا کی بات کر کے

نظم

میں نے پلکیں بھیڑ رکھی ہیں
یادِ تمہاری آئی ہے
نیم گرم آنکھوں میں
آنسو سلگ اٹھے ہیں
میں نے پلکیں بھیڑ رکھی ہیں
دنیا میری خالی ہے
کھڑکی کے رستے کرنوں کے ساتھ
آجا چاند کی ڈلی
میں نے پلکیں بھیڑ رکھی ہیں
بیٹھ تو پاس مرے
کانوں میں میرے باری باری کہتی جا
میں ہمیشہ یہیں تو تھی
ایک ہاتھ کے فاصلے پر
میں نے پلکیں بھیڑ رکھی ہیں
کوئی نہیں کوئی نہیں
دنیا مری خالی ہے
یاد تری آئی ہے
نیم گرم آنکھوں میں
آنسو سلگ اٹھے ہیں

(پنجابی)

نریش / سمن کاظمی

آؤ بغاوت کی نئی راہ ڈھونڈیں

سانپ کی صورت
جابر سے ٹکرائیں
آؤ بغاوت کا نیا راستہ ڈھونڈیں
اپنا تن تو اپنا ہے
ننگا ہی سہی
پہلے اوروں کے جسموں کو ڈھانپیں
لمبا وصل بے لطف ہوا
کوئی صورت ہی بچھڑنے کی نکالیں
تو میری تہذیب کا اتہاس ہے
میرے جسم سے لٹکی دھجی
اتنا تو سوچنا دشمنی سے پہلے
مقابلے کے لئے میدان ایک جیسا ہو گا
وہموں کی فصل پک چکی ہے نریش
آؤ اب کہیں سے چنگاریاں ڈھونڈیں

(پنجابی)

استفان تونتیچ / علی دیپک قزلباش

زنگ آلود پٹڑیاں

بقول یونانی شاعر
"گیتی ابھی جواں ہے"
تو
کیا وجہ ہے کہ
○
سرائیوو کے خطوط متروی کو
زنگ لگ گیا
بہار کے دل میں

○ خطوط متروی: زیر زمیں چلنے والی لوکل ٹرین کی پٹڑیاں

خواب و خیال

"کیا کر رہے ہو بیٹا؟"
"خیالوں میں ماں!
خواب دیکھ رہا ہوں
گیت گا رہا ہوں
اور تم پوچھتی ہو،
"کیا کر رہے ہو بیٹا!"
گیت گا رہا ہوں
ان وقتوں کا
جب میرا گھر تھا،
اور اب نہیں ہے
گیت گا رہا ہوں، ماں!
اس وقت کا
جب میری زبان تھی
اور صدا بھی ماں!

اور اب نہ صدا ہے
نہ زباں،
اس صدا سے جو نہیں ہے
اس زباں سے جو نہیں ہے
اس گھر کا جو نہیں ہے
گیت گا رہا ہوں ماں!"

ایک دعا جو قبولیت پائے گی

پروردگار! اس سے پہلے کہ مجھے موت آجائے
مجھے مزید مصائب جھیلنے کی قوت عطا کر

مجھے سناٹوں سے کھیلنے کی توفیق دے
اور میرے پاس کچھ نہ رہنے دے ۔۔۔ حتیٰ کہ خوف بھی

دنیا کو قائم و دائم رکھ
تاکہ سمندر پہلے کی طرح ریت کا بوسہ لیتا رہے

گھاس کی سرسبزی و شادابی کو برقرار رکھ
تاکہ مینڈک اس میں پناہ لے سکیں
اور عاشق اس میں اپنا چہرہ چھپا کر
اپنی محبت کے لئے سسک سکیں

دن پوری تابانی سے چڑھتا رہے
اور یوں لگے جیسے غم واندوہ کا خاتمہ ہو چکا ہے

اور میری نظموں کو اتنا واضح کر دے
جتنا کھڑکی کا شیشہ
جس سے شہد کی مکھی اپنا سر ٹکرا دیتی ہے

رہائی

وہ مجھے اندر لائے
اور شناختی کارڈ پر نقش
میرے نام کے پہلے اور آخری حصے کو غور سے پڑھا
اور پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی
۔۔۔۔۔گویا میں خطاوار نہیں تھا
وہ دونوں رنگروٹ تھے
یقیناً انہوں نے غور سے نہیں دیکھا
یا شاید وہ میری آنکھوں میں روشن شعلوں کو پڑھ ہی نہیں سکے

رہائی کے بعد
میں زنجیروں کو پیچھے چھوڑتا آگے بڑھتا چلا گیا

دنیا

خدا نے خود کو اس لئے مخفی رکھا کہ وہ دنیا کو دیکھ سکے
اگر اس نے خود کو ظاہر کیا ہوتا تو دنیا میں محض وہی دکھائی دیتا
اور کون اس کی موجودگی میں چیونٹی کی طرف دھیان دیتا
یا خوبصورت مگر تند خو بھڑ کی طرف
جو دائروں میں تشویشناک انداز میں چکر کاٹتا رہتا ہے
یا زرد ٹانگوں والے سبز کیڑے کی طرف جو مچھلی کے شکار میں کام آتا ہے
یا اس کیڑے کی طرف جو اپنی چاروں ٹانگیں آرپار انداز میں رکھتا ہے
ابریشم میں لپٹے لوبیے کے دانوں کی طرح کی آنکھوں والی اژدہا مکھی کی طرف
ہماری بوڑھی ماں کی طرف جو کچھ عرصہ قبل تک
بڑے کنڈوں والے مگ کو تھامے میز کے کنارے بیٹھی تھی
صنوبر کے درخت کی طرف جو مخروطوں کی بجائے چھلکے گراتا ہے
دکھ اور سکھ کی طرف جو آگاہی کا ذریعہ ہیں
(دونوں ہی معمہ ہیں مگر بالکل مختلف)
اور ان پتھروں کی طرف جو راہیوں کو راستہ بتاتے ہیں

محبت جو غیر محسوس ہے اور باطنی ہے
کچھ بھی تو نہیں چھپاتی

دریچے سے دیکھتے ہوئے

فوجی اپنے سرخ بھاری بوٹوں کے ساتھ چلتے ہوئے
اپنی بوریت دور کر رہے ہیں
ایک بے آواز سوال:
"اس وقت تمہارا ردِّعمل کیا تھا
جب تمہیں نہتّے عوام پر گولی چلانے کا حکم ملا؟"
ایک بے آواز جواب:
"خوش قسمتی سے اس وقت
میں ٹی وی ٹرانسمٹر کی حفاظت پر مامور تھا"

میں تجھے نہیں بھول سکتا

اے میرے مہربان دوست
مجھے تمہارا خط موصول ہوا ہے
جو میرے لئے فخر کا باعث ہے
میں اس بات کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں
کہ تم نے میری خیریت دریافت کی ہے
تم نے لکھا ہے
میں نے تمہیں فراموش کر دیا ہے
تمہیں ایسی بدگمانی کی باتیں
زیب نہیں دیتیں!
تم میری کشور ہستی کے پاسبان
اور میری جان ہو
میں تمہیں نہیں بھول سکتا
نہیں بھول سکتا!!

زین فروشی

زین زریں
زیب دلدل ہے
پشت ورو سے زرنگار و زرگل......"
مو سفید سادہ دل' با التفات'
قیمتی گھوڑے ہیں وارفتہ سب
سرگرم راہ ہے اب عام نسل
اب نہیں کوئی' اسپ تازی
اور نہ چابک سوار۔۔۔
پیادہ رو کو زین بے کار۔۔۔
گرچہ زین بے سوار و بے سمند
ہے اب بھی خاک سے یکسر بلند۔۔۔
بے خریدار ہے مگر
پھر بھی متاع پیر کا
زین خالی
ہے یہاں منتظر شاہسوار

دوبیتی

(۱)

زباں تیری نہ سمجھے ماں بھی تیری
تجھے بیگانہ سمجھے تیری دھرتی
وہ شاخ باہر از دیوار ہو تم
پھلوں سے جس کی غیروں کا بھلا ہو

(۲)

کبھی ہے صلح، کبھی جنگ میں ہم
ہیں آسودہ، کبھی دل تنگ ہیں ہم
اگرچہ زندگی میں مختلف ہیں
نظر میں موت کی یک رنگ ہیں ہم

منصور حلاج

تمام رنگ آفتاب سے ہی نکل رہے ہیں
تمام رنگ آفتاب میں ہی سما گئے ہیں
چھپا جو سورج تو رنگ سارے فنا ہوئے ہیں
مجھے نہ رنگوں کی ہے ضرورت، مجھے نہ بے رنگیاں ہیں لازم

یہ سارے سورج نکل کے آئے، کہاں سے نکلے
یہ سارے سورج جو جا چکے ہیں، کہاں گئے ہیں
یہ مرگئے ہیں بغیر اس کے
مجھے ضرورت نہ روشنی کی، مجھے نہ تاریکیاں ہیں لازم

وہ صورتیں جو نکل کے آئیں، کہاں سے نکلیں
وہ صورتیں جو کہ جا چکی ہیں، کہاں گئی ہیں
وہ صورتیں ساری چھپ گئی ہیں
بڑے طبل سے صدا جو نکلی
تو ہو گئیں سب صدائیں مدغم
بڑی صدا میں، سمجھ تو منصور...... منصور

وطن کی خاطر

ہم نے کیا کیا نہ کیا اپنے وطن کی خاطر
ہم میں کچھ لوگ تھے جو جان پہ بھی کھیل گئے
اور کچھ ایسے تھے جو مر گئے تقریریں کرتے

ناظم حکمت / مسعود اختر شیخ

وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا

ساٹھ برس کی عمر ہوئی اور اب بھی میں
بارش، کیچڑ، گرمی، سردی جو بھی ہو
عالم ہو بیداری کا یا نیند میں ہوں
اس خواب کا پیچھا کرتا ہوں
وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا، اپنی عمر کے نویں برس میں

ہجر نے مجھ سے کیا کیا چھینا
میلوں میل امیدیں چھینیں
چھینے منوں دکھ درد میرے
جن میں کنگھی کرتا تھا وہ زلفیں چھینیں
چھینے ہاتھ کہ جن سے ہاتھ ملاتا تھا میں

خواب میں میں نے یورپ دیکھا، ایشیا اور افریقہ گھوما
البتہ امریکہ نے انکار کیا، ویزا نہ دیا
ساری جہاں گردی میں مجھے
دریاؤں اور پہاڑوں سے، صحراؤں سے بھی بڑھ چڑھ کر
انسانوں نے مسحور کیا

ناظم حکمت / مسعود اختر شیخ

انسان اور گیت

گیت انسان کے انسان سے بڑھ چڑھ کے حسیں
اس سے بڑھ چڑھ کے پر امید، امید افزا گیت
اس سے بڑھ چڑھ کے غم و یاس سے لبریز
دیر پا کتنے ہیں انسان سے انسان کے گیت

میں نے انساں سے زیادہ
اس کے گیتوں سے محبت کی ہے
زندہ رہتا ہی رہا جس جگہ انسان نہ تھے
پر جہاں گیت نہ تھے زندگی ناممکن تھی
اور گیتوں نے بھی مجھ کو کبھی دھوکا نہ دیا
جس زباں میں بھی لکھے جائیں سمجھتا ہوں انہیں

جو خوشی مجھ کو زمانے میں ملی گیتوں سے
وہ خوشی اور کوئی شے بھی مجھے دے نہ سکی
کھانے پینے کی کوئی چیز نہ سیر و تفریح
آنکھوں دیکھا کوئی نظارہ نہ کانوں پڑی آواز کوئی
میرا ادراک، میری فہم، میرے احساسات

کوئی شے ،کوئی بھی شے
وہ سعادت مجھے پہنچا نہ سکی
جو سعادت مجھے گیتوں سے ملی

ناظم حکمت / ادیب سہیل

زندان سے آٹھ خطوط: بیوی کے نام

ذیل کے آٹھ منظوم خطوط ناظم حکمت نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کے عرصے میں اپنی بیوی کو لکھے تھے جب وہ تیرہ سال کی قید و بند کی صعوبتیں بھگت رہا تھا۔

پہلا خط

میری تنہا رفیق اور مری جان جاں
آخری خط میں اپنے یہ لکھتی ہو تم
"میں عجب ذہنی الجھن میں ہوں مبتلا
دل مرا ان دنوں کچھ پریشان ہے"
آخری خط میں اپنے یہ لکھتی ہو تم
"تم اگر بر سر دار کھینچے گئے
تم اگر میری دنیا سے گم ہو گئے
زندگی میری بھی ختم ہو جائے گی"
تم مری جاں رہو گی بہ قید حیات
اور دوش ہوا پر دھوئیں کی طرح
مجھ سے وابستہ یادیں بھی اڑ جائیں گی
اور دنیا میں میرے نہ ہونے کا غم
وقت کے ساتھ ساتھ آپ مٹ جائے گا

موت اک جسم بے جان و مردہ ہے جو
ایک ڈوری میں ہے دیکھو لٹکی ہوئی

تم یقین رکھو اس بات کا میری جاں
یہ سیہ دست سفاک قاتل اگر
مجھ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا بھی دے
پھر بھی ناظم کی چمکیلی آنکھوں میں وہ
دیکھ پائے گا ہرگز نہ دہشت کا رنگ

زیست کے آخری دن علی الصبح تم
روبرو ہو گی اور ہوں گے احباب بھی
لے کے جاؤں گا مرقد میں میں ہی مگر
اپنے اس نغمہ ناممل کا غم

میری بیوی، مری جان و دل، جان جاں
ایسا کیوں میں لکھوں بھی کہ دشمن مرے
کر رہے ہیں مری موت کی سازشیں
"جانچ" کی صرف ابھی ابتدا ہی تو ہے
اور انساں کا سر کوئی شلغم نہیں
توڑنا اس کا اتنا تو آساں نہیں
تم کبھی ایسے ویسے خیالات میں
پڑ نہ جانا مری جان و دل، جان جاں
یہ ابھی ہے بہت دور امکان سے
ہو اگر پاس رکھی ہوئی کچھ رقم
گرم پاجامہ لے لو مرے واسطے
ان دنوں میں ہوں عرق النساء کا مریض
یہ نہ بھولو کبھی اے مری نیک دل
تم کہ زنداں کے قیدی کی بیوی بھی ہو
اور قیدی کی بیوی کے دل میں سدا
چاہیے روشنی آس، امید کی

دوسرا خط

جھکڑ آتے ہیں ہواؤں کے گزر جاتے ہیں
ایک جھکڑ میں ہواؤں کے مگر ایک ہی بار
ٹہنیاں چیری کی بل کھاتی ہیں دوبارہ نہیں
طائر شیریں نوا، نغمہ سرائی میں ہے غرق
بال و پر اس کے ہیں پرواز کے خواہاں، لیکن
کیا کرے بند ہے دروازہ قفس کا اب تک
اس کو وا ہونے پر مجبور ہی کرنا ہو گا
میں تجھے چاہتا ہوں اے مری دلدار حبیب
زندگانی کو ترے حسن میں ڈھل جانا ہے
زندگانی کو ترا پیار بھی اپنانا ہے
جانتا ہوں کہ ابھی دام اذیت ہے دراز
جلد ہی دام سمٹ جائے گا، کٹ جائے گا

تیسرا خط

میں گو یہاں ہوں۔۔۔۔
مرا تخیل یہاں سے باہر ہر ایک شے کو دل و نظر میں سمو رہا ہے
مری نگاہوں میں جھومتی ہیں لچیلی، لچکیلی نرم شاخیں
ہیں جن کے بازو پہ مسکراتے ہوئے حسیں نیلگوں شگوفے
ہو تم مثال بہار عالم، میں تم کو اس میں بھی ڈھونڈتا ہوں
میں رات کے وقت جب بھی اس نیلگوں سمندر کو دیکھتا ہوں
میں تم کو پاتا ہوں جان من کہکشاں میں، تاروں کے جھرمٹوں میں
میں شب کی خاموشیوں میں اکثر خیالی پرواز کے سہارے
وطن میں ہوتا ہوں دوستوں کے قریں الاؤ کے گرد رقصاں
میں اس کے شعلوں میں دیکھتا ہوں تمہارے عارض کا عکس دلکش

تم ایک شہ پارہ ہو مری جان اس ستاروں بھری فضا میں
مجھے ہے انسانیت سے عشق اور آدمی زاد سے محبت
مجھے ہے تحریک سے محبت
جواں تخیل سے ہے محبت
بلند ارادوں سے ہے محبت
جہاد پیہم سے ہے محبت
جہاد پیہم سے تم بھی وابستہ، روح ناظم ہو جان و دل ہو
مجھے ہے تم سے دلی محبت

چوتھا خط

ان دنوں میں سن رہا ہوں شہر استنبول میں
سلسلہ اندوہ و غم کا حد کو ہے پہنچا ہوا
قحط کے خونی شکنجے میں ہے حسن زندگی
بھوک سے دم توڑ دیتے ہیں ہزاروں راہ میں
تازہ تازہ خوں اگلنے کا مرض اب عام ہے
ننھی ننھی بچیاں باغ وطن کی کونپلیں
ماری ماری پھر رہی ہیں ہر گلی کوچہ میں آج
ان کی قسمت میں لکھا ہے کاسۂ دریوزگی
آرہی ہیں ان دنوں خبریں کچھ ایسی دل خراش
سچے، ایماں پروروں، محنت کشوں کے شہر سے
یعنی میرے پیارے، میرے شہر استنبول سے

تم جہاں رہتی ہو جانم یہ وہی تو ہے مقام
یہ وہی تو شہر ہے اے جان من، محبوب من
جس کی یاد آتی رہی ہے، ہر جگہ، ہر حال میں
اس جگہ بھی جس جگہ میں قید زنداں میں رہا
اور جس جا میں جلاوطنی کے دن کاٹا کیا

میرے دل پر ہے کچھ ایسا اس کی فرقت کا اثر
جیسے میں نے کھو دیا ہو اپنا کوئی نونہال

اور یہی وہ شہر ہے اے جان من جس کے نقوش
میری نظروں میں ہیں رقصاں' تیری صورت کی طرح

پانچواں خط

بج چکے ہیں نو' یہ لو' ٹاور نے بھی تصدیق کی
اب ہوا ہی چاہتے ہیں بند تہہ خانے کے در
عمر زندانی کی ہے اس بار کچھ زیادہ طویل
یعنی پورے آٹھ سال......
زندہ رہنا بھی بڑے ہی حوصلے کا کام ہے
جراتوں کی آزمائش تیری چاہت' تیرا پیار
خوبصورت ہے بہت تیرا خیال دلنواز
یاد میں تیری غزل گوئی بھی ہے دل کو عزیز
اہل زنداں کے لئے لیکن یہ سب موزوں نہیں
اس سے ہو جاتی ہے مدت قید کی بے حد گراں
چاہتا ہوں میں لبوں پر میرے بس مہکیں وہ گیت
جو دلوں میں زندگی کی آگ بھڑکاتے رہے
آزمائش کی کٹھن راہوں میں جو دیتے رہے
سوئے منزل ہم کو بڑھتے رہنے کا پرجوش درس

چھٹا خط

جیسے شہ رگ سے زندگانی کی
گرم اور زندہ خون بہتا ہو
ویسے ہی چل رہی ہے باد جنوب

نبض کی چال پڑ گئی مدہم
(کان آواز پہ لگاؤ تو)
اور الوداع کی پہاڑی پر
ہو رہی ہو گی برف کی بارش
برف کی ضرب سے زمیں پہ دراز
شہ بلوطوں کے سرخ پتوں پر
سو رہے ہوں گے ریچھ میٹھی نیند
اور میداں میں بید مجنوں بھی
ہوں گے بے برگ و بے ثمر، ساکت

جلد ہی چھپ رہیں گے کوئے' میں
ننھے ننھے سے ریشمی کیڑے
جلد ہی یہ خزاں کا موسم تلخ
دور ہو جائے گا درختوں سے
اور پھر یہ خزاں کی ماری زمیں
اس پہ چھا جائے گی گراں خوابی
آن پہنچے گا دوسرا جاڑا
اور یہ جاڑا بھی لوٹ جائے گا
اور زنداں کی کوٹھری میں ہم
کبھی غیض و غضب کے شعلے سے
کبھی امید کی شعاعوں سے
گرم کرتے رہیں گے اپنا لہو
گرم کرتے رہیں گے اپنا وجود

ساتواں خط

میرا بچہ مرض میں گرفتار ہے
باپ اس کا مقید حوالات میں

ہے ترا فکر مند اور بوجھل دماغ
تیرے وامانده بازو پہ ڈھلکا ہوا!
صرف ہم ہی نہیں ایک عالم یونہی
خونی پنجوں میں آلام کے ہے اسیر
وقت آئے گا جلد اے مری جان من
جبکہ انسان، انسان کے واسطے
لے کے آئے گا پیغام راہ نجات
جبکہ آدم ہی، آدم کو لے جائے گا
کلبہ غم سے شہر مسرت کی سمت

اپنا بچہ صحت یاب ہو جائے گا
باپ کو اس کے ہو گی رہائی نصیب
تیرا دل سرخوشی سے مری جان من
جھوم اٹھے گا، ناچے گا لہرائے گا
تیری آنکھوں کی جھیلوں میں لہرائے گی
مسکراہٹ کی تاباں، فروزاں کرن
صرف تو ہی نہیں ایک عالم یونہی
سرخوشی کے سمندر میں کھو جائے گا

آٹھواں خط

حسیں سمندر ہے وہ جسے آج تک نہ ہم لوگ دیکھ پائے
ہمارا سب سے حسین بچہ جواں ابھی تک نہیں ہوا ہے
حسیں زمانہ ہے وہ کہ جس سے ابھی تلک ہم نہیں ہیں گزرے
ہے خوبصورت ترین وہ بات تم سے جو کہنا چاہتا ہوں
مگر نہیں کہہ سکا ہوں اب تک۔۔۔۔۔

کیا تم بھوکے ہو

کیا تم بھوکے ہو؟ کیا میں نے تمہارا راشن کھایا؟
کیا میں نے تمہیں محروم کیا اور بھوکا رکھا
کیا تم ابھی بھی بدلہ لینا چاہتے ہو، حالانکہ تم نے مجھے قتل کیا
حالانکہ میں گل سڑ گیا، حالانکہ میں نے تاریک ترین دھرتی کو اوڑھ لیا
تم نے میرے گزرنے کے لئے بال کی مانند باریک پل بنایا
اس جال سے بچنے کے لئے، میں نے رستہ آپ بنایا

(نظم کا ایک بند)

مدت تک میں آسمان کا ایک ستارا تھا
جسے آسمانی فرشتے پیار کرتے تھے

اوزدیمیر آصف / حبیب فخری

جیوری

تمام رنگ ایک سی رفتار سے
میل جمع کرتے ہیں
انہوں نے پہلا انعام سفید کو دیا

پرواز

پرندے
میتیں ہیں
مٹی ان کے اندر ہے
اور آسمان باہر

مشکل الفاظ

مجھ سے ادق لفظوں میں بات کرو
موت اور اداسی جیسے
مجھے ایک ایسے گیت کا علم ہے
جو اختلاف پر لکھا گیا تھا

چڑیا

میری ننھی چڑیا
میرے لباس کی شکن پر اتر کر
کیا تم مجھے درد مندی سے دیکھ رہی ہو؟
میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں دیکھتا رہوں
سورج کے نیچے اپنے پر کھولو
اور پہلی بے عیب اڑان بھرو

وقت کی آنکھ

لمحہ ستاروں کو گھورتا اور زبان حال سے کہتا ہے
"اے ابدیت کے ساکنو۔ مری بات سنو"
عرصہ ہوا ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک مکڑی نے اپنے جال میں بڑے دلکش پھول بنائے۔ سنہری پروں والی مکھیوں کی ملکہ اور نازک تتلیوں کی ٹکلیاں ان عنکبوتی پھولوں کی دلکشی میں گرفتار ہو کر ان کی گہرائیوں تک گرتی چلی گئیں۔
مکڑی نے ان کو سیر ہو کر کھایا۔ پھر بھی اتنا بچ رہا کہ دوسری مکڑیاں بھی آتیں اس کی دولت سے تھوڑا تھوڑا لے جاتیں اور اس کو لکھ پتی کہتیں۔
انہوں نے اس سے کہا "اگر تم ان تاروں سے سونے، ہیرے موتی اور جواہرات کے تھیلے بناتیں تو انسان بھی ان مکھیوں کی طرح اپنی موت کو لبیک کہتا ہوا ان میں آ پھنستا۔ آئیں ایسا ہی کریں۔
لیکن ایک بوڑھی مکڑی نے دخل اندازی کی اور کہا۔ "نہیں، ہم فریب سے اپنی روح کیوں آلودہ کریں۔ پھولوں کی مسکراہٹ انہیں سامنے دکھا کر ان کی پشت میں زہریلے دانت گاڑ دیں۔ اسی سے ہماری خالص روح متاثر ہو گی۔ نیکی کو بدی کی خدمت پر نہ لگاؤ۔"
وقت کے اختتام تک مکڑیوں اور دوسرے جانوروں نے بوڑھی مکڑی کی بات پر یقین کیا۔ اتفاق سے جنگل کے کچھ قدیم باشندوں نے یہ بات چیت سن لی۔ ان کو مکڑی کی عقلمندی پر حیرت ہوئی۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے چالاکی اور عیاری جمع کرنا شروع کر دی اور اس کے خزینے بنا لئے۔ اور اس کو نسل بعد نسل منتقل کرتے رہے۔ اور یہ انسانی نسل کا قیمتی ورثہ آج تک بدستور دست بدست چلا آ رہا ہے۔

قتل

اپنی دونوں آنکھیں بند کر لو
اپنے دونوں کانوں کو ڈھانپ لو
انگلیوں پر بیس تک کی گنتی گنو
اکڑوں بیٹھ جاؤ
جنگ ختم ہو چکی ہے
امن نے اپنے بازو پھیلا دیئے ہیں
ملک میں خوشحالی ہے
چنانچہ خاموش اور خوش رہو
آسمان سونے کا بنتا جا رہا ہے
سارے عفریت غائب ہو چکے ہیں
محبت کا دور دورہ ہے
لو یہ پی لو
اپنے دماغ کو سو جانے دو
پر سکون رہو اور رونا بند کر دو
ہمارے ارادے نیک ہیں
اب لیٹ جاؤ
ادھر ادھر نہ دیکھو
کانوں میں آوازوں کو نہ آنے دو
تنہائی میں انگلیاں پھراؤ
ساکت و خاموش رہو

ہر چیز ٹھیک ٹھاک اور پر سکون ہے
آزادی یقینی ہے
دکھ اپنا منہ چھپاتا پھرتا ہے
جب جھٹپٹا آتا ہے
ان لوگوں کی قطاروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے
جو ایک ایک کر کے موت کی بھینٹ چڑھے ہیں
ان درخشاں پیالوں سے کہ جو محبت سے لبریز ہیں
ذہنی انبساط کا آشام پیو
دوسری چیزوں کا بالکل نہ سوچو
اور ہم پر شک نہ کرو
ہماری حکومت تو بڑی کھلی حکومت ہے
ہمیں گھور گھور کر نہ دیکھو
اپنا حصہ لینے کو تیار رہو
بعض چیزوں پر شک نہیں کیا جاتا
کہ جو ملک (کی بھلائی) کے لئے کی جاتی ہیں
جو کوئی ان کی مخالفت کرے یا ان کے خلاف آواز اٹھائے
اس کا منہ بند کر دو
اس کی آنکھیں سختی سے بند کر دو
دماغ کو سن کر دو اور سوچنا بند کر دو
دونوں نتھنوں کو بند کر دو
وہ احکامات جو ہم نے جاری کئے ہے
ان میں کوئی برائی نہیں
صاف و پر سکون رہنے کے لئے
دست بردار ہو جاؤ اور سر تسلیم خم کر دو
منہ سے آواز نہ نکلنے دو
آنکھوں کو دیکھنے سے باز رکھو
دل کو نہ دھڑکنے دو۔ احساس کو کند کر دو
(اور اسی طرح) خاموش لیٹے رہو۔

پانی کو برہم نہ کرو

پانی میں لہریں نہ پیدا کرو
میں اس کی بے انتہا صفائی دیکھنا چاہتا ہوں
اس کے ہلکورے لیتے پاتال میں دیکھو
کہ جو دماغ کی گہرائیوں جیسا گہرا ہے
کہ جو آسمانوں کی تنہائیوں جیسا گہرا ہے
یا میری آنکھوں سے بھی زیادہ گہرا
بانس کے چمکتے ہوئے پتوں سے روشن ہو کر
بانسری کی دھنیں اور نرم گیت بنتی ہیں
اے چھوٹے کیڑے ۔ بے قرار نہ ہو
پانی میں لہریں نہ پیدا کر
اور اے موج صبا سطح آب کو برہم نہ کر
مجھے خیال کی پہنائی کا گھونٹ بھرنے دے
پانی کو کون برہم کر رہا ہے
اے میرے دماغ کیا یہ تیرا ارتعاش ہے
صفائی دھندلا جاتی ہے اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے
زندگی کی لہروں کی طرح بہتے چشمے میں

آخر آخر

سب نہیں
مگر کوئی کوئی چیز
اچانک
ایک دھماکے کے ساتھ' یکلخت
بھک سے نہیں اڑ جایا کرتی
بلکہ یہ رفتہ رفتہ مٹتی ہے
آہستہ آہستہ مرتے ہوئے
ہونی سے انہونی تک کی مسافت
ایک ست رو مستقل مزاجی
کے ساتھ طے کرتے ہوئے
جیسے پانیوں کے جھاگ تھک ہار کر
ساحل کی ریت پر سو جاتے ہیں
اور جیسے دھوپ کی چادر' ڈھلتے ہوئے دن کے ساتھ ساتھ
بدن پر سے سمٹتی جاتی ہے
محبت معدوم ہونے کے لئے
کسی زلزلے کی محتاج نہیں ہوتی
یہ بغیر کسی حتمی اعلان کے
بغیر کسی پیش گوئی کے
ختم ہو جاتی ہے' پھولوں کے مرجھانے کی سی آواز
کے ساتھ ---

یوں ۔۔۔ جیسے کبھی تھی ہی نہیں
جسم
کتنی خاموشی، کس درجہ سکون سے
وقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں
اور
کوئی ماتمی دھن نہیں بجائی جاتی

ہر شخص، ہر جگہ، ہر شے
ہمیں کھاتی رہتی ہے
اور آخر کار
ہم خود کو دیکھتے ہیں
اداسی کے ایک دائرے کے بیچ
ایک خاموش اور پر ملال ہیتھوون!

خواب تقدیر

جل دیوتا کے کرودھ کا شکار
ایک بحری بیڑا
موجوں کے خلاف کرنوں سے مدد مانگتا ہے

جزیرے ---
اجنبی جگہیں' اجنبی لوگ' اجنبی زمانے ---
اکتائے ہوئے ملاح
انہیں اک دوسرے کے شرابور جسم
اور اپنی اپنی خشک زمینوں کے خواب
نظر آتے ہیں

لوگ۔ ساز اور ملاح
وہ دیکھتے ہیں' سوچتے ہیں
ان کے گھر بار' ان کے بیوی بچے
ان کی راہ دیکھ رہے ہوں گے

وہ سمجھتے ہیں
خود کو اوڈیسس جیسا
یا پھر اوڈیسی -- شاید
ٹھیک ہی سمجھتے ہیں

یہ جانتے ہوئے
کہ فرض اور محبت کی یہ نا مختتم جنگ
اتنی ہی پرانی ہے
جتنے کہ وہ لوگ خود!

لوگ۔ خواب
جن کی تقدیر ہیں

ساحلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ
خواب دیکھتے ہیں
اجنبی اور پراسرار جزیروں کے خواب
پانیوں میں گھرے ہوئے لوگ
خواب دیکھتے ہیں
آشنا اور بے تکلف بستیوں کے خواب

نئے لوگ، نئے خواب۔۔
یہ پرانے قصے کہانیاں
سن کر جی اب بھی بہل جاتا ہے
مگر اتنا بھی نہیں!

ہائیکو

سورۃ کی قرات
نیلے امبر میں جیسے
اک اجلا بادل!

○

برف آلود پہاڑ
جیسے کوئی دو دشمن
ماقبل تاریخ!

○

سوکھے پتوں سے ----
شعلے نکلے' ڈوب گئے
ظلمت اور بڑھی

○

سرما کا مچھر
تیرا تھپڑ پڑتے ہی
تھا اک نقطے بھر

○

اجلے چشمے میں
دیکھو نارنگی مچھلی
لیٹی ہے بے سدھ!

زمین پر پکنک

آؤ، ہم یہاں اکٹھے رسی کودیں
آؤ، ہم یہاں چاول کے گولے کھائیں
یہاں میں تم سے محبت کروں گا
تمہاری آنکھوں سے نیلا آسمان جھلکتا ہے
تمہاری پشت سبز جھاڑیوں سے رنگی ہوئی ہے
یہاں ہم اکٹھے ستاروں کے نام سیکھیں گے

یہاں ہم ان چیزوں کے بارے میں سوچیں
جو بہت دور ہیں
آؤ، ہم یہاں گھونگے اکٹھے کریں
دن ڈھلے سمندر سے
آؤ، ہم چھوٹی چھوٹی تارا مچھلیاں لائیں
جنہیں ہم ناشتے پر پھینک دیں
اور رات کو گزرنے دیں

یہاں میں کہتا رہوں گا
کہ میں واپس آگیا ہوں
جب تک تم دہراتی رہو گی۔ بخیر واپسی
یہاں میں بار بار واپس آتا رہوں گا
آؤ، ہم یہاں گرم چائے پئیں

یہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر
تازہ ہوا کا لمس محسوس کریں

●●

یادگار

ہزاروں نامعلوم لوگوں کی یادگار کے نیچے
نئی نو جزیرے میں سوتی ہے میری بیٹی
اس کا نام اب بھی ان میں شامل ہے
رنج اور تاسف......
ایٹم زدہ میرا ہیروشیما

نظم

ہر شام میں اپنی کھڑکی میں کھڑا
عجیب حادثوں کا انتظار کرتا ہوں
عجیب بدشگونی کا
ایک ریتلا جھکڑ گلیوں میں گھومتا ہے
اور رات کو آسمان پر کہکشاں نظر آتی ہے

میا شوجی / حبیب فخری

تانکا

ایک اور آزاد ملک
آج پیدا ہوا تھا
درمیاں تمام تر فاصلے کے باوصف
میں نے آج کا سارا دن خوش و خرم گزارا

جیسے موم بتی کا لمبا شعلہ
چمکتا اور ٹمٹماتا ہے
اسی طرح میری جوانی جلتی ہے
اور اسی طرح گزر جاتی ہے

تماشاہ گاہ کے پیچھے

روشنی بجادو
اور گرما کو چھوڑ
--- آہا یہ قدرے سرد ہے
لیکن،
--- قدرے بوجھل ہے
--- ایک مشکی فرس
جھانک رہا ہے

جہانِ بے وفا

یہ زمین جس پر خونخوار ہوائیں چل رہی ہیں
تم میں سے جو بھی آیا یہاں پر۔۔۔۔ برہنہ بچے کی شکل میں آیا
اس جہاں میں کچھ بھی نہ تھا تمہارا
اور جسم بھی تھا ٹھنڈا پارہ
پھر اک عورت نے تمہیں آغوش کی چادر میں محفوظ کیا

اس سے قبل
کسی نے تمہیں پکارا نہ تھا۔۔۔
اور نہ ہی کسی نے تمہیں تلاشا
تم بنا سامان زندگی چل رہے تھے۔۔۔۔ اپنے ہی ڈھنگ میں
اس جہاں میں تم اجنبی پنچھی سے کم نہ تھے
ایسے میں۔۔۔۔
اک شخص نے بڑھ کر تمہاری انگلی تھام لی

اس دنیا پر کیا تیرا کوئی قرض تھا' جو وہ چکاتی۔
تب ہی تو۔۔۔۔ یہاں سے جاتے سمے اس نے تجھے روکا نہیں
مگر!
بہت سے پیاروں نے تخیل کے پنچھی کو اڑایا
یہاں تک کہ اڑا کر شاہین بنایا
اور ایسے بھی تھے بے شمار۔۔۔۔

جنھوں نے بدلے میں تیرے آنسو بہائے
مگر!

یہ دنیا جہاں خونخوار ہوائیں چلتی ہیں
ایک دن تم بھی۔۔۔
اپنے رستے زخموں کے نشانوں کو سمیٹتے ہوئے
اوجھل ہو جاؤ گے
کبھی نہ آنے کے لئے
دور جا کر کہیں گھر بساؤ گے
افسوس! ہم سب جہان بے وفا کی محبت میں۔۔۔
اتنا کھو جاتے ہیں۔۔۔۔ اور جاتے ہوئے
سب کچھ ہی اپنا لٹا جاتے ہیں

تم بھی بولو

تم بھی بولو
بولو آخر تک
جب تک کچھ کہہ سکتے ہو
بولو۔۔۔۔
لیکن ہاں اور نہ کو منتشر یا بکھرنے نہ دو
اور اسے جدا نہ کرو
اپنی بات کے معنی میں
ہاں اور نہ کی
صداقتوں کا سایہ کرو
اپنی آواز کو
سایہ دار بنانے کی اس حد کو بھی یاد کر لو
جتنی تمہاری طاقت ہے
اسے دو جتنا دے سکتے ہو
کیونکہ تم جانتے ہو
کہ یہ رات کے درمیانی عرصے
اور صبح اور رات کے درمیان رہتے ہیں
چاروں طرف دیکھو
دیکھو۔۔۔۔
یہ چھلانگ لگانے والے کیسے زندہ ہیں
جہاں موت زندہ ہے
وہ سچ بولتا ہے
جو سائے کی طرح بولتا ہے

گجر کی آواز

گجر کی صاف آواز مجھے وقت کا احساس دلاتی ہوئی گزر رہی ہے
میرے حواس لرزاں ہیں
میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ
گریزاں دن کو قابو میں کر لوں
میرے نظارے سے پہلے تک کوئی شے مکمل نہیں تھی
ہر شدنی اپنی جگہ ساکت تھی
اب ہمارے نظارے میں پختگی آگئی ہے
اب اس خلوت سے جو کچھ بھی ظاہر ہو گا
اس کی حیثیت عروس نو کی ہو گی
کوئی شے اتنی کم مایہ نہیں
لہٰذا میں اس سے محبت کرتا ہوں
میں اس میں سنہرے رنگ بھرنا
اور اس کو عظیم دیکھنا چاہتا ہوں
اسے، میں گراں قدر سمجھتا ہوں
اور نہیں جانتا کہ کس کی روح کو اس سے آزادی ملے گی.....

ان کے نام جو موت میں زندہ ہیں

تم زندہ ہو، تم سب جو تپتی ہوئی رہائشوں میں
فنا ہوئے، پتھروں کے نیچے کچلے گئے
رسی پر جھولتے ہوئے، کتوں سے بھنبھوڑے گئے
تم زندہ ہو
تم جنھوں نے گھٹنوں کے بل چلنے سے انکار کیا
اور مارے گئے

تم ہم میں زندہ ہو
جو موجود ہیں اور جن کی موجودگی
زندہ رہنے کا نام صرف اس وقت تک
کماتی ہے جب تک ہم تمہیں یاد رکھتے ہیں
اور تم اس طرح
قاتلوں کی دوسری بار آمد کو روکتے ہو

ایک ساتھ جاگنا

ہماری بزم ٹانگیں' بازو اور زبانیں
دس بار بل دی ہوئی
وہ سوں تیار کرتے ہیں
شاید مبارکباد کے پیغامات' کومل
رات میں سے ان کے ظہور کی طرح

زبان

شجر
رات سے زیادہ طویل
وادی میں جھیلوں کی سانسوں کے ساتھ
ٹھہراؤ سے اوپر
سرگوشی کے ساتھ

سنگریزے
پاؤں کے نیچے
چمکتی ہوئی شریانیں
غبار میں دور تک
ہمیشہ کے لئے

زبان
دہشت زدہ
تھکے ہوئے منہ کے ساتھ
ختم نہ ہونے والے راستے پر
اپنے ہمسائے کے گھر تک

سائرن کی آوازیں

مجھے اپنے کانوں کے لئے
نہ ہی لاکھ چاہیے
اور نہ ہی ایک ستون
بندھ جانے کے لئے

میں اپنے خیالوں کو
ان کے نقرئی گیتوں
کی سان پر چڑھاتا ہوں

چہرہ

اس چہرے کو دیکھے ہوئے کتنے جگ بیت گئے ہیں
چہرہ جو کسی اور کائنات کے دور افتادہ
ساحل پر کسی چھلاوے کے شعلوں میں جھلکا تھا
آسیبوں سے آدھا بے رنگ
اور آدھا روز مرہ کاموں میں ڈوبا ہوا
میں تمہیں یاد نہیں کر سکتا
جو مجھے ایک انوکھے پرندے کے تاثر کے ساتھ
دیکھتا ہے کہ جو ایک دن سارا دن
میرے روز مرہ کاموں کو دیکھتا رہا

بچے کا کمرہ

دریا کا کنارہ جو میں نے جوانی میں چھوڑ دیا
ہوا اور نرسلوں کے ساتھ روتا ہے

خواہش جو نرسلوں میں تبدیل ہو چکی ہے
ہوا میں سرسراتی ہے

ہوا چلتی ہے
اس دریا کے کنارے جو میں چھوڑ چکا ہوں
نرسل رو رہے ہیں
میرے دل کی گہرائیوں میں
نرسل زار و قطار رو رہے ہیں

چانگ سو۔ کو / یونس ملک

گرمیوں کی ایک دوپہر

ہر طرف چھایا ہوا ہے سناٹا
بحر و بر کی سخن چینی کو
چپ سی لگی ہے
سورج کی شعائیں ہیں دریدہ دہن
باد سموم چلتی ہے
گرمیوں کی یہ دوپہر
کیا کیا سو رنگ بھرتی ہے
چاند کی مدھر روشنی کا متلاشی
دل وحشی کنارہ گیر
جسے زندگی کی گم گشتہ جنت کا
اب کوئی گیت یاد نہیں
ڈھلے جو دن تو گراں خاطر
دل ناشاد کو بھی قرار آئے
جیسے چمن سوختہ میں
چپکے سے بہار آئے
ان تپتی دوپہروں میں
گرمی گفتار بھی نہیں
کوئی جھنکار بھی نہیں
مردنی سی چھائی ہے ہر در و دیوار پر
نیلگوں آسمان کی پہنائیوں میں

ان گرمیوں کی شاموں میں
ایک طائرِ بے نوا کی شب باشی
کتنی حسین لگتی ہے

چڑیا

جس دن کلیوں نے گھونگھٹ کھولے' میں پلٹ آیا'
اپنے عادی راستے پر پھول نے بڑھتی ہوئی گرمجوشی سے
نم آلود پہلی کونپل کھولی' اس دن
ایک چڑیا میرے سر پر گا رہی تھی
چڑیا کہیں چلی گئی' مجھے نہیں معلوم کہ کہاں
بے نشان راستے پر جہاں والدین' بیوی' بیٹے یا سچی محبت
آپ کا تعاقب نہیں کر سکتے
ایک برہنہ ٹہنی سرد ہوا میں جھول رہی ہے
میرا گیت برف میں کہیں گہرا دفن ہے
ایسی سردی کے تصور میں' میں اپنے' لیے رستے پر پلٹ آیا
چڑیا تنے ہوئے آسمان میں اڑتے ہوئے ضرور کہیں
مایوسی کے عالم میں مر چکی ہو گی

چشم کرمک

ننھی منی
کھلی کھڑکی
اپنے کان ادھر لگاتی ہے جہاں سے
آواز آرہی ہے
شبنم گل سے نم' ایک سڑک پر
علی الصبح وہ لڑکیاں
اب بھی منتظر ہیں؟
جوانی کو پہنچتی لڑکیوں کی کھلی کھڑکی
کون کسی اور کے لئے کبھی نہیں مر سکتا
زندگی صرف ایک بار زندہ رہنے کے لئے ملتی ہے

راکھ

میں اپنے تمام گناہ
اپنی راکھ سے چھپاتا ہوں
میں اپنے عام دکھ اور خوشیاں
اپنی مشت بھر راکھ سے چھپاتا ہوں
لیکن اے کوو!
زنگ آلود چھری کی آواز کے ساتھ چلاؤ
میری راکھ کا ماتم کرو ہوا اسے اڑا لے گئی
میری مشت بھر راکھ کا ماتم کرو
جو میرے گناہوں کو بھی چھپا نہیں سکتی
چلاؤ اپنے کالے رنگ کے ساتھ' سارے شور و غل
سے گزرتے ہوئے
رنگ جو ساروں کو متحد کرتا ہے

ہماری ماؤں کو فراموش مت کرو

ہماری ماؤں کو فراموش مت کرو
جو ایک متعین صبر کے ساتھ
ہمارا انتظار کر رہی ہیں
ہمارے آبا کو مت بھولو
جو جیلوں میں سڑ رہے ہیں
اور کانوں میں گھل رہے ہیں
ہمارے بچوں کو اپنی یادوں سے دور نہ رکھو
جن کے بدن
گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں
اب انتقام کا ہاتھ بلند ہو چکا ہے
اور ہم
مزید یقین کے ساتھ
اعادہ کرتے ہیں
کہ افریقہ آزاد ہو گا
ہم اسے آزاد کرائیں گے

وطن دشمنوں کے لہجے کی ایک نظم

اس نگر میں روشنی ممنوع ہے
اس نگر میں تتلیاں بدکار ہیں
اس نگر میں پھول بھی معیوب ہے
اس نگر میں گیت گانا جرم ہے
اس نگر میں مسکراہٹ کفر ہے
اس نگر میں خواب پر تعزیر ہے
اس نگر میں قہقہے قیدی ہوئے
اس نگر میں ہر پرندہ مر ہی جائے
اس نگر میں چاند پر الزام ہے
اس نگر میں کون دیکھے آفتاب
اس نگر میں عورتیں پوری نہیں
اس نگر میں مسکرانا موت ہے
اس نگر میں زندہ رہنا الاماں!
اس نگر میں شعر کہنا الاماں!

انتقام

تمہیں کیسا لگے گا
اگر میں رات کے اندھیرے میں آؤں
اور تمہارے پہلو میں نیزہ اتار دوں
اپنے ان شہیدوں کا انتقام لینے کے لئے
جن کو تم نہیں جانتے تھے
جن کے زخم مخفی ہیں
جن کی کوئی یادگار نہیں
وہ جن کو تم صرف جشن کے اوقات میں
یاد کرتے ہو
ہم ان کو نہیں بھولے
دن بدن
ہمارے انتقام کی آگ تیز
اور اس کے شعلے
تمہارے شہروں
تمہارے بچوں کے گرد
اپنا حلقہ تنگ کرتے جاتے ہیں
جو راکھ کے مینار بن کر
ہمارے انتقام کی گواہی دیں گے

سیفو سی پاملا / افضل احسن رندھاوا

قیامت کے روز

کالے لوگ پیدائشی گانے والے ہیں
کالے لوگ پیدائشی دوڑنے والے ہیں
کالے لوگ پیدائشی ہیں امن پسند
ہم کو بے وقوف شمار کریں ہیں یہ خرافات
شیہین کے بلبلوں کے ساتھ ہم کو گھونٹ گھونٹ پیا گیا
ہم گلے کو گھونٹ دینے والی گرد سے واقف ہیں
ہم ذلت کے درد سے تڑپے کروٹ کروٹ
گانے والے
دوڑنے والے
امن پسند
اصل میں کوئی دیکھے نہیں ہے اس طوفان کو، جو
ہمارے اندر امڈ رہا ہے
کوئی نہیں پرواہ کرتا یہ جاننے کی کہ اب ہماری
اپنی اصلیت تک رسائی ہو چکی ہے
تضحیک اک اذیت بن گئی
گانے والے
دوڑنے والے
امن پسند
مرے جوتے پر
مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم سارے راتوں کے پہرے پہ کھڑے گائیں گے

جھاڑیوں میں پنپتے ہوئے
سوروں اور کتوں کے بچے نہیں ہیں
کہو نا کہ اب چیتھڑوں میں چھپی لڑکیوں کی
جوانی کو خوابوں سے محروم رکھنا بڑا جرم ہے
کہو نا کہ اب سرخ جسموں کی تکریم کا ہر زمانہ پرانا زمانہ ہوا
کہو نا کہ اب گوریوں کے لئے خاص تعظیم کا ہر زمانہ پرانا زمانہ ہوا
کہو نا، ہمیں اپنی کالی جسامت پہ اب
شرمساری نہیں ہے
نہیں ہے
کہو نا، ہمیں اپنی بھدی شباہت پہ اب
شرمساری نہیں ہے
نہیں ہے
کہو نا کہ ہم بھوک کی تال پر ناچتے ناچتے تھک چکے ہیں
ہمیں موت کے راگ پر رقص کرنا بھی اچھا لگا ہے
کہو نا، ہمارے لئے خوف کی نائکہ مر چکی ہے
کہو نا کہ ہم ظلم کی فاحشہ کے لئے ماں کی حرمت کا اعلان کرتے نہیں
کہو نا کہ ہم آمروں کے لئے اب کسی نیک خواہش سے معذور ہیں
کہو نا کہ ہم سبز جمہوریت کے علمدار ہیں
کہو نا، ہمیں ناریل اور کافی کے کھیتوں میں
آزادیاں کاشت کرنے سے محروم رکھنے کے دن جا چکے ہیں
کہو، کہ ہم نفرتوں کے دھوئیں سے الگ ہو چکے ہیں
کہو نا کہ ہم بھیک خیرات کے سارے کشکول۔۔۔
صحراؤں میں دفن کر آئے ہیں
کہو نا کہ ہم امن کے نغمہ گر ہیں

نیلسن مینڈیلا / شوکت ہاشمی

مادر وطن افریقہ کے لئے ایک اعلان نامہ

کہو نا' سیاہ فام ماؤں کے بیٹے بھی آدم کی اولاد ہیں
کہونا' ہمارے لئے جھونپڑوں اور کچے گھروں کی سکونت
کی اندھی روایت کا الہام' سچا نہیں ہے
کہونا' ہمارے عقیدوں میں
کالک نہیں ہے
کہونا' غلامی ہمارا مقدر نہیں ہے
کہونا' مسلسل غریبی ہمارے نصیبوں میں شامل نہیں ہے
کہونا' ہمارا خدا بھی خدا ہے
جو جھلسی ہوئی جھاڑیوں میں نہیں
عرش پر ہے
کہونا' چمکدار سورج ہمارے سروں پر چمکتا بھی ہے
کہونا کہ ہم لولے لنگڑے نہیں
اندھے بہرے نہیں ہیں
کہونا کہ دو وقت کی چھاچھ اور روٹیوں کے لئے
گرم صحراؤں کی دھوپ میں ــــــ یہ مویشی چراتے ہوئے
چھوٹے چھوٹے سے بچے بھی
ماؤں کے' باپوں کے بچے تو ہیں

جھاڑیوں میں پنپتے ہوئے
سوروں اور کتوں کے بچے نہیں ہیں
کہوناؔ کہ اب چیتھڑوں میں چھپی لڑکیوں کی
جوانی کو خوابوں سے محروم رکھنا بڑا جرم ہے
کہوناؔ کہ اب سرخ جسموں کی تکریم کا ہر زمانہ پرانا زمانہ ہوا
کہوناؔ کہ اب گوریوں کے لئے خاص تعظیم کا ہر زمانہ پرانا زمانہ ہوا
کہونا، ہمیں اپنی کالی جسامت پہ اب
شرمساری نہیں ہے
نہیں ہے
کہونا، ہمیں اپنی بھدی شباہت پہ اب
شرمساری نہیں ہے
نہیں ہے
کہوناؔ کہ ہم بھوک کی تال پر ناچتے ناچتے تھک چکے ہیں
ہمیں موت کے راگ پر رقص کرنا بھی اچھا لگا ہے
کہونا، ہمارے لئے خوف کی نائکہ مر چکی ہے
کہوناؔ کہ ہم ظلم کی فاحشہ کے لئے ماں کی حرمت کا اعلان کرتے نہیں
کہوناؔ کہ ہم آمروں کے لئے اب کسی نیک خواہش سے معذور ہیں
کہوناؔ کہ ہم سبز جمہوریت کے علمدار ہیں
کہونا، ہمیں ناریل اور کافی کے کھیتوں میں
آزادیاں کاشت کرنے سے محروم رکھنے کے دن جا چکے ہیں
کہوناؔ کہ ہم نفرتوں کے دھوئیں سے الگ ہو چکے ہیں
کہوناؔ کہ ہم بھیک خیرات کے سارے کشکول۔۔۔
صحراؤں میں دفن کر آئے ہیں
کہوناؔ کہ ہم امن کے نغمہ گر ہیں

محبت ہمارا ترانہ بنے گا
کہو نا، ہماری سیاست ہمارا ادب زندگی کا سہارا بنیں گے
کہو نا، ہمارا تمدن ہماری ثقافت، اخوت کی تحریر کا خوشنما تر صحیفہ بنیں گے
کہو نا، کہ ہم خوف کھاتے نہیں ہیں
کہو نا، کہ ہم بزدلی اور پسپائی کی آگ پیتے نہیں ہیں
کہو نا، کہ ہم اب کھلے جھونپڑوں پر، کھلے ساحلوں پر
کھلے مورچوں پر ۔۔۔ نئی زندگی کو
جنم دے رہے ہیں
سیاہ فام ماؤں کے بیٹو! مبارک
یہ اعلان نامہ مبارک
سیاہ فام ماؤں کے بیٹو!

زہریلے لفظ

میں وحشی ہوں
میں عادی ہوں
کیلنڈر جب بدلتا ہے ـــــ میں جولائی کی دس تاریخ پر
کچھ لال قوسیں پھیر دیتا ہوں
زبان اپنی (اسی تاریخ کو ـــ جب ریت پر شعلے برستے ہیں
انہی شعلوں کی حدت سے ـــــ ستمگر کو برا جبڑوں کو بھر لیتا ہے زہروں سے)
اسی تاریخ کو اس ناگ سے ـــــ اس کو برا سے
میں زباں اپنی کو 'ڈسوانے کا عادی ہوں
میں وحشی ہوں
مرے جذبوں میں بس اس واسطے کچھ زہر رقصاں ہیں
مرے جذبات زہری ہیں مرے الفاظ زہریلے
مرے لہجوں میں پھنکاروں کے شعلے تاب دیتے ہیں
کہاں سے لاؤں شہد آمیز شبنم۔ معذرت خواہ ہوں
میں حبشی ہوں
سیہ فاموں سے استعمار کا ریشم بچالو تم ـــــ میں وحشی ہوں

باغ مئی

مئی کا سورج آہستہ ہوتا جاتا ہے
خامشی سے تاکستان پر
یک روزہ جذبہ ترش پیازوں کی طرح
بے دم ہے
اے ہوا، تو اتنی ناتواں ہے کہ ایک پتہ ہلانے سے عاجز ہے
سدا بہار پیڑ کے پتے
گہری گھاس پر کسی فریب میں گم پڑے ہیں

آسمان کا ایک گوشہ

میں خالی خالی آنکھوں سے دریچے سے باہر نگاہ کرتا ہوں
اور نیلے آسمان کا ایک گوشہ دیکھتا ہوں
اس سے مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے
کتنا لمبا عرصہ آسماں کے بغیر گزار دیا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کوئی بہت قیمتی شے
دوبارہ حاصل کر لی ہے
میرا دل جو چار تنگ دیواروں میں مقید تھا
وسیع میدانوں کے کناروں پر کھلنے لگا ہے
آسماں کی محرابی چھت کے نیچے
میں خوشی میں ایک سنگریزے کو ٹھوکر مارتا ہوں

پرچم

ایک بے آواز نعرہ
ابدی یا ماضی کے خروش کا رومال
سمندر کی دور نیلاہٹوں میں لہلہاتا ہے
عزم عالی لہر کی طرح ہوا میں لہراتا ہے
خالص اور راست عصائے خیال پر
رنج اپنے پر سارس کی طرح پھیلاتا ہے
میں حیران ہوں کہ کس نے سب سے پہلے
ہمارے درد بھرے دل کو ہوا میں لہرایا تھا

برفانی موسم کی ایک رات

تاحدِّ نظر پھیلی ہوئی برفیلی شام
اور اس پر نقاشِ ازل کی گل کاریاں
دور تک نہ کوئی مُسافر نہ راہرو
برف سے اٹی گزرگاہ پر یہ نقشِ پا
جو نشانِ منزل نہیں، فریبِ نظر ہیں
یہ گھنے جنگلات یہ مناعی قدرت کے امیں
جن کے چرنوں میں بچھی جاتی ہے
حسنِ مطلق کی برف پوش چادر
یہ برف پوش پربتوں کا سلسلۂ دراز
جو کبھی موسمی پرندوں کا مسکن تھا
برف کے گالے بلند و بالا چوٹیوں سے لڑھکتے ہوئے
ندی کے تیز دھاروں پر رت جگا مناتے ہیں
اندھیرے اور روشنی کا یہ سفر
ایک نازک آبگینہ ہے
جیسے اک حسینہ ہے
آج پھر مجھے نظر آئی ہے ایک موہوم سی صورت
جیسے شبِ تار میں
کوئی آویزہ ٹمٹماتا ہے

میں نے دیکھے ہیں یہ دکھتے ہوئے رخسار پہلے بھی
بحیرۂ روم کے ایک شاپنگ آرکیڈ میں
جہاں دو چار ہوئی تھیں
یہ نم آلود آنکھیں
اور جہاں آب شور نے
جھک کے چھوا تھا ریت کو
اٹھتے جوبن کا یہ اجرام ہے
زندگی مجھے تیرا احترام ہے
یہ دشت و بیاباں کی اتھاہ گہرائیاں
جو گوشہ عافیت ہیں
گھنے جنگل جو نوحہ کناں ہیں
وقت کی برق رفتاری پر
وقت جو دبے پاؤں چلا جا رہا ہے
پربت کے سایوں کی مانند دم سادھے
بے حس و حرکت

مجھے پہلے خبر نہ تھی

مجھے پہلے خبر نہ تھی
کہ سارا سال
چاند رات کو نکلتا ہے

مجھے پہلے خبر نہ تھی
کہ میں تجھے اتنی شدت سے یاد کروں گا

مجھے پہلے خبر نہ تھی
کہ رات کے وقت
روشن ترین چاند کو کیسے دیکھنا ہے

مجھے پہلے خبر نہ تھی
کہ چاند
میرا دکھ ساتھ لے کر آئے گا

کوہ در کوہ

زمین پر رکھے ہوئے پہاڑ
خوبصورت ہیں
پہاڑ خوبصورت ہیں
کہ وہ ہمیشہ اونچے ہی رہتے ہیں
پہاڑ خوبصورت ہونے کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتے
کہ معصوم چرند اور ھیلن سے زیادہ حسین پھول
وہاں ایک ساتھ رہتے ہیں

میں دور کے پہاڑوں کو تکتا رہتا ہوں
زرافے کی طرح اپنی گردن اوپر اٹھائے
میں ان جیسا بننا چاہتا ہوں
پہاڑ کے بعد پہاڑ
اور پھر پہاڑ

چنگاری

چراغ خامشی کی طرح تم
ایک حجلۂ بے عروس میں شب زفاف
جل رہے ہو
کوئی بھی تم پر رشک نہیں کرتا تو پھر
میں اپنے دل کو تمہاری صورت پر کیوں بناؤں
جب یہ شب مختصر ایک اور اگلی صبح میں ڈھل جائے گی
تمہارا شعلہ خاموشی سے دم توڑ دے گا

کورا کاغذ

ایک مہینے نے اپنے لبوں سے کورے کاغذ کو چھو لیا
ایک روز جب میں سفید کاغذ پر نظم لکھنے کی کوشش میں تھا
میرے ہونٹ بھی اتفاق سے کاغذ کے ساتھ مس ہوئے
اور مجھے کورے کاغذ پر نظم لکھنے کی خواہش ہوئی
اپنے ہونٹوں سے

دھوپ کی دیوارِ سنگ سے سرگوشی

دیوارِ سنگ سے سرگوشی کرتی دھوپ کی طرح
دوب کے نیچے سے جھانکتی ندی کی طرح
میں سارا دن آسمان کی طرف دیکھنا چاہتا ہوں
میرا دل ایک پیاری سی بہاریں پگڈنڈی سے جڑا ہے
کسی دلہن کے رخساروں پر حیا کی سرخی کی طرح
موسیقی کی دیویوں کے دل کو جھنجھناتی کومل لہروں کی طرح
میں ریشمیں آسمان کی طرف دیکھنا چاہتا ہوں
ایک ملائم زمرد کی طرح جو پاس ہی بہتا جاتا ہے

ایک دن......

سرِ کہسار بجلی کا چمکنا
پسِ کہسار بجلی کا کڑکنا
درمیاں ان کے
اک گنگ چمکیلی چٹان

خامشی

سائے کے فرغل میں نیندوں کی حسرت میں
ایک میت کی طرح ابد میں مدفون
پہاڑی پر گھاس کو نیچے گراتی ہوا
زمین کو متزلزل کرتی آسمان کے آرپار کڑکتی بجلی
اسے اب جگاتی نہیں
مسرت دور دراز سے آکر
اونچے درختوں کی چوٹیوں پر اترتی نہیں
سیاہ و سفید پھولوں کو منتشر کرتے ہوئے
جو کچھ اداسی مجھے بتائے گی
میں اس کی ایک خزینے جتنی قدر کروں گا
اور اپنے ذہن میں
ایک متبرک اقلیم قائم کروں گا

تتلی اڑی

بید کے زرد کنج کی سمت
جو اپنی پتیاں کھولنے ہی والا ہے
ایک سفید تتلی اڑ رہی ہے
ایک خفیہ ارادے کے ساتھ

ایک سفید تتلی اڑی ہے
خفیہ ارادے کے ساتھ
بید کے زرد کنج کی سمت
ایک ایسے مکان کی طرح جس میں کوئی نہ رہتا ہو
سوائے ایک اکیلی لڑکی کے

پھول ہی پھول

مشرق میں آسمان ختم ہوتا ہے
بارش کی ایک بوند بھی وہاں گر نہیں رہی
اور پھر بھی پھول شعلہ بھڑک رہے ہیں
میں نے اپنی زندگی کے لئے کیسے ختم نہ ہونے والے دنوں
کا خواب دیکھا تھا
جب سحر ٹنڈرا پر سرد طلوع ہوتی ہے
پھولوں کی کونپلیں گہری برف میں لہلہاتی ہیں
ان دنوں جب پرندے ڈاروں کی صورت اترتے ہیں
وعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا
چڑھتی اترتی لہروں کے درمیان
ہوا میں جلتے سنگھاسن میں
بہت سی خوش و خرم تتلیوں کی صورت خواب دیکھنے والوں کی طرح
میں تمہیں اس دور افتادہ مقام سے آواز دیتا ہوں

ویران جزیرے والا آدمی

ویران جزیرے والا آدمی
انسانوں کے طور طریق بھول گیا ہے
اس کی ساری کہانیاں
اس کے اپنے بارے میں ہیں
وہ روز صبح سے شام تک
خود اپنے آپ سے راز و نیاز کرتا ہے
اور سبز بوتلوں میں بند پیغامات روانہ کرتا ہے
جو کہتے ہیں میری مدد کرو
مجھے پھینک دیا گیا ہے
اور گھر سے بہت دور
وہ روز دیکھنے جاتا ہے
کہ افق پر کوئی جہاز نظر آئے
مگر اس جزیرے کے کنارے تک کچھ نہیں پہنچتا
سوائے مضبوطی سے بند کی ہوئی سبز بوتلوں کے

بہار کے ریشم کے کیڑو!

ریشم کے کیڑو! تم ریشم کے تار بن رہے ہو
نہیں، تم تو شعری سوغات تخلیق کر رہے ہو
کتنی ارفع، کتنی مقدس کتنی نازک اور کتنی دلربا ہے تمہاری یہ شاعری
تمہاری یہ شاعری کن انتہاؤں کو چھوتی ہے
میرے پاس تو اس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ہیں

ریشم کے کیڑو! تمہاری شاعری
کیا یہ آورد ہے کہ بے ساختہ ہے
کیا تم فنی باریکیوں کے ساتھ تخلیق کرتے ہو
یا پھر یہ فطری بے ساختگی کا اظہار ہے
کیا یہ تم دوسروں کے لئے تخلیق کرتے ہو
یا پھر یہ تم صرف اپنے لئے بناتے ہو

ریشم کے کیڑو! مجھے ڈر ہے کہ تمہاری شاعری
کہیں محض بے ساختہ
اور غیر ارادی تو نہیں
فن کا وہ محل جو تم تعمیر کر رہے ہو
افسوس ہے کہ
وہ صرف اور صرف تمہارے اپنے لئے ہے

اے زمیں! میری ماں!

اے زمیں! میری ماں!
آسمان سحر کے رنگ میں پہلے ہی پھیکا پڑ گیا ہے
تم اپنی کوکھ سے بچے کو نمو دیتی ہو
اب میں تمہاری کمر پر رینگ رہا ہوں

اے زمیں! میری ماں!
جب بھی میں فردوس نما باغوں میں گھوما
سمندروں کی تہوں میں اترا
تم نے مجھے سنبھالا دیا
تم نے مجھے وہ آہنگ دیا کہ جس نے میری روح کو آسودگی بخشی

اے زمیں! میری ماں!
ماضی' حال اور مستقبل کے حوالے سے
تم میرے لئے غذا ہو' زندگی ہو' پناہ گاہ ہو
میں تمہارے احسانات کا بدلہ کس طرح چکا سکتا ہوں

اے زمیں! میری ماں!
اب میں خود کو تہ خانوں میں مقید نہیں کروں گا
میں تمہارے کھلے بے گیاہ میدانوں میں
اپنے فرض کو ادا کر کے

تم سے سرخرو ہوں گا

اے زمیں! میری ماں!
میں تمہارے فرض شناس بیٹوں اور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں پہ رشک کرتا ہوں
وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں
تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں! میری ماں!
میں تمہارے پیارے' کوئلے کی سیہ کانوں میں کام کرنے والے کارکنوں پہ رشک کرتا ہوں
وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں
تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں! میری ماں!
میں ہر شاخ' ہر ٹہنی' اپنے بھائیوں اور تمہاری اولاد پہ رشک کرتا ہوں
یہ سب لوگ کس قدر سرخوشی' آزادی' قناعت اور قوت کے ساتھ
اپنی اپنی زندگی کے مزے لوٹتے ہیں

اے زمیں! میری ماں!
میں جانداروں سے چاہے وہ حشرات الارض ہی کیوں نہ ہوں' ان پہ رشک کرتا ہوں
ہاں میں پرندوں پہ رشک نہیں کرتا
کیونکہ انہوں نے پر پرواز وا کرنے کے لئے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے

اے زمیں! میری ماں!
میں ہوا میں اڑنا نہیں چاہتا ہوں
نہ میں بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پہ سوار ہونا چاہتا ہوں
نہ میں موزے اور جوتے پہننا چاہتا ہوں
میں تو ننگے پاؤں تمہارے اور قریب ہونا چاہتا ہوں

اے زمیں! میری ماں!
تم میرے وجود کی حقیقت کی گواہ ہو
مجھے اس بات پر یقین نہیں کہ تم خواب میں تخلیق شدہ ایک بلبلہ ہو
مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں کہ میں ایک بے عقل مخلوق ہوں اور بغیر مقصد کے
معروف عمل ہوں

اے زمیں! میری ماں!
میرا خیال ہے ہم سب ماں جائے ہیں
مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ آسمان پر جنت کے سایہ دار مقام پر
میرا کوئی باپ ہے جو رہتا ہے

اے زمیں! میری ماں!
میرا خیال ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز تمہارے جسم کی تجسیم ہے
گرج تمہاری قوت کا سایہ ہے
برف اور بارش تمہارے خون کے تموج کا عکس ہیں

اے زمیں! میری ماں
میرا خیال ہے کہ آسمان کا پھیلا پیالہ، تمہارا آئینہ ہے جس میں دیکھ کر
تم اپنا سنگھار کرتی ہو
اور دن کے وقت یہ سورج اور رات کے وقت یہ چاند
آئینے میں تمہارے سائے ہیں

اے زمیں! میری ماں!
میرا خیال ہے کہ آسمان کے سارے تارے
آئینے میں منعکس تمہاری تخلیقات کی آنکھیں ہیں
میں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کہ تم وجود کی حقیقت کی گواہ ہو

چڑیا

میری ننھی چڑیا
میرے لباس کی شکن پر اتر کر
کیا تم مجھے دردمندی سے دیکھ رہی ہو؟
میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہیں دیکھتا رہوں
سورج کے نیچے اپنے پر کھولو
اور پہلی بے عیب اڑان بھرو

کیونکہ تم میری روح کو آسودہ کرنا چاہتی ہو

اے زمیں! میری ماں!
میری روح تمہاری روح ہے
میں اپنی روح کو قوی تر بناؤں گا
تاکہ تمہاری شفقتوں کا جواب دے سکوں

اے زمیں! میری ماں!
اب میں تمہاری شفقتوں کا جواب دوں گا
مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے پیار کرتی ہو اور میرے کام کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہو
میں تم سے انتھک کام کرنے کا سلیقہ سیکھوں گا

برف

ملک کا شمالی منظر
میل ہا میل یخ بستگی کا منظر
اور میلوں آگے برف کے ذرے'
دیوار چین کو ادھر سے ادھر تک دیکھو
ایک وسیع و عریض صحرا
عظیم دریائے زرد' اوپر نیچے'
کیا اس کی جھاگ بیٹھ گئی ہے
پہاڑیاں سانپوں کی طرح ناچ رہی تھیں
پہاڑ' موم کے ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے
یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی حیثیت کا مقابلہ
خدا کی حیثیت سے کر رہے ہوں
ایک سہانی صبح تک انتظار کرو
جب دھوپ' تمہاری براق سیم تنی کو سنہرا کر دے
یہ منظر' اور دل پذیر انداز میں ہویدا ہو

یہ زمین اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ساتھ دمکتی ہے
اس نے اپنے لاتعداد جوان سپوتوں کو
اپنی حفاظت کی خاطر قربان کیا ہے
چن ہیانگ اور ہان دو!
تم پر ترس آتا ہے

تم دونوں ناشناس سخن ہو
ناتگ تونگ اور سوانگ تو
فنون لطیفہ کے حظ سے عاری ہیں
اور وہ جنت کا بگڑا بچہ
چنگیز خاں
کہ جس نے کھینچی کمان سے
چیلیں شکار کرنی سیکھی تھیں
سب کچھ گزر چکا ہے
بڑے آدمیوں کے لئے
صرف اور صرف
یہ زمانہ آئینہ ہے

تیراکی

شوئی تیاؤ کہ تھو کی دھن میں

جون ۱۹۵۶ء

کیا تھا نوش ابھی آب چھانگ شا میں نے،
چکھا ہے اس جگہ وہ چھانگ مچھلیوں کا مزا
عظیم یانگسی کرتا ہوں پار تیرتے اب،
نظر ہے دور کھلے آسمان پر "چھو" کے
ہوائیں تیز چلیں، خواہ لہریں ٹکرائیں،
کہ خوب تر ہے یہ آنگن میں چہل قدمی سے
ہوئی ہے آج فراغت ذرا نصیب مجھے۔
کہا تھا بر سر دریا یہ کنفیوشس نے،
"بہاؤ میں ہیں اسی طرح سب کی سب اشیا!"

ہوا کے زور سے ہوتے ہیں بادباں جنبل،
پڑا ہے جامد و ساکت یہ "سانپ اور کچھوا"
عمل میں ڈھالے گئے ہیں عظیم منصوبے
کھنچے گا اڑتا شمال و جنوب پر اک پل،
جو فطری روک کو بدلے گا عام رستے میں

تنے گی سنگ کی دیوار رود مغرب پر'
کہ روک دے گی جو ووشاں کے ابروباراں کو'
اٹھے گی ٹھہری ہوئی جھیل گہری گھاٹی سے
ہنوز ہوتی جو موجود کوہ کی دیوی'
تغیرات زمانہ پہ دنگ رہ جاتی

مشورے

ایک ہری نرم کونپل
جوانی سے کہتی ہے
اپنے آپ کو پھیلاؤ
ایک مرجھاتا سفید پھول
جوانی سے کہتا ہے
اپنے آپ کو تحفہ بناؤ
ایک تازہ سرخ پھل
جوانی سے کہتا ہے
اپنے آپ کو بھینٹ چڑھاؤ

طلاق

غمزدہ چہرے سے مسکراتی
پانچ سال کے بچے کی انگلی تھامے
وہ رہ رہ کے اپنی بھیگی آنکھوں کو
دوسروں سے چھپاتی ہے
تنہا کشتی دریا میں تیرتی جاتی ہے
بچہ اپنی ماں کے ساتھ
کہیں دور بہت دور جا رہا ہے
اس کے اندر چھپا اس کے باپ کا سایہ
اس کے معصوم ہاتھوں میں دبی چاکلیٹ کو
توڑے مروڑے جا رہا ہے
یہ ایک نظارہ
کئی جانی انجانی یادوں کو جگا رہا ہے

باغ میں

ہم باغ میں گئے
اور میں نے ایک نازک افسردہ پھول
اس کے ہاتھ میں دیا
"یہ میرا دل ہے" میں نے کہا
"یہ سمجھ کے لے لو"
اس نے اپنے کانپتے ہاتھ میں پھول کو تھاما
اور اس کے شفاف آنسو
ایسے گرے جیسے صبح کی شبنم
میں نے سرگوشی کی "دیکھو! میرا دل
یہ زندگی سے کتنا بھرپور ہے"

صبح

رات رخصت ہوئی
اور سویرا ہو گیا
اس کی نیلی ٹھنڈی شعاعیں
اندھیرے سے گزریں
اور اب میرے کمرے پر ٹھہر گئیں
رات کا آخری ہلکا سایہ
اور رات کے ملگجے اندھیرے کا ایک کنارا بھی
اس روشنی کے سامنے نہ رکا
حقیقت نے اپنی چادر علیحدہ پھیلائی
فضا کھل گئی
اور یہ گنجان دنیا
میرے شکستہ اور اکیلے دل کو بھر دھاپ دیتی ہے

پجاری

میں ایک پجاری ہوں
میں سورج کی پوجا کرتا ہوں۔ پہاڑ کی چوٹی کی پوجا کرتا ہوں
سمندر کی پوجا کرتا ہوں۔ پانی کی پوجا کرتا ہوں
آگ کی پوجا کرتا ہوں۔ آتش فشاں کی پوجا کرتا ہوں
بڑے دریاؤں کی پوجا کرتا ہوں

میں زندگی کی پوجا کرتا ہوں۔ موت کی پوجا کرتا ہوں
روشنی کی پوجا کرتا ہوں۔ اندھیرے کی پوجا کرتا ہوں
میں سویز کی پوجا کرتا ہوں۔ پانامہ کی پوجا کرتا ہوں
دیوار چین کی پوجا کرتا ہوں۔ اہرام مصر کی پوجا کرتا ہوں

میں تخلیقی جذبے کی پوجا کرتا ہوں۔ طاقت کی پوجا کرتا ہوں
خون کی پوجا کرتا ہوں۔ دل کی پوجا کرتا ہوں
میں بموں کی پوجا کرتا ہوں۔ غموں کی پوجا کرتا ہوں
تباہی کی پوجا کرتا ہوں
میں بت شکنوں کی پوجا کرتا ہوں
اپنے آپ کی پوجا کرتا ہوں
کیونکہ میں بت شکن ہوں

لوژون / طارق شاہد

اپنی تصویر سے

دیوتاؤں کے تیز تیروں کو برج نہیں روک سکتے
ظلمت ایسے قدیم باغ کی طرح ہے جو طوفانوں سے تباہ ہو گیا
بغیر جانے میں اپنی امید یخ بستہ ستارے سے وابستہ کر لیتا ہوں
جب کہ میں اپنا خون منگول بادشاہ کو پیش کر رہا ہوتا ہوں

جڑ

میں جڑ ہوں
زندگی بھر بڑھتی ہوں
خاموشی سے زیرِ زمین
نیچے ہی نیچے
میں یقین رکھتی ہوں زمین کی گہرائی میں ایک سورج پر

میں شاخوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ نہیں سن سکتی
اور نرم ہوا کو محسوس نہیں کر سکتی
لیکن صاف دل سے کہتی ہوں
نہ ہی دل برداشتہ ہوں نہ کسی تکلیف میں

موسم بہار میں
مجھے بھی اتنی ہی خوشی ہوتی ہے، جتنی پتوں اور شاخوں کو
اور پھولوں کو
جن میں میرے دل کا خون بھرا ہوا ہے

اور ایک مرتبہ پھر میرے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے
انسانیت کے پھر سے جی اٹھنے پر

انگر کرسٹن سن / سعادت سعید

نظم

ایک مرد اور ایک عورت
ایک ہیں
ایک مرد اور ایک عورت اور ایک کل چڑی
ایک ہیں

سمٹے پنکھ جال میں الجھائے
تم اور ایک کل چڑی کے پر
شام کے گاتے پیڑ کا نگینہ
پرندے میں مرد کی پناہ
پرندے کا اس کے اندر غور سے جھانکنا
فطرت کے شعور سے اڑان
میں
میں وہ ہوں جو دیکھ رہی ہے

مبارک لمحوں کا تاریک ہونا
مرد اور کل چڑی مغلوب ہو گئے

دونوں میں خواہش پر سکون
پیو اسی دل کے ساتھ
گاؤ اسی چونچ کے ساتھ
خندقی پنہ کا کلوز اپ
میں
میں وہ ہوں جو اس منظر سے باہر ہے

غیر حقیقی درد
کلچڑی کا کھیل اور تمہاری آواز
وصال اور شام کی گونج
مرد کی سیٹی کو سنو
پرندے کی بولی سمجھو
وہ پکارتی ہے کیا میں ایک عورت ہوں
میں
میں وہ ہوں جو کھلی ہے

سویرے سے پہلے

سویرے سے پہلے
لومڑ بھٹوں سے اوپر ڈھلوان پر
جہاں گھاس دبیز ہے
اور طویل عرصے بعد موسم گرما آ پہنچا ہے
شدید تنہا
گھاس کے ساتھ نمو پا کر
ایک ٹھہراؤ
شبنم سا عمومی
اور لومڑوں کے چھوڑے کھانے پر بھنبھناتی مکھیاں ' سورج نکلنے پر
مجھے اب تمہارا انتظار بھی نہیں ہے
میں اب تمہیں پہچانتی بھی نہیں ہوں
تم میرے قریب سے گزر جاتے ہو
اس بات کو جانے بغیر

وہ یہ کر سکتا ہے

جب کوئی شخص نئی سبک مسافر گاڑیوں میں سے
کسی ایک کو، پٹڑی سے اترتا دیکھ رہا ہو
بہت تیز رفتاری سے رگڑ کھاتے ہوئے
ایک حقیقی آواز، جیسے کوئی شیشہ کاٹ رہا ہو
وہ حیرت سے ساکت ہو سکتا ہے کہ
زندگی جیسی کہ وہ ہے
اپنے ملال کے ساتھ کہ اس کا قیام اتنا لمبا ضرور ہے کہ 'فی الحقیقت' یہ کہ آج میرے پاس وقت تھا دونوں کو دیکھنے کے لیے
ایک بڑے بھدے مینڈک کو، سپر مارکیٹ کے بیرونی دروازے پر اور
اور اپنے اس امکان سے سمجھوتے کو کہ میں اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھوں گا

رقابت

اور رقابت کا اثبات
ایروز کا آسیب
شدید مخالفت اور دہشت
اعصاب کی انتہائی درگت
محبت کی شیرازہ بندی
بے تال اور قابل رحم
کہ جو سوچتی ہے وہ زندہ ہے
جب کہ ہر شے گزر چکی ہے

باقی ماندہ: ایک گدائے بیمار
قبر سے بلایا گیا
برفانی ہوا کے ساتھ جو اب بھی
اس کے کپڑوں میں مقید ہے
کسی زندہ کے ساتھ کھانا کھانے کون بیٹھتا ہے
اگر اسے زندگی کی
مسرتوں سے ہرگز کوئی حصہ نہیں دیا جاتا

گونج

میں راہبوں کا گیت سنتی ہوں
سورج آنکھ مچولی کھیلتا ہے
ستونوں اور ڈھلوانی چھتوں پر چمکتا ہے
اور پتھریلی محرابوں میں گم ہو جاتا ہے
یورپ کے کھنڈرات
پتھریلے تابوت اور لوح مزار کے لیے سایہ دار مجس

میں ایک بے گور و کفن لاش دیکھتی ہوں
بصارت کا مستقل عذاب
ایک نوجوان نے خود کو
چھت سے نیچے پھینکا ہے
اس کی دونوں ٹانگیں بے طرح پیچھے کی جانب جھکی ہوئیں
اس کے بازو ایسے پر ہیں
جو کھل نہیں سکے

میں راہبوں کا گیت سنتی ہوں
اور خون بہتا دیکھتی ہوں
ہوا 'خانقاہوں کے خود رو سبزوں اور پھولوں پر تیرتی ہے
بے ترتیب صعتر' منتشر پودینے اور اور ا۔ سٹاراگون

فاختاؤں کے جھنڈ کلیسا
اور گجر خانے سے نمودار ہو کر
دریا پر محو پرواز ہوتے ہیں
یہ ہوا میں تیرتا ایک جسم ہے
یخ بستگی کا ایک حیرت خانہ
وہ خون جسے میں ایک گٹر کی جانب
دوڑتا ہوا دیکھتی ہوں

باغ کی اداس بگولہ نما ہوا
دیواروں اور محرابی راستوں کے درمیان
میرے ننگے بازوؤں پر پڑے مرمر کو گراتی ہے
اور میرے گدی کے مہتاب بالوں کو اجلاتی ہے
فٹ پاتھ پر منجمد کرنے والی ٹکر

میں لوگوں کو خوفزدہ اس جانب دوڑتے دیکھتی ہوں
گلی ان سے معمور ہے
ان زندہ لوگوں سے جو اپنے ہاتھوں سے
مردہ انسان کا دل تیزی سے ملتے ہیں
خون دلخراش جنگلے کی جانب دھیرے دھیرے بہتا ہے
نالے کے کرن پانیوں تک پہنچ جاتا ہے

یہ مردہ انسان کا لہو ہے جو میرے دماغ میں
خموشی سے بہہ رہا ہے
میں اس لہو کی آواز سنتی ہوں جو نالے کے پانی میں گرتا ہے
دبیز دیواروں کے پیچھے

میں راہبوں کے گیتوں کی بھتی گونجیں
سنتی ہوں
بارش فٹ پاتھ کو دھو دیتی ہے
اور خانقاہی باغ میں
یک شاخہ چرتا ہے
خاموشی کا آغاز ایک جانور سے ہوتا ہے

میپل کا درخت

میپل کا لمبوترا درخت اب مدت سے زرد
ہر صبح دھند، تمام دن پر مسلط
حرارت کے نیچے سردی کا اشارہ
ٹھنڈی اور گہری سیلن
چپچپی، ڈستی ہوئی، جب اندھیرا ہو جاتا ہے
زبان پر لوہے کے ذائقے کی مانند رکھے
شبینہ انجمادی سردی جو پتوں کو خستہ کرتی ہے
اور تیزاب آشنا ڈنٹھل، پوپھٹے
بوسیدہ گھاس منجمد سردی کا پشمینہ اوڑھے ہوئے
اور شبنم، سورج سے پناہ چاہتی ہے
تمام حیران کن اور رنگین، روشنی سے جنم لیتا
جدائی کی: بے تکلیف جدائی کی
بے سوگ آزادی کی، معمولی
اور مابعد کچھ نہیں، منصوبے بھی نہیں

تب میں گرسلوں کے جھنڈ کی چہچہاہٹ سنتا ہوں

بہت سی ہواؤں کی پر زور گرجیں۔۔۔
اچانک زرد درخت کا
پر جوش مسرت سے روشن ہو جانا! یہ پرندے
اس درخت سے نہیں ہیں' ان کا تعلق
چونا پتھر' رنگ' اور ہوا سے ہے
اور جو ہم جانتے ہیں بیچ ہے' لطف لینے کے لیے
تاہم وہ درخت کی چھتری کو اپنی وجد آفرین چہکاروں سے
بھر دیتے ہیں: درخت گاتا ہے' سنو
آگ سے بنی زبانیں' آگ سے بنے حلق
آوازوں کے بھونچال' ایک سرخوشی
ایسی کہ ہوا کے شعلے۔۔۔جدائی' جدائی:
مگر یہاں درد ناممکن ہے'
میرے کانوں میں آتی ان جنگلی صفیروں کے ساتھ
میں جانتا ہوں کہ خوشی قائم رہے گی
پھر میری خوشی بھی لے جاؤ' اس لیے نہیں کہ
تمہیں اس کی ضرورت ہے بلکہ یہ
اس پورے لطف کو سمیٹ لے گی کہ جو وہاں ہے
جہاں حسد ماند پڑ جاتے ہیں' جہاں رقابت
مخالفت اور اختلاف غائب ہو جاتے ہیں
اس لیے کہ سب جمع ہو کر
اس لطف میں شریک ہوتے ہیں جو جدا ہونے والا نہیں ہے
وہ جگہ موجود ہے' اس سے زندگی پھوٹتی ہے
ہو سکتا ہے کو کوئی بھی خوشی قبول نہ کرے' میں
نہیں کرتا' نہ ہی درخت کرتا ہے' پرندہ
تاہم درخت سے زیادہ نہیں' وہ پرندہ

مگر کوئی نہیں ـــــــ سنتا، اب وہ گزرتے ہیں
زرد درخت کی سیہ دھات،
اب ایک اور درخت روشن ہو گیا ہے
بے آواز سکوت کے لیے بھی روشن

میپل جلتا ہے، اپنی ہی
خامشی اور داخلی سورج کے ساتھ
کہ اس کی چھتری پر منڈلاتا سونا پن
استکمال، طوفان کی آمد سے پہلے کا سکوت
نومبر کی تاریکی، سرما کا آرام ـــــ
آئندہ سرد شاموں سے پہلے جب
زمیں پر گرے پتے چمک رہے ہوں
درخت تلے بکھری سورج کی روشنی جیسے
میٹھے سورج کی روشنی: میرے اندر رکے بغیر
اور اس درخت پر کہ جس سے میں اپنا ماتھا ٹکراتا ہوں
جب اندھیرا پھیلتا ہے، جب دل نمو پاتے ہیں
سورج سے بھرے

نظم

وہ حقیقت میں اس کا حصہ نہیں رہی ہے
رونے کے لیے
اس کے پاس کوئی حقیقی ملال نہیں ہے، ممکن ہے اس
بہن کے لیے جو اس وقت معدوم ہو گئی جب وہ
اسے جانتی بھی نہیں تھی
ڈن کی موت پر، انھوں نے
کہا، شاید اس آدمی اور
اس کی کمزوریوں کے لیے
بیٹی کے بے کل جذبے کے لیے
اپنے لیے جس نے اسے نہیں بنایا
وہ اس کے لیے ہمہ تن گوش نہیں ہے
لیکن وہ اس تمام بدقسمتی کو پہلے ہی سے
محسوس کرتی ہے، اب جب وہ چلی گئی ہے
وہ خود معدوم ہونے سے
نہیں ڈرتی
لیکن آزادی سے
اس دہشت سے جس کے ساتھ
وہ زندہ رہی

ہر روز

شہر کی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ نوجوان دمکتے ہیں۔ ' گھر بند اور دور ہیں
ہر روز ایک ہی نظم
ایک عورت دیوار کی جانب منہ موڑے سوتی ہے۔ باہر' ٹریفک کی روشنیوں کی دیوار
طے شدہ پگڈنڈی کی سیر
ہر روز ایک ہی نظم
لفظ تصویروں اور شہروں کو تیاگنے کے منکر ہیں' عامیانہ شہری زبان - پژمردہ فضا
دیواروں کے درمیان۔۔ رات
ہر روز ایک ہی نظم
شہر تلے ذیلی راستے کی تیزی سے گزرتی غلام گردش' ہم سیڑھی راستوں پر تیرتے ہیں
ہر روز ایک ہی نظم
کوئی انسان پہلو کی گلیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔۔ شیشے میں میرا جسم۔۔ عقبی احاطوں میں بوتلیں
اور ڈبے جمائیاں لے رہے ہیں۔۔۔ ہم دروازوں میں بیٹھتے ہیں
ہر روز ایک ہی نظم
استعمال شدہ جوتے ' پرانی جیکٹیں۔۔۔ میں لفظوں سے ملاقات کرتا ہوں اور پھر دوبارا کام پر نہیں
جاتا۔ میں دریچہ کھولتا ہوں
ہر روز ایک ہی نظم
شہری عامیانہ زبان
آج پھر وہی نظم

جذباتی ویژن

سورج نے میرے دیکھے بھالے اعضاء کو
گرد آلود بنجر صحرا میں ٹکڑے کر دیا
اور میری خستہ مرجھائی زبان
اس کی بے مہر خشک سالی میں چیخ رہی تھی

بے آواز ' خالی ' سفیدی
جہاں صرف برہنہ ڈنٹھل نمو پاتے ہیں
گہرے نقوش قدم میرے دل پر محیط
تذلیل سے ہموار ہوئے

میری زندگی ایک لق و دق صحرا تھی
میں نے محبت کے نخلستان ڈھونڈھے ' ہر سو
لڑکھڑاتے ہوئے میں نے
فقط ان گنت سراب ہی پائے

اور پھر آخر کار اے میری محبوب بارش تو چلی آئی
اور میری روح کو محبت کی اعانت سے معمور کیا
میری ہونٹ جو پہلے خشک اور پھٹے ہوئے تھے
معمور، مرطوب اور سرخ ہو کر مسرور ہوئے

اور اب میں تمہارے محبت کے دریاؤں پر انحصار کرتی ہوں
اور لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی خشک سالی کو فراموش کرنے میں کوشاں ہوں
غیر محفوظ مستقبل مجھے ڈرا رہا ہے
کہ ہر شے پھر سے صحرا میں منقلب ہو سکتی ہے

لیکن میں تعقل سے دور رہنا چاہتی ہوں
اور خواہش روکتی ہوں
کیونکہ بارش اتنی سہانی اور اتنی موسلا دھار ہے
کہ میں اس بنا کب رہ پاؤں گی

یک طرفہ محبت

یک طرفہ محبت
ایک ایسا تیزی سے بڑھتا پودا
جس نے ایک بند کیپسول میں
خود مقفل نمو پائی

ماریانے لارسن / سعادت سعید

دشمن کون ہے

منفعت بخش عورت کے کئی نام ہیں
دکانوں پہ وہ مجھے ایک گاہک پکارتے ہیں

پیداواری جگہوں پر مجھے ایک تنخواہ دار ملازم کہا جاتا ہے
اداروں میں مجھے ایک سائل یا ایک مریض سمجھا جاتا ہے

اور چکلوں میں مجھے صرف ایک جسم سمجھا جاتا ہے
کنبے میں مجھے ایک متحرک، باقوت مشین سمجھا جاتا ہے

مجھے معلوم ہے جب مجھے جھاڑ پونچھ کر، بنا سنوار کر

موت کے بعد دفن کر دیا جائے گا
تو پھر مجھے اک فرشتہ کہا جائے گا

میں عورت رہنا چاہتی ہوں
یہاں تمہاری چار دیواری میں

جہاں میری عمر رواں ہے
اس دروازے پر تمہارے نام کی تختی آویزاں ہے

دیکھو تمہارے گندے کپڑوں کا بڑا انبار لگ گیا ہے
میں عورت رہنا چاہتی ہوں

یہاں اندر کمرے میں تمہاری خوشبو ہے
اور تمہارا تاباں چہرہ

تم اپنے مرد سے محبت کرتی ہو؟

وہ میری جانب آیا---
درشتی سے--- تکلیف دہ انداز سے
اس کے پیچھے وہ راستہ جس پر
جھوٹ کی تنگ پگڈنڈیاں اور ناسوری پھوڑے
ایک آواز گرجی: تم اپنے مرد سے محبت کرتی ہو؟
نہیں! میں نے کہا--- میں نہیں کرتی
محبت کرو! آواز نے کہا

وہ آیا---
اور قریب ----رینگتا ہوا
ہوس کی مضحکہ خیزی---
اپنے پیٹ کے ناسوروں میں
مکھیوں اور کیڑوں سمیت
ایک آواز بھنبھنائی:
تم اپنے مرد سے محبت کرتی ہو؟
نہیں! میں نے کہا---
محبت کرو! آواز نے کہا

قریب ہوتے دھیرے سے اور قریب ہوتے ہوئے
آہستہ آہستہ
عفونت عروج پر تھی اور
دروغ بانی سے ہزاروں بیماریاں
اور اس آواز نے دھمکی دی
تم اپنے مرد سے محبت کرتی ہو؟
نہیں! میں محبت نہیں کرتی!
محبت کرو! آواز نے کہا

تب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا
اور اس نے اپنے ہاتھ میری جانب پھیلا دیئے
اور دیکھو تو کانٹوں کے زخم سرخ کیچڑ تھے
ننگے بازو کندھوں تک
گناہوں کے سرخ ناسوروں سے ڈھکے ہوئے تھے
اور وہ آدمی ہنسا:
---- ایسے ہی خدا نے محبت کی
میری آنکھوں سے ایک پٹی اتر گئی
اور میں چلائی
اے شخص، میں تم سے محبت کرتی ہوں!

اور میرا منہ لہو سے -- اس شخص کے لہو سے
بھر گیا تھا

تم ایک فلم کی مانند لگتی ہو

تم دوسری دہائی کی
ایک فلم کی مانند لگتی ہو
یہ اداس مسرور، جل بجھی مخملیں آنکھیں
مہارت سے بنی پلکیں
جن سے مستقبل کا دکھ گر رہا ہے
میری نظموں کی ماں
سینے کی دراز میں
پرانے رواج کے من موہی فیشنی عشوے
دس سالہ لوینڈر اور مکمل طور پر
نفیس پاؤڈر بکس رکھے
انتہائی پارسا
مگر اکثر گل چینائی عورت
اور ابھی بھی مجھے تمہاری آنکھوں کے مصنوعی دکھ سے
محبت کرنا ہے
تمہارے غنچے چٹکاتے دو افیونی پیڑ
جن کے نیچے ہم انتہائی قرب میں بھی ایک دوسرے سے جدا
اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں

پہاڑیوں پر اداس رات

ٹاور میں گھنٹی بجتی ہے
ایک ہلکی سی ضرب ' غبار آلود اداس رات میں
دیواروں پر بہتی ہوئی
یہاں گھنٹی وقت نہیں
سکوت ناپ رہی تھی

میں اداس رات کے
اس خاموش ٹکڑے کا مالک ہوں
جسے گھنٹی کی ضرب نے متاثر کیا
سکوت کی ضربیں
ناقابل فہم
لیکن سنی جانے والی ہیں
ضرب اور ضرب کے درمیان

ایک بہاؤ ' خود کار ' نہ ختم ہونے والا
سکوت کی ندی
لامتناہی
تم اکیلے ہی تو زندہ
-----اور بیدار
نہیں ہو

نہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں

نہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے
ستاروں کو پکڑ لینا
یا موسم بہار کے پھولوں کو توڑ لینا
مرغزاروں کے جشن سے
اور لانا تم تک۔ انہیں
محبت کے تحفوں کے طور پر
تمہاری مہربان قبولیت کے لئے
کھلا رہنے دو پھولوں کو، کھلے میدان کے بیچ
اور بانہوں میں بانہیں ڈالے
گھومتے رہیں ہم ان کے درمیان
گلدان میں رکھو گے انہیں۔ تو مرجھا جائیں گے
شام پڑنے تک
نقصان پہنچائے گی انہیں
روشنی اور ہوا کی کمی
ستاروں تک کا فاصلہ بہت زیادہ ہے
میں کچھ نہیں کر سکتا
سوائے رات کے وقت انہیں دیکھتے رہنے کے
ایک راکٹ پہنچا سکتا تھا مجھے وہاں تک
لیکن دیر ہو چکی ہے
اس پرواز کے لئے۔ بہت دیر ہو چکی ہے مجھے

ایسی جانفشانی ۔ اس دل کی استطاعت سے باہر ہے
یہ دل ۔ ایک ایسا انجن
جو اپنی طاقت کی آخری حدوں پر ہے
اور جم چکی ہے جس میں
ان گنت راستوں اور شاہراہوں کی دھول
سو قبول کرلو اسے' اسی حالت میں
بغیر ستاروں کے
بغیر پھولوں کے

تیرہ سطریں

تم بول پڑے۔ آخر کار۔۔۔
گھٹنے ٹیک کر، میرا ہاتھ مانگنے کے لئے نہیں
وہ الفاظ۔۔۔ ان قسمت کا فیصلہ کرنے والے الفاظ نے
ضرور بات کی ہو گی۔۔۔۔
تم نے ادا کیا انہیں یوں
جیسے کوئی قیدی بھاگ جائے زنجیروں کو توڑ کر
اور آنسوؤں کی دھندلاہٹ سے
دیکھ رہا ہو۔۔۔ سرہلاتے نوازئیدہ درختوں کا جھنڈ
گیت گاتی اور آہستگی سے بولتی رہی۔ خاموشی
سایوں کو کاٹتی گئی، سورج کی شفاف تپش
اور جلاوطن ہو گئی تاریکی۔؟
بدل گئی تھی شراب کے ذائقے کی یکسانیت
اور معدوم ہو گیا۔ حال
جادو کے زور سے بدل جانے والی ایک دنیا نے
تم سے آنکھ ملا دی
اور میں۔ جسے ایک قاتلہ ہونا تھا
بکھر جانے دیا۔ اپنا نازک خواب
بے رحمانہ انداز سے
اور کوشش کی اسے طویل کرنے کی

اور انکار کر دیا۔ ان ظالمانہ الفاظ کی ادائیگی سے
جو ایسی مکمل اور شاندار خوشی کو
تباہ کر کے رکھ دیتے۔!

میں کہہ سکتی ہوں

میں کہہ سکتی ہوں پورے یقین سے
کہ میں نے زندگی کا کوئی بھی برس
بے وقعت نہیں گزارا
اور نہ ہی چلی ہوں کسی بھی راستے پر
مرضی کے بغیر
نہیں بند کیے میں نے ذہن کے دروازے
کسی بھی خیال پر
اور کھلے رکھے ہیں کان
کسی بھی خبر کو سننے کے لئے
نہیں دیئے میں نے تحفے
جہاں ان کی ضرورت نہیں تھی
اور نہیں ہے مجھے کوئی بھی پچھتاوا
بے یقینی اور دھوکے کی زد پر آتی ہوئی
اپنی زخم خوردہ محبت پر
جو موجود ہے میرے ہمراہ' میرے اندر
ایک بچی روشنی کی صورت
کبھی دیر نہیں ہوا کرتی
پھر سے آغاز کرتے ہیں
پھر بھی نہ جانے کیوں
نہیں ادا ہوتا۔۔ ماضی کے ہونٹوں سے

کوئی بھی لفظ
اور نہ ہی سنائی دیتی ہے
افسوس کے اکھڑے ہوئے سانس کی آواز

وہ جن کے پاس

وہ جن کے پاس زندہ رہنے کے لئے
رہ جاتے ہیں
زیادہ سے زیادہ۔ پانچ مختصر منٹ
وہ بھی ایک پل بیٹھ نہیں سکتے
آرام سے
یوں جیسے ان کے پاس نہ ختم ہونے والی
سو سالہ زندگی ہو
اور برفانی چوٹیاں۔ اتنی ہی عمر کے تخلیقی وقفے میں
لمبی چپ سادھے
دیکھتی ہیں، بے حقیقت انسان کو
اور ٹھٹھری کھڑی رہتی ہیں ماتمی انتظار میں
یوں جیسے انہیں یقین ہو
کہ ان کی زندگی۔ واقعی
مہمان ہے۔ صرف پانچ منٹ کی

بنی نوع انسان.....

بنی نوع انسان
میرے نزدیک
ایک دریا ہے قوموں کا
زمانے۔ جنہیں میں دیکھتا ہوں
اپنی تصور کی آنکھ سے
لہروں کی طرح جاتے ہوئے
سمندر کی جانب
لہروں پر لہریں۔ آزاد اور عظیم
اچھلتی، گھنٹیاں بجاتی ہوئیں
مختلف زمانوں میں
ہو سکتا ہے خاصا طویل ہو ابھی راستہ
سمندر تک پہنچ کا
لیکن بہہ رہا ہے دریا
بہتا چلا جا رہا ہے
اور میں کبھی یہ یقین کرنے پر
آمادہ نہیں ہو سکتا
کہ اتنا مضبوط دھارا
ٹوٹ بھی سکتا ہے
اچانک
میری غریب گیت کی طرح؟

ہر گھڑی پیغام دیتی ہے

ہر گھڑی ۔ یہ پیغام دیتی ہے
سادہ لفظوں میں بھرپور سچائی لئے
جو لوگ اڑا دیتے ہیں' خرچ کر دیتے ہیں وقت کو
ہوا کی تعظیم کرتے ہیں
وقت کو تو ختم ہو جانا ہے اور رہ جائے گا زندہ
بس تمہارا ضمیر۔
زندہ رہتا ہے یہ روح کے اندر
اور نہیں کرتا پرواہ ۔ وقت کی
ہمیشہ بہت دیر ہو جاتی ہے پچھتاووں کو
جب عزت کرتی ہے نشاندہی
اڑتے ہوئے وقت کی
اشارہ کرتی ہوئی انگلی سے
قسمت کے ہاتھ کی طرح
پچھتاووں سے آزاد رکھنے کے لئے
اپنے ضمیر کو
مت کرو ضائع ۔ ایک مختصر گھنٹہ بھی
جس طرح دوپہر کے وقت
کھڑی ہوتی ہیں ۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں
ایک ساتھ ۔
اسی طرح رہنے دو

عزت کو ضمیر کے ساتھ ساتھ
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
ہمیشہ کے لئے

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں
"بچے روتے ہیں تو بڑے ہوتے ہیں"
لیکن جب میں دیکھتا ہوں
کسی نوجوان کو
پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے
تو بھر جاتا ہے میرا دل
ایک گہرے دکھ سے
اور یوں لگتا ہے جیسے
میرے اردگرد کے پہاڑ بھی ماتم کر رہے ہوں
میں کبھی بھلا نہیں سکتا
ان بچوں کو۔ جلے ہوئے کھیتوں میں
جنگ کے چاٹ جانے والے شعلے
بڑھ رہے تھے جن کی جانب
جب بھی میں دیکھتا ہوں
روتے ہوئے۔ ایک نوجوان کو
مجھے لگتا ہے
ساری کائنات آنسو بہا رہی ہے!

کرتب دکھاتے بادل

اوپر
آسمان پر
تیر رہے تھے بادل
وہ صرف چار تھے۔
تمہارے ہجوموں کی طرح نہیں
پہلے سے تیسرے تک
وہ آدمیوں کی طرح لگتے تھے
جبکہ چوتھا
ایک اونٹ تھا
پھر۔۔۔
جب وہ تیزی سے بھاگنے لگے تو
ان سے آکر مل گیا۔ ایک پانچواں
اور یہاں سے بھاگے
ہاتھیوں کے پیچھے ہاتھی
ایک مکمل لاتعلقی کے انداز میں
تاوقتیکہ
شاید آگیا چھٹا
اور انہیں ڈرا گیا۔۔۔
بادل سارے کے سارے تحلیل ہو گئے
ہوا کی مہین چادر میں

اور ان کے بعد
بادلوں کی خوشگوار۔ اور پر شور انداز سے چھیڑتے ہوئے
نکل آیا۔ سرپٹ بھاگتا ہوا سورج
ایک پیلے زرانے کی طرح۔!

۲۳سال بعد

سب کچھ ختم ہو گیا ہے
میں شمعیں بجھاتی ہوں
شام کی زندہ دلی کا طلسم،
جلاد، نقیب شاہی، اور دام تزویر، سب ختم ہوئے
اور، افسوس، لعن طعن کر رہی ہوں
اور میرے خوابوں میں تم، میرے واہمے
بارش، ہوا اور طوفانوں کے جلو میں خداوند کی کشتی کے گرد
اپنا آخری رقص مکمل کر چکنے کے بعد
لافانی ساحل پر سائے کی طرح ہو
تاریکی کے غار سے تم میرا نام لے کر مخاطب کرتے ہو
اپنے سابقہ انداز میں
بار بار آواز دے رہو ۔۔۔۔ انا ۔۔۔ انا
تمہاری آواز میں وہی لگاوٹ ہے۔

رابرٹ لاویل کے لئے ایک نوحہ

پہلا کینٹو

ماحول کے رگ و پے میں پھیلتا ہوا خزاں کا زہر
میرے دوست!
تمہارے شہر کے چہرے پر اپنا رنگ دکھا رہا ہے

کہیں کوئی کتبہ لکھا جا رہا ہے
مرمر کی سلوں پر
تیز اور۔ بغیر کسی وجہ کے ـــ اور تیز ہوتے ہوئے
آہنی ناخنوں سے روشنی پھوٹ رہی ہے

پر، پتہ نہیں کیوں، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھائے جا رہا ہے!

فرش پر
سفید جھاگ کے ساتھ بکھرے ہوئے
(مقدس) خاموشی کے ریزے

جانے کس لہر، کس سمے نے ایسے چھینٹے اڑائے ہیں، ایسے چھینٹے.....

کہ گرد ملال سے اٹی ہوئی آنکھیں---

دھل دھلا کر بھی گدلی گدلی---

نیم شفاف موتیوں کی طرح چمکتی ہیں

کلیسا میں مودب کھڑے ہوئے مضطرب لوگ

روح کی نجات کے بارے میں سوچتے ہیں

(اس بارے میں سوچا ہی تو جا سکتا ہے)

کلیسا کے اختیار و قدرت کا اٹوٹ نغمہ

ان کی امرادا سی میں مداخلت نہیں کرپاتا

افسوس کے بھاری پتھر تلے دبے ہوئے وہ خود کو کراہتے ہوئے سنتے ہیں

کہ خداوند خدا' ان کے مقدس باپ' کے مفادات

ان کی تقدیروں' خواہشوں اور خوابوں سے

کتنی آسانی اور بے رحمی کے ساتھ ٹکراتے ہیں!

اس' سب سے قوی' سب پر غالب کے پاس

سب کچھ' ضرور بہت کچھ ہو گا--- لیکن' دوست! کچھ بھی ہو

تمہارا' تمہارے روح و بدن کا متبادل نہیں ہو سکتا

(شہکار بار بار تخلیق نہیں ہوا کرتے)

چمکتی ہوئی آنکھوں میں دمکتے ہوئے آنسو

مستقبل بعید کے کسی فراموش کردہ منظر کی جھلک دکھاتے ہیں

اور دوست! تم جانو' ایک آنسو ایک مکبو عدسے کے اصول پر چلتا ہے!

موت کے بعد' آدمی کے دوست

اتنی تیزی سے پسماندہ کوٹوں اور ٹائیوں کی جگہ لینے لگتے ہیں

کہ اس کی وارڈ روب میں جگہ کم پڑ جاتی ہے!

آخری کینٹو

فضائے بسیط میں پھیلا ہوا مرغ باد نما کا گیت
جیسے غلطی سے چھیڑ دیا گیا ہو
اور تمہارے نام پر بجائی جانے والی کلیسا کی گھنٹیوں کی آواز
جیسے کسی انہونی کی خبر دینے کے لئے بگل بج رہا ہو۔
بجتا چلا جا رہا ہو۔۔۔

ہونی کہیں، چاہے انہونی، موت بہر حال موت ہوتی ہے۔۔۔
ایک ناگزیر، ناخوشگوار فریضہ۔۔۔
کسی بوسیدہ، تنگ و تاریک کھنڈر کی مثال
جہاں دیا جلانے کے لئے ماچس ہو، نہ سگرٹ سلگانے کے لئے لائٹر
اور لفظ خاموشی کا قفل توڑنے، کھولنے کی بے سود کوشش کر رہے ہوں

ایسے میں۔۔۔ آخر کار۔۔۔ جسم بھی
روح کی مانند گھٹتے ہوئے
دکھائی نہ دینے کی عادت ڈال لے گا!

تمہارے جمال کی پرتیں الٹتے الٹتے، اس کے ہاتھ شل ہو جائیں گے
اور تمہاری زندگی، تمہاری بقا کے اصل ماخذ تک پہنچنے میں
ناکامیاب موت کو، یہ جان کر شرمندگی ہو گی

(اور شاید، حیرت بھی)

کہ تم اسے اس حد تک سمجھتے ہو۔۔۔۔ اتنا معمولی!

آزادی

تیرے بغیر درخت ٹنڈ منڈ اداس کھڑے ہیں
ان پر بہار کبھی نہ آئے گی
لوگ تیرے بغیر وحشی اور بے رحم بن گئے ہیں
اور
تیرے بغیر گیتوں کا سنسار
ویران ہے
تو عنقا تو نہیں جو ہاتھ نہ آئے
ہم نے تجھے پانے کے لئے
آنچلوں کے پرچم بنائے
لہو کے دیپ جلائے
تیری دھول ہماری مانگ کا سیندور ہے
دل کا سرور ہے
ہم پا کر رہیں گے

گریگوری کورسو / ادیب سہیل

دنیا

جب خالق نے لفظ کن سے دنیا تخلیق کی
اور فرشتوں کے ہجوم نے اس پر نغمۂ انبساط گایا
تو اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ ختم بھی ہو سکتی ہے'
یا شور پشت شیطان اسے تہس نہس کر سکتا ہے
دنیا اپنا فیصلہ کرنے کی آپ مجاز نہیں
یہ ویسی نہیں ہے جیسی اٹلس کے نقشے میں ظاہر ہوتی ہے
اور یہ وہ بھی نہیں جس کی چوٹی پر براجمان ہونے کا خواب طالع آزما دیکھا کرتے ہیں
نہ یہ چپٹی ہے نہ گول
نہ ہی یہ قطبی ریچھ ہے جو برفانی مچھلی کے خون کو برف کی رواں چادر پر چٹخارے لے کر چاٹتا ہے
دنیا بشر ہے
اس راہ سے اس کا علاقہ بوم سے بنتا ہے
اگر بشر نیند پر سورج کی عظیم حاکمیت کو قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا
تو وہ ان میں سے ہے جو دنیا سے دن کے اجالے کا دیس نکالا کر سکتا ہے
ایسے میں رات صرف رات کی عمل داری ہو گی! بشر کچھ نہیں ہو گا
اس کی عدم کی جانب' ترتیب سے نکلتی ہوئی سیاہ آوازیں
اس کرائے کے قاتل کی طرح ہیں
جو اس گیند کو حاصل کرنا چاہتی ہیں جو ابھی میدان میں پھینکی نہیں گئی
ایسے بھی لوگ ہیں جو دنیا سے لاتعلق ہیں
ایسے بھی لوگ ہیں جو اس دنیا کے نہیں لگتے
ایسا بھی وقت آتا ہے جب دنیا میں کمتری اور غم کی یلغار ہوتی ہے

پھر ایسا بھی وقت آتا ہے جب عظمت اور خوبصورتی رونما ہوتی ہے
دنیا کی تاریخ بڑی عجیب ہے۔

میں پیار کرتا ہوں

میں جانتا ہوں' جہاں دوسروں کا دل ہوتا ہے
سینے میں' جیسا کہ سب جانتے ہیں
لیکن میری باری آئی'
تو تخلیق کا علم پاگل ہو گیا
میں تمام کا تمام' دل بن گیا
جو سارے کے سارے بدن میں دھڑکتا ہے

تین گیتوں کا گیت

میں نے اپنے آپ سے کہا تھا
میں تین گیت لکھوں گا
اور ان تینوں گیتوں میں
میں تین لاشیں دفن کر دوں گا
میں ان لاشوں کو تانبے کے تین تابوتوں میں
دفن کردوں گا
تین لمحے
بنجر' بے حس
سکے کی طرح میری چھاتی سے چپٹے ہوئے ہیں
تین بے جان اور بے حس نجوم کی طرح
جو غیر یقینی کیفیت کے باعث' نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں
سانپوں کی شاخ پر لٹکے تین لاروں کی طرح
پھر میں نے اپنے آپ سے کہا
میں پہلا گیت فلورنس کے رہنے والے کی طرح لکھوں گا
جیسا کہ ڈانٹے نے لکھا ہو گا
جبکہ وہ بیزس سے ملا تھا
اور میں اس کی ہر لائن کو سونے سے بھر دوں گا

اتنا سونا، اتنا سونا
جتنا کہ پہلے معتقد نے پہلے عیسائی کی قبر پر لاد دیا تھا
دوسرا گیت
میں لزبین کے انداز میں لکھوں گا
لیزبوز کی پاگل مغنیہ عورتوں کے انداز میں
جیسے وہ محبت کے گیت گاتی ہیں
میں اسے سرخ رنگ سے بھر دوں گا
میں خوش بخت بیسواؤں کے ہونٹوں سے
یہ سرخ رنگ کشید کروں گا
اور تیسرے گیت کے لئے
میں سب سے دکھ بھری شکل انتخاب کروں گا
میں اس میں جذبات کی وہ حدت اور شدت تحلیل کروں گا
کہ قطبی ویران راتوں میں بھی ان کی دلسوزی
کی کراہٹیں گونجیں گی
میں اسے سبز رنگ سے بھر دوں گا
دلدلوں میں اگے سبزے جیسا سبز رنگ
کہ جہاں وہ لوگ جو محبت کے رجز سے عاری ہوں
محبت کو دفن تو کر سکیں

تو میں نے خود سے کہا
میں تین گیت لکھوں گا
مگر تمام پرانے سونے اور ہونٹوں کے سرخ رنگ میں سے
صرف ایک دھبہ باقی رہ گیا ہے
ایک سبز دھبہ۔ وہ اس قدر بوجھل ہے جیسا کہ قبر کا پتھر

جس کے نیچے، تین تابوتوں میں گٹار کے تین تار
سوئے ہوئے ہیں۔ اور گٹار
کہیں نہیں ہے

بے تعلقی کی جلاوطنی

وہ میرے پاس دماغ کی جھلی چھوڑ گئے ہیں
تاکہ میں اپنے آپ کو اکٹھا رکھ سکوں
اور اب پٹیوں میں بندھا' سوجن سے بے حال
میں سٹریچر پر زندگی اور موت کے درمیان
لیٹا ہوا ہوں
انہوں نے نازک وریدوں کو ربڑ کے دل میں گرمایا
مجھے فولادی پھیپھڑے دیے
میرے اندر کسی اور کا خون جاری کیا
اور یوں مجھے زندگی بخشی
میں کانوں کے بغیر سنتا ہوں اور بینائی کے بغیر دیکھتا ہوں
بالکل اس طرح جیسے کٹے ہوئے بازو میں بھی
کبھی کبھی نبض چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
میں اپنے اندر' اپنی ہی ایک نشانی کی طرح
زندہ ہوں
میری ساری زندگی
صرف خیال اور یاد ہے
خون کے لاکھوں ذرات "ابھی زندہ ہوں"
کے سندیسے بھیج رہے ہیں
آرزوؤں کو جگا رہے ہیں
اور وہ حکم دے رہے ہیں

جسے جسم کا کوئی عضو، مان نہیں سکتا ہے
میں لوہے کی تاروں اور سوئیوں سے سلا ہوا ہوں
سارے وقت میرے اندر بجلی کے جھٹکے
سرایت کرتے رہتے ہیں
اس جگہ کیسی عجیب تجارت فروغ پا رہی ہے
تم ہر طرح کا جتن کر لو
لیکن مجھے کبھی نہ سمجھ سکو گے

تم اس طرح کے عجیب و غریب صفحے جمع کرتے رہو گے
جو اوپر چڑھتی اور نیچے گرتی سیہ لائنوں سے پر ہوں گے
لیکن تم اس دماغی گراف کے حوالے سے
میرے خیال کی لو کو بھی نہ سمجھ سکو گے
یہ سیہ لکیریں، ان کا کیا مطلب ہے
صرف میں بتا سکتا ہوں۔ لیکن کیسے
جبکہ ہمارے تمہارے درمیان، رابطے کی کوئی شکل نہیں ہے
اور میرا دماغ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا محسوس ہوتا ہے
وہ لائنیں بے معنی ہیں
ان سے تم اتنا ہی بتا سکتے ہو
کہ میں ۔۔۔۔ ابھی زندہ ہوں
ایک ناقابل یقین زندہ انسان
جو کہ آدھا مشین ہے اور آدھا زندہ شے کی طرح ہے
یہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن تمہیں اسی پر اکتفا کرنا پڑے گا
جب تک کہ تمہیں میری طرف سے کوئی پیغام ملے
تمہیں اک نئی دریافت کی ضرورت ہو گی
جو مشین کے بغیر بھی ہمیں ایک دوسرے سے
رابطہ قائم کرنے میں مدد دے گی
خیالات سے خیالات کا رابطہ

اور یوں میں
ذہنی وابستگی کی دنیا میں آزادانہ گھوم سکوں گا
مگر جب تک 'پراسرار اور گنگ'
میں بے تعلقی کی جلاوطنی میں رہوں گا

شناخت

لامحدود، دنیا، دائم و قائم ہے
میں اس ساری دنیا کو کبھی بھی نہ دیکھ سکوں گی
میں نقشوں کے حوالے سے ان دیکھے مقامات کا
تصور باندھتی ہوں
میں اٹلس سے کان لگا کر
ان علاقوں کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرتی ہوں
میں خیالوں میں گھنے جنگل، پھیلے ہوئے صحرا
اور چاندی سے چمکتے، مگر راستہ بدلتے دریاؤں کی راہ گزر دیکھتی ہوں
میں مشرق کی جانب اپنی آنکھوں کو مرکوز کر دیتی ہوں
یہ سوچ کر کہ میں ایورسٹ کو دیکھ رہی ہوں
اور پھر میں شام کی خامشی سے کان لگا کر بیٹھتی ہوں
کہ شاید، میں نیاگرا کی مترنم آواز سن سکوں

میں خواب میں
قطب شمالی کے سفید ریچھوں کو دیکھتی ہوں
فیورڈ کی چٹانوں میں
چھوں کے گھونسلوں کو دیکھتی ہوں
اور سمندروں کی وسعتوں میں
آہستگی سے بڑھتے ہوئے، جہازوں کو دیکھتی ہوں
جو کہ بڑھتی اور پھیلتی افق کی جانب رواں ہیں
میں ساری دنیا کے لوگوں کو جاننا چاہتی ہوں

میں ان سب کو ان کے ناموں اور ان کے انداز بیان تک کے حوالے
سے جاننا چاہتی ہوں
تاکہ میرا چہرہ ناشناسا نہ رہے
اور ان تمام چہروں' ان تمام لہجوں میں میرا بھی کچھ حصہ ہو

سیلف پورٹریٹ

کتنا بھی جتن کروں، میں وہی رہوں گی، جو ہوں
میرے ہونٹوں کے نصیب میں گولائیاں نہیں
نہ آنکھیں بادام جیسی ہوں گی، نہ ناک نے کچھ بدلنا ہے
اور سر کی بناوٹ کو بھی، میں بدل نہیں سکتی
یہی تکون چہرہ، میرے نصیبوں میں لکھا ہے
کبھی ایک میٹھی روٹی جیسا، کبھی ڈاکو۔۔۔ جہاز کے ملاح جیسا
اور یہی دھواں لگے میرے بال رہیں گے
دن رات۔۔۔ غصے میں پھرنا میرے حصے میں آیا ہے
میرا بے تکا سایہ جب دیوار پر پڑتا ہے
تو اردگرد کی آنکھ۔۔۔ پتلی زخمی ہو جاتی ہے
میرا کسی سے کوئی رشتہ ہے؟
ماں باپ اور ان کے ماں باپ نے مجھے اپنایا نہیں
نسل۔۔۔ کالی بھی ہوتی ہے، یا لال، پیلی اور بادامی رنگ کی
لیکن مجھ میں سے، کسی کو بھی، کسی کی پہچان نہ ہو.....
صرف جب گھائل ہو جاؤں، روؤں یا خنکی میری ہڈیوں میں اتر
اور کوئی حادثہ میرے بدن کو جھیل جائے
تو وہ کہتے ہیں۔۔۔ پیاری لڑکی ہے
لیکن اس وقت میں بس اتنا ہی کہوں۔۔۔ نہیں، انسان ہوں.....

الوداع

اگر میں مرجاؤں
تو بالکنی کھلی چھوڑ دینا
ننھا بچہ نارنگی کھا رہا ہے
(میں بالکنی سے اسے دیکھ سکتا ہوں)
کسان گندم کی فصل کاٹ رہا ہے
(میں بالکنی سے اسے سن سکتا ہوں)
اگر میں مرجاؤں
تو بالکنی کھلی چھوڑ دینا

سمندر کا نغمہ

سمندر
دور بہت دور، مسکراتا ہے
جھاگ کے دانت
اور افق کے ہونٹ سے

اے پریشاں خاتون تم کیا بیچتی ہو
ہواؤں کے ہاتھوں اپنے آغوش وا کیے ہوئے؟
جناب میں پانی بیچتی ہوں
سمندروں کا
اے جوان سیاہ فام تم کیا لاتے ہو
اپنے لہو میں حلول کر کے؟
جناب میں پانی لاتا ہوں
سمندروں کا
ماں یہ نمکین آنسو
کہاں سے آتے ہیں؟
بیٹے میں روتی ہوں
سمندروں کا پانی
دل اور یہ شدید تلخیاں
کہاں جنم لیتی ہیں؟
سمندروں کا پانی

گلاب

مجھے رد کر دینے چاہئیں
وہ گلاب
جو کسی ڈکشنری یا مجموعے میں ملتے ہیں
گلاب' صرف کسان کی بانہوں پر کھلتے ہیں
اور کھلتے ہیں مزدور کے مکے پر
گلاب کھلتے ہیں' صرف سپاہی کے زخموں پر
اور کھلتے ہیں
ایک چٹان کی پیشانی پر

شام

اس برج کے پاس جو رنگ بدلتی شفق میں ڈوبا ہوا ہے
روتی ہوئی ہواؤں میں اس شام کی
جن میں نمی بھی ہے اور گرمی بھی
اک کالی کشتی راہ تکے

لو کوچ ہے آج کی رات
وہاں کہ جہاں پہلے شاید کچھ بھی نہیں
کہ جہاں سب کچھ چھٹ جاتا ہے اک اپنے سوا
ہر اپنا تب سے نظریں چرا چلے
اور کالی کشتی راہ تکے

ہم نے کہا اب تو تیاری پوری ہے
آنکھیں پیچھے مڑ کر حسرت سے تکتی ہیں
اور ڈھونڈتی ہیں وہ کچھ جو انجانا تھا
جو نایاب تھا اپنے لئے
وہ کچھ جس کو ہم دیکھ نہ پائے عمر بھر
وہ کچھ جس کو اپنا نہ سکے
تاہم وہ اپنا ہی ہے کہ اپنائیت کی
اس سے مہک پائی
رخصت، رخصت، رخصت، سب سے

گو اب تک جا نہ سکے

اور دل بیری جانے کے لئے تیار نہیں پھر بھی
سمجھو ہیں گئے گزرے
لو پیچھے چھوٹ چلا سب کچھ اور اس کی بہار
اک اپنے سوا سب پیچھے چھوٹ چلا
کل ہو گا کون یہاں اب بے گھر ہیں ہم رخصت
تم سے اور اس انجانے عالم سے جو تم میں تھا
انجانا خود مجھ سے
رخصت تم سے جو تم تک پہنچ نہ پائے
گو اس دھند میں پھرے
اف وہ دوری جو ہم میں تھی
اب بیٹھے بیٹھے اپنا نیر بہانا کیا اور جدا ہونے میں
پہلے ہی سے گئے گزرے ہو جانا دور چلے جانا
ہم گرم اشکوں سے روتے ہیں سورج کے ہوا
کے ظلم پہ
جو سرگرم ہیں رقص وحشت میں

خوان رامون خی مے نز / شفیق فاطمہ شعری

گل تنہا

بڑھا کے ہاتھ توڑ لو اسے ' گلاب توڑ لو
مگر نہیں ' یہ آفتاب ہے

گلاب شعلے کا
گلاب سونے کا
عیار کا ' مثال کا گلاب ہے

مگر نہیں ' یہ آفتاب ہے
گلاب جلوے کا
گلاب سپنے کا
نہایت و کمال کا گلاب ہے

مگر نہیں ' یہ آفتاب ہے
بڑھا کے ہاتھ توڑ لو اسے ' گلاب توڑ لو

نظم

سایہ، شاید
لاتا ہے تمہیں قریب تر......
آؤ، محیط اندھیرے کے غار سے!
میں منتظر ہوں تمہارا، پوشیدہ....
تم بھی رہو گے، نہاں.....

سکوت، شاید
لاتا ہے تمہیں قریب تر......
میری آمد سہمی ہوئی تنہائی کی قبا میں!
ٹھہرو، میرے لئے سکوت میں.....
میں سماعت سے پرے.....

خموش اور پوشیدہ
کوئی نہیں جان پائے گا
خموشی اور اندھیرے میں
وہ دائمی مسکن،
محبت سے ہم تخلیق کریں گے
آواز اور روشنی

میرا کتبہ' زندہ

نیند میں' میں ہوا فنا
ابھرا پھر سے' حیات میں

چاند کو دیکھتے ہوئے ایک خیال

مجھے معلوم ہے
زندگی اتنی جلدی نہیں بدلتی
ایک رات
کئی دن
کئی سال
یہ سچ ہے میں تمام عمر
کسی امید کے سہارے
ناامید رہا ہوں
لیکن
اس کے علاوہ
کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا

محمد الجواہر / احمد سلیم

بھوکے کی لوری

سوؤ،
بھوکے لوگو! سوؤ،
میری دعا ہے کہ غذا کے دیوتا
تمہاری حفاظت کریں
اگر لفظوں سے تمہاری بھوک نہیں مٹتی
تو خدا کرے خواب اس کی تکلیف مٹائیں
ٹوٹے ہوئے وعدوں کے بستر
اور الفاظ کے دھاروں پر سوؤ
خدا کرے کہ خواب و خیال کی پریوں کے سائے
تمہیں چاند کی طرح چمکتی ہوئی گول روٹیوں سے خوش کریں

ڈر

قیدیو! تم جہاں کہیں بھی ہو'
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے'
مجھے بھیج دو
ڈر، چیخیں، تنگدستی

ساحل سمندر کے مچھیرو!
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے
مجھے بھیج دو
خالی جال اور سمندر کا درد

دنیا بھر کے محنت کش مزدورو!
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے
مجھے بھیج دو
پھول اور دھجیاں
کٹی پھٹی چھاتیاں
چاک پیٹ
اکڑے ناخن

میرے پتے پر بھیج دو
کسی بھی قہوہ خانے میں،
دھرتی کی کسی بھی سڑک پر
انسانی دکھ کے موضوع پر
میں ایک بڑی دستاویز تیار کر رہا ہوں
خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے
بھوکے ہونٹوں اور فراموش کردہ لوگوں کی پلکوں سے
دستخط کروا لوں گا

لیکن دھرتی کے محنت کشو!
مجھے ڈر ہے.....
خدا بھی تو ناخواندہ ہو سکتا ہے.....

تھامس ٹرانسٹر/ شکیل فاروقی

رات

رات کو گاڑی گزرتی ہے گاؤں سے
بتی کی چوندھ سے کھڑے ہو جاتے ہیں گھر
جاگ اٹھتے ہیں، پیاس لگتی ہے
گھر، دروازے، کھمبے، تھالی کھڑے
اس لمحے جیسے جی اٹھتے ہیں سب کے سب
وہ جو سوئے ہوئے تھے

کچھ سوئے تھے چین کی نیند
اور کچھ کے چہرے تنے ہوئے سے تھے
جیسے لامحدود کو پانے کے لئے بے چین
نیند بہت گہری، مگر اندیشہ
کہ کہیں سب کچھ ہی چھوٹ نہ جائے
پراسراریت کے گزرنے پر
بند ریل کا پھاٹک
گاؤں کے پرے سے سڑک دور بنوں کے اندر تک چلی گئی ہے
اور درخت خاموش کھڑے ہیں، قطار در قطار
ساکت، چپ سادھے

ان کا ڈرامائی رنگ
سرخ، شعلوں جیسا
پتی پتی الگ
دہکتی ہوئی

بیداری اور خواب کے درمیان
ایک بڑا ساحرف
اپنے آپ کو ٹھونسنا چاہتا ہے
مگر ایسا کر نہیں پاتا

سانپوں کو کچل دو

کچل دو، کچل دو ان سانپوں کو
جو پھن پھیلائے ناچ رہے ہیں.....،
جب انتہائے رقص میں
میں ایک کامیاب زقند لگانے ہی والا تھا
کہ میری ریڑھ میں سویا ہوا سانپ سرسرایا
اور مجھے مبہوت کر گیا
یہ تشدد کیوں؟
وہ جو آزاد ہے، آزادی طلب نہیں کرتا
خواہش کی کنڈلیوں میں گرفتار
تم دوہرے رقص کرتے ہو
محبت اور نفرت کا رقص
تم جتنا زیادہ بچنے کی کوشش کرو گے اور الجھو گے
الجھتے ہی چلے جاؤ گے
مجھے کاٹ دو
مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دو
ہر ٹکڑا سانپ کا زہریلی سوزن
تمہارے خون میں دوڑے گا

تمہارے سفید پھولوں کو قرمزی
اور تمہارے خواب کو تباہ کر دے گا
حوا، آدم کی پسلی سے تخلیق ہوئی ہے
اس کی نال نہیں کاٹی گئی
باغ عدن میں سانپ کس کی ناف میں خوابیدہ ہے؟
آدم باغ عدن سے نکالے جانے کا الزام حوا کو دیتا ہے
اور حوا سانپ کو
دونوں میں سے کوئی سادہ حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتا
فرائڈ سے ماقبل کے انگوٹھا چوسنے والے معاصر جو کہیں
نہ تم شجر ممنوعہ کی خواہش کر سکتے
نہ ہی وہ آدمی سچائی
جو جھوٹ سے بھی زیادہ قابل ملامت ہے
تمہاری معصومیت کی اساس بن سکتی ہے
کچل دو کچل دو سانپوں کو
جو پھن پھیلائے ناچ رہے ہیں

کالے دانت جب بولتے ہیں

سب مجھے آدم خور سمجھتے ہیں
میرے بارے میں 'کیا جانے کیا کیا باتیں کی جاتی ہیں
میرے سرخ مسوڑھے غور سے دیکھے جاتے ہیں
لیکن کس کے دودھیا رنگ کے ہوتے ہیں
سرخ ٹماٹر زندہ باد

سب یہی کہتے ہیں کہ بہت کم ٹورسٹ اب کے آئیں گے
آپ کو معلوم ہے!
ہم امریکا کے باشندے نہیں
ہم تو بھوکوں مر جائیں گے

سب یہی کہتے ہیں' اس میں بھی خطا میری ہے
سب مجھ سے ڈرتے ہیں
لیکن دیکھو!
میرے دانت سفید ہیں' سرخ نہیں ہیں
کسی کو میں نے کھایا نہیں ہے

لوگ بہت بد نیت ہیں
وہ کہتے ہیں ---- میں نے ٹورسٹوں کو
تلایا شاید بھونا ---- پھر کھایا

لوگ بہت بدنیت ہیں
وہ کہتے ہیں --- میں نے ٹورسٹوں کو
تلایا شاید بھونا ---- پھر کھایا
میں نے تلایا بھونا' ان سے پوچھتا ہوں
وہ چپ ہو جاتے ہیں
اور پھر خوف سے میرے مسوڑھے دیکھنے لگ جاتے ہیں
سرخ ٹماٹر زندہ باد

سب کو یہ معلوم ہے
میری ساری دھرتی ہری بھری ہے
اور ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں
تازہ سبزی زندہ باد
سب کو یہ بھی علم ہے
سبزی -- کھیتی باڑی کرنے والے کا
پیٹ نہیں بھر سکتی!

میں کہ نحیف و نزار نہیں ہوں' موٹا تازہ ہوں
ٹورسٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر پلنے والا کیڑا ہوں
میرے دانت مردہ باد

پھر سب نے مجھے گھیر لیا
میرے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
اوندھے منہ دھرتی پر گرایا
عدل کے پیروں پر میری پیشانی رکھ دی

"آدم خور ہوں' کیا تم آدم خور نہیں ہو!
لیکن بولو
شاید تم خود کو چالاک سمجھتے ہو!
چہرے سے گھمنڈی لگتے ہو
دیکھتے جاؤ --- اب تم پر کیا بیتتی ہے
تم مطعون ہو' راندے ہوئے ہو
بولو --- آخری خواہش کیا ہے!!
میں چلایا۔ "سرخ ٹماٹر زندہ باد"

لیکن وہ سفاک بہت تھے
ان کی عورتیں آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہی تھیں
اس تماشابیں حلقے میں' اک عورت تھی
جس کی صدا خالی برتن کے بجتے ڈھکنے جیسی تھی
وہ چلائی
وہ چنگھاڑی
"اس کے پیٹ کو چاک کرو
شاید میرا باپ ابھی تک اس کے اندر ہو"

ان کی چھریاں کند تھیں
اور ہم سبزی خور ہیں --- کند چھری کے عادی ہیں
مغرب کے لوگوں کی طرح وہ
بلیڈ اک جھلٹ کالے آئے
ہولے ہولے میری جلد کی رگ رگ چھیلی

گوشت کو کاٹا
پیٹ کو چاک کیا
میرے پیٹ میں سرخ ٹماٹر کی اک کھیتی
جس کو پام کے دارو کا پانی ملتا تھا
ہر جانب پھل پھول رہی تھی
سرخ ٹماٹر زندہ باد

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو
سنو۔ آگ کی آواز
سنو۔ پانی کی آواز
سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز
یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے
مرنے والے ہمیشہ کے لئے نہیں جاتے ہیں
وہ زرد سایوں میں موجود ہیں
وہ گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں موجود ہیں
وہ جو مر گئے ہیں۔ وہ زمین کے نیچے ہیں
وہ ہلتے ہوئے درختوں
گھنے جنگلوں
بہتے پانی
کھڑے پانی
اور پر ہجوم بستیوں میں موجود ہیں
مرنے والے مرا نہیں کرتے ہیں
انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو
سنو۔ آگ کی آواز

سنو۔ پانی کی آواز
سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز
یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے
وہ مر نہیں گئے
وہ زمین کے نیچے نہیں ہیں
وہ مردہ نہیں ہیں
مرنے والے ہمیشہ کے لئے نہیں جاتے ہیں
وہ عورت کی چھاتیوں
بچے کی چیخوں اور چمکتی چنگاریوں میں موجود ہوتے ہیں
وہ جو مرگئے ہیں۔ زمین کے نیچے نہیں ہیں
وہ بھڑکتی ہوئی آگ
روتے ہوئے پودوں
کراہتی چٹانوں
جنگلوں سے بھری ہوئی جگہوں اور گھروں میں موجود ہیں
مرنے والے مرا نہیں کرتے
انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو
سنو۔ آگ کی آواز
سنو۔ پانی کی آواز
سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز
یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے

افریقہ

افریقہ ! میرے افریقہ
پشتنی بنجر میدانوں میں بہت قدیمی جنگجوؤں کے افریقہ
افریقہ جیسے میری دادی
دور کنارے دریا بیٹھ کے گاتی
میں نے تجھے کبھی نہ جانا
لیکن تیرا لہو میری رگ رگ میں چلتا ہے
کالا سوہنا لہو جو کھیتوں کو پانی دیتا ہے
لہو تیرے پسینے کا
پسینہ تیری محنت کا
محنت تری غلامی کی
غلامی تیرے بچوں کی
افریقہ ! مجھے بتا افریقہ
کیا یہ تم ہو؟ یہ کمر جو کبڑی ہے
یہ کمر جو لاچاری کے بوجھ تلے ہے ٹوٹ رہی
یہ کمر جو کانپ رہی ہے زخموں کے نشانوں سے
یہ کمر جو کڑی دوپہر میں پڑنے والے ہر چابک کو جی کہتی ہے
پر اک بھاری آواز مجھے جواب میں کہتا ہے

اے جوشیلے بیٹے! وہ جوان، توانا درخت
سفید اور کملائے پھولوں میں گھرا اکیلا، عالی شان، اکلاپے میں
کھڑا درخت
وہ تیرا افریقہ ہے، تیرا افریقہ
جو تسلی اور اکڑ کے ساتھ پڑا پھر بڑھتا ہے
اور اس کا پھل آہستہ آہستہ پائے جاتا ہے
آزادی کا کڑوا ذائقہ

ایک بدو سے گفتگو جس کا گھوڑا کھو گیا ہے

اگر یہ صحرا مری سنے تو اسے بتاؤں
یہ شاعروں کا گروہ فصل زوال ہے' تو اسے مٹا دے
یا اس کے منہ سے وہ لفظ لے لے
جو کتنی صدیوں سے زہر صورت ہماری نسلوں کو کھا رہے ہیں
یہ بانجھ لفظوں کی ڈگڈگی جو ہمارے کانوں میں بج رہی ہے
خموش کردے
یہ لفظ بازی کا شوق جسموں میں کوڑھ کی مثل پھیلتا ہے!
ورود شب ہو تو لفظ آنکھوں میں نیند بنتے ہیں
پو پھٹے تو حروف ابجد کا خواب سایہ پکارتا ہے!
مرے وطن یہ عجیب قصہ ہے
مرد میداں تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر
زمیں کے سینے پہ حسب سابق رواں دواں ہیں

یہ لفظ بازی ہے جس کے باعث ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
زمیں کے نقشے پہ ہم مقاموں سے ماورا ہیں
ہماری آنکھوں میں آنے والے سراب لمحوں کے خواب سجتے ہیں
اور کانوں میں اس کے گھوڑے کی ٹاپ بجتی ہے جو ہمارے

دلوں کو غم سے نجات دے گا' جو دشمنوں کی صفیں الٹ کر
شکست دے گا
ہم عالموں کے نصائح سنتے ہیں اور فقیہوں کی نکتہ سنجی پہ
جھومتے ہیں
ہماری آنکھوں کو داستانوں کی وادیوں میں سکون ملتا ہے' داستانیں
جو بانجھ لفظوں کی بے حقیقت جوانیاں ہیں
مرے وطن اے زمین میری!
فغاں! کہ ہم نے وہ لفظ جنس دکان اہل ہوس بنایا
جو قاصدان بہار جیسا سبک نوا تھا
حرم کے طائر سا خوش نما تھا

اگر یہ صحرائے نجد میری فغاں سنے تو اسے بتاؤں
مرے تصرف میں ہو تو لفظوں کے کارخانوں کو سرخ مہروں سے
بند کر دوں! حروف ابجد کے شہسواروں کو قتل کر دوں'
کہ جب سے ہم نے جنم لیا ہے
یہ ہم کو لفظوں کی چکیوں میں کچل رہے ہیں
اگر میں اپنے وطن میں کوئی مقام رکھتا
تو ایسے لوگوں کی انگلیوں کو تراش دیتا
جو اپنے لفظوں کو ظالموں کے غلیظ جوتوں پہ پھیرتے ہیں
اور ان میں ایسی چمک دکھاتے ہیں' جو بھی دیکھے خود اپنے
چہرے سے دو بہ دو ہو
تونگروں کے مصاحبوں کو ذلیل کرتا
جو شوربے کی مہک پہ کتوں کی مثل ہونٹوں کو چاٹتے ہیں،
اور ان کو لفظوں کے سخت دروں کی مار دیتا

جو اہلِ زر کی مدح سرائی میں جھوٹ کی فصل کاٹتے ہیں
میں ایسے لفظوں کو کاٹ دیتا جو بے ہنر ہیں
اور آنے والے دنوں کی جھوٹی تسلیوں سے ہر ایک منظر کو
فصاحتوں اور صنعتوں کو
وطن کی حد سے نکال دیتا' اور ان قصیدوں کو پھاڑ دیتا
جو اگلے وقتوں کے خواب دے کر گزرتے لمحوں کو روندتے ہیں
مرے وطن یہ عجیب قصہ ہے
مرد میداں تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر
زمیں کے سینے پہ حسب سابق رواں دواں ہیں

اگر مجھے دسترس ہو کوئی
تو قہوہ خانوں کی سیڑھیوں میں پڑے ہوئے ان زیاں پرستوں کو
قتل کردوں جو کشت افسوس بو رہے ہیں
تراش ڈالوں زبان ان کی جو اپنے نغموں سے داغ ذلت کو
دھو رہے ہیں
تباہ کردوں فلک پہ ہنستے ہوئے قمر کو جو ہم پہ مٹی
اڑا رہا ہے!
وطن میں تیری اداس شب کو نجات دے دوں اس آئینے سے
جو تیری ذلت کی داستانیں سنا رہا ہے
مرے وطن اے زمین میری!
مری دعا ہے کہ سوکھ جائے ترے کنوؤں کی یہ بہتی دولت
سوائے پانی کے سب فنا ہو
جو تیری چاہت سے منحرف ہیں ـــــ انہیں سزا ہو
جو بیٹیوں کو سجا کے گاہک کو ڈھونڈتے ہیں' انہیں ہوس کا

عذاب پہنچے
وہ اپنے جسموں میں کوڑھ دیکھیں، پہ موت ان کی طرف نہ آئے!
میں چاہتا ہوں
تونگروں کے محل۔۔۔۔ محلوں کے سرخ کمرے
جدید سائنس کے معجزوں کے کمال، کلچر کی خوش نمائی
سفید آقاؤں کی وراثت، جلاوطن ہو
حسین تاجوں میں جگمگاتے ہوئے جواہر
غریب لوگوں کی جوتیوں میں مقام پائیں
اگر وطن میں مجھے کوئی اختیار ہو تو میں اپنے صحرا
میں پلنے والے نئے امیروں کے بھاری خلعت اتار پھینکوں
یہ ارضِ یورپ کے سارے تحفے جو جگمگاتے ہیں مسخ کردوں
اور ان کے چہروں کو اس ملمع سے پاک کردوں جسے سجا کر
یہ اپنے اہلِ وطن سے ظاہر میں مختلف ہیں
انہیں بٹھاؤں بغیر زینوں کی گھوڑیوں پر
سلاؤں صحرا کی سرد راتوں میں جب سروں پہ کھلا فلک ہو
پلاؤں ان کو وہ دودھ جس سے نظر میں ان کی وہی چمک ہو
جو ان کے ناموں کا حاشیہ ہے
عرب شجاعت کا اور غیرت کا نام جس سے تمام تاریخ آشنا ہے
اگر یہ ہوتا کہ پیڑ یافا کے اپنی شاخیں قلم بناتے تو ہم کو
لاکھوں سلام دیتے
جو طبریا کا اداس پانی ہمیں جدائی کا حال لکھتا
تو کاغذوں میں وہ آگ لگتی کہ پڑھنے والے کباب ہوتے
اگر دہانِ قدس میں کوئی زبان ہوتی تو اس کے ہونٹوں پہ

آرزوؤں کے لفظ ہوتے
مگر یہ سب کچھ "اگر" کے صحرائے بے جہت کا غبار ہے کہ
ہم ایک ایسے کی ڈگر پر رواں دواں ہیں
حروف ابجد کو ہم نے اپنا نشان کیا ہے
ہم اپنی کھوئی ہوئی زمین پر کمند افسوس پھینکتے ہیں
جو شاعری سے بنی گئی ہے!
ہماری دامن پہ آنسوؤں کے اور آرزوؤں کے بیل بوٹے ہیں
اور ہم نے اسی کو یافا کی رہ گزاروں میں وا کیا ہے

مرے وطن اے زمین میری!
فغاں کہ تجھ کو فضول لفظوں کی کند چھریوں نے کاٹ ڈالا

مہمان

اِس کی دستک کے سمے وقفِ تحیر ہم لوگ
دشتِ غفلت میں کھڑے دیکھتے تھے
بے سحر رات کی بے فاصلہ پہنائی کو
خاک سے تابہ فلک کھلتے چلے جاتے تھے
لشکرِ غم کے علم
اس کی دستک کی صدا سن کے کوئی کہنے لگا
آخر کار کوئی آیا ہے
وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاں بخت کیا
اس کے بارے میں کوئی اچھی خبر لایا ہے
قاصدِ ارضِ وطن آیا ہے!
شاید اس پاس کوئی ایسی خبر ہو جو ہمیں
غم کے بے نام الاؤ سے رہائی دے دے
نطقِ خاموش کو پھر نغمہ سرائی دے دے
ہم نے روتی ہوئی آنکھوں سے اٹھائیں پلکیں
اور امید بھرے دل سے کہا
"اے گئی رات کے مہمان! بتا کون ہے تو؟"
اس نے کہا:
"میں مسرت ہوں' مرے ساتھ ہیں روشن نغمے

انبساط اور خوشی
کھلتے پھولوں کی مہک، پھوٹتی کلیوں کی ہنسی"
اپنے دروازے سے آنکھوں کی گزرگاہوں تک
ہم نے مہمان کو رستہ نہ دیا، عطر کو پھینک دیا
اور کھولے ہوئے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے!
پھر وہی ہم تھے، وہی ارض فلسطین تھی، وہی درد کا جال
وہی سرگوشیاں کانوں میں، وہی شام ملال
شوق کے کرب مسلسل میں گرفتار خیال
اسی خاموش خرابے میں گراں گام تھے ہم

پھر صدا گونجی کسی دستک کی
اس گھڑی گھر کے در و بام پہ غم لکھا تھا
قصئہ عہد ستم لکھا تھا
ہم اٹھے اور کہا:
"کون اس خانئہ ویراں کا سکوں لوٹنے آنکلا ہے؟
دھند میں ڈوبی ہوئی رات کی سرحد سے ادھر
کون بے فیض خموشی میں چلا آیا ہے؟
دکھ بھری رات کے مہمان، بتا کون ہے تو؟"
اس نے کہا:
"میں گل سبز کی خوشبو میں بسی خواہش ہوں
دیکھ یہ مہکا ہوا شہد مرے ہاتھ میں ہے!"
ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے اور کہا
"دکھ بھری رات کے مہمان! ہمیں تنگ نہ کر
ہاں پلٹ جا کہ ہمیں تجھ سے کوئی کام نہیں
خواہشیں ہم کو نہیں ہیں جائز

جب تلک قوم کی یہ دربدری باقی ہے
ہم انہیں پاس نہ آنے دیں گے
ہم نے دشمن کو ابھی اپنی تباہی کا بدل دینا ہے
اس کو پیغام اجل دینا ہے
جب تلک ہاری ہوئی قوم کو ہم
اس کی لوٹی ہوئی توقیر نہیں لوٹاتے
خواہشیں ہم کو نہیں ہیں جائز
دکھ بھری رات کے مہمان ہمیں تنگ نہ کر
ہاں پلٹ جا کہ ابھی غم کی صدا اور ندامت کی ہوا
روح کو تجھ سے بھلی لگتی ہے
ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے
اور کھوئی ہوئی منزل کے لئے
دکھ بھرے گیتوں میں پھر قوم کا غم لکھنے لگے

ایک دن صبح سے پھر کوئی دستک گونجی
اس قدر تیز کہ یوں لگتا تھا
جیسے مہمان کے ہاتھوں میں ہو طوفان کا ہاتھ
دشت غفلت میں چھناکے سے ہوئے
اور آنکھوں میں چمک سی اتری
ہم نے بے تابی سے دروازے طرف جا کے کہا
"اے نئی صبح کے مہمان! بتا کون ہے تو؟
تیری دستک میں یہ طوفان کا عالم کیوں ہے؟"
اس نے کہا:
"میں غضب ہوں
اشتعال اور تلاطم ہے نشانی میری

میرے ہاتھوں میں ہیں شعلوں کے چھلکتے پیالے"
ہم نے دروازے کے پٹ کھول دیئے
اپنے مہمان کے قدموں میں جھکے
اور آنکھوں سے اٹھا کر اس کو، دل کی محبوب تہوں میں رکھا
اور پھر غیظ میں اٹھ کر چیخے:
"اے نئی صبح کے مہمان ہمیں تیری قسم!
تو اگر آگ ہے، ہم لوگ ہیں ایندھن تیرا
اے غضب، جوش میں آ
رات کا عہد ستارے کی طرح ٹوٹ کے گمنام ہوا
سال ہا سال کی رسوائی بھری خاموشی
اور برداشت کا غم ختم ہوا
اے چمکتی ہوئی پیشانی کے مالک مہمان!
دیکھ ان ریت کے ٹیلوں میں بھٹکتی ہوئی اس قوم کا دل
آگ کا زخم ہوا
ہو وہ یافا کہ جنین
اپنی چھوڑی ہوئی مٹی کا ہر اک ذرۂ پاک
دست دشمن سے ہمیں لینا ہے
انتقام اور غضب کے شعلے! اور بھڑک
ہم عرب لوگ ہیں انگار ترے
ہم ترے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے تیرے
اور بھڑک
انتقام اور غضب کے شعلے ــــ اور بھڑک

مہمان شب

نم آلود زمین پر پاؤں کے نشان
اور اندھیرے میں بھونکتے ہوئے کتے
کیا وہ چور ہے؟
یا میرا نیا عاشق

محبت کوئی تقریب مسرت نہیں

تم نے کہا تھا محبت کوئی تقریب مسرت نہیں ہے
یہ چاولوں کی طرح کوئی نرم غذا نہیں
جسے گلے سے نیچے اتارنے والی خوراک نہ بھی ہو تو تم با آسانی نگل سکو
اور میں نے تمہاری بات کا یقین کیا تھا
اور میں نے ایک بے نام کمرے (دل) میں بنے ہوئے گنبد کو مرمت کیا
اور اپنی قوت کو فراموشیوں کی نذر کر دیا
اور اپنی ہنسی دہان زخم سے چھین لی
اور اب میری خوشی رہن ہے
ایک معصوم بچے کی پردرد چیخ کے عوض
اور میں اب اپنی خوشی کو واپس خرید بھی نہیں سکتی
حتی کہ اپنے آنسوؤں سے بھی
یعنی اب گریہ بھی میرے لئے باعث سکون نہیں
واقعی سچ کہ محبت کوئی تقریب مسرت نہیں
بلکہ یادوں میں گم ہونے والی یاد ہے
محبت ایک زمین کے ٹکڑے (دل) میں جنم لینے والی دنیا ہے

ہاں چلے حلقۂ زنجیر کی بات

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
فصیل زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
فضول ہے یہ شب سیہ کی تباہ کاری
کہ میرے خوں میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
اور ہونٹوں پہ جو صدا ہے وہ حرف جاں ہے

گئے ہوؤں کی عزیز روحو!
کبھی تو برزخ کی سرحدوں سے نکل کے آؤ
کبھی تو میرے زفاف کی شب میں مجھ کو دیکھو
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے فنا سفر میں
جبین اپنی بلند رکھی
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے
سپیدۂ غم میں جانے والوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں

مغنیوں کی صدائیں راتوں میں گونجتی ہیں
لرز رہے ہیں تمام سازوں کے تار جیسے

کبھی نہ سوئیں گے اہل نغمہ
مرے وطن، اے متاع ہستی ---- کبھی تو سن لے
کہ ذرہ ذرہ تری سماعت کا منتظر ہے
قبول کر لے ہمارا نغمہ
جو پھول بن کر نواح زنداں کی شور مٹی میں کھل اٹھا ہے

بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
اور ایک بے باک قہقہہ ہے یہ گیت ان پر
جو اس کی بندش کے مدعی ہیں
بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
میں ان کے آخر کے ظلم صفحوں کو ایک اک کر کے پھاڑتا ہوں

کبھی کبھی جب مری بصیرت شکست کھاتی ہے،
اور سوچیں، جہت بھلا کر بھٹکنے لگتی ہیں،
میری آنکھوں میں کوند جاتا ہے اپنے والد کا وہ تبسم
جو موت لمحے میں اس کے چہرے پہ ضو فگن تھا
دکھائی دیتے ہیں قاتلوں کے سیاہ چہرے
جو خوف و دہشت کے سرد جالے میں کانپتے ہیں

مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے
کہ ان کے بس میں نہ گیت میرے، نہ پھول میرے،
نہ میری چاہت
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے!
کہ دسترس میں نہیں ہیں ان کی

وہ کنجیاں، جن سے میری جیبیں بھری ہوئی ہیں
مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے، نہ ان فصیلوں میں بربریت کے شاہکاروں کا خوف کوئی
کہ جب بھی چاہوں
نئی مسرت سے پر زمینوں کی سرخ مٹی میں منہ چھپانا
ہے میرے بس میں

نہیں ہے کچھ بھی سلاخ زنداں کی دسترس میں
کہ میری ساری حیات لمحہ ہے --- ایک لمحہ
زمان چاہت کے لاکھ قرنوں میں ایک لمحہ
یہ قید میری، مرے لئے ہے فقط تماشا
فضا ہے جس طرح کھیل کوئی۔

○○

دردِ زہ

ہوا بار بردار کرنے والے مادہ کو اڑا لے جاتی ہے
اور ہماری سرزمین کانپتی ہے راتوں میں
دردِ زہ کا رعشہ
اور جلاد اپنے دل میں باور کر لیتا ہے
عجز کی کہانی، ٹوٹنے پھوٹنے کی داستان
اور خاتمہ

اے ہمارے کل کے نوجوان! جلاد کو بتا دو
کہ پیدائش کا رعشہ کیسا ہے
اسے بتا دو کہ پھول کیسے پیدا ہوتے ہیں
زمین کے جوکھوں سے اور کل کیسے پھوٹتی ہے
زخموں کے، لہو کے گلابوں سے

پردہ گرتا ہے

جب تالیوں کے شور سے گونجی ہوئی فضا، ہوتی ہے بے صدا
سایہ سا ایک ہال کے
سقف و در و دیوار سے
چلتا ہے اور کھیل کے کرتا ہے، گر بہ پا، دل کا مرے طواف
ہٹتا ہے "الجلیل" (۱) کے چہرے سے پھر غلاف
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

○

میں خود کو دیکھتا ہوں برہنہ تمام رات
جیسے ذبیحہ خانہ میں رکھا ہوا بدن
دیکھے تھے میرے باپ نے ارماں بھرے جو خواب
میرا یہ کھیل ان کی نہ تعبیر بن سکا
بخشی تھی "الجلیل" کی چڑیوں نے جو نوا
میرا یہ کھیل ان کی نہ تفسیر بن سکا
ماتھا مرا پسینے میں ڈوبا ہے اور میں
ہاتھوں سے دھو رہا ہوں ندامت کی گرد کو
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

کہتے تھے "جو پسند ہے ہم کو وہی لکھو
جس نے رقم لگائی ہے اس کا کہا کرو"
دھن تھی سفید جھوٹ کی، لیکن وہ ذی وقار
کہتے تھے "اس پہ رقص کرو گیت بھی لکھو"
لیکن میں تھک گیا ہوں، بہت اس کمال سے
رکھنے لگا ہوں طاق پہ فرضی کہانیاں
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

○

واللہ، یقین جانیے، مقصد نہ تھا کوئی
لکھا تھا میں نے کھیل یہ تفریح کے لیے
تعریف اس کی ناقدوں نے، اہل فن نے کی
لیکن مجھے لگا
"اس" کی نگاہیں چیر رہی ہیں مرا وجود
"اس" نے مرے بدن کی زمیں کھرچ کھرچ کر
ہر ایک مو پہ نقش لکھا "الجلیل" کا
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

○

اے میرے خوں، مہکتے ہوئے بے نشاں لہو
تصویر کش ہیں بغض و عداوت کے وہ قلم
جن کے لیے سیاہی کا منبع بنا ہے تو!
یافا(۲) ہے جیسے ڈھول پہ چمڑا کسا ہوا
اور اہل زر کے ہاتھ میں میرے یہ استخواں

چھڑیوں کی ہیں مثال
ہلتے ہیں میرے ہاتھ' دیتا ہے کوئی تال
ہر رات ناظرین سے کہتا ہوں جھک کے میں
"کل گر حضور آئیں تو وعدہ ہے یہ مرا
کردار اپنا آج سے بہتر کروں گا میں"
سو اس لئے ہے آج مرا آخری سلام

○

اونچے گھروں کے اعلیٰ و ارفع اے ناظرین!
لکھا ہے میں نے بیس برس آپ کے لیے
زندہ رہا ہوں آپ کی تفریح کے لیے
لیکن یہ وقت ہے کہ کروں آخری سلام
سیلاب رنگ و نور کی موجوں سے بھاگ کر
گاؤں میں "الجلیل" کی گلیوں میں صبح و شام
گاؤں میں "الجلیل" کی چڑیوں کے روبرو
بھرتی ہیں جو محال امیدوں میں رنگ و بو
اڑتی ہیں اپنے خواب کی مستی میں بے مقام
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام
--- مرا آخری سلام--- مرا آخری سلام

ایک مقدس گیت کے چند بول

انقلاب کے بیٹے
جن کا نام آزادی
آنکھ روشنی کی آنکھ
ہات روشنی کے ہات
سارا جسم لوہے کا
اور سوچ ---- آزادی

○

امن کے پیمبر ہیں
انقلاب کے بیٹے
ظلم و دشمنی میں آگ،
عدل، دوستی میں پھول
کامران ہر لحظہ
یاد رکھ! انہیں، دنیا
زندگی! انہیں مت بھول

یو۔ ٹامسی / افضل احسن رندھاوا

جنگل کی آگ

آگ، دریا کہنا چاہیے
ایک سمندر رپنا ریت کے پیچھے بھاگنا
پاؤں، ہاتھ
پیار کے لئے، دل کے اندر
یہ دریا جو میرے اندر رہتا ہے، مجھ کو پھر آباد ہے کرتا
آگ کے گرد بیٹھے یہ صرف میں نے تم سے کہا تھا

میری نسل
کسی دریا کی مانند یہاں وہاں
شعلے، نظریں ان کی جو اس بارے سوچیں
میں نے تم سے کہا تھا
میری نسل کو
یاد ہے
پگھلے تانبے کو پینے کا ذائقہ

غصہ

مجھے یہ احساس غصہ سے پاگل کرتا ہے
کہ میں وہاں نہیں ہوں
جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا
جب میں چھ سال کا تھا
میں نے سنا تھا
کچھ مشینیں ایسی ہیں
جو آسمان میں پرندوں سی اڑان بھرتی ہیں
پانیوں کے نیچے مچھلیوں سی رقص کرتی ہیں
میں نے سوچا تھا
بڑا ہو کر میں بھی ایسی ہی مشین بناؤں گا
جسے ہواؤں میں اڑاؤں گا
زمیں کے اندر چلاؤں گا
مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا
مجھ سے پہلے ہی کچھ پرندے یہ ایجاد کر چکے ہیں
مجھ سے پہلے ہی کچھ کیڑے زمیں کے نیچے اتر چکے ہیں
غارت ہوں یہ سب
سب پر غضب غضب غضب
قہرو غضب' قہرو غضب' قہرو غضب
اب تب کب' کب تب اب' جب اب تب
عجب عجب

ایک یتیم افریقی بچی کا خط

یو این او کے سیکرٹری جنرل کے نام

آج پھر میں شام کو
اپنے ہی تباہ حال گھر کے
ٹی وی لاؤنج میں
خوشیوں' اداسیوں کے ساتھ ہم کلام تھی
کہ باتھ روم کی طرف سے
میرے چھوٹے بھائی نے
جو آٹھ سال عمر کا ہے
جس کے پیٹ پر بموں کے زخم بھی ہیں
ٹی وی آن کر دیا' تو پھر' جناب آپ کا
فریب سے بھرا ہوا بیان نشر ہو رہا تھا
"۔۔۔۔ افریقی قوم عظیم تر ہے"
ہاں جناب! ہم عظیم تر ضرور ہو گئے ہیں
(بھوک اور پیاس سے بھرے ہوئے
ہاں جناب! ہم عظیم تر ضرور ہو گئے ہیں
دیکھیے تو۔۔۔ سارا ملک راکھ بن چکا ہے اور۔۔۔۔

بستیاں اجاڑ ہیں
ہاں جناب! آپ نے بجا کہا ہے
ہم عظیم تر ضرور ہو گئے ہیں
دیکھئے جناب! میں عظیم تر خطاب پر بھی مطمئن نہیں ہوں
---- پر مجھے معاف کیجئے گا۔ میں اگر
اس سیاہ سماج کے لئے نہیں
(بے گناہ سماج کے لئے نہیں)
آپ سے حضور! آپ کی عظیم ذات سے حضور!
اپنے چھوٹے بھائی کی سیاہ و سخت پشت پر
بموں کے زخم کے علاج کے لئے
اور اپنی پنڈلیوں کے ماس میں دھنسی ہوئی
عذاب ناک گولیوں کے
درد سے نجات کے لئے
دوائی مانگ لوں

لمبی مسافت

میری بیوی مجھے چھوڑ گئی
جب ہم دونوں ابھی نوجوان تھے
اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک عم زاد کے ہاں جا رہی ہے
وہاں ضرور اس سے زیادہ کچھ ہو گا

گزشتہ گرمیوں میں وہ لوٹ آئی
فصل کی کٹائی سے ذرا پہلے
میں نیند سے جاگا تو وہ وہاں موجود تھی
اور شادی کے طعام والے پکوان بنا رہی تھی

اب وہ ایک ادھیڑ عمر اور فربہ عورت ہے
یہاں تک کہ اس کے ہونٹ بھی شکنوں بھرے ہیں
لیکن اب بھی جب کبھی وہ بیٹھے ہوئے فون پر باتیں کرتی ہے تو
اس کی گال یا بازو کی محراب
مجھے اس لڑکی کی یاد دلاتی ہے جیسی کہ وہ کبھی تھی
میرے لئے اب اس تصور کی کیا وقعت ہے؟
میں اسے ہمیشہ اسی طرح یاد کرنا چاہتا ہوں
جیسی وہ اس وقت ہے

ہائیکو

دروازے کی مٹھ پر اس کے ہاتھ
دھوپ کا دریا بہتا ہے
اس کی پنڈلیوں کے درمیان

راستہ

مسافر
تمہارے پاؤں کے نقوش ہی راستہ ہیں
اور بس
مسافر
تمہارا چلتے رہنا ہی
راستے کا اثبات ہے
پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھو
تو ایک پگڈنڈی سی دکھائی دے گی
جس پر دوبارہ گذر ممکن نہیں
مسافر
راستہ کوئی نہیں
صرف سمندر کے جھاگ بھرے
پانی کی ایک لکیر۔۔۔

گھر کی خبریں

"میرے پیارے بیٹے! میں راضی ہوں شکر خدا کا
تیرے واسطے میں دن رات دعائیں کرتی ہوں۔"

"میرے پیارے بھائی! یہ اک دکھی کر دینے والا فرض ہے
کہ میں تجھ کو بتلاؤں کہ اماں جی فوت ہو گئیں
پچھلی اتوار کو
اک معمولی سی بیماری کے بعد۔"

"اے میرے چچا زاد! میں اب کافی بڑا ہو گیا ہوں
بھیجو کچھ پتلونیں اور نئے جوتے مجھ کو۔"

"میرے پیارے! دس برس سے میں تیرا رستہ پڑی دیکھتی ہوں
گورے کے اس ملک میں، کونسی شے ہے جو تم کو روکے ہوئے
سوچ ذرا کہ تیری اس لمبی غیر حاضری سے
ہم کتنی تکلیف میں ہیں۔"

"پیارے دوست ہمارا قصبہ

ایک بڑے قصبے میں بدل رہا ہے
کسی کو پیٹ بھر کے روٹی ملتی نہیں سوائے ۔۔۔۔۔
مجھ کو ٹیپ ریکارڈر اک بھیجو۔"

"میرے بیٹے! میں ہوں تمہارا باپ' جو
تمہاری منتیں کر رہا ہوں' واپس وطن کو لوٹو
ورنہ پھر تمہیں' میری قبر پہچاننے کا بھی
نہیں ہو گا افسوس۔"

"میرے پیارے بھتیجے! مجھ کو بتانا چاہیے
تمہارے باپ کی موت کی خبر اور یہ امید کہ
تم آ کے اس کے چالیس دنوں کے سوگ میں شامل ہو گے۔"

"میرے پیارے! ۔۔۔۔۔!"
اک آنسو جب ڈاکیہ میرے پاس سے گذرا کل
آج میں اس کے انتظار میں پھر سے ہوں بے چین
ایک اداسی مجھ کو چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہے' کہ جب
مجھ کو کوئی گھر کی خبر نہیں ملتی'
میری روح مرجھا جاتی ہے
جب کوئی گھر کی خبر میرے اوپر آگرتی ہے
پچھلے روز اک کشتی میں نے بنائی
گھر کی خبروں سے لدی ہوئی
اس کو میں نے سمندر پار جلاوطنوں کے
گھاٹ پہ' پانی میں چھوڑا

پھر میں نے اس کے پہنچنے کے لئے دی حاضری
امید تلے اکلدپے کی بندرگاہ پر
میری کشتی لائی میرے لئے کچھ خفیہ مسافر
اگلے روز ہی چٹھی رساں کا معجزوں والا ہاتھ
بڑھا ہوا تھا میری طرف

"مرے پیارے دوست! تمہارا بھائی پکڑا گیا
پچھلے ہفتے جائیداد کی ضبطی کے اک جھگڑے میں
تیرے حکومت مخالف کام پہ
کسی بھی مرد کے بنا ترا اب خاندان رہ گیا ہے
مجھ کو ایک قمیض اور اک نکٹائی بھیج۔"

بدروحیں!

ہمارے جنم پانیوں میں ہم پر سینکڑوں بدروحوں کا پھیرا
لہو میں ڈوبے گی یہ زندگی
اس سر کی آئرن پہ پڑتا ہے ہتھوڑا
سر کا یہ کشکول ہے ریزہ ریزہ
راہوں پہ بھیجے کے چھینٹے چھڑکاتا
راہگیروں کو ٹوٹی ہوئی کہانی کرتا پیش
دیکھ انقلابات زمانے کے
بکری کی رگوں میں ارنے بھینسے کی طاقت بھر!
مورکھ تھے ہم' جو پناہ
ان کی نظروں کے پروں پر ڈھونڈتے تھے
بھاگ کے اپنے کانوں میں رکھے ہوئے خوابوں سے

روز روشن کے محاصرے میں' انہوں نے
چوری کر لی نیند ہماری
اپنے مختصر پاگل پن میں ہم نے
لوریاں درد بھری پکاروں سے بدل لیں

ہم سارے باہر تھے کھیتوں میں
جب راتوں کے چور، ہمارے سرہانوں میں
آنکھ بچا کے گھس گئے
وہ ہماری نیند پہ چھپ کے حملہ کریں گے
اور دبا دیں گے گردن وہ خواب ہمارے کی
بدروحیں 'لہو چوسنے والی' میں نے دیکھی ہیں
ان کو پتہ ہے، میں نے ان کو دیکھ لیا ہے، جب
نمک آٹا لانے کے واسطے، میرے باپ نے، مجھ کو گھر بھیجا تھا
میری آواز، میری آواز، وہ ڈھونڈ رہی ہیں بس آواز میری
میرے لوگو! مجھ کو مت سونے دو۔

جان اگارڈ / عباس رضوی

بندوق کی گولی کی جانب سے اک سوال

میں بندوق کی گولی ہونا ترک کرنا چاہتا ہوں
میں بہت زیادہ عرصے سے بندوق کی گولی ہوں
میں اک معصوم سکہ بننا چاہتا ہوں
جو اک بچے کے ہاتھ میں ہو
اور جسے اک ببل گم مشین کے سوراخ میں ڈال دیا جائے
میں بندوق کی گولی ہونا ترک کرنا چاہتا ہوں
میں بہت زیادہ عرصے سے بندوق کی گولی ہوں
میں ایک نیک شگون والا بیج ہونا چاہتا ہوں
جو کسی کی جیب میں بیکار پڑا رہے
یا کوئی معمولی سا پتھر
جسے کسی کان کے بندے میں لگنا ہو
یا جو بہت سارے معمولی پتھروں کے درمیان
بے شناخت پڑا رہے
میں بندوق کی گولی ہونا ترک کرنا چاہتا ہوں
میں بہت زیادہ عرصے سے بندوق کی گولی ہوں
سوال یہ ہے کہ
کیا تم قاتل ہونا ترک کر سکتے ہو

وہ ریشم میں ملبوس آئی

وہ ریشم میں ملبوس آئی
پر چھاتیاں اس کی ننگی تھیں
چہرہ اس کا چھپا ہوا تھا
وہ شاہیں کے نشیمن پر بیٹھی تھی
دونوں ہاتھ سے تلواریں لہراتی ہوئی
وہ اک ممنوعہ سی شے تھی
جو خوابوں میں کچھ بدصورت لگتی ہے

اس نے مرے ہاتھوں میں لفظ دیئے
جو اون اور روئی میں لپٹے تھے
ختم نہ ہونے والی ایک پہیلی سے وہ بندھے ہوئے تھے
ان میں پیار تھا
اور اک ایسی نفرت تھی، جس میں پیار نہیں ہوتا
زہر بھرا تھا ان میں کالے سانپوں کا
دیکھنے میں بے حد سندر لگتے تھے
جیسے فلک پر زحل کا جادو

وہ ہلکے پروں والی تتلی تھی
دن بھر اس کی صدائیں بے آواز رہا کرتی تھیں
لیکن شب کو

وہ مفلوج انسانوں پر حملہ کرتی تھی
اس جیسا سفاک جہاں میں کوئی نہیں تھا
رات کو وہ ان گہرے غاروں میں جاتی تھی
جہاں فقط زخمی چیتے خوابیدہ ہیں
ہرے رنگ کی روشنی میں خاموشی سے

کہر آلود فضاؤں میں اس کے پاؤں کی آہٹ تھی
ان کھنڈرات میں جو صدیوں پہلے تعمیر ہوئے تھے
جن کے اندر برف کی قلمیں ہر جانب آویزاں تھیں
تھکی تھکی لیکن چلتی لہروں سے آلودہ فضا میں
وہ اپنے چہرے کی جھری جھری کو سہلاتی تھی
اور یوں ایک نئی آفت برپا کرنے کی تیاری کرتی تھی

لفظ محبت گھسا پٹا ہے
اس کو ہزاروں بار غلط معنی پہنائے گئے ہیں
اکثر اس کو خون میں بھی نہلایا گیا ہے
آؤ میں تم کو دھو کر پاک کروں
جیسے سونے کو دھو کر چمکایا جاتا ہے

میرا بازو تھام لو
میں تم کو اس بڑے ہجوم سے باہر لے جاؤں
اس تنی ہوئی چوٹی کے اوپر
شیشے جیسی چمکتی فصل گل کی جانب
جہاں پہ میں نے ڈھونڈھ لیا ہے
اسے ـــــ جسے زندہ رہنا آتا ہے

استقبال

غم کا موسم
جب بھی آتا ہے
میرے دل میں
خواہشیں بین کرتی ہیں
اور وحشتیں رقص!!!

خلیل جبران / ظفر اکبر آبادی

غنائیہ

راوی: وہ منتخب و محبوب جو اپنے عہد کی صبح صادق تھا۔ بارہ سال تک شہر عرفہ میں اپنے جہاز کا منتظر رہا جو اسے وطن کی طرف لے جانے والا تھا۔ آخر بارھویں سال جب اس نے شہر کے باہر پہاڑی پر چڑھ کر سمندر کی طرف نظر کی تو کہر کے دھندلے دامن میں اپنے جہاز کو آتے دیکھا۔ اس کی مسرت نے سمندر کی سطح پر اپنے پر پرواز کھول دیئے' اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی روح کے سکون مطلق میں دعا کرنے لگا۔ مگر جب وہ پہاڑی سے اتر رہا تھا تو اس پر ایک اداسی طاری ہوئی اور وہ یکایک اپنے دل سے گویا ہوا۔

آواز: میری امیدوں کا گہوارہ و مرکز ہے یہ شہر
میں یہاں سے کبھی مسرور نہیں جا سکتا
میں نے آسائش و اندوہ کا اک دور طویل
گھومتے پھرتے گزارا ہے گلی کوچوں میں
میری تنہائی کی راتیں تھیں نہایت لمبی
پھر بھی یک گو نہ مرے قلب کو تھا اطمینان
کس طرح پھر بھلا ممکن ہے کہ اس بستی سے
میں بغیر اشک بہائے ہوئے رخصت ہو جاؤں
کوبکو بکھرے پڑے ہیں مرے دل کے ٹکڑے
جا بجا میری تمناؤں کی اولادیں ہیں
کس طرح پھر بھلا ان سب کو بھلا کر یک لخت
اپنی منزل پہ پہنچنے کا ارادہ کر لوں
یہ کوئی جسم پہ ڈالا ہوا ملبوس نہیں
دم زدن میں جو اتر جائے گا آسانی سے
یہ ہے اک کھال مرے جسم پہ چپکی ہوئی کھال
اپنے ہاتھوں سے جسے نوچنا ہو گا مجھ کو
یہ حسیں شہر تخیل ہی نہیں ہے کہ جسے
ذہن سے اپنے جدا کر کے چلا جاؤں گا
یہ مرا دل ہے مری زیست کا مقصود ہے یہ

مگر اب میرا ٹھہرنا بھی تو ناممکن ہے
اپنی منزل پہ بہر حال پہنچنا ہے مجھے
دیر سے مجھ پہ ہے مرکوز سمندر کی نظر
منتظر کب سے ہے ساحل پہ سفینہ میرا

راوی : اس طرح سوچتا ہوا جب وہ دامن کوہ میں اترا تو اس نے پھر سمندر کی طرف دیکھا اس کا جہاز ساحل کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ اس نے جہاز کے ملاحوں کو غور سے دیکھا وہ سب اس کے ہم وطن تھے۔ پھر وہ کچھ اور آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ دور دور سے بہت سے آدمی اپنے لہلہاتے کھیتوں اور شاداب باغوں کو چھوڑ کر شہر کے دروازے کی طرف چلے آرہے ہیں اس نے ان کی آوازیں سنیں۔

وہ سب اسی کا نام لے کر پکار رہے تھے اور کھیتوں کھیتوں چلا چلا کر ایک دوسرے کو جہاز کے آنے کی خبر سنا رہے تھے۔ لوگوں کے اس احساس پر اس کے دل سے آواز بلند ہوئی۔

آواز : کیا دے سکوں گا میں انہیں جو میرے واسطے
آئے ہیں لہلہاتے ہوئے کھیت چھوڑ کر
کیا دے سکوں گا میں انہیں جو میرے واسطے
دامن کشاں بہار کی شادابیوں سے ہیں
کیا دے سکوں گا میں انہیں جو میرے واسطے
بددل ہیں گنگناتے ہوئے آبشار سے
اے کاش آج قدرت خالق سے میرا دل
بن جائے ایک نخل ثمر دار۔ تاکہ میں
پھل اس کے دونوں ہاتھوں سے تقسیم کر سکوں
کیا خوب ہو کہ آج مرا ذوق آگہی
مانند آبشار رواں کام آسکے
جس سے یہ لوگ اپنے پیالوں کو بھر سکیں
اے کاش بن سکے مرا دل آج مورچنگ
جب اس کو چھیڑنے لگیں لوگوں کی انگلیاں
موسیقیوں کی لہر فضاؤں میں پھیل جائے
کیا خوب ہو کہ بن سکوں میں ایک بانسری
سینے سے بانسری کے جو موج نفس اٹھے
وہ بڑھ کے ان کی روحوں میں اک ساتھ ڈوب جائے

راوی : اور جب وہ شہر میں داخل ہوا تو سب لوگوں نے اس پر سلام بھیجا۔ اور بیک زبان چلائے کہ تو ابھی ہم سے جدا نہ ہو تو ہمارا محبوب ہے۔ ابھی ہماری آنکھوں کو اپنے دیدار کا بھوکا نہ بنا۔ سمندر کی موجوں کو ہمارے اور اپنے درمیان حائل نہ کر۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ رخصت

ہونے سے پہلے تو ہمارا راز ہم پر ظاہر کر دے اور وہ سب کچھ بتا دے جو تو نے موت اور زندگی کے درمیان دیکھا ہے۔ تو ہمیں اپنی حقیقت اعلیٰ سے ایک حصہ عطا کر۔ ہم تیرے عطیہ کو اپنے بچوں کے سپرد کر جائیں گے اور پھر وہ بچے اپنے بچوں کو اس طرح تیری امانت ہمیشہ ہماری نسلوں میں محفوظ رہے گی۔

آواز : مرے عزیزو کروں تم سے ذکر کس شے کا

آواز : اے برگزیدہ و خدا رسیدہ تو ہمیں محبت کے متعلق کوئی بات بتا۔

آواز : تم لوگوں سے جس وقت مخاطب ہو محبت
لازم ہے تمہیں بھی کہ رہو گوش بر آواز
جس وقت محبت تمہیں نزدیک بلائے
تم اس کے اشارات کا مفہوم سمجھ کر
ہر لفظ کا ہر بات کا مفہوم سمجھ کر
اک آن میں نزدیک محبت کے پہنچ جاؤ
گھبراؤ نہ دشواری حالات سے ہر گز
جس وقت محبت تمہیں پردوں میں لپیٹے
بے خوف و خطر پردوں میں تم اس کے لپٹ جاؤ
اس خنجر خونخوار کی ہر گز نہ کرو فکر
پردوں میں محبت کے جو مستور و نہاں ہے
وہ خواہ تمہیں خون کے دریا میں ڈبو دے
جس وقت کرے تم سے کوئی بات محبت
لازم ہے کہ اس بات پہ لے آؤ تم ایمان
ہر گز نہ کرو فکر جو آواز سے اس کی
ناگاہ بکھر جائیں حسیں خواب تمہارے
رکھتی ہے کسی سر پہ کبھی تاج محبت
کرتی ہے کسی کو کبھی تاراج محبت
دیتی ہے کسی روح کو تسکین کی دولت
بنتی ہے کسی دل کے لئے وجہ اذیت
ہوتی ہے کبھی راگ کا بہتا ہوا دریا
بنتی ہے کبھی آگ کا بہتا ہوا دریا
یہ آگ کا دریا تمہیں جس وقت بلائے
تم پھیلتی بڑھتی ہوئی موجوں سے لپٹ جاؤ
موجوں سے لپٹنے میں اگر خوف ہو محسوس
پھر ہے یہی لازم کہ تم اس راہ سے ہٹ جاؤ

بہتر ہے چلے جاؤ تم اک ایسے جہاں میں
جس میں ہو کوئی ذوق نہ موسم نہ کوئی رنگ
ہر چند کہ تم لوگ وہاں ہنس تو سکو گے
ہنسنے سے مگر دل کا کنول کھل نہ سکے گا
ہر چند کہ تم لوگ وہاں رو تو سکو گے
رونے سے مگر دل کو سکوں مل نہ سکے گا

راوی: اے آگاہ راز تو ہمیں بچوں کی بابت کوئی بات بتا

آواز: تمہارے بچے تمہارے نہیں ہیں اے لوگو
ابھارتی ہے فقط قوت حیات انہیں
وہ ہر لحاظ سے اس زندگی کی ہیں اولاد
جو ارتقا کے لئے بے قرار رہتی ہے
انہیں تمہاری وساطت ضرور حاصل ہے
مگر تم ان پہ تسلط نہیں جما سکتے
انہیں تم اپنی محبت تو سونپ سکتے ہو
مگر تخیل فرسودہ دے نہیں سکتے
انہیں تمہارے تخیل کی احتیاج نہیں
وہ اپنے ساتھ تخیل بھی لے کے آتے ہیں
تم ان کے جسموں کو آسائشیں تو پہنچاؤ
مگر قیود سے روحوں کو آشنا نہ کرو
وہ روحیں ماضی و امروز سے بہت آگے
اک ایسے قصر حسیں میں قیام کی کرتی ہیں
جو ہے زمانے میں فردا کے نام سے موسوم
جہاں تمہارا تصور پہنچ نہیں سکتا
تم ان کے نقش قدم پر جو چل سکو تو چلو
مگر انہیں کبھی تقلید پر نہ اکساؤ
کہ زندگی کبھی پس پا نہیں ہوا کرتی
قدم حیات کے آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں
تمہارے بچے ہیں تیر اور تم کمانیں ہو
وہ تیر ہو کے کمانوں کی قید سے آزاد
فضا میں راستہ اپنا تلاش کرتے ہیں
علاوہ تیر و کماں کے ہے ایک تیر انداز
جو اپنی قوت بازو سے ان کمانوں کو

شبانہ روز فقط اس لئے جھکتا ہے
کہ تیر دور بہت دور تک چلے جائیں
تمہیں ہے اب یہی لازم کہ اس کے ہاتھوں پر
بصد نیاز بصد احترام جھک جاؤ
پسند کرتا ہے جیسے وہ تیز تیروں کو
اسے عزیز ہیں مضبوط تر کمانیں بھی

راوی: اے آقا مناکحت کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟

آواز: ہوئے ہیں مرد و عورت ساتھ پیدا
رہیں گے ساتھ یہ دونوں ہمیشہ
رہے گا ایک ہی دونوں کا مرکز
خدا کے حافظے میں بھی یہ دونوں
رہیں گے تا ابد اک ساتھ محفوظ
مگر اس وصل میں کچھ فصل بھی ہو
کہ جس سے زندگی کا لطف آئے
تمہیں لازم ہے اے لوگو کہ باہم
محبت تو کرو۔ لیکن خدارا
محبت کو سلاسل مت بناؤ
محبت کو بناؤ اک سمندر
بہ ہر صورت جو تم دونوں کے مابین
رواں ہو بے تکلف۔ یوں کہ جیسے
رواں ہوتا ہے اپنے کیف میں گم
ہمیشہ درمیاں دو ساحلوں کے
بھرو اک دوسرے کے جام لیکن
خدارا ایک ہی پیالے سے دونوں
بجھاؤ تشنگی اپنی نہ ہرگز
کرو تقسیم باہم اپنے لقمے
خدارا ایک ہی روٹی کو لیکن
جہاں تک ہو کبھی مل کر نہ کھاؤ
مناؤ رنگ رلیاں ساتھ مل کر
اٹھاؤ زندگی کا لطف لیکن
رہو آزاد بھی اک دوسرے سے
کہ جیسے ساز کے دو مختلف تار

جدا ہوتے ہوئے بھی چھیڑنے پر
کیا کرتے ہیں پیدا ایک ہی راگ
ہمیشہ زیست کے ماحول میں تم
رہو شانہ بہ شانہ بے تکلف
مگر آپس میں بالکل مل نہ جاؤ
ستون جس طرح مسجد کے عموماً"
جدا ہوتے ہوئے اک دوسرے سے
عمارت کو سہارا بخشتے ہیں

راوی: ہم سے غم و مسرت کا کچھ ذکر کر۔ تاکہ ہم ان حقیقتوں سے آگاہ ہو سکیں۔

آواز: تمہارا غم ہی حقیقت میں ہے تمہاری خوشی
وہ غم کہ چہرے سے جس کے اتر گیا ہے نقاب
ذرا یہ سوچو کہ وہ چاہ وہ کنواں جس میں
تمہارے ہنسنے کی آواز گونج اٹھتی ہے
وہی تو ہے کہ جہاں اشک غم بھی گرتے ہیں
تمہاری روح میں غم جاگزیں ہے جس حد تک
نہاں ہے اتنی ہی مقدار میں مسرت بھی
وہ جام جو ہے تمہاری شراب سے لبریز
وہی تو ہے کہ جو آوے کی آگ میں جل کر
تمہاری محفل عشرت فزا میں پہنچا ہے
وہ نے وہ نغمہ بلب نے کہ جسکی موسیقی
تمہاری روح میں پیدا گداز کرتی ہے
ہر ایک غم سے تمہیں بے نیاز کرتی ہے
نہیں ہے کیا وہ اسی چوب خشک کا ٹکڑا
چھری سے سینہ کریدا گیا تھا جس کا کبھی
تمہارا دل ہو مسرت سے جب کبھی معمور
تو دیکھو غور سے گہرائیوں میں تم دل کی
تمہیں ملے گی وہی چیز رنج کا موجب
جو بخشتی ہے مسرت کا قیمتی احساس
تمہاری روح پہ جب ہو فسردگی طاری
تو غور کرنے سے ہوگا تمہیں یہی محسوس
کہ تم ملول ہو اس شے کے واسطے دراصل
خوشی سے روح کو جو ہمکنار کرتی ہے

خوشی ہے غم سے معلی نہ غم خوشی سے بلند
یہ امتیاز تمہاری نظر کا دھوکا ہے
یہ دونوں ساتھ ہی آتے ہیں جب بھی آتے ہیں

راوی: تو ہمیں دوستی کے متعلق کوئی بات بتا تاکہ ہم اس کی اصلیت سے آگاہ ہو سکیں

آواز: تم کسی دوست سے جس وقت جدا ہونے لگو
نہ کرو دل کو جدائی کے الم سے معمور
کیونکہ جو چیز تمہیں اس کی بہت پیاری ہے
عین ممکن ہے کہ وہ اور بھی واضح ہو جائے
دوستی میں کبھی اغراض کو شامل نہ کرو
دوستی نام ہے بے لوث محبت کا فقط
تمہیں قدرت کی طرف سے جو ملا ہے جوہر
دوست کو بھی کرو اس جوہر ذاتی میں شریک
دوست کا راز کبھی بھول کے ظاہر نہ کرو
کیونکہ یہ فعل سراسر ہے محبت کے خلاف
جو محبت تمہیں اس فعل پہ آمادہ کرے
وہ محبت نہیں اک دام ہے پھیلا ہوا دام
دوست کو وقت گزاری کے لئے مت ڈھونڈو
دوستی ہے بشریت کا اک اعلیٰ مقصد
دوستی کے لئے گر دل میں ہے کچھ گنجائش
گھول دو اس کی حلاوت میں تبسم اپنا
کیونکہ جب زیست کی البیلی معطر شبنم
دل پہ گرتی ہے تو کھلتے ہیں دریچے دل کے

راوی: تو ہمیں حسن کی حقیقت سے آگاہ کر جو ازل سے اب تک ہر فرد و بشر کی توجہ کا مرکز ہے۔

آواز: تم لوگ ذکر کرتے ہو جس وقت حسن کا
ہوتا ہے لفظ لفظ سے اعلان خواہشات
کہتا ہے کوئی حسن ہے دوشیزہ جواں
جس کی نظر نظر ہے بہاروں کی داستاں
جس کا نفس نفس ہے محبت کا ترجماں
کہتا ہے کوئی حسن ہے طاقت کا دیوتا
جو اک دہاڑتے ہوئے طوفان کی طرح
ارض و سما کے شانے ہلاتا ہے دمبدم

کہتا ہے کوئی حسن بہت مہربان ہے
جس کی گرفت نرم ہے شیریں زبان ہے
کہتا ہے کوئی حسن ہے مدہم سی اک صدا
میٹھا سا ایک نغمہ ہے دلکش سا ایک راگ
جو روح میں جگاتا ہے موسیقیوں کی لہر
کہتا ہے کوئی حسن گرج بادلوں کی ہے
کہتا ہے کوئی حسن ہے اک صبح زرنگار
ان سب تصورات میں ہے خواہشوں کا رنگ
اور حسن خواہشات سے کافی بلند ہے
وہ صرف ایک کیف ہے اک کیف بے پناہ
پیاسے کا خشک لب ہے نہ سائل کا ہاتھ ہے
وہ صرف دل ہے جوش طلب سے بھرا ہوا
وہ صرف ایک نقش تصور ہے دوستو
جو آنکھ بند کر کے نظر آئے گا تمہیں
وہ اک لطیف نغمہ ہے اک مست راگ ہے
کان اپنے بند کر کے جسے سن سکو گے تم

راوی: یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اپنے جہاز کے پاس پہنچ گیا۔ جہاز کے عرشہ پر کھڑے ہو کر اس نے اہل عرفہ پر نگاہ ڈالی اور پھر اپنے گرد نظر کی۔

اس نے دیکھا کہ اس کے جہاز کے ملاح اپنے پتواروں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔ وہ کبھی کھلے ہوئے بادبانوں کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی سمندر کی وسیع سطح پر نظر کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے ملاحوں کی طرف اشارہ کیا ملاحوں نے لنگر اٹھا لیا اور جہاز مشرق کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس وقت بستی والوں کے مجمع سے ایک شور بلند ہوا۔ جو رات کی ابتدائی ظلمت کے سینے کو چیرتا ہوا سمندر کی سطح پر گزر گیا۔ تمام اہل عرفہ جہاز کے بادبانوں پر نظر جمائے رہے تا آنکہ جہاز کہر کے دھندلے دامن میں چھپ گیا۔۔۔۔

(ماخوذ)

موج

(آئینہ خالدہ کے لئے)

خالدہ:
تم اک شاخ ہو
سر سبز پتوں سے گھری ہوئی اک شاخ
تم اک ایسا سفر ہو
جس کا دن
تمہاری آنکھوں کی جھیل کے پانی میں ڈوبتا ہے
تم اک موج ہو
اک ایسی موج ہو
جس نے دکھلائی تاروں کو روشنی
بادلوں کا چہرہ
اور
یہ بتایا
کہ غبار کی آہیں بھی پھول ہیں

موت

ہمارے ملتے ہی
چند لمحوں کے بعد
وقت پھر لوٹ جاتا ہے
قدموں کی آہٹیں
اور
وہی پرانے لوٹنے والے راستے آجاتے ہیں
گھر بوڑھا ہو جاتا ہے
پلنگ بجھا دیتی ہے زمانے کی آگ ۔۔۔
مر جاتا ہے ۔۔۔۔
تکیہ
خالی تکیہ رہ جاتا ہے

انصاف کیا جاتا ہے!

مارا پیٹا گیا
لوٹا گیا'
ہسپتال میں داخل؟
اور گواہ؟
ریت کے ذروں جتنے:
اک کیڈل ہے
اک نڈولا
نڈیام بیلے بھی ہے
حتیٰ کہ پرندے بھی گواہی دے سکتے ہیں ----
پر تم بھول گئے' سردار کا
بیٹا منصف ہے
اور داماد ترجمان

○

بیل فوجی!
کیا تمہیں علم نہیں
کہ سات برس کا بیل
سپاہی بن سکتا ہے

اور فوج کی نوکری کے لئے
تمہاری جگہ لے سکتا ہے۔

حافظ ابراہیم / سید وقار احمد رضوی

شمشیر اور توپ کی دولت

اے دولت شمشیرہائے آبدار! اور اے لمبے باریک سنانوں (نیزوں) کی صولت!
تم نے قرون ماضی میں ممالک کو کس قدر مضبوط و مستحکم کیا۔ ایسے ممالک جن کا ملنا دشوار تھا۔
وہ ممالک سفید شمشیر براں کی دھار اور لچکدار گندم گوں بھالوں سے درست یعنی مضبوط ہوئے۔
وہ دولت شمشیر و سنان (اب) شوکت پاستان بن کے رہ گئی ہے اور اس کی جگہ دولت بزرگ (مدفع) نے لے لی ہے۔
یعنی پر عظمت توپ کی حکومت جس کی طاقت آگ اور دھماکوں سے عبارت ہے۔
وہ دولت مدفع، بہادروں کے دلوں کو خوفزدہ کرتی ہے اور پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے۔
وہ توپ شیروں کو ان کے بیشوں میں ڈراتی ہے اور وہ عمروں اور امیدوں کی قاطع ہے۔
وہ جنگ میں میلوں کے (فاصلے) سے جانیں لے لیتی ہے۔ کوہ آتش فشاں کی طرح۔
پس وہ پے بہ پے خوف در خوف (مصائب) لاتی ہے اور پے بہ پے آگ برساتی ہے۔
پس وہ کھوپڑیوں کو پھاڑتی ہے اور (کچھ) پرواہ نہیں کرتی۔
وہ توپ، مارنے والے ستارے (شہاب ثاقب) کی طرح ہے جو اوپر سے گرتا ہے اور اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے جس طرح فکر دل و دماغ میں سرایت کر جاتی ہے۔
وہ (شہاب) اس سرکش حیلہ گر شیطان (معاند) پر گرتا ہے جو تاریکی میں باتوں کو چراتا ہے۔
نوٹ: یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ جب شیاطین عالم بالا کی طرف۔ اسرار الٰہی سننے کے لیے جاتے ہیں۔ تو ان کی سرکوبی کے لیے شہاب ثاقب پھینکا جاتا

ہے تاکہ وہ آسمانوں سے پلٹ کر آجائیں۔

وہ شیطان عالم بالا سے باتوں کو چرانے والا ہے۔

وہ مارنے والا ستارہ (شہاب ثاقب) ہبوط و ضرر رسانی میں اس مدفع (توپ) سے زیادہ نہیں بوقت قتال۔

جب توپ کے قہرناک دہن سے وبال کا گولہ نکلتا ہے۔

تو وہ میدان جنگ میں برق و رعد و مرگ اموات سے ڈرتا ہے۔

وہ توپ اس سیف قتالہ کی مثل نہیں جو سروں اور جوڑوں میں شگاف ڈالتی ہے۔

وہ شمشیر قول میں خاموش اور کام کرنے میں بولنے والی ہے۔ میں اس کو، مثال میں مثل قوم پاتا ہوں۔

کہ وہ قوم، قول سے کام کی طرف رخ کرنے والی ہے۔ پس مالک ہو گئی وہ بڑے بڑے مراتب کی۔

آزادی

آزادی کا دن جتنا دور ہو پس وہ تم سے قریب ہے۔ وہ یوم آزادی جس کے لیے پسلیوں میں دل دھڑکتا ہے۔

پس جبکہ وہ یوم آزادی بعید ہوتا ہے تو دوست بھی بغض رکھنے والا ہو جاتا ہے اور جب وہ قریب ہوتا ہے تو دشمن بھی دوست بن جاتا ہے۔

مشرقین (غالباً" اس سے مراد مشرق اقصیٰ اور مشرق وسطیٰ ہے یا مشرق و مغرب) میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ (انہی مشرقین میں) کسی ایک کے ساتھ وہ آزادی واضح ہوتی ہے اور کسی ایک کے ساتھ غبار آلود ہے۔ (یعنی کوئی ملک آزاد ہے اور کوئی غلام)

جیسے آفتاب کہ وہ لوگوں کے درمیان پھیلا ہوا اور مشترک ہے۔ یعنی سب کو اس کی روشنی مساوی ملتی ہے اور وہ کبھی طلوع ہوتا ہے اور کبھی غروب۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج طلوع و غروب ہوتا ہے اسی طرح حریت بھی بین الناس گھومتی رہتی ہے۔

کس قدر قریب کی گئی ہے وہ قوم لئیم (انگریز) حریت سے اور کس قدر بعید ہوئے ہیں اہل مشرق اس حریت سے یہاں تک کہ برابر ہو گیا ہے اہل مشرق کا یوم حریت سے دور ہونا ان کے قریب ہونے سے یعنی مغرب اس سے قریب ہے اور اہل مشرق اس سے دور ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قوم لئیم (انگریز) یوم حریت کو کس قدر قریب و دور کرتی ہے یہاں تک کہ برابر ہو جاتا ہے قریب کرنا اور دور کرنا یعنی کبھی وہ آزادی دینے کا وعدہ کرتی ہے اور پھر مکر جاتی ہے ٹال دیتی ہے۔

وہ لوگ (انگریز) سچ نہیں بولتے (یعنی آزادی دینے میں سچا وعدہ نہیں کرتے) کیونکہ وہ حریص کیا سچ بول سکتا ہے جو نفاق کے بلانے والے، جھوٹ بولنے والے کی طرف کان لگاتا ہے۔

ہر عاشق کا عشق یکساں نہیں ہوتا۔ عشاق کے عشق کی مختلف قسمیں ہیں۔

کمال قال المتبنی

ضروب القوم عشاة ضروبہا

مجھ سے یہ بات بعید ہے کہ سوائے حریت کے کوئی چیز مجھے (اپنی طرف) مائل کرے۔ وہ حریت کہ جس کی طرف بوڑھے اور جوان سب جھکتے ہیں۔

تیرے لیے یہ بات کافی ہے کہ جمال حریت، یوسف کی طرح ہے اور محبت کرنے والے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ یعقوب کی طرح (یوسف یعنی حریت) سے محبت کرنے والا ہو۔

اے دونوں گروہوں (مصر و عراق) کی آرزو (حریت) تو ایسی فضیلت ہے، قبائل اور اقوام جس کے مشتاق ہیں۔

اے ملکوں کی آزادی! تو ایسی محبوبہ ہے کہ اس کی محبت میں عذاب پانا بھی شیریں ہے۔

محبت کرنے والے کے قلب میں، اس کی فکریں، بوجھل ہوئی ہیں۔ اے (محبوبہ حریت!) بس تیرا ناز ہی کافی ہے۔ یعنی زیادہ ادلال و تدلل نہ دکھا۔

ہر روز تیرے بارے میں جلسہ ہوتا ہے اور اس جلسے میں شاعر و خطیب اسٹیج پر چڑھتے ہیں۔

ہر روز محفلوں میں تیری خاطر تاریخ حریت بیان کی جاتی ہے اور تیری روشنی کا تذکرہ قائمقام ہوتا ہے۔

کس قدر عمدہ ہے یوم آزادی اور اس کا وصال؟ اور اس کا کمایا ہوا اجر (یعنی فوائد و نوافع حریت) آزادی کا دن وہ دن ہے کہ ہمارا استقلال (خود مختاری) اس کے ساتھ لوٹے گا اور ہمارے غصب کیے ہوئے حقوق ہمیں ملیں گے۔

ہم کہاں تک اس غلامی کی ذلت کو خوشی سے برداشت کریں حالانکہ ممالک اطراف میں ہمارے لیے کودنا پھاندنا ہے۔ یعنی ہم دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی غلام ہیں۔

نوٹ: اس شعر میں حتام مرکب ہے حتی = ما سے لفظ ما کا الف حرف جار کے داخل ہونے کی وجہ سے

اکثر گر جاتا ہے۔

ہم حیات حریت کی امید کرتے ہیں اور کوئی جاننے والا اس بات سے ناواقف نہیں کہ زندگی مصائب اور نزول امور عظیمہ کا نام ہے۔ مطلب حریت کے لیے مصائب برداشت کرنا ہوتے ہیں۔

اے اللہ! ہمیں حریت کی عزت سے ہمکنار کردے (دعائیہ کلمہ ہے) جس قوم پر زندگی تنگ ہو جائے اس کو موت دے دے۔ یعنی جو قوم غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہو اس کا مرجانا بہتر ہے۔

خوشا وہ دن ہمارا (یوم حریت) جب فرد اس کے لیے نغمہ خوان ہو گا۔ اور لوگ خوش و خرم ہوں گے (آزادی کی خوشیاں منائیں گے)

اے مسافر

اے مسافر!

تیری راہیں ناہموار ہیں

تیری مسافتیں طویل ہیں

تیری منزل کوئی نہیں

پڑاؤ بھی نہیں

اے مسافر

اے مسافر!

میری آنکھوں کے بھیگتے کنارے نہ دیکھ

کوئی ریت کا ریزہ پڑ گیا ہو گا

یاد کی کوئی کرچی خراش کر گئی ہو گی

بے خیالی میں چبھ گئی ہو گی

یہ نظارے نہ دیکھ

اے مسافر!

اے مسافر!

تاروں کی چھاؤں میں نکل جا

رات ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہے
اندھیروں کے پاگل کتے سو رہے ہیں
جلاد کوڑے رکھ کر پڑ گئے ہیں
جسم خستہ ہیں اور ہاتھ شل
زندانیوں کی پیٹھوں پر لہو جم گیا ہے
درد تھم گیا ہے
اے مسافر

حقیقت سے فرار

میں بستر پر ننگی لیٹی ہوں
آئینہ میرے مقابل ہے
دکھ سے میرا بدن ہے پھوڑا
میری جلد ہوئی ہے پیلی
جیسے ایک صدی کے کرب نے اک لمحے کی شکل ہے لے لی
بربادی اس کی قسمت ہے
یوں لگتا ہے جیسے میں نے
سچ کو ٹالتے رہنا سیکھ لیا ہے

اے محبوب مرے
میں نے حاملہ چاندنی رات کی اس خاموشی میں
جو محتاج کلام نہیں
اک وقتی سچ کا سہارا لے کر
تم سے جھوٹ اک بولا تھا
اور اب آئینہ جیسے مجھے کھا جانے کو دوڑ رہا ہے
میری آنکھیں جیسے مجھ سے خفا ہیں
لے چلو مجھ کو لیکچراروں اور سفیروں اور وکیلوں کی محفل میں

یہ سب ایک ہی مٹی کے ہیں بنے

اپنے بیوی بچوں اپنے دوست احباب سے ہر دم

جھوٹے وعدے کرنا ان کی عادت ہے

اب میں شعر نہیں کہہ سکتی

اس سے بہتر ہے گلیوں اور بازاروں میں گشت لگانا

یا ان میں بسنے والوں کے سینوں پر لوٹ لگانا

ان لوگوں کے آگے سارے جھوٹ اور سارے وعدے

جھوٹ اور وعدے ہی رہتے ہیں

سب کچھ تمہارا ہے ماں

ماضی تمہاری سیاہ آنکھوں میں مدفون ہے
جس نے طغیانیوں کو، وقت کی سختیوں کو رام کیا
میں جانتا ہوں
تم نے ہمیشہ مایوسی اور رنج کو سکون دینے کی کوشش کی
تمہاری مہربان مسکراہٹ میں
حال خمیدہ ہے
ایسے میں کہ تمہیں بے آرام رات، غیر یقینی شام کا سامنا ہے
میں جانتا ہوں
تم ایک میدان ہو صبر و استقلال سے معمور
ایک اونچا جنگل اشجار سے گھنا

مستقبل تمہارے بھڑکتے ہوئے سینے میں چمکتا ہے
جو مقدر کے مطالبات اور شے کو پگھلا دیتا ہے
میں جانتا ہوں
تم امید کی تھوں کو اپنی انگلیوں سے
یونہی پھسلنے نہیں دو گی

ایقان

ہو سکتا ہے،
تم سب سے اچھے مرد نہ ہو،
لیکن میری طرح کی عورت کے لئے
شاید تم سے زیادہ بہتر مرد
کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا!

ہو سکتا ہے
مجھے سب کچھ نہ مل سکے
لیکن میں جیسی بھی ہوں
میں تم سے
اس سے زیادہ کچھ اور طلب بھی تو نہیں کرتی

مجھ سے مت پوچھو
کہ کیا میں واقعی مسرور ہوں
میں بھی تم سے،
تمہارے جذبات کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی
کیونکہ جب بھی کوئی،
کسی شے کے بارے میں،
بہت زیادہ تحقیق کے ساتھ جاننا چاہتا ہے،
تو وہ اور بھی شک و شبہ میں گرفتار ہو جاتا ہے

جب کوئی بہت زیادہ گفتگو اور تجزیہ کرتا ہے
تو اسے اور بھی کم علم ہوتا ہے!

میں نے جو کچھ کہا:
شاید اس پر،
میرا یقین کم ہو
لیکن ایک بات یقینی ہے
کہ ہمیں اتنا زیادہ پر یقین ہونے کی ضرورت نہیں!

خود کلامی

میرا دل بھر آتا ہے
اس آنسو کے لئے
جو ریت پر گرا
اور بارش میں معدوم ہو گیا
جو دکھ میں محسوس کرتا ہوں
ایک باپ کا دکھ ہے
جس کے بیٹوں نے بغاوت کی
منہ پھیر لیا
اور پھر غصے کے شعلوں میں اپنے آپ کو
برباد کر لیا
زوال جاری ہے
منشیات کے تاجروں کے طفیل
جو نوجوانوں کے معصوم چہروں پر
اپنے شیطانی سائے ڈالتے ہیں
زوال ایک مکمل نسل کو
فنا کر سکتا ہے

وقت

ہزار کڑواہٹیں وقت میں گھلی ہیں
فضاؤں میں بوئے خوں بسی ہے
خموش سینوں میں دفن ہیں آہیں اور کراہیں
کرو اگر گفتگو تو اتنا خیال رکھنا
کہ قید خانے میں جتنے دیوار و در ہیں ان سے
کئی نگاہیں تمہاری نگرانی کر رہی ہیں

سخنورو! لفظ اور معنی کے بادشاہو
تم اپنے زور قلم سے چاہو تو پردہ کرب چاک کر دو
مگر تمہیں وقت نے سکھادی ہے مصلحت بھی
وہ مصلحت جس سے تم نے سیکھی منافقت ہے

صحافیو تم بھی تو قلم کے بڑے دھنی ہو
جو چاہو ہر جھوٹ ہر حماقت کو طشت از بام کر کے رکھ دو
مگر یہ کیا ہے
یہ کیوں تمہیں چپ سی لگ گئی ہے
زمانے سے جیسے تم سمجھوتہ کر لیا ہے

تمہارے نزدیک سب ہے اچھا
یہ ساری دنیا کو کیا ہوا ہے
ہر ایک شے آہنی شکنجے میں پھنس کے خود بھی ہے اک شکنجہ
ہر ایک شے بو رہے کہ ہے جھوٹ کا پلندہ

زمانے کے اختتام پر

سو موسموں کے بعد
ہم زمانے کے اختتام پر
منتظر ہیں
کبھی کبھی
ہمیں روشنی کی قاشیں
زمین کو چیرتی، بوجھل سانس لیتی
زوال کے لبوں پر گرم خون ٹپکاتی
دکھائی پڑتی ہیں

یہاں ہم زندگی کے گھیرے میں
الم کی مسلسل حرارت سے جھلس رہے ہیں

اے۔ صمد۔ سعید / محمد خالد

اجنبی

ایک مرتبہ، غروب آفتاب کے وقت، تم آئے
ایک چیتھڑا جیکٹ اور ایک لمبی مالا پہنے ہوئے
تمہارا سارا چہرہ
بادلوں میں چھپا ہوا تھا
سوائے تمہاری آنکھوں کے
پرانے جوتے، ہتھیار کی طرح تانے ہوئے، تم نے کہا
"مجھے میری آزادی دے دو"

تب خاموشی کے ساتھ، تم چلے گئے اور میں....
کانپتے ہوئے، کچھ بھی نہ کر سکا، سوائے
تمہاری ماں کا لرزتا ہوا ہاتھ پکڑنے کے
اور میں نے پوچھا
"ہم سے کیا خطا ہوئی ہے"

ہمارے دلوں میں
سورج دوبارہ طلوع نہیں ہوا
چاند ہمارے چہروں پر دوبارہ نہیں چمکا
ایک دفعہ پھر میں نے تمہاری ماں کا ہاتھ پکڑا
اب کے وہ زیادہ عمر رسیدہ تھی،
دہشت زدہ، دھتکاری ہوئی، غفلت گزیدہ

اچانک آ گئے
تمہاری ڈائری اٹھائے ہوئے' تمہارے پوتے نواسے
میں غم زدہ اور ملول تھا' کیونکہ میں اسے پڑھ نہیں سکتا تھا
تمہاری ماں کا کمزور ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے
میں نے پوچھا "کیا.....
ہم سے کیا خطا ہوئی ہے؟"

ٹی۔ الیاس۔ طیب / محمد خالد

اکارڈین بجانے والا نابینا

وہ اپنے اکارڈین سے
ناریل کا دودھ نکالتا ہے
اس کی انگلیوں سے ایک سیال دنیا بہتی ہے
اس کی موسیقی میں زندگی کا آہنگ تھرتھراتا ہے
گہرے بادل اس کی دنیا کے آر پار جہاز رانی کرتے ہیں

اس کی آنکھیں بند ہیں مگر اس کی موسیقی کھلی ہے
اس کی آواز تلخ ہے مگر اس کی دنیا شیریں اور رس بھری ہے
میری آنکھیں کھلی ہیں مگر میرا گیت اندھا ہے
میری آواز شیریں ہے مگر میری دنیا تلخ ہے

اپنے اکارڈین کے ساتھ، جو اس کے جسم پر جھولتا ہے،
وہ اپنے جیون کی اداس کتھا گاتا ہے
ایک قصبے سے دوسرے تک
اپنی لمبی مشاق انگلیوں کے ساتھ
وہ ایک گرسنہ گیت کی دھن بجاتا ہے
شکم سیر گلیوں کے کنارے کنارے
جو اسے نظر انداز کر دیتی ہیں

وہ اپنے اکارڈین سے

ناریل کا دودھ نکالتا ہے
اس کی انگلیوں سے ایک سیال دنیا بہتی ہے
ایک سنگین سورج اس کے دل میں بلند ہوتا ہے
ایک اجلی بھور اس کی آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرتی ہے

محمد حاجی صالح / محمد خالد

میری دنیا کا یہ حصہ

میری دنیا کے اس حصے کو
ضرورت ہے 'ملائمت کی'
ولولے اور مقصد کی سطح پر

میری دنیا کے اس حصے نے
اپنا چہرہ پلاسٹک میں لپیٹ رکھا ہے
اور یہ مارچ کرتا ہے
مشینوں کی تال پر

وقت تو مل جل کر گذران کرنے کے لئے ہے
معانی کی تخلیق کے لئے
جس میں 'میں شمولیت اختیار کرتا ہوں'
بھروسے کے ساتھ
یہ وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جو میرے دنوں کے وجود کو
بندھا ہوا رکھتی ہے

شہر حقیقت کے گرد گرد پتلی پتلی دیواریں چن دیتا ہے'
تیزاب کی نہروں کے پہلو میں
ہم 'تمدن کی بنیاد' رسد' طلب اور
پرانی' قلعی کی کانوں پر تو نہیں رکھ سکتے

میں نغمہ سرائی کرنا چاہتا ہوں
زندگی کے بارے میں
فطرت کے اپنے نغموں کے ذریعے
دن بھر چلانا چاہتا ہوں
پہاڑوں میں اور میدانوں میں
اونچے اونچے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کے گیت سننا چاہتا ہوں
دریا میں تیرنا چاہتا ہوں
ایسی زبان بولنا چاہتا ہوں جو ناپاک اور غلیظ نہ ہو
محبت میں مبتلا ہونا چاہتا ہوں
بنی نوع انسان کے ساتھ
قابل قبول بننا چاہتا ہوں'
ایک آدمی کی طرح'
مضبوط' ہمدرد' سمجھ بوجھ والا

میں چاہتا ہوں کہ وادی کی ہوائیں
میری کھڑکیوں کے چاروں طرف اپنے ساز بجائیں
میرا گھر' سخت لکڑی کا بنا ہوا ہو
اور اس میں بچھا ہوا بوریا' جنگلی پتیوں کی طرح نرم ہو
میں چاہتا ہوں' زرخیز زمین
سیاہ پڑی ہوئی'
زندگی بخش' غذاؤں سے

میری دنیا کے اس حصے کو
ضرورت ہے' ملائمت کی
ولولے اور مقصد کی سطح پر

شہر کے سرے پر ایک بوڑھے برگد کی موت پر لکھا گیا نوحہ

ایک بوڑھا برگد، سڑک کے کنارے کھڑا تھا
ایک نو تعمیر شدہ دارالحکومت میں
وہ کئی سو سال تک پلا بڑھا
دھوپ کے خلاف زمین کی ڈھال بنا رہا
پرندے اس کے گرد اڑتے تھے،
گاتے ہوئے
یہ ان کا گھر تھا وہ یہاں پر خوش تھے
تتلیاں بڑی شادمانی سے ایک دوسری کا پیچھا کرتی تھیں
اس کے تنے کی پناہ گاہ میں بچے کھیلتے تھے

اچانک وہ بھیانک دن آگیا
ٹیکنالوجی کے جنات، درخت پر حملہ آور ہو گئے
بڑی بے رحمی کے ساتھ
اس کے جسم میں اپنے دانت گاڑتے ہوئے
یہاں تک کہ ہم نے ایک مہیب چنگھاڑ سنی
برگد کے ٹوٹ کر زمین پر گرنے کی آواز

اب بھی
غروب ہوتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنوں میں
تم سن سکتے ہو

برگد کی پکار

الوداع!
الوداع اے درختو' الوداع
الوداع' اے سورج' الوداع
الوداع' پیاری تتلیوں
الوداع' گاتے ہوئے پرندو
الوداع' خوش و خرم بچو

میں ایک پامال برگد ہوں
جسے قتل کر دیا
ان منصوبوں نے
جنہیں ترقی کا نام دیا جاتا ہے

نعمار جمیل / محمد خالد

وقت ایک تحفہ ہے

اب، برسوں کے بعد
میں نے بالآخر سمجھ لیا ہے
وقت کا مفہوم

ابن عربی کا قول ہے
"وقت خدا کا تحفہ ہے
اور یہ اسی کو لوٹانا چاہیے"

ہمیں ملتے ہیں
مواقع، کار خیر (کی توفیق)
ہمیں عجز و انکسار اور فروتنی سکھانے کے لئے
اور دل کی صفا
دنیا خوب صورت ہے اور زندگی کی مہلت قلیل

اب، برسوں کے بعد
میں نے بالآخر سمجھ لیا ہے
وقت کا مفہوم

رازِ محبت

خاموش بہتی ندیا

چراگاہ کے کنارے کنارے

بھیڑیں چراتی لڑکی سرما

انتہائی خوش و خرم، گھاس کی باس مسحور کن

دور گھاس کی سبز لہروں سے ابھرتا ہوا

اک اسپ سوار چرواہا

اپنے گھوڑے کو پانی پلانے کی خاطر نہیں،

نہ ہی دھول سے اٹے چہرے کو دھونے کے لئے

وہ اک سنہرا پھول توڑتا ہے

اور خوبصورت لڑکی سرما کو پیش کرتا ہے

لیکن سرما جواب دیتی ہے

ایک سرسبز چیڑ کا بلندیوں پر اگنے والا درخت

زیادہ خوبصورت ہے اس پھول سے جو کسی ندی کے کنارے سے توڑا جائے

سرما مسکرا کر پھول واپس لوٹا دیتی ہے......!

○

منتخب گائے کا دودھ چھلک رہا ہے

اور سرما کے چہرے پر پسینے کے قطرے بہہ رہے ہیں

شام

وہ کیا ہے جو سنبھالے رکھتا ہے
شام کے نیم وا نور
اور باغوں میں آزاد کردہ روشنی کو؟

تمام شاخیں
پرندوں کے بوجھ سے مغلوب'
اندھیرے کی سمت جھکتی ہیں

محوِ ذات زرد لمحے
ابھی تک تاباں ہیں
حصاروں پر

رات کا استقبال کرتے ہوئے
پیڑوں کے جھنڈ
سکوت کے فوارے بن جاتے ہیں

ایک پنچھی گرتا ہے
گھاس بھورا ہے
دھندلے کنارے' لاسا سیاہ ہے
دنیا ذرا کم ہی قابلِ اعتبار ہے!

مراجعت

تم مری آنکھوں کے تلے استراحت کرتی ہو'
تودہَ ریت کی سرزمین ---- گیروِی' چمک دار
ہوا پانی کی تلاش میں رکی'
دل کی دھڑکنوں اور فواروں کی ایک دھرتی
اس رات کی طرح وسیع
جو تم نے مرے ہاتھ کے خلا میں سجا دی تھی
بعد ازاں ایک بے حرکت افتاد
ہمارے وجودوں کے اندر اور باہر بھی
میں نے اندھیرے کو اپنی آنکھوں سے ہڑپ کرلیا'
وقت کا پانی پیا' اور رات کو نوش کرلیا
تب میں نے ایک دلھن کے بدن کو ہاتھ لگایا
اور اپنی انگلیوں کے سروں سے سماعت کی

سیاہی مائل کشتیاں' ساتھ ساتھ
----- سایوں میں لنگر انداز
ہم نے جسم پھیلا کر استراحت کی
ہماری روحیں جکڑ بندی سے آزاد
رات کے پانیوں میں
تیرتے ہوئے چراغ

انجام کار تم نے آنکھیں وا کیں
تم نے اپنے آپ کو میری نظر سے دیکھا
ایک پھل کی طرح گھاس پر
اور ایک پتھر کی طرح تالاب میں گرتے ہوئے
تمہارے اندر تمہاری اپنی افتاد

مرے اندر ہی اندر ایک لہر اٹھی
تم نے کہا ایک یوکلپٹس کی طرح لوٹ جاؤ
ہوا نے میرے بیل بوٹے ہلا دیئے
میں خاموش تھا اور ہوا بولتی تھی
لفظوں کی اک سرگوشی۔ اوہ: یہ پتے
سبزے کی چرچراہٹیں، پانی کی زبانیں
یوکلپٹس کی نیو پر قدم بڑھاتے ہوئے
تم ہنسی کا ایک فوارہ تھے
مخفی شاخوں کی جنبشیں
یہ تم ہی تھے، بادِ صبا جو لوٹ کر آ گئی

گھر ☆

(پہلا رینگو)

ہر کوئی مسافر ہے
اور ہر مسافر اپنا گھر بناتا ہے
زادِ سفر اور گردِ راہ کے آمیزے سے
ہر جگہ کو، وقت پر استعمال کرتے
اور
وقت کو اس کے حصے کی جگہ دیتے ہوئے!
ہر سفر کرنے والا
ایک گھر بناتا ہے۔ اپنا گھر
اور سفر ختم ہو جاتا ہے!
پھر بھی
ہم ان گھروں میں پیدا ہونے پر مجبور ہوتے ہیں
جنہیں ہم نے نہیں بنایا ہوتا
سفر پھر شروع ہو جاتا ہے
دھیان
ہمارے اور ہم سے پہلے
پرانے، بھولے بسرے گھروں کی بازیافت کرتا ہے
جیسے سورج
فضائے بسیط میں

اپنی ہی مدفون شبیہوں
میں چکراتا پھرے
گھر
ہر گھر
ایک آہنگ ـــــ بالکل جداگانہ
اپنی طرز کا ایک ہی آہنگ ہوتا ہے
وقت کی منحوس دستک
نامسعود قدموں کی آواز
اس آہنگ کو۔۔
اس خواب کو شکست کرتی ہے!

گھر
جو سورج کی طرح ابھرتا ہے
ہر شے کو نمایاں'
روشن اور واضح ـــــ اس شے کا روپ دیتے ہوئے
اور پھر
ڈوب جاتا ہے
ختم ہو جاتا ہے
جیسے کوئی جگہ
اپنی جگہ پر بیٹھے بٹھائے
بس یونہی
نظر آنا بند ہو جائے
وقت میں تبدیل ہو جائے!

گھر: جاپانی صنف شعر "رینگا" کی ہیئت میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ لکھی گئی یہ نظم چار رینگو پر مشتمل ہے۔ رینگو کے چار سٹانزا ہیں اور یہ اس طرح کی دو نظمیں "گھر" اور "وقت" کے عنوان سے اوکتا ویو پاز اور چارلس ٹاملنسن نے مل کر لکھی ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ پہلے چارلس نے "گھر" یعنی پہلی نظم کا پہلا سٹانزا لکھا اور پاز کو بھجوا دیا' پھر پاز نے دوسرا سٹانزا لکھ کر ہوائی ڈاک کے ذریعے چارلس کو روانہ کر دیا۔ اس طرح وہ منفرد شعری تجربہ ظہور میں آیا' جسے دونوں نے "Airborne" کے نام سے چھپوانا پسند

کیا۔ پاز نے اپنے حصے کے ستانزے ہسپانوی زبان میں اور چارلس نے انگریزی زبان میں لکھے۔۔۔۔ بعد میں دونوں نے ایک دوسرے کے لکھے ہوئے ستانزے ترجمہ کئے اور یوں کتاب مکمل ہوئی۔

جہاں تک کتاب کی نظموں کے عنوانات کا تعلق ہے' تو اس سلسلے میں چارلس ٹاملنسن نے بڑی بصیرت افروز بات کی ہے۔

"I think time was at the back of all our minds, and that "day" (time passing) thus came into a natural relationship with "house" (time measured by place)."

سو' دراصل "گھر" اور "دن" ایک وسیع تخلیقی منظر نامے کا حصہ ہیں۔ نظموں میں' بنیادی دھارا ایک ہونے کے باوجود یکسانیت نہیں ملتی۔ زبان کا استعمال محض مشاقی سے نہیں' بڑی خلاقی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس میں ذاتی تصورات اور واردات سے لے کر جدید ترین فلسفیانہ رجحانات تک کا رنگ ملتا ہے۔ یہ نظمیں بلکہ یہ نظم اپنے اندر کسی ناول کا سا پھیلاؤ رکھتی ہے' کسی افسانے کی طرح مختصر ہوتے ہوئے بھی!

راستے کہاں جاتے ہیں

جاتے ہیں راستے کدھر
سینۂ رہ گزار پر
کوئی ٹریم بھی نہیں
گرد ہے اور تململاں
چاروں طرف جلی بجھی
یہ تو شکار جبر ہیں
ان کا مقام ہے یہی
مذبح کے آس پاس یا
بکتا ہے جس جگہ دہی
سرد و اداس و جاں بلب
باڑ کو نوچتے ہیں یہ
شام سے تاقیام شب
تبت یدا ابی لہب
عالم ناسپاس میں
خوف و غم و ہراس میں
کتنے ہی راستے ہیں جو
مرتے ہیں اپنی پیاس میں
ایک جہان سنگ و خشت
مذبح سے لیمپ پوسٹ تک
ساتھ میں کیفے ٹیریا

کرسی و میز و راہ وکشت
خوارو زبوں خراب وزشت
جب سے بنے ہیں۔ ہاتھ میں
تب ہی سے کنکریٹ ہے
درد ہے ان کی روح میں
خاک ہیں رنگ گرد سے
بارو جود سرد سے
ہار چکے ہیں راستے!
ہار چکے ہیں راستے!

وقت

کیا بھلا آئین سٹائن نے کہا
وقت گاہے صبح گاہے شام ہے
کھینچ کر جیسا بھی کر لو
جب لڑکپن میں کبھی
ہفتہ دو ہفتہ کی چھٹی
یوں لگا کرتی تھی جیسے
سلسلہ ہائے ابد ہیں سامنے
اب نہ جانے کیا ہوا ہے
وقت جیسے دھوپ میں اڑتا ہوا
اک دھند کا بادل ہے بس
اب خزاں آتی ہے جب تو میں
اڈتی برف کے ڈر سے
لون موور اور مہکتی بیل کے گملے اٹھا کر
گھر کے اندر بھی نہیں رکھتا
بہار آنے میں ایسی کون سی صدیاں پڑی ہیں

نظم

دل نے اس دھار پہ کتنا چاہا
میں نے دریا سے لپٹنا چاہا
جب مرے ہاتھ سے وہ بہہ نکلا
میں نے یکبار لپک کر اس پر
سر مہتاب جھپٹنا چاہا
سر مہتاب ہے وہ طاس جہاں
دل بچھڑتے ہیں جدا ہوتے ہیں
میں نے پتھر کو پکڑنا چاہا
اور وہ ڈوب گیا دریا میں
میرے ہاتھوں میں بھنور بھر آیا
چاند نے آ کے مجھے چھڑوایا
میں نے ہر جلوۂ رم خوردہ کو
اپنے ہاتھوں میں جکڑنا چاہا
تم نے پھیلائے تھے بازو اپنے
جیسے اک صبح شناسائے طرب
ایک خاموش حریری پل میں
ایسے ساحل سے جہاں خواب ابھی
واقعہ ہونے نہیں پائے ہیں

اڑن مچھلی

اڑن مچھلی اڑی
روشنی کے ایک لمحے کی طرح
نور کو جس طرح پر لگ جائیں
کھیل اک ایسا
سمندر
پیشتر اس کے کہ تیرے واسطے
شارک کے جبڑوں کو اپنا نظم سکھلائے

کوہ کن

اے پہاڑ گرج اور غوغا سے
میرے ہتھوڑے کی ضربوں کے سامنے ٹوٹ جا
میں نے تیری اتھاہ تک راستہ بنانا ہے
حتیٰ کہ مجھے کچی دھاتوں کی آواز آنے لگے

پہاڑ کی ویران رات کی گہرائیوں سے
مجھے بیش بہا خزینے اشارے کرتے ہیں
ہیرے اور جواہرات
سونے کی سرخ شاخوں کے بیچ سے

اور گہرائیوں میں امن ہے
ابدی امن اور سکون
میرے ہتھوڑے۔ میرے لئے راستہ بنا
پوشیدہ چیزوں کے جگر تک

ایک بار لڑکپن کی سرخوشی میں۔ میں بیٹھا تھا
تاروں بھرے آسمان کے نیچے
ہوائے بہار میرے پاؤں میں تھی
بچپن کا سکون میری ملکیت تھا

پگھلتا برتن

ہے اندھیرا قبر جیسا اب یہاں
دائرہ در دائرہ اب رقص کرنا ہے مجھے
اور بکھرنا ہے مجھے
کچھ نہیں حیرت مجھے
ہے آسماں بے کیف گر
اور بھلائے جانے پر ان لوگوں کو
ادراک بھی جو نہ رکھیں
کیا کھیل کھیلے گا مقدر ان کے ساتھ
اور میں لرز جاتا ہوں اس کاسۂ دنیا پر
دیکھ کر کہ آسماں بے کیف ہے کتنا
یہ سب انسان ان جیسے نہیں ہیں کیا
یہ انسانوں کی ناقدری کہ جیسے کوئی مجھکو گالی دیتا ہے
Udara سے پھسل کر گرتا ہے جب کوئی اندھا
اس طرح کے دوسرے اندھے
کاش میں نے جو بھی دیکھا نصف بھی وہ دیکھتے اس کا
کاش میں نے جو سنا ہے نصف بھی وہ سنتے اس کا
اس صدی کا ایک اندھا آدمی

ہاتھ کی پرانی کھڈی

(ایک اور بچے کی موت پر)

اس کی ماں کے کپڑے
(اس کا دل نہیں!)
درد سے پھٹے پڑے ہیں
اس کے اڑتے چیتھڑے
موت کے جشن میں ہیں مصروف
کچھ چیتھڑے، خوشی کو دفنانے کے واسطے
کچھ چیتھڑے، ہنسی کے آنسو پونچھنے کو

بیوروکریٹ

بیوروکریٹ اکتاہٹ کے کھوکھلے سمندر میں تیرتے ہیں
حماقتوں کی وحشت میں یہ کولمبیا کے سب سے بڑے قاتل ہوتے
ہیں
ان کا حشر جگر کی خرابی ہوتا ہے
اور ٹیلی فون سے چمٹے ہوئے یہ ختم ہو جاتے ہیں
ان کی زرد آنکھیں گھڑی کی جانب گھورتی رہ جاتی ہیں
ان کی لکھائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے
یہ اپنے لئے نکٹائیاں خریدتے رہتے ہیں
جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی بیٹیاں
داد رسی کرتی ہیں تو انہیں فالج کے دورے پڑنے لگتے ہیں
ان پر درزیوں کے پیسے چڑھے رہتے ہیں
یہ ریڈرز ڈائجسٹ اور نرودا کی پیاری --- نظمیں پڑھتے ہیں
اطالوی اوپیرا دیکھنے چلے جاتے ہیں اور
اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بناتے ہیں
یہ کمیونسٹ دشمن بیانوں پر دستخط کرتے ہیں
اور بزدلی سے خودکشی کر لیتے ہیں
ان کا کھیلوں میں ایماں ہوتا ہے
لیکن انہیں شرم آتی ہے
کہ ان کا باپ پیشے کے اعتبار سے ترکھان تھا

چندرما

بھری جوانی کے جوبن میں
چندرما کی مانگ سے سب سندور مٹا ہے
سورج دور گگن کے پیچھے ڈوب گیا ہے
شام کی نرماہٹ میں
اپنی نرمل پوریں پھیر رہا ہے
چندا کے سندر سے بدن کے داغ اور چھالے
جوبن کی لاٹوں سے پگھل گئے ہیں
گھور اندھیرے میں جو پلے ہوئے تھے
تارے ٹم ٹم دیکھ رہے ہیں
دھرتی سے سب پاپی آنکھیں گھور رہی ہیں
چندرما بے بس ہے گہری سوچ میں گم ہے
اپنے جیون کی بدھی دھارا میں بند ہے
کتنی تھکن ہے
اس کے بال سفید کپاس کا روپ لئے ہیں
اس کا جیون میلی سی چادر ہے
یا بہتے نیروں میں دھلی ہوئی ساڑھی ہے
جو دھرتی کے شریر کو ڈھانپ رہی ہے
چاروں اور میں کومل چاندنی پھیل گئی ہے

سرکاری افسر

اس کی آواز بن گئی ہے
اطلاعی گھنٹیوں کی تعمیل
اس کی انگلیاں سیدھی ہیں
قلم کے بے جان دستے کی طرح
اس کی زبان پھیلتی ہے سیاہی چوس کی طرح
سولی پر ٹنگے یسوع کی طرح
اس کا نام دفتر کی دیواروں پر
کیلوں سے ٹنگا ہوا ہے
اس طرح تھک ہار کر وہ ایک دن گھبرا گیا
اور اپنے بدن کی سرحدوں کے اندر
سنگھ دربار کی چھتوں کی طرح
بے یار و مددگار
ایک آہ کئے بغیر پھٹ گیا

خدا کا تحفہ

میں تمام پاک گیت لکھ چکا ہوں
جو میرے گناہ آلود بستر سے طلوع ہوتے ہیں
خدا مجھے گناہوں کی دولت سے نواز چکا ہے
اور خدا تنہا ہے اور مجھے گناہوں سے بچا چکا ہے

نظم

ہمارا تصور، پتہ ہے
سبک رفتاری سے بہتا ہوا
پہاڑ کے سائے اور ندی کی رخشندہ سطح
ایک نادر اور دلنشیں منظر بناتے ہیں
اور اسی خلا میں
سورج اور چاند آپس میں بدلتے رہیں گے
سفید پرندے آتے ہیں
مٹھی بھر شاعری طلب کرنے کے لئے
اڑان بھرتے ہوئے

وہار بیلا / احمد سلیم

دس قدم

راستہ بہت لمبا ہے اور بہت کٹھن
لیکن پہلے دس قدم میں اپنی ماں کے لئے چلوں گا
پھر دوسرے دس قدم اپنی محبوبہ کی خاطر
تیسرے دس قدم گھر کی دہلیز کے لئے
اور چوتھے دس قدم دوستوں کی خاطر
اور پانچویں دس قدم ان کتابوں کے لئے۔۔۔
جو ابھی میں نے پڑھی نہیں
اگلے دس قدم جھیلوں اور جھرنوں کے لئے
اور اگلے گرمی کی صبحوں کی خاطر
اور پھر اگلے سیبوں کے درختوں اور پھولوں کے لئے
پھر پیرس اور وینس کی خوبصورت گلیوں کے لئے
اور پھر مائیکل اینجلو کے فن پاروں کے لئے

اور دس قدم تاریخی روم کے کھنڈرات کی خاطر
اور مزید دس قدم
بیتھوون اور دی بوسی کے سنگیت سروں کے لئے
پھر مجھے دس قدم اور چلنا ہے

ان بچوں کے لئے، جو ابھی میری بیوی کی کوکھ میں سو رہے ہیں
اور پھر دس قدم ان کھلونوں کی خاطر
جن سے بچوں کو کھیلنا ہے
وہ بچے ...... جو خوف اور غلامی سے نہیں گزریں گے
اور پھر دس قدم اس صبح کی خاطر
جس نے دنیا کو امن دینا ہے
اور پھر دس قدم اس انصاف کے لئے
جس نے کبھی مزدوروں سے کہنا ہے کہ یہ دھرتی تمہاری ہے

اور پھر دس قدم
زہر کے اس پیالے کی خاطر
جو سقراط نے پیا تھا کبھی
اور پھر دس قدم اس اقرار کے لئے
جو سپارٹیکس نے کیا تھا کبھی

اور پھر دس قدم جیور دانو برونو کے لئے
جسے سب سے پہلے علم کی خاطر جلایا گیا
اور پھر دس قدم اس معصوم انسان کے لئے
جسے کہیں بھی اور کبھی بھی، پھانسی پر چڑھایا گیا
اور پھر دس قدم ان کے لئے
جو پھولوں کی طرح کھلے اور دنیا کو مہک دے گئے
اور پھر دس قدم ان کے لئے
جو ہر تعمیر کی خاطر سیڑھی کی طرح بچھ گئے
اور آخری دس قدم مجھے اپنے وجود کے لئے چلنا ہے

جو کسی دن

میری وادی کا کھاد بنے گا

اور وادی اور بھی سرسبز ہو جائے گی --- کل کے انسانوں کی خاطر....

مگر ہم رہیں گے

مگر ہم
شطرنج کی دیو قامت بساط کے وسیع و عریض مربعوں میں
باقی رہیں گے
ہم سب مجرم ہیں
ہماری کافی سے جلے ہوئے خطوط کی بو آتی ہے
اور ڈاکخانے
ناجائز طور پر کھولی گئی ڈاک کی بدبو سے بھرے ہوئے ہیں
فلک بوس عمارتیں بہری ہو گئی ہیں
اور اب
یہاں ایسا کوئی نہیں ہے
جو ڈپٹ کر کہے
"ایسا نہ کرو"
گھروں کے سامنے
مصالحہ لگے ہوئے چہروں نے آنکھیں بند کر لی ہیں
اور ہر رات چڑیاں شہر سے باہر پرواز کر جاتی ہیں
اور ہماری صبحیں
بلا سوچے سمجھے روشن ہیں

ٹھہرو! شاید یہ خواب ہے
مگر ہر صبح ۔۔۔ اخبار تو چھپ رہے ہیں

پوسٹ مارٹم

اس کے دل کے نہاں خانوں میں، پتہ یہ چلا کہ زردا ہٹ
زیتون کی طرح جڑ پکڑ چکی تھی

اور اپنے بے شمار رتجگوں کے درمیان
ایک بے کنار انتظار کی خموش آگ
اس کی انتڑیوں کو جکڑ لیتی رہی تھی

جلد سے تھوڑا نیچے نیلے رنگ کی ایک افقی لکیر
لہو میں نیلے خلیوں کی تعداد خاصی تھی

اپنے بے انداز اکیلے پن کے دوران
کونجوں کی جتنی کوکیں
اس کے پھیپھڑوں میں منجمد ہو گئیں تھیں
سب کی سب، ایکا ایکی بہہ نکلیں
اور نشتر کپکپانے لگا

اپنی ناشنیدہ مگر ناگزیر بدقسمتی کی اتنی بے ساختہ عکاسی کرنے پر
دیکھو تو' اس کی آنکھوں سے
کیسی فتح مندی ٹپک رہی ہے!"

پردۂ چشم پر ـــ کسی منظر میں اٹکی ہوئی فلم
کاسۂ سر میں ـــ فضا کی دم توڑتی ہوئی بازگشت

واحد حقیقی شے جو ملی
بائیں کان کے خلا میں تھوڑی سی ریت!
سمندروں کے کنارے
دھیمی محبت کے خاموش ہیجان اور تند ہوا کے پرشور طوفان کی مستقل رفاقت میں
آوارہ پھرتے رہنے کی نشانی

گردوں پر آتش زدگی کے سے اثرات ـــ
وصال کے لمحوں کی گریزپائی کی علامت

عجب نہیں
کہ اب کے برس
پھل، قبل ازوقت، پک کر تیار ہو جائیں!

آئینے میں

میرے سینے کے زخم پھر جلنے لگتے ہیں
جب ستارے اتر کر میرے جسم و جاں میں گھل جاتے ہیں
اور جب لوگوں کے قدموں تلے خاموشی کچلی جاتی ہے

وقت کے سمندر میں یہ ڈوبتے پتھر
مجھے کب تک اپنے ساتھ گھسیٹے چلیں گے
یہ پھیلا' بھرا سمندر
کون اسے خشک کر سکے گا'
میں ہر صبح اپنے ہاتھوں کو ذلت اور پراگندگی میں آلودہ دیکھتا ہوں
میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں
میں اذیتوں سے بنی ہوئی ایک چٹان ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ درختوں نے مرے ہوؤں کی سیاہ طمانیت کو جذب کر کے
مسکراہٹوں کو سجایا ہے
مگر یہ وہ مسکراہٹ ہے جو مجسموں کے چہروں پہ عیاں نہیں ہوتی ہے

نظم

کھڑا ہوا ہے وہ ساحل پر
بے لباس۔ عریاں
اور آسمان اسے جھک کر چومتا ہے
زمین بچھ رہی ہے قدموں میں
فلک پر ڈوبتے سورج نے
اس کے سفینے پر
لہو کے رنگ کی اک ڈور باندھ رکھی ہے
لٹک رہا ہے سرا جس کا
بائیں گھٹنے تک

○

کہاں ہو مری آتشیں جوانی، جواب دو
تو ایک مہمان کی طرح آئی اور رخصت ہو گئی
اس کے سارے سربستہ راز میرے اندر اتر گئے
صرف حسن کا اسرار بے اندازہ رہا
اس دنیا کی تمام تر بناوٹ کو سمجھتے ہوئے
اپنے رفیقوں پر اس قدر مہرباں نہ رہو
اپنی روح کی مضبوطی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھو
ورنہ تمہیں کہیں جائے اماں نہیں ملے گی
نشاطِ عشق سے لطف اندوز ہوئے بغیر
کیا کوئی صحیح معنوں میں اپنی قدر و قیمت جان سکتا ہے
اگر آفت بہت بھاری پڑے تو وہی راستی پر ہے
جو اس افسردہ زمین کو خیرباد کہہ دے
دوست بلاشبہ اس وقت سچے دوست ہیں جب وہ ضرورت کے وقت تمہارا ساتھ دیں
اگر تم اپنا ریوڑ خود نہیں چراتے تو کون اسے چراگاہ سے گھر کی جانب ہانکے گا

تم خود اپنے مقدر کے مالک ہو

محنت فرحت ہے کاہلی آفت ہے

آراستہ گفتگو بے وقعت ہے، جس میں سے کوئی فراست جنم نہیں لیتی

تم سب کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ جو کوئی کاہلی کی زندگی بسر کرتا ہے

انجام کار خالی ہاتھ ہوگا

دنیاوی نعمتیں مصائب اور مشقت سے حاصل کی جاتی ہیں

(انگریزی ترجمہ : Doriana Rottenberg)

○

الھڑتو وہ ساری ہیں لیکن ان میں سے پاکباز کون ہے؟
ان میں سے ایک بھی نہیں یا ایسا لگتا ہے
نہ تو وہ اپنے اوصاف ضائع کرنے میں جلدی کرتی ہیں
اور نہ ہی اٹھارہ برس تک پہنچنے کے انتظار کی زحمت اٹھاتی ہیں
ان کا رویہ میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں کہ احترام سے بہت دور ہے
بعض ٹچ می ناٹ کا کھیل کھیلتی ہیں اور بعض اپنی آزادہ رو
عریانیوں میں شرم سے عاری ہیں
اور پہلے آنے والے آدمی کے ساتھ ہوس رانی میں عجلت اور شدت کا
مظاہرہ کرتی ہیں
ان کے ذہنوں پر کیا چھایا ہوا ہے سب جانتے ہیں
ایک ماہر گھڑسوار سے شادی ان کا خواب ہے
وہ جسے سارے بالاتر سمجھتے ہیں
ایسی ہی ان کی واحد آرزو اور منزل ہے
وہ نہیں جانتیں کہ تمام ایسے گھڑسوار قابل اعتبار نہیں ہوتے

ایک حلیم شخص شہرت کا دعوی نہیں کرے گا
اپنے عظیم الشان نام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے
ایک منصوبہ ساز اپنی کھال سے باہر آجائے گا
ہماری یہ گم شدہ حسینائیں فکر کرنا کبھی ترک نہیں کرتیں
جو اپنے ہاتھوں اور اپنے ذہن سے کوئی بامقصد کام نہیں کرتیں
ان کا نصیب انہیں دغا دے جاتا ہے اور ان کی تمام زندگی نا ؤنوش
میں گذرتی ہے
وہ اپنی تمام چالاکیوں اور پریشانیوں کے قابل نہیں ہیں

(انگریزی ترجمہ : Olga Shartse)

○

آہ یہ کیسی ظالم مفلسی ہے
میں اس قدر مضطرب ہوں کہ سانس نہیں لے سکتا
مجھے اپنے بہتے آنسوؤں کو روکنے کا یارا نہیں
اور یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جسے میں اپنے مصائب سنا سکوں
میں اس قدر تذلیل اور کمتری محسوس کرتا ہوں کہ جب میں اپنے
کسی شناسا کو دیکھتا ہوں تو فرشی سلام کرتا ہوں اور لذت
سے سرخ ہو جاتا ہوں
اپنی آنکھیں پھیر لیتا ہوں اور سر جھکا دیتا ہوں
جلدی سے گزر جاتا ہوں یا اسی راستے پر واپس ہو جاتا ہوں جدھر سے آیا تھا
میں بے چینی سے ساری رات جاگتا ہوں
غذا میں نگل نہیں سکتا
میں کس قدر درماندہ اور آزردہ محسوس کرتا ہوں
میرے لئے اتنے مصائب کیوں بھیجے گئے
اور میں کب امن و آشتی سے بخوبی آشنا ہونگا

درد میرے دل کو جلاتا ہے اور درد بھی کس قدر ہیبت ناک

یا اللہ کیا اس کی شدت کبھی کم نہیں ہو گی

یا اللہ اپنے بندے کو راستہ دکھا

میری مدد فرما میں فریاد کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں

مجھے ایسی رسی عطا کر جسے میں پکڑ سکوں

چنار کے پیڑ ہوا میں جھومتے ہیں

اس کے پتے کتنے ترو تازہ اور پرجوش ہیں

اور میں صدمے سے لرزتا اور کپکپاتا ہوں

آج میں ایک مدہوش شخص جیسا ہوں

اور میرا لبادہ آنسوؤں سے نم آلود ہے

کبھی میں بھی ناز کیا کرتا تھا اور بھول گیا تھا

کہ مصائب اب بھی میری ملکیت ہو سکتے ہیں

مجھے حرارت ہے اور میرا درد محسوس کرتا دل

کبھی گرم اور کبھی سرد ہوتا ہے اور پھر دھڑکنے لگتا ہے

اور امید کی ایک کرن بھی ظاہر نہیں ہوتی

(انگریزی ترجمہ : Olga Shartse)

○

میری خزاں آن پہنچی ' ہاں ہلکا ہلکا کہرا گرنے لگا
اپنی قوت اور توانائی کو کس طرح محفوظ رکھوں
میرا ذہن مٹی مٹی ہے' میں واضح بلاوا سن رہا ہوں
لیکن موجِ بہار کو نیا راستہ تبدیل کرنے پر رضامند نہیں کر سکتا
آہ میری روح اب مئی میں سرمالوٹ آیا ہے
اور کیا برف میں دم سادھے ہوئے کوئی گلاب کھل سکتا ہے
لیکن انسان کے اندر اگر تندو تیز شعلہ بھڑکتا ہو تو وہ نہیں بجھتا
جب سرمائی جھکڑ چلتے ہیں
انسان تنگ دل اور تنگ نظر ہوتا ہے
دور کے مناظر بے پروبال روحوں کو نہیں بلاتے
حسن کے مقابل بے بصر لیکن
خود پرست ' بے وقعت اور غیر اہم چیزوں پر نگاہِ ہوس ڈالنے والا ہر ایک حریص ' سفاک
درندہ
بھیڑیئے جیسا ' مکار ' سکون سے انجان

دعوت میں حصہ لینے کے لئے زور آوری کرتا ہے

سب سے بہتر اور فربہ ترین کباب چھین لیتا ہے

وہ دھوکہ دینے اور مال بنانے کو حقیر نہیں جانتے

یا جب دوسرا ادائیگی کر رہا ہو تو بھوکوں کی طرح چڑھا جانا اور حریصوں کی طرح غٹ غٹانا

تیز دھار دکھائی دو مگر گرفت میں نہ آؤ'

ان کے لئے عزو وقار کا یہی پیمانہ ہے

ایسے ہیں خنزیران دولت 'ایسے ہیں ان کے اطوار

وہ صرف مکار ترین شخص کا احترام کرتے ہیں

انکساری ان کے نزدیک نامردانہ خوف ہے

کیا کوئی تا عمر یہاں دھوکے سے تحفظ اور مسرت کے حصول کی توقع کر سکتا ہے؟

(انگریزی ترجمہ : Tom Botting)

Selections from
World Literature

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
H-8/1, Pitras Bukhari Road Islamabad, Pakistan
www.pal.gov.pk